إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

کتابِ مستطاب

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

یعنی

سوانح اقدس حضرت سرورِ عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مجلّد چہارم ـــــ مشتمل بر منصبِ نبوّت

اوّلاً مقدمہ میں منصبِ نبوّت کی حقیقت اور اُس کے لوازم و خصائص پر بحث ہے پھر قبل از اسلام دنیا کے متمدّن ممالک اور خصوصاً ملکِ عرب کی مذہبی و اخلاقی حالت کی تفصیل ہے اور اُس کے بعد نبوّتِ محمدیؐ نے دنیا اور عرب کے لئے جس عظیم الشّان اصلاح کا فرض انجام دیا اُس کا اجمالی ذکر ہے پھر اسلامی عقائد کا تفصیلی بیان ہے۔

تالیف

علامہ سیّد سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفّی ۱۴ ربیع الاوّل ۱۳۷۳ھ مطابق ۲۳ نومبر ۱۹۵۳ء)

نیشنل بک فاؤنڈیشن۔ اسلام آباد، پاکستان

قیمت: ۲۰ روپے

فہرست مضامین

سیرۃ النبیؐ جلد چہارم

مضمون	صفحہ
مقدمہ	
۱ — ۲۰۹ منصب نبوت	۲۰۹
کتاب کا موضوع	۱
آپ کے پیغمبرانہ کارنامے	″
نبی اور مصلح اور حکیم	۳
نبوت کی حقیقت اور خصوصیات	″
نبوت و رسالت کے ثبوت	۷
کا اجمالی طریقہ،	
تفصیلی ثبوت کے تین طریقے	۸
پہلا طریقہ	″
دوسرا طریقہ	″
تیسرا طریقہ	۹
نبی کی ضرورت	۱۲
نبی کی عصمت	۱۳
نبی کی محبوبیت	۱۴
مصلحین	″
مصلحین کے اقسام	۱۵
نبی کی دو بعثتیں	۱۶

مضمون	صفحہ
بعثت کیلئے کسی قوم کا انتخاب	۱۸
بعثت کا زمانہ	″
نبی کی یقینی کامیابی	۱۹
ایک شبہہ اور اس کا جواب	۳۳
نبی اور غیر نبی کے امتیازات	۳۹
نبوت کے لوازم اور خصوصیات	۴۷
وہبی استعداد	۵۰
غیبی علم	۵۵
علم انسانی کے مآخذ	
ذرائع علم کے حصول کے	۵۸
زمانے اور ان کے مراتب	
غیر مادی علم	۶۰
علم غیب	۶۷
غیب کی حقیقت	۶۹
وحی اور ملکۂ نبوت	۷۵
کتاب اور سنت	″
وحی متلو اور وحی غیر متلو	۷۸
احادیث قرآن کا بیان ہیں	۸۲
الہام واجتہاد و حکمت	″

مضمون	صفحہ
نبوت	۸۴
عصمت اور بے گناہی	۹۲
بعض شبہات کا ازالہ	۱۰۲
نکتہ	۱۰۶
نبیؐ کی بشریت	۱۱۲
اجتہاد نبوی میں خطا،	۱۲۴
اس خطا کے معنی	۱۲۵
پانچ اجتہادی علوم پر تنبیہ الٰہی	۱۲۶
پہلا واقعہ	″
دوسرا واقعہ	۱۲۸
تیسرا واقعہ	۱۳۳
چوتھا واقعہ	۱۳۴
پانچواں واقعہ	۱۳۵
ایک غلط استدلال	۱۳۸
عقل بشری کی	۱۴۲
ملکۂ نبوت یا عقل نبوت کا شرعی ثبوت	۱۴۶
حکمت	۱۴۷
کتاب و حکمت کی تعلیم	۱۶۳
علم	۱۶۶

مضمون	صفحہ
علم وحکم	۱۶۸
شرحِ صدر	۱۷۲
تبیینِ کتاب	۱۷۹
اداءت	۱۸۲
رسول کا وجود مستقل ہدایت ہے،	۱۸۶
تزکیہ	۱۸۷
نور	۱۸۸
آیاتِ ملکوت کی رویت	۱۸۹
سماعِ غیب	۱۹۰
تبلیغ ودعوت	۱۹۱
ایک شبہہ کا ازالہ	۱۹۴
انبیاء کی تعلیم کا امتیازی عقیدہ	۲۰۱
نبوت کی غرض وغایت	۲۰۲
تائید ونصرت	۲۰۷
خاتمہ	۲۰۸
شبِ ظلمت ۲۱۰ - ۲۹۹ پیغمبر اسلام کی بعثت کے وقت دنیا کی مذہبی اور اخلاقی حالت ۲۱۰ — ۲۴۶	
ظہورِ اسلام کے وقت دنیا کی تمدنی اور مذہبی حالت کیا تھی؟	۲۱۲
مجوسِ فارس	۲۱۳
عیسائیِ روم	۲۱۸
ہندوستان	۲۲۹
یہود	۲۳۳
ظہورِ اسلام کے وقت عرب کی مذہبی واخلاقی حالت ۲۴۶ - ۲۹۹	
خدا کا اعتقاد	۲۴۷
ملائکہ کی الوہیت	۲۴۹
جنیات کی الوہیت	۲۵۱
بت پرستی	۲۵۲
ستارہ پرستی	۲۵۹
جن وشیاطین اور بھوت پلیت	″
کہانت	۲۶۳
اوہام پرستی	۲۶۷
جنگجوئی	۲۶۸
شراب خواری	۲۶۹
قمار بازی	۲۸۳
سود خواری	۲۸۵
لوٹ مار	۲۸۷
چوری	۲۸۹
سفاکی وبے رحمی ووحشت	۲۹۱
زنا اور فواحش	۲۹۲
بے شرمی وبے حیائی	۲۹۴
عورتوں پر ظلم	۲۹۴
وحشت وجہالت	۲۹۸
عربوں کے خصوصیات امر **خیر الامم بننے کی اہلیت** ۳۰۰ — ۳۰۹	
صحتِ نسب	۳۰۰
کسی پہلے مذہب میں داخل نہ تھے۔	۳۰۲
محکوم نہ تھے۔	۳۰۳
کتابی فاسد تعلیم سے نا آشنا تھے،	۳۰۴
دو زمین کے وسط میں آباد تھے	″
بعض اخلاقی خوبیاں	۳۰۵
شجاع وبہادر تھے،	″
پرجوش تھے،	″
حق گو تھے،	″
عقل ودانش والے تھے،	۳۰۶
ذہن اور حافظہ کے تیز تھے	۳۰۶
فیاض تھے،	۳۰۷
مساوات پسند تھے	″
عملی تھے،	۳۰۸
ان اوصاف کی مصلحت	۳۰۹

مضمون	صفحہ
صبحِ سعادت	۳۱۰ - ۳۴۴
ایک قوم کا انتخاب	۳۱۰
اصلاح و ہدایت کی مشکلات	۳۱۱
جہالت	۳۱۲
ابائی دین و رسوم کی پابندی	۳۱۹
توہم پرستی	۳۲۵
قبائل کی خانہ جنگیاں	۳۲۹
سیاسی مشکلات	۳۳۴
ذریعۂ معاش	۳۳۹
رفع شک	۳۴۲
تبلیغ نبوی اور اس کے اصول اور کامیابی کے اسباب	۳۴۵ - ۳۹۷
فریضۂ تبلیغ	۳۴۵
تبلیغ کی اہمیت	۳۴۷
اس کی وسعت	۳۴۸
تبلیغ کے اصول	۳۵۲
قول لین	۳۵۳
اغراض اور قول بلیغ	۳۵۴
تبشیر و تنذیر	،،
تدریج	۳۵۵
تالیف قلب	۳۵۶
دعوتِ عقل	۳۵۷
مذہب میں زبردستی نہیں	۳۵۹
میدانِ جنگ میں تبلیغ	۳۶۳
مسلح تبلیغی جماعتیں	۳۶۹
تبلیغ و دعوت کی تنظیم	۳۷۰
مبلغوں کی تعلیم و تربیت	۳۷۲
دعوت بالقرآن	،،
اشاعت اسلام کی	۳۷۳
قدرتی ترتیب،	۳۷۳
قبول اسلام کے لیے کیا چیز	۳۷۴
درکار تھی؟	۳۷۴
اشاعتِ اسلام کے اسباب	۳۷۸
و ذرائع	۳۷۸
ایک ضروری نکتہ	۳۸۷
موانع کا ازالہ،	۳۸۸
اسلام یا محمد رسول اللہ کا پیغمبرانہ کام	۳۹۸ - ۴۰۴
تعلیماتِ نبوی کی ہمہ گیری	۳۹۸
اسلام کے چار حصے	۴۰۳
عقائد	۴۰۵ - ۴۱۵
عقائد کی حقیقت اور اہمیت	۴۰۵
اللہ تعالیٰ پر ایمان	۴۱۶ - ۵۵۳
اصلاح عقائد	۴۱۶
تعددِ خدا کا ابطال	۴۱۸
بزرگوں کی مشرکانہ تعظیم سے روکنا	۴۲۰
درمیانی واسطوں کا مشرکانہ اعتقاد	۴۲۴
خوارقِ خدا کے حکم سے ہوتے ہیں	۴۲۶
حرام و حلال کرنا خدا کا کام ہے	۴۲۹
غیر خدا کی مشرکانہ تعظیم	۴۳۰
صفاتِ الٰہی کی توحید،	۴۳۱
مخفی قوتوں کا ابطال	۴۳۴
اوہام و خرافات کا ابطال	۴۳۶
کفارہ اور شفاعت کے غلط معنی کی تردید	۴۳۹

مضمون	صفحہ
اجرامِ سماوی کی قدرتِ الٰہی	۴۴۹
غیر خدا کی قسم سے روکنا	۴۵۰
خدا کی مشیت میں کوئی شریک نہیں،	۴۵۲
مشبہات شرک کی ممانعت	۴۵۵
قبر پرستی اور یادگار پرستی سے روکنا،	″
ریا اور عدم اخلاص بھی معنوی شرک ہے	۴۵۶
توحید اور اس کے ایجابی اصول و ارکان	۴۶۰
اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلیل	″
توحید پر عقلی دلیلیں	۴۶۴
توحید کی تکمیل	″ ۴۷۰
خدا کی حقیقی عظمت	″
انسان کا مرتبہ	۴۸۱
خدا کا جامع اور مانع تخیل	۴۸۶
اسماء و صفات	۴۹۰
صفاتِ جمالی	۵۰۵
صفاتِ جلالی	۵۰۸
نکتہ	۵۰۹
صفاتِ کمالی	۵۱۰
صفاتِ وحدانیت	″
صفاتِ وجودی	″

مضمون	صفحہ
علم	۵۱۱
قدرت	۵۱۲
نکتہ	۵۱۳
تنزیہہ	۵۱۴
ان تعلیمات کا اثر اخلاقِ انسانی پر	۵۱۶
خدا کا ڈر اور پیار	۵۲۴
محبت کے ساتھ خوف و خشیت کی تعلیم	۵۲۵
محبت کے جسمانی اصطلاحات کی ممانعت	۵۳۰
تعلیماتِ اسلامی میں محبتِ الٰہی کے مظاہر	۵۳۷

فرشتوں پر ایمان
۵۵۴ - ۵۷۶

مضمون	صفحہ
ملائکہ کے معنی	۵۵۴
ملائکہ کا تخیل مذاہب قدیمہ میں	۵۵۵
ملائکہ کا تخیل فلسفہ میں	″
یونانی مصری فلسفہ میں	″
قدیم یونانی فلسفہ میں	″
صابیون میں ملائکہ کا تخیل	۵۵۶
اسلام میں فرشتوں کی حقیقت	″
اس عقیدہ کی عقلی حیثیت	۵۵۹
آیات و احادیث میں ملائکہ کا ذکر	۵۶۲
ملائکہ کے فرائض	″
فلسفہ و مذاہب کی ملائکہ کے متعلق بے اعتدالی	۵۶۱
فرشتوں پر ایمان لانے کا مقصد	۵۶۲

رسولوں پر ایمان
۵۷۷ - ۵۹۳

مضمون	صفحہ
ایک عام غلط فہمی کا ازالہ	۵۷۷
نبوت کسی ملک یا قوم سے مخصوص نہیں،	۵۷۸
تمام دنیا میں پیغمبر آئے	۵۷۹
تمام پیغمبروں کی صداقت کا اعتراف	″
پیغمبروں میں تفریق کی ممانعت	۵۸۱
پیغمبروں کی غیر محدود تعداد	۵۸۴
مختلف فیہ پیغمبروں کی رسالت کا اقرار	″
پیغمبری کی توضیح حقیقت کا اظہار	۵۸۵
پیغمبروں کا منصب و فرائض	″
پیغمبروں کی عصمت	۵۸۶
قرآن میں پیغمبروں کا جامع تذکرہ	۵۸۸

مضمون	صفحہ
وہ انبیاء جن کا تذکرہ قرآن میں نہیں ہے	۵۹۰
ایسے انبیاء کی شناخت کا اصول	،،
انبیاء کی باہمی ترجیح کا مسئلہ	۵۹۱
کتبِ الٰہی پر ایمان **۵۹۴ - ۶۳۱**	
کتاب الٰہی پر ایمان لانے کا مقصد	۵۹۴
اس عقیدہ کا تکمیلی پہلو	۵۹۵
تمام کتب الٰہی پر ایمان لانا ضروری ہے	،،
انبیائے قدیم کے غیر معلوم الاسم صحائف	۵۹۷
چار معلوم الاسم آسمانی صحائف	،،
اس عقیدہ کا اثر سیاسیاتِ عالم پر	۵۹۹
اقوامِ عالم کی قانونی تقسیم اور ان کے حقوق،	،،
مسلمان	۶۰۰
اہلِ کتاب	،،
شبہہ اہل کتاب	،،
کفار و مشرکین	۶۰۱
وحدۃ الادیان	،،
تمام سچے مذاہب ایک ہیں،	۶۰۲

مضمون	صفحہ
دین اور شرعۃ، منسک، منہاج کا فرق	۶۰۲
صحیفے وقتاً فوقتاً کیوں نازل ہوئے	۶۰۳
وحدتِ دین پر قرآن کی شہادت	۶۰۴
وحدتِ دین کی دعوتِ عامہ	۶۰۶
دین قیم	۶۰۷
اسلام اور مذاہبِ قدیم کا اتحاد	۶۰۸
دین ہمیشہ ایک رہا،	،،
شرعہ اور منہاج میں تبدیلی ہوئی	۶۰۹
اس کی مثالیں	،،
تبدیلِ قبلہ	،،
خانہ کعبہ کے حج کی تعیین	،،
یہود و نصاریٰ انبیاء کی تکذیب کرتے رہے اسلئے اصل اسلام سے ہٹ گئے،	۶۱۰
یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنی کتابوں پر عمل کرنے کی ہدایت	۶۱۰
مسلمانوں کو شریعتِ اسلام پر عمل کرنے کا حکم،	،،
صحیفۂ محمدیؐ نے اگلی کتابوں کی تصدیق کی،	،،
اہل کتاب نے اپنی کتابوں کو چھوڑ کر اہلِ اہوا کی پیروی کی،	۶۱۱
حدود میں شریعتوں کا اختلاف غیر اہم ہے،	۶۱۲
یہود و نصاریٰ فروعی اختلافات پر ایک دوسرے کو برسرِ باطل کہتے تھے،	،،

مضمون	صفحہ
وہ مسلمانوں کو یہودیت و نصرانیت کی دعوت دیتے تھے،	۶۱۲
اسلام کی دعوت اصل دین ابراہیمی کی جانب	،،
اسلام کا تمام اہل مذاہب کو یکساں خطاب	۶۱۴
قبولِ عمل کیلئے ایمان شرط ہے،	۶۱۵
ایمان و عمل کے لیے نبی کی تصدیق ضروری ہے،	،،
اسلام کامل تمام رسولوں کی تصدیق ہے،	،،
یہود و نصاریٰ انبیاء کی تکذیب	۶۱۶
یہود و نصاریٰ کا حسنِ عمل"	۶۱۷
اسلام کا اصل الاصول توحید	،،
کامل اور رسالتِ عمومی ہے	،،
اسلام کا ہدایت تامہ ہونا،	۶۱۹
توحیدِ کامل کے بغیر نجات کلی کا کوئی مستحق نہیں،	۶۲۰
نبوتِ محمدی کا دعویٰ	،،
دعوتِ محمدی میں ہدایت کی بشارت	،،
اہل مذاہب اور تمام انسانوں کو دعوتِ محمدی کیوں پیش کی گئی	۶۲۱

مضمون	صفحہ
تکمیل دین	۶۲۴
قرآن کے سوا کسی صحیفہ نے دین الٰہی کی تکمیل کا دعویٰ نہیں کیا،	״
حضرت موسیٰؑ کی بشارت ایک آنے والے نبی کے لیے	״
حضرت عیسیٰؑ کی بشارت ایک آنے والے نبی کے لیے،	״
موعود الامم (صلعم) کی آمد اور اس کا دعویٰ	۶۲۵
وحی الٰہی کی جانب سے تکمیل دین کا اعلان	״
تکمیل دین کے اثرات مظاہر	״
قرآن کا یقین ہونا	۶۲۶
قرآن کا تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں پر مشتمل ہونا	״
قرآن محفوظ ہے اور رہیگا،	״
اگلی کتابیں تحریفات و تصرفات سے بری نہیں	״
قدیم مذاہب دائمی نہ تھے، اسلیے دائمی حفاظت کا وعدہ نہ تھا	۶۲۷
قرآن کی بقا اور حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر	״
قرآن کے لفظ و عبادت و معنی کی حفاظت کیلئے وعدۂ الٰہی	״
قرآن کا غالب ہونا	۶۲۸
ختم نبوت	״
وحدت ادیان اور دین اسلام	۶۲۹
تمام مذاہب سابقہ کا اصل دین	״
صحیفۂ محمدیؐ نے اہل کتاب کو وحدتِ دین کی دعوت دی	״
وحدتِ دین کی حقیقت صحیفۂ محمدی میں،	۶۳۰

پچھلے دِن اور پچھلی زندگی پر ایمان

۶۳۲ - ۷۱۳

اسلام کے سلسلۂ ایمانیات کی آخری کڑی ہے،	۱۳۲
آخرت کے لفظی معنی اور مفہوم	״
آخرت سے مراد عالم بعد الموت ہے،	۱۳۳
قرآن میں ایمان باللہ کے بعد سب سے زیادہ زور ایمان آخرت پر ہے،	۱۳۵
آئندہ زندگی کے دو دور یعنی برزخ و بعثت	״
تورات و انجیل میں برزخ و بعثت کی تفصیل نہیں	״
اسلام اور یوم آخرت کی تفصیل	۱۳۶
اسلام میں تین دور ہائے حیات دنیا۔ برزخ اور قیامت ان	״
تینوں دوروں میں فرق	״

۱۔ برزخ

۶۳۷ - ۶۷۶

قرآنِ مجید میں لفظ برزخ اور اس کے معنی	۶۳۷
قبر، برزخ کا عرف عام ہے	۶۳۸
موت و حیات کی منزلیں،	״
قرآن میں دو موتوں اور دو حیاتوں کا ذکر،	״
دونوں موتوں اور حیاتوں کی تشریح،	۶۳۹
عالم برزخ کی کیفیت،	״
نیند اور موت کی مشابہت	״
نیند اور موت کا فرق	۶۴۰
قرآن میں موت کی تشبیہ نیند سے	״
برزخ کی زندگی کی تعبیر نیند سے	۶۴۱
قرآن میں دوسری زندگی کیلئے بعث کا لفظ،	״
خواب میں لذت و الم	۶۴۲

مضمون	صفحہ
خواب کی خیالی دنیا کا جسم پر اثر انداز ہونا،	۶۴۲
عالم خواب کی لذت والم کا	۶۴۳
خاتمہ بیداری میں	۶۴۳
اور بیداری کی لذت والم	″
کا خاتمہ عالم خواب میں	
عالم خواب کے لذائذ والآلام	″
کے فلسفیانہ اسباب وعلل	″
بھولے ہوئے احساسات و	″
معلومات کا خواب میں متشکل ہوکر	
نظر آنا،	″
اچھے اور برے اعمال کے نقوش	″
ذہن انسانی کے گوشوں میں	
تمثیلی خواب اور اس کی مثالیں	۶۴۴
جسم انسانی میں مختلف مادوں	″
کی کمی بیشی سے خواب میں ان	
کے مناسب مجسم شکلیں اور	
اور ان کی مثالیں	
اعمال انسانی کا خواب میں اپنے	۶۴۵
مناسب قالب میں مجسم ہونا اور	
ان کی مثالیں،	
اعمال کی تمثیلات قرآن مجید میں	″
اعمال کی تمثیلات احادیث میں	۶۴۸
گناہوں کی تمثیلی سزائیں،	۶۴۹

مضمون	صفحہ
آنحضرت صلعم کے ایک رویاے	۶۵۰
صادقہ میں مختلف گناہوں کی	
مختلف تمثیلی سزاؤں کے مناظر	
ان تمثیلات کی تعبیر تشریح	۶۵۱
علم النفس سے انسان کی لاعلمی	۶۵۲
تصوری یقین اور خارجی	۶۵۳
وجود کا باہمی تعلق	
قرآن پاک میں یقین کی دو قسمیں	″
علم الیقین وعین الیقین	″
علم الیقین کے حصول کا ذریعہ	″
ایمان ہے	″
علم الیقین کے ذریعہ دوزخ	۶۵۴
کا مشاہدہ دنیا میں	
موت کے بعد حجاب مادیت کا	۶۵۵
اٹھنا اور اعمال کے تمثیلی نتائج	
کو کسی حد تک دیکھنا،	
قیام روز جزا پر تمام رازہاے	″
سربستہ کا فاش ہوجانا،	″
احوال برزخ کا عین الیقین	۶۵۶
موت کے بعد عالم برزخ کی ابتدا	″
عالم برزخ میں جزا وسزا کے پیش پڑنے	″
مشاہدہ کی شہادتیں قرآن مجید میں	″
موت کے بعد خدا کی طرف	۶۵۸
روح کی بازگشت،	

مضمون	صفحہ
موت کے لئے قرآن مجید میں	۶۵۹
خدا کی طرف بازگشت کی	
اصطلاح اور اس کا مفہوم	۶۶۰
اس وقت کا سماں	۶۶۱
موت کے سماں کا خاکہ	″
قرآن مجید میں	″
جسم سے روح کی علیحدگی	۶۶۲
کے بعد سزا کا دور	
سزا قانون عمل کے مطابق	″
انسانی اعمال کا نتیجہ ہے،	
نیکوکاروں کو بشارتیں	″
برزخ کا عذاب وراحت	۶۶۳
برزخ میں عذاب وثواب کے	۶۶۴
مناظر،	
برزخ اور اس کے عذاب وثواب کا	″
تذکرہ قرآن مجید میں	
قبر کی اصطلاح	۶۶۸
احادیث میں برزخ کا اصطلاحی	″
نام قبر ہے،	
قبر کا مفہوم	۶۶۹
قبر ارواح ونفوس کی دنیا ہے	″
قبر کی روحیں جسم خاکی کے بجائے	″
جسم مثالی میں متشکل ہوتی	
ہیں۔	

مضمون	صفحہ
جسم خاکی کی طرح جسم مثالی میں بھی لذت و الم کا احساس ہوتا ہے،	۶۶۹
بعض سعید روحیں جسم خاکی کی ثقل کی قید سے آزاد کر دی جاتی ہیں،	۶۷۰
مٹی کی قبروں میں عذاب کے مشاہدات	۶۷۱
سوال و جواب	،،
قبر میں فرشتوں کا توحید و رسالت کے متعلق سوال	،،
قبر کے سوال و جواب کا ذکر قرآن مجید میں	،،
سوال و جواب کا اصل مفہوم	۶۷۲
برزخ میں ارواح کا مسکن	۶۷۴

آخرت کی دوسری اور حقیقی منزل

۶۷۵ - ۶۷۹

قیامت اور جزائے اعمال ۶۷۸	
کیا کبھی دنیائے حیات پر بھی موت طاری ہوگی، ؟	۶۷۸

مضمون	صفحہ
نظام کائنات کی بربادی کی پیشین گوئی اہل سائنس کی طرف سے،	۶۷۸
قیامت کا عقیدہ مختلف آسمانی کتابوں میں،	۶۷۹

قیامت

۶۸۰ - ۷۱۳

قیامت کے نام قرآن میں	۶۸۰
قیامت کے اوصاف	۶۸۲
قیامت میں فساد نظام ہوگا	۶۸۴
اس کی شہادتیں قرآن مجید سے	،،
بعد قیامت ایک نئے آسمان اور نئی زمین کی تعمیر،	۶۸۷
پچھلی دنیا کے نتائج پر اسکی بنا	،،
قیامت کی حقیقت	،،
صور قیامت	۶۹۲
عربوں کا انکار قیامت سے	۶۹۲
اسی لئے اسلام میں توحید کے بعد سب سے زیادہ زور قیامت کے عقیدہ پر دیا گیا	۶۹۵
عقیدۂ قیامت اصول دین کیوں ہے؟	۶۹۶
قیامت پر قرآنی دلائل	۶۹۷
حشر جسمانی	۷۰۵

مضمون	صفحہ
روحانی زندگی کا تصور نئی جسمانی زندگی سے زیادہ دشوار ہے،	۷۰۶
حشر جسمانی ہوگا،	،،
جسم و جسد،	۷۰۸
کیا کوئی نیا جسمانی پیکر ہوگا	،،
نیا جسمانی پیکر جسم خاکی کی خصوصیات و لوازم سے الگ ہوگا،	،،
"خلق جدید"	،،
ذمہ داری روح پر ہے	۷۱۰
دنیاوی جسم بدلتے رہنے پر بھی وہی جسم رہتا ہے،	۷۱۱
آخروی جسم کیسا ہوگا؟	۷۱۲

جزاء اور سزا

۷۱۴ - ۷۶۹

جزاء و سزا دیگر مذاہب میں	۷۱۴
عالم آخر کا فہم و ادراک	۷۲۰
عالم آخر کو دنیا کی زبان محاورات میں سمجھایا گیا ہے،	۷۲۱
اس طرز افہام سے فلسفی و عامی دونوں تشفی پاتے ہیں،	،،
آخروی وقائع کے سمجھانے کیلئے مادی الفاظ کا استعمال	،،
وجود کے موجود قوانین فطرت	۷۲۲

مضمون	صفحہ
اور ان کے خصوصیات و لوازم	
مادی دنیا کے قوانین فطرت	۲۲،
اور سلسلۂ علت و معلول اسی	
مادّی عالم کے ہیں،	
ضروری نہیں کہ موجودہ قوانین	۲۳،
فطرت وہاں بھی کارفرما ہوں	
اصولِ جزا	،،
اصولِ فطرت صرف مادیات	،،
تک محدود نہیں	
اعمال کے لوازم و نتائج	۲۴،
عقاب و ثواب ردِ عمل ہے،	۲۵،
حصولِ راحت کا اصول	۲۶،
نامۂ عمل	۲۹،
کوئی چیز پیدا ہونے کے بعد فنا	،،
نہیں ہوتی	
اعمال کے ریکارڈ ہمیشہ محفوظ	،،
رہتے ہیں،	
قرآن مجید میں اس اصول کی	،،
تشریح اور اس پر شہادتیں	
اعضاء کی شہادت	۳۲،
میزان	۳۴،
حساب	۳۵،
جنت و دوزخ	۴۶،
جنت انسان کی وراثت ہے،	،،

مضمون	صفحہ
حضرت آدمؑ کا زمین پر آنا اُن کی	۳۷،
پیدائش سے پہلے مقدر ہو چکا تھا	
آدم اور بنو آدمؑ کی اصلی جگہ	،،
جنت ہے،	
جنت کے دو درخت نیک و بد	۳۸،
کی پہچان کا، اور زندگی	
جاوید کا،	
آدم کو نیک و بد کی شناخت	،،
کے درخت سے روکا گیا،	
سلطان نے حیات جاوداں	۳۹،
کا درخت کہکر نیک و بد کی شناخت	
کے درخت کو بتا دیا،	
حیات جاوداں کا مقصود	،،
کیا ہے،	
نیک و بد کی تمیز ہی شرعی	،،
تکلیف کا باعث ہے،	
آدم کو نیک و بد کی تمیز کا فطری	،،
الہام	
انسان کا تکلیف شرعی کی امانت	،،
کو قبول کرنا، اور حیاتِ جاوداں	
کا حصول سعی و عمل پر موقوف ہونا	
زمین پر بنو آدم کی چار چیزوں	۴۲،
کھانے، پینے، پہننے اور بڑھنے	
کی ضروریات کا پیدا ہونا	

مضمون	صفحہ
مذہب نے ان ضروریات اربعہ کو جائز	۴۲،
طریقوں کی تعلیم اور ناجائز طریقوں	
سے احتراز کی تلقین کی،	
جنت کی وراثت کا وعدۂ الٰہی	،،
انسانی جزا و سزا کے تین گھر	۴۳،
انسان کا پہلا دار الجزا یعنی دنیا	۴۴،
مگر یہ دار الجزا فانی ہے،	۴۹،
یہ دار الجزا دار الاصلاح بھی ہے	۵۱،
انسانوں کی تنبیہ و اصلاح کے	۵۲،
مراتب	
نیکی سے برائی کا کفارہ	،،
توبہ کفارہ ہے،	۵۳،
مصائب کی تنبیہ اور کفارہ	۵۶،
عذاب الٰہی کا مقصد	۵۷،
عذاب برزخ بھی کفارہ ہے،	۶۰،
عذاب دوزخ کفارۂ گناہ ہے	۶۳،
عذاب، انسان کے اعمال کا	۶۶،
نتیجہ ہے،	
انسان کی تخلیق رحمت کیلئے ہوئی	۶۷،
دوزخ	۶۹، - ۸۱۱
دوزخ قید خانہ نہیں شفاخانہ	۶۹،
ہے،	

مضمون	صفحہ
گناہ روحانی بیماری کا اور عذاب اس کے نتیجۂ بد کا اصطلاحی نام ہے	۷۶۵
دوزخ کی مثال شفاخانہ ہے	،،
دوزخ سے بالآخر نجات ہوگی	۷۷۱
گویا دوزخ بھی ایک نعمت ہے،	۷۷۲
دوزخ میں رحمت الٰہی کا ظہور	۷۷۴
دورِ نجات	
اس کی تصریحات احادیث میں	۷۷۵
شرک و کفر کی بخشایش نہیں	۷۷۸
کیا دوزخ کی انتہا ہے؟	۷۷۹
دوزخ رحمتِ الٰہی کی چھینٹوں سے بالآخر سرد ہو جائے گی،	۷۸۰
اللہ کے غضب پر رحمت کی سبقت	،،
دوزخ کی انتہا قرآن مجید میں مشیت پر ہے،	۷۸۱
کفار و مشرکین کے عذاب کی انتہا مشیت الٰہی پر موقوف ہے	۷۸۲
قرآن مجید کی کوئی آیت دوزخ کے تسلسل و جود پر دلالت نہیں کرتی	،،
قرآن مجید میں بہشت کے عدم انقطاع کی تصریح کی گئی،	۷۸۳
قرآن مجید سے اس کی تشریح	۷۸۴
اسکی شہادت حدیثوں میں	۷۸۵
دفعِ شبہہ	۷۸۷
قرآن مجید کی بعض آیتوں سے دوزخ کے دوام کا شبہہ	،،
اس شبہہ کا ازالہ	۷۸۸
چند آیتوں میں کفار کے دوزخ سے الگ نہ ہونے کی تشریح	
ان آیات کا مفہوم	۷۹۱
اللہ تعالیٰ کے وعدۂ ثواب و عذاب میں فرق	۷۹۲
مشرکین و کفار کی معافی کی تصریح	۷۹۳
تصریح کیوں نہیں،	
عقیدۂ کفارہ اور عقیدۂ کرم اور عقیدۂ مغفرت	،،
عذاب طویل کا سبب	۷۹۴
مشرک و کافر کا آخر انجام؟	۷۹۵
جمہور کے نزدیک عذابِ دوزخ کا دوام	۷۹۹
بہشت و دوزخ کی جزا و سزا بھی تمثیلی ہے،	۸۰۳
تمثیلی سزا کے معنی	،،
اسکی مثالیں قرآن مجید و احادیث سے	۸۰۴
دوزخ کی جسمانی سزائیں	۸۰۶
جسمانی سزاؤں کی تصریح قرآن مجید سے	،،
دوزخ میں روحانی سزائیں،	۸۰۹
اُن کی تصریح قرآن مجید سے	،،

جنت

۸۱۲ - ۸۵۹

مضمون	صفحہ
جنت کے نام	۸۱۲
جنت کا دوام	،،
اُس کی تصریح قرآن مجید میں	۸۱۳
دائمی قیام اہلِ جنت کا جنت میں گھبرانا، ان کی جبلت و فطرت کے خلاف ہوگا،	۸۱۸
غیر فانی بادشاہی	،،
جنت کے عیش و مسرت کی تعبیر آسمانی بادشاہی سے	۸۱۹
عیسوی پیغام میں آسمانی بادشاہی	،،
"آسمانی بادشاہی" کے اجمال کی اسلامی تفصیل	۸۲۰
جنت کے لئے باغ کا استعارہ کیا عرب کے لئے ہے؟	۸۲۲
استعارہ میں ایک نکتہ	،،
سامانِ جنت کے دنیاوی نام	۸۲۳
جنت میں دنیاوی الفاظ کے معانی سے بلند تر حقائق	۸۲۴
اسکی شہادت قرآن مجید و احادیث سے	،،

مضمون	صفحہ
جنت کی مسرتیں اعمال کی تمثیل ہیں،	۸۲۶
اس کی شہادت قرآن مجید اور احادیث سے	"
لطف و مسرت کا تصور	۸۳۴
لطف و مسرت کا اعلیٰ ترین تخیل	"
جنت میں انسان کی ہر خواہش پوری ہوگی،	۸۳۵
جنت جہاں کوئی جسمانی و روحانی آزار نہیں،	۸۳۸
جنت جہاں رشک و حسد نہیں	۸۳۸
وہاں کی جسمانی زندگی کیسی ہوگی؟	۸۳۹
جنت ارتقاء روحانی ہے،	۸۴۰
مسئلہ ارتقاء کے اصول "بقائے اصلح" کا عمل روحانی مدارج کے ارتقاء میں،	۸۴۲
امن و سلامتی کا گھر،	۸۴۳
مقام رحمت	۸۴۵
مقام نور	۸۴۶
مقام رضوان	۸۴۷
مقام طیب و طاہر	۸۴۹
مقام تسبیح و تہلیل	۸۵۰
صبح و شام کی روزی	۸۵۲
مقام قرب	۸۵۳
دیدار الٰہی	"
ان تعلیمات کا عملی اثر	۸۵۵
عرب کا ایمان و یقین اور صحابہؓ کی حیثیت الہٰی،	۸۵۶
قضا و قدر ۸۶۰ - ۸۸۰	
کیا عقیدۂ قضا و قدر ایمانیات میں ہے،	۸۶۰
عقیدۂ قضا و قدر کا حاصل	"
اس عقیدہ کی تعلیم قدیم مذاہب میں،	"
خاتم النبیین (صلعم) کی تعلیم نے اس کی کیا تکمیل کی، اور کیا اثرات پیدا ہوئے،	۸۶۱
اصطلاح قضا و قدر کی تشریح	۸۶۲
اس عقیدہ کی اخلاقی اہمیت	۸۶۴
عقیدۂ قضا و قدر کی توضیح،	۸۶۵
عقیدۂ قضا و قدر کا نتیجہ پستی	۸۶۷
سستی دو دن ہمتی نہیں	
اس کا نتیجہ بلندی استقلال	"
اور صبر و ثبات ہے،	

مضمون	صفحہ
غلط فہمی کا ازالہ	۸۶۸
تضاد قدر و سعی عمل کی باہمی تطبیق،	۸۶۹
پہلے فسق اور نافرمانی ہوتی ہے	۸۷۰
اس کے نتیجہ میں خدا کی طرف سے ضلالت کا ظہور ہوتا ہے،	"
جبر و قدر	۸۷۱
جبر و قدر کا لاینحل مسئلہ	"
قدیم مذاہب میں اس کے حل کی دو صورتیں، یا تو خاموشی یا جبر کی تلقین،	"
آنحضرت صلعم نے اس راز کو ظاہر کیا،	۸۷۲
بیک وقت دو صد اقتیں	"
صحیفۂ محمدیؐ میں ان دونوں صد اقتوں کی تفصیل اور ان کی تشریح،	۸۷۳
ہدایت و ضلالت کے الفاظ سے پیدا شدہ غلط فہمی کا ازالہ	۸۷۵
خیر و شر کا مفہوم اسلام میں	۸۷۷
"اگر خدا چاہتا تو تم کو ہدایت دیتا" کی تفسیر	۸۷۸
ہدہ کی مشیت	"
اللہ کی گمراہی کن کے لیے ہے،	"

مضمون	صفحہ
نتیجۂ بحث	۸۸۸
ایمان کے نتائج ۸۸۱ - ۸۸۸	
خلاصۂ مباحث	۸۸۱

مضمون	صفحہ
ایمان کا مقصد دل کی اصلاح ہے،	۸۸۲
اسلام میں ایمان و عمل کی جامعیت	"
درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے،	
اہلِ ایمان کی شناخت	

مضمون	صفحہ
تمام نیکیاں صرف ایک جڑ "ایمان" کی شاخیں ہیں،	۸۸۷
ایمان کے بعد عمل کی ضرورت	"
ایمان ملزوم اور اعمال اسکے لوازم ہیں،	"
خاتمہ،	۸۸۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع ثانی

سیرۃ النبیؐ جلد چہارم

سیرت جلد چہارم کو جو اسلام کے اصول و عقائد پر ہے، جس وقت پہلی دفعہ ناظرین کرام کے ہاتھوں میں دے رہا تھا، میرا دل اضطراب کے عالم میں تھا کہ ایسے مشکل اور پیچیدہ راستہ میں معلوم نہیں میرا قلم کہاں کہاں بہکا، اور قدم نے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی ہے، لیکن الحمد للہ والمنۃ کہ سوائے دوزخ کی ابدیت و غیر ابدیت کے ایک مسئلہ کے جس میں جمہور کی رائے ہمارے ساتھ نہ تھی ہر مسئلہ میں اس کتاب کی تحریر کو قبولیت عام حاصل ہوئی، جن جن حوصلہ افزا طریقوں سے خواص علماء اور عام مسلمانوں نے اپنی تحسین و آفرین کی عزت بخشی، اس سے جی چاہتا تھا کہ یہ قیاس کر دوں کہ ملاء اعلیٰ کی خوشنودی و رضامندی بھی اس حقیر مؤلف کے شامل حال ہے،

اس کتاب کی طبع ثانی چھوٹی تقطیع پر چھاپی جا رہی ہے، اس میں طبع اول کے مطبعی اغلاط کی تصحیح کر دی گئی ہے کہیں کہیں عبارت کی خوبی و شستگی کے لئے لفظی تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں اور مسئلہ ابدیت نار میں جمہور کے خیال کی ترجمانی کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے، تاکہ ناظرین کو اس کے

دونوں پہلوؤں سے واقفیت ہوجائے، واعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا،

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچائے، تاکہ ناچیز مؤلف کو اپنی مغفرت کا وسیلہ ہاتھ آئے،

کتاب کی طبع اوّل چونکہ بڑی تقطیع پر چھپی تھی، اس لئے ۶۸۶ صفحوں کی ایک جلد بنے دی گئی، لیکن چھوٹی تقطیع پر اُس کی ضخامت ۸۸۸ صفحوں تک پہونچ گئی ہے جس کا ایک جلد میں سمانا مشکل تھا، اس لیے گو صفحوں کا شمار مسلسل رکھا گیا ہے، مگر صفحہ ۴۰۵ سے کتاب دو حصوں میں علیحدہ بھی کر دی گئی ہے، تاکہ اگر کسی کا جی چاہے تو اُس کو دو جلدوں میں کرلے تاکہ پڑھنے میں اور سفر میں ساتھ رکھنے میں آسانی ہو،

جامع

سید سلیمان ندوی

۲۶ رجب ۱۳۵۳ھ

دیباچہ طبع اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین
وعلی آلہ وصحبہ اجمعین

اے باز کنِ درمعانی — بر ما بکلیدِ آسمانی
ہرچہ از تو گمان برم بچونی — آن من بوم دتو زآن برونی

شاہِ رسل و شفیع مرسل — خورشید سپہر و نورِ اوّل
(خسرو)
سلطانِ ممالکِ رسالت — طغرائے صحیفۂ جلالت

پیشِ نظر کتاب، سیرۃ النبیؐ کے سلسلہ کی چوتھی جلد ہے، اس کا موضوع منصب نبوت ہے، اس تقریب سے سب سے پہلے اس میں ایک مقدمہ ہے جس میں نبوت کی حقیقت اور اُسکے لوازم و خصوصیات کی تشریح ہے، اس کے بعد دیباچہ ہے جس میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ولادت اور ظہور اسلام کے

وقت دنیا کی مذہبی واخلاقی وروحانی حالت کا مرقع دکھایا گیا ہے، بالخصوص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ملک عرب کی جو مذہبی واخلاقی حالت تھی، اور اُس کی اصلاح میں جو دقتیں درپیش تھیں طرح وبسط کے ساتھ اُن کی تفصیل کی گئی ہے، اُسکے بعد آپکے تعلیمات وارشادات کی تفصیل سے اصل کتاب کا آغاز ہوا ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیشگاہ باری سے جو شریعت کاملہ اور قانونِ ابدی عطا ہوا، وہ درحقیقت چار عنوانوں پر منقسم ہے، عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات، خیال تھا کہ عقائد وعبادات کی ایک جلد ہو اور اخلاق ومعاملات دوسری جلد میں ہوں مگر جوں جوں مسافرِ قلم اس دشوار گذار مرحلہ میں آگے بڑھتا گیا، راستہ اسی قدر وسیع اور مسافت اتنی ہی بعید نظر آنے لگی، ناچار اس جلد کو صرف عقائد کے بیان پر محدود رکھا گیا، دوسری جلد میں عبادات اور اُن کی حقیقت اور فرائض چہارگانہ کے حقائق وفوائد سے بحث ہوگی، اور تیسری جلد کا عنوان اخلاق ومعاملات ہوگا جس میں ہم انشاء اللہ تفصیل پائیں گے کہ تمدن ومعاشرت بالخصوص قوانینِ نکاح، طلاق، وراثت، حقوقِ نسا، غلامی، جہاد، اصولِ حکومت اور اقتصادیات وغیرہ کے متعلق تمام دنیا کے مذاہب کے کیا اصول اور تمام سلطنتوں اور قوموں کے کیا قوانین تھے، اور آج مغربی اس انتہائی تہذیب تک پہونچ کر کس حد تک ان امور میں ترقی کی ہے، پھر موازنہ کرکے ہم دکھائیں گے کہ شریعتِ اسلام کے مقابلہ میں مغرب کی معراجِ ترقی، شریعتِ اسلام کا پایۂ اولین ہے،

حضرت الاستاذ مرحوم نے اس جلد کا کام شروع ہی کیا تھا، اور مذکورۂ بالا مباحث میں سے صرف عرب جاہلیت کے مذہبی واخلاقی حالات کے پچیس تیس صفحے لکھنے پائے تھے کہ وفات پائی، یہ صفحے بھی ان اوراق میں شامل ہیں مگر چونکہ ان میں بکثرت اضافہ وترمیم کی ضرورت پیش آئی ہے اس لئے ان صفحات کو اُن کے اسم گرامی کی طرف منسوب کرنے میں احتیاط کرتا ہوں، بقیہ پوری کتاب کی ذمہ داری خاکسار ہی کے کار خطا

قلم پر ہی، وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ،

کوشش کی ہو کہ ان اوراق میں پیغمبر اسلام علیہ السّلام کے پیغام و تعلیم کو پوری تشریح، استناد، استدلال اور دلچسپی کے ساتھ ناظرین کی خدمت مین پیش کیا جائے، قرآن پاک کے استناد کو ہر موقع پر سب سے آگے رکھا گیا ہی اور اسی کے پرتو میں احادیث صحیحہ سے فائدہ اٹھایا گیا ہے، مناظرانہ پہلو سے بچکر ہر پیش نظر مسئلہ میں اسلام کا دوسرے مذاہب سے اس غرض سے موازنہ کیا گیا ہے، تاکہ اسلام کی تکمیلی شان نمایان ہو جائے۔

ان اوراق کے لکھنے والے کے نزدیک نسخ شریعت کے معنی کسی حکم کو اس کے غلط یا غیر مفید ہونے کے سبب سے سرے سے مٹا کر کسی دوسرے حکم کو نافذ کرنے کے نہیں ہیں، بلکہ محرف احکام کی جگہ پر اصل احکام کے دوبارہ نازل ہونے اور دنیا کے حسب حال ناقص کی جگہ کامل اور کامل کے بدلہ کامل تر تعلیمات دیئے جانے کے ہیں اس لیے قرآن پاک کے ناسخ کتب اور اسلام کے ناسخ ادیان ہونے کے معنی ان کے مٹا دینے والے کے نہیں، بلکہ ان کی تکمیل کرنے والے کے ہیں، مذاہب کی تاریخ جب سے شروع ہوتی ہی ہر مذہب اور اس کی کتاب انسانی عروج و ترقی کی ایک ایک منزل ہی، اور اسلام اس عروج و ترقی کی وہ انتہائی منزل مقصود ہی جسکے بعد تکمیل دین کی سرحد ختم ہو جاتی ہے اور جیسا کہ خود اس کا دعویٰ ہی، اور اس دعویٰ میں کوئی اور دین اس کا شریک نہیں ہی کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ،

ان کی تکمیلی مباحث میں سے یہ جلد صرف عقائد پر مشتمل ہی اور کون نہیں جانتا کہ مذاہب میں اعتقادات کی حیثیت کتنی اہم اور ان کی بحث کتنی نازک ہی، اسلیے اس خار زار سے کسی آبلہ پا کا بسلامت گذر جانا کس قدر مشکل ہی، تاہم میں نے جد و جہد اسی کی کی ہی کہ کسی آبلہ کو ٹھیس لگے بغیر اس راستہ کو طے کر لوں، چلنے والا تو تھک کر چور ہی، اب دیکھنے والوں کو فیصلہ کرنا ہی کہ اس نے رہبری کی یہ شرط کہاں تک پوری کی

ارباب بصیرت جانتے ہیں کہ اسلامی فرقوں میں سے کسی فرقہ کے مطابق بھی اگر عقائد کی کتاب لکھی جاتی تو یہ منزل نہایت آسان تھی کہ ان میں سے ہر ایک کی مدون اور مرتب کتابیں سامنے ہیں، لیکن مجھے اس جلد میں کسی خاص فرقہ کے نہیں، اسلام کے وہ عقائد لکھنے تھے جن پر ایمان لانے کا قرآن نے ہم سے مطالبہ کیا ہے، اور جن کی تعلیم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو دی تھی، چنانچہ ان اوراق میں انہی چند عقائد کی تشریح ہے اور یہ وہی ہیں جو آمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تعالیٰ میں مذکور ہیں یعنی خدا، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں پر اور آخری دن اور تقدیر پر ایمان، چنانچہ اس جلد میں مقدمہ دیباچہ کے بعد ان ہی چھ باتوں کی تفصیل و تشریح ہے،

میں نے اپنے جانتے اس کی پوری احتیاط کی ہے کہ کسی مسئلہ کی تشریح میں قلم صراط مستقیم سے تجاوز نہ کرے لیکن عالم الغیب جانتا ہے کہ قدم نے کہاں ٹھوکر کھائی ہے، اسلئے اس کی بارگاہ میں نہایت عجز سے دعا ہے کہ خداوندا میری لغزش کو دوسروں کی لغزش کا سبب نہ بنانا، اور ہم سب کو سیدھی راہ دکھانا،

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ (اعراف ۲۳)	جس کو خدا راہ دکھائے وہ راہ پایا ہوا ہے،
وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ (زمر)	اور جسکو خدا راہ نہ دکھائے اسکو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں،
رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا (بقرہ)	ہمارے پروردگار ہماری بھول چوک کی باز پرس ہم سے نہ فرمانا،
این نامہ کہ خامہ کرد بنیاد	توقیع قبول، روزیش باد،

طالب رحمت

سلیمان ندوی

۲۵ ربیع الاول سنہ ۱۳۵۱ھ

(دار المصنفین اعظم گڈھ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

منصب نبوت

کتاب کا موضوع آپ کے پیغمبرانہ کارنامے

سیرت کی عام کتابوں میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے واقعاتِ زندگی کے اندر جو چیز سب سے زیادہ ممتاز ہو کر نظر آتی ہے وہ غزوات اور لڑائیاں ہیں لیکن یہ غزوات اور لڑائیاں ظاہر ہے کہ مقصود بالذات نہ تھیں، بلکہ وہ سلسلۂ دعوت میں اتفاقاً پیش آگئیں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عرب کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی، انھوں نے اُس کے قبول کرنے سے انکار کیا، اور نہ صرف انکار کیا، بلکہ اُس کے مٹانے کی پُرزور کوشش کی، اُس کے قبول کرنے والوں کو ستایا، انھیں کو اُن کے گھروں سے نکال دیا، وہ اپنی جان بچا کر دوسرے شہر کو چلے گئے، وہاں انکی دعوت نے فروغ پایا، اور بہت بڑی تعداد نے اُس کی سچائی کو قبول کیا، یہ دیکھکر مخالفوں نے ہر طرف سے یورش کی، اور

چاہا کہ اس جماعت کو بزورِ شمشیر مٹا دیں، اُس نے اپنی جان کے بچاؤ کی تدبیریں کیں، اور اُن کی پُرزور سازشوں اور کوششوں کے سیلاب کو پہاڑ بن کر روکا، اس کشمکش نے خونریز لڑائیوں کا ایک سلسلہ چھیڑ دیا جو متصل دس سال تک قائم رہا، رفتہ رفتہ اعجازِ نبوت، حسنِ تدبیر، لطفِ اخلاق سے تمام معرکے سر ہوئے، اور پھر ایک پُرامن نظام قائم ہوگیا، بے شبہ یہ کارنامہ بھی کچھ کم مستوجبِ منقبت نہیں لیکن ناظرین اس نکتہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوں گے کہ ہم کس (ذاتِ اقدسؐ) کے سوانح لکھ رہے ہیں، یہ جو کچھ ہوا اور پیش آیا، وہ گو نہایت عجیب، حیرت انگیز، اور کرشمۂ ربانی کا پورا مظہر ہے تاہم وہ درحقیقت آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اصلی براہ راست اور مقصود بالذات کارنامہ نہیں، وہ اتفاقی حوادث ہیں، جو اسلام کی دعوت و اشاعت کی راہ میں دشمنوں کی مخالفت سے پیش آگئے، آپ کے اصلی پیغمبرانہ کارنامے وہ ہیں جو اگر یہ اتفاقی واقعات رونما نہ ہوئے ہوتے، تب بھی ظاہر ہی ہوتے، اور وہی آپ کی سیرۂ مبارکہ کے اصلی وقائع اور سوانح ہیں، یعنی عرب میں سرتاپا روحانی و اخلاقی انقلاب پیدا کر دینا تمام عالم کے سامنے کامل ترین اور اخیر شریعت کو پیش کرنا، دنیا کے گوشہ گوشہ کو ترانۂ توحید اور سرور و محبت سے معمور کرنا، ظلمت کدۂ عالم کو سراجِ منیر بنکر تبعۂ نور بنا دینا، گمراہوں کو راستہ بتانا بھولوں کو یاد دلانا، بندوں کا رشتہ خدا سے جوڑنا، غلط اوہام کو مٹانا، اخلاقِ فاضلہ سکھانا، گناہوں کے دفتر کو دھونا، انسانوں کو شیطانوں کے دامِ فریب سے نکال کر فرشتوں کی صف میں کھڑا کرنا، دنیا کو رفق و محبت، لطف و شفقت اور برادرانہ مساوات کی تعلیم دینا، حکمت و دانائی، پند و موعظت، اور تہذیب و تمدن کے رموز سکھانا، روحانیت کی برباد شدہ دنیا کی دوبارہ تعمیر، اور قلوب و ارواح کے ویران گھروں کی ازسرِ نو آبادی، الغرض خاتم النبیینؐ کا اصلی کام ایک شریعتِ ابدی کی تاسیس، مذاہبِ عالم کی

اصلاح، فنِ اخلاق کی علمی و عملی تکمیل، قانونِ الٰہی کا اظہار و عرض اور تہذیبِ نفوس کی معراج اخیر تھی، اور یہ سب اُسی پُرآشوب زمانہ میں ہوتا رہا جس کے بیل و نہار بظاہر صرف حملوں کے تیرِ باراں کے روکنے میں صرف ہو گئے، پیشِ نظر جلد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ کے ان ہی واقعات اور کارناموں پر مشتمل ہے،

نبی اور مصلح اور حکیم | بظاہر نظر آتا ہے کہ اس قسم کے کچھ کام ایسے لوگوں سے بھی انجام پاتے ہیں جو نبوت اور رسالت کے منصب پر فائز نہیں ہوتے، وہ اپنی قوم و ملک کے سامنے اپنی اصلاح کی دعوت پیش کرتے ہیں، اور سعی و محنت اور متواتر جد و جہد سے اُن میں کوئی سیاسی، اجتماعی، تعلیمی، اقتصادی اور معاشرتی انقلاب پیدا کرتے ہیں، اور اُن کو قعرِ ذلت سے نکال کر ترقی کی سطحِ مرتفع تک پہنچا دیتے ہیں، ایسے لوگوں کو مُصلح اور ریفارمر کہتے ہیں، اور ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے منہ سے اخلاق و حکمت اور پند و موعظت کے موتی جھڑتے ہیں جن کو حکیم کہتے ہیں، اس حالت میں ایک پیغمبر اور ایک مصلح اور ایک حکیم میں کیا فرق ہوگا؟ اس التباس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے کوتہ نظر ایک پیغمبر اور ایک مصلح اور ایک حکیم میں کوئی امتیاز نہیں کرتے، اس بنا پر اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں، اس فرق و امتیاز کو نمایاں کر دینا ضروری سمجھتے ہیں،

نبوت کی حقیقت اور خصوصیات | اس فرق کو پوری طرح واضح کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے نبوت کی حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کر لیجائے، نبوت کی فلسفیانہ حقیقت کی بہترین تشریح امام غزالی نے معارج القدس[1] اور شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں کی ہے، یہ دونوں

[1] معارج القدس کا یہ حصہ حضرۃ الاستاذ مرحوم نے الکلام کے آخر میں بطور ضمیمہ شائع کر دیا ہے،

بزرگ تصوف، فلسفہ، اور نفسیات تینوں کوچوں سے باخبر ہیں، اس لئے یہ جو کچھ بتائیں گے، اس میں کچھ کچھ ذاتی ذوق ومشاہدہ کا حصہ بھی شامل ہوگا،

امام صاحب فرماتے ہیں، :-

"نبوت انسانیت کے رتبہ سے بالاتر ہے، جس طرح انسانیت حیوانیت سے بالا ہے، .... وہ عطیہ الٰہی اور موہبت ربانی ہے، سعی ومحنت اور کسب وتلاش سے نہیں ملتی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ (انعام-۱۵)	اللہ بہتر جانتا ہے کہ جہاں وہ اپنی پیامبری کا منصب بنائے،
وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا، مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰکِنْ جَعَلْنٰہُ نُوْرًا نَّھْدِیْ بِہٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا (شوریٰ-۵)	اور اسی طرح ہم نے تیرے پاس اپنے حکم سے ایک روح بھیجی تو پہلے نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے، اور ایمان کیا؟ لیکن اس کو ہم نے ایک نور بنایا ہے جس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں راہ

اس موقع کے لئے صریح آیت یہ ہے :-

ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ، (جمعہ-۱)	یہ (نبوت) خدا کا فضل ہے جس کو وہ چاہے دے،

لہ امام صاحب نے آیت پوری نہیں لکھی ہے، میں نے اپنی طرف سے آیت پوری لکھ دی ہے،

گو یہ صحیح ہے کہ وہ عبادات و ریاضات جو فکر و مراقبہ پر مشتمل، اور ریا اور شہرت طلبی سے پاک ہوں نفس میں آثار وحی کے قبول کرنے کی استعداد پیدا کر دیتے ہیں، تاہم نبوت کا منصب خاص محض اتفاقی نہیں، جو محنت اور کوشش سے کسی کو حاصل ہو جائے، بلکہ جس طرح نوع انسان کا انسان اور فرشتوں کا فرشتہ بن جانا ان کے افراد کی سعی و محنت کا مرہون منت نہیں اسی طرح نوع انبیاء کا نبی بن جانا، ان کے افراد کی کوشش اور محنت سے ممکن نہیں، ہر انسان کا بچہ اپنی ذاتی محنت سے نہیں، بلکہ فیاض عالم کی بخشش سے انسانیت کا مرتبہ حاصل کرتا ہے، مگر انسانیت کے ممکن کمالات کو بالفعل حاصل ہو جانے کے لئے اس کو یقیناً کچھ نہ کچھ جد و جہد کرنی پڑتی ہے، اسی طرح نبوت، نوع انبیا کے لئے اکتسابی چیز نہیں، لیکن منشائے نبوت کے مطابق ریاضت اور عمل، قبول وحی کی استعداد اور تیاری کے لئے البتہ ضروری ہیں،

چنانچہ اسی اصول کے مطابق اکثر پیغمبروں کے آغاز وحی کے حالات میں آپ کو یہ ملے گا، کہ انھوں نے ایک زمانہ تک عبادت و مراقبہ میں بسر کی، ایک ایک مہینہ، ایک ایک چلہ اس طرح گذارا کہ وہ مادی دنیا کی آلایشوں سے یکسر الگ ہو گئے، توراۃ میں حضرت موسیٰؑ کی نسبت ہے کہ کتاب ملنے سے پہلے وہ چالیس روز تک کوہ طور پر روزہ کی حالت میں رہے، اسی طرح انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے کہ وہ ایک سنسان جنگل میں چالیس روز تک روزہ رکھ کر عبادتوں میں مصروف رہے، اور وحی سے پہلے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا غار حرا میں مہینوں عزلت گزیں رہنا اور فکر و مراقبہ اور عبادت و ریاضت میں مصروف رہنا سب کو معلوم ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے حرا میں جا کر عبادت میں مشغول ہوئے تو دیا سے صادقہ

دیکھنے لگے، جس کی سچائی مثل سپیدۂ صبح کے صاف نمایاں ہوتی تھی، وحی کے بعد بھی آپ اس قدر عبادت میں مصروف رہتے تھے کہ آپ کے دونوں پاؤں سوج جاتے تھے، اسی لئے قرآن نے آپ کو خطاب کرکے کہا:-

طٰہٰ، مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓی، (طٰہٰ-۱)

(اے پیغمبر!) ہم نے یہ قرآن تجھ پر اس لئے نہیں اتارا کہ تو تکلیف اٹھائے،

اس عبادت وریاضت کے ساتھ، نبوّت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اُس کے حامل میں حسن صورت، اعتدالِ مزاج، نشو ونما کی پاکی، حُسن تربیت، طہارتِ نسب، کرم اخلاق، نیک طینتی، متانت، سنجیدگی، دوستانِ الٰہی کے ساتھ نرم خوئی اور تواضع اور دشمنانِ حق کے ساتھ شدتِ قوت پائی جائے، علاوہ بریں وہ راست گفتار، امانت دار، تمام برائیوں سے پاک، فضائل ومحاسن سے آراستہ، اور ذلیل باتوں سے مُبرّا ہوتا ہے، وہ ظلم کرنے والوں کو معاف، اور اپنے ساتھ بُرائی کرنے والوں کے ساتھ حُسنِ سلوک کرتا ہے، قرابت مندوں اور ہمسایوں کے ساتھ احسان، مظلوموں کی اعانت، فریاد خواہوں کی فریادرسی، اس کی طینت، اور نیکی سے محبت اور بدی سے نفرت اُسکی فطرت ہوتی ہے، اُس کی شان جیسا کہ قرآن نے بتایا ہے یہ ہوتی ہے کہ

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰی (نجم-۱) تمہارا ساتھی (پیغمبر) نہ گمراہ ہوا اور نہ بھٹکا،

اُس کی یہ صفت اس دنیاوی عالم میں ہے کہ وہ ہر گمراہی وبے راہ روی سے پاک ہوتا ہے،

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی (نجم-۱) اُس کی نگاہ نہ کج ہوئی اور نہ سرکش ہوئی،

یہ اس دنیا کے مناظر اور مشاہدات کے متعلق اُس کی کیفیت ہوتی ہے،

تمام دنیا کی قومیں اُس کی قوت کے سامنے بالآخر طوعاً و کرہاً سرنگوں ہو جاتی ہیں، با ایں ہمہ وہ مغرور، جابر، جفاپیشہ، بدخو، اور دُرشت مزاج نہیں ہوتا، وہ پیغمبری اور رسالت کے بارِ عظیم کو اٹھاتا ہے اور اس کا پورا حق ادا کرتا ہے، اور تمام عالم میں اپنی رحمت کا فیض جاری کرتا ہے،

نبوت و رسالت کے ثبوت کا اجمالی طریقہ

نبوت کے ثبوت کے دو طریقے ہیں، ایک اجمالی اور دوسرا تفصیلی، اجمالی طریقہ یہ ہے کہ جس طرح انسان کو حیوان پر نفسِ ناطقہ کی بنا پر فضیلت حاصل ہے کہ یہ عقلی و دماغی خصوصیت حیوان میں نہیں پائی جاتی جس کے بل پر انسان حیوان پر حکمرانی کرتا ہے اور اس کا مالک بنا ہوا ہے اور اُس کو اپنے کام میں لگائے ہوئے ہے، اسی طرح انبیاء علیہم السلام کو اپنے نفوسِ قدسیہ کی بنا پر تمام انسانوں پر برتری حاصل ہے، وہ اپنے ان قدسی نفوس و پیغمبرانہ قوت سے دوسروں کو راہِ راست سُوجھاتے، اور خود راہِ راست پر قائم رہتے ہیں، اُن کی پیغمبرانہ عقل و فہم تمام انسانی عقلوں سے بالاتر ہوتی ہے، اور اُن کو وہ ربانی خصوصیت حاصل ہوتی ہے جس کی بنا پر وہ تمام انسانی نفوس کی تدبیر کا فرض انجام دیتے، اور اُن پر قابو پاتے، اور اُن کو کام میں لگاتے ہیں، اور جس طرح انسانوں کے عجیب و غریب کام حیوانوں کو حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں اسی طرح پیغمبروں کے عجیب و غریب کام انسانوں کو معجزہ نظر آتے ہیں،

اور اگرچہ نبی عام انسانوں کے ساتھ بشریت اور انسانیت میں برابر کا شریک ہوتا ہے مگر عقلیت و معنویت میں وہ اُن سے بالکل الگ ہوتا ہے، کیونکہ اس میں وحی کے قبول کرنے کی جو صلاحیت ہوتی ہے، وہ دوسرے انسانوں میں نہیں ہوتی، اسی مفہوم کو قرآن نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے،

اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ، (کہف-۱۲)

میں تمھاری ہی طرح بشر ہوں، مجھ پر وحی کی جاتی ہے،

دیکھو کہ بشریت میں گو پیغمبر کو دوسرے انسانوں کے مثل کہا ہے، مگر ساتھ ہی وحی کے فرق وامتیاز کو دونوں میں حد فاصل قرار دیدیا ہے،

نبوت کے تفصیلی ثبوت کے تین طریقے ہیں:-

پہلا طریقہ ۔ انسان میں تین قسم کے اختیاری حرکات پائے جاتے ہیں، فکری، قولی، عملی، ان تینوں سے جو افعال صادر ہوتے ہیں، وہ اچھے بھی ہوتے ہیں، اور برے بھی، فکر یعنی رائے صحیح بھی ہوتی ہے، اور غلط بھی، قول سچ بھی ہوتا ہے، اور جھوٹ بھی، عمل اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی،

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحیح اور غلط، سچ اور جھوٹ، اور اچھے اور برے میں تمیز کیونکر ہو؟ پھر کیا یہ تمیز ہر شخص کر سکتا ہے، یا کوئی نہیں کر سکتا، یا بعض کر سکتے ہیں اور بعض نہیں، پہلے دو احتمال بداہۃً غلط ہیں، اب رہ گیا تیسرا احتمال، یعنی بعض انسان ایسے ہوتے ہیں جو ان حدود کو متعین کر سکتے ہیں، کہ فلاں رائے وعقیدہ صحیح اور فلاں غلط ہے، فلاں قول سچ ہے، فلاں جھوٹ ہے اور فلاں فعل اچھا، اور فلاں برا ہے، جس شخص کو خالقِ فطرت اپنے فضل وکرم سے یہ قوت عطا فرماتا ہے، وہی پیغمبر اور صاحبِ شریعت ہوتا ہے،

دوسرا طریقہ نوعِ انسان کو اپنے اختیاری اعمال وحرکات اور مصلحتی معاملات میں باہمی اجتماع اور تعاون کی ضرورت ہے، اگر انسانوں میں باہم یہ اجتماع اور تعاون نہ ہو تو نہ تو انسان کا کوئی فرد زندہ رہے، نہ جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت ہو سکے، اسی بقائے نفس اور جان ومال وآبرو

کے تحفظ کے اصول و آئین کا نام شریعت ہے، انسان کو اس کے لیے دو قسم کے کاموں کی ضرورت ہے ایک یہ کہ اچھے کاموں میں سب مل کر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں، اس کو تعاون کہتے ہیں، اور دوسرے یہ کہ بُرے کاموں سے ایک دوسرے کو باز رکھنے کی کوشش کریں اُسکو تمانع کہتے ہیں، اسی تعاون کے ذریعہ سے انسان، کھانے، پہننے، اور رہنے کے سامان و اسباب فراہم کرتا ہے تعاون کے ذریعہ نکاح و قرابت اولاد و اعزہ اور احباب و دوست کے حقوق و تعلقات پیدا ہوتے ہیں اور تمانع کے ذریعہ سے نوع انسانی، اور افرادِ انسانی کی زندگی، اور اُن کی دولت و جائداد، اور عزت و آبرو کے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے، اس تعاون اور تمانع کے اصول ضرور ہے کہ مرتب محدود، اور معلوم ہوں، اور وہ اس طرح بنائے جائیں جن میں کسی شخص، خاندان، قبیلہ، قوم، اور ملک کے فوائد کی ترجیح نہ ہو، بلکہ اُن میں سب کا برابر فائدہ ہو، یہ ظاہر ہے کہ ایسا قانون انسانوں کے ذریعہ نہیں، بلکہ وحیِ ربانی، اور تعلیم الٰہی سے بن سکتا ہے، مطلب یہ ہے کہ محض کسی انسان کی عقل سے جو بہر حال کوئی خاص شخص، یا کسی خاص خاندان قبیلہ، قوم اور ملک کا ہوگا، ایسا غیر جانبدارانہ قانون جس میں تمام مخلوقات کی حیثیت یکساں ہو، اور کسی طرف پلہ جھکنے نہ پائے، اور تمام عالم کے لیے یکساں واجب العمل ہو محال ہے، اس لئے ضرور ہے کہ یہ اصول اس کی طرف سے وحی ہوں، جس کے ہاتھ میں نظامِ عالم کی باگ ہے، اور جو پورے نوعِ انسانی کے اندرونی و بیرونی احوال و کیفیات کے رموز سے باخبر ہے، یہ اصول اخلاقِ عالم کی طرف سے جس شخص پر وحی ہوتے ہیں، وہی پیغمبر اور رسول ہوتا ہے،

تیسرا طریقہ یہ وہ طریقہ ہے کہ جس نے اُس کو نہیں جانا، اُس نے نبوت کی حقیقت نہیں پہچانی،

پہلے یہ جاننا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ دو کام ہیں، خلق (پیدا کرنا، نیست سے ہست کرنا) اور امر (جو موجود ہست ہے، اُس کو اپنی مصلحت کے مطابق حکم دینا) کائنات ان ہی دو چیزوں سے عبارت ہے تو جس طرح فرشتے خالق اور مخلوق، اور مخلوق کے درمیان خلق و ایجاد و پیدائش اور پیغام رسانی میں واسطہ ہیں، اسی طرح پیغمبر، خدا اور بندہ کے درمیان احکام کے پہنچانے میں واسطہ ہیں، اور جس طرح خدا پر بحیثیت خالق اور امر (پیدا کرنے والے اور حکم دینے والے) کے ایمان لانا واجب ہے اُسی طرح فرشتوں پر اس حیثیت سے کہ وہ خالق و مخلوق کے درمیان ایجاد و پیدائش اور پیغام رسانی کے واسطہ ہیں، ایمان لانا ضروری ہے، اور اسی طرح پیغمبروں پر اس حیثیت سے ایمان لانا فرض ہے کہ وہ خدا اور بندہ کے درمیان حکم کے پہنچانے میں واسطہ ہیں،

اس کے بعد حسب ذیل مقدمات ذہن نشین رکھنے چاہئیں،

۱۔ چونکہ ممکن کا وجود اور عدم برابر ہے، اس لئے ممکن ہے کہ وجود میں آنے کے لیے ایک مُرجح کا ہونا ضروری ہے، جس کی وجہ سے وجود کو عدم پر ترجیح ہو، اور وہ شئے عدم سے وجود میں آسکے، یہی امر مرجح ممکن کی علت ہوتا ہے،

۲۔ ہر قسم کے حرکات کے لئے ایک محرک کی ضرورت ہوتی ہے، جو دمبدم حرکت کی تجدید کرتا رہے، حرکات کی بھی دو قسمیں ہیں، طبعی اور ارادی، ارادی حرکت کے لیے ضرور ہے کہ اس کے محرک میں ارادہ اور اختیار پایا جائے، اسی طرح طبعی حرکت کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ اس کا محرک عقل اور تدبیر والا ہو، آفتاب و ماہتاب اور دوسری آسمانی مخلوقات کی حرکات گو طبعی ہیں، تاہم اُن کو حرکت دینے کے لیے کسی عاقل و مدبر کی ضرورت ہے، اسی لیے قرآن نے ان کے لیے کہا

وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَھَا، (حم السجدہ) خدا نے ہر آسمان میں اس کا فرض اور کام وحی کیا،

۳۔ اب جس طرح انسانی حرکات کو ارادہ اور اختیار کی حاجت ہے، یعنی ارادہ اور اختیار کے بغیر وہ وقوع میں نہیں آسکتیں اسی طرح ان حرکات کو ایسے رہنما کی ضرورت ہے، جو اُن اعمال و حرکات کا ٹھیک راستہ اور صحیح طریقہ بتائے، اور حق کو باطل سے سچ کو جھوٹ سے، اور خیر کو شر سے ممتاز کر دے،

۴۔ خدا کے حکم دو قسم کے ہیں، تدبیری اور تکلیفی، پہلا حکم تمام نظامِ عالم میں جاری ہے، جس کی بنا پر تمام عالم میں تدبیر اور انتظام کا سلسلہ نظر آتا ہے، قرآن مجید میں ہے،

وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِہٖ اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ، (اعراف - ۷) اور سورج اور چاند اور ستارے اس کے حکم کے تابعدار ہیں، اسی کا کام ہے بنانا اور حکم فرمانا،

تکلیفی حکم صرف انسان کے لیے ہے، چنانچہ قرآن میں ہے،

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ، (بقرہ ۲ - ۴) اے انسانو! اپنے اس رب کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا،

مقدماتِ مذکورۂ بالا سے ثابت ہوا کہ انسان کے تمام حرکات ممکن ہیں، اسی لیے مُرجح کی ضرورت ہے، اختیاری ہیں، اس لئے، عقل کی ضرورت ہے، خیر و شر کے محتمل ہیں، اس لیے رہنما کی ضرورت ہے، اسی رہنما کا نام پیغمبر ہے،

نظامِ عالم میں خدا کا جو تدبیری حکم نافذ ہے، وہ ملائکہ کے ذریعہ سے ہے، اسی قیاس پر انسانوں

میں خدا کا جو تکلیفی حکم نافذ ہے، وہ بھی ایسے ہی نفوسِ قدسیہ کے ذریعہ سے ہوگا، اور اُن ہی کا نام پیغمبر ہے،

شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ کے چھٹے مبحث کے دو ابتدائی بابوں میں اس پر بحث کی ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ کمال نکتہ سنجی سے کی ہے، شاہ صاحب کی تقریر کو ہم اپنے الفاظ میں لکھتے ہیں،

نبی کی ضرورت انسان میں دو قسم کی قوتیں ہیں، بہیمی اور ملکوتی، کھانا، پینا، شہوت، حرص وطمع، استیلا، وجبر وغیرہ افعال بہیمی قوت کے آثار ہیں، اور غور وفکر، علم ومعرفت، حسن اخلاق، صبر وشکر، عبادت وطاعت وغیرہ ملکوتیت کے نتائج ہیں، انسان کی روحانی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ اس کی بہیمی قوت، اس کی ملکوتی قوت کے تابع ہو، اگرچہ عقل سلیم اُن اصول اور طریقوں کو معلوم کر سکتی ہے جن کے ذریعہ سے بہیمیت کے تابع ملکوتیت ہونے کے فائدے اور گناہ وعصیان کے نقصانات ظاہر ہوں، عقل سلیم کے اس علم سے انسان فائدہ اٹھا کر اپنی اصلاح کر سکتا ہے، مگر یہ تو امکانِ عقلی ہے، عملی کیفیت یہ ہے کہ انسان کی آنکھوں پر موجودہ دنیاوی لذائذ، حرص وطمع، اور بیجا خواہشوں اور غفلتوں کے اتنے تو بر تو پردے پڑ جاتے ہیں کہ اُس کے اصلی اور فطری وجدان اور قوتِ احساس کا مادہ فاسد ہو جاتا ہے، جیسے بیماری میں انسان کی زبان کا ذائقہ جب بدل جاتا ہے، تو میٹھی سی میٹھی چیز اُس کو کڑوی معلوم ہوتی ہے اسی طرح اندرونی وجدان واحساس کے فاسد ہو جانے سے بھی وہ حق وباطل، خیر وشر، اور نیک وبد کی تمیز کو بھول جاتا ہے، اس لئے نوعِ انسان کو ایسے صحیح رہنماؤں اور روحانی معلموں کی ضرورت ہے، جن کے

احساس و وجدان کا آئینہ گرد آلودہ ہو،

اگر افراد، جماعات اور اہلِ ملک کو ایسے شخص کی ضرورت ہے، جو اپنی سیاست کے زور سے ان میں صلح و آشتی اور امن و امان پیدا کر دے، تو ایک قوم کی قوم بلکہ کل دنیا کے لیے ایک ایسے شخص کی ضرورت کیوں نہ ہو جو ہر گروہ کی استعداد کو پیش نظر رکھکر اُس کے مطابق اُس کے حقوق و فرائض کی تعیین کرے، ایسے لوگ جو ایسے اہم فریضہ کو انجام دے سکیں، اُسی طرح کم ہیں، جس طرح دوسرے اصناف کے اہلِ کمال، انسانوں کے معمولی پیشوں، بجاری اور لوہاری کو دیکھو کس قدر معمولی ہیں، مگر اُن کو کرنا بھی ہر شخص کا کام نہیں یہ پیشے بھی ایسے لوگوں کے بغیر وجود میں نہیں آئے، جن کو ان کاموں کا خاص ذوق و وجدان تھا، اور اُن کو ان کاموں کی خاص فطری استعداد ملی تھی جس کے ذریعہ سے انھوں نے اس فن کو تکمیل تک پہنچایا، اور اُس کے اصول و قواعد وضع کئے، اور بعد کے آنے والوں نے اُن کی تقلید کی، اور اس تقلید سے مدارجِ علیا تک پہونچے، پھر اخلاق اور روحانیات اور ملک و ملت کے مصالح و فوائد عامہ کا فن جس قدر اہم اور نازک ہے کیا اسکو سمجھنا، اور وضع کرنا ہر کس و ناکس کا کام ہو سکتا ہے،

نبی کی عصمت، پھر اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جو شخص اس رہنمائی کے منصب کا مدعی ہو، وہ اپنی نسبت یہ بھی ثابت کرے، کہ وہ ان اصول و قواعد سے بخوبی واقف ہے، اور وہ اپنے علم اور تعلیم میں غلطی اور گمراہی سے محفوظ ہے، اور یہ اُس وقت تک ممکن نہیں، جب تک اس کے علم اور تعلیم کا ماخذ اور سرچشمہ غلطیوں سے پاک اور محفوظ نہ ہو، اُس کو ان امور کا علم اسی طرح وجدانی ہو جس طرح انسان کو بھوک اور پیاس کا وجدان ہوتا ہے، کیا کسی کو اس علم میں کہ اُس کو بھوک یا پیاس

معلوم ہوتی ہے، کوئی غلطی ہو سکتی ہے، اسی طرح اس کو حق و باطل، خیر و شر، اور نیک و بد امور کے درمیان فیصلہ اسی طرح قطعی معلوم ہوتا ہے، جس میں دلیل کی حاجت ہوتی ہے اور نہ عقلِ معاش کی ضرورت ہوتی ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے اندر بھوک اور پیاس ہونے کا علم اس طرح رکھدیا ہے کہ ہمارے سامنے کوئی معاند کتنی ہی دلیلیں پیش کرے کہ ہم کو بھوک یا پیاس نہیں ہے، ہم کبھی اپنے اس وجدانی یقین سے جس کو خدا نے ہمارے اندر پیدا کر دیا ہے، اس معاند کے ان عقلی دلائل سے متاثر ہو کر دست بردار نہیں ہو سکتے، اور اپنے یقین کو غلط نہیں کہہ سکتے، بعینہٖ اسی طرح ان نفوسِ قدسیہ کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے خاص قسم کا وجدان و ذوقِ سلیم رکھدیا ہے، جس کا عمل ہمیشہ صحیح اور جس کا احساس ہمیشہ درست اور جس کا فیصلہ ہمیشہ ناطق ہوتا ہے،

نبی کی محبوبیت ایسا شخص جب لوگوں کے سامنے آتا ہے، اور لوگوں کو بار بار کے تجربہ سے اس کی صداقت، سچائی اور راست بازی کا یقین ہو جاتا ہے، اور اس کے ہاتھ سے جو تصرفات صادر ہوتے ہیں، اُن سے اُس کا مقرب بارگاہِ الٰہی ہونا بھی ظاہر ہو جاتا ہے تو ہر طرف سے لوگ اس کے ارد گرد جمع ہو جاتے ہیں، اور اُسکی محبت کی راہ میں جان و مال اور اہل و عیال سب کو قربان کر دیتے ہیں،

شاہ صاحب اس کے بعد دوسری فصل میں اسی بحثِ نبوت کو ایک اور انداز سے لکھتے ہیں، جس کا ماحصل یہ ہے،

مصلحین فضل و کمال، اور علم و عمل کے لحاظ سے انسانوں کے مختلف درجے ہیں، ان میں سب سے بڑا درجہ مفہمین کا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی قوتِ ملکیہ نہایت بلند ہے، اور جن میں یہ قدرت ہوتی ہے کہ سچے اور صحیح جذبہ سے ایک خاص نظام کو دنیا میں قائم کر دیں، اور ان پر بارگاہِ الٰہی سے ایسے

علوم اور احوال کا تاریخ ہوتا ہے، جن میں ربانی آثار نظر آتے ہیں، ایسے لوگ معتدل مزاج اور اپنی صورت و سیرت میں درست، اور عقل و ذکاوت میں متوسط ہوتے ہیں، نہ اس قدر بلید کہ جزئیات سے کلیات تک ان کا پہنچنا مشکل ہو، نہ اس قدر تیز کہ جزئیات اور محسوسات سے قطع نظر کر کے ہمیشہ ذہنیات اور تخیلات میں مبتلا رہیں، صحیح فطرت پر وہ قائم رہتے ہیں، طور و طریق اُن کے پسندیدہ ہوتے ہیں، خدا کے ساتھ اُن کا تعلق عبادت و طاعت سے، اور بندوں کے ساتھ عدل و انصاف سے قائم رہتا ہے، وہ اپنے فیصلوں میں شخصی اور جزئی بھلائی اور منفعت کا لحاظ نہیں کرتے، بلکہ منفعت عامہ اور تدبر کلی کا لحاظ کرتے ہیں، وہ براہ راست کسی کو تکلیف نہیں دیتے، الّا یہ کہ منفعتِ عامہ کا حصول اور بڑی تعداد کا فائدہ چھوٹے سے نقصان سے حاصل ہو تو وہ اس جزئی تکلیف اور شخصی نقصان کو گوارا کر لیتے ہیں، وہ ہمیشہ اپنے کاروبار میں عالم غیب کی طرف مائل رہتے ہیں، جس کا اثر اُن کی بات چیت، کام کاج اور معاملات میں نمایاں ہوتا ہے، کارکنانِ عالم اُن کی تائید و نصرت میں رہتے ہیں، معمولی ریاضت سے اُن کے لئے قرب و سکینت کے وہ دروازے کھل جاتے ہیں۔ جو دوسروں کے لیے نہیں کھلتے۔

مصلحین کے اقسام | مفہمین کے درجہ بدرجہ مختلف اصناف ہیں، اور اُن کی مختلف استعدادیں ہیں، اور اس بنا پر اُن میں سے ہر ایک کے الگ الگ اصلاحی نام ہیں، جو زیادہ تر عباد اکے ذریعہ سے تہذیبِ نفس کے علوم پاتا ہے، وہ کامل ہے، اور جو اخلاق فاضلہ اور تدبیر منزل کے اصول حاصل کرتا ہے، وہ حکیم ہے، جو عمومی تدبیر و سیاست کے علوم کا فیض پاتا ہے، اور اُن کے مطابق اس کو لوگوں میں عدل کے قیام اور ظلم کے دور کرنے کی توفیق ملتی ہے، وہ خلیفہ ہے اور جس کو ملاء اعلیٰ

کا نزول ہوا، اور وہ اس سے تعلیم پائے، اور اُس کو مخاطب کرے، اور مختلف قسم کے تصرفات اس سے صادر ہوں، وہ مؤید بروح القدس کہلاتا ہے، اور وہ جس کی زبان اور دل میں نور ہو کہ لوگ اُس کی صحبت اور پند و موعظت سے نفع اٹھائیں، اور وہ نور اس سے منتقل ہو کر اُسکے رفقاے خاص میں منتقل ہو، جس سے وہ بھی کمال کے درجہ تک پہنچ جائیں اس کا نام ہادی اور مزکّی رہا کرنیوالا ہے، اور جس کے علم کا بڑا حصہ ملت کے اصول و قواعد اور اس کی مصلحتوں کی واقفیت ہو اور ملت کے منہدم ارکان کو دوبارہ قائم کرنے کی طاقت ہو وہ امام کہا جائے گا، اور جس کے قلب میں یہ ڈالا جائے کہ وہ لوگوں کو اُن کی اس مصیبتِ عظمیٰ سے خبردار کرے جو اس دنیا میں اُن کے لئے ان کے اعمال کے نتیجے کے طور پر مقدر ہے، اور اُن کی بداعمالی کے سبب سے اُن سے حق تعالیٰ کی رحمت کو جو دوری ہے، یا قبر اور حشر میں اُن پر جو مصیبتیں آنے والی ہیں، اُس کا نام منذر (ڈرانے والا) ہشیار کرنے والا) ہے،

اور جب حکمتِ الٰہی کا یہ اقتضا ہوتا ہے کہ مخلوق کی ہدایت و اصلاح کے لیے ان مضمین میں سے کسی کو بھیجے تو اُس کی آمد مخلوق کے تاریکی سے نکل کر روشنی میں آنے کا سبب ہو جاتی ہے اور وہ بندوں پر یہ فرض قرار دیتا ہے کہ دل و جان سے اس کی اطاعت کریں، اور بارگاہِ الٰہی سے تاکید ہوتی ہے کہ جو اُس کی اطاعت کرے وہ اس سے خوشنودی، اور جو اُس سے مخالفت کرے، وہ اس سے ناخوشی ظاہر کرے، یہی شخص نبی ہوتا ہے،

نبی کی دو پیشین | نبیوں میں بڑا درجہ اس کا ہوتا ہے، جس کو اس پیغمبرانہ بعثت کیساتھ ایک اور بعثت ملتی ہے، اور وہ یہ کہ مرادِ الٰہی یہ ہوتی ہے کہ اس نبی کے ذریعہ سے اُس کی قوم اور اسکی قوم کے

ذریعہ سے دوسری قومیں ظلمت سے نکل کر نور میں آئیں تو اسی نبی کی ذاتی بعثت کا نام بعثتِ اولیٰ اور اسکی قوم کی دوسری قوموں کی ہدایت کے لئے نامزدگی بعثتِ ثانیہ ہے،

نبی کی پہلی بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے،

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا	وہی خدا جس نے ان پڑھوں میں ان ہی
مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ	میں سے ایک رسول بھیجا، جو ان کو اس کی
وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ	آیتیں سناتا، اور ان کو پاک بناتا، اور
(جمعہ-۱)	ان کو کتاب اور دانائی سکھاتا ہے،

اور دوسری بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے،

كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے
تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ	وجود میں لائی گئی، نیکی کا حکم دیتے ہو،
عَنِ الْمُنْكَرِ، (آل عمران-۱۲)	اور برائی سے باز رکھتے ہو،

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ بعثت ان کی امت کے لئے ہوئی ویسی ہی انکی امت کی بعثت دوسری قوموں کی طرف ہوئی

اللہ اسی معنی میں قرآن پاک کی یہ آیت بھی ہے،

لِیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْكُمْ	تاکہ رسول تم پر گواہ ہو، اور تم لوگوں
وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ،	گواہ ہو،

اسی لئے احادیث میں ہے کہ آپ نے صحابہ سے فرمایا، فَاِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُیَسِّرِیْنَ وَلَمْ

تُبَعَثُوْا مُعَسِّرِیْنَ "تم آسانی کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، سختی کرنے والے بنا کر نہیں"۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو انبیاء علیہم السلام آئے، وہ ان مختلف مذکورہ بالا مناصب میں
سے ایک یا دو منصب کے ساتھ مبعوث ہوئے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام منصبوں پر
ایک ساتھ سرفراز ہوئے، اور یہ تمام فنون آپ کی واحد ذات میں جمع کر دیئے گئے اور آپ کو
یہ دونوں نسبتیں بھی بکمالِ استحقاق عطا ہوئیں،

بعثت کے لئے کسی قوم کا انتخاب | یہ بھی واضح ہو کہ رسول کی بعثت کے لئے حکمتِ الٰہی کا اقتضاء
اس لئے ہوتا ہے کہ عالم کی عمومی تدبیر و نظم و نسق میں جو اضافی خیر مقدر ہے، وہ ان دونوں اسی
رسول کی بعثت میں منحصر ہوتا ہے، اور اس بعثت کے حقیقی سبب کا علم اسی دانائے غیب کو ہے،
مگر اتنی بات ہم قطعاً جانتے ہیں کہ کچھ اسباب ایسے ہیں جو بعثت کے ساتھ ضرور پائے جاتے
ہیں، اور امت پر اس رسول کی اطاعت اسی لئے فرض ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا کی تمام قوموں
سے جس قوم کی نسبت یہ جانتا ہے، کہ اس میں خدا کی اطاعت و پرستش کی استعداد اور اس
اللہ تعالیٰ کے فیضان اٹھانے کی صلاحیت زیادہ ہے، اس میں وہ رسول مبعوث ہوتا ہے، اور چونکہ
اس قوم کی اصلاح اسی پیغمبر کی پیروی اور اتباع میں منحصر ہوتی ہے، اسلئے بارگاہِ الٰہی کا یہ فیصلہ
ہوتا ہے، کہ اس کی اطاعت پر سب پر واجب کی جائے،

بعثت کا زمانہ | اس موقع پر چند باتیں اور قابلِ لحاظ ہیں، اگر یہ وقت وہ وقت ہوتا ہے کہ کوئی
نئی حکومت اس لئے قائم کیجائے تاکہ اس کے ذریعہ سے ان دوسری حکومتوں کو جو دنیا میں
فساد اور شر کا موجب بنی ہوئی ہیں، مٹا دیا جائے تو ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ اس شخص

کو بھیجتا ہے، جو پہلے اس قائم ہونے والی سلطنت کی قوم کی اصلاح کرے، اور اُس دین کو درست کرے، تاکہ اس کے ذریعہ سے دوسری قوموں کی اصلاح ہو، جس طرح سے ہمارے پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی زندگی کی بقاء اور اس کو اپنا برگزیدہ بنانا چاہتا ہے، تو اس میں وہ ایک ایسے شخص کو بھیجتا ہے، جو اس کی کجی کو دور کردے اور اُس کو کتابِ الٰہی کی تعلیم دیکر اُس کو اس کا مستحق بنادے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بنی اسرائیل میں بعثت ہوئی، یا کسی قوم کے متعلق قضاے الٰہی کا فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو مزید زندگی ملتی رہے، اور اس کا دین وسلطنت برقرار رہے، تو مجددین نبوت پیدا ہوتے ہیں، جیسے بنی اسرائیل کے مختلف زمانوں میں حضرت داؤدؑ و حضرت سلیمانؑ اور پیغمبروں کے ایک گروہ کی بعثت ہوتی رہی،

بنی کی یقینی کامیابی ہر نبی کی بعثت کے دور میں اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اُسکو اور اُس کے دوستوں کو کامیابی اور اُس کے دشمنوں کو پے در پے ناکامی ہو، (یہانتک کہ حق استوار اور دعوت مکمل ہوجائے) قرآن پاک میں ہے،

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا	اور ہماری بات اے پیغمبر بندوں کے
الْمُرْسَلِيْنَ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ	متعلق پہلے ہی طے ہوچکی ہے کہ انہی کی مدد
وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ (وَلَقَدْ سَبَقَتْ)	جائیگی اور ہمارا ہی لشکر غالب ہوگا،

ان دونوں بزرگوں (امام غزالی اور شاہ ولی اللہ صاحب) نے اپنے اپنے الفاظ میں جو کچھ کہا ہے، وہ حرف بحرف صحیح ہے، انبیاے کرام علیہم السلام کے احوالِ مبارکہ، اور سوانح مقدسہ

پر جس کی نظر عمیق و وسیع ہوگی، اس کو ان اصول کے تسلیم کرنے میں ذرہ بھر شک نہیں ہو سکتا، اور ان پر استدلال، واقعات اور حوادث سے اسی طرح کیا جا سکتا ہے، جس طرح نفسیاتِ اجتماع (سائیکالوجی) یا نفسیاتِ رہنمائی (سائیکالوجی آف لیڈرشپ) پر واقعات کے تسلسل اور تواتر سے کرتے ہیں، اس طرح امام غزالی اور شاہ ولی اللہ صاحب نے اوپر کے صفحات میں جو کچھ کہا ہے، ہم مجازاً کہہ سکتے ہیں کہ وہ "نفسیاتِ نبوت" کے گویا ابواب ہیں،

موجودہ زمانہ میں خیالات، طرزِ گفتار، اسلوب تحریر، اور طریقۂ استدلال، غرض ہر چیز میں فرق ہو گیا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اہلِ زمانہ سے ان کی اصطلاح میں گفتگو کیجائے، اور جو اصول قائم کیا جائے، اس پر قرآن مجید سے بھی ساتھ ساتھ استدلال کیا جائے کہ عقل و نقل دونوں دربار وں میں کہنے والے کی بات کا اعتبار ہو،

غور کرنے سے یہ معلوم ہوگا کہ دنیا کا ذرہ ذرہ جس غرض و مقصد کے لئے پیدا ہوا ہے، وہ اپنے ذاتی ارادہ اور قصد کے بغیر خود بخود اس کو پورا کر رہا ہے، اور اسکے خالق نے اسکے روز پیدائش سے اسکو جو حکم دیدیا ہے، اسکی تعمیل سے وہ سرمو انحراف نہیں کرتا، آسمان سے لیکر زمین تک ہر چیز اپنے اپنے کام میں لگی ہوئی ہے، آفتاب دنیا کو گرمی اور روشنی دینے پر مامور ہے اور وہ ہر آن اور ہر لمحہ اس میں مصروف ہے، زمین کو سرسبزی اور شادابی کا کام سپرد ہے، اور وہ اسکو انجام دے رہی ہے، ابر کو سیرابی اور گوہر باری کا حکم ہے، اور وہ اسکی تعمیل کر رہا ہے، درخت پھل دینے پر مقرر ہیں، اور وہ اس کام میں لگے ہوئے ہیں، حیوانات جن کاموں پر مامور ہیں، وہ بخوشی اُن کر رہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا انسان بھی اس دنیا میں کسی کام پر اسی طرح مقرر ہو کر آیا ہے یا نہیں؟ اگر آیا ہے تو کیا اسکو انجام دے رہا ہے؟

آؤ انسان کو غور سے دیکھیں، بظاہر وہ بھی کھاتا، پیتا، چلتا پھرتا، اٹھتا بیٹھتا زندگی گذارتا ہے، اور پھر مرجاتا ہے کیا اس کی زندگی کا بس اسی قدر مقصد ہے، اگر یہی ہے تو پھر انسان اور حیوان میں کیا پہچان اور ذی ارادہ اور غیر ذی ارادہ میں کیا امتیاز؟ اور صاحب عقل اور بے عقل میں کیا فرق؟ چنانچہ قرآن پاک اسی لئے انسانوں سے سوال کرتا ہے، اور بجا سوال کرتا ہے،

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا (مومنون)	کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تمکو بیکار پیدا کیا
اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى (قیامہ)	کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ وہ بیکار چھوڑ دیا جائیگا

اس سے معلوم ہوا کہ وہ بھی کسی غرض و مقصد کیلئے پیدا ہوا ہے، لیکن وہ غرض و مقصد کیا ہے؟

انسان کی پوری ہستی اگر کائنات کے صفحہ سے مٹ جائے، تو بھی آفتاب اسی طرح چمکتا رہیگا، سمندر اسی طرح اُبلتے رہیں گے، ہوائیں اسی طرح چلتی رہیں گی، پانی اسی طرح برستا رہیگا، سبزے اسی طرح اُگتے رہیں گے، اور درخت اسی طرح پھلتے رہیں گے، لیکن اگر درخت نہ پھلیں تو انسان کی ہستی معرضِ خطر میں پڑ جائے، سبزیاں نہ اُگیں، تو انسان بھوکا مر جائے پانی نہ برسے تو انسان پیاسا تڑپ جائے اگر ہوا نہ ملے تو انسان گھٹ کر مر جائے، اگر زمین نہ ہو تو انسان کو کھڑے ہونے کی جگہ نہ ملے، اگر آفتاب نہ چمکے تو انسان کی ہستی کا چراغ فوراً بجھ جائے، سمندر نہ ہو تو نہ پانی برسے نہ سبزیاں اگیں، نہ انسانی غذا میسر آئے، نہ پانی برس کر پھر زمین کو خشک ہونا نصیب ہو، الغرض دنیا کی کوئی ہستی اپنے وجود کے لئے انسان کی محتاج نہیں، لیکن انسان اپنے وجود کے لئے کارخانۂ ہستی کے ایک ایک پرزے کا حاجتمند ہے، تو پھر کیا یہ نتیجہ صحیح نہیں کہ اس کارخانہ کے ہر ریزہ کی غرض و غایت انسان کا وجود اور اس کی بقا ہے، لیکن خود انسان کے وجود کی غرض کوئی دوسری ہے؟

جو دیگر موجودات کے وجود کی غرض سے زیادہ اہم ہے،

قرآن پاک دوسرے موجودات و مخلوقات کی نسبت تو یہ کہتا ہے،

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا، (بقر ۱۔۳)

اُسی نے تمہارے لئے (اے انسانو!) وہ سب پیدا کیا، جو زمین میں ہے،

پھر یہ بھی بتایا،

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ، (حج ۔۹)

(اے انسان) کیا تو غور نہیں کرتا کہ زمین میں جو کچھ ہے، اسکو تمہارے کام میں اس نے لگا رکھا ہے،

زمین کے بعد آسمان کی نسبت بھی اُس نے اعلان کیا،

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ (نحل ۔۲)

اور (اے انسانو!) اس نے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو تمہارے کام میں لگایا ہے، اور ستارے بھی اسکے حکم سے کام میں لگے ہیں،

ہستیاں دو ہی ہیں، خالق کی اور اُسکی مخلوقات کی، مخلوقات کے حالات پر غور کرنے سے نظر آتا ہے کہ اُن میں ہر ادنیٰ چیز اپنے سے اعلیٰ چیز کے کام آرہی ہے، جمادات نباتات کے، نباتات حیوانات کے، اور جمادات اور نباتات اور حیوانات، تینوں انسان کے کام آرہے ہیں، آخر انسان کو بھی اپنے سے کسی اعلیٰ ہستی کے کام آنا چاہئے، مخلوقات میں تو اب اس سے کوئی اعلیٰ ہستی نہیں، تو لامحالہ اُسکی تخلیق خود خالق کے لئے ہوئی ہے،

الغرض دنیا کی ساری چیزوں کی غرض و غایت بواسطہ یا بلاواسطہ انسانوں کی بقا

زندگی اور آسائش ہو، لیکن خود انسان کی زندگی اس کے لئے نہیں بلکہ خدا کیلئے ہو، جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (ذاریات ۳۰)

اور میں نے جن اور انسان کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری اطاعت کریں،

عقل و فہم اور ارادہ و اختیار کے لحاظ سے مخلوقات کی تین قسمیں ہیں،

۱۔ ایک وہ جو ان صفات سے یکسر محروم ہیں، آفتاب، ماہتاب، زمین، مٹی، پتھر، پھل، پھول، درخت،

۲۔ دوسری وہ صرف ابتدائی احساس اور علم و فہم رکھتی ہیں، لیکن قیاس و استقرار، تمثیل اور حاضر پر غائب کو قیاس کر کے کسی نئے علم کا استخراج کرنا اُن کی قدرت سے باہر ہے، اُنکا ارادہ و اختیار بھی صرف ظاہری محسوس اشیاء تک محدود ہے، جیسے حیوانات،

۳۔ تیسری وہ مخلوق ہے، جو عقل و ادراک رکھتی ہے، قیاس آرائی کرتی ہے، استقرار و تمثیل کے ذریعہ سے استنباط کرتی ہے، جزئیات سے کلیات بناتی اور کلیات سے جزئیات پر حکم لگاتی ہے، بدیہیات سے نظریات تک پہنچتی، اور غائب کو حاضر پر قیاس کرتی ہے،

پہلی قسم کی مخلوقات سے جو حرکات اور آثار پیدا ہوتے ہیں وہ اضطراری اور غیر ارادی ہوتے ہیں، اور کبھی اُن میں تخلف نہیں ہوتا، اسی لئے اُن کو فطری آثار اور طبعی خصائص کہتے ہیں، جن کا صدور ان مخلوقات سے ہمیشہ یکساں اور بلا ارادہ ہوتا رہتا ہے، دوسری قسم کی مخلوقات سے جو آثار و حرکات پیدا ہوتے رہتے ہیں، وہ گو ارادہ اور احساس اور ابتدائی فہم کے ماتحت صادر ہوتے ہیں لیکن اُن کے ہر فرد سے صرف ایک ہی قسم کے افعال، حرکات

اور آثار یکساں طور سے ظاہر ہوتے ہیں، اُن کے خلاف نہیں ہو سکتا، اور نہ ایک دوسرے سے کم و بیش ہو سکتا ہے، اُن کے ان افعال، حرکات اور آثار کو جبلت، فطرت اور طبیعت کہتے ہیں، اُن کے صدور میں بھی وہ مخلوقات اپنی فطرت اور طبیعت کے تقاضے سے مجبور ہیں، جیسے حیوانات کے افعال، اور اُن کے مختلف انواع کے الگ الگ نوعی کام کہ وہ ازل سے قیامت تک یکساں ایک ہی طرح، اور وہ بھی کسی غایت اور انجام و مآل کے پہلے سے سوچے بغیر اُن سے صادر ہوتے ہیں،

تیسری مخلوق کے بعض افعال گو طبیعت و جبلت کے مطابق ہوتے ہیں، جو دیگر مخلوقات کی طرح ویسے ہی بے ارادہ اور اضطراراً سرزد ہوتے ہیں، مگر اس کے اور دوسرے افعال و حرکات تمامتر اُس کے ارادہ، اختیار اور فہم سے صادر ہوتے ہیں، صرف یہی آخری قسم کے افعال وہ ہیں، جن پر خیر و شر اور نیک و بد کا حکم جاری ہوتا ہے، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے تمام عاقلانہ کام، عاقبت بینی، انجام، اور مآلِ کار کو خیال کر کے اُس کے ارادہ سے صادر ہوتے ہوتے ہیں، اور یہی سے اُسکی ذمہ داری کا سوال پیدا ہو جاتا ہے،

جن دانس کے علاوہ تمام دوسری مخلوقات خیر و شر کی ذمہ داری سے بری ہیں، جمادات و نباتات تو اس لئے کہ ان کے افعال و حرکات تمامتر مجبورانہ، بے ارادہ اور فکر انجام کے بغیر صادر ہوتے ہیں، یا یوں کہنا کہ اُن احکام کے بموجب ہمیشہ ہوتے ہیں، جو خدا نے انکو اوّل ہی دیدیئے ہیں، حیوانات بھی اسلئے اس ذمہ داری سے بری ہیں کہ اُنکے افعال و حرکات بھی تمامتر جبلی و طبعی ہیں، اور وہ جبلت و طبیعت پر مجبورانہ بے ارادہ اور انجام کے خیال

کے بغیر عامل ہیں، یا یوں کہو کہ وہ اپنے خالق کے احکام پر ہمیشہ اضطراراً عمل پیرا ہیں اسی طرح فرشتے بھی اس تکلیف سے سبکدوش ہیں، کیونکہ وہ بھی اپنی خلقت اور جبلت سے اطاعت پر مجبور ہیں، اور اسی لئے ان سے عصیان نہیں سرزد ہوتا، صرف ایک انسان ایسی مخلوق ہے، جو بہت سی باتوں میں ارادہ اختیار اور علم رکھتا ہے، نیکی، بدی، اور خیر و شر ان دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک کے اختیار پر قطعی مجبور نہیں ہے، بلکہ وہ عقل و فہم سے سوچ سمجھ کر، مآل کار اور انجام پر غور کر کے یا اپنے جذبات کے تحت کوئی کام کرتا ہے، اسلئے وہی خیر و شر کے امتیاز اور حق و باطل کے فرق کے لئے پیغام الٰہی کا محتاج قرار پایا،

جمادات و نباتات، اور دیگر مخلوقات سے احکام الٰہی کی مجبورانہ اطاعت یعنی جبلت یا فطرت یا خاصیت کو قرآن پاک یوں ادا کرتا ہے،

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي	اور خدا ہی کے آگے سر جھکاتے ہیں جو آسمانوں
الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ	میں ہے، اور جو زمین میں ہے جاندار وں میں سے اور
لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ	فرشتے وہ سرکشی نہیں کرتے اپنے پروردگار
فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (نحل ۶)	کا اوپر سے ڈر رکھتے ہیں اور کرتے ہیں، جو حکم

اسی فطری اطاعت الٰہی کا دوسرا نام فطری وحی بھی رکھ لو، جیسا کہ قرآن میں ہے،

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ	اور تیرے پروردگار نے شہد کی مکھیوں پر وحی بھیجی کہ
مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا	پہاڑوں میں اور درختوں میں اور جہاں چھت ڈالتے
يَعْرِشُوْنَ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ	ہیں اپنے لئے گھر بنا لے، پھر ہر پھل میں سے کھا،

فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا (نحل-۹) پھر اپنے پروردگار کی راہوں پر دمقررہ احکام پر چل مطیع ہو کر

دیکھو اس آیت پاک میں طبعی الہام کی مجبورانہ پیروی کو اطاعتِ الٰہی کہا گیا ہے اور دوسری جگہ اُن کی اپنے خالق اور پیدا کرنے والے کے حکم کی اسی طبعی اطاعت اور فطری تعمیل کو انکی زبان حال کی تسبیح اور تسبیح فرمایا گیا ہے،

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ط كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِمَا يَفْعَلُوْنَ (نور-۶)

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ آسمان زمین میں جو کوئی ہے وہ اڑتے جانور پر کھولے اسکی یاد کرتے ہیں، ہر ایک نے جان رکھی ہے اپنی طرح کی نماز اور اسکی پاکی کی یاد اور خدا کو معلوم ہے جو وہ

لیکن انسان کو دوسرے موجودات و مخلوقات کی طرح مجبور محض نہیں پیدا کیا گیا ہے بلکہ جیسا کہ بتایا جا چکا، وہ احساس اور ارادہ جو جمادات میں معدوم، نباتات میں محلِ بحث اور حیوانات میں متحرک ہے، انسان میں پوری طرح بیدار اور کارفرما ہے، اسی طرح وہ ارادی قدرت و اختیار جو جمادات میں معدوم، نباتات میں مفقود، اور حیوانات میں محدود ہے انسان میں ایک حد تک وسیع ہے، علاوہ ازیں ہر کام میں عاقبت بینی، اور مآل اندیشی صرف انسان کا خاصہ ہے، اسی لئے تمام مخلوقات میں وہی "ارادی تکلیف" کا مستحق قرار پایا اور غیر ذی ارادہ مخلوقات کی طرح بالاضطرار اور مجبورانہ اطاعتِ الٰہی کے لئے نہیں، بلکہ بالارادہ اطاعت کے لئے اسکی تخلیق ہوئی، فرمایا،

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ

ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور

وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا — پہاڑوں پر پیش کی، تو انھوں نے انکار کیا، اور

وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ (احزاب ۹) اس سے ڈرے اور انسان نے اسکو اٹھا لیا،

یہ امانت، اُس کی نیکی و بدی کی تمیز اور خیر و شر کا فرق ہے، جس کے نتیجہ کے طور پر شریعت الٰہی کا نزول ہوا ہے، انسان کو اپنی اس امانت سے عہدہ برآ ہونے کے لئے با ارادہ اور با اختیار افعال میں بھی بے ارادہ اور بے اختیارانہ افعال کی طرح احکام الٰہی کی اطاعت کرنا ضروری ہے، یعنی جس طرح بے اختیارانہ افعال میں فطرت و جبلت کی مجبورانہ اطاعت کرکے حکم الٰہی کی تعمیل کیجاتی ہے، اسی طرح با ارادہ اور اختیاری افعال میں بھی شریعت کی با ارادہ اطاعت کرکے حکم الٰہی کی تعمیل ضروری ہے،

اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں ادا کرسکتے ہیں، کہ غیر ارادی افعال و حرکات میں جس طرح ہم اپنے فطری الہام و وحی کی مجبورانہ پیروی کرتے ہیں، اسی طرح ارادی افعال میں بھی شرعی الہام و وحی کی با ارادہ پیروی کریں،

لیکن کسی کی اطاعت اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک اسکے احکام و اوامر سے ہم کو واقفیت نہ ہو، انبیاء و رسول وہی ہیں، جن پر اللہ تعالیٰ اپنے ان احکام اور اوامر کی شریعت کو وحی کرتا ہے، اور وہ ان ذی ارادہ بندوں کو اس سے آگاہ و باخبر کرتے اور اُنکی اطاعت کی دعوت دیتے ہیں،

یہ نکتہ کہ انسان کے علاوہ تمام دیگر بے ارادہ مخلوقات خدا کی اطاعت پر طبعاً مجبور اور مجبول ہیں اور کسی قدر با اختیار انسان کے افراد اپنے اُسی تھوڑے سے اختیار اور ارادہ کے بل پر اپنے خالق سے سرکشی کرنے پر آمادہ ہیں، خود قرآن پاک کے الفاظ میں موجود ہے، فرمایا،

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي	کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ ہی کے آگے سر جھکاتا
السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ	ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور سورج
وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَ	اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور
الدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ	جانور اور بہت سے انسان اور بہت سے (انسان)
حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ (حج - ۲)	ہیں جن پر عذاب ٹھہر چکا،

دیکھو کہ انسان کے علاوہ تمام دوسری بے ارادہ اور بے عقل مخلوقات کی کلی اطاعت اور سرافگندگی کا اعلان ہے، لیکن خاص با ارادہ اور با عقل اور انجام بیں، انسانوں کی دو قسمیں کر دی گئیں، مطیع اور سرکش،

کائنات کے صحیفۂ کا تدریجی مطالعہ کرو تو معلوم ہوگا کہ جمادات، نباتات، حیوانات، اور انسان میں سے جس صنفِ مخلوقات میں احساس، ارادہ، اور اختیار کی جتنی کمی ہے، اسی قدر فطرت اس کی دایہ گری کی خدمات زیادہ انجام دیتی ہے، اور جس حد تک احساس اور اختیار کا دائرہ اصنافِ ہستی میں بڑھتا جاتا ہے، اسی قدر معلّم فطرت اپنے فرائض سے کنارہ کش ہوتا جاتا ہے اور وہ صنفِ کائنات اپنی ذمہ داری آپ قبول کرتی جاتی ہے، جمادات اپنی نشو و نما کیلئے بیرونی غذا کے محتاج نہیں، نباتات جن میں ان اوصاف کی ہستی صرف آنکھیں کھولتی ہے، اُن کی غذا خود اُن کے پاؤں کے نیچے ہوتی ہے، اور وہ خود اڑ کر اور چل کر اُن تک پہنچ جاتی ہے، حیوانات جن میں یہ اوصاف جاگ کر کروٹیں بدلتے ہیں، اُن کی غذا بے جوتے بے بوئے، بے چنے نکھارے بن پکے پکائے، ہر قدم پر ہر وقت تیار ملتی ہے، لیکن انسان جس میں یہ تینوں اوصاف بیٹھ کر حکمراں اور

کارفرما ہوتے ہیں، اس کے منہ تک غذا کا ایک دانہ بھی اُس وقت تک نہیں پہنچ سکتا، جبتک اُسکی جدوجہد محنت و جانفشانی کے پسینہ کا گرم قطرہ پیشانی سے چل کر اسکے پاؤں تک نہیں پہنچتا،

جہاں احساس، ارادہ اور اختیار جیسے جیسے کم ہے، اُسی قدر طبیعت، فطرت اور جبلت کی اضطراری حکومت زیادہ قائم ہے، لیکن جیسے جیسے ان تینوں اوصاف کی ترقی و تکمیل ہوتی جاتی ہے طبیعت فطرت اور جبلت کی حکومت کا دائرہ تنگ ہوکر، احساس، ارادہ، اور اختیار کی شہنشاہی قائم ہوتی جاتی ہے، اور حرکات و اعمال کی باگ، فطرت و جبلت کے مضبوط، اور ناممکن التغیر ہاتھوں سے نکل کر اختیار و ارادہ کے کمزور اور ہر آن بدل جانے والے ہاتھوں میں آجاتی ہے، جمادات ہمیشہ وہی کریں گے، جو ان کو کرنا چاہیئے، نباتات عموماً وہی بنیں گے، جو ان کو بننا چاہیئے، حیوانات وہی کام انجام دیں گے جو اُن کے سپرد کر دیا گیا ہے، لیکن انسان کسی قدر اختیار اور ارادہ پاکر اکثر اپنی راہ سے ہٹ جاتا ہے، اور حدودِ اعتدال سے قدم باہر نکال دیتا ہے، اور اپنے اس اختیار و ارادہ کی ذمہ داری کی امانت کو بھول جاتا ہے، انبیاءؑ اور رسول وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس ذی ارادہ اور با اختیار مخلوق کو اُسکی اس ذمہ داری کے فرائض سمجھانے کے لئے آتے ہیں،

اس اختیار و ارادہ کے مرکز کا نام مذاہب کی زبان میں "دل" ہے جو انسان کے سر سے لیکر پاؤں تک کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ کی ایک ایک جنبش و حرکت پر حکمراں ہے، اور اُسی کے حکم سے اس جسم کے اندرونی عالم میں سب کچھ ہوتا اور سرانجام پاتا ہے، انبیاءؑ اسی دل کے نظام کو درست کرنے کے لئے آتے ہیں،

انسان کو اپنے وجود، بقاء، ترقی اور تکمیل کی ہر منزل میں قدم قدم پر ہزاروں چیزوں کی احتیاج

ہوتی ہے، ان چیزوں کے مہیا اور تیار کرنے کے لئے ہر انسان میں استعداد و قوت الگ الگ ہوتی ہے اور یہ استعداد و قوت فیاضِ قدرت کی طرف سے پیدائش بلکہ پیدائش سے پہلے ہی آب و گل کے عالم میں اس میں ودیعت رکھی جاتی ہے، یہی سبب ہے کہ ہر انسان میں جس قسم کا میلان ہوتا ہے، اسی کی استعداد اس میں پائی جاتی ہے، اور پھر بعد کو خاص خاص فنی الہامات کے ذریعہ سے جن کو تم ایجادات و اختراعات کہتے ہو، ہر پیشہ ور اپنے متعلقہ کام کو بڑھاتا اور ترقی دیتا ہے، اور تمہاری ضرورت کے مطابق تمہارے لئے سامان فراہم کرتا ہے،

ان مادی ضروریات کے بنانے والوں کی حسبِ استعداد و حسبِ حیثیت مختلف درجے اور مرتبے ہیں، بعض ان میں سے محض مقلد ہوتے ہیں، جو وہی بنا سکتے ہیں، جو بنانا سیکھا ہے، بعض چابکدست اور ذہین ہوتے ہیں، جو اچھے کاریگروں کے صرف نمونوں کو دیکھ کر اچھی چیزیں تیار کر سکتے ہیں، بعض ایسے ذہین اور فطین ہوتے ہیں کہ وہ نئی نئی چیزیں بناتے، دریافت کرتے اور ایجاد کرتے ہیں، اور بعد کے آنے والے مدت تک ان ہی کی تقلید کرتے رہتے ہیں، کاشتکاری کے اصول، ازالۂ مرض کی تدبیریں، کھانے پکانے کے طریقے، سواری کے ضروریات، رہنے سہنے کے سامان، پہننے کے کپڑے، لڑنے کے آلات، اُن میں سے ہر شے کی ضرورت ہے، اور ان میں ہر ضرورت کے لئے خالقِ فطرت نے ایک ایک گروہ پیدا کر دیا ہے، اور وہ اپنے اپنے کام انجام دیتا رہتا ہے، ان ضرورتوں کے فراہم ہو جانے سے انسان کی مادی زندگی کی تکمیل ہو جاتی ہے، اب اس کے بعد اُس کی روحانی اور اخلاقی زندگی کے ضروریات کا جن کو تم اصولِ تمدن، طریقۂ معاشرت، آئین عدل و انصاف، اخلاقِ حسنہ اور دین و تقویٰ کے نام سے موسوم کرتے ہو، اور شروع ہوتا ہے

اگر یہ اصول اور تعلیمات انسانوں کے سامنے نہ ہوں تو آدم کے بیٹوں کی یہ جنت دوزخ ہو جائے اور اشرف المخلوقات کی یہ جماعت جانوروں کا گلہ اور درندوں کا غول بن جائے،

جو تمھارے لئے غلہ پیدا کرتا ہے، وہ کاشتکار ہے، جو اوزار بناتا ہے، وہ لوہار ہے، جو زیور گھڑتا ہے وہ سونار ہے، جو تمھارے لئے کپڑے بنتا ہے وہ بُنکر ہے، جو تمھارے مکان بناتا ہے وہ معمار ہے، جو تمھاری حفاظت کرتا ہے، وہ سپاہی ہے، جو تمھاری نگہبانی کرتا ہے، وہ حاکم ہے، جو تمھارے آپس کے جھگڑے چکاتا ہے، وہ قاضی ہے، جو تمھارے ملک کے اندر امن و امان کا ضامن ہے وہ بادشاہ ہے، جو تمھاری جسمانی بیماریوں کا معالج ہے، وہ طبیب ہے، جو اپنی صناعیوں سے تمھاری ضرورتوں کے لئے کاریگری کی چیزیں بناتا ہے، وہ صناع ہے، اور جو تمھارے لئے مادی کائنات کے چہرے سے اسرار کا پردہ ہٹا کر تمکو ہر چیز سے باخبر کرتا ہے، وہ حکیم ہے،

اسی طرح جو برگزیدہ افراد تمھارے روحانی و اخلاقی و اجتماعی حالات کے معلم و نگراں ہیں، ان کی بھی ایک جماعت ہے، لیکن جس طرح تمھارے مادی ضروریات کے بنانے والوں کے حسب استعداد اور حسب حیثیت درجے ہیں، اسی طرح ان روحانی ضروریات کے فراہم کرنے والوں میں بھی مرتبے اور درجے ہیں، بعض وہ ہیں جو صرف اگلے روحانی معلمین کی نقل و تقلید کرتے ہیں، یہ عام علماء ہیں، بعض وہ ہیں، جو اچھے روحانی نمونوں کو دیکھ کر خود بھی اُن کی عمدہ نقل اُتارتے ہیں، اور دوسروں کو بھی بتاتے ہیں، یہ مجددین ہیں، بعض ایسے ہیں جو الہام ربانی سے فیض پاکر روحانیت کے نئے نئے اصول وضع کرتے اور دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں، یہ انبیاء ہیں، ان کے مقدس ہاتھ تمھارے لئے غلہ پیدا کرنے، مکان بنانے، کپڑا بننے، اوزار بنانے اور صناعی

کرنے کے لئے نہیں بلکہ اُن سے بدرجہا بلند تر اور بہتر کام کے لئے ہیں، اُن کی مبارک انگلیاں تمہارے اُن تاروں پر پڑتی ہیں جن سے یہ صدہا قسم کے نغمے نکل رہے ہیں، یعنی تمہارے دل کی رگوں پر غور کرو کہ یہ اصل مرکز جس پر تمہارے تمام اعمال و افعال اور ہر قسم کے حرکات و سکنات اور ہر طرح کی جد و جہد کا مدار ہے، یعنی "دل" کیا انبیاء اور اُن کے متبعین کے سوا نوعِ انسانی کا کوئی طبقہ اس کی نشو و نما، حفاظت، ترقی، تکمیل اور اصلاح کے لئے بھی کام کر رہا ہے، اور کیا خالقِ فطرت کا یہ فرض نہ تھا کہ وہ تمہاری مادی ترقی و اصلاح کی طرح تمہاری روحانی ترقی و اصلاح کی بھی فکر کرتا، اور ایسا سمجھنا کہ اُس نے اُسکی ترقی و تکمیل و اصلاح کی خدمت نوعِ انسانی کے کسی کارکن طبقہ سے متعلق نہیں کی ہے، کیا اُس کی شانِ ربوبیت کے ساتھ سوءِ ظن نہیں ہے،

یہی وہ طبقہ ہے، جو تمام متفرق اور مختلف انسانی طبقوں کو باہم جوڑ کر ایک عام انسانی تمدنی سطح پر لایا ہے، وہ ان سب کو جو تمہارے لئے روٹی تیار کرتے ہیں، کپڑے بنتے ہیں، جھونپڑے بناتے ہیں، اور سامان اور اوزار درست کرتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ مشارکت اور معاونت اور نیکی پر آمادہ کر کے اُن میں روحانی برادری پیدا کرتے ہیں، اور مٹی سے پیدا ہونے والے ایک آدم کے بیٹوں کو جن کو دولت و غربت، سوسائٹی اور مجلس، حکومت اور اقلیم اور جغرافی و قومی تقسیم نے پارہ پارہ کر رکھا ہے، باہم جوڑ دیتے ہیں، اور ان تمام مصنوعی امتیازات کو مٹا کر پوری زمین کو ایک ملک، تمام اقوامِ عالم کو اولادِ آدم، اور کل بلند و پست طبقوں کو ایک انسانی طبقہ قرار دیتے ہیں، اور انکے اخلاقی و روحانی عالم میں اصلاح و ترقی اور امن و امان پیدا کرتے ہیں، انکے دلوں سے بغض و کینہ کو نکال کر اخوت و محبت کا نور بھرتے ہیں انکے احساس، ارادہ اور

اختیار کی باگ پر اُن کے دل کو قابو حاصل کرنے کی تدبیر بتاتے ہیں، اور اُن کو اعتدال کی حد بتاکر صحیح و غلط کی تمیز عطا کرتے ہیں،

یہی وہ انسانی طبقہ ہے، جس کو ہم نبی، رسول اور پیغمبر کہتے ہیں، اُن کو گو براہِ راست جسم وجسمانیات سے تعلق نہیں ہوتا بلکہ صرف دل اور قلب و روح کے عالم سے سروکار ہوتا ہے، تاہم اس دل اور قلب و روح کی اصلاح کے لئے جسم و جسمانیات کی کسی قدر اصلاح بھی اس حد تک اُن کے فرائض میں داخل ہے، جہاں تک اُن کو دل اور قلب و روح کے کاموں کی اصلاح میں اس کی ضرورت معلوم ہوتی ہے،

ایک شبہہ اور اس کا جواب اس مقام پر ایک شبہہ یہ ہوتا ہے، کہ افرادِ انسانی کے درمیان امن و امان اور اطمینان پیدا کرنے کا کام تو بادشاہ بھی کرتے ہیں، اخلاق کا ایک معلم بھی کرتا ہے، ایک فلسفی اور اجتماعیات کا ایک حکیم بھی کرتا ہے، مگر اُن کے کاموں کے درمیان جو عظیم امتیاز فرق ہے، اُسکو سمجھ لینا ہی اس شبہہ کا ازالہ ہے، علمی اصطلاح میں یوں سمجھو کہ مختلف فنون کے ماہر، ایک ہی چیز پر مختلف حیثیتوں سے نظر ڈالتے ہیں، اور اسی اختلافِ نظر سے اُن کا فن بھی علیحدہ علیحدہ ہو جاتا ہے، کسی جسم کے اجزائے ترکیبی سے اگر بحث کی جائے تو کیمسٹری ہے، اگر اسکی زندگی، اور اسبابِ زندگی پر غور کیا جائے تو بیالوجی (علم الحیات) ہے، اگر اُس کے دماغی قویٰ اور اُن کے آثار کی تحقیق کیجائے، تو سائیکالوجی (علم النفس) ہے، اگر اُس کے جذبات اور جذبات کے مطابق اس کے شخصی افعال و اعمال کے حدود اور اُن کے اسباب، علل اور غرض و غایت پر نظر ڈالی جائے تو یہ اتھیکس (فلسفۂ اخلاق) ہے، اگر اس کے جماعتی خصائص اور لوازم کی تفتیش کیجائے تو یہ سوشیالوجی (علم اجتماع و معاشرت) ہے، اگر

جسم کی صحت و مرض کے اسباب کی جستجو کیجائے، تو یہ طب ہی، دیکھو کہ ایک ہی جسم یا متعلقِ جسم پر کتنی حیثیتوں سے بحثیں کی گئی ہیں اور ان سے کتنے مختلف علوم پیدا ہو گئے ہیں، تاہم وہ سب کے سب جسم اور جسمانیات ہی سے متعلق اور وابستہ ہیں، اور بایں ہمہ اُن میں سے ہر ایک علم و فن علٰحدہ اور ہر ایک علم و فن کے جاننے والے علٰحدہ ہیں،

اسی طرح ایک نبی اور ایک رسول کا کام بھی بادشاہوں، فلاسفروں اور حکیموں کی طرح انسانوں ہی کی اصلاح ہے، مگر ان میں سے کسی ایک کا کام بھی دوسرے سے ملتا جلتا نہیں ہی، بادشاہ صرف اس کا ذمہ دار ہے کہ وہ اپنے زور و قوت سے بازاروں، گلیوں، آبادیوں اور میدانوں میں امن و امان اور انصاف کو قائم رکھے، فلاسفر انسانوں کے تمام اعمال و خیالات کے اسباب و علل کی تفتیش، اور اُن میں نظم و تسلسل، اور علت و معلول کا ربط پیدا کرنے کا کفیل ہی، فلسفہ اخلاق کے معلم تمہارے اخلاق و عادات کے اسباب علل تمکو بتاتے اور ناقابلِ فہم جذبات کی تشریح کرتے ہیں، اس سے آگے ان کا کوئی کام نہیں، حکیم اور واعظ تمہارے اعمال و اخلاق کی اصلاح کے لئے نہایت شیریں، خوشگوار، اور ڈھلے ہوئے فقرے سناتے ہیں، مگر اُن میں سے کوئی نہیں جو تمہارے دلوں کا رہنما ہو، جو تمہارے احساس، ارادہ اور اختیار کے قدم کو غلط روی سے روک سکے، وہ نہ صرف تمہارے اخلاق و عادات اور جذبات کے اسباب و علل بتائے، بلکہ تمہاری اخلاق و عادات اور جذبات میں خیر و شر کی تمیز کرے، اور خیر کے حصول اور شر سے حفاظت کی تدبیر بتائے بلکہ اس کے ہاتھ اور زبان میں یہ قوت ہو کہ اپنی تعلیم و تلقین و فیضِ صحبت سے تمہارے اخلاق و عادات و جذبات بلکہ احساس، ارادہ اور اختیار کی غرض و غایت بلکہ پورے دل کی قوتوں میں انقلاب پیدا کر دے،

اور شر کے تخم کو دلوں کی سرزمین سے نکال کر خیر کا برگ و بار پیدا کر دے، البتہ نبی یہ تمام کام سرانجام دیتا ہے، وہ انسانوں کو اُن کے احساس، ارادہ اور اختیار کی بھولی ہوئی ذمہ داری یاد دلاتا ہے، اور اُن کی قویٰ کے مرکز یعنی دل کو خدا کے حکم سے درست کر دیتا ہے،

وہ بادشاہوں کی طرح صرف بازاروں، مجمعوں اور آبادیوں کا امن و اطمینان نہیں چاہتا، بلکہ وہ لوگوں کے دلوں کے اندر کا امن و اطمینان چاہتا ہے، وہ معلمینِ اخلاق کی طرح اسبابِ علل کی تلاش و جستجو و تشریح کی پروا نہیں کرتا، بلکہ اخلاقِ سیئہ خواہ کسی سبب سے ہوں، وہ ان کی بیخ کنی کرتا ہے، اور اخلاقِ حسنہ خواہ وہ کسی علت کے معلول ہوں، وہ انکو انسانوں کے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ انسانی اوہام کے طلسم کو توڑ دیتا ہے، اور غلط رسم و رواج کی بندشوں کو کھولتا ہے، اور انسانوں کی غلامی سے آزاد کر کے صرف خدا کی غلامی میں دیتا ہے،

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (اعراف ۹)

وہ اُن کو بھلائی کا حکم دیتا ہے، اور برائی سے روکتا ہے اور اچھائیوں کو ان کیلئے حلال اور خبیث چیزوں کو حرام ٹھہراتا ہے، اور اُن کے اس بندھن اور زنجیروں کو جو ان پر ہوتی ہیں ان سے اتارتا ہے

رُسُلًا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (نساء ۴-۳۳)

ایسے رسول بھیجے جو نیکوں کو خوشخبری دیتے اور بدکاروں کو ہشیار کرتے ہیں تاکہ رسولوں کے اس وعظ و تذکیر کے بعد پھر انسانوں کو خدا پر الزام دینے کا موقع نہ ملے

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا

ہم نے رسولوں کو کھلی ہوئی دلیلیں دیکر بھیجا، اور ان کے ساتھ

مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ج (حدید - ۳)

کتاب (ہدایت) اور (عدل کی) ترازو تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم رہیں اور دنیا میں امن و امان کی زندگی بسر کرے،

نوعِ انسانی کے دوسرے تمام خدام اور کارکن اپنے فرائض کو جن اغراض سے انجام دیتے ہیں، اُن کا دائرہ موجودہ زندگی کی بھلائی اور برائی سے آگے نہیں بڑھتا، مگر انبیاءؑ اور رسول نوعِ انسانی کی خدمت کے یہ کام بھی اُس کی موجودہ زندگی کی بھلائی اور برائی کو اس لحاظ سے سامنے رکھ کر کرتے ہیں کہ اُن کا اثر اُس کی دوسری دائمی و پائدار زندگی پر کیا پڑیگا، وہ جسم کی خدمت، جسم کے لئے نہیں، بلکہ روح کیلئے کرتے ہیں، اور مخلوق کی خدمت خالق کے منشا کے مطابق بجالاتے ہیں، وہ صرف ایک مخلوق کو دوسرے مخلوق ہی سے نہیں بلکہ مخلوق کو خالق سے اور خالق ہی کیلئے ایک مخلوق کو دوسرے مخلوق سے جوڑتے ہیں، وہ صرف اچھی اچھی اور میٹھی میٹھی باتیں لوگوں کو نہیں سناتے، بلکہ خود بہتر سے بہتر عمل کرتے ہیں، اور دوسروں کا اس کا عامل بناتے ہیں، وہ خیال آرا شاعروں اور جھوٹے حکیموں کی طرح نہیں ہوتے، جو کہتے ہیں اور کرتے نہیں، دماغ ہوتے ہیں، مگر دل نہیں ہوتے، زبانیں ہوتی ہیں، مگر ہاتھ نہیں ہوتے،

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ (شعراء - ۱۱)

اور شاعروں کے پیرو کار گم کردہ راہ ہوتے ہیں: تم دیکھتے نہیں کہ وہ ہر میدان میں سر مارتے پھرتے ہیں اور وہ وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں،

وہ اس دعوٰی کے ساتھ انسانوں میں آتے ہیں، کہ اُن کے خالق نے جس نے اُن کے ذرہ ذرہ کا سامانِ راحت فراہم کیا ہے، اور جو ان کے قلب و روح کا سامانِ راحت بھی بہم پہنچاتا ہے،

اُن کو اس لئے بھیجا ہے کہ انسانوں کے قلب، روح کو اس سامان کا برتنا سکھائیں، اور اُن کے رب کا پیغام ان کو سنائیں، اور بتائیں کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اُس کے بندے اپنے احساس، اپنے ارادہ اور اپنے اختیار کو اس طرح اس عالم میں صرف کریں کہ وہ پریشانی و بے اطمینانی کی تاریکی سے نکل کر سکون و اطمینان، اور امن و سعادت کی روشنی میں داخل ہوں،

هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖٓ اٰیٰتٍۢ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ؕ

(حدید - ۱)

وہی خدا ہے جو اپنے (رسول) بندے پر کھلی آیتیں اتارتا ہے، کہ تمکو (اے انسانوں) وہ تاریکی سے نکال کر روشنی میں لائے، اور اللہ نے ایسا اسلئے کیا، کہ تم پر شفقت کرنے والا مہربان ہے،

انبیاء بھی ایک بادشاہ کی طرح جماعتوں کا انتظام کرتے ہیں، مگر ملک کے خراج اور زمین کی آبادی کے لئے نہیں، بلکہ خدا کے لئے، وہ بھی جان و مال کی حفاظت کے لئے مقنن کی طرح قانون بناتے ہیں، اور قاضی کی طرح سزا و جزا کا حکم سناتے ہیں، مگر انعام شاہی اور تنخواہ پاکر یا کر کسی دنیاوی بادشاہ کے فرمان کی تعمیل کے لئے نہیں، بلکہ جسم و جان کے شہنشاہ اور کائنات کے مالک کے فرمان کی تعمیل میں، وہ بھی فلاسفر کی طرح رموز و اسرار کا پردہ فاش کرتے ہیں، مگر تجربہ استقراء اور قیاس سے نہیں، بلکہ عالم اسرار کے مبدء علم سے فیض پاکر، وہ بھی حکیم و واعظ کی طرح پر تاثیر کلام کرتے ہیں، مگر انکے مانند اپنے دل سے جوڑ کر نہیں، بلکہ خدا سے سُن کر، اور وہ صرف کہتے نہیں، بلکہ جو کہتے ہیں وہ کرتے ہیں، وہ دوسروں سے کراتے ہیں، وہ خدا سے ہیں، خدا سے پاتے ہیں، اور اسی سے سنتے ہیں، اور وہی اوروں کو سناتے ہیں، غرض اوپر آسمان سے ان کو جو کچھ ملتا ہے

وہی نیچے زمین پر سب کو بانٹتے ہیں،

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى، مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى، وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى، اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى، عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى، ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى، وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ..... فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى، مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى، اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ..... مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى، لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى (والنجم-۱)

قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (اعراف-۲۴)

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ (شعراء-۱۱)

قسم ہے اس ستارہ کی جب وہ نیچے گرے کہ تمہارا ساتھی (پیغمبر) نہ بھولا، نہ بھٹکا، اور نہ وہ نفس کی خواہش ہی سے بات کرتا ہے، وہ تو وہ ہے جو اسکو وحی کے ذریعہ کہا جاتا ہے، اسکو بڑی بڑی قوتوں والے ہی نے سکھایا طاقت والا، تو وہ سیدھا ہوا اور آنحالیکہ وہ آسمان کے تو اس نے اپنے بندہ پر وحی کی جو وحی کی، نہ اسکے دل نے جو اس نے دیکھا، اسکو جھوٹ کہا، کیا وہ جو دیکھتا ہے تم اس پر اس سے جھگڑتے ہو..... ... نہ بینائی نے کجی کی اور نہ سرکشی کی، اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے دیکھا،

کہدے (اے پیغمبر) کہ میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر میرے رب کی طرف سے وحی کیجاتی ہے، یہ (اے انسانو!) تمہارے رب کی طرف سے بصیرتیں ہیں اور انکے لئے جو ایمان رکھتے ہیں، ہدایت اور رحمت ہیں،

یہ تو عالم کے پرورش کرنے والے کی طرف سے اتارا گیا ہے، اس کو امانت والی روح نے تیرے دل پر اتارا تاکہ تو ہشیار کرنیوالے میں سے ایک ہو، فصیح عربی زبان میں،

نکتہ:- یہ بالکل ممکن، بلکہ واقعہ ہے کہ ایک ہی قسم کا کام مختلف لوگ مختلف غرض و نیت سے کرتے ہیں، کسی قوم کی اصلاح ہی کا کام ہے، کہ اس کو مختلف لوگ مختلف غرض و نیت سے کرتے ہیں، خود غرضی کے غیر مخلصانہ اغراض سے قطع نظر کرکے صرف مخلصانہ اغراض کو لو کوئی یہ سمجھتا ہے کہ قوم کی مالی حالت کی درستی سے قوم بن سکتی ہے، کوئی اصلاح کی جڑ تعلیم کو قرار دیتا ہے، کوئی رسم و رواج و معاشرت پر زور دیتا ہے، کوئی ظاہری تمدن پر مدار رکھتا ہے، کوئی جسمانی قوت پر بھروسہ رکھتا ہے، کوئی سیاسی کامیابی کو قومی اصلاح کا مرکز ٹھہراتا ہے، لیکن انبیاؑ کے نزدیک یہ سب ثانوی درجہ کی باتیں ہیں، وہ اپنی بنیاد صرف قلب کی اصلاح پر رکھتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ یہی اصلی چیز ہے، اور اسی کے بدلنے سے سب کچھ بدل سکتا ہے، ان کی غرض خدا کی اطاعت، خدا کی محبت، اور خدا کی معرفت ہوتی ہے اور تمام دوسری ترقیوں اور اصلاحوں کو وہ یکسر اسی ایک اصل کی فروع اور اسی ایک جڑ کی شاخیں جانتے ہیں،

یہی سبب ہے کہ انکی دعوت کی کامیابی سے قوموں کو سلطنت بھی ملتی ہے، دولت بھی ہاتھ آتی ہے، علم بھی حاصل ہوتا ہے زور اور قوت بھی پیدا ہوتی ہے، اور دنیاوی عظمت و جلال کا ہر مظہر خادمانہ اسکے استقبال کے لئے آگے بڑھتا ہے، مگر یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ سیاسی مصلحین کی طرح سلطنت، مالی مصلحین کی طرح دولت، تعلیمی مصلحین کی طرح تعلیم علم و فن، جسمانی مصلحین کی طرح قوت و طاقت انکا مطمح نظر نہیں ہوتی، بلکہ جو کچھ انکے سامنے ہوتا ہے، وہ صرف خدا کی اطاعت، خدا کی محبت، خدا کی خوشنودی ہوتی ہے اور باقی تمام چیزیں انکی نگاہ میں فرعی، ثانوی اور ضمنی ہوتی ہیں،

نبی اور غیر نبی کے امتیازات سطور بالا سے ہویدا ہے، کہ انبیا، اور اُن کے مشابہ اشخاص میں کتنا عظیم الشان فرق ہے، یہ فرق چار حیثیتوں سے نمایاں ہے، مبدء اور منبع کا فرق، غرض و غایت کا فرق طریق، دعوت کا فرق، اور علم و عمل کا فرق، نبی کے علم کا مبدء منبع، ماخذ اور سرچشمہ جو کچھ کہو وہ تعلیم ربانی، شرح صدر، اور وحی و الہام ہوتا ہے، اور حکیم کے علم کا ماخذ و منبع، تعلیم انسانی، گذشتہ تجربہ، استقرا اور قیاس ہوتا ہے، یعنی حکیم عقل سے جانتا ہے اور نبی خالق عقل سے، اسی طرح ایک حکیم کے تمام اقوال اور جد و جہد کا منشا، اپنی شہرت طلبی، علم کا اظہار، قوم یا ملک کی محبت کی خاطر اسکی اصلاح ہوتا ہے، مگر ایک نبی کا مقصد خدا کے حکم کا اعلان اور خالق کی رضامندی کیلئے مخلوق کی بھلائی ہوتا ہے، طریق دعوت کا فرق یہ ہوتا ہے، کہ حکیم اپنی دعوت کی عمارت کو تمام تر حکمتوں، مصلحتوں اور علل و اسباب کے ستونوں پر کھڑا کرتا ہے، مگر اپنی دعوت کو زیادہ تر خالق کی اطاعت، محبت اور رضا جوئی پر قائم کرتا ہے، حکیم کہتا ہے، لیکن اسکا کرنا اس کیلئے ضروری نہیں، نبی جو کہتا ہے وہ کرتا ہے، اور اُس کا کرکے دکھانا اس کے لئے ضروری ہے، وہ صرف جلوت کے منبر پر جلوہ نما نہیں ہوتا، بلکہ وہ جلوت و خلوت اور ظاہر و باطن میں یکساں حیثیت سے آراستہ اور برائیوں سے پاک ہوتا ہے، دنیا میں سقراط، افلاطون، ارسطو، ودجانیس وغیرہ ایک طرف اور ابراہیم، موسیٰ، اور محمد دوسری طرف ہیں، اور دونوں کے سوانح اور سیرتیں اور کارنامے بالکل نمایاں اور ایک دوسرے سے اس طرح ممتاز ہیں کہ ان میں ذرا التباس نہیں،

بادشاہ اپنی تلوار کے زور اور اپنی فوج و لشکر کی قوت سے رعایا کو اپنے قانون کا پابند بناتے ہیں تاکہ فتنہ و فساد رُک جائے، فلاسفر اپنے دعووں کو صرف استدلال کی قوت اور عقل کے خطاب سے

ثابت کرنا چاہتے ہیں، تاکہ اُن کی بات لوگ تسلیم کریں، لیکن پیغمبر اپنے پیروؤں کے قلب کو اس طرح بدل دینا چاہتے ہیں کہ وہ از خود برائی کو چھوڑ کر نیکی اختیار کریں، وہ اگر کبھی قانون و حدود و سزا کو اختیار کرتے ہیں یا ساتھ ساتھ عقل کو بھی مخاطب کرتے ہیں، تو ان کا یہ ضمنی یا ثانوی کام ہوتا ہے اوّلین نہیں، ان کی اوّلین غرض یہ ہوتی ہے کہ اُن کے پیروؤں کو خدا کی قدرت اور اسکے حاضر و ناظر ہونے کا اتنا محکم اور پختہ یقین ہو جائے، کہ وہ اسکے حکموں اور نصیحتوں کو جو اُنکے ذریعہ آتی ہیں، بے چون و چرا تسلیم کر لیں،

دنیا کے بادشاہ اور فاتح اور کشور کشا اپنے زور بازو، اور تلوار کی قوت سے دنیا کے طبقے الٹ دیتے ہیں، انھوں نے کبھی کبھی چار دانگ عالم پر حکمرانی کی، قوموں کی جان و مال پر اپنا قبضۂ اقتدار جمایا، انکی تلوار کی دھاک نے آبادیوں اور مجمعوں کے مجرموں کو روپوش کر دیا، اور بازاروں اور راستوں میں امن و امان پیدا کر دیا، لیکن کیا انھوں نے دلوں کے طبقے بھی الٹے؟ اپنی سلطنت کے دائرہ سے باہر کسی کمزور سے کمزور انسان سے اپنے حکم منوا سکے؟ وہ لوگوں کے دلوں کو بھی اپنے قبضۂ اقتدار میں لا سکے؟ آبادیوں اور مجمعوں کے روپوش مجرموں کو بھی فنا کر سکے؟ وہ دلوں کی بستیوں میں بھی امن و امان پیدا کر سکے؟ وہ روحوں کی مملکتوں کا بھی نظم و نسق قائم کر سکے؟

حکما، اور فلاسفر جو اپنی عقل رسا کے ذریعہ سے عجائباتِ عالم کی طلسم کشائی اور کائنات کے مخفی اسرار کے فاش کرنے کے مدعی ہیں، کیا وہ قلب و روح کے عجائبات کو بھی دریافت کر سکے؟ وہ ماورائے مادہ اسرار و رموز کو بھی حل کر سکے؟ وہ انسانوں کی صلاح و ہدایت کا بھی کوئی سامان اپنی تحقیق و تفتیش سے فراہم کر سکے؟ ان کی دقیق نکتہ سنجیوں اور خیال آرائیوں کے پیچھے ان کے ذاتی حسن عمل کا بھی کوئی نمونہ ہے؟ ارسطو نے فلسفۂ اخلاق کی بنیاد ڈالی، دوسرے حکما نے

اخلاق کے اسباب و علل کے حدود، ظہور، اثر اور نتیجہ کے ایک ایک جزو کی تحقیق کی مگر کیا، اس سے کسی انسان کے دل سے برائی کا تخم دور ہوا، یا اچھائی کے بیج نے نشو و نما پائی؟ ان کے اخلاق و تعلیمات کے فلسفیانہ رموز و اسرار کا دائرہ اُن کی درسگاہوں کی چار دیواریوں سے کبھی آگے نہ بڑھ سکا؟ کیونکہ وہ اپنے درس کے کمروں سے نکل کر جب انسانی صحبتوں میں داخل ہوتے ہیں تو اُنکی اخلاقی زندگی اور قلبی صفائی عام انسانی افراد سے ایک انچ بھی بلند نہیں ہوتی، حکمائے یونان میں سقراط سے بڑھ کر کوئی نہیں، مگر کیا یہ وہی نہیں ہے جو بازار کی فاحشہ عورتوں سے ارتباط رکھتا تھا، اور اُن میں ایک پیشہ ور کے فرزند اور کامیابی کے لئے کوشاں رہتا تھا، یہی یونان کے دوسرے حکما کا حال تھا، اور توحید پرستی کا درجہ تو اس سے بدرجہا بلند ہے، جس کی اُن کو ہوا بھی نہیں لگی تھی،

ان سطروں سے اندازہ ہوا ہوگا کہ ہر شیریں نوا واعظ، ہر مؤثر بیان خطیب، ہر دقیقہ رس، مقنن، ہر کشور کشا فاتح، اور ہر نکتہ داں حکیم اس لائق نہیں کہ نبوت و رسالت کا اہم اور بلند اور مقدس منصب اس سے منسوب کیا جائے، اس منصب کے ساتھ کچھ ایسے شروط، لوازم، اور خصوصیات بھی وابستہ ہیں، جو اس کے ضروری اجزاء اور عناصر ہیں،

۱۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اس کا تعلق پُر اسرار عالم غیب سے ہو، وہ غیب کی آوازیں سنتا ہو، غیب کی چیزیں دیکھتا ہو، غیب سے علم پاتا ہو، عالم ملکوت کی تائید اُس کے ساتھ ہو، روح القدس اسکا سفیر و ہمنوا ہو،

۲۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کو تمام بندوں میں سے اسکے لئے چنا ہو، کہ وہ اس بلند منصب پر سرفراز ہو

۳۔ اس سے خدا کے حکم سے عجیب و غریب اور حیرت انگیز تصرفات صادر ہوں، جن سے اس کا

مقبولِ بارگاہ ہونا ثابت ہو،

۴۔ فضائل اخلاق کے پھولوں سے اس کا دامن بھرا ہو، اور ہر قسم کے گناہ کے خس و خاشاک سے پاک و صاف ہو کہ گندے ہاتھوں سے میلے کپڑے پاک و صاف نہیں ہو سکتے،

۵۔ وہ لوگوں کو خدا اور عالم غیب پر یقین کی دعوت اور فضائل و اخلاق کی تعلیم دے اور روز الست کا بھولا ہوا عہد ان کو یاد دلائے،

۶۔ نہ صرف تعلیم، بلکہ اس میں یہ قوت ہو کہ وہ شریروں کو نیک اور گمراہوں کو راست رو بنا دے، اور جو خدا سے بھاگتے ہوں، انکو پھیر کر پھر اس کے آستانہ پر لے آئے،

۷۔ اپنے سے پہلے خدا کی طرف سے آئے ہوئے صحیح اصول کو انسانی تصرفات سے پاک و صاف کر کے پیش کرے،

۸۔ اسکی اس دعوت، جد و جہد، اور تعلیم و تلقین سے مقصود کوئی دنیاوی معاوضہ، شہرت، جاہ طلبی، دولت مندی، قیام سلطنت وغیرہ نہ ہو، بلکہ صرف خدا کے حکم کی بجا آوری اور خلق خدا کی ہدایت ہو،

یہ نبوت و رسالت کے وہ اوصاف اور لوازم ہیں، جو دنیا کے تمام پیغمبروں میں یکساں پائے جاتے ہیں، مذاہب عالم کے صحیفوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف اور آشکارا ہو جاتی ہے، خصوصاً قرآن پاک نے جو دنیا کی نبوت کا سب سے آخری اور سب سے مکمل صحیفہ ہے جس نے نبوت و رسالت کی حقیقت اور شرائط و لوازم کی سب سے بہتر تشریح کی ہے، سورۂ انعام میں اکثر پیغمبروں کا ذکر کر کے یہ حقائق ان الفاظ میں بیان کئے ہیں،

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ؕ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ

اور یہ تھی ہماری دلیل جو ہمنے ابراہیم کو اسکی قوم کے
مقابلہ میں دی، ہم جس کو چاہتے ہیں کئی درجے بلند کرتے
ہیں بیشبہ تیرا پروردگار تدبیر والا خبردار ہے، اور ہمنے ابراہیم
کو اسحٰق اور یعقوب بخشے، اور ہر ایک کو ہدایت دی اور نوح
کو اس سے پہلے ہدایت دی تھی، اور اسکی اولاد میں داؤد اور سلیمان
اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو اسی طرح ہم
نیکوکاروں کو بدلہ دیتے ہیں اور زکریا، اور یحییٰ، اور عیسیٰ اور
الیاس کہ ہر ایک نیکوکاروں میں سے ہے اور اسمٰعیل اور الیسع
اور یونس اور لوط کو، ہر ایک کو بزرگی بخشی دنیا والوں پر
اور انکے باپ دادوں اور بھائیوں میں سے، اور ہم نے انکو
چن کر پسند کیا، اور انکو سیدھی راہ پر چلایا، یہ اللہ
کی ہدایت ہے، اس پر وہ جس کو چاہے چلاتا ہے، اگر وہ
شرک کرتے تو انکا سارا کیا برباد ہو جاتا، یہی وہ
لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حق و باطل میں فیصلہ
کرنا، حکم، اور نبوت دی، تو اگر کوئی ان باتوں
کا انکار کرے تو ہم نے ان باتوں پر ایسے دوسرے
کو مقرر کیا ہے، جو ان کا انکار نہیں کرتے یہی وہ

فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ ط قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ	لوگ ہیں جنکو ہمنے ہدایت دی، اے محمد! تو بھی انہی کی رہنمائی
عَلَيْهِ اَجْرًا ط اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى	کی پیروی کر، اور کہہ میں اپنے کام کی تم سے مزدوری نہیں
لِلْعٰلَمِيْنَ، (انعام-۱۰)	چاہتا، یہ قرآن تو دنیا والوں کو یاد دہانی ہے،

ان آیتوں میں اکثر پیغمبروں کے نام لیکر اُن کے پیغمبرانہ اوصاف گنائے ہیں، اگر ہم اُن کو یکجا کر دیں تو نبوت و رسالت کے عام اوصاف خصوصیات اور لوازم واضح ہو جائیں،

۱- فرمایا "ہم نے ابراہیم کو دلیل دی" اور ہم نے اُن کو ہدایت بخشی" جس سے معلوم ہوا کہ اُن کے علم اور ہدایت کا سرچشمہ عالم ملکوت سے ہوتا ہے،

۲- ارشاد ہوا کہ "ہم نے اُن کو سیدھی راہ چلایا، اور یہ سب نیکوکار تھے" اس سے ثابت ہوا کہ وہ معصوم اور گناہوں سے بے داغ ہوتے ہیں،

۳- یہ بھی کہا کہ "ہم نے اُن کو چن کر پسند کیا، اور اپنے بندوں میں سے جسکو چاہیں، یہ ہدایت عطا کریں" جس سے یہ مقصود ہے کہ یہ منصب سعی و محنت سے نہیں بلکہ خدا کی مرضی اور انتخاب سے ملتا ہے،

۴- فرمایا کہ "ہم نے انکو کتاب حق و باطل کے فیصلہ کی طاقت (حکم) اور احکام غیب کی تعلیم (نبوت) دی" اس سے معلوم ہوا کہ ان منصب والوں کو کیا کیا چیزیں عطا ہوتی ہیں،

۵- حکم ہوا کہ "انکی رہنمائی کی پیروی کر" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی اور دعوت پر مامور ہوتے ہیں، اور لوگ اُن کی پیروی سے نیکوکار اور صالح بنتے ہیں،

۶- فرمایا کہ اے پیغمبر! یہ کہدے کہ میں اپنے کام کا کوئی معاوضہ یا بدلہ تم سے نہیں چاہتا یہ تو اہل دنیا کے لئے نصیحت اور یاد دلانا ہے" اس سے ثابت ہوا کہ خالق کی خوشنودی، اور اسکے

ذریعہ سے مخلوق کی خیر خواہی کے علاوہ اُن کا کوئی دوسرا مقصد اور مطمحِ نظر نہیں ہوتا،

دوسرے انبیاے کرام علیہم السّلام کے علاوہ خاص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق و نسبت سے ان حقیقتوں کو قرآن پاک نے کئی دفعہ تصریح بیان کیا ہے، جن میں سے چار باتیں سب سے زیادہ نمایاں ہیں،

۱۔ اشیاے غیب، امور خیر اور فلاح و سعادت کے اسباب پر اسکا علم خدا کی تعلیم سے کامل ہو،

۲۔ وہ اپنے علم کے مطابق اپنے عمل میں کامل اور راست باز ہو،

۳۔ وہ دوسروں کو ان امور کی تعلیم دیتا ہو،

۴۔ اور اُن کو بھی اپنی تعلیم اور صحبت کے فیض سے حسبِ استعداد کامل بناتا ہو،

قرآن پاک میں متعدد موقعوں پر آپ کی نسبت یہ فرمایا گیا،

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ،	وہ رسول ان پڑھوں کو خدا کی باتیں سناتا، اور اُن کو پاک صاف بناتا، اور اُن کو کتاب و حکمت سکھاتا ہے،
(بقرہ :- وجمعہ-۱)	

اس مختصر سی آیت میں ان چاروں مذکورۂ بالا امور کا یکجا ذکر کیا ہے، جاہلوں کو آیاتِ الٰہی پڑھانے اور کتاب و حکمت سکھانے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ خود اُس کو آیاتِ الٰہی پڑھائی، اور کتاب و حکمت سکھائی گئی ہوں، اور دوسروں کو پاک و صاف بنانے کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود پاک و صاف ہو، کہ ایک جاہل اپنے ہی جیسے دوسرے جاہل کو عالم، اور ایک ناپاک اپنے ہی جیسے دوسرے ناپاک کو پاک نہیں بنا سکتا، ایک دوسری آیت میں ہے،

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ اِنَّهٗ
يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى
فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى سَيَذَّكَّرُ
مَنْ يَّخْشٰى وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى

(اعلیٰ)

ہم تجھے پڑھائیں گے تو تو نہیں بھولیگا، مگر جو اللہ چاہے،
وہ جانتا ہے، پکار اور چھپا، اور ہم تجھے آسان
آسانی تک پہنچائیں گے، اور تو سمجھا،
اگر تیرا سمجھانا فائدہ دے، جسکو خدا کا
لحاظ ہوگا، وہ سمجھے گا، اور جو بدبخت ہوگا، وہ اس سے

ایسا پڑھانا، جس میں بھول نہ ہو، پیغمبر کی روحانی تعلیم ہے، اور آسانی کی منزل کی طرف اُسکو آہستہ آہستہ لے چلنا، اور اسکے لئے اس کٹھن منزل کو آسان کر دینا اُس کے ذاتی عمل کو کمال کے درجہ تک اس طرح پہنچا دینا ہے کہ تمام امور خیر اس سے بسہولت از خود صادر ہونے لگیں، پھر اس کو دینا کے سمجھانے پر مامور کرنا، اس رمز کو آشکارا کرنا ہے، کہ دوسروں کی تعلیم و تذکیر کا منصب اسکو ملا ہے، اس کے بعد یہ فرمانا کہ "متقی اس نصیحت سے فیض پائیں گے، اور بدبخت محروم رہیں گے" اُسکی تشریح یہ ہے، کہ ناقصوں کی تکمیل اور ذی استعداد لوگوں کو اُن کی استعداد کے مطابق پہنچانا بھی اُس کا فرض ہے،

نبوت کے لوازم اور خصوصیات نبوت کی شرح حقیقت اور اس کے لوازم اور خصوصیات کے اجمالی بیان کے بعد ضرورت ہے کہ نبوت کے چند اہم خصوصیات پر تفصیل سے گفتگو کی جائے، تاکہ وقت کی بہت سی غلط فہمیوں کا سدباب ہو، لیکن ان خصوصیات کے ذکر سے پہلے خود ہم کو "خصوصیت" کو سمجھنا ہے، کہ اس سے مقصود کیا ہے،

لطیفہ تشریح اور طریقۂ استدلال امام رازی نے اپنی تفسیر اور بعض کتب کلامیہ میں اختیار کیا ہے،

دنیا میں ہر نوع اور ہر نوع کے ماتحت ہر صنف میں کچھ نہ کچھ مخصوص صفات ہوتی ہیں، یہ مخصوص صفات اس نوع اور صنف کے ہر فرد میں یکساں پائی جاتی ہیں، ان ہی کو ہم لوازم اور خصوصیات کہتے ہیں، پھل پھول، چوپائے، پرندے، انسان تمام انواع میں کچھ نہ کچھ ایسی خصوصیات ہیں، جو دوسروں میں نہیں پائی جاتیں، اور انہی خصوصیات کی بنا پر ہر نوع دوسری نوع سے ممتاز اور ہر صنف دوسری صنف سے علیحدہ ہے، گلاب میں خاص قسم کا رنگ، خاص قسم کی خوشبو اور خاص قسم کے پتے ہوتے ہیں، یہ ناممکن ہے کہ کوئی گلاب ہو، اور اس میں یہ چیزیں نہ پائی جائیں لیکن گلاب کی بھی مختلف صنفیں ہیں، اور ان میں سے ہر ایک میں کچھ ایسی لازمی صفات ہوتی ہیں، جن سے گلاب کی ہر صنف (قسم) دوسری صنف (قسم) سے علاحدہ (الگ) نظر آتی ہے،

اسی طرح انسانیت کے کچھ خاص لوازم ہیں، دو ہاتھ، دو پاؤں، سیدھا قد، بولنے کی طاقت، سمجھ بوجھ اور غور و فکر کی اہلیت، ایجاد و اختراع کی قوت، انجام بینی اور مآل اندیشی کی صلاحیت وغیرہ اس کے خواص ہیں، اور جس طرح شہد میں مٹھاس حنظل میں کڑواہٹ، آگ میں گرمی، اور برف میں ٹھنڈک، نوعی خواص کی حیثیت سے خود بخود پیدا ہو گئی ہیں، اسی طرح انسان میں انسانیت کی مذکورہ بالا خاصیتیں فطرۃً ودیعت ہیں، لیکن اس وصفِ انسانیت میں اشتراک کے ساتھ گلاب کے اصناف کی طرح نوعِ انسانی کے بھی مختلف اصناف ہیں، جیسے ہندی، چینی، حبشی، رومی، ایشیائی، یورپین، دیکھو کہ ان میں سے ہر ایک صنف میں انسانیت کے اشتراک کے باوجود قد و قامت، چہرہ، مہرہ، رنگ و روغن، صورت و شکل، اخلاق و عادات وغیرہ، بیسیوں چیزوں کا نمایاں امتیاز ہوتا ہے، اور یہ تمام انسانی اصناف جو مختلف آب و ہوا، مختلف مرز و بوم، مختلف

نسل، اور مختلف ماحول سے تعلق رکھتے ہیں، انسان ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے صریحاً ممتاز ہیں.

اسی طرح ہر صنفِ انسانی کے اندر مختلف افراد ہیں، خلاقِ فطرت نے ان میں سے ہر ایک کو مختلف قابلیتیں عطا کی ہیں، شاعری، زباندانی، فلسفہ ریاضی، صناعی، باغبانی، معماری، پہلوانی سیکڑوں مختلف قسم کی انسانی استعدادیں اور قابلیتیں ہیں، ان میں سے ہر صنف کی، اور ہر صنف میں سے ہر ایک فرد کی قابلیت و استعداد کی خصوصیتیں دوسروں سے الگ ہیں، ایک تخیل پسند شاعر اور ایک حقیقت شناس ریاضی داں میں عظیم الشان فرق ہوتا ہے، ادب و انشا کے خیالی بلند پرواز، عموماً ریاضیات جیسے ٹھوس اور واقعی علوم سے کورے ہوتے ہیں، اور واقعیات سے لبریز ریاضیات کے جاننے والے، ادب و شاعری سے بیگانہ، پہلوانی کے جوہر، باغبانی سے الگ ہیں، اور ایک صناع کی طبیعت ایک فلسفی سے متضاد ہوتی ہے،

اسی کے ساتھ صنفِ شعراء میں خاص دماغی قابلیت کا اتحاد ہوتا ہے، نظم کی قوتِ تخیل کی بلندی، محاکات کی قدرت، الفاظ کا زور۔ معانی کا جوش، یہ تمام شعراء کی مخصوص صفات ہیں، اسی طرح تمام فلسفیوں کی ایک خاص دماغی کیفیت ہوتی ہے، خاموشی، غور و فکر، دقتِ نظر، خارجی عالم سے بے پروائی، تصور میں انہماک، خلوت گزینی، اخلاق کی خشکی، الغرض مرد و دم اور آب و ہوا کے اختلاف کی بنا پر جو اصنافِ انسانی پیدا ہوتے ہیں اُن میں اختلاف و امتیاز ہوتا ہے، اسی طرح دماغی و ذہنی و روحانی اختلافِ استعداد کی بنا پر جو اصنافِ انسانی پیدا ہوتے ہیں اُن میں بھی یہ اختلاف و امتیاز نظر آتا ہے، نپولین، تیمور و چنگیز، دم کے دم میں آبادی کو ویرانہ اور

ویرانہ کو آبادی، پہاڑ کو میدان، اور میدان کو پہاڑ بنا سکتے تھے، مگر وہ بیٹھکر فلسفۂ اخلاق پر چند صفحے نہیں لکھ سکتے تھے، افلاطون تنہائی میں بیٹھ کر جمہوریت کا فلسفیانہ خاکہ تیار کر سکتا تھا، مگر انتہنز کے تخت پر بیٹھ کر ایک لمحہ حکمرانی کا فرض انجام نہیں دے سکتا تھا، سلطان محمود کے درباری شاعر فردوسی نے اپنی طبیعت کے زور سے سیکڑوں خیالی سومنات کے معرکے فتح کئے لیکن پتھر کی ایک چٹان پر کلہاڑی نہ مار سکا، اس کے برخلاف سلطان محمود فوجوں کے دل بادل کے ساتھ پہاڑوں کو چیرتا، دریاؤں کو پھاڑتا اور ریگستانوں میں پانی بہاتا ہوا غزنی سے چل کر گجرات کے کناروں تک پہنچ گیا اور سومنات کے سنگی قلعہ اور مجسمہ کو چکنا چور کر ڈالا، مگر فردوسی کی طرح تنہا بیٹھ کر وہ خیالی شاہنامہ کا ایک معرکہ بھی فتح نہیں کر سکتا تھا،

ان مثالوں سے یہ ثابت ہے کہ نوعِ انسانی میں اشتراک ہونے کے باوجود اصنافِ انسانی کی ہزاروں قسمیں ہیں، اور ان میں سے ہر قسم وصنف کے الگ الگ خصوصیات، صفات اور لوازم ہیں، انہی مختلف اصنافِ انسانی میں انبیاء علیہم السلام کی بھی ایک صنف ہے، اور نوعِ انسانی کی اس مقدس صنف کے بھی چند خاص اوصاف، خصوصیات اور لوازم ہیں جو انکو دوسرے اصنافِ انسانی سے علانیہ ممتاز بناتے ہیں،

اس تمہید کے بعد اب ہم کو اس مسئلہ کی طرف توجہ کرنی چاہئے، کہ نبوت و رسالت کے اہم لوازم اور خصوصیات کیا ہیں،

ذہنی استعداد ان میں سے سب سے پہلی چیز ذہنی استعداد ہے، اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مختلف انسانوں میں مختلف قسم کی فطری استعدادیں پائی جاتی ہیں، اور انہی کی طرف

ان کا طبعی میلان ہوتا ہے اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں، ان کی استعداد اور میلان طبع کا جوہر برگ و بار پیدا کرنے لگتا ہے، یہاں تک کہ ایک خاص مقررہ مدت میں جا کر وہ پوری طرح ظاہر ہو جاتا ہے، جس طرح ہر درخت سے آم کا پھل پیدا نہیں ہو سکتا، بلکہ اسی سے ہوگا، جس کو خدا نے آم کا درخت بنایا ہے، پھر آم کے درخت کے آثار، خواص، پھل، اس کا مزہ، اس کا رنگ و بو غرض جملہ خصوصیات خود اس درخت میں اسی وقت موجود ہوتے ہیں، جب وہ ہنوز تخم کی صورت میں ہوتا ہے، وہی تخم پودا بنتا ہے، پودا بڑھتا ہے کونپل اور شاخیں پیدا کرتا ہے اور چند سال میں پھل دینے لگتا ہے لیکن اپنی ترقی کے ہر دور میں وہ اپنے مخفی خصوصیات وہی جو ایک دن اس سے آخر میں ظاہر ہونے والے ہیں اور اس پھل کی صفت ہمیشہ اس میں بالقوہ موجود تھی اسی تمثیل کے مطابق یہ سمجھنا چاہیئے کہ ہر انسان کوشش سے نبی نہیں ہو سکتا، بلکہ وہی ہو سکتا ہے، جس کو خدا نے نبی بنایا ہے، اور نبوت کے یہ آثار، خواص، اور کیفیات اس میں بالقوہ اور استعداد کی صورت میں اسی وقت سے موجود رہتے ہیں، جب وہ ہنوز آب و گل کے عالم میں ہوتا ہے، شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کہ "میں اسی وقت نبی تھا جب آدم ہنوز آب و گل میں تھے"[1] اسی قسم کا مطلب ہوگا،

انبیائے کرام علیہم السلام کی سیرتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جب سے عرصہ وجود میں قدم رکھتے ہیں، اسی زمانہ سے آنے والے وقت اور ملنے والے منصب کے آثار ان سے ظاہر ہونے لگتے ہیں، وہ حسب و نسب اور سیرت و صورت میں ممتاز ہوتے ہیں، شرک و کفر کے

[1] جامع ترمذی مناقب نبوی و مستدرک حاکم مناقب محمدی ج دوم ص ۶۰۰ حیدرآباد،

ماحول میں ہونے کے باوجود اُس کی گندگی سے بچائے جاتے ہیں؛ اخلاقِ حسنہ سے آراستہ ہوتے ہیں، اُن کی دیانت، امانت، سچائی، راست گفتاری مسلّم ہوتی ہے، اور یہ تمہیدیں اس لئے ہوتی ہیں تاکہ منصب ملنے کے بعد، اُن کے دعوائے نبوت کی تصدیق، اور لوگوں کے میلانِ خاطر کا سامان پہلے ہی سے موجود رہے، حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت یحییٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد رسول اللہ صلوٰۃ اللہ علیہم کے حالات و واقعاتِ قبل نبوت پڑھو، تو ہمارے اس دعویٰ کی سچائی تمکو نظر آئیگی، حضرت ابراہیمؑ کا نبوت پانے سے پہلے ہی سے آسمان و زمین کے خالق کی تلاش، سورج چاند اور ستاروں پر متفکرانہ نظر، اور بت پرستی کے خلاف نفرت کا شدید جذبہ کس بات کی شہادت ہے، حضرت اسمٰعیلؑ کا بے آب و گیاہ میدان میں پرورش پانا، چاہِ زمزم کا ظہور، آنے جانے والے قافلوں کا اس کی آبادی کی طرف میلان، چلنے پھرنے کے قابل ہوئے تو مقدس باپ کے ساتھ مقدس سفر کے لئے تیاری، اور اس کم سنی میں باپ کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پوری آمادگی، اور صبر و شکر اور تسلیم و رضا کا اظہار، کس مستقبل کی خبر دیتا ہے، ؟ حضرت اسحٰقؑ کا فرشتوں کی بشارت سے پیدا ہونا اور پیدائش سے پہلے ہی غلامِ علیہم (حجر-۴۰) کا خطاب پانا، پھر مقدس باپ کی جانشینی اور اور تسلیم کی مسجد کی پاسبانی کے لئے انتخاب، کس مقصود کا دیباچہ ہے، ؟

حضرت یوسفؑ کا بچپن میں رویائے صادقہ، اور صبر و فکر، اور پاکدامنی کس بات کی گواہی دیتی ہے، ؟ حضرت موسیٰؑ کی عین خطرہ میں پیدائش، حفاظت، پرورش اور نبوت سے پہلے ہی فرعونیوں سے تن تنہا مجاہدانہ آویزش، کس مبتدار کی خبر ہے، ؟ حضرت سلیمانؑ کا آغازِ عمر

میں علم و فہم فصلِ مقدمات کی قوت کس نتیجہ کے آثار ہیں، ؟ حضرت یحییٰؑ کی دایۂ پیدائش بچپن ہی میں اُن کی نیکی، سعادتمندی، نرم خوئی، پاکی، کس مقصد کی تمہید ہے، ؟ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش اور بچپن ہی میں نیکی، سلامت روی، توراۃ کی حقیقت رسی، کس روز روشن کی صبح ہے، ؟ اور خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دعائے خلیل، نوید مسیحا، رویائے آمنہ اور احوالِ ولادت و نشو و نما، مراسمِ شرک سے اجتناب، اخلاقِ حسنہ، دیانت، امانت، آثارِ خیر و برکت، نبوت سے پہلے ہی تنہائی پسندی، خلوت گزینی، حقیقت کی تلاش اور غور و فکر کس خورشید جہانتاب کا مطلعِ انوار ہے، ؟

حضرت اسماعیلؑ کا یہ حال ہے،

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ، فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ، قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى، قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (صفت)

تو ہم نے ابراہیم کو ایک بردبار لڑکے کی خوشخبری دی، جب وہ اُس کے ساتھ دوڑنے کی عمر کو پہنچا تو اس نے کہا کہ اے میرے بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تجھکو میں ذبح کر رہا ہوں، اس نے جواب دیا اے میرے باپ کر ڈال جو تجھ سے کہا گیا، تو مجھے خدا نے چاہا تو صبر کرنے

حضرت موسیٰؑ کو یہ خطاب ہے:۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى، اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى، (طٰہٰ۔ ۲)

اور ہم نے تجھ پر دوسری دفعہ احسان کیا جب تیری حفاظت اور پرورش کے متعلق تیری ماں کے دل میں یہ بات ڈال دی جو ڈالی گئی،

حضرت یحییٰؑ کی نسبت یہ ارشاد ہے،

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ط وَاٰتَيْنٰهُ
الْحُكْمَ صَبِيًّا لا وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَ
زَكٰوةً ط وَكَانَ تَقِيًّا لا وَّبَرًّا بِوَالِدَيْهِ
وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا وَسَلٰمٌ
عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ،

(مریم-۱)

نیز حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے،

كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ
صَبِيًّا، قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ
وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَمَا
كُنْتُ، (مریم-۲)

اے یحییٰ! کتاب (توراۃ) کو مضبوطی سے پکڑ،
اور ہم نے اُس کو فیصلہ کرنے کی قوت بچپن ہی
میں دیدی اور اپنے پاس سے رحم و مہر اور ستھرائی،
اور تھا پرہیزگار، اور اپنے ماں باپ کا فرمانبردار
اور نہ تھا زبردستی کرنے والا، نافرمان، سلامتی ہو
اُس پر جس دن پیدا ہوا،

ہم کیسے اس سے بات کریں جو ہنوز گہوارہ
میں بچہ ہے، عیسیٰؑ نے کہا میں خدا کا بندہ ہوں،
اس نے مجھے کتاب الٰہی دی، اور مجھے نبی ٹھہرایا،
اور مبارک بنایا، میں جہاں ہوں،

اور کہ "الامین" نبوت کے پہلے کی اپنی پوری زندگی، موقع شہادت میں بے خطر پیش کر دیتا ہے،

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ط
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ، (یونس-۲)

تو اس (پیغمبری کے دعوی) سے پہلے میں تم میں
ایک عمر گذار چکا ہوں کیا تم نہیں سمجھتے،

انبیاء علیہم السلام کے احوال مبارکہ کے یہ جزئیات باہم مل کر اپنی نسبت خود کلیہ منکر پیش کرتے ہیں۔
غیبی علم نبوت کا دوسرا سب سے اہم خاصہ اس کا غیبی علم ہے یعنی وہ علم جو عام انسانوں کی طرح

وجدان، احساس، یا عقل وقیاس سے نہیں، بلکہ براہِ راست صدائے غیب، یا رویائے صادقہ یا فرشتوں کے ذریعہ سے خدائے پاک سے حاصل ہوتا ہے، اسی کے آغاز سے نبوت کی استعداد بالقوہ کا عملی ظہور شروع ہو جاتا ہے، اس مسئلہ کو پوری طرح سمجھنے کے لئے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے،

علم انسانی کے ماخذ علم انسانی کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو بلا واسطہ ہوتا ہے، اور دوسرا وہ جو کسی واسطہ سے حاصل ہوتا ہے، بے واسطہ علم کی بھی تین قسمیں ہیں،

۱۔ وجدان: انسان کو اپنے جسمانی وجود اور اس جسمانی وجود کے اندرونی کیفیات کا علم سب سے زیادہ یقینی طور سے ہوتا ہے، ہر شخص کو اپنے وجود کا یقین ہے، اور اس کے اندر بھوک، پیاس، بیماری، صحت، غم، خوشی، خوف وغیرہ اندرونی تغیرات کا علم اُس کو بلا واسطہ از خود ہو جاتا ہے،

۲۔ فطرت: اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ ہر نوعِ مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ ایسی نوعی خصوصیتیں عطا ہوتی ہیں، جو دوسری نوعوں میں نہیں پائی جاتیں اور ان ہی سے باہم نوعوں کا اختلاف اور امتیاز ظاہر ہوتا ہے، ان نوعی خصوصیتوں کا علم ہر نوع کے افراد کو بلا کسی ذریعہ اور واسطہ کے از خود ہوتا ہے، اور اسی کو بعض علماء کی اصطلاح میں فطری یا نوعی الہام اور اہلِ فلسفہ کی اصطلاح میں "جبلت" کہتے ہیں، حیوانات کو اپنے متعلق بہت سی باتوں کا علم از خود فطرۃً ہوتا ہے: پرندوں کے بچوں کو دانہ چگنا، اور اڑنا کون سکھاتا ہے، آبی جانوروں کو تیرنے کی تعلیم کون دیتا ہے، شیر کے بچہ کو درندگی کا سبق کس معلم نے پڑھایا، انسان کے بچہ کو پیدا ہوتے ہی رونا، سونا، دودھ پینا کون سکھا دیتا ہے،

۳- ہدایتِ اوّلیہ۔ انسان کو کچھ ہوش و تمیز آنے کے بعد بلا دلیل بعض ایسی باتیں از خود یا بادنیٰ تامل اس طرح معلوم ہو جاتی ہیں کہ ان میں پھر کسی قسم کا شک و شبہہ راہ نہیں پاتا، دو اور دو چار ہوتے ہیں، برابر کا برابر، برابر ہوتا ہے، ایک ہی وقت میں ایک ہی چیز سیاہ و سپید دونوں نہیں ہو سکتی، ہر بنی ہوئی چیز کا کوئی بنانے والا ہوتا ہے، وغیرہ بہت سے ایسے ضروری مقدمات اور کلیات جن پر انسان کے استدلال کا تمام تر مدار ہے، اسکو بداہۃً معلوم ہو جاتے ہیں

یہ تو بلا واسطہ علم کی تین قسمیں تھیں، اس کے بعد علم انسانی کی وہ قسمیں ہیں جن کا علم اسکو کسی واسطہ سے ہوتا ہے، انسان کے پاس اس قسم کے دو واسطے ہیں، ایک احساس اور دوسرا عقل، پہلے سے وہ گرد و پیش کی مادی چیزوں کا، اور دوسرے سے اُن مادی چیزوں کا جو سامنے موجود نہیں، یا سرے سے خارج ہیں، موجود نہیں، بلکہ عالم الغیب میں ہیں، یا صرف ذہن میں ہیں، علم حاصل کرتا ہے؛

۴- انسان کے جسم کے اندر پانچ قسم کی جسمانی قوتیں ہیں، باصرہ[۱]، سامعہ[۲]، شامہ[۳]، ذائقہ[۴]، لامسہ[۵]، باصرہ[۶]، دیکھتی، سامعہ سنتی، شامہ سونگھتی، ذائقہ چکھتی، اور لامسہ چھوتی ہے، ان ہی کا نام حواس خمسہ ہے، انسان کے پاس یہی پانچ آلات ہیں، جن کے ذریعہ سے وہ اُن مادی چیزوں کے متعلق علم حاصل کرتا ہے، جو اس کے ان آلات سے آکر ٹکراتی ہیں، اسی کا نام احساس ہے، ہم چکھ کر مزا پاتے، سُن کر آواز پہچانتے، دیکھ کر صورت جانتے، چھو کر سختی و نرمی دریافت کرتے، اور سونگھ کر بو معلوم کرتے ہیں، ان حواس کے ذریعہ سے بھی جو علم ہمکو ہوتا ہے، وہ اکثر یقینی اور شاذ و نادر غلط بھی ہوتا ہے، کیونکہ وہ کبھی کبھی کسی سبب سے دھوکا بھی کھاتے ہیں، اور دریافت میں غلطی بھی کرتے ہیں اور

دلائل سے انکا یہ دھوکا اور ان کی غلطی ثابت ہوتی ہے، بیماری میں قوت ذائقہ بدل گئی ہے اور اسنے میٹھے کو کڑوا بتایا ہے، تیز حرکت میں قوتِ باصرہ نے ہمکو دھوکہ دیا ہے، ریل میں ہمکو ساکن اور ٹھہرتی ہوئی چیز چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، چلتے ہوئے جہاز میں جہاز ہم کو ٹھہرا ہوا معلوم ہوتا ہے، متحرک چنگاری کا نقطہ تیز سیدھی حرکت میں ہمکو آتشیں خط اور گول حرکت میں آتشیں دائرہ معلوم ہوتا ہے، آسمان کے چمکتے ہوئے بڑے بڑے ستارے کتنے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں لیکن کیا وہ حقیقت وہ ایسے ہی چھوٹے ہیں،

۵۔ علم بالواسطہ کی دوسری قسم وہ ہے جس کو ہم اپنی عقل و قیاس، غور و فکر اور استدلال کے ذریعہ سے حاصل کرتے ہیں، اسکی بنیاد در حقیقت اُن ہی معلومات پر ہوتی ہے، جن کا علم ہمکو اپنے وجدان، الہام فطری یا جبلت، بداہتِ اولیہ، اور احساس سے پہلے ہو چکا ہے، اور ان ہی معلوم شدہ امور پر غیر معلوم امور کو تمثیل یا استقرار کے ذریعہ سے قیاس کرکے اُن معلوم شدہ امور کے خصوصیات اور آثار کا حکم ان غیر معلوم لیکن مشابہ و مماثل امور پر لگا کر نیا نتیجہ حاصل کرتے ہیں، وہ غیر معلوم امر جس پر معلوم امور کے ذریعہ ہم کوئی حکم لگاتے ہیں، اگر مادی ہوتا ہے، تو نتیجہ چنداں غیر مشکوک نہیں ہوتا، سوائے اسکے کہ جزئیات کا استقرار پورا نہ کیا گیا ہو یا تمثیل تام نہ ہو، یا تجربہ و مشاہدہ نے دھوکہ دیا ہو، یا کوئی اور اصولی غلطی ہو گئی ہو، طبعیات اور سائنس کے مسائل اکثر اسی طرح معلوم کئے گئے ہیں لیکن اگر وہ مجہول غیر مادی ہو، تو مادی امور پر اس غیر مادی کو قیاس کرکے اسکی نسبت جو کچھ کہا جائیگا، اسکا مرتبہ ظن و تخمین سے آگے نہیں بڑھتا، مگر یہ کہ وہ تمام تر نظریات یا بدیہیات و محسوسات پر علانیہ منتہی ہو، مابعد الطبیعۃ اور فلسفہ الٰہیات کے مسائل

اسی طریقہ استدلال سے حاصل ہوتے ہیں، اور اسی لئے اُن میں اختلافات کی بڑی گنجایش نکلتی ہے، کیونکہ آخری نتیجہ اور ابتدائی بنیادی وجدانی یا بدیہی یا حسی مقدمات کے درمیان قیاسات کی کئی منزلیں ہیں، اور ان میں سے ہر منزل خطروں سے لبریز ہے، مشابہت و مماثلت میں دھوکا ہو سکتا ہے، عقلی اور وجدانی اور حسی اشیاء کے خواص کے درمیان اختلاف اور فرق ہو سکتا ہے، غور و فکر، بحث و نظر، تحقیق، جستجو اور ترتیب مقدمات جو قیاس عقلی کے کارکن اور فاعل ہیں، وہ اپنے کام میں دھوکا کھا سکتے ہیں، اسی لئے یہ علوم شکوک و شبہات سے لبریز ہیں،

ذرائعِ علم کے حصول کے زمانے اور ان کے مراتب

سطورِ بالا سے ہویدا ہے کہ ہمارے سب سے زیادہ یقینی علوم ہمارے وجدانیات اور فطریات ہیں، جو ہمکو قدرت کی طرف سے سب سے پہلے عنایت ہوتے ہیں کہ ہمارے وجود کی بقا اس علم پر موقوف ہے، جیسے بھوک اور پیاس کا احساس، اور اس علم کا یقینی ہونا بھی ضروری ہے، ورنہ ہم اپنا وجود قائم نہ رکھ سکیں گے، ہم کو جو بھوک پیاس لگتی ہے، کیا اسکے یقینی اور قطعی علم میں ہم سے غلطی ہو سکتی ہے، اور کیا کسی کے شک دلانے سے کہ ممکن ہے کہ تمکو بھوک نہ ہو، ممکن ہے کہ تمکو پیاس نہ ہو، کبھی بھوکے پیاسے کو اپنی بھوک اور پیاس کے متعلق شک ہو سکتا ہے، اور یہ احساس اور علم، وجود کے ساتھ ساتھ انسان کو ملتا ہے، یہانتک کہ آج کا پیدا شدہ بچہ بھی اس کا احساس کرتا اور علم رکھتا ہے، ورنہ وہ اپنے وجود کو قائم نہ رکھ سکے،

وجدانیات و نظریات کے بعد محسوسات کا علم انسان کو ملتا ہے، دیکھنا، سننا، چکھنا، سونگھنا چھونا، یہ ہماری پانچ حواس ہیں، جو ہمارے مادی علم کے آلات ہیں، اور جن کے غیر کوئی باہر کا علم

ہمارے اندر نہیں آسکتا، یہ احساسات بھی ایک ہی دفعہ نہیں کمال پاجاتے، بلکہ ضرورت کے مطابق حسبِ استعداد ملتے اور ترقی پاتے ہیں، اور پیدائش کے چند ماہ بعد یہ تکمیل کو پہونچتے ہیں، کیونکہ وجود کی بقا، اور ضروریات کی تکمیل ابھی سے ان پر رفتہ رفتہ موقوف ہوتی جاتی ہے،

محسوسات کے بعد بدیہیاتِ اولیہ کا درجہ آتا ہے انسان کو اپنے اس علم میں بھی وہی اذعان و قطعیت ہوتی ہے، دو دو چار ہوتے ہیں، دس پانچ کا دونا ہے، ایک چیز ایک ہی وقت میں دو جگہ نہیں ہوسکتی، ایک چیز ایک ہی وقت میں سیاہ و سپید نہیں ہوسکتی، ان بدیہی علوم کو ہر شخص مانتا، اور تسلیم کرتا ہے، مگر اس کا علم انسان کو بچپن میں نہیں ہوتا، بلکہ تمیز و رشد کے بعد ہوتا ہے کیونکہ اُسی وقت اُس کی ضرورت پیش آتی ہے، اگر یہ علوم اس سن میں اس کو عطا نہ ہوں تو وہ دنیا کے ضروری کاروبار چلانے کے لائق نہ دوسرے علوم کی دریافت کی، اس میں استعداد پیدا ہو، فطری احمق اور بیوقوف ان ہی کو کہتے ہیں، جن میں ان بدیہیات کا علم کم یا بالکل نہیں ہوتا،

سب سے اخیر میں اُس علم کا درجہ آتا ہے، جو وجدانیات، فطریات، بدیہیات اور محسوسات پر قیاس کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے، اور جس کو علم معقولات کہتے ہیں، اسی علم اور اسی کی قوت کی کمی بیشی کا نتیجہ ہے کہ انسانی عقلیں درجہ اور مرتبہ میں متفاوت ہوتی ہیں، ایک طرف تو (کمی کی سمت میں) وہ حماقت تک پہنچ جاتی ہیں، اور دوسری طرف (سمتِ کمال میں) عاقل تر اور عاقل ترین طبقہ تک اونچی ہوجاتی ہیں، یہانتک کہ وہ درجہ بھی آتا ہے کہ کسی کی عقل اس مرتبہ تک جا پہونچتی ہے، جہاں کوئی اس کا دوسرا حریف اور ہمسر نہیں ہوتا، ایک جاہل حبشی

سے لیکر ارسطو اور بوعلی سینا تک سب انہی عقلی مدارج کے مختلف انسانی نظائر ہیں، با این ہمہ یہ ظاہر ہے کہ اس علم کا طریقہ نہایت پُرخطر اور منزلِ مقصود ہمیشہ مشکوک رہتی ہے،

عام طور سے انسانی علم کے پانچ ذریعے اور طریقے سمجھے جاتے ہیں، لیکن درحقیقت ایک اور ذریعہ بھی ہے جس کا تعلق تمامتر ماورائے مادہ سے ہے، غور کیجیے کہ آپ کا سب سے پہلا علم یعنی وجدانیات آپ کے اندرونی حواس کا نتیجہ ہے، دوسرا یعنی فطریات کا علم خالقِ فطرت خود آپ کے اندر ودیعت رکھتا ہے، تیسرا علم یعنی محسوسات کا علم آپ کے اُن ظاہری حواس کا نتیجہ ہے، جو گو باہر ہیں مگر آپ کے جسم کے اندر ہیں، آپ کا چوتھا ذریعۂ علم یعنی بدیہیات اولیہ آپ کے حواس اور ذہن کا ایک مشترکہ فیصلہ ہیں، پانچواں ذریعۂ علم جو آپ کی عقل و ذہن کی قیاس آرائی ہے، وہ آپ ہی کے اندر کے داخلی قویٰ کا عمل ہے، تھوڑے تامل سے معلوم ہوگا کہ آپ کا علم وجدان سے لیکر ذہن تک بتدریج مادیت سے ترقی کرکے ماورائے مادہ کے قریب تک پہنچتا ہے، وجدان تمامتر ہماری اندرونی جسمانی مادیت ہے، جس میں کوئی شک نہیں، محسوسات بھی ہمارے ہی جسم کے مادی آلاتِ علم کے نتائج ہیں، بدیہیات، ہمارے حواس سے جو مادی ہیں، اور ہمارے ذہن سے جو غیر مادی ہے مشترک تعلق رکھتے ہیں، یعنی بدیہیات مادی اور غیر مادی ذرائع علم کے بین بین ہیں، اور معقولات تمامتر ذہنی اور غیر مادی ہیں تاہم اس غیر مادی قوت کا مرکز ہمارا مادی جسم ہی ہے، اور اس حد تک اس غیر مادی قوت کا ارادہ سے تعلق بہرحال ہوتا ہے،

غیر مادی علم | اب اس کے بعد اُس علم کا درجہ آتا ہے، جس کی سرحد اسکے بعد آتی ہے، اور جس کا تعلق مادہ سے اتنا بھی نہیں ہوتا، جتنا معقولات اور ذہنیات کا ہے، وہ تمامتر مادہ اور مادیات سے

پاک ہوتا ہے، اُس کو اتنا ہے اسی قدر لگاؤ ہوتا ہے کہ وہ علم مادی دل و دماغ کے آئینہ پر اُدھر سے اُکر اپنا عکس ڈالتا ہے،

اس غیر مادی علم کے بھی بہ ترتیب مختلف درجے ہیں، جن کو فراست، حدس، کشف، الہام اور وحی کہتے ہیں، اور جس طرح انسانی علم کے مذکورۂ بالا پانچوں ذریعے انسان کے جسمانی قویٰ سے متعلق تھے، اسی طرح یہ غیر مادی ذرائع انسان کے روحانی قویٰ سے وابستگی رکھتے ہیں اور جس طرح آپنے دیکھا ہے کہ وجدانیات سے لے کر عقلیات تک بہ ترتیب ہمارا ذریعۂ علم خالص مادی، کامل مادی، کم مادی، اور برائے نام مادی تک ترقی کرتا چلا گیا ہے، اسی طرح فراست، حدس، کشف، الہام اور وحی بھی برائے نام مادی روحانی سے لیکر پھر روحانی کامل، اور خالص روحانی کے ذریعہ تک ترقی کرتے چلے گئے ہیں،

فراست کے لفظی معنی تاڑ جانے کے ہیں، تاڑ جانے کی قوت ہر شخص میں نمایاں نہیں ہوتی مگر جس میں نمایاں ہوتی ہے، اُسکی یہ کیفیت ایک ملکہ کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے، جو تجربہ کی کثرت اور عمل کی مہارت اور کمال کے بعد انسان کو حاصل ہو جاتا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کے دیکھنے، سننے، چکھنے، سونگھنے یا چھونے کے ساتھ ہی صرف بعض علامتوں کے جان لینے سے دوسری متعدد ضروری علامتوں پر تفصیلی نظر ڈالے بغیر اتنی جلدی انسان صحیح نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ غیب کی بات بیان کر رہا ہے، حالانکہ اس کا علم تمام تر ظاہری علامتوں اور نشانوں پر مبنی ہوتا ہے جن کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے مگر دیکھتا نہ تھا، ایسے ماہرین اور ذی فراست اشخاص برابر ہر شخص کے مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں، جسکو جس چیز یا فن میں یہ ملکہ پیدا

ہو جاتا ہے، اُسکی فراست اسکو حاصل ہو جاتی ہی، جرائم کے پتہ لگانے والے ماہرین اور جاسوس اپنے فن کی فراست میں یہ کمال رکھتے ہیں، کہ صورت دیکھی اور تاڑ گئے، اسیطرح ہر علم و فن کے ماہروں کو اپنے اپنے فن کے اندر یہ ملکہ حاصل ہو جاتا ہے، اخبار اور نیکوکاروں کو اپنی جماعت کے افراد کے پہچان لینے اور جان لینے کی طاقت بھی اسی طرح حاصل ہوتی ہے، اور اسی کو ایک حدیث میں ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے،

اتقوا فراسۃ المؤمن فانہ ینظر بنور اللہ، (ترمذی)

مومن کے تاڑ لینے سے ڈرو کہ وہ خدا کی روشنی سے دیکھتا ہے،

۲۔ فراست کے بعد حدس کا درجہ ہے، فراست کے ابتدائی مقدمات حواس پر مبنی ہوتے ہیں، لیکن حدس کے ابتدائی مقدمات ذہنی اور عقلی ہوتے ہیں اور ان ہی ذہنی اور عقلی مقدمات کے غور و فکر، تلاش اور ترتیب سے نتیجہ حاصل ہوتا ہے، مگر فطری کمال یا فن کی حاصل کردہ مہارت کے سبب سے غور و نظر، فکر و تلاش، اور ترتیب مقدمات کے منطقیانہ مرحلوں کو ذہن اس تیزی اور سرعت کے ساتھ طے کر کے آخری نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ خود اسکو بھی اس کا احساس نہیں ہوتا، کہ اس نتیجہ کے حاصل کرنے میں اُس نے کوئی دماغی عمل بھی کیا ہی، یہ چیز بھی اکثر کامل العقل اور صائب الرائے انسانوں کو فطرۃً عطا ہوتی ہے، اور دنیا کے مشہور عقلا، اور دانایان روزگار کے واقعات میں اسکی کثرت سے مثالیں ملتی ہیں،

۳۔ کشف کے لفظی معنی تو کھولنے اور پردہ اٹھانے کے ہیں، مگر اس سے مقصود یہ ہے کہ مادیت کے ظلمانی پردہ کو چاک کر کے مادی چیز روحانی عالم میں مشاہدہ کے سامنے آجاتی ہے، وہ کبھی اصلی صورت میں اور کبھی ..... اپنی مثالی صورت میں نظر آتی ہے،

عام لوگوں کے سمجھنے کے لئے اسکی بہترین مثال خواب کی ہے فرق اتنا ہے کہ خواب عالم خواب کی بات ہے، اور کشف عالم بیداری کی، جس طرح عام لوگوں کو خواب میں جب ظاہری حواس بیکار ہو جاتے ہیں ایسی چیزیں معلوم ہوتی ہیں، جو کبھی کبھی عین واقعہ ثابت ہوتی ہیں، اسی طرح خاص لوگوں پر بیداری ہی میں ظاہری حواس کے معطل سے ایسا سماں پیش آتا ہے، ہر شخص کے تجربہ میں ایسے متعدد حیرت انگیز واقعات گذرتے رہتے ہیں

۴۔ الہام کے لفظی معنی "دل میں ڈالنے" کے ہیں اور اس سے مراد وہ علم ہے، جو محنت، تلاش، تحقیق، غور اور ترتیب مقدمات کے بغیر دل میں آجاتا ہے، اور ممکن ہے کہ اُس کی صحت بعد کو حسی تجربوں اور عقلی دلیلوں سے بھی ثابت ہو جائے، مگر خود وہ علم پہلے پہل ذہن میں کسی حسی تجربہ یا عقلی دلیل کے نتیجہ کے طور پر نہیں آتا، بلکہ خود بخود دل میں آجاتا ہے، کیوں آتا ہے، اور کہاں سے آتا ہے، اسکے جوابات مختلف ہو سکتے ہیں، مگر یہ واقعہ ہے، کہ وہ آتا ہے، اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، اسکی ابتدائی اور معمولی مثالیں وہ خیالات ہیں جو محققین، علماء شعراء اور موجدین کے ذہن میں پردۂ عدم سے پہلے پہل آتے ہیں اور وہ انکو دنیا کے سامنے اپنی ایجادات کی صورت میں پیش کرتے ہیں،

۵۔ وحی کے لغوی معنی کسی کا اپنے دلی منشا کو بول کو جنبش دیئے بغیر اخفاء اور آہستگی کے ساتھ دوسرے پر ظاہر کر دینا ہیں، اور اصطلاحاً اس کے معنی خدا کا اپنے دلی منشاء سے اپنے خاص بندوں کو کسی غیبی ذریعہ سے مطلع کرنا ہیں، یہ علم و اطلاع کے روحانی ذریعوں کی آخری سرحد ہے،

جس طرح علم کی تین جسمانی قسمیں یعنی وجدانیات، حسیات اور بدیہیات عام انسانوں کے ذریعہ یقینی ہیں، اسیطرح روحانی ذرائع علم کے یہ تین ذریعے کشف، الہام اور وحی انبیاء علیہم السلام

کے لئے یقینی ہیں، اور جس طرح علم کے مادی ذریعوں میں سے یقین کا سب سے پہلا ذریعہ وہ ہی، جو تمام مادی ہی یعنی وجدان، پھر حس ظاہر، اور پھر بدیہیات، اسی طرح علم کے روحانی واسطوں میں سب سے زیادہ یقینی وہ ہے، جو تمام تر روحانی ہے، یعنی وحی، پھر الہام پھر کشف،

ہم نے علم کے روحانی ذرائع کی جو تین قسمیں کی ہیں، یعنی وحی، الہام، اور پھر کشف، یہ قرآن پاک کی اصطلاحیں نہیں ہیں، اُسکی اصطلاح میں روحانی ذریعۂ علم کا نام مکالمہ الٰہی (خدا سے بات کرنا) اور اُس کی حسب ذیل تین قسمیں بیان کی ہیں،

۱۔ وحی (اشارہ) سے بات کرنا، یعنی دل میں کسی معنی کا بغیر آواز اور الفاظ کے آجانا، یہ اگر حالتِ بیداری میں ہو تو کشف ہے، اور اگر خواب میں ہے تو رویا ہے،

۲۔ خدا کا پردہ کے پیچھے سے بات کرنا، یعنی متکلم نظر نہیں آتا، مگر غیب سے آواز آتی ہے، اور الفاظ سنائی دیتے ہیں، اس کو الہام کہہ لو،

۳۔ فرشتہ کے ذریعہ سے بات کرنا، یعنی فرشتہ خدا کا پیغام لیکر سامنے نظر آتا ہے، اور اسکے منہ سے وہ الفاظ ادا ہوتے ہیں، جنکو سن کر نبی محفوظ کر لیتا ہے، اسی کو عام طور سے وحی کہتے ہیں، کیونکہ قرآن پاک کا نزول اسی آخری طریقہ سے ہوا ہے، لیکن اس شہرتِ عام کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ اور دوسرے دو طریقے وحی کی قسمیں نہیں ہیں، وحی کی ان اقسام کا ذکر سورۂ شوریٰ میں ہے،

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ (شوریٰ ۵)

اور کسی آدمی کی یہ تاب نہیں کہ اللہ اس سے بات کرے، لیکن وحی (اشارہ) سے یا پردہ کے پیچھے سے یا کسی قاصد کو بھیجے تو وہ خدا کے حکم سے خدا جو چاہے اسکو وہ وحی کر دیتا ہے،

مکالمۂ الٰہی کے یہ تینوں طریقے، یعنی وحی (اشارہ) سے بات کرنا، پردہ کے پیچھے سے بات کرنا، اور فرشتہ کے ذریعہ سے بات کرنا، وحی کی یہ تین مختلف قسمیں بھی ہیں اور پھر ان تینوں کا اجمالاً مشترک نام بھی وحی ہے، یعنی یہ مقسم بھی ہے، اور اپنی تین قسموں میں سے بھی ایک پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، اسی آیت میں دیکھو کہ فرشتے کے ذریعہ سے کلام کو بھی وحی فرمایا گیا، اور تینوں مذکورۂ بالا طریقوں میں جس طریقے سے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غیبی تعلیم و اطلاع دی گئی ہے، اسکو بھی وحی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، یعنی وہ عام مکالمۂ الٰہی کے مرادف بھی مستعمل ہوا ہے،

مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ط اِنْ هُوَ	نبی خواہشِ نفس سے کلام نہیں کرتا
اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى، (نجم-۱)	بلکہ وہ وحی ہوتی ہے، جو اسکو کیجاتی ہے

الغرض اسی امتیاز کے لئے علمی اصطلاحات میں[1] ان تینوں طریقوں کے لئے کشف، الہام اور وحی کے تین علیحدہ علیحدہ الفاظ وضع کر دیئے گئے ہیں، تاکہ بول چال میں ہر روحانی طریقۂ گفتگو دوسرے سے ممتاز ہو جائے، بیداری میں اشارہ سے بات کرنا کشف ہے اور خواب کے عالم میں رویا ہے، پردہ کے پیچھے سے آواز کا آنا الہام ہے، اور فرشتہ کی وساطت سے بات کرنا وحی ہے،

نکتہ، اوپر کی آیت میں جہاں اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ کسی بندہ کی یہ تاب نہیں کہ خدا اس سے بات کرے، لیکن ان تین طریقوں سے، اس کے آخر میں فرمایا ہے کہ وہ سب سے بلند اور

---

[1] ان اصطلاحات کی بحث کے لئے اصول فقہ کی اہم کتابوں کی طرف توجہ کرنی چاہیئے، کم از کم اس موقع پر تحریر ابن ہمام المتوفی ۸۶۱ھ کی شرح التقریر والتحریر لابن امیر الحاج المتوفی ۸۷۹ھ جلد سوم ص ۹۵ مطبوعہ امیریہ بولاق مصر ۱۳۱۶ھ دیکھنی چاہیئے،

حکیم ہے، یعنی اس کی بلندی و برتری کا اقتضا تو یہ ہے کہ وہ کسی کو اپنے مکالمہ کے شرف کا مستحق نہ سمجھے، مگر اس کی حکمت کا اقتضا یہ ہے کہ وہ اپنے بندگانِ خاص سے عام بندوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے ان تین غیر معمولی طریقوں میں سے کسی طریقہ سے گفتگو فرمالے،

بہر حال غیبی ذریعۂ اطلاع کی یہ سب سے بلند قسم جس کو اصطلاح میں وحی کہتے ہیں، اُس کا تجربہ عام لوگوں کو نہیں، لیکن اس سے نیچے درجہ کے غیبی ذرائع اطلاع کا تجربہ ہر شخص کو تھوڑا بہت ہے، اور ہر انسان کی زندگی میں جو بعض پُر اسرار اور ناقابلِ فہم واقعات پیش آتے ہیں اُن پر غور کرنے سے غیب کے اس اعلیٰ ترین ذریعۂ علم کا دھندلا سا خاکہ ذہن میں آسکتا ہے، جس سے غیر جسمانی اور غیر حسی مادی ذرائع علم کے سمجھنے اور باور کرنے میں جو استبعاد معلوم ہوتا ہے وہ دور ہو سکتا ہے، خصوصاً اس عہد میں جب سائیکالوجی کی تحقیقات سے نفس کی بہت سی نامعلوم طاقتوں کا پتہ چل رہا ہے، اور اسپیچولزم کے ذریعہ ارواح سے خطاب کلام کی سلسلہ جنبانی ہو رہی ہے، اور جدید روحانیات کا فن ایک مستقل سائنس کی صورت اختیار کر رہا ہے،

انبیا علیہم السلام کو اپنے کشف، الہام اور وحی پر اتنا ہی یقین ہوتا ہے، جس قدر عام انسانوں کو اپنے وجدانیات، محسوسات، فطریات اور بدیہیات پر، انبیا کا یہ روحانی علم ایسا ہی اندرونی ہوتا ہے، جیسا عام انسانوں میں وجدانیات، فطریات اور بدیہیات و محسوسات کا علم ہوتا ہے، جس طرح کسی شخص کو اس علم میں دھوکا نہیں ہو سکتا کہ اسکو بھوک یا پیاس معلوم ہو رہی ہے، یا اسکو غم یا خوشی ہے، اسی طرح نبی کو بھی اپنے روحانی وجدانیات میں دھوکہ نہیں ہوتا، اور جس طرح تمکو اپنے فطریات میں یہ مغالطہ نہیں ہوتا کہ دو اور دو چار نہیں ہوتے

اسی طرح اسکو بھی پیغمبرانہ فطریات میں مغالطہ واقع نہیں ہوتا، اور جس طرح تمکو اپنے محسوسات میں اگر کسی کو سامنے دیکھ رہے ہو، یا کسی کی آواز سن رہے ہو، شبہہ نہیں ہوا کرتا، اسکو بھی اپنے روحانی محسوسات میں شبہہ نہیں ہوا کرتا، غرض وہ اپنے ان جملہ غیبی اور روحانی ذرائع علم میں ہر لغزش، فریب، خطا اور غلطی سے اسی طرح پاک ہوتا ہے، جس طرح تم اپنے وجدانیات، فطریات، محسوسات اور بدیہیات میں غلطی اور خطا سے پاک ہوتے ہو،

علم غیب اسلام کے عقیدہ میں غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں، قرآن پاک میں بار بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اعلان کی ہدایت ہوئی ہے،

فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ (یونس-۲۰) — تو کہدے اے پیغمبر کہ غیب خدا کے لئے ہے

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ (نمل-۸) — کہدے کہ آسمانوں میں اور زمین میں خدا کے سوا کوئی نہیں جسکو غیب کا علم ہو،

رسول کہتے ہیں،

وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ (انعام-۵) — اور میں غیب نہیں جانتا،

لیکن اسی کے ساتھ دو موقعوں پر یہ بھی کہا گیا ہے، کہ با ایں ہمہ خدا اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو غیب کی اطلاع دیتا ہے،

سورۂ جن میں ہے،

فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا، اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ، (جن-۲) — تو اللہ اپنے غیب کی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتا، لیکن اس پیغمبر پر جس کو پسند کرے

دوسری جگہ سورۂ آلِ عمران میں ہے،

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ، (ص-۱۸۰)

اور نہ تھا اللہ کہ غیب کی باتوں پر تم کو مطلع کرتا، لیکن یہ کہ اللہ اپنے پیغمبروں میں سے جس کو چاہے چن لیتا ہے،

ان دو آیتوں سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو غیب کی باتوں کی اطلاع دیتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جن آیتوں میں غیب دانی کی کلیتہً اور قطعًا نفی کی گئی ہے، اُن سے مراد ذاتی اور حقیقی علم ہے، یعنی خدا کے سوا بالذات کسی کو غیب کا علم نہیں، البتہ خدا کے واسطہ اور ذریعہ سے اور اُس کی تعلیم و اطلاع سے پیغمبروں کو اس کا علم حاصل ہوتا ہے، ساتھ ہی آیت الکرسی میں فرما دیا گیا،

وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ج (بقرہ ۱۰-۳۴)

اور وہ خدا کے ذرۂ علم کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے، لیکن اتنے کا جتنے کا وہ چاہے،

یعنی اپنے علوم غیب سے جتنا اور جس قدر وہ پسند کرتا ہے، اور مصلحت سمجھتا ہے، وہ اُن کو بذریعۂ وحی ان سے واقف کرتا رہتا ہے، با ایں ہمہ بعض باتوں کی نسبت جیسا کہ سورۂ ہود اور لقمان میں ہے، اللہ تعالیٰ نے قطعی طور سے یہ فیصلہ کر دیا ہے، کہ ان کا علم کسی کو نہیں، مثلاً قیامت، بارش، موت، تم کو مادر میں لڑکا ہے یا لڑکی، کل کیا ہوگا؟ ان باتوں کو خدائے تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اسی طرح بعض آیتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ اس کا تمکو علم نہ تھا جیسا کہ غزوۂ تبوک میں عدم شرکت کے بعض عذر خواہ لوگوں کے متعلق سورۂ توبہ میں ہے کہ اُنھوں

نے جھوٹی قسمیں کھاکر اجازت حاصل کرلی، خدا نے فرمایا،

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ، (توبہ - ۷)

خدا نے تجھ سے درگذر کیا، کیوں تو نے انکو اجازت دی تاآنکہ تجھے معلوم ہو جائے جو سچ بولے اور جھوٹوں کو جان لیتا،

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ (توبہ)

انھوں نے پہلے فتنہ پیدا کرنا چاہا، اور تیرے سامنے واقعات الٹ دیئے، یہانتک کہ حق بات آگئی، اور خدا کی بات کھل گئی اور وہ ایسا نہیں چاہتے تھے،

آگے چل کر ہے،

مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۖ لَا تَعْلَمُهُمْ ۖ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۚ (توبہ - ۱۳)

یہ نفاق پر اڑے ہیں، تو ان کو نہیں جانتا ہم جانتے ہیں،

ان آیتوں سے یہ واضح ہے کہ پیغمبروں کو غیب کا کلی علم نہیں ملتا بلکہ ان کو غیب کی اطلاع دیئے جانے کے موقع کی دونوں آیتوں میں رسول ہی کا لفظ استعمال کرنا اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے، کہ جن امور غیب کی اطلاع پیغمبروں کو دیجاتی ہے، اُن کا تعلق فریضۂ رسالت اور اسکی مصلحتوں اور شریعتوں سے ہے،

غیب کی حقیقت علم غیب کے اس نادیدہ راستہ میں اتنی منزل طے کر لینے کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے، کہ قرآن مجید کی اصطلاح میں غیب کس کو کہتے ہیں، ؟ قرآن مجید کے اس لفظ کے استعمال کے تمام مواقع پر غور کرنے سے اُس کے اجمالی اور تفصیلی دونوں معنی واضح ہوتے ہیں:

اجمالاً اس کا اطلاق ان اُمور پر ہوتا ہے جن کا علم انسان اپنے علم کے عام اور طبعی و فطری ذریعوں سے حاصل نہیں کر سکتا، گذر چکا ہے کہ انسانی علم کے طبعی ذریعے، وجدان، حواس اور عقل و استدلال وغیرہ ہیں ان طبعی ذریعوں سے جو ہر انسان کو ملے ہیں، جو علم حاصل نہیں ہوتا، اسکو علم غیب کہتے ہیں یعنی اُس شے یا اُن اشیاء کا علم جو انسان کے ظاہری و باطنی حواس اور دماغی قویٰ کی نگاہوں کے سامنے سے غائب ہیں، اور اس کا مقابل لفظ شہادت ہے جس کے معنی حاضر ہونے کے ہیں یعنی وہ اشیاء جو ہر انسان کے حواس اور قوائے دماغی کے سامنے ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ اپنے کو بار بار عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ کہا ہے (انعام، رعد، حشر، تغابن) یعنی انسانوں کے طبعی ذرائع علم کے سامنے جو حاضر ہے، اور غائب ہے، ان سب کا عالم اور واقف کل وہی ہے،

الغرض اجمالاً علم غیب اُس غیبی طریقہ علم کا نام ہے، جو عام انسانوں کو نہیں ملا ہے،

تفصیلی حیثیت سے قرآن پاک میں غیب کا اطلاق چار چیزوں پر ہوا ہے،

۱۔ زمانۂ ماضی کے واقعات جن کا علم بعد کو نہ تو حواس کے ذریعہ ہو سکتا ہے کہ حواس سے صرف شاہد (سامنے موجود) کا علم ہوتا ہے، اور نہ عقل و فکر کے ذریعہ ہو سکتا ہے اگر ہو سکتا ہے تو تحریر و روایت کے ذریعہ، لیکن جس کے لئے تحریر و روایت کا ذریعہ یقینی طور سے مسدود ہو، اس کے لئے ان کا علم اگر ہو سکتا ہے تو غیبی ہی ذریعہ سے ہو سکتا ہے،

حضرت نوحؑ کے مختصر قصہ کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

تِلْكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ	یہ غیب کی بعض خبریں ہیں ہم انکو وحی کرتے
مَا كُنتَ تَعْلَمُهَا أَنتَ وَلَا قَوْمُكَ مِن	ہیں، تیری طرف تو تو انکو پہلے سے جانتا ہی

قَبْلِ هٰذَا ط (ھود-۴) تھا، اور نہ تیری قوم جانتی تھی،

حضرت مریمؑ کے قصہ میں ارشاد ہوتا ہے،

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۠ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ (آل عمران-۵)

یہ غیب کی خبروں میں سے ہے اُس کو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں، اور نہ تو اُنکے پاس موجود تھا جب وہ اپنے قلم (قرعہ کے طور پر) ڈال رہے تھے کہ کون مریم کو پالے اور نہ تو اُنکے پاس اس وقت تھا جب وہ جھگڑ رہے تھے،

دیکھو کہ محسوس واقعات کے علم کا طبعی طریقہ اس وقت موجود رہ کر دیکھنا اور سننا تھا، اُسکی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نفی کی گئی، کہ آپ وہاں یقیناً اس وقت موجود نہ تھے، اب رہ گیا کسی دوسرے انسانی ذریعہ سے سننا اس کی بھی نفی پہلے ہی سے ہے کہ تیری قوم میں سے بھی کسی کو معلوم نہ تھا، اور نہ دوسروں سے معلوم کیا، اب اس کا علم جس غیر طبعی طریقہ سے رسول کو دیا گیا، وہ وحی کا ذریعہ ہے،

اسی طرح حضرت یوسفؑ کے پورے واقعہ کے ذکر کے بعد فرمایا،

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ (یوسف-۱۱)

یہ غیب کی خبروں میں سے ہے ہم اسکو تیری طرف وحی کرتے ہیں اور تو اس وقت انکے پاس نہ تھا جب وہ اپنا کام طے کرنے لگے اور جال چل رہے تھے،

اس میں بھی علم شاہد کی نفی کر کے علم غائب کو ثابت کیا گیا ہے، بہرحال ان آیتوں سے واضح ہے کہ ماضی کے واقعات کے غیر طبعی طریقۂ علم کو بھی علم غیب کہا گیا ہے،

۲- اسی طرح آیندہ مستقبل میں جو واقعات ہونے والے ہیں، اُن کو بھی غیب کہا گیا ہے، کہ علم دلائل وقیاس کے ظنی ذرائع کے علاوہ غیر ظنی ذریعہ سے ہوا ہو، تو اُسکو بھی علم غیب کہیں گے، قرآن پاک میں ایک موقعہ پر ان کفار کے جواب میں جو نشانیوں کے طالب تھے یہ کہا گیا،

فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا	تو کہدے کہ غیب کا علم خدا ہی کیلئے ہے، انتظار
اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ (یونس)	کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنیوالوں

مستقبل کے منتظرہ واقعات کو اس آیت میں "غیب" کہا گیا ہے، اسی طرح قیامت کو بار بار غیب کہکر غیر خدا سے اُس کے علم کی نفی کی گئی ہے،

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ (لقمان)	خدا ہی کے پاس قیامت کا علم ہے،
يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا	وہ قیامت کو پوچھتے ہیں، کہدے کہ اس
قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ (اعراف ۲۳)	کا علم میرے پروردگار کے پاس ہے،

اسی طرح مستقبل کے دوسرے واقعات کے علم کی بھی انسانوں سے نفی کی گئی ہے،

وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ	کوئی نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کریگا، اور
غَدًا وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ	نہ کوئی یہ جانتا ہے کہ وہ کس سرزمین
تَمُوْتُ، (لقمان-۴)	میں مریگا،

۳- اُن چیزوں پر بھی غیب کا اطلاق کیا گیا ہے، جو گو ماضی اور مستقبل نہیں، بلکہ زمانۂ حال میں موجود ہیں، تاہم انسان کے حواسِ خمسہ اور عقل کی محدود طاقت سے اُن کا علم نہیں ہو سکتا، ہم کو دیکھنے اور سننے کی طاقت دی گئی ہے، مگر اس کے لئے کسی نہ کسی مسافت، عدم حجاب، اور

دیگر چند شرائط کی قید لگادی گئی ہے، جن کے بغیر ہماری یہ طاقت بالکل بیکار ہے، ہم دلی میں بیٹھ کر، بمبئی کے پیش نظر مناظر کو نہیں دیکھ سکتے، اور نہ بغیر آلات کے ہم یہاں سے وہاں کی آواز آج بھی سُن سکتے ہیں، اس لئے زمانۂ حال کے علم کے لئے بھی جو طبعی شرائط اور قیود ہیں، اُن کے بغیر جو علم حاصل ہوگا، وہ غیب ہوگا،

حاملہ عورت سامنے موجود ہے، مگر اُس کے بطن کے پے در پے حجابات کے اندر جن کو آنکھیں چاک نہیں کر سکتیں کیا ہے، ؟ کس کو معلوم،

وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ، (لقمان-۴) اور اللہ جانتا ہے، رحموں کے اندر جو ہے،

آسمان و زمین میں اس وقت جو کچھ ہے، وہ سب زمانۂ حال میں سب کے سامنے موجود ہے، تاہم اُس کا علم ہمارے حواس اور عقل کی محدود دسترس سے اُس وقت تک باہر ہے، جب تک ہمارے دیکھنے اور سُننے اور جاننے کے لئے خدا نے جو طبعی شرائط بتا دیئے ہیں، وہ پورے نہ ہوں،

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (هود-۱۰) اور خدا ہی کیلئے ہے، آسمانوں اور زمین کا غیب،

إِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ، (حجرات-۱) بیشک خدا جانتا ہے آسمانوں اور زمین کا غیب،

۴۔ تمام غیب کی آخری چیز وہ امور ہیں، جو غیر مادی ہونے کی وجہ سے ہمارے حواس اور عقل کے تنگ دائرۂ عمل سے قطعاً باہر ہیں، ہم فرشتوں کو نہیں دیکھتے، خدا کی رویت کی صلاحیت نہیں رکھتے، جنت اور دوزخ ہمکو یہاں نظر نہیں آسکتی، یہ تمام امور بھی غیب ہیں،

اَلَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ (انبیاء-۴) تو جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں، غیب ہیں،

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ (بقرہ-۱) وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں غیب ہیں،

وَالَّتِیْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَہٗ بِالْغَیْبِ (مریم - ۴)

وہ جنّت جس کا وعدہ اس مہربان خدا نے اپنے بندوں سے کیا ہی، غیب میں،

"غیب" "مین" کے معنی ہیں، بے جانے، بن دیکھے، حواس سے علم حاصل کئے بغیر، اور باوجود اُس کے کہ وہ چیزیں اس عالم میں دیکھی نہیں جاسکتی ہیں،

پیغمبر کو اللہ تعالیٰ غیب کی جن باتوں سے آگاہ کرتا ہے، وہ ان چاروں قسم کے امورِ غیب ہوتے ہیں، بعض گذشتہ قوموں اور پیغمبروں کے عبرت انگیز، اور نصیحت آمیز حالات سے بھی روایت اور تحریر کے ذریعہ کے بغیر وحی کے واسطہ سے اُن کو مطلع کرتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید کے حوالوں سے اوپر گذر چکا، آیندہ مستقبل میں دنیا کے فتنوں، امتِ محمدیہ کے انقلابات، قیامت کے مناظر اور اُس کے بعد کے پیش آنے والے واقعات کا علم آپؐ کو دیا گیا، جیسا کہ ان دنیاوی پیشینگوئیوں اور قیامت و محشر کے اُن مناظر سے ظاہر ہے، جو قرآنِ پاک اور احادیث صحیحہ میں بتصریح مذکور ہیں، اسی طرح حال کے ان احوال و مناظر کا علم بھی ثابت ہے، جو باوجود سامنے موجود ہونے کے احساس و تعقل کے طبعی شرائط نہ پائے جانے کے سبب سے عام انسانوں کو نظر نہیں آتے، قبروں کا انکشاف، پسِ پردہ رویت، دوسروں کے موجودہ احوال سے واقفیت وغیرہ، اس علمِ غیب میں سے بھی پیغمبر کو عطا ہوتا ہے، اور سب سے آخر میں وہ مغیبات ہیں، جن کا احساس و تصور ہمارے مادّی ذرائعِ علم سے قطعاً خارج ہے، تاہم وہ بھی اُسکو دکھائے اور بتائے جاتے ہیں، خود خدا کا دیدار، فرشتوں کی رویت، جنت و دوزخ کا مشاہدہ وغیرہ، اُن تمام امورِ غیب میں سے اللہ تعالیٰ جس رسول کے لئے جس قدر مناسب اور سزاوار سمجھتا ہے، اس کا علم وحی کے مختلف اقسام

کے ذریعہ سے اس کو عطا فرماتا ہے،

وحی اور ملکۂ نبوت حکمائے اسلام نے وحی کی حقیقت "ملکۂ نبوت" کے لفظ سے ظاہر کی ہے، اس کی تشریح یہ ہے کہ ترتیبِ کائنات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ کائنات میں علم اور تعقل نے پستی سے بلندی کی طرف رفتہ رفتہ ترقی کی ہے، جمادات بے حس ہیں اُن کے اوپر نباتات ہیں، جن میں صرف محدود احساس ہوتا ہے، اور دماغی قویٰ، حافظہ، تذکر اور غور و فکر کی قوت سے وہ محروم ہیں، ان سے اونچے حیوانات ہیں، جن میں یہ تمام قویٰ ناقص طریقے سے نمودار ہوتے ہیں، اور آخر میں اُن سے بالاتر ہستی، یعنی انسان میں جاکر یہ قویٰ پورے کمال میں ظاہر ہوتے ہیں، ان قویٰ کی ترقی یہیں تک محدود نہیں ہے، بلکہ جس طرح نباتات میں قوتِ احساس ہے، جس سے جمادات محروم ہیں، اور حیوانات میں حافظہ، تصور، تعقل وغیرہ کے وہ قوانین ہیں جو نباتات میں نہیں، انسان میں وہ دماغی و ذہنی قویٰ ہیں جو حیوانات میں نہیں، اسی طرح انبیا میں علم و تعقل کی ایک ایسی قوت موجود ہوتی ہے، جو عام انسانوں میں نہیں ہوتی، اور اسی کا نام ملکۂ نبوت ہے،

حواس صرف مادیات کو دریافت کرتے ہیں، دماغی قویٰ مادیات سے بلند ذہنیات اور عقلیات کو، اور ملکۂ نبوت اس سے بھی اونچا جاتا ہے، وہ ذہنیات و عقلیات سے بلند تر حقائق یعنی غیبیات کو دریافت کرتا ہے، اس ذریعۂ علم میں غور و بحث اور منطقیانہ فکر و نظر اور ترتیبِ مقدمات کی ضرورت نہیں پڑتی، بلکہ حقائق اس طرح سامنے آتے ہیں، جس طرح وجدانیات، فطریات، بدیہیات اور محسوسات سامنے آتے ہیں، اور ان ہی کی طرح

وہ یقینی بھی ہوتے ہیں، اور چونکہ اس ذریعہ میں علم انسانی کے عام ذریعے اور طریقے، یعنی وجدان، فطرتِ نوعی، بداہتِ اولیہ، احساس اور غور و فکر سے معلومات حاصل نہیں کئے جاتے بلکہ خود علّام الغیوب وہ علم ان انسانی وسائط کے بغیر ان کو عطا کرتا ہے، شرع کی زبان میں اسی کو وحی و الہام کہتے ہیں، علم کلام کی اصطلاح میں بلکہ نبوت اور عام محاورہ میں اسکو غیبی علم کہہ لیجئے،

لیکن اہلِ نقل کی اصطلاح میں وحی کی یہ صورت نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو وقتاً فوقتاً احکام اور ارادوں سے براہِ راست فرشتوں کے ذریعہ سے مطلع کرتا رہتا ہے، یہی وحی ہے،

امعانِ نظر سے معلوم ہوگا کہ اہلِ عقل و نقل کے اختلاف کا منشا یہ ہے کہ آیا یہ وحی خود پیغمبر کے ما فوق اور غیر معمولی وہبی علم و فہم کا نتیجہ ہوتی ہے، یا خود براہِ راست وقتاً فوقتاً تعلیمِ ربانی کا دوسرے لفظوں میں یہ کہو کہ جس طرح عام انسانوں میں علم و فہم کی قوت آغازِ پیدائش ہی میں فطرۃً ودیعت کر دیجاتی ہے، اسی طرح انبیاء میں منشائے الٰہی جاننے کی قوت بھی شروع ہی میں ودیعت کر دیجاتی ہے، یا یہ کہ وہ فطرۃً تو ویسے ہی عام انسانی طریقہ کا طبعی علم و فہم رکھتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نبوت کے بعد اپنے منشائے الٰہی سے اُن کو کسی غیبی ذریعہ سے وقتاً فوقتاً آگاہ کرتا رہتا ہے،

لیکن واقعہ یہ ہے کہ حقیقت، عقل کی نقل سے اور نقل کی عقل سے علیحدگی میں نہیں بلکہ اتحاد میں ہے، وہ لوگ جو عقل و نقل دونوں کے جامع ہیں، وہ ان دونوں کو جمع کرتے ہیں،

ع: یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

انبیاء علیہم السلام میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بد فطرتاً اور آغازِ پیدائش سے ان

امور کے متعلق جن کا اُن کی رسالت و نبوت سے تعلق ہے، اور جن کو دین کہتے ہیں، وہ کلّی استعداد عمومی فہم ہوتی ہے، جس سے غیر انبیاء محروم ہیں، اور اس پوشیدہ قوت کا عملی ظہور اُس وقت سے شروع ہوتا ہے، جب وہ نبوت کے منصب پر عملاً سرفراز ہوتے ہیں، اسی کا نام "ملکۂ نبوت" ہے، اور اہم امورِ دین کے متعلق اُن کو وقتاً فوقتاً جو غیبی اطلاع ملتی رہتی ہے، اُس کا نام "وحی" ہے،

آج کل قرآن فہمی اور عقل کے دعویوں اور نقل کے لفظی پابندوں میں جو اختلاف ہے، وہ دراصل انہی دو قوتوں کے درمیان تمیز نہ کرنے کا نتیجہ ہے، نقل کے لفظی پابند یہ سمجھتے ہیں کہ ہر لفظ جو نبی کے منہ سے نکلتا ہے، وہ اس معنی میں وحی ہے، جس معنی میں قرآن ہے، کہ وہ براہِ راست خدا کی غیب کی اطلاع ہے، اور عقل کے مدعی یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن بیشک خدا کی براہِ راست وحی ہے، مگر اُس کے ماسوا رسول جو کچھ کہتا ہے، وہ اُس کے پیغمبرانہ نہیں، بلکہ انسانی و بشری علم و فہم کا نتیجہ ہے، لیکن حقیقت ان دونوں کے ماورا ہے، جیسے وحیِ قرآنی، وحی براہ راست ہے، اسی طرح نبی کے دوسرے احکام اُس کے عام انسانی و بشری علم و فہم کا نہیں، بلکہ اُس کی پیغمبرانہ وہبی قوتِ علم و فہم کا نتیجہ ہیں، جو وحی کی ایک دوسری قسم اس لئے کہی جا سکتی ہے کہ اُس کا منشاء ملکۂ نبوت کے ذریعہ وحیِ ربانی کی ترجمانی ہے، اس لئے پیغمبر کی وحی اور ملکۂ نبوت دونوں کے احکام واجب الاتباع ہیں،

کتاب اور سنت اس تقریر کا منشا یہ ہے کہ پیغمبر کو جو علم حاصل ہوتا ہے، اس کی دو قسمیں ہیں، ایک وحیِ جلی یعنی وہ علم جس کو اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً اپنے خاص الفاظ میں پیغمبر پر نازل کرتا رہتا ہے، اور جس کے مجموعہ کو کتابِ الٰہی، صحفِ ربانی، توراۃ، انجیل، زبور اور قرآن کا نام دیا گیا ہے، دوسرا

وہ علم جو پیغمبر کے ملکۂ نبوت یا فہمِ نبوت کا نتیجہ ہوتا ہی، پہلا علم اصلی اور دوسرا فرعی ہی، یا یوں کہو کہ پہلا اصولی اور دوسرا فروعی ہے، یعنی علم اوّل، پیغمبر پر شریعت کے غیر متبدل اور ازلی احکامِ کلیہ اور مہمات کو واضح کرتا ہے، اور دوسرا علم پہلے علم کے غیر متبدل کلّی اصول کے ماتحت اسکے مقصود کی صحیح تشریح اور اُس کے جزئیات کی ضروری تفصیل کرتا ہے، اور غیر اہم اور متبدل امور کے متعلق ہنگامی اوقات میں مصلحتی احکام بتاتا ہے، اور اسی دوسری قسم کا علم ہے، جو روایات اور احادیث کی صورت میں ہے، اور جس کو اہلِ اصول اصطلاحاً سنت کہتے ہیں

کتاب اصولی احکام ہیں اور سنت ان اصولی احکام عملی تشریح اور بیان ہے، کتاب براہ راست وحیِ الٰہی کا نتیجہ ہے۔ اور سنت ملکۂ نبوت اور فہم نبوی کا، کتاب بلفظہٖ وحی ہے، اور سنت بالمعنی

وحی متلو اور وحی غیر متلو

بعض علماے اصول نے کتاب اور سنت دونوں کو وحی مانا ہے، اور ان دونوں کے درمیان تفریق یہ کی ہے کہ کتاب اُس وحی کا نام ہے، جس کی تلاوت کیجاتی ہے، اور سنت اس وحی کو کہتے ہیں، جس کی تلاوت نہیں کیجاتی، اس تشریح کا مقصود حقیقۃً تلاوت و عدم تلاوت کا فرق نہیں ہی، بلکہ یہ ہے کہ کتاب میں معنی کے ساتھ الفاظ بھی وحی کئے گئے ہیں اور وہ الفاظ بھی محفوظ ہیں، انکا حرف حرف اور نقطہ نقطہ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ کی پیشین گوئی میں داخل ہے، اور اس لئے اس میں الفاظ کی کمی بیشی اور حذف و اضافہ محال ہی، اور سنت میں الفاظ کی نہیں صرف معانی کی حفاظت ہی، اسی لئے کتاب کی وحی مدوّن، مکتوب اور محفوظ کی گئی، اور نماز میں اُس کی قرأت کا حکم ہے اور یوں بھی عام طور سے اُس کی تلاوت مسنون ہے، اور سنت کی وحی بالفاظہا مقصود نہیں، اسلئے اسکی لفظی حفاظت کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی

اور نہ نماز میں اس کے الفاظ "قرأت کئے جا سکتے ہیں، اور نہ اُن کی تلاوت کیجاتی ہے، اور نہ اُن کو کتابِ الٰہی کہا جا سکتا ہے، مگر معنیً اصولی حیثیت سے اُن کی حفاظت خود قرآن نے اپنے اندر کر لی ہے، اور جزئیات کی حیثیت سے گو الفاظ میں نہیں، مگر عمل میں خود رسول اور اُس کے پیروؤں اور پھر اُن کے پیروؤں کے مسلسل تعامل سے، یہانتک کہ آج بھی تمام مسلمانوں کے عملدرآمد سے عملی تواتر کی صورت میں محفوظ ہے، اور بعد کے اماموں نے اچھی طرح تحقیق کر کے الفاظ اور کُتبِ حدیث کے اوراق میں بھی اُن کو محفوظ کر دیا ہے،

سنت کو وحی کہنا اس لحاظ سے ہے کہ اُس کے جزئیات اصولاً وحیِ حقیقی یعنی کتاب کے اندر داخل ہیں، اور اُس کی کلیت میں سنّت کے تمام احکام مندرج ہیں، بنا بریں چونکہ سُنّت وحی کے کلّی منشا کے اندر داخل ہے، وہ بھی ضمنی حیثیت سے وحی کہی جا سکتی ہے، لیکن چونکہ اس میں الفاظ کی تعیین خدا کی طرف سے نہیں، اس لئے وہ غیر متلو ہے،

اس فرق کا راز یہ ہے کہ کتاب کی اصلی حیثیت کلّی قانون کی ہے، قانون کے اصل منشا کی حفاظت اور وضاحت کے لئے نہ صرف اُس کے ایک ایک لفظ کے محفوظ رہنے کی ضرورت ہوتی ہے، بلکہ اُس کے ایک ایک نقطہ، شوشہ، وقف، وصل، فصل، عطف، قطع، تقدم تاخر یعنی آج کل کی اصطلاح میں ایک ایک ڈیش اور کامے کی بعینہٖ حفاظت کی ضرورت ہے، ورنہ ذرا سے تغیر میں قانون کا مطلب کچھ کا کچھ ہو جا سکتا ہے، اور سنت کی یہ کلی قانونی حیثیت نہیں ہے، بلکہ وہ اُس کلّی قانون کی تشریحات، تفصیلات اور جزئیات ہیں جو درحقیقت اس کلّی قانون کے اندر مندرج تھے، مگر چونکہ عام لوگوں کی فہم میں نہیں آتے تھے، یا عام لوگ

اُن کو نہیں سمجھتے تھے، اس لئے صحابہ کے دریافت پر یا خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکی ضرورت محسوس فرما کر اُس کو کھول کر بیان فرما دیا، کہ پھر اشتباہ نہ رہ جائے،

اسی مقام پر ایک اور نکتہ بھی ہے، کہ کتاب الٰہی میں جو حکم جن الفاظ میں ادا ہوا ہوتا اگر بعض کم فہم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا اور انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس کی تشریح چاہی، یا انھیں نہیں معلوم ہوا کہ اس خاص جزئی واقعہ کا کیا حکم ہے، اور قرآن پاک کی کس اصل سے ماخوذ و مستنبط ہوگا، اور اس لئے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، تو اُس کے جواب میں اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پاک کے بعینہٖ ان ہی الفاظ کو بے کم و بیش دہرا دیتے، تو یہ بے کار ہوتا، کہ انہی الفاظ کے نہ سمجھ سکنے کے سبب سے تو سوال کی نوبت آئی تھی اسلئے ضرور تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم الفاظ کو بدل کر، اور طریقہ تعبیر کو تغیر دے کر ان الفاظ کی تشریح فرمائیں، اور یہی احادیث ہیں،

درحقیقت احادیث میں قانونِ الٰہی اور کتابِ ربانی ہی کے مفہوم و منشا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھنے والوں کی سہولت، گمراہوں کی تکمیلِ ہدایت اور اصل منشائے الٰہی کی پوری توضیح اور کہیں پوری تاکید کی خاطر مختلف نقطوں، مختلف عبارتوں اور مختلف تعبیروں سے ادا فرمایا ہے، اسلئے اصل مفہوم و منشا کے لحاظ سے احادیث کے معانی ضمناً وحی ہیں، لیکن الفاظ، عبارت اور تعبیر کی حیثیت سے یعنی لفظاً وحی نہیں ہیں، بلکہ فہم نبوی، اجتہاد نبوی، اور ملکہ نبوت کے خیر خطا پر نتائج ہیں، اسی لئے ان کو اصطلاح میں "وحی غیر متلو" کہتے ہیں،

ہم اس فرق کی ایک مثال دیکر اپنے مطلب کو زیادہ واضح کر دینا چاہتے ہیں، قرآن پاک

میں والدین کی خدمت اور اطاعت کا حکم ہے اور ساتھ ہی یہ بھی اشارہ ہے کہ والدین کی رضامندی گناہوں کی مغفرت کا سبب ہے، یہ وحی الٰہی کا حقیقی منشا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس منشائے الٰہی کو ان الفاظ اور مختلف تعبیروں سے ادا فرمایا "ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے"، کبھی ارشاد ہوا "رب کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے"، ایک صحابی نے دریافت کیا کہ "یا رسول اللہ! میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟" فرمایا تیری ماں، تیری ماں تیری ماں"، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، صحابہ حضوری کے شرف سے ممتاز تھے کہ زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے "وہ ذلیل ہوا، وہ ذلیل ہو، وہ ذلیل ہو"، حاضرین نے عرض کی "یا رسول اللہ! کون؟" ارشاد ہوا وہ جس نے اپنی ماں یا باپ کی صنعیفی پائی اور پھر انکی خدمت گذاری کر کے جنت نہ حاصل کرلی ایک اور مجلس میں صحابہؓ نے پوچھا کہ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیکی کے کاموں میں خدا کو سب سے زیادہ کون کام پسند ہے؟" فرمایا "وقت پر نماز ادا کرنا"، دریافت کیا اسکے بعد، فرمایا "ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا"

ان تمام احادیث پر معمولی سی غور و فکر کی نظر بھی یہ راز ظاہر کر دے گی کہ یہ کل حدیثیں ذیل کی آیتوں کی تشریح و بیان ہیں،

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا (بقرہ-۹، نسآء)	ماں، باپ کے ساتھ نیکی کرو،
وَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ (اسرآئیل-۳)	وہ بوڑھے ہو جائیں تو انکو اُف نہ کہو
وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ	یہ وہاں باپ کے خدمت گذار وہ ہیں جن کی بدیوں سے ہم درگذر کرتے ہیں،

یہی حال دوسرے قرآنی احکام کے بیان وتشریحات کا ہے،

احادیث قرآن کا بیان ہیں

قرآنِ پاک اور احادیث دونوں پر جن کی عمیق ووسیع نظر ہے، انکو یہ برملا معلوم ہوتا ہے کہ احادیثِ صحیحہ کے تمام فرعی اور ثانوی احکام قرآنِ پاک کے عمومی اور کلی احکام کے تحت میں مندرج ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ میں صرف اُن کی تشریح فرمائی ہے، اس قسم کی حدیثوں کی عموماً تین شکلیں ہیں، ایک وہ جسمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ میں حکم بیان فرمانے کے بعد خود قرآن پاک کی کوئی آیت اسکے ساتھ پڑھ دی، اس قسم کی حدیثوں کے بیان ہونے میں کس کو شبہہ ہوسکتا ہے، ۲ دوسری شکل یہ ہے کہ آپنے آیت نہیں پڑھی، مگر خود اس حکم میں ایک دو لفظ ایسے فرما دیئے ہیں جو کسی آیت کا جزو ہیں، جس سے یہ اشارہ ہوتا ہے کہ یہ حکم فلاں آیت کی تشریح ہے، اس صورت میں بھی اصل وفرع کی تمیز اہلِ علم کے لئے آسان ہے، تیسری شکل یہ ہے کہ آپنے کسی آیت یا اشارہ کے بغیر صرف حکم بیان فرمادیا، اس قسم کی حدیثوں کے ماخذ کی تلاش دقتِ نظر کا کام ہے، ان کا پتہ زبان نبوت اور فہمِ رسالت کے طرز اسلوب کے سمجھنے والے راسخین فی العلم ہی پاسکتے ہیں،

الہام واجتہاد وحکمت

امام شافعی نے کتاب الرسالہ میں احادیث وسنن کی تین قسمیں بیان کی ہیں،

۱؎ مجھے پہلے شبہہ تھا کہ میں اس رائے میں منفرد ہوں، مگر بحمداللہ کہ تلاش وتفحص سے ثابت ہوا کہ دیگر متعدد علمائے اصول کا یہی مسلک ہے، چنانچہ یہ خیال اجمالاً سب سے پہلے امام شافعی کی کتاب الرسالہ (ص ۲۰-۲۹-۶۲۰) مطبوعہ علمیہ مصر ۱۳۱۲ھ میں اور یہ نظریہ سب سے زیادہ مفصل امام شاطبی اندلسی متوفی ۷۹۰ھ کی اہم تصنیف الموافقات فی اصول الاحکام جلد اول ص ۱۶۵-۱۷۱ مطبعہ سلفیہ مصر ۱۳۴۱ھ میں موجود ہے، اور شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ میں بھی اسکا ایک باب ہے

ایک[1] وہ جو بعینہٖ قرآن پاک میں مذکور ہیں، دوسری[2] وہ جو قرآن پاک کے مجمل حکم کی تشریح ہیں، تیسری وہ جن کا ذکر (بظاہر) قرآن پاک میں نہ تفصیلاً ہے، نہ اجمالاً، یہی تیسری قسم قابلِ بحث ہے، امام صاحب نے اس کے متعلق ائمۂ سلف کے چار نظریے نقل کئے ہیں[1]،

۱۔ اللہ تعالیٰ نے رسول کی کلی اطاعت فرض کی ہے، اور اس کے علم میں پہلے ہی سے یہ ہے کہ رسول جو کچھ کہے اور کریگا، اس میں رضاے الٰہی کی توفیق اس کے ساتھ شامل ہوگی حاصل یہ ہے کہ پہلے ہی سے رسول کو یہ توفیق ربانی عنایت کی گئی ہے کہ وہ رضاے الٰہی کو دریافت کرے،

۲۔ رسول نے کوئی ایسا حکم نہیں دیا ہے جس کی اصل کتاب اللہ میں نہ ہو (مقصود یہ ہوا کہ اس کے احکام بھی دراصل کتاب اللہ ہی سے ماخوذ ہیں، گو بظاہر کم بینوں کو ایسا نظر نہ آئے)

۳۔ تمام احادیث نبوی، القا فی الروع ہیں (یعنی رسول کے دل میں خدا نے ڈالدیئے ہیں) اور یہ اس حکمت کا نتیجہ ہیں جو آپ کے دل میں ڈالی گئی،

۴۔ اس قسم کے تمام امور جو احادیث میں ہیں، کتابِ الٰہی سے جداگانہ مستقل پیغام ربانی کے ذریعہ رسول کو معلوم ہوئے ہیں،

چوتھے نظریہ کو چھوڑ کر بقیہ تین رائیں میرے خیال میں تقریباً ایک ہی ہیں، پہلے نظریہ کا منشا یہ ہے کہ صریح وحی کے علاوہ جو وقتاً فوقتاً نبی پر آتی رہتی ہے، اس کو ابتدا ہی سے ایک توفیق ازلی بھی عنایت ہوتی ہے، جس سے وہ پیش آمدہ امور میں رضاے الٰہی کو دریافت کرکے فیصلہ کرتا ہے، تیسرے نظریہ میں اسی توفیق علم کو الہام، القا فی الروع، اور دل میں ڈال دینے

[1] کتاب الرسالہ امام شافعی صفحہ ۲۰۔

سے تعبیر کیا گیا ہے، اور دوسرے نظریہ کا منشا یہ ہے کہ رسول کے جو احکام بظاہر کتاب اللہ میں نہ ہوں، اُن کی اصل بھی درحقیقت کتاب اللہ میں ہے اور رسول اُسی اصل سے اپنے احکام مستنبط کرتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ یہ استنباط، عام انسانی و بشری فہم سے نہیں ہوتا، ورنہ اس کا غلطی سے پاک ہونا مشتبہ رہے گا، بلکہ وہ "پیغمبرانہ قوتِ فہم" کا نتیجہ ہوگا، اور جب ایسا ہے تو اس "پیغمبرانہ قوت فہم" کی تعبیر خواہ الہام سے کرو، القار سے کرو، یا اس کو حکمتِ نبوی کا نتیجہ کہو یا توفیق الٰہی کہو، بات ایک ہی ہوئی

میرے نزدیک صحیح مسلک یہ ہے کہ رسول کے تمام صحیح ربانی احکام بھی عموماً اس کے صحیفۂ ربانی سے ماخوذ و مستنبط ہیں، اور ان کے جزئیات کتاب الٰہی کے کلیات کے تحت میں مندرج ہیں، اور رسول کا یہ اخذ، استنباط، اور فہم اس کی اس پیغمبرانہ قوتِ علم کا نتیجہ ہیں جسکو حکما ملکۂ نبوت اور اہلِ شرع حکمت، الہام اور شرحِ صدر وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، اور جو خطا اور غلطی سے یکسر پاک ہے،

اجتہادِ نبوت اس موقع پر علمائے اصول کی ایک اور اصطلاح "اجتہاد نبوی" کی تشریح ضروری ہے، علمائے اصول لکھتے ہیں کہ جب کوئی نیا واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش آتا اور وحی نازل نہ ہوتی، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد فرماتے، یعنی گذشتہ وحی شدہ احکام کے تطابق سے آپ حکم دیدیتے تھے، (یہ فقہاء کا طریقۂ تعبیر ہے ورنہ یوں کہنا چاہئے، کہ رسول اپنی اس حکمتِ ربانی کے فیض سے مدد لیکر جو خدا نے ان کے سینہ میں ودیعت رکھی تھی، گذشتہ وحی کے کلیات کی روشنی میں اُسکا فیصلہ فرماتے تھے) بہرحال خواہ فقہاء کے طریق پر اجتہاد نبوی کو نصوصِ قرآنی سے مستنبط سمجھئے یا شاہ ولی اللہ صاحب کے نظریہ کے مطابق رسول کے

علم سینہ اور وحی شدہ اصولِ کلی کے جزئیات تسلیم کیجئے، ہر حال میں وہ نتیجہ امت کیلئے واجب العمل اور خطا سے پاک ہے، کیونکہ یہ مقدمہ اپنی جگہ پر ثابت ہے، کہ انبیاء گناہوں سے معصوم، ضلالت و گمراہی سے پاک اور ہوائے نفسانی سے مبرا ہوتے ہیں، اس لئے امور رسالت اور امور دین میں اُن کی کوئی رائے غلط نہیں ہو سکتی کہ ان کی غلطی سے پوری امت کا غلطی پر قائم ہو جانا مسلم ہو، حالانکہ ان کی بعثت کی غرض ہدایت ہو، ضلالت نہیں، ان وجوہ سے اُنکا اجتہاد اگر کبھی کسی ایسے نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے جو مصلحتِ الٰہی کے مطابق نہیں ہوتا، تو ہمیشہ اللہ تعالیٰ اس پر تنبیہ فرما کر ان کو اپنی مرضی سے مطلع فرما دیتا ہے، (اسکی مثالیں آئندہ آئینگی) الغرض بعض امور میں خیر کے کسی خاص پہلو کو پیش نظر رکھ کر اس سے بہتر پہلو سے تغافل ہونے یا غیب و مستقبل سے عدم واقفیت کے سبب سے نبی کا اجتہادی خطا کرنا ممکن ہو، مگر اس خطا پر نبی کا قائم رکھا جانا ناممکن ہو، ایسی صورت میں نبی کا ہر ایسا اجتہادی حکم جس پر وحیِ الٰہی نے فوراً کوئی تنبیہ نہیں کی، یہ معنی رکھتا ہو کہ وہ حکم علم الٰہی کے منشا کے مطابق اور خطا و غلطی سے مبرا ہے، اور اس کے دوسرے معنی وحی خفی یا باطنی وحی کے ہیں[1]

میری رائے میں یہ اصطلاح بھی معنی گذشتہ اصطلاحوں کے قریب قریب ہے، اس لئے اس اجتہاد نبوی کے معنی الہام، حکمت، ملکۂ نبوت، فہم نبوی وغیرہ گذشتہ اصطلاحات سے عملاً الگ نہیں کہ اس کی حیثیت بھی وحی ثانوی کی قرار پاجاتی ہے۔

اس مبحث پر شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں جو خیال ظاہر فرمایا ہے اسکا ترجمہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں،

---

[1] سطور بالا میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اسکے حوالہ کیلئے دیکھو شرح تحریر ابن ہمام المتوفی ۸۶۱ھ مسمی بہ التقریر والتحبیر للعلامہ ابن امیر الحاج المتوفی ۸۷۹ھ ج ۳ ص ۲۹۴-۲۹۹، مطبوعہ امیریہ مصر ۱۳۱۶ھ اور التلویح فی کشف حقائق التنقیح والتوضیح فی حل غوامض التنقیح ج ۲ ص ۴۵۲ مطبع مکتب صنائع قسطنطنیہ ۱۳۱۰ھ بحث الرکن الثانی فی السنۃ،

"ساں تو امبحث احادیث نبوی سے شریعت کے اخذ کرنے میں

علوم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقسام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو روایتیں حدیث کی کتابوں میں جمع کی گئی ہیں، انکی دو قسمیں ہیں

۱۔ ایک وہ جنکا تعلق تبلیغ رسالت سے ہے، اور یہ آیت

مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا ج (حشر۔۱)	پیغمبر تم کو جو کچھ دے اسکو لے لو، اور جس چیز سے منع کرے اس سے باز آؤ،

اسی قسم کے متعلق نازل ہوئی ہے،

علوم معاد یعنی قیامت اور آخرت کے احوال بہ جزا و سزا اور عجائب الملکوت (یعنی دوسرے عالم کے احوال و کیفیات، اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں، اور ان سب کا دار و مدار صرف وحی پر ہے، اور اُن اصول کے مطابق جن کا ذکر اوپر گذر چکا، قوانین شریعت اور عبادات و معاملات کی جزئیات کا ضبط بھی اسی قسم میں داخل ہے، لیکن ان میں سے بعض چیزوں کا دار و مدار وحی پر اور بعض کا اجتہاد پر ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد بھی وحی کی حیثیت رکھتا ہی، کیونکہ خداوند تعالیٰ نے آپ کو غلط راے قائم کرنے سے محفوظ رکھا ہے، اور یہ ضروری نہیں ہی کہ آپ کا ہر اجتہاد کسی خاص نص و آیت سے استنباط کا نتیجہ ہو، جیسا کہ خیال کیا جاتا ہی، بلکہ آپ کے اجتہاد کی

زیادہ تر صورت یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے شریعت اور وضعِ قانون کے مقاصد، انسانوں کی آسانی اور بھلائی اور اصولی مقاصد کا قانون آپ کو تعلیم کر دیا تھا، وہ مقاصد، جن کا ماخذ وحی تھا، آپ اسی کلی و اصولی قانون کے ذریعہ سے جو آپ کو سکھایا گیا تھا، ان کی تشریح فرمادیا کرتے تھے، حکمت کی متفرق باتیں اور تمام مصلحتیں جن کے لئے آپ نے نہ کوئی وقت مقرر کیا، نہ ان کے حدود بتائے، مثلاً اخلاقِ صالحہ اور اخلاقِ غیر صالحہ کا بیان بھی تبلیغ رسالت سے تعلق رکھتا ہے، لیکن اُن میں اکثر کا دار و مدار اجتہاد پر ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے آپ کو باہمی معاملات و اجتماع کا کلی قانون تعلیم کر دیا تھا، اور آپ نے حکمت کی باتیں اسی کلی قانون سے جو آپ کو سکھایا گیا تھا، مستنبط کیں، اور ان کے متعلق ایک کلیہ بنایا، فضائلِ اعمال اور ان پر عمل کرنے والوں کے مناقب بھی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور میرے خیال میں ان میں بعض کا دار و مدار وحی پر اور بعض کا اجتہاد پر ہے، ان قوانین کا بیان اوپر گذر چکا ہے، اور ہم اسی قسم کی شرح کرنا اور اُن کے معانی کو بیان کرنا چاہتے ہیں،

۲- دوسری وہ روایتیں ہیں جو تبلیغِ رسالت سے تعلق نہیں رکھتیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ "میں صرف ایک آدمی ہوں، جب میں تمہارے دین کے متعلق تمکو کوئی حکم دوں تو اس پر عمل کرو، اور جب میں تمکو اپنی رائے سے کوئی حکم دوں تو یہ سمجھو کہ میں صرف ایک آدمی ہوں"، اور چھوہاروں کے جوڑ لگانے کے واقعہ میں آپ کا یہ فرمانا کہ "میں نے ایک خیال قائم کیا تھا، میرے خیال پر تم لوگ عمل نہ کرو، البتہ جب خدا کی کوئی بات بیان کروں تو اس پر عمل کرو، کیونکہ میں خدا پر جھوٹ نہیں باندھتا"، اسی قسم سے تعلق رکھتا ہے، طب کے متعلق حدیثیں اور آپ کا ارشاد کہ "تم سیاہ رنگ اور ایسے گھوڑے پر سوار ہو، جسکی پیشانی میں تھوڑی سی سفیدی ہو"

اسی قسم میں داخل ہے، اور اس کا دارومدار تجربہ پر ہے،

آپنے جو کچھ عادۃً کیا، عبادۃً نہیں، اتفاقاً کیا، قصداً نہیں، وہ بھی اسی قسم میں داخل ہے، آپنے جو واقعات ایسے بیان کئے جن کا تمام قوم میں چرچا تھا، مثلاً امر زرع اور خرافہ کے قصے، وہ بھی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں، اور اسی بات کو حضرت زید بن ثابتؓ نے جب ان سے چند لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کرنے کی درخواست کی، اس طرح بیان کیا ہے، کہ "میں آپ کا پڑوسی تھا، اور جب آپ پر وحی نازل ہوتی تھی، تو آپ مجھ کو بلا بھیجتے تھے، اور میں آپکے حکم سے اسکو لکھا کرتا تھا، لیکن جب ہم دنیا کا ذکر کرتے تھے، تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر فرماتے تھے، اور جب ہم آخرت کا ذکر کرتے تھے، تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے اور جب ہم کھانے کا ذکر کرتے تھے، تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے، تو کیا میں ان تمام چیزوں کو بطور حدیث بیان کروں؟"

اسی میں وہ چیزیں بھی داخل ہیں، جن کو آپنے اپنے زمانہ کی جزئی و عارضی مصلحت کے طور پر کیا ہے، اور وہ تمام امت کیلئے ضروری نہیں ہیں، مثلاً فوجوں کی آراستگی، اور جنگی علامت کی تعیین کے وہ احکام جن کو خلیفہ دیتا ہے، اور حضرت عمرؓ کے اس قول کے کہ اب ہمکو حج میں اکڑ کر چلنے کی کیا ضرورت؟ ہم ایک قوم (کفار قریش) کے سامنے اسکی نمائش کرتے تھے، لیکن اب خدا نے اس کو ہلاک کر دیا" بھی یہی معنی ہیں کہ وہ اسکو ایک خاص جزئی و عارضی مصلحت سمجھتے تھے، لیکن چونکہ اپنے اس اجتہاد پر پورا اطمینان نہ تھا، اسلئے ان کو یہ خوف ہوا کہ خاص اسکا کوئی اور سبب ہو، اس لئے اس میں دست اندازی نہیں کی، اسیطرح دوسرے احکام بھی اسی پر محمول

کئے گئے ہیں، مثلاً آپ کا یہ ارشاد کہ "جو شخص جس کو قتل کرے اس کا ہتھیار اسی کا حق ہے" نیز آپ کے مخصوص فیصلے بھی اسی قسم میں داخل ہیں کہ آپ مقدمات کے ان فیصلوں میں گواہوں اور قسموں کے مطابق فیصلے کرتے تھے، آپنے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جو یہ فرمایا تھا کہ "واقعہ میں حاضر جو کچھ دیکھتا ہے، اسکو غائب نہیں دیکھتا" اس کے معنی بھی یہی ہیں" (انتہی کلامہٗ)

شاہ صاحب کے نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جنکا تعلق پیغمبرانہ فرائض، تبلیغ رسالت اور مہماتِ امور دین سے ہے، یہ تمام باتیں براہ راست وحی و تعلیم سے ماخوذ ہیں، دوسری وہ جو عام انسانی باتیں ہیں، انکی متعدد صورتیں ہیں،

۱۔ کسی جزئی عارضی مصلحت کی بنا پر کوئی حکم، جیسے حج میں آپنے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ قریش کے سامنے اکڑکر سعی کریں تاکہ قریش یہ نہ سمجھیں کہ مدینہ کی آب و ہوا نے انکو کمزور کر دیا ہے،

۲۔ وہ امور جنکو دین و رسالت سے براہ راست کوئی تعلق نہیں، بلکہ زمانہ کے حالات کے ساتھ وہ بدلتے رہتے ہیں، مثلاً جنگ کا طریق، ہتھیار کے اقسام، حکومت کے صیغوں کی ترتیب وغیرہ

۳۔ وہ امور جن کو آپ اپنی شخصی، قومی، یا ملکی عادت کے مطابق کرتے تھے، جن کو دین و رسالت سے کوئی واسطہ نہیں، مثلاً وضع و لباس، فرش پر نشست، کمل اوڑھنا، دسترخوان اور چمچوں کا عدم استعمال، عمامہ باندھنا، تہبند پہننا، اونٹ پر سوار ہونا وغیرہ،

۴۔ وہ امور جو عرب میں بطور قصہ کے مشہور تھے، اور آپنے بھی انکو اسی طرح تفنن طبع کے لئے یا کسی اخلاقی نتیجہ کی خاطر بیان فرمایا، مثلاً ام زرع اور انکی نو سہیلیوں کی کہانی، خرافہ

کی داستان، بنی اسرائیل کی بعض حکایتیں،

۵۔ عربوں کے بعض تجربی مسلمات اور علاج و معالجہ کی بعض باتیں،

۶۔ زراعت و غیرہ کے متعلق بعض دنیاوی رائیں، مثلاً مدینہ میں قاعدہ تھا، کہ فصل کے موقع پر نر چھوہاروں کے پھول مادہ چھوہاروں کے درختوں میں ڈالے جاتے تھے، آپ نے یہ طریقہ دیکھا تو اسکو محض رسمی بات سمجھ کر فرمایا کہ اگر ایسا نہ کیا کرو تو کیا ہو، مدینہ والوں نے آپ کے اس ہلکے سے اشارہ کو حکم کے طور پر مانا اور اس سال یہ ترکیب چھوڑ دی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال پیداوار کم ہو گئی، لوگوں نے آکر عرض کی، فرمایا میں نے ایسا خیال کیا تھا، انتم اعلم بامور دنیاکم "تم اپنے دنیاوی کاروبار اور معاملات سے زیادہ واقف ہو" یہ امور تغیر اور ردوبدل کے قابل ہو سکتے ہیں،

الغرض یہ وہ امور ہیں جن میں رسول کے ارشاد کی حیثیت، انسانی باتوں کی ہے، لیکن ان کے علاوہ دوسرے امور جن کا تعلق دین و رسالت و نبوت سے ہے، مثلاً عقائد، عبادات، اخلاق اور اخبارِ معاد اور معاملات کے بعض ضروری حصے، یہ سب کے سب وحی اور تعلیم ربانی سے ہیں، جو دائمی اور ناقابلِ تغیر ہیں،

ان ناقابلِ تغیر امور کی تعلیم و اطلاع کی دو صورتیں ہیں، ایک براہ راست وحی الٰہی جو وقتاً فوقتاً پیغمبر کی تعلیم و اطلاع کے لیے خدا کی طرف سے آیا کرتی تھی، اور دوسری اجتہاد نبوی یہاں بحث اسی دوسری چیز سے ہے، شاہ صاحب اس کے متعلق دو باتیں فرماتے ہیں،

۱۔ یہ کہ اجتہاد نبوی کی صورت و حقیقت مجتہدین کے اجتہاد کی طرح نہیں ہے، مجتہدین کا اجتہاد کسی خاص نص سے استنباط کا نام ہے، اور پیغمبروں کے اجتہاد کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ

اجمالی طور سے شریعت کے کلی اصول و قواعد کا علم، منصب نبوت کے ساتھ ساتھ عطا فرما دیا ہے، اسی علم کے مطابق آپ وحی کی توضیح، احکام منصوصہ کی تفصیل، کسی کلی کے جزئیاتِ مسائل کی تشریح، اپنے الفاظ میں فرما دیا کرتے تھے،

۲- پیغمبروں کا یہ اجتہاد، دوسرے عام انسانی مجتہدین کے اجتہادات کے برخلاف خطا و غلطی سے یکسر پاک و منزہ ہوتا ہے، کیونکہ ان کی رائے خطا و غلطی پر باقی رکھے جانے سے محفوظ بنائی گئی ہے، اسی لئے ان کا پیغمبرانہ اجتہاد بھی بمنزلۂ وحی کے ہے،"

"پیغمبرانہ اجتہاد" کی جو تشریح شاہ صاحب نے فرمائی ہے، اسکو پیش نظر رکھ کر یہ فیصلہ نہایت آسان ہے کہ دوسرے لوگ ملکۂ نبوت، الہام، القاء، حکمت ربانی، فہم نبوی سے جو کچھ مراد لیتے ہیں اس میں اور "اجتہاد نبوی" میں عملاً کوئی فرق نہیں ہے کہ اس اجتہاد سے مقصود وہ قوت علمیہ یا الہامیہ یا نبویہ ہے، جس کو اللہ تعالیٰ خاص پیغمبر کے سینہ میں ودیعت رکھتا ہے، اسلئے مجتہدانہ اجتہاد اور پیغمبرانہ اجتہاد کے درمیان صرف لفظ کی مشارکت ہے، معنی کی نہیں، مزید بحث آگے آئیگی ایک نکتہ کی طرف یہاں اور اشارہ کر دینا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور جتنے صاحب کتاب انبیاء آئے ان کی وحی کتاب اور نتائج حکمت نبوی میں فرق و امتیاز باقی نہیں رہا، چنانچہ توراۃ و انجیل و زبور میں یہ سب باتیں ملی جلی ہیں، جیسا کہ ان کے پڑھنے سے ہر شخص کو نظر آسکتا ہے، مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ آخری اور غیر منسوخ کتاب لے کر آئے تھے، اس لئے آپ کی کتاب کی ہر طرح حفاظت کی گئی، اور ہر تخلیط اور آمیزش سے محفوظ رکھی گئی، بلکہ اسی لئے آغاز اسلام میں آپ نے نتائج حکمت نبوی کی تحریر سے لوگوں کو باز رکھا، تاکہ کتاب کے ساتھ انکی آمیزش

نہ ہو بعد کو جب یہ خطرہ باقی نہیں رہا تو اکثر کے نزدیک یہ ہے کہ آپنے ان کی تحریر کی اجازت دیدی اور بعض متشدد صحابہ اور علما کے نزدیک یہ اجازت مخصوص لوگوں کے لئے تھی، عام نہیں لیکن یہ اختلاف تحریر و کتابت میں ہے، اُن کی صحیح طور سے حفاظت روایت و تبلیغ میں نہیں، اسلئے اس خدمت کو تمام صحابہؓ تابعین اور تبع تابعین اور علماے صالحین نے ہمیشہ ادا کیا،

عصمت و بے گناہی نبیؐ کی تیسری اہم خصوصیت اُسکی معصومی اور بے گناہی ہے، یہود میں چونکہ پیشین گو ہونے کے علاوہ نبی کا کوئی صحیح تخیل نہیں، اس لئے ان کی کتابوں میں انبیاے کرام علیہم السّلام کی طرف ایسی باتیں منسوب کی گئی ہیں، جو ان کی شانِ نبوت کے سراسر منافی ہیں، عیسائیوں میں صرف ایک مسیحؑ کی ذات معصوم مانی جاتی ہے، لیکن اسلام میں یہ عقیدہ ہر نبی اور رسول کی نسبت عام ہے، اُسکے نزدیک تمام انبیاء اور رسول گناہوں سے پاک اور معصوم تھے، ان سے بمقتضاے بشریت بھول چوک ہو سکتی ہے، مگر اللہ تعالیٰ اپنی وحی سے انکی ان غلطیوں کی بھی اصلاح کرتا رہتا ہے، نبوت کے متعلق عقلی حیثیت سے بھی جبتک عصمت کا اصول مان نہ لیا جائے، نبی اور عام حکیم و مصلح میں فرق نمایاں نہیں ہو سکتا، اور نہ نبیوں اور رسولوں کی کامل صداقت و صحت پر اعتماد کیا جا سکتا، اسی لئے اسلام نے اس عقیدہ کا بھی بڑا اہتمام کیا ہے، ایک ایک کرکے تمام پیغمبروں کے متعلق احوال کا تذکرہ کیا ہے اور ان واقعات کی تردید کی ہے جو شانِ عصمت کے خلاف ہیں، اور جن کو لوگوں نے غلطی سے انبیاء میں شامل کر دیا ہے،

عرب کے مشرکوں کا یہ عقیدہ تھا کہ کاہن جو غیب کا حال بتاتے ہیں، اور شاعر جو پُرجوش اور پُرتاثیر کلام نظم کرتے ہیں، یہ شیطان سے سیکھ کر بتاتے اور کرتے ہیں، اور یہی بات وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی نسبت بھی (نعوذ باللہ) کہتے تھے، قرآن نے ان کے جواب میں کہا، درخت اپنے پھل سے اور شے اپنے آثار سے پہچانی جاتی ہے،

اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ، اِنَّمَا سُلْطَانُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ، (نحل - ۱۳)	شیطان کا زور ایمان والوں پر نہیں چلتا، اور نہ اُن پر جو اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں، اسکا زور انہی پر چلتا ہے، جو اس سے دوستی کرتے ہیں، اور اپنے رب کا شریک ٹھہراتے ہیں،

اس کے بعد آخر تک اس خیال کی تردید کی ہے، اور پھر خاتمہ اس پر ہے،

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ (نحل ۱۶)	اور صبر کر، اور تیرا صبر کرنا بھی خدا ہی کی مدد سے ہے، اور نہ تو ان پر غمگین ہو، اور نہ ان کے فریب سے شکدل ہو، بیشک خدا ان کے ساتھ ہے، جو پرہیزگار ہیں، اور جو نیکوکار ہیں،

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ انبیائے کرام شیطانوں کے فریب سے آزاد متقی، پرہیزگار اور نیکوکار ہوتے ہیں، سورۂ شعراء میں اسی شبہہ کا جواب تمام پیغمبروں کے حالات کو سنا کر آخر میں یہ کہہ کر دیا ہے،

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ (شعراء ۱۰۴)	کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں، اترتے ہیں، جو جھوٹ گھڑتے ہیں، گنہگار ہوتے ہیں، (لوگوں کو یقین دلانے کیلئے کہ وہ غیب کی باتیں سن رہے ہیں،

(شعراء ۶ = ۱۱) کان ڈالتے ہیں اور وہ اکثر جھوٹے ہوتے ہیں،

سورۂ جاثیہ میں مخالفین کے جواب میں کہا گیا ہے،

وَيْلٌ لِّكُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ لَا يَسْمَعُ آيَاتِ اللَّهِ تُتْلَىٰ عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (جاثیہ - ۱)

ہلاکت ہو اُس پر جو جھوٹ گھڑنے والا گنہگار ہے، خدا کی آیتوں کو جو اس کو پڑھکر سنائی جاتی ہیں، وہ سنتا ہے اور پھر اپنے غرور پر اڑا رہتا ہے، گویا، اس نے سنا نہیں تو اسکو دردناک عذاب کی بشارت دیدو،

اس کے معنی یہ ہوئے کہ انبیاء علیہم السلام جھوٹ گھڑنے والے اور گنہگار نہیں ہوتے کہ اگر ایسے ہوں تو فرشتوں کے بجائے وہ شیطانوں کے قرین و رفیق ثابت ہوں، اور اُن کی سچائی اور صداقت مشتبہ ہو جائے، اور نیز یہ کہ نبوت کی حقیقت کذب و گنہگاری کے صریح منافی ہے،

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا،

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِن دُونِ اللَّهِ (آل عمران)

اس آدمی کے جس کو اللہ کتاب اور فیصلہ اور نبوت دے یہ شایان نہیں کہ وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ،

یعنی پیغمبروں کی دعوت کا منشا خدا کی بندگی کا اعلان ہے، نہ کہ لوگوں کو اپنا بندہ اور پرستار بنانا، اور یہ گناہ ان سے سرزد نہیں ہوتا،

اور ایک آیت میں فرمایا،

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَن يَغُلَّ وَ

کسی پیغمبر کا یہ کام نہیں کہ وہ جو کچھ چوری سے چھپائے

مَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ج ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ، اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰهُ جَهَنَّمُ ط وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ، هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ج وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ه

(اٰل عمران - ۱۷)

جو کوئی چھپائیگا، قیامت کے دن لیکر اسکو حاضر ہوگا، پھر اُس وقت ہر شخص کو اس کے کام کا پورا بدلہ ملیگا، اور ان پر ظلم نہ ہوگا، کیا جو خدا کی خوشنودی کی پیروی کرے وہ اس جیسا ہو سکتا ہے، جو خدا کا غضب کمائے، اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ برا ٹھکانا ہے، انسانوں کے خدا کے نزدیک کئی درجے ہیں، خدا ان کے کام سے خبردار ہے، بے شبہ اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان میں انہی میں سے ایک ایسے رسول کو بھیجا جو ان کو اسکی آیتیں پڑھکر سناتا ہے، اور انکو پاک وصاف بناتا، اور کتاب وحکمت سکھاتا ہے، اور بے شبہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے،

ان آیتوں میں گو ہر نبی سے غلول (مال چھپانے) کی نفی کی ہے، اور فرمایا ہے کہ نبی جس خدا کی خوشنودی کی ہمیشہ پیروی کرتے ہیں، وہ ان کے مانند نہیں ہو سکتے جو خدا کی خفگی کماتے ہیں، مگر خصوصیت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہے، اور بتایا گیا ہے کہ نبی کی یہ شان نہیں کہ اس سے ایسا جرم سرزد ہو سکے، کیونکہ اللہ کی رضامندی کا طالب اسکی ناخوشی کے کام کا مرتکب نہیں ہو سکتا، اور خود دوسروں کو احکام الٰہی سنائے،

خود اس سے اُن احکام کی خلاف ورزی ممکن نہیں اور جو دوسروں کو پاک وصاف کرنے پر مامور ہے، وہ خود گنہگار و ناپاک نہیں ہو سکتا،

انبیا علیہم السّلام کے لئے بار بار قرآن نے "چُنکر پسند کرنے" کا لفظ استعمال کیا ہے، جو مرتبہ عصمت اور گناہوں سے محفوظ و پاک رہنے پر دلالت کرتا ہے، عام پیغمبروں کے متعلق یہ آیت ہے،

اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ط (حج-۱۰)

خدا فرشتوں میں سے اپنے پیغمبر چن کر پسند کرتا ہے اور آدمیوں میں سے،

چند مخصوص پیغمبروں کی شان میں ہے،

اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰٓی اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰھِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (آل عمران-۴)

اللہ نے آدم، نوح، آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کو تمام اہلِ دنیا سے چنکر پسند کیا،

خاص حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ارشاد ہوا،

وَلَقَدِ اصْطَفَیْنٰہُ فِی الدُّنْیَا ج (بقرہ-۱۶)

ہم نے اسکو دنیا میں چُن کر پسند کیا،

حضرت موسیٰؑ کی نسبت فرمایا،

اِنِّی اصْطَفَیْتُکَ عَلَی النَّاسِ بِرِسٰلٰتِیْ وَبِکَلَامِیْ، (اعراف-۱۷)

میں نے تجھکو اپنے کلام اور پیغاموں کیلئے لوگوں میں سے چن کر پسند کیا،

ایک آیت میں پیغمبروں کیلئے اصطفار کے ساتھ خیر (بہتر اور نیکوکار) کی صفت ظاہر کی گئی ہے،

وَاذْکُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰھِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ اُولِی الْاَیْدِیْ وَالْاَبْصَارِ

ہمارے خاص بندوں ابراہیمؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ کو یاد کرو جو ہاتھوں (قوتِ عمل) والے اور آنکھوں

إِنَّآ أَخْلَصْنَاهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى	(قوت علم) والے تھے ہم نے ان کو آخرت کی خالص
الدَّارِ ج وَإِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ	نصیحت کیلئے خالص کیا، اور وہ ہماری بارگاہ میں
الْمُصْطَفَيْنَ الْأَخْيَارِ، (ص-۴)	چنے ہوئے نیکوکاروں میں تھے،

سورۂ انبیاء میں اکثر پیغمبروں کے تذکرہ کے بعد فرمایا،

وَكُلًّا جَعَلْنَا صَالِحِينَ، وَجَعَلْنَاهُمْ	اُن میں سے ہر ایک کو ہم نے صالح بنایا، اور ہم نے
أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا وَأَوْحَيْنَا	ان کو وہ پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے لوگوں کو راہ
إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَ الصَّلٰوةِ	دکھاتے تھے، اور ہم نے اُنکو نیک کاموں کے کرنے کی
وَإِيتَاءَ الزَّكٰوةِ ج وَكَانُوا لَنَا عٰبِدِينَ	اور نماز کھڑی کرنے اور زکوٰۃ دینے کی وحی کی، اور
(انبیاء-۵)	وہ ہمارے پرستار تھے،

کیا اس سے زیادہ اُن کی عصمت اور بیگناہی کی شہادت ہو سکتی ہے کہ وہ امام و پیشوا اور صالح اور خدا کے پرستار بنائے گئے،

سورۂ انعام میں بہت سے پیغمبروں کے نام گنا کر سب کو صالح فرمایا گیا،

كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِينَ، (انعام-۱۰)	یہ سب صالحوں میں تھے،

پھر آگے چل کر فرمایا، كُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِينَ (انعام-۱۰) ہر ایک کو دنیا والوں پر فضیلت دی" پھر ان کا ذکر کر کے فرمایا، وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ اور ہم نے اُن کو برگزیدہ کیا اور ان کو سیدھی راہ چلایا، صالح ہونا، برگزیدہ ہونا اور راہِ راست پر ہونا سراسر عصمت اور بے گناہی ہے،

شقی و سعید اور گنہگار و نیکوکار، دونوں کی سیرتوں اور زندگیوں کا فرق اتنا نمایاں ہے کہ ان میں التباس اور اشتباہ ممکن نہیں، تاریخ و سیر کی خاموش اور خلق کی گویا زبانیں چیخ چیخ کر اس فرق و امتیاز کی منادی کرتی رہتی ہیں، اس اصول کو قرآن پاک نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے،

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ	کیا وہ جو گناہوں کے مرتکب ہیں، یہ گمان کرتے ہیں
اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا	کہ ہم انکو، ان کی طرح جو ایمان لائے اور اچھے کام
الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْیَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ	کرتے بنائیں گے، اُن دونوں کی زندگی اور موت
سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ، (جاثیہ-۲)	یکساں ہو، یہ اُن کا فیصلہ کتنا برا ہے،

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ ان دونوں کی زندگی، اور موت دونوں متمائز ہوتی ہیں،

انبیا کے وصف میں فرمایا،

الَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَیَخْشَوْنَهٗ	جو اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں، اور اس سے ڈرتے
وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ (احزاب-۵)	ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت اور بیویوں کو جو عزت اور شرف حاصل ہے وہ نبوت و رسالت ہی کی نسبت سے ہے، ازواجِ مطہرات کی شان میں ہے،

یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ	اے پیغمبر کی بیویو! تم عام عورتوں میں سے کسی ایک
النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ (احزاب-۴)	کی طرح نہیں ہو، اگر تم متقی ہو،

پھر اہلِ بیتِ نبوی کو خطاب کر کے فرمایا کہ ارادۂ ربانی یہ ہے کہ وہ تمکو برائی سے پاک اور صاف اور ستھرا بنائے،

اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ	اللہ یہی چاہتا ہے، کہ تم سے ناپاکی کو دور کردے اے نبی
اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا (احزاب)	کے گھر والو! اور تم کو بالکل صاف ستھرا بنادے،

ظاہر ہے، کہ اگر انبیاء علیہم السلام کے ازواج و اولاد کی شرافت کیلئے گناہ اور بدی کی نجاست مخل ہے تو خود انبیاء علیہم السلام کا کیا ذکر ہے، ایک دوسری آیت میں حضرت عائشہؓ کو تہمت سے بری کرکے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا،

اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ وَالْخَبِیْثُوْنَ لِلْخَبِیْثٰتِ ج	گندیاں، گندوں کے واسطے، اور گندے
وَالطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ وَالطَّیِّبُوْنَ	گندیوں کے لئے، اور ستھریاں، ستھروں کے
لِلطَّیِّبٰتِ ج اُولٰٓئِکَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا	واسطے، اور ستھرے، ستھریوں کے واسطے
یَقُوْلُوْنَ ط (نور-۳)	یہ ان کی تہمت سے پاک ہیں،

یہاں طیب، پاک، اور ستھرے سے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہے، اور اسی ستھرے پن، پاکی اور طہارت سے ازواج مطہرات کے اخلاقی ستھرے پن، پاکی، اور طہارت پر استدلال کیا گیا ہے،

انبیاء درحقیقت مقتدیٰ اور پیشوا، اور نمونہ بنکر اس دنیا میں بھیجے جاتے ہیں، اسی لئے فرمایا،

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ	تمہارے لئے خدا کے رسول میں اچھی پیروی
اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ (احزاب-۳)	ہے،

یعنی ان کی اطاعت واجب ہے،

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ	ہم نے کوئی نبی نہیں بھیجا، لیکن اسلئے کہ خدا کے

بِاِذْنِ اللّٰہِ ط (نساء-۹) حکم سے اُسکی اطاعت کیجائے،

اور خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت تصریح ہے، کہ آپ کی پیروی، خدا کا محبوب بننے کا مستحق ٹھہراتی ہی،

اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ (آل عمران) اگر تم خدا کو چاہتے ہو تو میری پیروی کرو خدا تمکو چاہے گا

کیا کسی گنہگار اور عصیان کار کی زندگی، پیروی، اتباع اور نمونہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہی، تاریکی سے روشنی کبھی نکلی، اور گندگی سے پاکی کبھی پیدا ہوئی، اور گنہگاروں کی دعوت سے کبھی نیکوکاری پھیلی ہے، ہی برائی اور گنہگاریوں کا اصلی سرچشمہ اور منبع شیطان یا انسان کی خود قوتِ شر ہے، لیکن خدا کے خاص بندے اُس کے دامِ فریب سے آزاد ہیں،

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطَانٌ یقیناً میرے بندوں پر تیرا (اے شیطان) کوئی زور نہیں

وَکَفٰی بِرَبِّکَ وَکِیْلًا (بنی اسرائیل ۷) تیرا پروردگار (اپنے بندوں کی طرف سے) سب کچھ کر دینے کو بس ہے

کیا انبیائے کرام علیہم السلام سے بڑھ کر کوئی بندہ رب ہو سکتا ہے،

انسانوں کی گمراہی اور عصیان کاری، وسوسۂ شیطانی کا نتیجہ ہوتی ہی، خواہ یہ شیطان خود اپنے دل کے اندر (خناس) چھپا ہو، یا انسان اور جن کی صورت میں ہو، ہر ایک کے فتنہ سے انکی ذات پاک اور بلند ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض خود غرض لوگوں نے بعض مشوروں میں پھسلانا چاہا، مگر خدا نے پھسلنے نہ دیا اور فرمایا کہ میری جو رحمت اور مہربانی تجھ پر مبذول ہے، وہ ہر وقت تیری دست گیری، اور گمراہی سے تیری نگہبان ہے، اور کتاب الٰہی اور حکمت و دانائی جو تجھے عطا ہوئی وہ

تیری پاسبان ہو،

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ط وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ط وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ط وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا، (نسآء ۶-۱۷)

اور اگر تجھ پر اللہ کا فضل اور مہربانی نہ ہوتی تو ایک گروہ نے تیرے گمراہ کرنے کا ارادہ کیا تھا، اور وہ گمراہ نہیں کرینگے لیکن خود اپنے آپ کو، اور تجھے کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گے، اور خدا نے تجھ پر کتاب اور حکمت اُتاری ہے، اور اس نے وہ سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا، اور تجھ پر خدا کا بڑا فضل ہے،

اور یقیناً موقع و محل کی شہادت سے اس سب سے بڑے فضل سے یہاں مراد عصمت ہے، خود نفس انسانی بھی اپنی جھوٹی تمناؤں، خود غرضانہ آرزوؤں اور خوش نما خیالوں سے لوگوں کو دھوکا دیتا ہے، لیکن انبیاء علیہم السلام اس فریب تمنا سے بھی پاک ہیں، بشریت کے اقتضاء سے یہ تو ممکن نہیں کہ خود اپنے مشن، اور جس دعوت حق کو لیکر وہ آئے ہیں، اسکی جلد از جلد کامیابی اور لوگوں کے بسرعت قبول ایمان کے متعلق اُن کے دل میں تمنائیں، اور آرزوئیں نہ پیدا ہوتی ہوں، لیکن وہ مصلحت الٰہی کے مطابق نہیں ہوتیں، اس لئے اللہ تعالیٰ اُن خیالات اور تمناؤں کو اُن کے دلوں سے نکال دیتا ہے، اور اپنے فیصلہ کو برقرار رکھتا ہے، فرمایا،

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ج فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ

اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی نبی یا رسول نہیں بھیجا، لیکن یہ کہ جب وہ خیال باندھتا ہے، تو شیطان اسکے خیال میں کچھ ملا دیتا ہے تو خدا شیطانوں کی ملاوٹ کو مٹا دیتا ہے،

ثُمَّ يَأْتِيكُمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (حج-۷)

اور اپنے حکموں کو مضبوط کر دیتا ہے، اور خدا دانا اور حکمت والا ہے،

اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء کرامؑ غلط خیال آرائی کے گناہ سے بھی محفوظ رکھے جاتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا گیا،

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى (نجم-۱) (اے مسلمانو!) تمہارا صاحب نہ گمراہ ہوا نہ بھٹکا،

اس عدم گمراہی اور عدم ضلالت کا تعلق کسی خاص عہد اور وقت سے نہیں ہے، بلکہ اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر عہد سابق اور زمانۂ ماضی سے ضلالت اور غوایت کی پوری نفی کی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ آپ کا دامن سدا ان کانٹوں سے پاک رہا،

بعض شبہات کا ازالہ قرآن پاک میں بعض ایسے الفاظ ہیں، جن سے ایک ظاہر بین کو یہ دھوکا ہو سکتا ہے کہ بعض پیغمبروں کے دامن پر عدم معصومیت کے بھی داغ ہیں، مگر علمائے محققین نے ان میں سے ہر ایک شبہ کا تشفی بخش جواب دیدیا ہے، اور خصوصیت کے ساتھ علامہ ابن حزم اندلسی نے الفصل فی الملل والنحل (جلد چہارم) میں اور قاضی عیاض مالکی نے شفا قسم ثالث، باب اول، میں خفاجی نے شرح شفا (جلد چہارم) میں اور متاخرین میں ملا دوست محمد کابلی نے تحفۃ الاخلاء فی عصمۃ الانبیاء میں ایک ایک شبہ کو پوری طرح رد کیا ہے، جس سے ظاہر بینی کا پردہ آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے، اور اصل حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے، ان میں سے ہر شبہ کا ذکر کرنا اور اس کا رد کرنا ایک طویل عمل ہے، مختصراً اصولی طور سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مسئلہ میں جو غلط فہمیاں کسی کو پیش آتی ہیں، ان کے دو اسباب ہیں اور ان اسباب کی تشریح

کر دیتا ہی ان غلط فہمیوں کو دور کر دیتا ہے،

۱۔ سب سے پہلی بات یہ ذہن نشین کر لینی چاہیئے، کہ انبیاء علیہم السّلام کا پایہ بندوں میں بلکہ تمام مخلوقات میں خواہ کسی قدر بلند ہو، اور ان کا دامن گناہ و عصیان کے گرد و غبار سے کتنا ہی پاک ہو تاہم اس ذوالجلال والاکرام کے سامنے اُن کی حیثیت ایک عبد، ایک بندہ، اور ایک عاجز مخلوق ہی کی ہے، ایک عبد و غلام خواہ کسی قدر اطاعت کیش، کفا ہی، و فا شعار، اور مطیع و فرمانبردار ہو، تاہم اپنے آقا کے سامنے اُسکو اپنے قصور کا معترف، اپنی تقصیر کا مقر، اپنی کوتاہیوں پر خجل اور اپنی فروگذاشتوں پر نادم ہی ہونا چاہیئے، اسی لئے حضرت ابراہیمؑ جن کی نیکی اور پاکی کی شہادت سے قرآن بھرا ہوا ہی، وہ خدا کی عظمت و جلال اور اسکی رحمت و شفقت کے ذکر میں فرماتے ہیں

وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ط (شعراء ۔ ۵)

اور وہ خدا جس سے جزا کے دن اپنی بھول چوک کی معافی کی پوری امید رکھتا ہے،

نبی کا یہ اعتراف و اقرار اور خجالت و ندامت، اُس کا نقص نہیں بلکہ اسکی بندگی اور عبودیت کا کمال ہے، اور آقا کا حق پہنچتا ہے کہ اس کے غلام، اطاعت و فرمانبرداری کے جس حیرت انگیز رتبہ تک بھی پہنچے ہیں، وہ اُن سے اطاعت کیشی اور وفا شعاری کے اس سے بھی بلند رتبہ کا مطالبہ کرے کہ اس کے دربار میں ان کے عروج و ترقی کی کرسی اور بھی اونچی ہوتی جائے، بعض آیتوں میں اگر کسی پیغمبر کو خدا سے مغفرت مانگنے کی ہدایت کی گئی ہے، تو اس کا سبب گناہ کا وجود نہیں بلکہ ہر قدم پر گذشتہ رتبۂ اطاعت پر قناعت کر لینے پر تنبیہ اور مزید اطاعت کا مطالبہ ہی، تاکہ وہ اُس کے مزید تقرب کا ذریعہ بن سکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہوتا ہے،

إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ أَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا (نصر)

جب اللہ کی مدد آچکی، اور مکہ فتح ہو چکا اور لوگوں کو اللہ کے دین میں گروہ در گروہ جاتے دیکھ چکا تو اپنے پروردگار کی پاکی بیان کر اور اُس سے معافی چاہ کہ وہ بندے کے[۳]

غور کرو کہ خدائی مدد آنا، مکہ فتح ہونا، بُت پرستی کی بیخکنی، اور لوگوں کا مسلمان ہو جانا کونسی جرم ہے، جس کے کوئی معافی چاہے، اسی طرح سورۂ فتح میں فرمایا،

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا (فتح-۱)

ہم نے تجھکو کھلی فتح دی تاکہ اللہ تیری اگلی پچھلی خطا کو معاف کرے اور اپنا احسان تجھ پر پورا کرے، اور تجھ کو سیدھی راہ چلائے، اور تجھ کو مضبوط مدد دے،

دوبارہ غور کرو کہ مکہ کی فتح کامل نصیب ہونے کو حضور کی معافی سے بجز اس کے کیا تعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کے حسنِ خدمت کو قبول فرما کر اپنی خوشنودی کا اظہار فرماتا ہے، اس استغفار سے مقصود نعوذ باللہ پیغمبر کی گنہگاری کا ثبوت نہیں، بلکہ اس کی عبدیتِ کاملہ کا اظہار ہے،

حضرت عیسیٰ علیہ السلام، جن کے خدا کے بیٹے ہونے کے عیسائی، اور فرشتے جن کے خدا کی بیٹیاں ہونے کے اہلِ عرب قائل تھے، اور ان کو خدا کا درجہ دیتے تھے، ان کے متعلق قرآن نے کہا،

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا (نساء ۔۴۴)

مسیحؑ کو ہرگز اس سے عار نہ آئیگا کہ وہ خدا کا بندہ ہو، اور نہ مقرب فرشتوں کو اور جو اسکی بندگی سے عار کرے گا اور بڑائی چاہے گا تو خدا ان سب کو اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔

اس سے مقصود نعوذ باللہ حضرت عیسیٰؑ کی توہین نہیں، بلکہ ان کی عبدیت اور بندگی کا اعلان ہے۔

الغرض انبیاءؑ کا خدا کے حضور میں اپنی کوتاہی کا اعتراف، انکی گنہگاری کا ثبوت نہیں، بلکہ ان کی عبدیت کاملہ کا اظہار ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا کسی پیغمبر کی نسبت یہ فرمانا کہ میں نے تجھے معاف کیا، اسکی گنہگاری کا اعلان نہیں، بلکہ اپنی پسندیدگی، رضا اور قبولِ تام کی بشارت ہے، سورۂ فتح کی جو آیتیں اوپر گذریں، ان کو پڑھو، تو ظاہر ہوگا کہ چونکہ بت پرستی کی آلائش سے مکہ کی تطہیر، اور کل جزیرۂ عرب میں حق و باطل کی تمیز، مکہ کی فیصلہ کن فتح پر موقوف تھی، اسلیے جب وہ پیغمبر علیہ السلام اور مسلمانوں کی مسلسل کوششوں اور جانفروشیوں سے حاصل ہوئی تو خدا نے اعلان فرمایا کہ آج اس فتح سے نبوت کے فرض کی، اور تجھ پر میرے سلسلۂ احسانات کی تکمیل ہوئی، پھر خدا آپ سے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کا اور اپنی زبردست مدد کا وعدہ کرتا ہے، حالانکہ ان میں سے ہر چیز آپ کو پہلے ہی عنایت ہو چکی تھی، کیا فتح مکہ سے پہلے آپ صراطِ مستقیم یعنی اسلام پر نہ تھے، یا آپ کو زبردست مدد نہیں مل چکی تھی، یہ سب مرتبے حاصل تھے، مگر ان باتوں کے بیان کرنے سے اللہ تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ اس موقع پر اس طرح اپنی مزید رضامندی کا اظہار فرمائے

اور رسول کی اگلی پچھلی تمام فروگذاشتوں پر (اگر ہوں) خطِ عفو پھیرنے کا اعلان کرکے
ان کو نیا خلعتِ فاخرہ عطا اور نئے مراتبِ جلیلہ عنایت کرے،

عبدیتِ کاملہ کا یہی راز و نیاز ہے، جو حضرت مسیحؑ کے اس فقرہ میں نمایاں ہے، ایک سردار اُن کو "اے نیک استاد" کہکر خطاب کرتا ہے، اسکے جواب میں وہ فرماتے ہیں،

"تو کیوں مجھ کو نیک کہتا ہے؟ کوئی نیک نہیں، مگر ایک یعنی خدا" (لوقا ۱۸-۱۹)

حضرت مسیحؑ کے اس فقرہ سے کسی کا یہ قیاس کرنا کہ وہ نیک نہ تھے، کسقدر غلط ہوگا، اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کا اپنی مشہور دعا میں یہ کہنا کہ

"اور جس طرح ہم اپنے قرضداروں کو بخشتے ہیں، تو اپنے دَین ہم کو بخشدے" (متی ۶-۱۲)

ان کی گنہگاری کی دلیل نہیں بلکہ عبدیتِ کاملہ کے اظہار کا ثبوت ہے،

نکتہ: عربی زبان میں گناہ کے لیے مختلف الفاظ ہیں، مثلاً ذنب، اثم، حنث، جرم وغیرہ ان میں سے ذنب کے سوا دوسرے الفاظ کا اطلاق اس حقیقی گناہ پر کیا جاتا ہے جو بالقصد اور جان بوجھکر کیا جائے، لیکن ذنب کا اطلاق ہر غلط فعل پر ہوتا ہے خواہ وہ جان بوجھکر کیا جائے، یا بن جانے غلط فہمی سے ہو، یا سوچ سمجھکر، بھول چوک سے ہو، یا قصداً اور ان کاموں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو درحقیقت عام امت کے لیے گناہ نہیں، لیکن انبیاء کے حق میں اتنی غفلت بھی مواخذہ کے قابل ہے، اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ حسنات الابرار سیاٰت المقربین (نیکوں کی نیکیاں مقربین کی برائیاں ہیں) ع

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

انبیاء علیہم السلام کے استغفار کے موقع پر ہمیشہ "ذنب" کا لفظ استعمال ہوا ہے، جرم، اثم یا جنث کا نہیں،

ذنب کا لفظ بھول چوک اور غفلت سے لیکر عصیان تک کو شامل ہے[1]، اسلیے کسی نبی کو اگر خدا کی طرف سے استغفار ذنب کی ہدایت کیگئی تو اسکے معنی صریح عصیان و گناہ کے نہیں، بلکہ یہی انسانی بھول، چوک اور فروگذاشت ہے، جس کی اصلاح و تنبیہ اللہ تعالیٰ اپنے رحم و کرم اور لطف و عنایت سے فرماتا رہتا ہے، اسی کے لیے استغفار کا حکم ان کو ہوتا رہتا ہے،

اسی سے ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ بھول چوک اور بلا ارادہ غفلت گو امت کے حق میں قابل مواخذہ نہیں، مگر انبیاء علیہم السلام کے بلند مرتبہ کے لحاظ سے یہ چیزیں بھی گرفت میں آتی ہیں، کیونکہ ان کا قول و فعل شریعت بنجاتا ہے، اسلیے شریعت کی حفاظت کیلیے انکے ہر قول و فعل کی حفاظت بھی ضروری ہے، اس بنا پر اگر ان سے احیاناً کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے تو فوراً اس پر تنبیہ کیجاتی ہے، اور انکو ہشیار کر دیا جاتا ہے، اور اسی کے ساتھ انکی یہ چیز معاف کر کے انکو بشارت سنا دیجاتی ہے، اور اس طرح ہر چھوٹے بڑے دانستہ اور نادانستہ تمام گناہوں سے ان کا دامن پاک و صاف رکھا جاتا ہے۔

فَتَلَقّٰى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ	تو آدم نے اپنے رب سے چند باتیں سیکھ لیں، تو وہ

[1] اس فرق کو عام لغت نویسوں نے ملحوظ نہیں رکھا ہے مگر جن علمائے لغت نے الفاظ کے فروق پر کتابیں لکھی ہیں انھوں نے اسکی تصریح کی ہے، ہم یہاں پر بیروت کے مشہور عیسائی لغت نویس ادیب لاب ہنری کوس لانس کی کتاب فوائد اللغۃ فی الفرق کی عبارت نقل کرتے ہیں الاثم الذنب الذی یستحق العقوبۃ علیہ ولا یوصف بہ الا المجرم وبین الاثم والذنب فرق من حیث ان الذنب مطلق المجرم عمداً کان او سہواً بخلاف الاثم فانہ ما یستحق فاعلہ العقاب فیختص بما یکون عمداً، والخطیئۃ ابلغ من الذنب لان الذنب یطلق علی الصغیرۃ والخطیئۃ علی الکبیرۃ، والمجرم لا یطلق الا علی الذنب الغلیظ (ص ۹۶-۹۷ مطبوعہ کاثولیکیہ ۱۸۸۹ء)

عَلَيْهِ (بقرہ - ۴)	اس کی طرف رجوع ہوا،
ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ (طٰہٰ - ۱۲۲)	پھر خدا نے اس (آدم) کو برگزیدہ کیا پھر اسکی طرف رجوع ہوا
لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ (توبہ - ۱۴)	یقیناً اللہ نبی کی طرف رجوع ہوا،
فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ (انبیاء - ۹)	پھر ہم نے اس (یونس) کی دعا قبول کی، اور اسکو غم سے رہائی دی
لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ (فتح - ۱)	تاکہ اللہ تیری اگلی پچھلی فروگذاشت معاف کرے۔

کامل اور عام عفو و مغفرت کا یہ مرتبۂ بلند خود بندہ کی زندگی میں انبیاء کے سوا کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔

۲- انبیاء کی معصومیت کے مسئلہ میں غلط فہمی کا دوسرا سبب یہ ہے کہ انبیاء کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت زندگیوں میں قوت اور فعل کا جو فرق ہے اسکو ملحوظ نہیں رکھا جاتا، علم اور جہل، ضلالت اور ہدایت، اضافی الفاظ میں سے ہیں، علم کی ہر حد کو علم کے مافوق درجہ کے لحاظ سے جہل اور ہدایت کے بلند سے بلند رتبہ کو اس سے بھی اوپر کے مرتبہ کے لحاظ سے ضلالت کہہ سکتے ہیں،

انبیاء علیہم السلام کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت زندگیوں میں قوت اور فعلیت کا فرق ہے، جس طرح تخم میں تمام برگ و بار پوشیدہ ہوتا ہے لیکن وہ اس وقت درخت نہیں ہوتا اور نہ اس میں تنہ، شاخیں، پتے، پھول اور پھل ہوتے ہیں، اور نہ اس کا عالم پناہ سایہ ہوتا ہے لیکن ایک وقت آتا ہے جب وہی تخم بڑھ کر ایک نیا درخت بنجاتا ہے، اس کے پتے آنکھوں میں ہریالی پیدا کرتے ہیں، اس کے پھول مشام جاں کو معطر کرتے ہیں، اسکے پھل کام و دہن میں شہد ٹپکاتے ہیں،

اس کے سایہ میں تھکے ماندے مسافر آرام پاتے ہیں، اسی طرح نبوت کی سابقہ اور لاحقہ زندگیوں میں عظیم الشان فرق ہے، اور اسی فرق کی بنا پر اس کی قبل از نبوت زندگی، ظہور نبوت کے بغیر تاریکی اور ضلالت، اور بعد کی زندگی نور اور ہدایت معلوم ہوتی ہے جس طرح عام افراد کی زندگی اسلام و ایمان کے بغیر ضلالت اور اسلام و ایمان کے بعد ہدایت سمجھی جاتی ہے، اسی طرح انبیاء کی زندگی ان کی نظر میں نبوت کے بغیر ضلالت اور نبوت کے بعد ہدایت ہوتی ہے، غرض یہ کہ ظہور نبوت سے پہلے کا زمانہ ان کی ضلالت کا اور بعد کا زمانہ انکی ہدایت کا عہد کہلاتا ہے لیکن ضلالت اور ہدایت کا یہ مفہوم اس مفہوم سے بالکل مختلف ہے جو غیر انبیاء کے حق میں مستعمل ہے، اللہ تعالیٰ جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے احسانات گناتا ہے، فرماتا ہے:

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَاٰوٰى ۝ وَوَجَدَكَ	کیا اللہ نے تجھ کو یتیم نہ پایا، پھر پناہ دی اور اس نے
ضَآلًّا فَهَدٰى ۝ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا	تجھ کو بھولا پایا تو رہنمائی کی اور تجھکو محتاج
فَاَغْنٰى (ضحیٰ - ۱)	پایا، تو بے نیاز کیا،

سطور بالا سے ظاہر ہے کہ یہاں ہدایت سے نبوت اور ضلالت سے قبل نبوت کی زندگی مراد ہے، جو نبوت کے بعد کی زندگی کے مقابلہ میں نسبتہً ضلالت ہی ہے،

"ضلالت" کے معنی عربی میں صرف صریح گمراہی ہی کے نہیں ہیں بلکہ نادانستہ بھولنے بہکنے اور غفلت کر لے کے بھی ہیں، عورتوں کی شہادت کے موقع پر ہے:

اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا	بھول جاوے ایک عورت تو یاد دلاوے
الْاُخْرٰى (بقرہ - ۳۹)	اس کو دوسری۔

ایک اور آیت میں علم الٰہی کی تعریف میں ہے،

لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسَی (طٰہٰ ۲۰) نہ چوکتا ہے میرا رب نہ بھولتا ہے،

ان آیتوں میں لفظ ضلالت کا استعمال بتاتا ہے کہ "ضَالّ" کے معنی عربی زبان اور محاورۂ قرآن میں صرف گمراہ کے نہیں بلکہ بھول چوک کے بھی ہیں، اسی طرح اس حالت کے بھی ہیں، جس میں گمراہی گو گمراہی معلوم ہوتی ہے، لیکن ہنوز ہدایت الٰہی کا نور اسکے سامنے نہیں چمکا، غلطی کا احساس ہوتا ہے، مگر اس غلطی کی جگہ ہنوز صحت نظر نہیں آئی ہو، جہل کی برائی تو معلوم ہوگئی ہے، مگر ہنوز علم کا دروازہ نہیں کھلا ہے، اور یہی قبل نبوت کی کیفیت ہوتی ہو، حضرت موسیٰؑ نے اپنی نبوت سے پہلے ایک ستم شعار قبطی کو گھونسا مارا تھا جس کے صدمہ سے وہ اتفاقیہ مرگیا تھا، نبوت پاکر جب وہ لوٹے تو فرعون نے ان کو طعنہ دیا کہ تم تو میرے فراری مجرم ہو، حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا،

فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّیْنَ (شعراء - ۲) میں نے اس حالت میں کیا تھا کہ میں چوکنے والوں میں سے تھا۔

اس چوک اور ضلالت سے مقصد صرف یہی ہو کہ اس وقت میں نبوت کی عزت سے سرفراز نہ تھا، ورنہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے نبوت سے پہلے کوئی گمراہی کی بات نہیں کی تھی، نہ بت کو پوجا تھا، نہ فرعون کو سجدہ کیا تھا، نہ کوئی اور شرک کیا تھا، کسی کے طمانچہ مارنے سے اتفاقیہ کسی کمزور کا مرجانا، مارنے والے کا کوئی بالقصد گناہ نہیں جس کو ضلالت کہیں، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا اپنے کو اس وقت ضال کہنے سے مراد نبوت سے سابقہ زندگی ہے،

اس قبل نبوت کی زندگی کو بعد نبوت کی زندگی کے لحاظ سے جسے یہاں "ضلالت" کہا گیا ہے دوسری جگہ اس کو "غفلت" (بےخبری) سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، حضرت یوسفؑ کے قصہ میں آپ کو خطاب ہے:

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا	ہم تجھے بہترین قصہ سناتے ہیں، کیونکہ ہم نے تیری
اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ق وَاِنْ	طرف یہ قرآن اتارا، اگرچہ اس قرآن کی وحی سے
كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ (یوسف-۱)	پہلے تو بےخبروں میں تھا،

اس "بےخبری" کے عالم کی تفسیر دوسری آیت میں ہے جس میں پیغمبر کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت کی زندگی کا فرق ظاہر فرما دیا ہے،

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ	اور اسی طرح ہم نے اپنے (خلوت خانہ) راز سے
اَمْرِنَا ط مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ	ایک روح تیری طرف وحی کی، تو نہیں جانتا تھا
وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ	کہ کتاب کیا ہے اور نہ ایمان، لیکن ہم نے اس کو
بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ط وَاِنَّكَ	نور بنا دیا جس سے جس کی چاہتے ہیں اپنے بندوں
لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ لا	میں سے رہنمائی کرتے ہیں، اور بے شک تو سیدھی
(شوریٰ-۵)	راہ دکھاتا ہے۔

"کتاب و ایمان" کے نور و ہدایت ملنے سے پہلے کی یہی وہ کیفیت و حالت ہے جس کو کہیں ضلالت اور کہیں غفلت کہا گیا، اس سے مقصود حقیقی گنہگاری، عصیان کاری اور باطنی گمراہی نہیں ہے، بلکہ طلبِ حق، تلاشِ معرفت اور انتظارِ حقیقت ہے کہ وہی ان کے

حق میں ضلالت اور غفلت کا حکم رکھتا ہے، آخر وہ وقت آتا ہے جب روشنی چمکتی ہے، روحانی سکون کا چشمہ بہتا ہے، اور منزل رسی کے بعد دوسروں کی رہنمائی کا منصب عطا ہوتا ہے، یہ ہدایت کا دور ہے، چنانچہ ایک موقع پر انبیاء کے نبوت ملنے کو ہدایت کے لفظ سے ادا فرمایا گیا ہے،

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ (انعام - ۱۰)

اور ہم نے ابراہیم کو اسحٰق اور یعقوب بخشے اور ان میں ہر ایک کو ہدایت دی اور ان سے پہلے نوح کو ہدایت دی،

اس ہدایت دینے سے اگر نبوت عطا کرنا مراد ہے تو ظاہر ہے کہ عدم نبوت کا عہد "ضلالت" ہی کہلائے گا، مگر اس سے مقصد صرف وہ حالت ہوگی جس میں ان کو ہنوز نبوت نہیں ملی تھی اور اس مرتبۂ بلند کا انتظار تھا،

اس تشریح سے یہ واضح ہو گیا کہ انبیاء کے حق میں ضلالت سے مقصود گنہگاری، عصیان کاری اور گمراہی نہیں، بلکہ عدم نبوت کا دور اور رسالت کی زندگی سے پہلے کا عہد ہے، جو نبوت و رسالت کی ہدایت کے مقابلہ میں نسبۃً ضلالت ہے،

نبی کی بشریت نبی کی معصومیت اور اس کے دوسرے مقدس خصوصیات کے باوجود اسلام کی تعلیم یہی ہے کہ نبی خدا کا مخلوق خدا کا بندہ اور آدمی ہی ہوتا ہے، وہ خدا، خدا کا اوتار، دیوتا یا فرشتہ نہیں ہوتا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ بھی ان مسائل میں سے ہے، جن کی اصل حقیقت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے افراط و تفریط کی تاریکی میں گم تھی، اور آپ کے فیض تعلیم سے وہ روشن ہوئی، اسلام سے پہلے یہودیوں کی طرح ایسے اہل مذہب بھی تھے جو پیغمبروں کو ایک پیشنگوئی کی صفت کے علاوہ ہر حیثیت سے معمولی انسان سمجھتے تھے، وہ ہر قسم کے گناہ بھی کرتے تھے،

وہ بد اخلاقیوں کے بھی مرتکب ہوتے تھے، وہ کفر بھی کرتے تھے، تاہم پیغمبر سمجھے جاتے تھے'
دوسری طرف عیسائی بھی تھے، جو اپنے نجات دہندہ کو انسانیت سے پاک خود خدا یا
خدا کا جزء یا ناسوت ولاہوت کا ایک مجموعہ سمجھتے تھے، اور ہندو بھی تھے جو اپنے رہنماؤں کو
دیوتا اور اوتار، یعنی مجسم خدا، یا انسان کے بھیس میں خدا سمجھتے تھے اور جنکو ہر قسم کی خدائی طاقتیں حاصل تھیں'

اسلام نے اپنی تعلیم ان دونوں کے وسط میں پیش کی، وہ ایک طرف رسولوں کو مخلوقِ محض
صرف انسان اور پورا بندہ اور خدا کے حکم کے سامنے عاجز و درماندہ تسلیم کرتا ہے، لیکن دوسری
طرف وہ اُن کو خدا کا برگزیدہ، معصوم، نیک اور خدا کی قدرت سے فیض پاکر برکتوں، معاونوں
اور ہدایتوں کا مرکز اور اس کی اجازت سے عجیب و غریب امور صادر کرنے والا بتاتا ہے، اور
بے اعتدالی کے اُن دونوں خیالات کی جو غلط فہمی پر مبنی ہیں، علانیہ تردید کرتا ہے' اہلِ عرب
بھی ہندوؤں، یونانیوں اور عیسائیوں کی طرح یہ سمجھتے تھے کہ انسان کی رہنمائی کیلئے خود انسان
نہیں، بلکہ انسان سے مافوق ہستی ہونی چاہیئے، اور وہ ہستی صرف فرشتوں کی ہے' قرآن نے انکے
اس خیال کی بار بار تکذیب کی ہے اور کہا ہے کہ اگر زمین میں فرشتے آباد ہوتے، تو فرشتہ کو انکے
پاس رسول بنا کر بھیجا جاتا، اور انسانوں میں فرشتہ آتا بھی تو انسانیت ہی کے پیکر میں آتا تو
ایسی حالت میں تم اس فرشتہ کو فرشتہ کب مانتے،

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبروں کے دو رخ ہوتے ہیں، ایک طرف تو وہ بشریت کے جامہ
میں ہوتے ہیں اور انسانوں ہی کی طرح کھاتے پیتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے، شادی بیاہ کرتے
اور پیدا ہوتے اور مرتے ہیں، دوسری طرف وہ اپنی روحانیت، بے گناہی، پاکدامنی اور اختصاص

نبوت میں انسانوں سے بلند تر ہیں، یہودیوں کی طرح جن کی نظر اُن کے انسانی رخ پر پڑتی ہے، وہ انکو ہر طرح معمولی انسان سمجھتے ہیں، اور عیسائیوں کی طرح جن کی نظر اُن کے مافوق انسانی خصائص پر پڑتی ہے، وہ ان میں اُلوہیت کے اوصاف ثابت کرنے لگتے ہیں، حالانکہ حق ان دونوں کے بیچ میں ہے۔ وہ اپنے بشری اوصاف کے لحاظ سے بلاشبہ انسان ہوتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے مافوق بشری خصوصیات کی بنا پر فوق البشر ہوتے ہیں، یہی مغالطہ اُنہیں اپنے پیغمبروں کے متعلق کفار کو ہوتا تھا، پیغمبر اُن کے سامنے جب اپنی نبوت اور خدا کی طرف سے آنے کا دعویٰ پیش کرتے تھے، تو وہ اُن کی بشری خصوصیتوں کو دیکھ کر کہتے تھے کہ تم تو ہماری ہی طرح آدمی ہو، تم خدا کے قاصد اور پیامبر کیسے ہو سکتے ہو، چنانچہ کفار نے بار بار پیغمبروں سے کہا

أَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا (اسرائیل) — کیا خدا نے بشر کو قاصد (رسول) بنا کر بھیجا؟

وہ بشریت کو رسالت کے منافی سمجھتے تھے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا،

هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (اسرائیل) — میں تو نہیں ہوں مگر انسان رسول،

ان کو شبہہ تھا کہ کیا گمراہ انسانوں کی رہنمائی انسان ہی کر سکتا ہے،

أَبَشَرٌ يَهْدُوْنَنَا (تغابن-۱) — کیا انسان ہماری رہنمائی کریں گے؟

یہ وہی شبہہ تھا جس میں پھنس کر عیسائی حضرت عیسیٰؑ کی انسانیت سے منکر ہوئے کہ مورثی گنہگار انسان کو انسان کا بیٹا کیونکر نجات دے سکتا ہے اور یہ نہیں سمجھے کہ انسان مورثی گنہگار نہیں، بلکہ وہ گنہگار بھی ہو سکتا ہے اور بے گناہ بھی، بے گناہی اور معصومیت کے لئے انسانیت سے

پاک ہونا ضروری نہیں، یہی بات اور کفار کی سمجھ میں بھی نہیں آتی تھی اور انبیاءؑ کو ظاہری اور جسمانی طور سے اپنی ہی طرح انسان سمجھکر، ان کو نبوت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے اور کہتے تھے،

اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (ابراہیم ۲) تم تو نہیں ہو لیکن ہماری ہی طرح ایک بشر

دوسروں کو نبی کے انکار کرنے پر اس طرح آمادہ کرتے تھے کہ

هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (انبیاء ۱) نہیں ہے یہ لیکن تمہاری ہی طرح بشر،

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (مومنین ۲) نہیں ہے یہ لیکن تمہاری ہی طرح بشر

انبیاءؑ کے سامنے وہ یہی دلیل پیش کرتے تھے،

مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (شعراء ۲) تم تو ہماری ہی طرح بشر ہو،

مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (یس ۲) تم لوگ تو ہماری ہی طرح بشر ہو،

اور وہ اپنے اس دعویٰ کی صداقت کو ہدایت اور مشاہدہ سے ثابت کرتے تھے،

مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا (ہود ۳) ہم تو تمکو اپنی ہی طرح بشر دیکھتے ہیں،

انبیاء علیہم السلام نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ ہاں تمہاری ہی طرح ہم بشر ہیں، لیکن خدا کے فضل و کرم سے سرفراز ہیں، اور یہی تم میں اور ہم میں فرق ہے، فرمایا،

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اُن کے رسولوں نے جواب دیا کہ ہم تمہاری

اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ ہی طرح بشر ہیں لیکن خدا اپنے بندوں میں

عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (ابراہیم ۲) سے جس پر چاہتا ہے، احسان کرتا ہے

ان کفار کی نظر صرف اُن کے ایک رخ یعنی عام انسانی پہلو پر پڑتی تھی، انبیاء نے جواب میں

اس پہلو کے ساتھ اپنے دوسرے رخ کو بھی اُن کے سامنے پیش کر دیا اور کہا کہ ہاں ہم انسان ہیں لیکن ایسے انسان جن پر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی بارش ہی یعنی نبوت سے سرفراز اور اسکی خصوصیتوں سے ممتاز ہیں، دوسرے نبیوں کی طرح خاتم المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ بار بار ارشاد فرمایا بلکہ وحیِ الٰہی نے آپ کی زبان سے یہ اعلان کر دیا کہ کہدو کہ میں تو تمہاری ہی طرح ایک آدمی اور بشر ہوں"۔ اس اعلان نے جو درحقیقت اس غلط عقیدہ کے مٹانے کے لئے تھا، جو انبیاؑ کی شانِ الوہیت کے متعلق عیسائیوں کے اثر سے لوگوں میں پھیل گیا تھا، اور افسوس ہے کہ اس قسم کا غلط خیال اس نبی کی امت کے ایک گروہ میں بھی پایا جاتا ہے، جو دنیا میں خدا کی توحید کامل کا مبلغ بنکر آیا تھا، دوسری طرف اس اعلان سے ایک تفریط پسند گروہ نے یہ نتیجہ نکالا کہ پیغمبر اور عام انسانوں میں کوئی فرق و امتیاز نہیں اور نہ پیغمبروں کو عام انسانوں پر کوئی بلندی و برتری حاصل ہے لایہ کہ پیغمبروں پر وحی آتی رہتی ہے، اور عام انسان اس سے محروم ہیں، گویا اس کا منشا یہ ہے کہ پیغمبر صرف اس لحاظ اور اس میں منصبِ نبوت کا امتیاز پاتا ہے، جس پر کسی قسم کی وحی نازل ہوتی ہے، اور اس کے پہلے اور اس کے بعد وہ عام انسان ہوتا ہے، اس سے آگے بڑھکر اسی لئے ایک اور مختصر سے فرقہ نے یہ دعویٰ کیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغمبرانہ حکم صرف وہی ہے، جو وحیِ قرآنی کی صورت میں آیا، اس کے علاوہ آپکے تمام احکام جو قرآن سے باہر ہیں، وہ صرف عاکمانہ اور انتظامی امور ہیں، جن کی پیروی کرنا نہ اسلامی شریعت ہی، نہ اسلام کا جزو ہے، یہ خیالات حقیقت میں دوسرے فرقہ کے مفرطانہ خیالات کے مقابلہ میں تفریطانہ ہیں اور یہ دونوں اعتدال کی حد سے باہر ہیں، اور حقیقت ان کے بیچ میں ہے،

قرآن پاک میں تین جگہ وہ آیتیں ہیں جن میں خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کا اعلان ہے، مگر ہر جگہ توحید کامل کے بیان اور خدا کے مقابلہ میں رسولوں کی عبدیت کی تشریح اور اس عقیدۂ باطل کی تردید میں ہیں، کہ رسولوں کے ہاتھوں میں یہ قوت ہونی چاہیئے کہ وہ خدا سے زبردستی کسی بات کو منوالیں، اور سعی و سفارش کرکے قصور معاف کرادیں، قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ انکو جو کچھ حاصل ہے، وہ خدائے تعالیٰ کی اجازت، اذن اور عطا سے ہے،

سورۂ کہف میں ان مشرکوں کا ذکر ہے جو خدا کے بندوں کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں،

اَفَحَسِبَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنْ یَّتَّخِذُوْا	کیا وہ جنھوں نے کفر کیا، یہ سمجھے ہیں کہ وہ میرے
عِبَادِیْ مِنْ دُوْنِیْٓ اَوْلِیَآءَ اِنَّآ اَعْتَدْنَا	بندوں (رسولوں اور فرشتوں) کو میرے سوا اپنا حامی
جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِیْنَ نُزُلًا (کہف۔۱۲)	بنالیں گے، ہم نے ان کافروں کے لئے جہنم تیار کی ہے

قرآن اس خیال کو کفر قرار دیتا ہے، یہ رکوع کا شروع ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے غیر محدود اوصاف و کمالات کا ذکر ہے، پھر ارشاد ہے،

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یُوْحٰٓى اِلَیَّ	کہدے کہ میں تو تمہاری طرح ایک بشر ہوں، مجھ پر
اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (کہف۔۱۲)	وحی کیجاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے

دوسری جگہ یہی تعلیم بعینہٖ سورۂ حم السجدہ (فصلت) میں ہے،

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یُوْحٰٓى اِلَیَّ اَنَّمَآ	کہدے کہ میں تو تمہاری طرح ایک بشر ہوں، مجھ پر وحی
اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِیْمُوْٓا اِلَیْهِ	کیجاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے، اسکی طرف سیدھے
وَاسْتَغْفِرُوْهُ وَوَیْلٌ لِّلْمُشْرِكِیْنَ (حم السجدہ)	رہو اور اس سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو خرابی

اس آیت کا منشا بھی یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں رسول اسی طرح ایک بندہ ہے، جس طرح خدا کے دوسرے بندے، دعائیں خدا ہی سے مانگنی چاہئیں اور اُسی سے اپنے گناہوں کی معافی کی درخواست کرنی چاہئے، یہ اختیارات خاص خدا کے بندوں کے نہیں، اس تعلیم سے مقصود حقیقت میں عیسائیوں کے مسئلۂ کفارہ اور اُن کے اس عقیدہ کی بڑ ہے کہ گناہوں کا معاف کرنا، حضرت عیسیٰؑ کے اختیار میں ہوگا، اور مسلمانوں کو اپنے رسول کی نسبت اس قسم کی باطل عقیدتمندیوں سے بچانا ہے، چنانچہ تیسری جگہ قرآن پاک میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کفار کا یہ مطالبہ مذکور ہے، کہ تم خدا کے پیغمبر ہو تو ہمارے لئے سونے کی چھت بنا دو، جہاں نہریں نہیں وہاں نہریں جاری کر دو، ہمارے سنسان جنگلوں کو باغ و بہار بنا دو، اپنے ساتھ جلو میں فرشتوں کے پرے لیکر چلو، ہمارے سامنے آسمان پر چڑھ جاؤ، اور وہاں سے ہاتھ میں کتاب لیکر سامنے اترو،

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ	اور انھوں نے کہا کہ ہم تیرا یمان ہرگز تک نہیں لائیں گے
الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۙ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ	جبتک تم ہمارے لئے زمین سے ایک چشمہ نہ بہا دو یا تمہارے
مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ	لئے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ نہ ہو جائے
خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۙ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا	یا جیسا تم کہتے ہو، آسمان کے ٹکڑے کر کے ہمپر نہ گراؤ
زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ	یا خدا کو اور فرشتوں کو ضامن بنا کر نہ لے آؤ
وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۙ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ	تمہارے لئے سونے کا ایک گھر نہ ہو جائے، یا
مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ۭ وَلَنْ	تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور وہاں تمہارے آسمان

نُؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهٗ (بنی اسرائیل - ۱۰)

پر چڑھنے کا ہم کو اس وقت تک یقین نہ آئیگا جبتک تم وہاں سے ایک نوشتہ نہ ہمپر اتار لاؤ، جس کو ہم پڑھ لیں،

یہ امور شکل و محال نہ تھے، لیکن نبوت کے اوصاف کو ان بازیگرانہ تماشوں سے تعلق نہ تھا، اور اس سے زیادہ یہ کہ اس غلط عقیدہ کا ابطال کرنا تھا کہ پیغمبر میں براہ راست کچھ خدائی اختیارات ہوتے ہیں، اس لئے آپ کو یہ جواب سکھایا گیا کہ آپ فرمائیں،

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا، وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا، قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا، (اسرائیل - ۱۱)

کہدے اے پیغمبر! سبحان اللہ میں تو ایک بشر ہوں، رسول اور لوگوں کو جب ان کے پاس ہدایت آئی ایمان لانے سے باز نہیں رکھا، مگر اس خیال نے کہ کیا خدا نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے، کہدے کہ اگر زمین میں فرشتے ہوتے تو ہم آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر ان پر اتارتے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بحکم خدا معجزات بھی صادر ہوئے اور ان کی حیرت انگیزی کو انھوں نے تسلیم بھی کیا، پھر بھی یہ خیال کہ ایک بشر رسول کیونکر ہو سکتا ہے، قائم رہا کفار نے معجزات دیکھنے کے بعد بھی یہی کہا،

مَنْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ (انبیاء)

یہ تو تمہاری ہی طرح بشر ہے، کیا تم دیکھ بھال کر بھی جادو کے پاس آتے ہو،

معجزات کی حیرت انگیزی کو جادو کہکر تسلیم کیا، مگر پھر بھی انکو بشریت رسالت کے منافی ہی معلوم ہوئی، اُن سے کہا گیا کہ نبوت و رسالت کے اوصاف و خصائص تم سے زیادہ اُنکو معلوم ہیں، جن کو تم سے پہلے آسمانی کتابیں عطا ہوئیں، یعنی یہود ان سے پوچھ لو کہ رسول اللہ بشر ہی ہوتے آئے ہیں،

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (انبیاء-۱)

اور ہم نے نہیں بھیجا رسول بنا کر تم سے پہلے لیکن انسانوں ہی کو جن کو ہم وحی کرتے تھے، جانتے والوں سے پوچھو، اگر تم نہیں جانتے،

یہی جواب سورۂ یوسف میں دیا گیا،

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى (یوسف-۱۲)

اور ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھیجے، وہ بشر ہی تھے، آبادیوں کے رہنے والے ہم ان پر وحی کرتے تھے،

اس سے زیادہ تفصیل سورۂ نحل میں ہے،

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (نحل-۶)

اور ہم نے نہیں بھیجا تم سے پہلے لیکن انسانوں کو جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے تو پوچھ لو کتاب والوں سے اگر تم نہیں جانتے، کھلی نشانیاں اور کتابیں دیکر اور ہم نے تم پر کتاب (ذکر) اتاری تاکہ تم کھول کر لوگوں سے بیان کر دو، جو ان کی طرف اُتارا گیا، اور تاکہ وہ سوچیں،

ہر شخص جو مثلیت اور بشریت کی ان آیتوں پر ایک نگاہ ڈالے گا، وہ یہی سمجھے گا کہ ان آیتوں میں جس قسم کی مثلیت اور بشریت کا ذکر ہے، اس کا تعلق ظاہری جسمانیت اور جسمانی قوی اور مخلوقیت سے ہے، ورنہ اخلاقی، روحانی، دماغی، قلبی، علمی اور عملی حیثیت سے ایک پیغمبر انسان رہ کر بھی غیر نبی انسانوں سے بلند تر اور علانیہ ممتاز ہوتا ہے، نبی اور غیر نبی میں صرف وحی کے امر فارق ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نبی القائے ربانی سے متصف ہونے کے علاوہ بقیہ تمام اوصاف و کمالات یا عیوب و نقائص میں عام انسانوں کے برابر ہوتا ہے، یہ کہنا ایسا ہی ہے، جیسے کوئی یہ کہے کہ عالم و جاہل میں صرف علم کا فرق ہے، ورنہ دونوں برابر کے انسان ہیں، تو اس کے معنی یہ نہیں کہ علم و جہل کے ۔۔۔ علانیہ ممتاز و متضاد اوصاف میں بھی وہ دونوں برابر ہیں، اور ان میں عقل، اخلاق، تہذیب، سلیقہ، رائے اور حکمت و دانائی کا کوئی فرق نہیں، حالانکہ ان میں علم و جہل کا فرق کہکر درحقیقت ان دونوں کے درمیان علم اور جہل کے سینکڑوں اوصاف، لوازم اور خصائص کا فرق و امتیاز تسلیم کرنا ہے،

اسی طرح نبی اور غیر نبی میں وحی کا فرق مان کر وحی والے اور بے وحی والے انسانوں میں خود وحی اور عدم وحی کے سینکڑوں لوازم، خصائص اور اوصاف کا فرق تسلیم کرنا پڑیگا، وحی و رسالت کو چھوڑ دو، دوسرے انسانی کمالات کو مثلاً لو تو بھی یہی ماننا پڑیگا کہ انسان کیلئے جتنے اوصاف و کمالات ممکن ہیں، ان سب کی اعلیٰ سے اعلیٰ جانب کمال تک پہنچنا ممکن ہے، اور جو وہاں تک پہنچ جاتے ہیں، وہ اپنے جسمانی اوصاف و خصائص کے لحاظ سے انسان ہونے کے باوجود اپنے دوسرے قوی میں عام انسانوں سے یقیناً بلند اور ممتاز ہوتے ہیں، کوئی کہہ سکتا

ہے کہ جسمانی قوت کا ایرانی ہیرو رستم انسان نہ تھا، علم وعقل کا یونانی مجسمہ ارسطو انسانیت سے پاک تھا، اور موجودہ دنیا کی بہت سی حیرت انگیز ایجادوں کا مخترع اڈیسن بشر نہیں، لیکن اس انسانیت اور بشریت کے اشتراک کے باوجود اپنے اپنے دائرہ میں، وہ عام انسانوں سے بلند تر اور ممتاز ہیں اور باایں ہمہ وہ اپنے جسمانی خصائص، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، دیکھنے بھالنے، صورت شکل، ہاتھ پاؤں، ہر ایک چیز میں وہ ایسے ہی انسان ہیں، اور مخلوق انسان بلکہ مجبور انسان ہیں، جیسے دوسرے کمزور جاہل، اور بلید الذہن انسان، یہی مثال ایک معنی میں انبیاے کرام علیہم السلام کی بھی ہے کہ وہ غیر نبی انسانوں کے ساتھ بہت سے انسانی اوصاف میں شریک ہونے کے باوجود وحی اور اس کے خصائص اور لوازم میں ان سے صریحاً الگ، بلند اور اعلیٰ بلکہ بعض جسمانی خصائص میں بھی ان سے ممتاز ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صوم وصال رکھتے دیکھ کر جب صحابہ بھی آپ کی پیروی میں کئی کئی دن کا متصل روزہ رکھتے ہیں تو آپ انکو منع کرتے ہیں اور اپنی نسبت فرماتے ہیں، اَیُّکُمْ مِثْلِیْ اَبِیْتُ یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَیَسْقِیْنِیْ[1]، تم میں کون میرے مثل ہے میں رات گذارتا ہوں تو میرا رب مجھے کھلاتا پلاتا ہے؟ کیا تم انسانوں کو بھی یہ روحانی غذا اور روحانی سیرابی میسر آتی ہے اور روحی کے علاوہ بعض دوسری حیثیتوں سے بھی مثلیت کی اس میں نفی نہیں ہے؟

اسی طرح نیند کی حالت میں بھی نبی کے قلب اور اس کے احساسات کا غافل نہ ہونا صحیح حدیثوں سے ثابت ہے، آپ نے فرمایا میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن دل نہیں سوتا، وَکَذٰلِکَ

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصوم،

"اَلْاَنْبِیَاءُ تَنَامُ اَعْیُنُھُمْ وَلَا تَنَامُ قُلُوْبُھُمْ"[1] اور اسی طرح سب انبیاء ہیں، کہ ان کی آنکھیں سوتی ہیں، مگر ان کے دل نہیں سوتے، کیا یہی کیفیت عام انسانوں کی نیند کی بھی ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو نماز میں صفوں کو درست رکھنے کی تاکید کرتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ "میں تمکو اپنی پیٹھ کے پیچھے سے بھی ویسے ہی دیکھتا ہوں جیسے سامنے سے"! کیا عام انسانوں کی قوت بصارت کا یہی عالم ہوتا ہے، قرآن پاک میں ہے، "اَفَتُمٰرُوْنَہٗ عَلٰی مَا یَرٰی"۔ کیا پیغمبر جو دیکھتا ہے تم ایسی اس سے جھگڑتے ہو "وَلَقَدْ رَاٰہُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ"۔ اور اس نے اس (فرشتہ) کو آسمان کے کناروں میں دیکھا"! کیا عام انسان بھی یہ مشاہدہ کرتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتساب سے امہات المومنین کو جو شرف حاصل ہوا، اس کا اقتضا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے امہات المومنین کو خطاب کرکے فرمایا "یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ" (احزاب) اے پیغمبر کی بیویو! تم ایسی نہیں ہو جیسی ہر عورت اگر خدا کا ڈر رکھو"۔ تو اگر پیغمبر کی بیویاں تقویٰ کے بعد عام عورتوں کے مثل نہیں ہیں تو خود پیغمبر تو بدرجہا اس کا سزاوار ہے، کہ وہ کَاَحَدٍ مِّنَ الرِّجَالِ، نہ ہو اور اپنے خصائص میں عام انسانوں سے بدرجہا بلند تر اور ممتاز ہو،

الغرض نبی اور غیر نبی میں صرف وحی و نبوت کا جو فرق ہے، اس کے یہی معنی ہیں کہ ان دونوں میں وحی و رسالت کے تمام لوازم، خصوصیات اور ضروری اوصاف میں فرق اور امتیاز ہے، اسی لئے کسی انسان کو صاحب وحی ماننے کے ساتھ ہی اس کو ان تمام اوصاف و لوازم اور خصوصیات کا مالک بھی ضرور ہی ماننا پڑے گا،

---

[1] صحیح بخاری باب الاسرار۔

اجتہادِ نبویؐ میں خطا

شبہہ کا ایک اور سبب یہ ہے کہ قرآن مجید میں بعض جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپؐ کی چند فروگذاشتوں پر متنبہ کیا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خاص وحیِ الٰہی کے علاوہ آپ اپنی عقل و مصلحت سے جو حکم دیتے تھے وہ غلطیوں سے پاک نہیں ہوتا تھا، اس سلسلہ میں یہ بات تمام مسلمانوں کو تسلیم ہے کہ جن بعض امور میں آپؐ پر وحی قرآن نازل نہیں ہوتی تھی، ان میں آپ اپنے پیغمبرانہ علم و حکم اور فہم نبویؐ سے فیصلہ فرماتے تھے، لیکن غور کے قابل یہ بات ہے کہ اگر آپؐ کو آپ کے اس فیصلہ پر خدائے تعالیٰ کی طرف سے کبھی کوئی تنبیہ نہ ہوئی ہوتی تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ آپ کے تمام فیصلے صحیح اور منشائے الٰہی کے مطابق ہوتے تھے، مگر یہ بھی کتنے دلالہ کہہ سکتا تھا کہ اجتہادِ نبویؐ کے فیصلوں کی صحت و خطا کی ذمہ داری خدا نے نہیں لی تھی، اسلئے تنبیہ نہ فرمائی گئی، مگر واقعہ ان دونوں کے خلاف ہے، صورت یہ ہے کہ بعض فیصلوں پر تنبیہ کی گئی ہے اور بعض پر نہیں، اور اس سے بداہۃً ثابت ہوتا ہے کہ اجتہادِ نبویؐ میں غلطی ہو جانا ممکن ہے، مگر اس غلطی پر چند لمحوں کا قرار بھی ممکن نہیں، ادھر لغزش ہوئی اور ادھر علام الغیوب کی بے خطا وحی نے اس کی تنبیہ اور اصلاح کی، اس واقعہ سے دوسرا نتیجہ یہ ثابت ہوتا ہے، کہ وہ تمام امور و احکام جن کو آپ نے اپنے پیغمبرانہ اجتہاد و علم و حکمت سے ارشاد فرمایا، یا ان پر عمل کیا، اور وحیِ الٰہی نے ان پر خاموشی برتی، تو منشائے الٰہی نے گویا ان کی صحت و صداقت پر اپنی خاموشی سے مہر کر دی، اور ان کی حیثیت بمنزلہ وحی کے ہو گئی،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی عمر ۲۳ سال ہے، ان پورے ۲۳ سالوں میں ہزاروں واقعات اور امور پیش آئے، جن پر آپ نے اپنے اجتہاد اور شرح صدر سے فیصلے صادر کئے، مگر ان میں سے

کل پانچ باتیں ایسی ہیں جنپر وحی الٰہی نے تنبیہ کی، اور عجیب تر یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے، جس کا تعلق حکم دینی، شریعت ابدی، اعتقاد، عبادات یا شرعی معاملات سے ہو، بلکہ وہ کل کے کل ایسے امور ہیں، جن کی حیثیت تمامتر شخصی یا جنگی ہے، اس سے بھی یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے، کہ دین اور شریعت میں آپکے یہ پیغمبرانہ اجتہادی فیصلے خطا و غلطی سے تمامتر پاک تھے،

اس خطا کے معنی | عام انسانوں کے اجتہادات میں جن اسباب سے غلطیاں واقع ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ جن مقدمات پر اُن کا اجتہاد مبنی ہوتا ہے وہ غلط ہوتے ہیں، یا ان کا علم ان کو قطعی طور سے نہیں ہوتا، یا استقراء تام نہیں ہوتا تمثیل پوری نہیں ہوتی، علتِ مشترکہ صحیح نہیں معلوم ہوتی، مگر یہ تمام صورتیں اجتہاد نبوی میں منتفی ہیں، کیونکہ اجتہاد نبوی نہ ان طریقوں پر مبنی ہوتا، نہ وہ غور و فکر، نظر و استدلال اور استقراء و تمثیل کے منطقی اور اصولی ذرائع پر قائم ہوتا ہے، بلکہ وہ نور رسالت فہم نبوت، حکمت ربانی اور شرح صدر پر مبنی و قائم ہوتا ہے جنمیں یہ پیچ کی منزلیں سرے سے نہیں ہوتی ہیں، اسی لئے لفظ "اجتہاد" جو عام طور پر پہلے معنی میں مستعمل اور مشہور ہے، اس سے اس مقام پر التباس سے بچنے کی خاطر احتراز کرنا بہتر ہے،

ایک اور نکتہ بھی پیش نظر رہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ اجتہاد میں اگر غلطی ہوئی ہے تو اس غلطی کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ آپنے جو پہلو اختیار فرمایا، وہ کوئی گناہ یا بدی یا بد اخلاقی کا پہلو تھا، بلکہ یہ ہے، کہ دو بہتر راستوں میں سے آپنے بہترین راستے کو چھوڑ کر بہتر راستے کو اختیار کیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی اور بہتر کی جگہ بہترین کی تلقین کی،

اس قسم کے جو چند واقعات پیش آئے ہیں، ان پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت بیکشف

ہوجاتی ہے کہ مہترین کو چھوڑ کر جس بہتر کو آپ نے اختیار فرمایا، اس کا منشا ہمیشہ امت پر رحم و کرم اور شفقت کی نگاہ تھی، اللہ تعالیٰ نے اس ظاہری یا عارضی رحم و کرم و شفقت کی جگہ ان احکام کی تلقین فرمائی، جن میں گو بظاہر سختی معلوم ہوتی ہے، مگر علام الغیوب کی دائمی مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ وہی سخت پہلو اختیار کیا جائے،

ذیل میں ہم ان اجتہادی امور کی تشریح کرتے ہیں، جنپر وحی الٰہی نے تنبیہ کی ہے،

پانچ اجتہادی امور پر تنبیہ الٰہی جن اجتہادی امور پر وحیِ الٰہی نے تنبیہ کی ہے، اُن میں،

(۱) پہلا واقعہ یہ ہے کہ ہجرت کے قبل مکہ معظمہ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت کی تبلیغ فرما رہے تھے، تو ایک دن قریش کے بڑے بڑے رؤسا آپ کی مجلس میں آکر بیٹھے، آپ ان کو سمجھا بجھا رہے تھے، بت پرستی کی برائیاں اور توحید کی خوبیاں ان پر ظاہر فرما رہے تھے، اور دل سے چاہتے تھے، کہ وہ اس دعوت کو قبول کرلیں کہ اتنے میں ایک مخلص لیکن غریب اللہ نابینا مسلمان عبداللہ بن ام مکتوم بھی آکر بیٹھ گئے، اور کچھ دریافت کرنا چاہا، قریش کے یہ رؤسا بیحد مغرور اور خود پسند تھے، وہ آپ کے جلسوں میں صرف اسلئے ناپسند نہیں کرتے تھے کہ آپ کی مجلس میں بدحال، بے حیثیت اور ادنیٰ درجہ کے لوگ آیا کرتے ہیں، اس لئے اس موقع پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان رئیسوں کی اثر پذیری کے کچھ امکانات نظر آرہے تھے، عبداللہ ابن مکتومؓ کا آنا جانا اور پوچھنا ناگوار ہوا کہ ان کے آنے سے ان رئیسوں کی خود پسندی اور بڑائی کے جذبہ کو اشتعال ہوا، اور راستہ سے بدک گئے،

عبداللہ بن ام مکتومؓ کی آمد اور دریافت پر یہ ناگواری جو بالکل نیک نیتی سے تھی یعنی اسلئے

تھی کہ آپؐ جانتے تھے کہ عبداللہ بن ام مکتوم تو مسلمان ہی ہیں، اس وقت ان کی بات کا جواب نہ دینے میں چنداں ہرج نہیں، لیکن ان رئیسوں کی ناگواری پورے باشندگان مکہ پر اثر انداز ہوگی، اگر یہ مسلمان ہو گئے، تو مکہ میں اسلام کی اشاعت کی راہ میں پھر کوئی روک باقی نہیں رہے گی، یہ سمجھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ بن ام مکتوم کی طرف سے بے التفات ہو کر ان رئیسوں کی تبلیغ و موعظت کی طرف سرتاپا متوجہ رہے، اس پر وحی الٰہی نے حسب ذیل الفاظ میں تنبیہ کی

عَبَسَ وَتَوَلّٰى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۔ تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا کہ وہ اندھا آیا اور تجھے
وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۔ اَوْ يَذَّكَّرُ کیا خبر کہ شاید وہ سنورتا، یا سوچتا تو اس کا سمجھانا کام
فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۔ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۔ آتا، وہ جو پروا نہیں کرتا، سو تو اس کی فکر میں ہے اور
فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۔ وَمَا عَلَيْكَ اس کے نہ سنورنے کا تجھ پر کوئی الزام نہیں اور جو
اَلَّا يَزَّكّٰى ۔ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۔ وَهُوَ تیرے پاس دوڑا آیا، اور (خدا سے) ڈرتا ہے، تو
يَخْشٰى ۔ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۔ كَلَّآ اِنَّهَا اس سے تغافل کرتا ہے یوں نہیں یہ تو نصیحت
تَذْكِرَةٌ ۔ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ (عبس۔۱) ہے، جو چاہے اس کو یاد کرے،

ان آیتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اجتہاد پر کہ ایک پرانے لیکن غریب مسلمان کی مزید ہدایت سے قریش کے رئیسوں کا سمجھانا زیادہ بہتر ہے، تنبیہ کی گئی، اور اس نکتہ کو ذہن نشین کیا گیا کہ اسلام کی اصولی بنیادوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے نزدیک امیر و غریب، آقا اور غلام، اونچے اور نیچے کی کوئی تمیز نہیں، اسکی نگاہ میں بنیاد اور نابنیاد دونوں برابر ہیں، یہ نکتہ اس وقت کے فیصلے میں آپؐ کے پیش نظر رہا کہ ایک مسلمان اندھے کی دلجوئی سے ان رئیسوں کی

جائز دلجوئی کر کے ان کو اسلام کی طرف مائل کرنا زیادہ بہتر ہے، مگر یہ نکتہ نظر انداز ہو گیا کہ اس طرز عمل سے خود اسلام کی بنیادی تعلیم پر کیا اثر پڑیگا، اس لئے وحی الٰہی نے تنبیہ کی کہ اسلام کا یہ پیغام دنیا کے لئے صلاے عام ہے، جو چاہے قبول کرے، اس میں کوئی تمیز و تخصیص نہیں، علاوہ ازیں اس کا بھی اشارہ کیا کہ یہ روساے قریش جن کے مسلمان ہونے کی آپؐ اس قدر کوشش فرما رہے ہیں وہ ایمان سے محروم ہی رہیں گے، اس لئے ان کی طرف مزید توجہ بے سود ہے اور ظاہر ہے کہ آپ اُن کے حق میں داناے غیب کے اس فیصلہ سے پہلے آگاہ نہ تھے، اسلئے آپؐ اپنے موجود علم کے مطابق اپنے فعل کو صحیح سمجھ رہے تھے،

دوسرا واقعہ | وہ سب سے پہلی لڑائی میں مسلمانوں کے مالِ غنیمت حاصل کرنے اور بدر کے قیدیوں سے زر فدیہ قبول کرنے کا ہے، اس وقت تک ظاہر ہے کہ مالِ غنیمت اور فدیہ کا قانون نازل نہیں ہوا تھا کہ ابھی اس کا موقع ہی نہیں آیا تھا، مسلمانوں کو مدینہ منورہ آکر سب سے پہلے سریۂ نخلہ میں مالِ غنیمت ہاتھ آیا، اس کے بعد ہی بدر کے معرکہ میں پھر مالِ غنیمت ملا، اور ساتھ ہی قریش کے ستر قیدی بھی ہاتھ آئے، جن میں اکثر مکہ کے دولتمند اور شرفا تھے، ان قیدیوں کی نسبت مسلمانوں کی مختلف رائیں تھیں، بعضے ان کو آگ میں زندہ جلا دینا چاہتے تھے، کچھ لوگ فدیہ لیکر ان کو چھوڑ دینا چاہتے تھے، جس سے انکو چالیس ہزار درہم ملنے والے تھے، نفسیات کے ماہر جانتے ہیں کہ جو قوم مدت سے ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف اٹھاتی رہتی ہے، وہ جیسی مظلومیت، مغلوبیت اور غربت کے دور سے نکل کر جب پہلے پہل غالب اور دولتمند ہوتی ہے، اور اس کو ملکی اور مالی قوت پر دسترس حاصل ہوتی ہے، تو

وہ لمحہ اُس کی زندگی میں اخلاقی حیثیت سے بڑا ہی نازک ہوتا ہے، غلبہ، قوت اور دولت پاکر بھی اُس کے نشہ میں وہ سرشار نہ ہو اور اپنے دل و دماغ پر قابو رکھے، یہ بڑا ہی مشکل کام ہے، جو مظلوم تھا، وہ غالب ہو جائے اور جو ظالم تھا وہ مغلوب ہو جائے، اور اس وقت ردِ عمل اپنا کام کرکے مظلوم غالب میں اپنے ظالم مغلوب سے شدید انتقام لینے کا جذبہ نہ پیدا کرے، یہ کوئی آسان کام نہیں ایسا سیاسی و مذہبی تاریخوں میں اسکی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ ایسا ہو سکا، خود عیسائی قوم کو دیکھئے جس نے یہودیوں اور بت پرست رومیوں کے ہاتھوں سے تین صدیوں تک برابر سخت سے سخت تکلیفیں اٹھائیں لیکن قسطنطین کے زمانہ میں جب دفعۃً جو مظلوم تھے، وہ غالب اور جو ظالم تھے، وہ مغلوب ہو گئے، تو عیسائی قوم کا پچھلا جوہر ایک ایک کرکے رخصت ہو گیا، اور ان لوگوں نے جو پہلے مظلوم تھے، انتقام کے نشہ میں چور ہو کر یہودیوں اور رومی بت پرستوں کے ساتھ وہ کچھ کیا، جس سے اخلاقِ انسانی کی تاریخ آج بھی شرماتی ہے،

غزوہ بدر کی غیر متوقع فتح نے مظلوم و بیکس مسلمانوں کیلئے تاریخی دور کا وہی نازک موقع پیدا کر دیا، غریب و تنگدست مسلمانوں کو جو سالہا سال سے کسبِ معاش سے محروم اور معمولی ضروریات کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے، ان کو غنیمت اور فدیہ کی دولت ہاتھ آئی، اور وہی قریش جن کے ظلم و ستم سے اُن کے بدن زخمی اور اُن کے سینے داغدار تھے، وہ دفعۃً مغلوب ہو گئے، ان کے بڑے بڑے سردار اُن کے ہاتھوں سے لڑائی میں مارے گئے، اور ان کے ہاتھوں میں قید ہو کر ستر سردار صرف اُن کے رحم و کرم پر زندہ تھے،

اب تک مسلمان نہایت یکدلی، یک جہتی، اور خلوص سے اپنی راہ طے کر رہے تھے اور یہ

اخلاقی جوہر مظلوموں کی برادری میں اکثر پیدا ہو جاتے ہیں، لیکن دولت مل کر ان کے بجائے ان میں اختلاف، تفریق اور حرص و طمع اور ذاتی اغراض کے جذبات پیدا کر دیتی ہے، اس اتفاقی دولت اور غیر متوقع فتح و غلبہ نے صحابۂ کرام کے لئے امتحان کا وہی نازک موقع پیش کر دیا اور دنیا کے سب سے بڑے رہنما کی قوتِ رہنمائی کے اظہار کا بھی یہی موقع تھا، چنانچہ اس وقت مالِ غنیمت، زرِ فدیہ اور قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کے متعلق غالب فاتح مسلمانوں میں اختلافِ رائے رونما ہو گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس وقت اہم ترین کام تھا، آپ نے امر اول کی طرف توجہ فرمائی کہ مظلوم فاتح قوت پاکر اپنا جوہر نہ کھو بیٹھیں، چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے ان قیدیوں کے قتل کی جو تجویز پیش کی تھی، آپ نے رد فرما دی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تجویز کہ فدیہ لیکر اُن کو رہا کر دیا جائے، قبول فرمائی اور اُن سے فرمایا کہ اے ابوبکرؓ تمہاری مثال ابراہیمؑ اور عیسیٰؑ کی ہے، اور اے عمرؓ تمہاری مثال نوحؑ اور موسیٰؑ کی ہے[1]، آپ نے حضرت ابراہیمؑ کی نیک دلی اور حضرت عیسیٰؑ کی رحمدلی کی مثال کی پیروی کی، اور بدر کے اُن قیدیوں کی جان بخشی فرمائی، اور قتل کے بجائے زرِ فدیہ ادا کر دینے پر رہائی کا حکم دیدیا، اور جو ان میں نادار تھے، ان کو چند مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے پر آزادی کا فرمان عطا کر دیا، اور صحابہ کو تاکید کی کہ اُنکے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کریں، چنانچہ بعضوں کا یہ حال تھا کہ وہ خود کھجور پر قناعت کرتے تھے اور اپنے قیدیوں کو روٹی کھلاتے تھے،

لیکن وحیِ الٰہی کی نگاہ میں اس سے زیادہ اہم پہلو، ان غریبوں کا دفعۃً مال و دولت کی حرص و طمع میں مبتلا ہو جانا تھا، چنانچہ یہی صورت پیش آئی، مالِ غنیمت کے فراہم کرنے والوں نے

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۲۱، کتاب المغازی حیدرآباد دکن،

دعویٰ کیا کہ اس پر ہم نے لڑائی میں قبضہ کیا ہے، اس لئے ہمارا ہے، لڑنے والے نوجوانوں نے دعویٰ کیا کہ ہماری تلواروں سے فتح حاصل ہوئی ہے، اس لئے اس کے ہم حقدار ہیں، جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کر رہے تھے، وہ کہتے تھے کہ سب سے نازک اور خطرناک فرض ہمارا تھا، اس لئے ہمکو ملنا چاہئے[1]، یہی اختلاف زر فدیہ کی ملکیت کی نسبت بھی ہوا ہوگا، جیسا کہ سورۂ انفال کی ابتدائی آیتوں سے ظاہر ہوتا ہے،

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ	(اے پیغمبر) تجھ سے (تیرے ساتھی) غنیمت کا حکم
الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ	پوچھتے ہیں، تو کہدے کہ مال غنیمت اللہ کا ہے، اور
وَ ... اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ	رسول کا ہے، تو اللہ سے ڈرو اور آپس میں صلح
وَرَسُوْلَهٗ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (انفال، ع ۱)	کرو، اور اللہ اور اسکے رسول کی حکم کی اطاعت کرو اگر تم

حضرت عبادہ بن صامتؓ سے پوچھا گیا کہ سورۂ انفال کے نزول کی کیا وجہ ہے، تو کہا

فِيْنَا اَصْحَابَ بَدْرٍ نَزَلَتْ حِيْنَ	یہ سورہ ہم بدر والوں کے متعلق نازل ہوئی
اخْتَلَفْنَا فِي النَّفْلِ وَسَاءَتْ فِيْهِ	جب مالِ غنیمت میں ہم نے باہم اختلاف کیا اور
اِخْلَاقُنَا فَنَزَعَهُ اللّٰهُ مِنْ اَيْدِيْنَا	اس میں ہمارے اخلاق بُرے ہوگئے، تو خدا نے اسکو
فَجَعَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ	ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا، اور رسول اللہ صلی اللہ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَسَمَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ	علیہ وسلم کے اختیار میں دیدیا، تو آپنے تمام مسلمانوں
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ الْمُسْلِمِيْنَ عَنْ سَوَاءٍ	کے مابین برابر تقسیم فرما دیا،

[1] سیرت ابن ہشام، ذکر انفی بیدر والاساری ج ۱ ص ۳۹۱، مطبوعہ محمد علی، مصر ۲ ایضاً،

یہی وہ تنبیہ ہے جو وحیِ الٰہی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فیصلہ پر کی اور آیت اتری[1]

مَاكَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى	کسی پیغمبر کو زیبا نہیں کہ اُسکے پاس قیدی
حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ	ہوں تاکہ زمین میں فساد کریں تم لوگ دنیا کا
عَرَضَ الدُّنْيَا ۡ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ	سامان چاہتے ہو اور اللہ آخرت چاہتا ہے اور
الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۭ	اللہ غالب اور دانا ہے اگر خدا کی طرف سے یوں ہونا
لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ	مقدر نہ ہو چکا ہوتا، تو تمہارے اس لینے پر
اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ فَكُلُوْا مِمَّا	تمکو بڑی سزا ملتی تو اب جو تم نے لوٹ میں
غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۡ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ	پایا حلال و پاک کر کے کھاؤ، اور اللہ
اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (انفال ۹)	کا ادب کرو، اللہ بخشنے والا رحم کرنیوالا ہے

اسی قدر نہیں بلکہ اُن قیدیوں کو جن سے زرِ فدیہ وصول ہوا یا وصول کیا جا رہا تھا، اسکے بعد ہی یہ تسلی دی گئی،

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ	اے پیغمبر! تمہارے ہاتھوں میں جو قیدی ہیں
مِّنَ الْاَسْرٰٓى اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ	ان سے کہدو کہ اگر اللہ تمہارے دلوں میں
قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ	نیکی جانیگا تو تمکو اس سے بہتر چیز دیگا جو تم
اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ	سے لیگئی اور تمکو معاف کریگا، اور اللہ معاف
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (انفال ۱۰)	کرنیوالا اور رحم کرنے والا ہے،

[1] سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۳۹۱،

بعضوں کو یہ شبہ ہوا ہے کہ یہ تنبیہ قیدیوں کے زرِ فدیہ لے کر رہا کرنے اور قتل نہ کئے جانے پر ہوئی، حالانکہ ظاہر ہے کہ جن قیدیوں سے زرِ فدیہ لئے جانے پر اللہ تعالیٰ نے ان سے ہمدردی فرمائی، اور اگر وہ حسنِ نیت سے ظاہر کریں تو ان کی مغفرت کا وعدہ اور اس دنیاوی خرفِ یزہ سے جو ان سے بطورِ فدیہ لیا گیا، انکو بہتر دولت دیئے جانے کی امید دلائی، کیا ان کا قتل زرِ فدیہ لینے سے کم سزا ہوتی؟ اور جن سے فدیہ لیا گیا، ان کے قتل کئے جانے پر ان کے قاتلوں پر اس سے زیادہ سرزنش، اور ان مقتولوں سے اس سے زیادہ ہمدردی نہ کیجاتی،

بہرحال وہی مالِ غنیمت اور زرِ فدیہ جس کو اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف و صریح وحی آنے سے پیشتر قبول فرمایا تھا، اور جس پر تنبیہ ہوئی، وہ آخر کار اجتہادِ نبوی[1] کے مطابق مناسب موقع پر جائز اور حلال و طیب ہی ٹھہرایا گیا، اور غلطی غلطی باقی نہیں رہی۔ مالِ غنیمت لینے کے متعلق کُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ کا حکم اسوقت آگیا، اور فدیہ لینے کی اجازت اِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً کے الفاظ میں بعد کو مناسب زمانہ میں آگئی، اور اس مال و دولت کی حرص و طمع سے اسوقت جو بداخلاقی پیدا ہونے والی تھی، اس کا ازالہ ہمیشہ کیلئے اس طرح کر دیا کہ اس کی تقسیم کا ابدی قانون بنا دیا گیا، اسمیں تمام ضروری مستحقین کے حصے لگا دیئے گئے۔

تیسرا واقعہ تیسرا واقعہ یہ ہے کہ آپ غزوۂ تبوک کے لئے جا رہے تھے، جس میں بکثرت مسلمانوں کی شرکت کی ضرورت تھی کہ مقابلہ رومیوں کی دل بادل فوج سے تھا، اور کسی منظم سلطنت سے ٹکر لینے کا یہ پہلا موقع مسلمانوں کو پیش آیا تھا، اور موسم بھی نہایت گرم اور سخت تھا، میں ہزار

[1] مزید تفصیل کے لئے دیکھو سیرۃ النبی جلد اول میں غزوۂ بدر کا بیان۔

مسلمانوں کی جمعیت روانہ ہو گئی، مگر کچھ مخلص مسلمان مجبوراً چھوٹ گئے، اور اکثر منافقین نے جان بوجھ کر اسکی شرکت سے جی چرایا، آپ واپس آئے تو عدم شرکت کے قصوروار منافقین آکر جھوٹی جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنے عذرات بیان کرنے لگے، آپ نے ان کا اعتبار کر کے رحم فرما کر ان کے قصور سے درگذر کیا، اس پر تنبیہ ہوئی،

سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ج يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ج وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ، عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ج لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ

وہ خدا کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہم مقدور رکھتے تو ضرور تمہارے ساتھ نکلتے وہ اپنی جانوں کو برباد کرتے ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں، اللہ تجھکو بخشے تو نے انکو رخصت کیوں دی تھی تک تجھ پر وہ کھل نہ جاتے جو اس میں سچ بولے اور تو جان لیتا جھوٹ بولنے والوں کو

ظاہر ہے کہ آپ علم غیب سے آگاہ نہ تھے، اور ان کے واقعی حالات سے بے خبر تھے، اسلئے بظاہر اُن کے قول پر اعتبار ہی کرتا تھا، اور وہی آپ نے کیا، مگر علام الغیوب نے حقیقت حال سے باخبر فرما کر ان کے جھوٹ کا پردہ چاک کیا، بہرحال یہاں بھی منشائے خطا اگر خطا سمجھی جائے تو بھی ترحم کی شان تھی،

چوتھا واقعہ منافقین کی نسبت آپ کو اطلاع دیدی گئی تھی کہ اُن کے حق میں آپ کی دعائے مغفرت قبول نہ ہوگی، اور فرما دیا گیا تھا کہ

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ

تو انکی مغفرت کی دعا مانگے یا نہ مانگے اگر ستر دفعہ بھی انکی مغفرت کی دعا مانگے تو ہرگز انکو

لَهُمْ، ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ — خدا بخشے گا، یہ اسلئے کہ انھوں نے خدا کا اور

رَسُوْلِهٖ (توبہ-۱۰) — اور اس کے رسول کا انکار کیا،

اس حکم کے آنے کے بعد عبداللہ بن ابی سلول کا انتقال ہوا یہ منافقوں کا سردار تھا، اس کا لڑکا مخلص مسلمان تھا، اس نے آکر آپ سے نماز جنازہ پڑھانے کی درخواست کی، جس کو آپ نے فرطِ کرم سے رد نہ فرما سکے، حضرت عمرؓ نے عرض بھی کی کہ یا رسول اللہ! اس کے عدم مغفرت کے متعلق تو حکم ہو چکا ہے، فرمایا میں ستر دفعہ سے بھی زیادہ اسکی مغفرت کی دعا مانگوں گا، بہرحال آیت بالا میں گو آپ کے مغفرت مانگنے اور نہ مانگنے دونوں کو بیکار و بے سود بتایا گیا تھا، مگر ان کے حق میں سرے سے دعاے مغفرت نہ مانگنے کی کوئی ممانعت نہ تھی، اسلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بایں شفقت سے اس بیکار فرض کو انجام دیا، تاکہ اس کے مخلص مسلمان فرزند کی دلشکنی نہ ہو اور اس سے قبائل فرمایا کہ ایک مخلص کی دلجوئی تو ہوگی، مگر بیسیوں منافقین کو اپنے چھانے میں کامیابی ہو جائیگی، اور وہ مسلمانوں کے اندر رہ کر فتنوں کا باعث نہیں گے، اسلئے حکم ہوا،

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ — اور نہ کبھی ان میں سے کسی کے جنازہ کی نماز

اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا — پڑھ اور نہ اسکی قبر پہ کھڑا ہو، بیشک انھوں

بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ — نے خدا اور اسکے رسول کا انکار کیا، اور

فٰسِقُوْنَ (توبہ-۱۱) — اسی گنہگاری کی حالت میں مرے،

پانچواں واقعہ اس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعض بیویوں کی خوشنودی اور رضامندی کیلئے کسی مباح چیز کو، جو آپ کو بہت مرغوب تھی، اپنے اوپر حرام کر لیا تھا یعنی

اس کے کبھی نہ استعمال کرنے کا عہد فرمایا تھا، ظاہر ہے کہ ہر شخص پر مباح چیز کا کھانا فرض نہیں، اسکو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی خوشی سے یا کسی دوسرے کی رضامندی کے لئے اسکے نہ کھانے کا عہد کرے اس لئے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض بیویوں کی خاطر جنکو وہ شے پسند نہ تھی، اسکو اپنے اوپر حرام کر لیا، تو ظاہر ہے کہ آپ کا اپنی بعض بیویوں کی خاطرداری کیلئے ایسا کرنا الزام کے قابل نہیں کہ آپنے بحیثیت شوہر کے ان کی اتنی دلجوئی کو بھی عورتوں کے ساتھ عدل وانصاف کے مناسب سمجھا، مگر اس مسئلہ کی ایک دوسری حیثیت بھی تھی، اور وہ یہ کہ بحیثیت ایک پیغمبر کے، ایک حلال و جائز چیز کو اپنے اوپر حرام کر لینا اور اس کے نہ کھانے کا عہد کرنے سے، آپ کی اقتدا میں امت کے عام افراد بھی اسکو ناجائز نہیں تو ناپسند ضرور ہی کرتے، اور یہ ایک طرح سے شریعت الٰہی میں تبدیل و تحریف کا مرادف ہوجاتا اس لئے حکم آیا کہ ان امور میں پیغمبر کو کسی کی دلجوئی اور خاطرداری کی پروا نہ چاہئے، فرمایا،

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ	اے پیغمبر! جس کو اللہ نے تیرے لئے حلال
اللَّهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ	کیا ہے، اسکو حرام کیوں کرتا ہے اپنی بیویوں
وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (تحریم-۱)	کی مرضی چاہتا ہے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے

اس موقع پر اللہ تعالیٰ کا آپ کو نبی کہہ کر خطاب کرنا یہ واضح کرتا ہے کہ بحیثیت ایک انسان اور شوہر ہونے کے آپ ایسا کر سکتے تھے، مگر پیغمبر کی حیثیت سے آپ کو یہ اختیار نہیں،

الغرض یہی وہ پانچ واقعے ہیں، جن میں آپ کی اجتہادی خطا ثابت کی گئی ہے اگر مگر تفصیلات سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ انکو خطا کہنا درحقیقت مجاز ہے کہ پیغمبر کی بلندی و معصومی کو پیش نظر رکھکر

اس کو اُس مجازی خطا کی بھی اجازت نہیں، اور اسی وحیِ الٰہی نے ان میں سے
ہر موقع پر تنبیہ کی، اور اپنے صحیح فیصلہ سے رہنمائی فرمائی، اب کیا کسی کا شبہہ یہ بھی ہے
کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معمولی مسامحات پیش آئے جن کی تنبیہ اصلاح ہر وقت
وحیِ الٰہی نے کی، ایسے ہی ممکن ہے کہ آپ کو اور بھی ایسے مسامحات پیش آئے ہوں جن کی تنبیہ
و تصحیح کی حکمتِ الٰہی نے پروانہ کی اور خاموشی برتی، اگر کسی کو یہ شبہہ ہے تو درحقیقت رسالت
و نبوت کی مرتبہ شناسی اور دینِ الٰہی و شریعت ربانی کی حقانیت اور اللہ تعالیٰ کے طریق
رشد و ہدایت کی معرفت سے وہ کوسوں دور ہے، رسولوں کی بعثت اس لئے ہے کہ وہ
غلط کار انسان کو ان کی غلطی سے نکال کر حق و صواب کی تعلیم دیں نہ اس لئے کہ انکے ذریعہ
الٹے ہدایت کے بجائے مزید ضلالت کا اضافہ ہو، استغفر اللہ ثم استغفر اللہ، اسلئے ناممکن ہے
کہ رسولوں کے ہاتھوں اور زبانوں سے کوئی ایسا کلام صادر ہو، جو حکمتِ الٰہی کے مطابق نہ ہو اور
پھر اللہ اسکی تصحیح اور رہنمائی سے تغافل برتے اور انسانوں کو اپنے رسولوں کے ذریعہ گمراہی میں
پیغمبرانہ اجتہاد و رائے علم کا وہ کوثر ہے، جس کی دھاریں دماغ سے نہیں بلکہ دل کے
سرچشمہ سے بہتی ہیں، جو انسانی رائے و تجربہ سے نہیں بلکہ الہام الٰہی، القائے ربانی، حکمت
یزدانی، فہم رسالت، بلکہ نبوت سے ماخوذ ہے اور جسکی نسبت محرم اسرار شریعت عمر فاروق
رضی اللہ تعالیٰ عنہ برسر منبر فرماتے ہیں،

یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّ الرَّاْیَ اِنَّمَا کَانَ	اے لوگو! آنحضرت صلعم کی رائے غلطی سے
مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مُصِیْبًا	پاک تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کو وہ رائے دکھاتا تھا،

اللہ کان یریہ وانما ھو منا — اور ہماری رائے ہمارا گمان، اور از

الظن والتکلف (ابوداؤد کتاب الاقضیہ) — خود کہنا ہے،

وہ رائے نبویؐ جو خدا کے بتانے اور دکھانے سے قائم ہوئی ہو، ظاہر ہے کہ بمنزلہ وحی کے ہے، اور اُس کا نام بشری اجتہاد اور انسانی رائے نہیں بلکہ نبوی اجتہاد اور پیغمبرانہ رائے ہے جو عملاً وحی الٰہی کی ہم مرتبہ اور کلام ربانی کی ہم پایہ ہے، حضرت عمرؓ نے اس خطبہ میں جو کچھ کہا ہے درحقیقت وہ خود کلام پاک سے مستنبط ہے، قرآن پاک میں ہے،

انا انزلنا الیک الکتاب بالحق — ہم نے تجھ پر کتاب سچائی کے ساتھ اتاری

لتحکم بین الناس بما اراک اللہ — تاکہ لوگوں کے درمیان جو اللہ تجھکو سوجھائے

ولا تکن للخائنین خصیما (نساء ۱۶) — فیصلہ کرے اور تو نہ ہو دغابازوں کی طرف

اس سے ظاہر ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو دکھایا، سوجھایا، اور رائے پیدا کرائی جاتی تھی، وہ خدا کی طرف سے ہوتی تھی، یہی پیغمبرانہ رائے ہے جسکی نسبت خود آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا،

انا اقضی بینکم برائی فیما لم — میں تم لوگوں کے درمیان اس مسئلہ میں جسکی

ینزل علی (ابوداؤد، اقضیہ) — نسبت مجھ پر وحی نہیں ہوئی اپنی رائے سے فیصلہ

یہ فیصلہ اگر غلط ہوتا تو فوراً وحی الٰہی دستگیری کرتی، اور صحیح راستہ پر لے آتی، جیسا کہ گذشتہ پانچوں واقعات سے ظاہر ہے،

ایک غلط استدلال اس آیت پاک سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مقدمات کے فیصلوں میں

آپ کو ارادتِ الٰہی ہوتی تھی، یعنی خدا کی طرف سے آپ کو رائے سوجھائی جاتی تھی اور ظاہر ہے کہ ارادتِ الٰہی (خدا کی طرف سے سمجھایا جانا) تاکہ آپ کتابِ الٰہی کے مطابق فیصلہ کریں غلط نہیں ہو سکتی، لیکن ابو داؤد وغیرہ میں ایک حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ مقدمہ سے فرمایا

"میں ایک بشر ہوں، تم لوگ میرے پاس اپنے جھگڑے لیکر آتے ہو، اور شاید تم میں سے بعض زیادہ زبان آور ہوں، جو اپنی دلیل کو خوبی سے بیان کر سکتے ہوں، تو میں جیسا سنتا ہوں ویسا فیصلہ کر دیتا ہوں تو میں اگر کسی کو وہ حق دلا دوں، جو اسکا نہیں بلکہ اسکے بھائی کا ہے، تو وہ نہ لے کہ میں اسکو آگ کا ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔" (کتاب الاقضیہ

اس سے ایک غلط فہم یہ استدلال کر سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے بھی غلطی سے پاک نہیں ہوتے تھے، اس لئے اُمت آپکے قضایا، اور فیصلوں کی پیروی پر مجبور نہیں، لیکن ایسا خیال کرنا سراسر مغالطہ ہے، اصل یہ ہے کہ مقدمات میں دو چیزیں ہوتی ہیں، ایک واقعہ کی اصلی روداد جس کو ہر مدعی اور مدعا علیہ اپنے دعوی کے مطابق بنا کر اپنے اپنے رنگ میں بیان کرتا ہے، اسکے بعد دوسری چیز اس بیان کردہ روداد کے مطابق صحیح اور عادلانہ حکم اور فیصلہ ہے جو تمام تر مقدمہ کی اس روداد پر مبنی ہوتا ہے، جو حاکم و قاضی کے سامنے بیانات اور شہادتوں کے ساتھ پیش ہوتی ہے، یہ بات کہ واقعہ کی اصلی روداد کیا ہے، اور ان میں سے کون صحیح کہہ رہا ہے، علم غیب سے تعلق رکھتی ہے، جسکا دعوی کسی نبی کو نہیں، اور اگر ہو بھی تو یہ دعوی بجائے خود مسلم ہے کہ قاضی کا ذاتی علم دو انسانوں کے درمیان فیصلہ کا مبنی نہیں قرار پا سکتا، اسکے لئے فریقین کے بیانات، شہادتیں اور دلائل ہی بکار آمد ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ

امر اول کے متعلق عموماً آپ کو غیب کا علم عطا نہیں ہوا، لیکن دوسری چیز یعنی جس روداد کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح باور کیا اسکے مطابق آپؐ کا فیصلہ کبھی کبھی صحیح و صواب اور عادلانہ نہیں ہوتا تھا، یہ کہنا رسول نبی کی شان کی توہین و تحقیر ہے، اور اس "ارائت الٰہی" کے خلاف ہے، جس کا شرف مقدمات کے فیصلہ میں آپ کو بخشا جاتا تھا، اس لئے جو غلطی فیصلوں میں آپ سے ہو سکتی تھی وہ فریقین میں سے کسی ایک کی دلیل و شہادت کو سُن کر اُسکے صحیح یا غلط کے مطابق واقعہ یا مخالف واقعہ سمجھنے میں، لیکن جس کو آپ نے صحیح باور فرمالیا، اس کے مطابق مناسب و صحیح حکم و فیصلہ کرنے میں آپ سے کبھی غلطی نہ ہوئی، اور نہ ہو سکتی تھی، اور اُمت آپؐ کی پیروی، آپ کے ان قضایا، اور فیصلوں میں کرتی ہے نہ کہ نزاع مذکور کے گذشتہ واقعات اور گذشتہ مقدمات کے صحیح یا غلط باور کرنے میں فَثَنَّانَ بَیْنَهُمَا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اعلان میں نکتہ یہ ہے کہ شاید فریقین میں سے کوئی غلط بیان یا جھوٹا یا برسر باطل جو اپنے مقدمہ کی روداد زیادہ خوبی سے بنا کر آپؐ کی عدالت سے موافق فیصلہ حاصل کرلے، یہ سمجھے کہ گو حقیقت میں میرا حق نہ تھا، لیکن جب عدالت نبویؐ نے میرے حق میں فیصلہ کر دیا تو میری ملکیت ثابت ہو گئی، اور غصب حق کے گناہ سے برارت ہو گئی تو اس کا ایسا سمجھنا صحیح نہ ہوگا، گو قانوناً حکم نافذ ہو جائیگا، مگر عند اللہ جو برسر حق تھا، وہ حق ہی رہیگا، اور جو برسر باطل تھا، وہ باطل ہی رہیگا، اور جو اصل مالک تھا وہی مالک رہیگا، اور جو غاصب ہے، وہ غاصب ہی ٹھہریگا، اسی اعلان کا اثر تھا، کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقدمہ میں فریقین کو اس حقیقت سے مطلع فرمایا تو دونوں رو پڑے اور دونوں ایک دوسرے کے حق میں

دست بردار ہونے پر آمادہ ہو گئے (ابو داؤد کتاب الاقضیہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم روداد مقدمہ کو سامنے رکھ کر جو فیصلے صادر فرماتے تھے وہ تمام تر حق، منصفانہ اور صحیح ہوتے تھے، اور اُنکی اطاعت سے انحراف، کفر و نفاق تھا، اسی لئے ارشاد ہوا کہ

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ	سو قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہ ہونگے
فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي	جب تک وہ تجھکو حکم نہ مانیں پھر اپنے دلوں
أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَ	میں تیرے فیصلہ سے تنگی نہ پاویں اور مانکر
يُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (نساء ۹)	قبول کریں،
وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ	اور کسی ایماندار مرد یا عورت کا یہ کام نہیں
إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا	کہ جب اللہ اور اُس کا رسول کسی بات کا
أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ	فیصلہ کردے تو بھی اُسکو اپنے کام کا اختیار ہے
وَمَنْ يَعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ	اور جو خدا اور اُس کے رسول کے بے حکم چلا
ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا (احزاب ۵)	وہ صریح گمراہ ہوا،

کیا اُمت کو رسول کی اطاعت اور اس کے فیصلوں کے چون وچرا قبول کر لینے کا مذکورہ تاکیدی حکم، برسر باطل پہلو پر ہو سکتا ہے؟ چنانچہ دوسری آیت میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے، کہ آپ کا کوئی فیصلہ کبھی ظالمانہ اور غلط نہیں ہو سکتا،

وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ	اور جب وہ اللہ اور اُس کے رسول کی طرف
لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِنْهُمْ	بلائے جائیں تاکہ رسول اُنکے درمیان فیصلہ کرے

مُعْرِضُوْنَ ۝ اِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ	تو ان میں کا ایک گروہ منہ پھیر لیتا ہے اور اگر
يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ۝ اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ	انکو کوئی حق پہنچتا ہو تو قبول کرکے چلے آتے ہیں
مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ	کیا انکے دلوں میں روگ ہے، یا وہ ڈرتے
يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ ۭ بَلْ	ہیں کہ خدا اور اسکا رسول انکے ساتھ
اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (نور - ۶)	بے انصافی کریگا، بلکہ وہی بے انصاف ہیں،

عقل بشری اس میں بھی شک نہیں کہ وحی اور ملکۂ نبوت کے علاوہ نبی میں نبوت و رسالت کے فرائض سے باہر کی چیزوں میں وہی عقل ہوتی ہے، جو عام انسانوں کی ہوتی ہے، اور جس میں اجتہادی غلطی کا ہر وقت امکان ہے، شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک اجتہاد کی یہی وہ دوسری قسم ہے، جس میں نبی سے بھی غلطی ہو سکتی ہے، کہ اس کا مدار وحی و الہام اور ملکۂ نبوت پر نہیں، بلکہ انسانی علم و تجربہ پر ہوتا ہے، اور یہی وہ قسم ہے، جس کا اتباع پیروؤں پر واجب نہیں، اور اسکی بہترین مثال کھجور کی کاشت کا واقعہ ہے،

صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ کے بعض باغوں میں گذرے تو دیکھا کہ کچھ لوگ کھجوروں کے درختوں پر چڑھ کر کچھ کر رہے ہیں، آپنے دریافت فرمایا کہ یہ کیا کر رہے ہیں؟ ایک ہمراہی نے کہا کہ یہ مادہ کھجوروں میں نر کھجوروں کے پھول ڈالتے ہیں کہ پھل زیادہ آئیں" فرمایا" میں تو نہیں سمجھتا کہ اس سے کچھ فائدہ ہوگا"؛ ایک اور روایت میں ہے کہ آپنے فرمایا کہ اگر ایسا نہ کرتے تو بہتر ہوتا"؛ اُس نے جاکر باغ والوں سے آپؐ کا یہ فقرہ بیان کر دیا، صحابہ نے جو سنا تو یا اطاعت تھے اس پر عمل کیا، اور ایسا کرنا چھوڑ دیا، پھل اس سال کم آئے" یا کم ٹھہرے" آپ کا پھر گذر ہوا تو ان

لوگوں نے صورتِ حال عرض کی، آپ نے فرمایا میں نے تو یوں ہی ایک بات سمجھ سے کہدی تھی اگر اُن کو اس عمل سے فائدہ ہوتا ہے تو کریں، پھر فرمایا،

اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اِذَا اَمَرْتُکُمْ بِشَیْءٍ	میں تو ایک آدمی ہی ہوں، جب تمہارے دین
دِیْنِکُمْ فَخُذُوْا بِهٖ وَاِذَا اَمَرْتُکُمْ	کا کوئی حکم دوں تو اسکو قبول کرو اور جب
بِشَیْءٍ مِنْ رَاْیِیْ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ،	اپنی رائے سے کچھ کہوں تو میں ایک آدمی ہوں

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں[1]۔

اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ	تم اپنے دنیا کے کام کو زیادہ جانتے ہو

تیسری روایت کے یہ الفاظ ہیں[1]۔

اِنَّمَا ظَنَنْتُ ظَنًّا فَلَا تُؤَاخِذُوْنِیْ	میں نے ایک گمان سا کیا تھا، گمان پر مجھکو
بِالظَّنِّ وَلٰکِنْ اِذَا حَدَّثْتُکُمْ عَنِ اللّٰهِ	نہ پکڑو، ہاں جب خدا کی طرف سے کوئی بات
شَیْئًا فَخُذُوْا بِهٖ فَاِنِّیْ لَنْ اَکْذِبَ عَلَی اللّٰهِ	کہوں تو اسکو لو کہ میں خدا پر جھوٹ نہ

ان تینوں روایتوں میں آپ نے اپنے اس ارشاد کو ظن (گمان)، رائے اور امرِ دنیا سے تعبیر فرمایا ہے، اس سے یہ کلیہ سمجھ میں آتا ہے کہ امورِ دین و شریعت میں آپ کا ہر حکم واجب اور منجانب اللہ ہے لیکن کھیتی باڑی، علاج و معالجہ وغیرہ خالص دنیاوی امور میں اگر آپ نے کچھ کہا ہے تو اس کی حیثیت فقط مشورہ اور رائے کی ہے، یہی سبب ہے کہ صحابۂ کرام جن باتوں میں اپنا مشورہ

[1] یہ تینوں روایتیں صحیح مسلم باب وجوب امتثال ما قالہ شرعًا دون ما ذکرہ صلی اللہ علیہ وسلم من معائش الدنیا علی سبیل الرای، ج ص ۲۰۵ مصر میں ہیں،

آپؐ کو دینا چاہتے تھے، پوچھ لیتے تھے کہ یا رسول اللہ! یہ وحی سے ہے یا رائے ہے، آپ جب فرما دیتے تھے کہ رائے سے ہے تو وہ اپنا مشورہ پیش کرتے اور آپؐ پسند فرماتے، تو قبول فرماتے غزوۂ بدر میں آپ نے ایک مقام پر پڑاؤ ڈالنا چاہا، ایک صحابی نے آکر عرض کی یا رسول اللہ! اس مقام کا انتخاب وحی سے ہے، یا رائے سے ہے، فرمایا محض رائے ہے تو عرض کی کہ جنگی نقطۂ نظر سے یہ مقام بہتر نہیں، فلاں مقام بہتر ہے، آپ نے ان کی رائے پسند کی اور اس پر عمل فرمایا اسی طرح صلح و جنگ اور حکومت کے دوسرے معاملات میں بھی صحابہؓ سے مشورہ لیا، اور عمل فرمایا ہے، اور اسی میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (توبہ) یعنی امور حکومت یا عام امور میں صحابہ سے مشورہ لے لو، کا حکم خدا کی طرف سے ہے، چنانچہ غزوۂ احزاب میں خندق کھودنے میں سلمانؓ فارسی رائے پر عمل کیا، لیکن امورِ جنگ و سیاست میں بھی جس بات کا حکم عقلِ بشری سے نہیں بلکہ وحیِ الٰہی یا فہمِ نبویؐ سے ہوا تھا، اس میں آپ نے نہ کسی سے مشورہ لیا، اور نہ کسی کے مشورے کو قبول فرمایا، صلح حدیبیہ کے شرائط اور دفعات جو سراسر مصلحتِ الٰہی اور حکمت ربانی پر مبنی تھے، ان کے بدلنے پر حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہؓ نے کیا کیا زور نہیں لگایا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ التفات نہ فرمایا، اور آخر مستقبل نے بتا دیا کہ فہم نبوت سراسر صحیح تھی، اسی طرح غزوۂ احد جیسے نازک موقع پر عبد اللہ بن اُبی کا تین سو آدمیوں کے ساتھ پھر جانا گوارا کیا، مگر مدینہ سے باہر جا کر صف آرا ہونے سے باز نہ آئے اور پھر مستقبل نے مصلحتِ الٰہی کے راز کو فاش کیا،

ایک ادنیٰ سا تامل عقلی حیثیت سے بھی یہ راز بتا دیگا کہ دنیا میں ہر صاحب فن کی ایک نہیں دو عقلیں ہوتی ہیں، ایک اس فن کے متعلق جس کی استعداد اُسکے اندر رکھی جاتی ہے،

اور پھر تعلیم و تربیت، مشق اور کثرتِ عمل سے وہ اتنی بلند اور پختہ ہو جاتی ہے کہ وہ اس فن کے بڑے بڑے عمیق اور مشکل دقائق کو ایک نظر میں معلوم کر لیتی ہے، اور اس کے لاینحل عقدوں کو اشاروں میں حل کر دیتی ہے لیکن اس دائرہ کے باہر اس کی دوسری عقل عام انسانوں ہی کی طرح معمولی ہوتی ہے، ایک شخص جو فن تعمیر کی مہارت اور ہندسہ اور انجینئرنگ کی صناعی میں غیر معمولی عقل و ذہانت رکھتا ہے بالکل ممکن ہے کہ کھجور کی کاشت میں اسکی عقل معمولی انسانوں سے بھی کم درجہ ہو، ایک فلسفی جو اپنے زورِ فکر سے افلاطون و ارسطو کی غلطیاں نکالتا ہو، وہ تعمیر کے فن میں ایک معمولی مزدور سے زیادہ کم عقل ہو یہ روزمرہ کی پیش آنے والی مثالیں ہیں اسیطرح وہ برگزیدہ انسان جو روحانیت کے اسرار، معرفتِ ربانی کے حقایق، تزکیہ نفس کے رموز، اخلاق و معاشرت کے آداب اور حقوق و شریعت کے مسائل میں دقیقہ رس فہم اور نکتہ داں عقل رکھتا ہو، اسکو تعمیر و کاشت کاری کے مسائل میں محض معمولی درک ہو، بلکہ بالکل نہ ہو،

اسی طرح انبیاء علیہم السلام اپنے دین و شریعت میں وحی اور ملکۂ نبوت سے جو کچھ فرماتے ہیں وہ عین مصلحت عین حکمت، خطا اور غلطی سے سرتاپا مبرا اور پاک ہوتا ہے، لیکن دوسرے امور مثلاً پہننے اوڑھنے، کھانے پینے، رہنے سہنے، سلطنت و سیاست، نظم و نسق، صلح و جنگ سامان و اسلحہ، فوج سواری، صنعت و حرفت، طب و علاج وغیرہ دنیاوی امور کی نسبت کلی مصلحتیں بتا کر جزئیات کی تفصیل سے انھوں نے احتراز فرمایا، اور کسی قطعی فیصلہ کا مسلمانوں کو پابند نہیں کیا، پہننے اوڑھنے کے متعلق صرف تین باتیں فرمائیں، پہلی یہ کہ وہ لباس اور طرز لباس نہ اختیار کیا جائے، جس سے ستر عورت نہ ہو، دوسری یہ کہ مرد وہ لباس اختیار نہ کریں جو

عورتوں کے لئے زیبا ہے، نہ عورتیں وہ لباس اختیار کریں جو مردوں کیلئے مناسب ہے، تیسری بات یہ ہے کہ وہ لباس پسندیدہ نہیں جس سے غرور و نخوت نمایاں ہو، کھانے پینے میں چند حرام چیزوں کے کسی کی ممانعت نہیں، نظم و نسق اور نظام حکومت و سلطنت میں چند کلی اصول تعلیم فرمائے، مثلاً مشاورانہ اور جابرانہ حکومت نہ ہو، لوگوں میں مساوات ہو اور اہم امور میں اہل حل و عقد کا باہمی مشورہ ہو اور علیٰ ہذا القیاس،

الغرض یہی وہ امور ہیں جن میں زمانہ اور تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ تغیر و انقلاب ہوتا ہے، اس لئے ان کو ہمیشہ کے لئے محدود کر دینا مصلحت الٰہی کے خلاف تھا،

ملکۂ نبوت یا عقل نبوت کا شرعی ثبوت

گذشتہ مباحث سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ نبی میں علم و فہم کے تین ذریعے ہیں، وحی ملکۂ نبوت اور عام عقل بشری، ان میں سے اول و آخر کے ثبوت کے لئے اب کسی استدلال کی ضرورت نہیں کہ اول تو یہ مسلمات سے ہیں اور دوسرے اوپر کی تشریحات میں مستقل طور سے ان پر بحثیں ہو چکی ہیں، لیکن ابتک ہم نے دوسری چیز یعنی ملکۂ نبوت کیلئے کوئی شرعی دلیل پیش نہیں کی ہے، اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ کہنی ہے کہ جن علماء نے اسکی حقیقت ظاہر کی ہے، انھوں نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس کے لئے الگ الگ اصطلاحیں قائم کی ہیں، مگر مفہوم و معنی کے لحاظ سے وہ در اصل ایک ہیں، سلف صالحین میں سے بعض نے اس کو القاء فی الروع و دل میں ڈالنا، نبی کی حکمت قلبیہ، توفیق ازلی، اور قوت تبیین سے تعبیر کیا ہے[1]، امام غزالی و امام رازی اور دوسرے متکلمین نے اس کو ملکۂ نبوت سے ادا

[1] یہ تمام الفاظ امام شافعی کی کتاب الرسالہ میں مذکور ہیں،

کیا ہے، شاہ ولی اللہ صاحب اور علمائے اصول نے اس کو "پیغمبرانہ قوت اجتہاد" کہا ہے، اور صوفیہ کی عام پسند اصطلاح میں اس کو علم لدنی کہا جاتا ہے، مگر ان سب کے معنی تقریباً ایک ہی ہیں یعنی نبی کے اندر کی وہ پیغمبرانہ عقلی قوت، جو بشری عقل سے فوق ہے، اور جس کے ذریعہ وہ وحی کی تشریح، اسرار شریعت کا بیان، اور دقائق حکمت کی اپنی زبان سے توضیح کرتا ہے،

انبیائے کرام کے ان ربانی انعامات کی فہرست پڑھئے، جن کا تذکرہ قرآن نے جابجا کیا ہے، تو وحی کی مخصوص نعمت کے بعد فہرست انعامات میں جو چیز نظر آئیگی وہ "علم نبوت" ہے جسکو کہیں ذکر (یاد داشت) کہیں حکم (حق و باطل میں تمیز کا ملکہ) کہیں حکمت (دانائی) کہیں شرح صدر (سینہ کا کھول دینا) کہیں تفہیم (سمجھ بوجھ دینا) کہیں تعلیم (سکھا دینا) کہیں آیات (دکھا دینا، سوجھا دینا) کہا گیا ہے، ان سب مختلف الفاظ کا مفہوم وحی سے نیچے اور عقلِ بشری سے اوپر عقلِ نبوی کے سوا اور کیا ہے، ان سے مراد وحی تو اس لئے نہیں کہ اسکا ذکر وحی سے الگ ہوتا ہے، اور عقل بشری اسلئے نہیں کہ عقلِ بشری خاص نبی پر کوئی انعام نہیں کہ یہ نعمت تو ہر انسان کو کچھ نہ کچھ ملی ہے اس بنا پر اس سے مراد عقلِ نبوی اور حکمت نبوی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا،

حکمت انبیا علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نعمتیں عطا ہوتی ہیں، ان میں ایک خاص نعمت کا ذکر قرآن پاک میں بار بار آتا ہے، اور وہ حکمت ہے، آلِ ابراہیم پر اللہ تعالیٰ نے جو احسانات کئے ان کا ذکر وہ ان الفاظ میں فرماتا ہے،

۱۔ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا (نساء)

تو بے شبہ ہم نے ابراہیم کی اولاد کو کتاب اور حکمت دی، اور ان کو بڑی سلطنت بخشی،

حضرت لقمانؑ کی نسبت ہے،

۲۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ (لقمان-۲)

۲۔ اور یقیناً ہم نے لقمان کو حکمت دی،

حضرت داؤدؑ کی شان میں ہے،

۳۔ وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ (ص-۲)

۳۔ اور ہم نے داؤد کی سلطنت مضبوط کی اور اسکو حکمت اور قولِ فیصل عطا کیا،

۴۔ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ (بقرہ-۳۳)

۴۔ اور داؤدؑ نے جالوت کو مارا اور خدا نے داؤدؑ کو سلطنت اور حکمت بخشی اور جو چاہا اس میں سے کچھ سکھایا،

حضرت عیسیٰؑ فرماتے ہیں:۔

۵۔ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ (زخرف-۷)

۵۔ میں تمہارے پاس حکمت لیکر آیا ہوں تاکہ جن باتوں میں تم باہم اختلاف کرتے ہو کچھ باتیں ان میں سے کھول دوں،

خود اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ اپنا احسان جتاتا ہے، تو فرماتا ہے،

۶۔ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ (مائدہ-۱۵)

۶۔ اور (یاد کرو) جب میں نے تجھکو کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل کی تعلیم دی،

عام انبیاؑ کے متعلق ہے،

۷۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ

۷۔ اور جب اللہ نے نبیوں سے وعدہ لیا کہ جو

لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ (آل عمران ۹) میں تمکو کوئی کتاب اور کوئی حکمت دوں

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی یہ دعا مانگی تھی،

۸۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ ۸۔ ہمارے پروردگار! اور ان میں انہی
يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ میں سے ایک رسول بھیج جو انکو تیری آیتیں سنائے
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اور کتاب اور حکمت سکھائے اور انکو سنوارے
اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (بقرہ ۱۵) بیشک تو غالب اور حکمت والا ہے،

اللہ تعالیٰ نے اُن کی یہ دعا قبول فرمائی،

۹۔ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ ۹۔ جس طرح ہم نے تم میں تم ہی میں سے ایک
يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ رسول بھیجا جو تمکو ہماری آیتیں سناتا اور
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ تمکو سنوارتا ہے، اور تمکو کتاب اور حکمت سکھاتا
مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (بقرہ ۱۸۱) ہے، اور وہ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے

اس دعاے ابراہیمی کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کا احسان اللہ تعالیٰ نے سورۂ آلِ عمران میں ہم پر جتایا ہے،

۱۰۔ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۱۰۔ یقیناً اللہ نے ایمان والوں پر احسان
اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ کیا کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا
يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ جو انکو اسکی آیتیں پڑھکر سناتا ہے، اور
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ انکو سنوارتا ہے اور انکو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے

وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ — اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں
مُّبِيْنٍ، (آلِ عمران - ۱۷) — تھے،

اللہ تعالیٰ نے اپنا یہی احسان امی الفاظ میں سورۂ جمعہ میں دہرایا ہے،

۱۱۔ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ — ۱۱۔ وہی اللہ جس نے ان پڑھ لوگوں میں
رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ — انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انکو اس
وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ — کی آیتیں سناتا ہے اور انکو پاک صاف
وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ — کرتا ہے اور کتاب و حکمت سکھاتا ہے اور
لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (جمعہ - ۱) — اور وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے،

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے اپنا یہ احسان ان پر ظاہر فرمایا ہے،

۱۲۔ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَ — ۱۲۔ اور اگر خدا کا فضل و کرم تجھ پر نہ ہوتا تو
رَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ — ان میں سے ایک جماعت ارادہ کر چکی تھی کہ وہ
مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ وَمَا يُضِلُّوْنَ — تجھے گمراہ کر دے اور وہ گمراہ نہیں کرتے
اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ — لیکن اپنے آپ کو اور تجھے کچھ نقصان نہیں
وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ — پہنچا سکتے خدا نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری
وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ — اور تجھکو وہ سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا اور
فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (نساء)، — تجھ پر خدا کا بڑا فضل تھا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے،

۱۳۔ ذَالِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ (اسرائیل۔۴)

۱۳۔ یہ وہ ہے جو خدا نے حکمت کی باتوں میں سے تم پر وحی کی ہے،

عام مسلمانوں سے ارشاد ہے:۔

۱۴۔ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ (بقرہ۔۲۹)

۱۴۔ اور اللہ کا جو احسان تم پر اور اس نے تم پر جو کتاب اور حکمت اتاری ہے انکو یاد کرو، خدا تمکو اس سے سمجھاتا ہے،

خاص طور پر ازواج مطہرات کو خطاب کیا ہے،

۱۵۔ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ (احزاب۔۷)

۱۵۔ اور تمھارے گھروں میں اللہ کی جو آیتیں اور حکمت کی جو باتیں سنائی جاتی ہیں

یہ نعمت حسب استعداد عام مسلمانوں کو بھی ملا کرتی ہے،

۱۶۔ يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا، (بقرہ۔۳۰)

۱۶۔ اور خدا جس کو چاہتا ہے حکمت بخشتا ہے، اور جس کو حکمت بخشی گئی اسکو بڑی دولت (بھلائی) دی گئی،

اسی کے ذریعہ تبلیغ و دعوت کا حکم بھی ہوتا ہے،

۱۷۔ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (نحل۔۱۶)

۱۷۔ اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف تو حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ سے بلا اور ان سے عمدہ طریقہ سے مناظرہ کر،

ایک جگہ قیامت اور عبرت کے واقعات پر حکمت کا اطلاق ہوا ہے،

۱۸۔ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْبِيَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ط حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ (قمر۔۱)

۱۸۔ اور انکو اتنے احوال جتنے میں ڈانٹ ہو سکتی ہے، پہنچ چکے ہیں، موثر حکمت تو انکو ڈر سنانے والے فائدہ نہیں پہنچا سکتے،

اوپر کی سطروں میں وہ تمام آیتیں لکھ دی گئی ہیں جن میں حکمت کا لفظ آیا ہے، ان میں کہیں "حکمت" کا لفظ تنہا آیا ہے اور کہیں "کتاب" کے بعد آیا ہے، کتاب کے دو معنی قرآن میں ہیں، ایک "صحیفۂ ربانی" اور یہ اکثر آیا ہے، اور دوسرے نوشتۂ الٰہی، اور علم الٰہی جیسے لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ (اگر خدا کا نوشتہ یا علم پہلے نہ ہوتا) مذکورۂ بالا آیتوں میں تو کتاب سے تو بے شبہ آسمانی کتاب اور صحیفۂ ربانی یا یوں کہو کہ وحی کتا مراد ہے، جیسے تورات و قرآن وغیرہ لیکن حکمت کا مفہوم ان آیتوں میں کیا ہے؟

حکمت کے لغوی معنی "دانائی کی بات اور کام کے ہیں، مگر یہاں اس سے کیا مقصود ہے اس تحقیق کے لئے ضرورت ہے کہ مستند اہلِ لغت اور ماہرینِ قرآن کے اقوال نقل کر کے تبصرہ کیا جائے، سب سے قدیم لغت نویس ابن درید المتوفی ۳۲۱ھ اپنی کتاب "جمہرۃ اللغۃ" میں حکمت کے حسب ذیل معنی لکھتا ہے،

فَكُلُّ كَلِمَةٍ وَعَظَتْكَ اَوْ زَجَرَتْكَ اَوْ دَعَتْكَ اِلٰى مَكْرُمَةٍ اَوْ نَهَتْكَ مِنْ قَبِيْحٍ فَهِيَ حِكْمَةٌ وَحُكْمٌ،

(جلد ۳ ص ۱۸۶ حیدرآباد)

ہر وہ بات جو تجھ کو سمجھائے یا تجھکو تنبیہ کرے یا کسی اچھی خصلت کی طرف بلائے یا کسی بری چیز سے روکے وہ حکمت اور حکم ہے،

لغت کا امام جوہری، اپنی صحاح اللغۃ میں لکھتا ہے،

الحکمۃ من العلم والحکیم العالم	حکمت یعنی علم، اور حکیم یعنی عالم، اور حکمت
وصاحب الحکمۃ والحکیم المتقن	والا اور حکیم کاموں کو خوبی سے کرنے
للامور (جلد ۲ ص ۲۷۶، مصر)	والا،

عربی لغت کی مبسوط و مستند کتاب لسان العرب میں ہے،

والحکمۃ عبارۃ عن معرفۃ	اور حکمت بہترین چیز کو بہترین علم کے ذریعہ
افضل الاشیاء بافضل العلوم (ج	سے جاننے کو کہتے ہیں،

لغات قرآن کے مشہور امام راغب اصفہانی، مفردات القرآن میں کہتے ہیں،

والحکمۃ اصابۃ الحق بالعلم	اور حکمت علم اور عقل کے ذریعہ سچی اور صحیح بات
والعقل فالحکمۃ من اللہ تعالیٰ	کو پہنچنا ہے تو اللہ تعالیٰ کی حکمت چیزوں کا جاننا
معرفۃ الاشیاء وایجادھا علی غایۃ	اور انکو کمال خوبی پیدا کرنا ہے، اور
الاحکام من الانسان معرفۃ	انسان کی حکمت موجودات کو جاننا، اور
الموجودات وفعل الخیرات (ص ۱۲۶ مصر)	اچھی باتوں کا کرنا ہے،

یہ تو عربی لغت کے اماموں کی تصریحات تھیں، اب ان بزرگوں کے اقوال پر غور کرنا ہے جو زبان دانی کے ساتھ قرآن اور شریعت کے استدلالات اور محاورات سے بھی کامل طور سے آگاہ تھے، ابن حیان اندلسی نے اپنی تفسیر بحر المحیط میں ان کے اکثر اقوال کو یکجا کر دیا ہے[1]،

---

[1] زیر آیت وابعث فیھم رسولا منھم الآیۃ ج ۱ ص ۳۹۳، مطبوعہ سعادت مصر،

۱۔ قال مالک و ابو زرین: الحکمۃ الفقہ فی الدین والفہم الذی ھو سجیۃ ونور من اللہ تعالیٰ	۱۔ امام مالک اور ابو زرین کا قول ہے، حکمت دین میں سمجھ اور اس فہم کو کہتے ہیں جو ایک فطری ملکہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نور ہے
۲۔ وقال مجاہد: الحکمۃ فہم القرآن	۲۔ مجاہد کا قول ہے: حکمت یعنی قرآن کا فہم
۳۔ وقال مقاتل: العلم والعمل بہ لا یکون الرجل حکیماً حتیٰ یجمعھا،	۳۔ مقاتل کا قول ہے: حکمت علم اور اس کے مطابق عمل کو کہتے ہیں، کسی شخص کو حکیم اس وقت تک نہیں کہا جاتا جب تک وہ علم اور عمل دونوں کا جامع نہ ہو
۴۔ وقیل: الحکمۃ والقضاء	۴۔ بعضوں کا قول ہے: حکمت فیصلہ کرنا ہے
۵۔ وقیل: ما لا یعلم الا من جھۃ الرسول،	۵۔ کسی کا قول ہے: حکمت وہ ہے جو رسول کے سوا کسی اور ذریعہ سے معلوم نہ ہو سکے،
۶۔ وقال ابو جعفر محمد بن یعقوب: کل صواب من القول ورث فعلاً صحیحاً فھو حکمۃ،	۶۔ ابو جعفر کا قول ہے: ہر وہ صحیح بات جو صحیح عمل پیدا کرے، حکمت ہے،
۷۔ وقیل وضع الاشیاء مواضعھا	۷۔ کسی کا قول ہے، چیزوں کو اپنی اپنی جگہ پر رکھنا حکمت ہے
۸۔ وقیل: کل قول وجب فعلہ،	۸۔ ایک اور شخص کا قول ہے: ہر وہ بات جس کا کرنا ضروری ہو، حکمت ہے،

امام ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں حسب ذیل اقوال لکھے ہیں:۔

۱۔ قال (مالکؒ): المعرفۃ بالدین والفقہ فی الدین والاتباع لہ

۱۔ مالک کا قول ہے: دین کی معرفت اور دین میں سمجھ اور اسکی پیروی حکمت ہے،

۲۔ قال ابن زید:۔ الحکمۃ الدین الذی لا یعرفونہ الا بہ صلی اللہ علیہ وسلم یعلمہوا ایاہا قال والحکمۃ العقل فی الدین وقرۃ ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا وقال عیسیٰ ویعلمہ الکتب والحکمۃ والتورٰۃ والانجیل وقرء ابن زید واتل علیہم نبأ الذی اٰتینٰہ اٰیٰتنا فانسلخ منہا، قال لم ینتفع بالآیات حین لم تکن معہا حکمۃ قال والحکمۃ شیٔ یجعلہ اللہ فی القلب فنور لہ بہ،

۲۔ ابن زید کا قول ہے: حکمت دین کا وہ حصہ ہے جو صرف رسول سے معلوم ہوتا ہے، وہی اسکو سکھاتا ہے، نیز انہی کا قول ہے کہ حکمت دینی عقل کا نام ہے اور اس پر یہ آیت پڑھی کہ "جس کو حکمت دیگئی اسکو بڑی دولت دیگئی اور خدا نے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق کہا کہ خدا ان کو کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل سکھاتا ہے" ابن زید نے یہ آیت بھی پڑھی کہ انکو اس کا حال سناؤ، جس کو ہم نے اپنی آیتیں دیں تو وہ ان سے الگ ہوگیا" یعنی ان آیتوں سے نفع نہیں اٹھایا کیونکہ انکے ساتھ حکمت نہ تھی، انہی کا قول ہے کہ

۳۔ عن قتادۃ:۔ والحکمۃ ای السنۃ

۳۔ قتادہ سے مروی ہے:۔ حکمت یعنی سنت نبوی،

آخر میں امام طبری اپنا فیصلہ سناتے ہیں،

۴۔ قال ابن جریر الطبری:۔ والصواب

۴۔ ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ حکمت اُن

من القول عندنا فی الحکمۃ انہا العلم باحکام اللہ التی لا یدرک علمہا الا ببیان الرسول صلعم المعرفۃ بما وما دل علیہ ذالک من نظائرہ وہو عندی ما خوذ من الحکم الذی بمعنی الفصل

احکام الٰہی کے علم کا نام ہے جو صرف رسول کے بیان (تشریح) سے معلوم ہوتے ہیں اور انکی اور جو انکی مثالیں اور نظیریں ہیں انکی معرفت کو کہتے ہیں اور حکمت کا لفظ میرے نزدیک حکم سے ماخوذ ہے، جس کے معنی حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں،

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف کتاب الرسالہ میں قتادہ کے مسلک کو پسند کیا ہے، لکھتے ہیں:

۵۔ سمعت من ارضی من اہل العلم بالقرآن، یقول:۔ الحکمۃ سنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ص ۱۲)

۵۔ میں نے قرآن کے ان اہل علم سے جن کو پسند کرتا ہوں، یہ سنا کہ حکمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا نام ہے،

امام شافعی اسی کتاب میں آگے چل کر بعضوں کا قول نقل کرتے ہیں،

وسنۃ الحکمۃ التی القی فی روعہ عن اللہ عزوجل، (صفحہ ۲۸)

اور آپ کی سنت وہ حکمت ہے، جو آپ کے دل میں خدا کی طرف سے ڈالی گئی،

ائمہ لغت اور علمائے قرآن کے ان تمام اقوال پر ایک نظائر نظر ڈالو، تو معلوم ہوگا کہ یہ کل کے کل ایک ہی مفہوم کی مختلف تعبیریں، اور ایک ہی حقیقت کی متعدد تفسیریں ہیں، حکمت عقل و فہم کی اس کامل ترین حقیقت کا نام ہے، جس سے صحیح و غلط صواب و خطا، حق و باطل اور خیر و شر کے درمیان تمیز و فیصلہ بذریعہ غور و فکر، دلیل و برہان اور تجربہ و استقرار کے نہیں بلکہ

منکشفانہ طور سے ہو جاتا ہے اور اسی کے مطابق اس صاحب حکمت کا عمل بھی ہوتا ہے،

ہر فن کے واقف کار دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو کسی فن کو باقاعدہ حاصل کرتے اس کی مشق کرتے اور اس میں مہارت اور کمال بہم پہنچاتے ہیں، دوسرے وہ جو اُس فن کی فطری استعداد اور قابلیت رکھتے ہیں، اور تجربہ و دلیل کے بغیر خود اپنی فطری صلاحیت صحیح وجدان اور سلیم ذوق سے اس فن کی کسی شے کو دیکھنے کے ساتھ ہی اسکے متعلق جچی تلی رائے دیتے ہیں اور حرف حرف صحیح دیتے ہیں، اسی کا نام آپ صحت وجدان اور سلامت ذوق کہتے ہیں شاعری انشاپردازی اور دوسرے فنون لطیفہ میں اسکی مثالیں بکثرت دیکھی اور سنی جاتی ہیں اسیطرح بعض لوگوں میں اشیاء کے حق و باطل اور افعال کے خیر و شر کی تمیز کا صحیح وجدان اور صحیح ذوق ہوتا ہے وہ ان امور کے دقیق سے دقیق مسئلہ کے متعلق اپنے ربانی ذوق و وجدان سے ایسی صحیح رائے دیتے ہیں جو دوسرے لوگ وسیع مطالعہ اور غور و فکر کے بعد بھی نہیں دے سکتے، یہی وہ معرفت اور نور الٰہی ہے جو جد و جہد اور سعی و محنت سے نہیں بلکہ عطاء بخشش سے حاصل ہوتی ہے، اور اسی کا نام "حکمت" ہے،

دوسری ربانی استعدادوں اور فطری بخششوں کی طرح حکمت کا عطیہ بھی سب کو یکساں نہیں ملتا بلکہ حسب استعداد معمولی حکمت سے لیکر اعلیٰ ترین اور کامل ترین حکمت تک لوگوں کو عطا ہوتی ہے، اس کے مختلف درجے اور مرتبے عام انسانوں کو مل سکتے ہیں اور ملتے ہیں لیکن اس کا اعلیٰ ترین اور کامل ترین درجہ اور مرتبہ حضرت انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہوتا ہے

مگر یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح اس ربانی عطیہ آسمانی فہم دینی عقل اور نورانی قوت پر "حکمت" کا اطلاق ہوتا ہے، اسی طرح اس قوت (حکمت) کے آثار و نتائج اور اسکی تعلیمات پر بھی

اُس کا اطلاق ہوتا ہے، چنانچہ دوسری آیت جس میں حضرت لقمانؑ کو حکمت دیئے جانے کا بیان ہے، اس کے بعد اُس حکمت لقمانی کی حسب ذیل تعلیمات کا ذکر بھی کیا گیا ہے اللہ کا شکر ادا کرنا، شرک کی ممانعت، والدین کی خدمت اچھوں کی پیروی، خدا کا ہمہ گیر علم، نماز کا حکم، صبر فخر و غرور کی ممانعت، میانہ روی، آہستہ بولنا، اسی طرح تیرہویں آیت میں حکمت محمدی کی حسب ذیل تعلیمات کی تفصیل بھی کی گئی ہے، شرک کی ممانعت، والدین کے ساتھ احسان، قرابتداروں اور مسکینوں سے نیک سلوک، اسراف کی برائی، نرمی کی بات کرنا، میانہ روی، اولاد کے قتل کی ممانعت، کسی کی جان نہ لینا، مقتول کا بدلہ لینا، یتیم کے ساتھ اچھا برتاؤ، عہد پورا کرنا، ناپ تول ٹھیک رکھنا، بے جانی چیز کی پیروی نہ کرنا، فخر و غرور کی مذمت، ان تمام باتوں کو بیان فرما کر اللہ کہتا ہے

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ (اسراء ۔ ۴)

یہ ہیں حکمت کی وہ بعض باتیں جو خدا نے تجھ پر وحی کی ہیں،

حکمت کی ان بعض باتوں کی تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکمت کے مظاہر اور نتائج کس قسم کی باتیں ہوتی ہیں، یہ عموماً وہی باتیں ہوتی ہیں جن کی عالمگیر صداقت اور سچائی کو خود فطرتِ انسانی اور حسِ اخلاقی تسلیم کرتی ہے، یہی سبب ہے کہ تیسری اور چوتھی آیت میں حکمت کا اطلاق زبور پر اور پانچویں اور چھٹی آیت میں انجیل پر ہوا ہے، کہ اُن میں اسی قسم کی دانائی نصیحتوں اور عالمگیر صداقتوں کی تعلیم ہے، اور خود قرآن پاک نے بھی اپنی صفت "حکمت والا قرآن" ظاہر کی ہے، تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ (لقمان و یونس) وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ (یٰسین) اِلَيْكَ الْكِتٰبُ الْحَكِيْمُ (آل عمران)

ان آیتوں سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ "حکمت" کی بعض اہم تعلیموں کو وحیِ الٰہی خود اپنے

اندر کبھی شامل کر کے ان کو آپ مقطر بنا دیتی ہے، یہ چیز انبیاءؑ کو کتاب الٰہی و حی کے ساتھ ساتھ عام طور پر ملتی ہے، فرمایا،

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ	اور یاد کرو جب خدا نے پیغمبروں سے عہد
لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ (آل عمران)	کہ البتہ جو میں تمکو کتاب اور حکمت دوں

بہرحال یہ حکمت کی قوت انبیاء علیہم السلام کو بدرجۂ اتم حاصل تھی، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی ہر بات دانائی اور ان کا ہر کام دانشمندی پر مبنی ہوتا تھا، اور چونکہ یہ قوت اُن کو حاصل تھی اسلئے اس کے آثار اور نتائج بھی اقوال و اعمال کی صورت میں ظاہر ہوئے جن کا نہ صرف اقرار و اعتراف بلکہ ان پر عمل بھی نبوت کی تصدیق میں داخل ہوا، پندرھویں آیت میں ہے،

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ	اور اے محمد رسول اللہ کی بیویو تمہارے
اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ،	گھروں میں خدا کی جو آیتیں اور حکمت کی باتیں
(احزاب - ۴)	سنائی جاتی ہیں، ان کو یاد رکھو،

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کو آیات الٰہی کے علاوہ کس حکمت کے یاد رکھنے کا حکم دیا گیا، ظاہر ہے کہ وہ خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمت و دانائی کی باتیں تھیں اب اگر وہ باتیں امور دین سے متعلق نہ ہوتیں، تو ان کے لئے ان کا یاد رکھنا کیوں ضروری قرار دیا جاتا اسی طرح آٹھویں، نویں، دسویں اور گیارہویں آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت میں ہے

لہ لفظ یتلیٰ سے کسی کو شبہہ نہ ہو کہ وہ کتاب کے لئے خاص ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کتاب کا کوئی صفحہ پڑھکر نہیں سناتے تھے، بلکہ الفاظ الٰہی کو زبانی ادا فرماتے تھے،

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (جمعہ) وہ مسلمانوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتاب کے بعد کس حکمت کی تعلیم دیتے تھے؟ ظاہر ہے کہ خود اپنی حکمت کی، تو جس حکمت کی تعلیم وہ دیتے تھے وہ خود ان کے اندر بھی تھی کہ جو چیز انکے پاس نہ تھی دوسروں کو کیا بخش سکتے تھے، اور جب یہ قوت آپ کے پاس تھی تو اسکے آثار و نتائج بھی اقوال و افعال کی صورت میں نمایاں ہونگے، جن کی آپ تعلیم فرماتے تھے اور اپنے ان امور حکمت کی تعلیم سے آپ کا مقصد بھی یہی ہو سکتا تھا کہ مسلمان اُن پر عمل کریں،

پانچویں آیت میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ فرماتے ہیں،

قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ	میں تمہارے پاس حکمت لیکر آیا ہوں تاکہ
لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ	جن باتوں میں تم باہم اختلاف رکھتے ہو
فِيهِ، (زخرف ۷)	کچھ باتیں اُن میں سے کھول دوں

اس سے معلوم ہوا کہ حکمت کا ایک فریضہ تبیین بھی ہے، یعنی کسی مجمل، ذو معنین اور مختلف فیہ مسئلہ کی تشریح و تفصیل جس سے وہ اجمال اور اختلاف جاتا رہے، اور اصل مقصود کی تشریح ہو جائے، چنانچہ حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام نے تورات کے بعض احکام کی جن میں یہود مختلف الرائے تھے، تفصیل فرمائی، اور اُن کی غلطی دور کی،

بارہویں آیت میں ہے،

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ	اگر خدا کا فضل و کرم تجھ پر نہ ہوتا تو ان میں سے

لہ قرآن پاک میں حرف علت سے قبل اور آیا کرتا ہے جیسے وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ، یہ حرفِ عطف نہیں،

اَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ	ایک گروہ نے چاہا تھا کہ تجھکو گمراہ کرے اور
وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ	وہ گمراہ نہیں کرتے لیکن اپنے آپ کو اور تجھے
مِنْ شَيْءٍ وَّاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ	ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے، اللہ نے
وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ	تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری اور تجھکو سکھایا جو
وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۝	تو نہیں جانتا تھا اور اللہ کا فضل تجھ پر بڑا ہے

ان آیتوں میں بیان ہے کہ منافقین کا ایک گروہ آپ کو غلط رائے دیکر بہکانا چاہتا تھا، مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "ان کی یہ چال کارگر نہ ہوئی، اور وہ تجھ کو بہکا نہ سکے، اسکی وجہ یہ تھی کہ اللہ کا تجھ پر فضل و کرم ہے، اور وہ فضل و کرم یہ ہے کہ اُس نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری اور تجھے وہ علم بخشا جو پہلے نہ تھا" اس سے ظاہر ہوا کہ گمراہی سے آپ کی یہ حفاظت، خطاب سے یہ عصمت اور علم کی یہ بخشش آپ کو کتاب اور حکمت دونوں کے ملنے کے سبب سے حاصل ہوئی ہے، الغرض اس حفاظت و عصمت کے حصول میں کتابِ الٰہی کے ساتھ، حکمتِ ربانی کے انعام کو بھی دخلِ کامل ہے،

یہ تو وہ نبوی حکمت تھی جس کا سرچشمہ صرف سینۂ نبوت تھا، لیکن یہ فیض حسب استعداد پیغمبر کی اتباع میں دوسروں کو بھی ملتا ہے جس کا یہ اثر ہوتا ہے، کہ وہ سچی اور صحیح بات کو بہت آسانی سے سمجھ لیتے، قبول کر لیتے اور اس پر عمل کرتے ہیں،

تبلیغ اسلام کے تین ذریعوں حکمت، موعظت اور خوش خلقی سے مناظرہ کرنے میں سب سے اول حکمت کو جگہ دی گئی ہے،

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ۔ (نحل ۱۲۵)

تو اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کیساتھ دعوت دے اور ان سے مناظرہ بطریق حسن کر

یعنی صحیح اور صاف بات دل تک پہنچ جاتی اور بہت جلد اپنا اثر دکھاتی ہے، فرمایا،

حِکْمَةٌ بَالِغَةٌ (قمر ۔ ۱)

دل تک پہونچ جانے والی حکمت،

یہ حکمت ہر نیکی کی جڑ اور ہر بھلائی کی اصل ہے، پھر اس سے بڑھ کر دنیا میں اور کیا دولت ہو سکتی ہے، اسی لئے ارشاد ہوا،

وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا ، (بقرہ ۔ ۳۷)

جس کو حکمت دی گئی، اس کو بہت نیکی (دولت) دی گئی،

اس سلسلہ میں دو مشہور اور مستند حدیثوں کا حوالہ بھی مناسب ہے، جن سے حکمت کی حقیقت واضح ہوگی، اور کم از کم قرن اول میں اس لفظ کا مفہوم ظاہر ہوگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد کے ایک خطیب کا بیان سن کر فرمایا،

اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِکْمَةً وَاِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا ،

بعض شعر حکمت ہوتے ہیں اور بعض تقریریں جادو ہوتی ہیں،

ایک حدیث میں بعض اشعار کو حکمت اور بعض تقریروں کو جادو کہا گیا ہے، اس تقابل سے ظاہر ہے کہ حکمت کا عربی مفہوم اُس کے اردو مفہوم سے بلند تر ہے، یعنی سحر و جادو کے مافوق انسانی تصور کی طرح "حکمت" کے عربی مفہوم میں کوئی مافوق بشری تخیل ضرور ہے، اسی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ عربی میں حکمت کے معنی عقل و فہم وغیرہ کے معمولی الفاظ سے کوئی بلند اور

غیر معمولی حقیقت ہے، اور اردو میں اس حقیقت کی "حکمت" کے ساتھ لفظ "الہامی" بڑھا کر ادا کیا جاسکتا ہے، یعنی "الہامی حکمت"۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، رشک وحسد اگر جائز ہے تو صرف دو شخصوں پر ایک اس پر جس کو مال کی دولت ملی تو وہ اسکو صحیح مصرف میں لاتا ہے، دوسرے رَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ الْحِكْمَةَ فَهُوَ يَقْضِي بِهَا وَيُعَلِّمُهَا (صحیح بخاری کتاب العلم) اس شخص پر جس کو حکمت ملی ہے، تو وہ اُس کے ذریعہ سے فیصلہ کرتا ہے، اور دوسروں کو سکھاتا ہے، اور اس میں معلم ہونے کی شان پیدا ہوتی ہے، جب عام انسانوں کا یہ درجہ ہے، تو انبیاء علیہم السلام کو یہ دولت کس بہتات سے ملی ہوگی، اور وہ یقیناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حصہ میں بھی آئی، اب اس حصولِ دولت یعنی عطاء حکمت کا نتیجہ بھی آپ سے ظاہر ہونا چاہئے، اور وہ فیصلہ اور تعلیم ہے، آپ کے یہ حکیمانہ فیصلے اور حکیمانہ تعلیمات تمام تر وحی ربانی کی عملی اور زبانی شرح اور بیان ہیں،

کتاب حکمت کی تعلیم اوپر کی چار آیتوں ۸-۹-۱۰-۱۱ میں خفیف سے تغیر کے ساتھ حسب ذیل آیت ہے،

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ	وہ رسول اُن (اَن پڑھوں) کو خدا کی
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ	آیتیں سناتا، اور ان کو سنوارتا، اور
(جمعہ-۱)	ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے،

ان آیتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تین کاموں کا ذکر ہے،

۱- خدا کی آیتوں کو پڑھنا، اور دوسروں کو سنانا،

۲۔ ان کو شرک اور بد اخلاقی کی نجاستوں سے پاک صاف کرنا اور سنوارنا،

۳۔ ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دینا،

سوال یہ ہے کہ پہلی اور تیسری آیتیں ایک ہی معنی رکھتی ہیں، یا دو، اگر ایک معنی رکھتی ہیں، تو اس بے سود تکرار کا فائدہ کیا؟ کیوں نہ دوسری جگہ بھی یتلوا (یعنی تلاوت کرتا ہے) ہی کا لفظ رکھدیا گیا، اور اگر دو الگ الگ معنی رکھتی ہیں جیسا کہ ہر صاحب نظر سمجھ سکتا ہے، تو ان دونوں معنوں میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوگا، اگر رسول کا فرق محض وحی کی زبان سے سنی ہوئی آیتیں پڑھکر دوسروں کو سنا دینا ہے، اور اسی پر اس کی تبلیغ کا فریضہ ختم ہو جاتا ہے، تو اس کا تیسرا فرض الفاظ کی تلاوت سے آگے بڑھ کر کتاب اور حکمت کے سبق کی تعلیم کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے، بالکل ظاہر ہے کہ تعلیم کا مفہوم تلاوت سے بہت کچھ زیادہ ہے، خصوصاً جب کہ تعلیم کا لفظ تلاوت کے بعد آیا ہو، وحی کے الفاظ سنا دینے سے تلاوت کا فرض ادا ہو جاتا ہے، مگر تعلیم کا فرض ہنوز باقی رہتا ہے، کتاب کی تعلیم کے معنی تلاوت کی طرح کتاب کے الفاظ کا سنا دینا اور پڑھا دینا یا دوسروں کو یاد کرا دینا نہیں، بلکہ الفاظ قرآنی کی تلاوت کے بعد جو آپ کا پہلا کام تھا، اسکے مشکل مطالب کو حل کرنے، مجمل معنی کو سمجھانے اور اپنی زبان اور عمل سے اُن کی شرح و تفصیل کر دینے کا نام کتاب و حکمت کی تعلیم ہے، اور یہ آپ کا دوسرا یا تیسرا فریضہ تھا، اور یہی وہ تعلیم تھی، جس کا ان آیتوں میں بار بار ذکر ہے، اب جب ان مطالب و معانی کی شرح و تفسیر بھی آپ کے فرائض نبوت میں داخل تھی، تو اس پیغمبرانہ شرح و تفصیل کی حیثیت بھی دینی ہوگی، اور اسکی تعمیل بھی امت کیلئے ضروری ہوگی آپ کی اسی زبانی و عملی شرح و تفصیل کو صحابہؓ اور تابعین نے اپنی روایت و عمل کے ذریعہ

سے محفوظ رکھا، اور وہ "احادیث وسنن" کے نام سے موسوم ہے،

اس تفصیل کے بعد "حکمت" کے ان معنوں پر ایک نظر دوبارہ ڈالئے، جو ائمہ لغت اور علمائے قرآن نے بیان کئے ہیں، تو آپ کو یقین آجائیگا کہ وہ کل ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں اور ایک ہی معنی کی متعدد تفسیریں ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال جن کے اصطلاحی نام احادیث وسنن ہیں، کتاب الٰہی کی عملی وزبانی تشریحات ہیں، کتاب الٰہی، وحی ربانی کا نتیجہ ہے، اور احادیث وسنن، سیرۂ نبوی کی ملہمانہ حکمت کا اس مقام پر امام شافعی کی یہ تحقیق پیش نظر رہے،

وسنته الحكمة التي القي في روعه	اور آپ کی سنت وہ حکمت ہے، جو آپ کے قلب
عن الله عز وجل (كتاب الرسالة ص۲۵)	میں خدا کی طرف سے ڈالی گئی،

اور اسی مفہوم کو مجاہد اس طرح ادا کرتے ہیں کہ الحکمۃ فقہ القرآن حکمت فہم قرآن کا نام ہے، دوسری عبارت میں یوں کہو کہ قرآن کے معانی ومطالب کی تشریح حکمت ہے، اور اس تشریح کا نام جو رسول کے قول وعمل سے ادا ہوتی، سنت ہے، اور اس معنی کو امام مالک ابو رزین اور ابن زید وغیرہ دوسری صدی کے علمائے قرآن ان عبارتوں میں ادا کرتے ہیں، کہ "حکمت، معرفت دین، فقہ دین، اور اس علم دین کو کہتے ہیں، جسکو رسول نے بیان کیا اور حکمت اُس نور کا نام بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کسی قلب میں پیدا کر کے اسکو منور کر دیتا ہے"

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اصل حکمت نبویؐ دو نور نبوت اور الہامی معرفت ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب وسینہ میں ودیعت کیا تھا، اور چونکہ آپ کے

سنن واقوال آپ کی اسی ودیعت شدہ حکمت نبوی کی پیداوار اور آثار و نتائج ہیں، اسلئے اُن پر بھی حکمت کا اطلاق جائز ہے، اس تفصیل کے بعد ظاہر ہوگا کہ بعض اماموں اور عالموں نے حکمت کی تشریح میں اصل معنی کی طرف توجہ کی ہے، اور بعض نے ثانوی معنی کو بیان کیا ہے، اور دونوں حق پر ہیں،

علم | علم کے لغوی معنی جاننے کے ہیں، مگر ہر فن کے تعلق سے جاننے کی نوعیت اور معلومات کی حیثیت مختلف ہوگی، انبیاء کے تعلق سے جب اس کا استعمال ہوگا تو اس سے طبعاً خدا کی توحید، ذات و صفات، دین و شریعت کے احکام اور اخلاقی تعلیمات مراد ہونگی، حضرت ابراہیمؑ توحید پر استدلال کر کے اپنے باپ سے فرماتے ہیں،

يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ (مریم ۳-)	اے میرے باپ! میرے پاس علم کا وہ حصہ آیا ہے، جو تیرے پاس نہیں آیا،

حضرت خضرؑ کے متعلق ہے،

وَعَلَّمْنَاهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا (کہف)	اور ہم نے اپنے پاس سے اسکو علم سکھایا

خدا کے پاس سے تو ہر چیز ہے، پھر "اپنے پاس سے علم سکھانے" کا مفہوم کیا ہے؟ ہر وہ شے جو انسان کی ذاتی محنت، کوشش اور جد و جہد وغیرہ معمولی ذرائع کے بغیر حاصل ہوتی ہے وہ "منجانب اللہ" کہی جاتی ہے، اسی طرح خدا کے پاس سے علم عطا ہونے کے معنی اس علم کے ملنے کے ہیں، جو انسان کے طبعی ذرائع علم و استدلال اور تلاش و تحقیق کے بغیر خود بخود عطا ہو، یہی علم خداداد ہے، اور اسی لئے صوفیہ کی اصطلاح میں اسکو علم لدنی و پاس والا علم کہتے ہیں، حضرت داؤدؑ اور سلیمان علیہما السلام کی نسبت ہے،

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا (نمل) — اور بے شبہ ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم دیا،

حضرت یوسفؑ کے آغاز نبوت کے موقع پر ہے،

وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ، (یوسف-۱) — اور اسی طرح تیرا پروردگار تجھ کو نوازیگا اور تجھ کو باتوں کی حقیقت (تاویل) سکھائیگا اور تجھ پر اپنا انعام پورا کریگا،

ان آیتوں میں اس علم کا ذکر نہیں جس کا منشاء وحیِ موقت ہے، کیونکہ ان میں سیاقِ کلام سے علم کے یکبارگی دیئے جانے کا ذکر ہے، جو وحیِ موقت کی شان نہیں، خصوصاً آخری آیت میں تو تاویلِ احادیث کا علم بیک دفعہ دیئے جانے کی تصریح ہے، اسی لئے حضرت یوسفؑ ایک خواب کی تعبیر بیان کرکے دوسرے موقع پر کہتے ہیں،

ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ (یوسف) — یہ وہ ہے، جو میرے پروردگار نے مجھے سکھایا،

یہ کہیں بیان نہیں کیا گیا ہے کہ خواب کی تعبیر بتلاتے وقت ان پر وحی اگر حقیقت سے آگہ مطلع کرتی تھی، بلکہ خود ان کے اندر یہ علمی قوت ہمیشہ کے لئے ودیعت کر دی گئی تھی، اسی قسم کا وہ علم ہے، جس کی نسبت سے بعض انبیاؑ کو بچپن ہی میں عَلِیْمٌ (جاننے والے) کا خطاب ملا،

وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ (ذاریات-۲) — اور فرشتوں نے اسکو ایک بڑے صاحبِ علم فرزند کی خوشخبری دی،

اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ (حجر-۴) — ہم تجھے ایک بڑے صاحبِ علم فرزند کی خوشخبری دیتے ہیں،

یہاں لفظ عَلِیْمٌ اختیار کیا گیا ہے، عالم نہیں، اور یہ لفظ عالم سے زیادہ علم پر دلالت کرتا ہے، ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ وحیِ مَوقت جو گاہ گاہ آتی ہے، اُس کے علاوہ علم کا ایک دائمی عطیہ بھی نبی کی شان ہے،

علم وحکم بہت سے انبیاؑ کے متعلق علم کے ساتھ حکم کا عطا ہونا بھی بیان ہوا ہے، حکم کے معنی لغت میں فیصلہ اور حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں، جس کا ترجمہ اردو میں سمجھ اور بوجھ کا نتیجہ (یعنی فیصلہ) کر سکتے ہیں، امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں:۔

وَالحکم بالشئ ان تقضی بالشئ	کسی شے پر حکم کرنا، یہ فیصلہ کرنا ہے کہ یہ شے
بانہ کذا او لیس کذا سواء الزمت	ایسی ہے، یا ایسی نہیں ہے، عام اس سے کہ اس فیصلہ
ذالک غیرہ او لم تلزمہ (ص ۱۲۶)	کا تم دوسرے کو پابند کر سکو، یا نہ کر سکو،

عربی لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں ہے،

الحکم العلم والفقہ والقضاء بالعدل (ج ۱۲ ص ۱۴۲) حکم کے معنی علم، سمجھ اور منصفانہ فیصلہ کرنا ہے،

ان انبیا علیہم السلام کو جن پر کسی کتاب کا نازل ہونا ثابت نہیں، اس علم اور حکم کا عطا ہونا ثابت ہے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ وحی کتاب کے علاوہ کسی اور عطیہ علم و حکم کی طرف اشارہ ہے، چنانچہ حضرت یوسفؑ کی شان میں ہے

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا	اور جب یوسفؑ جوانی کی قوت کو پہنچا تو
وَّعِلْمًا، (یوسف ۔ ۲۲)	ہم نے اسکو حکم اور علم دیا،

حضرت لوطؑ کے متعلق ہے،

وَلُوطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا (انبیاء ۹) اور لوط کو ہم نے حکم اور علم دیا،

حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کے ذکر میں ہے،

فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا (انبیاء ۶-۷) تو ہم نے سلیمان کو وہ فیصلہ سمجھایا اور ہر ایک کو ہم نے حکم اور علم دیا تھا،

حضرت یحییٰؑ کی نسبت ہے،

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا (مریم ۱۲) اے یحییٰ! کتاب (توراۃ) کو مضبوطی سے پکڑ اور ہم نے اسکو حکم بچپن میں عطا کر دیا،

ایک جگہ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل پر اپنی نعمتیں ان الفاظ میں شمار کرتا ہے،

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ (جاثیہ ۱۶) اور بلاشک ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکم اور نبوت دی،

اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اور حکم اور نبوت تین چیزیں ہیں، یہاں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ان آیتوں میں حکم سے مراد دنیاوی حکومت اور سلطنت ہے کہ اس معنی میں یہ لفظ خالص اور قدیم عربی میں نہیں آیا ہے، یہ اہل عجم کا محاورہ ہے قرآن نے ہر جگہ اس کو فیصلہ اور قوتِ فیصلہ کے معنی میں استعمال کیا ہے جیسے،

فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ (ص ۶) ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر،

فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (ص ۶) تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر،

وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ۭ (مائدہ ۴۲) اور تو انکے درمیان فیصلہ کرے تو انصاف کیساتھ فیصلہ کر،

حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ ایک مقدمہ کا فیصلہ کرتے ہیں،

وَدَاؤُدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ (انبیاء-۶) — اور داؤد اور سلیمان کو جب وہ دونوں کھیت کا فیصلہ کر رہے تھے،

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ط (شوریٰ-۲) — اور جس کسی چیز میں تم نے اختلاف کیا، تو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف ہے،

سب سے بڑھ کر یہ کہ یہی تین باتیں سورۂ انعام میں بہت سے پیغمبروں کے نام گنا کر کہی گئی ہیں،

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ج (انعام-۱۰) — یہ وہ لوگ تھے، جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت بخشی،

جن پیغمبروں کے نام اوپر گنائے گئے ہیں اور جن کی طرف وہ لوگ گنکر اشارہ کیا گیا ہے، یہ ہیں، ابراہیمؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ، نوحؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، ہارونؑ، زکریاؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ، الیاسؑ، اسمٰعیلؑ، الیسعؑ، یونسؑ، لوطؑ علیہم السلام، ان اٹھارہ ناموں میں "حکم" یعنی حکومت و سلطنت اگر ہو تو اس کے مستحق صرف دو ہیں، سلیمانؑ اور داؤدؑ اور چاہے کسی طرح کسی تاویل سے یوسفؑ اور موسیٰؑ کو بھی شامل کر لیجیے، باقی چودہ نام ان پیغمبروں کے ہیں، جن کو اس کا کوئی حصہ نہیں ملا تھا، اسلئے لامحالہ حکم کا لفظ قرآن میں عربیت کے اصلی اور صحیح و صریح معنی میں مستعمل ہے اور اس لفظ سے خدا کا جو مقصود ہے وہ کتاب کے ساتھ ساتھ ان پیغمبروں کو برابر حیثیت میں ملا تھا، غلط فہمی کا پردہ چاک کرنے کیلئے ایک اور آیت کریمہ پر نظر ڈالئے

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ — کسی بشر کے لئے یہ زیبا نہیں کہ اللہ اسکو

وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ	کتاب حکم اور نبوت دے، پھر وہ لوگوں سے
كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ	کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بنو،
كُوْنُوْا رَبَّانِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ	بلکہ جو تم کتاب (توراۃ) سکھاتے تھے اور
الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ،	جو تم پڑھتے تھے، اس کے ذریعہ سے تم
(آل عمران - ۸)	خدا والے بنو،

ان آیتوں میں مخاطب اہلِ کتاب ہیں اور جس مقدس بشر کا ان میں ذکر ہے بظاہر اس سے مراد حضرت عیسیٰؑ ہیں، وہ نہ ہوں تو خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہ اُس وقت کی بات ہے، جب یہود کی پوری قوت مدینہ کے اطراف اور حجاز میں موجود تھی، اور اسلام ہنوز ان کے مقابلہ میں کمزور و ناتواں تھا، ایسی صورت میں جس حکم کے ملنے کا ذکر ان آیتوں میں ہے، وہ کتاب اور نبوت ہی کی جنس کی کوئی چیز ہو سکتی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو تو حکومت و سلطنت کا ادنیٰ شائبہ بھی عطا نہیں ہوا تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اُس وقت تک جب بنی اسرائیل اپنی ممتاز قوت کے ساتھ مدینہ اور حجاز میں موجود تھے، یہ رتبہ نہیں ملا تھا آیت اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ میں بھی حکم سے مراد وہی فیصلہ اور قضائے ربانی ہے حکومت و سلطنت نہیں، تسکین کے لئے اس آیت کے آگے پیچھے کے الفاظ پر نظر ڈالو،

قُلْ اِنِّيْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَكَذَّبْتُمْ	کہدے (اے پیغمبر!) کہ میں اپنے پروردگار
بِهٖ مَا عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ	کی کھلی دلیل پر ہوں، اور تم اسکو جھٹلاتے
بِهٖ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ،	ہو، میرے پاس وہ نہیں جس کی تم جلدی

يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِيْنَ، (انعام - ۷)

کرتے ہو، فیصلہ کسی کا نہیں لیکن وہ کا وہ حق بیان کرتا ہے اور سب فیصلہ کرنے والوں سے وہ بہتر ہے،

ان وجوہ سے اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ انبیاء علیہم السلام کو منصب نبوت اور وحیِ کتاب کے ساتھ حکم کی سند بھی ملتی ہے، جس کے صاف و صریح معنی کلام عرب اور لغت اور قرآن کے قرینوں سے علم و فہم، فیصلہ، اور حق و باطل میں تمیز ہے، اور اس لئے رسول کی اس قوت و طاقت کے نتائج بھی ہمارے لئے واجب العمل ہیں،

شرح صدر | ربانی علم و معرفت کا ایک اور مقام شرح صدر کا ہے، شرح صدر کے معنی "سینہ کھولنے" کے ہیں، عام خیال یہ ہے کہ سینہ کی تنگی اور ضیق، جہل و نادانی کی علامت ہے اور سینہ کی کشادگی اور فراخی علم کی کہ وسعت اور معرفت کی فراوانی پر دلالت کرتی ہے، اسی لئے شرح صدر کے اصطلاحی اور مجازی معنی علم کی کثرت اور آگاہی کی وسعت کے ہیں، اور خاص طور سے اس علم و معرفت اور اطلاع و آگاہی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، جو کسی دقیق اور مشکل مسئلہ کے متعلق دفعۃً اور یک بیک قلب میں وارد ہو جاتی ہے اور اس حل سے اسکی تسلی و تسکین ہو جاتی ہے، اور اس کے شکوک و شبہات دور ہو کر اسکو یقین کی راحت و مسرت حاصل ہو جاتی ہے، جمہرہ ابن درید میں ہے،

وَالشرح من قولهم شرحت لك الامر ..... اى اوضحته و كشفته

شرح اہل عرب کے اس محاورہ سے ہے کہ میں نے تیرے لئے بات کی شرح کر دی یعنی اسکو واضح

وشرح اللہ صدرہ فانشرح اذا تسع لقبول الخیر، (۲ - ۳۴)

کر دیا، اور کھول دیا، اور اللہ نے اسکے سینہ کو کھول دیا تو وہ کھل گیا یعنی جب نیکی کے قبول کرنے کیلئے وسیع ہو گیا،

صحاح جوہری میں ہے،

الشرح الکشف تقول شرحت الغامض اذا فسرتہ،

شرح یعنی کشف (کھولنا) تم کہتے ہو میں نے اس پوشیدہ مسئلہ کی شرح کر دی یعنی اس کی تفسیر کر دی

لسان العرب میں ہے،

الشرح الکشف یقال شرح فلا امری اوضحہ وشرح مسئلۃً مشکلۃً بینھا، وشرح الشئ بشرحہ شرحاً وشرحہ فتحہ بینہ وکشفہ وکل ما فتح من الجواھر فقد شرح ایضاً تقول شرحت الغامض اذا فسرتہ.....

شرح یعنی کشف ہے، کہا جاتا ہے کہ فلاں نے اسکی بات کی شرح کر دی یعنی اسکو واضح کر دیا اور مشکل مسئلہ کی شرح کر دی یعنی اسکو بیان کر دیا، اور کسی چیز کی شرح کر دی یعنی تفصیل کر دی اور کھول دیا، اور جواہر میں سے جو کھولا جائے تو اسکی شرح کی گئی، تم بولتے ہو پوشیدہ مسئلہ کی شرح کر دی، یعنی تفسیر کر دی

.... وشرح اللہ صدرہ لقبول الخیر بشرحہ شرحاً فانشرح وسعہ لقبول الحق فاتسع،

.....اور خدا نے اسکے سینہ کو کھول دیا کسی نیک بات کے قبول کرنے کیلئے تو وہ کھل گیا یعنی اس کو قبول حق کے لئے وسیع کر دیا تو وہ وسیع ہو گیا

قال ابن الاعرابی الشرح الحفظ والشرح الفتح والشرح البیان والشرح الفهم

ابن اعرابی نے کہا، شرح کے معنی ہیں یاد رکھنا، کھولنا، بیان کرنا سمجھنا،

قرآن مجید میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نبوت کا منصب ملتے وقت دعا مانگی

رَبِّ اشْرَحْ لِی صَدْرِی وَیَسِّرْ لِی أَمْرِی وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِی یَفْقَهُوا قَوْلِی، (طٰہٰ - ۲)

اے میرے رب! میرے سینہ کو میرے لئے کھول دے اور میرے کام کو میرے لئے آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ لوگ میری

دعا کے پہلے جملہ میں حضرت موسیٰؑ نے اپنے لئے شرح صدر کی استدعا کی ہے اور آخر میں فصاحت بیان کی، یعنی اول میں صحیح معنی کے القاء اور آخر میں ان کیلئے صحیح الفاظ کے انتخاب کی دعا کی ہے تاکہ ان کی دعوت و تبلیغ کو مخاطب سمجھ سکیں لیکن یہ دولت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بن مانگے ملی، خدا نے فرمایا،

أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ، (انشراح - ۱)

کیا ہم نے (اے محمد!) تیرے لئے سینہ کو کھول نہیں دیا، اور تیرے بوجھ کو تجھ سے اتار لیا،

شرح صدر اور سینہ کھولنے کی جو تشریح احادیث صحیحہ میں مذکور ہے اسکے لئے علم اصطلاح شق صدر ہے، یعنی عالم رویا، یا بیداری میں فرشتوں نے آکر سینۂ مبارک کو واشگاف کیا، اسکو آب زمزم سے دھویا، اور سونے کے طشت میں ایمان اور حکمت بھر کر لائے اور ان سے سینۂ مبارک کو معمور کر کے شگاف کو برابر کر دیا[1]، اگر یہ واقعہ اپنی ظاہر حقیقت پر محمول کیا جائے

[1] صحیح بخاری و صحیح مسلم و نسائی ابواب معراج و اسراء و فرائض الصلوٰۃ و مسند احمد بروایت انس بن مالک و سنن ترمذی تفسیر سورۂ انشراح

تو بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ سینۂ مبارک کو واقعتاً چاک کرکے اور زمزم کے پانی سے پاک وصاف کرکے ایمان اور حکمت اس میں بھری گئی اور اگر تمثیل کے رنگ میں لیا جائے، تو بھی یہ حقیقت ماننی پڑیگی کہ سینہ صافی ایمان وحکمت سے معمور کیا گیا، بہرحال شرحِ صدر کی حقیقت ایمان اور حکمت کی ربانی بخشش ہے،

شرحِ صدر کے اس مذکورۂ بالا معنی کو جو شقِ صدر کے واقعہ کی تفصیل سے واضح ہے، اگر کوئی تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہو تو بھی بحمداللہ کہ اسکی تسکین کا سرمایہ قرآن پاک میں موجود ہے، سورۂ زمر میں ہے،

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۔	بھلا جس کا سینہ اللہ نے اسلام کیلئے کھولدیا تو وہ اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشنی میں ہے،

اسلام کے لیے سینہ کے کھول دینے سے مقصود یہ ہے کہ اسلام کی حقیقت موثر طریقہ سے اس پر اس طرح کھل گئی کہ اسکو اسلام کی سچائی کا پوری طرح یقین آگیا، اور اسکو اپنے اس یقین پر کامل تسکین حاصل ہوگئی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسکو اپنی منزل مقصود کے ہر قدم پر اللہ کی روشنی حاصل ہے، یہی "شرحِ صدر" کی حقیقت ہے، اور اس روشنی کی کمی وبیشی درجوں اور منصبوں کے مطابق ہوتی ہے،

اس سلسلہ میں حدیث کے دو ایسے موقعوں کا ذکر کرنا ہے، جن سے لفظ "شرحِ صدر" کے معنی کی پوری تشریح ہو جاتی ہے، یہاں یہ نکتہ پیشِ نظر رہے کہ ان حدیثوں سے معنوی احتجاج یہاں مقصود نہیں، بلکہ صدرِ اول کے کلام عرب سے شرحِ صدر کے محاورہ کی تشریح مقصود ہے،

۱۔ پہلا واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عرب کے بعض قبیلے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کرتے ہیں، حضرت ابوبکر صدیقؓ ان پر فوج کشی کا ارادہ کرتے ہیں، حضرت عمر فاروقؓ آکر عرض کرتے ہیں کہ یا خلیفۂ رسول اللہ! ان سے جہاد کیونکر ممکن ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس نے لا الہ الا اللہ کہا اس نے اپنی جان و مال کو مجھ سے بچا لیا، حضرت صدیقؓ جواب دیتے ہیں، خدا کی قسم! میں اس سے لڑونگا، جو زکوٰۃ اور نماز میں فرق کرتا ہے، نماز خدا کا حق ہے، اور زکوٰۃ بندوں کا حق ہے، اگر وہ بکری کا ایک بچہ بھی جس کو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دیتے تھے، اب نہ دیں گے تو میں ان سے لڑوں گا، اس کے بعد حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:۔

فَوَاللّٰہِ مَا ھُوَ اِلَّا اَن قَد شَرَحَ	تو خدا کی قسم، نہ تھا یہ لیکن یہ کہ کھول دیا
اللّٰہُ صَدرَ اَبِی بَکرٍ فَتَ	تھا اللہ نے ابوبکرؓ کے سینہ کو، تو میں جانا
اِنَّہُ الحَقّ، (بخاری کتاب الزکوٰۃ)	یہ وہی حق ہے،

۲۔ دوسرا واقعہ ہے کہ جنگِ یمامہ میں قرآن کے بہت سے حافظ شہید ہوئے، اُس وقت حضرت عمرؓ نے آکر حضرت ابوبکر صدیقؓ کو مشورہ دیا کہ قرآن پاک کو ایک ترتیب سے کاغذ پر لکھ لیا جائے، حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ میں وہ کام کیونکر کروں جس کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، لیکن حضرت عمرؓ اپنے مشورہ کے بہتر ہونے پر اصرار کرتے رہے، یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ کی سمجھ میں بھی بات آگئی، اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ کہتے ہیں:۔

فلم یزل عمر یراجعنی حتی شرح اللہ صدری لذلک ورأیت ذلک الذی رای عمر (صحیح بخاری)

تو عمرؓ بار بار مجھ سے کہتے رہے، یہانتک کہ خدا نے اس کیلئے میرے سینہ کو کھولدیا، اور میں نے بھی وہی دیکھا جو عمرؓ دیکھتے تھے،

ان دونوں موقعوں پر لفظ شرح صدر اپنے استعمال کا محل اور اپنی حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے، یہی شرح صدر ہے، جس کو قرآن نے جیسا کہ اوپر سورۂ زمر کے حوالہ سے گذرا، نور ربانی یا نور بصیرت کہا ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شرح صدر کی جو وسعت عطا ہوئی تھی، اس کے سمجھنے سے پہلے بلاغت کا ایک مسئلہ سمجھ لینا چاہیئے جب کوئی لفظ متعلقات کے صلہ اور مفعول کے ساتھ مقید ہو کر بولا جاتا ہے، تو اس سے معنی کی تخصیص و تحدید ہو جاتی ہے لیکن وہی لفظ جب متعلقات کے صلہ اور مفعول کی قید کے بغیر بولا جائیگا، تو وہ عموم کے ساتھ فعل کے ثبوت کا فائدہ دیگا مثلاً علم (جاننا) مفعول کو چاہتا ہے، جس چیز کا علم ہوتا ہے، اس کو عبارت میں مفعول بناتے ہیں، اور اس عبارت میں اُس علم سے مقصود اسی خاص شے کا علم ہوتا ہے جس کو مفعول بنایا ہے، لیکن اگر مفعول کو حذف کر دیں تو اس کا مقصد کسی خاص علم کے بجائے مطلق اور عام علم کا ثبوت ہوگا، ایک جگہ قرآن میں ہے، یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (روم) وہ جانتے ہیں کا ظاہری پہلو جانتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس علم کا تعلق صرف ایک چیز کے علم سے ہے، یعنی دنیا کی ظاہری زندگی کے علم سے، عام علم سے نہیں، لیکن دوسری جگہ ہے، هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ، کیا جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے (یعنی جو علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے)

دونوں برابر ہو سکتے ہیں"، یہاں یہ ذکر نہیں کہ کس خاص بات کو جانتے ہیں بلکہ مقصود عام علم ہے، تو یہاں معنی یہ ہونگے کہ جو ہر طرح کے علم والے ہیں اور جو مطلق بے علم ہیں دونوں برابر نہیں ہو سکتے"، بلاغت کی کتابوں میں هُوَ يَامُرُ وَيَنْهٰى وَيُعْطِى وَيَمْنَعُ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى کی مثالوں سے اس مفہوم کی توضیح کی گئی ہے،

اس تمہید کے بعد شرح صدر کے گذشتہ استعمالوں اور مثالوں پر نظر ڈالئے، ہر جگہ آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ جس بات کے سمجھنے کے لئے سینہ کھولا جاتا ہے، اس پر لام آتا ہے یا قرینہ سے سمجھا جاتا ہے کہ مثلاً اسلام کے لئے سینہ کھول دیا، جمع قرآن کے لئے سینہ کھول دیا، مانعینِ زکوٰۃ کے قتال کے لئے سینہ کھول دیا، مگر حضرت موسیٰؑ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے قرآن میں جس شرح صدر کا ذکر ہے، اس میں اُس بات کا ذکر نہیں ہے، جس کیلئے ان انبیاء علیہم السلام کے سینے کھولے گئے، اس سے یہ مقصود ہے کہ ان انبیاء کو امورِ دین میں مطلق اور عمومی شرحِ صدر عنایت ہوا اور یہیں سے عام امت اور انبیاءؑ کے فرقِ مراتب کا اظہار ہوتا ہے کہ امت کے عام افراد کو خاص خاص امور کے سمجھنے کیلئے شرحِ صدر ملتا ہے، اور انبیاءؑ کو اپنے دائرہ میں کلی اور عمومی حیثیت سے یہ چیز عنایت ہوتی ہے،

ایک اور لطیف پہلو بھی یہاں ذکر کے قابل ہے، حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کی دعا اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر احسان دونوں موقعوں پر لی اور لک ہی، حضرت موسیٰؑ کہتے ہیں، میرے لئے میرے سینہ کو کھول دے"، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا میں نے تیرے لئے تیرے سینہ کو کھول نہیں دیا"، سوال یہ ہے کہ "میرے لئے" اور

"تیرے لئے" کے اضافہ کی ضرورت اور اس "لام" کی حاجت کیا تھی؟ مفسرین میں امام زمخشریؒ نے اس سوال کے جواب دینے کی کوشش کی ہے، اور لکھا ہے کہ یہ صرف تاکید کے لئے ہے، حالانکہ یہ لام تملیک کے بجائے لام افادہ ہے، جیسا کہ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا میں ہے، مقصد یہ ہے کہ یہ شرح صدر کی دولت تجھکو تیرے لئے ملی ہے، یعنی تیرے کشف علم کیلئے یا تائید کیلئے یا فائدہ کے لئے اور یہ کشف علم اور شرح صدر خود تیری ذات کیلئے ہے، کہ وہ کامل سے کامل تر ہو کر ظاہر ہو

اب آخری سوال یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دین کا جو یہ عمومی شرح صدر عنایت ہوا، اس کا کوئی اثر و نتیجہ بھی تو نمایاں ہوگا؟ دراصل اسی کے یہ آثار و نتائج ہیں جو افعال و اقوال اور "احادیث و سنن" کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں،

تبیین کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں جس شریعت کو لیکر آئے، وہ آخری اور ابدی تھی اور ایسی آخری اور ابدی شریعت کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ زیادہ تر زور شریعت کے کلی اور ابدی اصول و مبادی پر دے، چنانچہ اس آخری وحی الٰہی نے اپنی کتاب کو صرف اصول و کلیات تک محدود رکھا اور جزئیات کے لئے اپنی آیتوں میں ایسے اشارے رکھے جنکے سہارے سے دل جو علم و معرفت سے پُر نور اور حکم و حکمت سے معمور اور شرح صدر اور تائید ربانی سے فیض یاب ہوں، وہ علیٰ قدر مراتب جزئیات کو صحیح طور سے جان لیں، چنانچہ یہ رتبہ سب سے پہلے خود نبیؐ کو ملا، اور چونکہ وہ خطا سے معصوم ہے، اسلئے اسکے اس منصب کے نتائج بھی خطا سے محفوظ ہیں، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے یہ منصب خلفائے راشدین، اکابر صحابہؓ ائمہ تابعین و تبع تابعین مجتہدین عظام اور علمائے اعلام کو ہمیشہ ملتا رہا، اسی کا اصطلاحی نام اجتہاد ہے، جس کو ہر زمانہ کے

فیضیابانِ علومِ نبوت اور حاملینِ اسرارِ شریعت خدا کی دی ہوئی بصیرت کے مطابق اسکی وحی کی روشنی میں ہمیشہ انجام دیتے رہے ہیں، اور دیتے رہیں گے، یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی توضیح و تفسیر کی ذمہ داری بھی خود اپنے اوپر لی ہے، فرمایا،

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ط اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ، (قیامہ-۱)

تو قرآن کی وحی کے ساتھ اپنی زبان کو اس غرض سے حرکت نہ دے تاکہ تو اسکی تلاوت و اشاعت میں جلدی کرے، بیشک ہم پر ہے قرآن کو جمع کرنا اور اسکو پڑھانا، اور جب ہم نے اسکو پڑھا دیا تو تو اسکی پڑھائی کی پیروی کر، پھر اس بیان و شرح کی ذمہ داری بھی ہم پر ہے،

اس بیان و شرح کی ذمہ داری کبھی بذریعہ وحی ادا ہوئی ہے جو قرآن میں مذکور ہے، کبھی رسول کی تقریر و عمل سے پوری ہوئی ہے جو عملی تواتر سے منقول اور احادیث و سنن کے مستند دفتر میں موجود ہے، یہ امر کہ اس بیان و شرح کی طاقت اور اس شرح و بیان کا اختیار رسول کو خدا کی طرف سے عطا ہوا تھا حسب ذیل آیت سے ثابت ہے،

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (نحل-۶)

اور ہم نے تیری طرف یہ نصیحت (کی کتاب) اتاری، تاکہ لوگوں کی طرف جو اتارا گیا ہے تو اسکو کھول کر بتا دے شاید وہ سوچیں،

"بیان لو تبیین" کے لفظی معنی کھولنے اور واضح کرنے کے ہیں، اور ان کا استعمال دو معنوں میں ہوتا ہے، ایک اعلان، اور اظہار کے معنی میں یعنی اخفا کے مقابل، دوسرے توضیح و تفسیر

کے معنی میں قرآن پاک میں یہ لفظ "تبیین" اپنے دونوں معنوں میں آیا ہے، اب یہ تمیز کہ کس آیت میں کیا معنی مراد ہیں، سیاق و سباق اور موقع و محل سے ہو سکتی ہے، مثلاً ایک جگہ قرآن پاک میں ہے،

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ	اے کتاب والو! تمہارے پاس ہمارا رسول
رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِمَّا	آیا کہ کتاب کی جو باتیں تم چھپاتے تھے وہ
كُنْتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَ	ان کو تمہارے لئے ظاہر کرے اور بہت
يَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ، (مائدہ ۳۰)	سی باتوں سے درگذرے،

یہاں "تبیین" صریح طور سے اخفا کے مقابلہ میں ہے، اس لئے یہاں "تبیین" کے معنی یقیناً ظہور و اظہار و اعلان کے ہیں، لیکن یہی لفظ دوسری جگہ سورۂ نحل میں اس طرح آیا ہے،

وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا	اور ہم نے تجھ پر کتاب نہیں اتاری لیکن
لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا	اسلئے تاکہ تو واضح کر دے اسکو جس میں
فِيهِ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِقَوْمٍ	انھوں نے اختلاف کیا، اور ایمان والوں کیلئے
يُؤْمِنُونَ، (نحل ۔ ۸)	رہنمائی اور رحمت بنا کر اس کو اتارا،

اختلاف کے مقابلہ میں اظہار اور اعلان کی نہیں بلکہ توضیح و تشریح کی ضرورت ہے کہ جس امر میں اختلاف ہو وہ اس توضیح و تفسیر کے بعد دور ہو جائے، اب پہلی آیت پر غور کرنا چاہیے جو اسی سورہ میں ایک اور مقام پر ہے،

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ	اور ہم نے اے پیغمبر تیری طرف نصیحت

لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ، (نحل - ۶)	کی کتاب (قرآن) کو اُتارا، تاکہ لوگوں کی طرف جو اتارا گیا، تو اسکو ان کیلئے کھول کر بتادے شاید کہ وہ سوچیں،

سوال یہ ہے کہ اس آیتِ پاک میں بیان کرنے کے معنی ظاہر کرنے کے ہیں یا تشریح تفصیل کرنے کے؟ ہمارا دعویٰ ہے کہ ظاہر کرنے کے بجائے یہاں غور و فکر کی مناسبت اور قرینہ کے سبب سے تشریح و تفصیل کے معنی لینا صحیح ہے، امر مخفی کا اظہار سننے اور ماننے کے تو مناسب ہو سکتا ہے مگر سوچنے نے نہیں، سوچنے اور غور و فکر کرنے کے لئے یہاں تشریح و تفصیل کی ضرورت ہے نہ کہ اظہار و اعلان کی، اب جبکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے تفصیل و تبیین کا منصب خدا کی طرف سے ثابت ہے، تو اس تفصیل و تبیین کی پیروی اور اتباع بھی خدا ہی کے احکام کی پیروی ہوگی اور آپ کی یہ تبیین و تشریح آپ کے نورِ حکمت کا فیضان ہوگا جسکے اشارے خود کتاب الٰہی کے اندر آپکو موجود نظر آتے تھے،

اردو انسانی الفاظ میں یہ قدرت نہیں کہ اُن کے ذریعے کوئی ایسا قانون وضع کیا جاسکے جو ایک طرف اختلافِ فہم سے محفوظ رہے اور دوسری طرف اُس میں یہ وسعت ہو کہ تمام آئندہ پیش آنے والے واقعات پر جن کے جزئیات کی کوئی حد نہیں، پوری طرح حاوی ہو سکے لیکن فہم انسانی کے اختلاف کے جو نقائص قانون میں ہوتے ہیں گو ان کو تمامتر دور نہیں کیا جاسکتا تاہم ان کو کم کیا جاسکتا ہے، اسلام نے اپنے قانون الٰہی سے جو ہر جہاں انسانی بول چال کے الفاظ میں ہے، اس اختلاف فہم کے نقص کو کم کرنے کے لئے یہ کیا کہ اپنے رسول کی معرفت زبانی اور عملی طور سے اسکی تشریح و تبیین کرا دی، گو انسانی ذرائع حفظ و روایت کی فطری کمزوریوں

کے سبب سے اس تشریح و تبیین میں بھی اختلافِ فہم پیدا ہو گیا، مگر یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اگر یہ تشریح و تبیین نہ ہوتی تو اختلافات کی خلیج اس سے بھی زیادہ عمیق اور وسیع ہوتی،

روزمرہ کے پیش آتے رہنے والے جزئیات کے فیصلہ کی یہ صورت رکھی گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں روزانہ اس قسم کے واقعات اور مقدمات پیش ہوتے رہتے، اور آپ وحیِ کتاب کے اصول و کلیات کے ماتحت اپنے نورِ بصیرت اور فہم حکمت سے انکے فیصلے فرماتے رہتے، خلفاے راشدینؓ نے اپنے اپنے عہد میں ان نو بنو اور تازہ بتازہ واقعات کے فیصلوں کیلئے اولاً وحی کتابی کو اور اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان قضایا اور فیصلوں کو جو فہم نبوت، نورِ بصیرت اور ارادت الٰہی کے ذریعہ فیصل ہوئے تھے اپنا ماخذ قرار دیا اور یہی اصول بعد کے فقہاء اور مجتہدین نے اختیار کیا اور ہر نئے واقعہ کو وحی کتاب اور فیصلۂ نبوی کے معصوم و مسلم معیار پر جانچ کر ان میں سے کسی نہ کسی مماثل اور مشابہ فیصلہ پر قیاس کر کے اپنے فیصلے دیئے اور جو چیزیں ان میں نہ ملیں انکو معمولی عدل و انصاف، رسم و رواج، عقل و فکر و استحسان وغیرہ کے اصول پر سمجھ کر انکا فیصلہ کیا، یہی مجموعہ آج فقہ اسلامی کہلاتا ہے،

وحیِ الٰہی قرآن پاک میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قضایا اور فیصلے احادیث و سنن کی صحیح روایتوں میں محفوظ ہیں، وحی الٰہی کی صداقت میں تو کلام نہیں ہو سکتا، اب رہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قضایا اور فیصلوں کی پیروی، تو اسکے متعلق بھی وحیِ الٰہی ناطق ہے،

اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الْکِتَابَ بِالْحَقِّ	ہم نے (اے پیغمبر!) تیری طرف سچائی کے
لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَا اَرٰکَ اللّٰہُ	ساتھ کتاب اتاری تاکہ لوگوں کے درمیان جو تجھکو

(نساء ۶-۱۶) اللہ سوجھائے اسکے ذریعہ فیصلہ کرے،

اس کتاب الٰہی کے نزول کی غرض ہی یہ بتائی گئی ہے کہ تو اے پیغمبر! اسکے احکام اور قوانین کو لیکر اُس فہم کے ذریعہ جو کچھ اللہ تعالیٰ تجھ کو سوجھائے، اور دکھائے تو لوگوں کے درمیان فیصلہ اور انصاف کرے، اللہ تعالیٰ کا اپنے پیغمبر کو یہی سوجھانا اور دکھانا جو کچھ تھا، وہ آپؐ کے عمل اور قضایا اور فیصلوں کی صورتوں میں محفوظ ہے، اور اسلام کے قانون کا وحی الٰہی کے بعد دوسرا ماخذ ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عدل و انصاف پر خود منافقین تک کو بھروسہ تھا، چنانچہ ان کا قاعدہ تھا کہ جب اُن کا حق کسی پر ہوتا تو وہ دوڑے ہوئے عدالت نبویؐ میں حاضر ہوتے، کیونکہ سمجھتے تھے کہ یہ حق آپ ہی کی عدالت سے ہمکو ملے گا لیکن جب ان پر کسی کا حق نکلتا تو وہ ٹال جاتے اور دوسرے طریقہ سے فیصلہ چاہتے، اس پر اللہ تعالیٰ نے اُن کی سرزنش کی،

وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ	اور جب وہ اللہ تعالیٰ اور رسول کی طرف
لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ	بلائے جائیں کہ رسول انکے درمیان فیصلہ
مُّعْرِضُوْنَ وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا	کردے، تو ان میں سے کچھ لوگ منہ موڑتے ہیں اور
اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ	اگر انکو کچھ حق پہنچتا ہو تو فرماں بردار بنکر رسول
مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ	کے پاس چلے آئیں، کیا انکے دل میں بیماری
يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ ۭ بَلْ	ہے یا وہ شک میں ہیں یا ڈرتے ہیں کہ خدا
اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ اِنَّمَا كَانَ	اور اور اسکا رسول انکے ساتھ ناانصافی کریگا

قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذَا دُعُوْا إِلَى اللّٰهِ	بلکہ وہی لوگ بے انصاف ہیں، ایمان والوں
وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَّقُوْلُوْا	کی بات یہ تھی کہ جب ان کو خدا اور رسول
سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأُولٰٓئِكَ هُمُ	کی طرف بلایا جائے تاکہ وہ ان کے درمیان
الْمُفْلِحُوْنَ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ	فیصلہ کردے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور مان
وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولٰٓئِكَ	لیا، انہی لوگوں کا بھلا ہے، اور جو کوئی اللہ
هُمُ الْفَآئِزُوْنَ، (نور۔۷)	کے اور اسکے رسول کے حکم پر چلے اور اللہ سے ڈرتا

ان آیات سے معلوم ہوا کہ رسول کے تمام فیصلے منصفانہ ہوتے تھے، اور رسول کے فیصلوں کی اطاعت خود خدا کے حکم کی اطاعت ہے، بلکہ ایمان کی دلیل اور نشانی ہے،

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى	تو قسم ہے تیرے رب کی، وہ مومن نہ ہونگے
يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ	جب تک وہ تجھے اپنے جھگڑوں کا منصف
لَا يَجِدُوْا فِيْٓ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا	بنائیں اور پھر جو تو فیصلہ کرے اس سے اپنے دل
قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (نساء۹)	میں خفگی نہ پائیں اور پوری طرح تسلیم کریں
وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ	اور مومن مرد یا مومن عورت کا یہ کام نہیں کہ
إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ أَمْرًا أَنْ	جب اللہ اور اس کا رسول فیصلہ کردے
يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ	تو انکو اپنے کام کا اختیار رہے، اور جس نے
وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ	اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی
ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا، (احزاب۵)	وہ کھلا گمراہ ہوا،

یہ اطاعت، اور مطلقاً سرافگندگی اور تمام فیصلوں کے قطعی حق اور منصفانہ فیصلہ ہونے کی ربانی ذمہ داری ہر حاکم وقت اور سلطان زمانہ کے لئے نہیں، یہ انبیاءؑ کے لئے خاص ہے، دو شخصوں کے باہمی جزئی و شخصی مقدمات کا فیصلہ ظاہر ہے، کہ خود اللہ تعالیٰ وحیِ قرآنی کے ذریعہ نہیں کرتا تھا، بلکہ رسول کے فہمِ نبوت، نورِ نبوت، فیضِ حکمت، شرحِ صدر، تبیینِ حقیقت اور (رویت دکھانا اور سوجھانا) کے ذریعہ فرماتا تھا، لیکن کلیات کی حیثیت سے وہ یقیناً وحیِ قرآنی کے مطابق ہوتا تھا، اور ان کلیات کے مطابق ان جزئیات کا فیصلہ خود اللہ تعالیٰ آپ کو سوجھاتا تھا،

آپ کے ان قضایا اور فیصلوں کی رضامندانہ اطاعت ہر مسلمان پر قیامت تک ضروری ہے، آپ کی زندگی کے بعد ان فیصلوں کی اطاعت یہ ہے کہ اُس قسم کے مقدمات اور معاملات میں ہم وہی فیصلے جاری کریں جو آپ نے اپنی زندگی میں انکے متعلق کئے کہ آپ کے فیصلے بحکم خدا غلطی سے پاک، ظلم سے بری، اور بے انصافی سے منزہ تھے، اور دنیا میں رسول کے سوا کسی انسان کو اس بے گناہی اور عصمت کا درجہ اور رتبہ حاصل نہیں،

رسول کا وجود مستقل ہدایت ہے اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو امام و پیشوا اور ہادی و رہنما فرمایا ہے یعنی نبوت اور وحی سے سرفراز ہونے کے بعد ان کی ذات مجسم ہدایت و رہنمائی اور امامت و پیشوائی کے لئے خاص ہو جاتی ہے، اُن کی بعثت اسی لئے ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی فرمائیں، اور ان کو ضلالت و گمراہی سے بچائیں، جس امت میں مبعوث ہوتے ہیں، اسکے سامنے ہدایت و رہنمائی کے دو چراغ روشن ہوتے ہیں، ان دونوں کی روشنی مل کر ایک ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو جنھیں یہود اپنی شرارت اور سازش سے گمراہ بنانا چاہتے تھے، خطاب کرکے فرماتا ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا	اے مومنو! اگر تم اہل کتاب کے کسی گروہ کا
مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ	کہا مانو گے تو وہ ایمان لا چکنے کے بعد تمھیں
اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ	مرتد کرکے کافر بنا دیں گے، اور تمکو کیونکر کفر ہو
وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَ	چاہیے درآنحالیکہ تمکو اللہ کی آیتیں سنائی
فِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ (آل عمران - ۱۰)	جاتی ہیں اور تم میں اللہ کا رسول موجود ہے

آیت کے آخری ٹکڑے سے ثابت ہوا کہ کفر سے بچانے والی دو مستقل چیزیں مسلمانوں کے پاس تھیں، ایک تو آیاتِ الٰہی جو ان کو سنائی جاتی تھیں اور دوسری خود رسول کا مستقل وجود جو اپنی تعلیم و تلقین فیضِ صحبت اور اثر سے اُن کو بھٹکنے نہ دیتا، اور ضلالت سے مانع آتا تھا، اگر صرف کتاب الٰہی اس کام کو انجام دے سکتی، تو رسول کے ذکر کی حاجت، بلکہ خود بعثت کی ضرورت کیا تھی، اس سے یہ واضح ہوا کہ اللہ کی کتاب صامت (قرآن) اُس کی کتاب ناطق (رسول) سے مل کر اپنے فریضہ کو انجام دیتی ہے، اور غالباً اس حدیثِ صحیح کے بھی یہی معنی ہیں، جس کا اعلان آپ نے حجۃ الوداع سے واپسی میں اپنی وفات سے کچھ مہینوں پہلے فرمایا،

انی تارك فیكم الثقلین كتاب	مسلمانو! میں تمھارے درمیان دو چیزیں چھوڑ
اللہ وسنتی،	جاتا ہوں اللہ کی کتاب اور اپنی سنت یعنی

ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کا ظاہری وجود مٹ گیا، مگر آپ کی عملی زندگی جس کو سنت کہتے ہیں، قائم و باقی ہے، اور وہ بھی قرآن کے بعد ہماری ہدایت کا دوسرا سرچشمہ ہے،

تزکیہ | انبیاء علیہم السلام کا عموماً اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصاً ایک اور امتیازی وصف تزکیہ ہے، تزکیہ کے معنی پاک وصاف کرنے کے ہیں، نبوتِ محمدیہ کے اس وصف کا ذکر ان آیتوں میں ہے، جن میں آپ کی یہ توصیف کی گئی ہے "ایک رسول جو لوگوں پر خدا کی آیتیں تلاوت کرتا ہے، اور انکو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اور انکو پاک صاف کرتا ہے" ظاہر ہے کہ آپ کا یہ تیسرا وصف دو پہلے اوصاف سے الگ ہے، یہ پاک صاف کرنا آیاتِ الٰہی کی تلاوت اور کتاب وحکمت کی تعلیم کے بعد نبی کی عملی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے کہ آپ کی تعلیم وتربیت، فیضانِ صحبت، حسنِ اخلاق، پند وموعظت اور تبلیغ ودعوت کی تاثیر سے برے اچھے، بد نیک اور اشرار اخیار بنجاتے ہیں،

انبیاء علیہم السلام کی ہر تاریخ اس واقعہ کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ گمراہ اور بدکار قوموں میں مبعوث ہوئے، ہر طرح کی اذیتیں اٹھائیں، تکلیفیں سہیں، مصیبتیں جھیلیں اور آخر تاریکی کو روشنی سے، جہالت کو علم سے اور کفر کو توحید سے بدل کر رہے، اور مدت تک اُن کی تاثیر کا فیض جاری رہا، اُن کا یہ وصف تزکیہ وحیِ والہام کے علاوہ ان کے جسم وجان اور زبان ودل کی کیمیا اثری کا نام ہے، خواہ انکی زبان اُس وقت وحیِ الٰہی سے مترنم ہو یا خاموش، ہر آن آفتابِ حق کی کرنیں مطلعِ نبوت سے نکل نکل کر دلوں کی سرزمین کو روشن کرتی رہتی تھیں،

نور | اسی لئے نبوت کا سینہ صدق وصفا کا آئینہ ہوتا ہے، نبی کا مجسم پیکر ظلمت کدۂ عالم کا چراغ اور علم وہدایت کا مطلع نور ہوتا ہے، جس طرح اس کا صحیفۂ الہامی اور وحیِ ربانی نور ہوتی ہے وہ خود بھی سراپا نور ہوتا ہے، جس سے اندھے دیکھتے، گمراہ راہ پاتے اور ان کے طالبِ روشنی حاصل کرتے ہیں، خود آپ کو مخاطب کرکے فرمایا گیا،

يَا اَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّا اَرْسَلْنَاكَ	اے نبی! ہم نے تجھ کو بتلانے والا، خوشخبری سنانے
شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا لَّا وَدَاعِيًا	والا، چوکنا کرنیوالا، خدا کی طرف اسکے حکم سے
اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا (احزاب ۶)	بلانے والا اور روشن کرنیوالا چراغ بنا کر بھیجا

یہ آس پاس کی چیزوں کو روشن کرنے والا چراغ خود رسولؐ کی ذات ہی، سوال یہ ہی کہ اگر آپکے جسم وجان، زبان ودل، خلق وعمل، علم وفہم میں روشنی نہیں تو آپ کی ذات جو ان ہی چیزوں کا مجموعہ ہے، روشن چراغ کیونکر ثابت ہوگی، اور جب آپؐ کی ذاتِ مبارک کی یہ تمام چیزیں انوار الٰہی ہیں، تو اُن انوار میں سے ہر نور کی روشنی میں چلنا ہدایت ہے اور ان میں سے کسی سے قطع نظر کرنا بھی ظلمت کے ایک گوشہ میں قدم دھرنا ہے،

آیات وملکوت کی رویت جس طرح انبیاء علیہم السلام اپنی قوتِ سامعہ سے نداے غیب کو سنتے اور صداے وحی کی سماعت کرتے ہیں، اسی طرح ان کی آنکھیں بہت کچھ دیکھتی ہیں جو عام انسان نہیں دیکھتے، حضرت ابراہیمؑ کے ذکر میں ہے،

وَكَذَالِكَ نُرِيْٓ اِبْرَاهِيْمَ مَلَكُوْتَ	اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ	زمین کی مملکت دکھاتے تھے تاکہ وہ یقین
مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ (انعام۔ ۹)	کرنے والوں میں ہو،

استعداد نبوت کی تربیت اور نشو ونما کے لئے یہ رویت بصیرت کی مافوق قوت انکو عطا ہوئی، حضرت موسیٰؑ کو طور پر جو کچھ نظر آیا وہ جلوہ گری حسن وعشق کی مشہور کہانی ہی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہداتِ روحانی کا تذکرہ معراج کے تعلق سے ان الفاظ میں کیا گیا ہے،

لِنُرِيَهٗ مِنْ آيٰتِنَا (اسرائیل)

تاکہ ہم اس رسول بندہ کو اپنی نشانیاں دکھائیں

دوسری جگہ ہے،

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى اَفَتُمٰرُوْنَهٗ

دل جھوٹا نہیں بولا جو اس نے دیکھا، کیا اس

عَلٰى مَا يَرٰى وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً

پر اس سے جھگڑتے ہو؟ اور دوسری بار اس

اُخْرٰى، (نجم-۱)

کو اترتے دیکھا،

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى، لَقَدْ

نگاہ نہ بہکی اور نہ سرکش ہوئی، اس نے اپنے رب

رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى (نجم)

کی بڑی نشانیاں دیکھیں،

ایک اور مقام پر ہے،

وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ (تکویر)

اور اس نے یقیناً اسکو آسمان کے کھلے کنارے میں دیکھا،

یہ مشاہدہ وحی والہام کے علاوہ نبوت کے دوسرے حاسۂ بصارت کے امتیاز کو ظاہر کرتا ہے،

سماعِ غیب جس طرح آیات وملکوت کا مشاہدہ انبیاء کے حاسۂ بصارت کا امتیازی وصف ہے، اسی طرح غیب کی آواز اور وحی کی صدا کو سننا بھی ان کے حاسۂ سماعت کا خصوصی امتیاز ہے، قرآن پاک میں اسکی تصریحات موجود ہیں کہ انبیاء خدا سے ہم کلام ہوتے تھے اور وحی کو پاتے تھے، وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (نساء-۲۳) اور خدا نے موسیٰؑ سے بات کی،

حضور کو حکم ہوا،

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ

اور اس سے پہلے کہ قرآن کی وحی تجھ پر پوری ہو

يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ (طٰہٰ-۶)

قرآن کے پڑھنے میں جلدی نہ کر،

خدا نے پیغمبروں کو پکارا اور انھوں نے اس کی آواز میں سنیں "فَنَادَيْتَنَا" ہم نے پکارا، بار بار

یہ مضمون قرآن میں پیغمبروں کے متعلق آئے ہیں،

تبلیغ و دعوت | نبی کا سب سے پہلا اور اہم فرض تبلیغ اور دعوت ہے، یعنی جو سچائی اُس کو خدا سے ملی ہے اس کو دوسروں تک پہنچا دینا، اور جو علم اس کو عطا ہوا ہے، اس سے اوروں کو بہرہ ور کرنا، خدا کا جو پیغام اس تک پہنچا ہے، وہ لوگوں کو سنا دینا، اُس نے اس کو جس صداقت سے آگاہ کیا ہے، اُس سے اپنے ہم جنسوں کو باخبر کرنا، جو ذہنی، جسمانی، زبانی، دماغی، روحانی اور اخلاقی طاقتیں اس کو بخشی گئی ہیں، ان کو اس راہ میں صرف کرنا، اور اس سمجھانے بجھانے اور راہ راست پر لانے میں صداقت کی ہر تاثیر سے کام لینا، اُس اعلان اور دعوت میں جو تکلیف بھی پیش آئے، اسکو راحت جاننا، جو مصیبت بھی درپیش ہو، اسکو آرام سمجھنا، جو کانٹے بھی اس وادی میں اسکے تلوؤں میں چبھیں، ان کو رگِ گل سمجھنا، اس حق کی آواز کو دبانے کے لئے جو قوت بھی سر اُٹھائے اُس کو کچل دینا، اور مال و منال، اہل و عیال، غرض جو چیز بھی اس سفر میں سنگِ راہ ہو کر سامنے آئے اس کو ہٹا دینا، اور اس کی اس ساری کوشش و کاوش کا مقصد خدا کی مخلوق کی خیر خواہی اور اپنے فرضِ رسالت کی ادائگی کے سوا کچھ نہیں ہوتا،

یہ ہے، انبیاؑ کی تبلیغ و دعوت کا مفہوم، دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے، انھوں نے اپنے فرض کو اسی ایثار و قربانی کے ساتھ انجام دیا، اور ایک لمحہ بھی اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہ کی، اور آج دنیا میں جو کچھ خدا کی محبت، بھائیوں کا پیار، انسانوں کی ہمدردی، بیکسوں کی مدد، غریبوں کی اعانت اور دوسری نیکیوں کا اس سطحِ زمین پر وجود ہے، وہ سب

بواسطہ یا بلا واسطہ دانستہ یا نادانستہ انہی کی دعوت و تبلیغ اور جد و جہد کا اثر اور نتیجہ ہے،

دنیا کے بڑے سے بڑے مفکر، بڑے سے بڑے شاعر، بڑے سے بڑے حکیم اپنا فرض خود سمجھ لینا، یا زیادہ سے زیادہ دوسروں کو سمجھا دینا، سمجھتے ہیں، لیکن انبیاء علیہم السلام جس صداقت کو پاتے ہیں اس کو دوسروں کے سمجھانے اور ہر ممکن طریق سے اسکے پھیلانے اور اہل دنیا کو اس کے اپنا کرانے میں اپنی پوری قوت صرف کر دیتے ہیں، وہ ہر مشکل کو جھیل کر نافہموں کو حقیقت سمجھاتے اور اندھوں کو راہِ راست دکھاتے ہیں،

انبیاء علیہم السلام کی تعریف میں خدا فرماتا ہے،

الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ	جو اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور
وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا	اسی سے ڈرتے ہیں، اور اسکے سوا کسی
اِلَّا اللّٰهَ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا	سے نہیں ڈرتے، اور اللہ بس ہے حساب
(احزاب - ۵)	(اعمال) کے لئے،

حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوتا ہے،

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (طٰہٰ)	فرعون کے پاس جا کہ اس نے سرکشی کی،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ پیغام ربانی کی بے کم و کاست تبلیغ کریں اور دشمنوں سے نہ ڈریں کہ ان کی حفاظت کا خود شہنشاہِ دو عالم ذمہ دار ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ	اے پیغمبر! تیرے رب کے پاس سے جو تیری طرف
مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ	اترا ہے اسکو پہنچا دے اور تو نے نہ کیا تو

رِسٰلَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ
النَّاسِ (مائدہ-۱۰)

اس کے پیغام کے پہنچانے کا فرض ادا نہیں
کیا، اور اللہ تجھ کو لوگوں سے بچائیگا،

انبیاءؑ کی تبلیغ و دعوت میں تبشیر اور انذار دونوں ہوتے ہیں، تبشیر یعنی بشارت دینا اور خوشخبری سنانا، اور انذار یعنی خدا کے جلال سے ڈرانا، عذاب الٰہی کا خوف دلانا، اور لوگوں کو ان کے انجام بد سے آگاہ کرنا، اور انبیاء کی آمد اس شان سے اس لئے ہوتی ہے، کہ خدا کی حجت بندوں پر تمام ہو جائے،

رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا
یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ ۢ
بَعْدَ الرُّسُلِ (نساء-۲۳)

یہ سب پیغمبر خوشخبری سناتے اور ہشیار و بیدار
کرتے ہوئے آئے تاکہ پیغمبروں کے آنے
کے بعد لوگوں کے لئے خدا پر کوئی حجت نہ رہے

ان سب نے پیغام الٰہی پہنچانے کے ساتھ اپنی خیر خواہی، دلسوزی و اخلاص مندی کا اعلان کیا،

اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ
اَمِیْنٌ، (اعراف-۹)

میں تمکو اپنے رب کے پیغام پہنچاتا ہوں اور
میں تمہارا امانتدار خیر خواہ ہوں،

یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّیْ
وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ
النّٰصِحِیْنَ (اعراف-۱۰)

اے میرے لوگو! میں نے اپنے رب کا پیام تمکو
پہنچا دیا، اور تمہاری خیر خواہی کر چکا، لیکن
تم خیر خواہوں کو پیار نہیں کرتے،

یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ
وَنَصَحْتُ لَكُمْ فَكَیْفَ اٰسٰى عَلٰى

اے میرے لوگو! میں نے اپنے رب کے پیام تمکو
پہنچا دیئے اور تمہاری خیر خواہی کر چکا تو پھر

قَوْمِ کٰفِرِیْنَ (اعراف - ۱۱) کیسے نہ ماننے والے لوگوں پر میں غم کھاؤں

یہ بھی فرمایا کئے،

لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِنْ اَجْرِیَ — میں اپنی نصیحت کی تم سے مزدوری نہیں

اِلَّا عَلَی الَّذِیْ فَطَرَنِیْ (ھود۔) — مانگتا میری مزدوری تو اُن ہی جس نے مجھ کو پیدا کیا

لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مَالًا اِنْ اَجْرِیَ — میں اپنی تبلیغ کے بدلہ تم سے مال و دولت کا

اِلَّا عَلَی اللّٰہِ (ھود - ۳) — خواہاں نہیں ہوں میری مزدوری تو خدا کے

ایک شبہہ کا ازالہ اس سلسلہ میں ہم کو ایک اور غلط فہمی کو دور کرنا ہے، جو بعضوں کو حضورؐ کی صفتِ تبلیغ کے سمجھنے میں پیش آئی ہے، قرآن مجید میں متعدد آیتیں اس معنی کی آئی ہیں کہ رسول کا فرض صرف پیغام پہنچا دینا (البلاغ) ہے، اس سے آج کل کے بعض کوتاہ بینوں کو یہ دھوکا ہوا کہ رسول کا فرض صرف وحیِ الٰہی کی تبلیغ ہے، یعنی قرآنِ پاک کے الفاظ کو انسانوں تک بعینہٖ پہنچا دینا، اس کا کام ہے، اس کے معانی کی تشریح اور مطالب کی توضیح نہ اس کا منصب ہے اور نہ اسکا اسکو حق ہے ان کے نزدیک مُبلّغِ رسول کی حیثیت صرف ایک قاصد اور نامہ بر کی ہے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ خط تو پہنچا دیتا ہے، مگر اس خط کے مفہوم و معنی کی تشریح کا اسکو حق نہیں ہوتا، بلکہ اس کو بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اس بند لفافہ میں کیا ہے،

شاید اُن کو یہ دھوکا اس آیت کے علاوہ لفظ رسول سے بھی ہوا ہے، جس کے لفظی معنی پیغامبر اور قاصد کے ہیں، لیکن وہ لوگ یہ خیال نہیں کرتے کہ جہاں اسکو رسول کہا گیا ہے "نبی" (خبر پانے والا) بھی تو کہا گیا ہے، مُبشر (خوشخبری سنانے والا) نذیر (ڈرانے والا) سراجِ منیر

(روشن کرنیوالا چراغ) صاحبِ حکمت، صاحبِ خلقِ عظیم، صاحبِ مقام محمود، مجتبیٰ (مقبول) مصطفیٰ (برگزیدہ) مبین (بیان اور شرح کرنے والا) معلّم (سکھانے والا) مزکی (پاک صاف کرنیوالا) داعی الی اللہ (اللہ کی طرف بلانیوالا) حاکم (فیصلہ کرنیوالا) مطاع (واجب الاطاعۃ) آمر (حکم دینے والا) اور ناہی (روکنے والا) بھی تو کہا گیا ہے، کیا یہ اوصاف و القاب اسکی اسی حیثیت کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ صرف ایک پیغام پہنچانے والا قاصد ہے، جس کو اصل پیغام کے مفہوم و معنی سے ایک معمولی قاصد اور نامہ بر کی طرح کوئی سروکار نہیں؟ اسکے پیغام کے مفہوم و معنی کی تشریح و تفسیر کا آج تو ہر عربی داں کو حق حاصل ہے اور اسکی اصل حقیقت تک پہنچ جانے کا ہر مدعی کو دعویٰ ہے، مگر خود صاحبِ پیغام کو اپنی پیغامبری کے وقت نہ مفہوم و معنی کا علم تھا، اور نہ اسکی تشریح کا اسکو حق تھا، اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ہم نے پچھلے صفحات میں جو کچھ لکھا ہے اس سے اس غلط خیال کی پوری تردید ہو جاتی ہے،

ان کے اشتباہ کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اسلام میں شرع اور وضعِ قانون کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لئے تسلیم کیا گیا ہے کہ وہی اصلی شارع ہے، اب اگر رسول کے لئے بھی وحیِ کتابی سے الگ شرع بنانے کا حق تسلیم کیا جائے، تو خدا کے سوا ایک اور شارع تسلیم کرنا ہوگا، اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ ہم رسول کو شارع نہیں شارح قرار دیتے ہیں کیا عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر جج جب حکومت کے قانون کی توضیح و تشریح کرتا ہے، تو وہ اپنے اس عمل سے سلطان وقت بن کر واضع قانون کا منصب حاصل کرتا ہے، یا صرف قانون کے مفہوم کا شارح ہوتا ہے؟ یہی حیثیت آسمانی عدالت کے اُس قاضی کی ہے، جس کو ہم نبی اور رسول اور معلّم اور مبین کہتے ہیں،

دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ہر پیام اور مقصد اور مفہوم اور فیصلہ سے صرف وحی کے اسی طریقہ خاص کے ذریعہ اپنے پیغمبر کو مطلع نہیں فرماتا جس طریق خاص سے قرآن مجید نازل ہوا ہے، بلکہ وہ اپنی تینوں قسموں کے ذریعہ سے اپنے اغراض اس رسول پر واضح کرتا ہے اور ان میں سے ہر طریق کی وحی کی اطاعت تمام اُمت پر فرض ہے، خواہ وہ وحی ہو، جو الفاظ الٰہی کی قید کے ساتھ آئی ہو، جس کو قرآن کہتے ہیں، یا ربانی مفہوم و معنی رسول کے الفاظ میں ادا ہوں، جس کو حدیث و سنت کہتے ہیں، الغرض خواہ وہ کتاب الٰہی کے ذریعہ سے ہو، یا حکمت ربانی کے فیض سے ہو

قرآن مجید کی وہ آیتیں جن کے معنی یہ ہیں کہ "ہمارے رسول پر صرف پیغام پہنچانا ہے" ان کا یہ منشا نہیں کہ وہ صرف پیغام پہنچانے والا ہے، خوشخبری سنانے والا نہیں، ہشیار و بیدار کرنیوالا نہیں، پیغام الٰہی کے الفاظ سنانے کے بعد ان کی تعلیم دینے والا نہیں، آیات الٰہی کی تبیین و تشریح کرنے والا نہیں، رہنما و ہادی نہیں، نجاستوں سے پاک و صاف کرنے والا نہیں، ایسا کہنا قرآن کا انکار اور عقل و فہم کا ماتم ہے، قرآن میں کئی جگہ ہے،

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ (رعد، نازعات) تو تو صرف ڈر سنانے والا ہے،

ایک جگہ ہے،

اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ (ص۔ ۵) میں تو صرف ڈر سنانے والا ہوں،

کیا ان آیتوں کا مفہوم یہی ہے کہ ڈر سنانے کے سوا، رسول کا کام بشارت اور خوشخبری سنانا نہیں اور وہ صرف منذر ہے، مبشر نہیں، اصل یہ ہے کہ اس قسم کی آیتوں

اِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ (مائدہ ۱۲) ہمارے رسول پر صرف پیغام پہنچا دینا ہے،

کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ وہ صرف پیغام رساں اور قاصد ہے مبین اور شارح نہیں بلکہ یہ ہے کہ اس کا کام صرف خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے، زبردستی لوگوں کے دلوں میں اس پیغام کا اتار دینا نہیں، بزور لوگوں کو مسلمان بنا دینا نہیں، جبراً منوا لینا نہیں، اور نہ پیغام پہنچا دینے کے بعد لوگوں کے کفر و انکار اور عدم ایمان کی ذمہ داری اس پر ہے، قرآن میں جہاں جہاں اس معنی کی آیتیں آئی ہیں، انکا منشا یہی اور صرف یہی ہے، قرآن پاک کی تیرہ مختلف آیتوں میں یہ بات کہی گئی ہے، اور ہر جگہ یہی ایک مفہوم ہے،

۱۔ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ	کتاب والوں اور ان پڑھوں سے کہدے
الْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا	کیا تم نے اسلام قبول کیا، اگر کیا تو ہدایت
فَقَدِ اهْتَدَوْا، وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا	پائی اور اگر منہ پھیرا تو تجھ پر (اے رسول)
عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ	صرف پیام پہنچانا ہے، اور اللہ بندوں
(آل عمران - ۲)	کا دیکھنے والا ہے،

مفہوم بالکل ظاہر ہے کہ اسلام کی ہدایت قبول کرنے میں کوئی زبردستی نہیں، اگر لوگ قبول کریں تو انھوں نے حق کی راہ پائی، اور اگر انکار کریں تو رسول کا کام صرف پیغام پہنچا دینا تھا، وہ اس نے پہنچا دیا، اس کا فرض ادا ہو چکا، اب خدا جانے اور اسکے بندے جانیں،

فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ	تو تیرا فرض صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور
(رعد - ۶)	ہمارا فرض ان سے حساب لینا ہے،

اس کی مزید تفصیل سورۂ غاشیہ میں ہے،

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ — تو (اے پیغمبر!) تو نصیحت کر، تو تو صرف نصیحت
عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ إِلَّا مَنْ تَوَلَّىٰ — کرنیوالا ہے، ان پر داروغہ نہیں، لیکن جس نے
وَكَفَرَ، فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ إِنَّ — منہ پھیرا اور انکار کیا تو خدا اسکو بڑی سزا
إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ثُمَّ إِنَّ — دیگا بیشک پھر ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا
عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ (غاشیہ-۱) — ہے، اور ہمیں پر ان کا حساب ہے،

یہی مفہوم سورۂ شوریٰ میں ہے کہ رسول کا کام صرف سمجھانا اور تبلیغ کرنا ہے، وہ سلطان کار فرما، داروغہ اور فرماں روا بنا کر نہیں بھیجا گیا، کہ لوگوں سے زبردستی اپنی بات منوا لے،

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا، إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَاغُ (شوریٰ-۵) — تو اگر وہ انکار کریں تو ہم نے تجھکو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا، تیرا کام صرف پہنچا دینا ہے،

کافروں نے جب کبھی رسولوں کو جھٹلایا، انھوں نے یہی کہا کہ ہمارا کام پہنچا دینا ہے، ماننے نہ ماننے کا تمھیں اختیار ہے،

قَالُوا مَا أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا وَمَا — کافروں نے کہا تم تو ہماری ہی طرح آدمی ہو اور
أَنْزَلَ الرَّحْمَٰنُ مِنْ شَيْءٍ إِنْ أَنْتُمْ — خدا نے کچھ نہیں اتارا، تم جھوٹ کہتے ہو
إِلَّا تَكْذِبُونَ، قَالُوا رَبُّنَا يَعْلَمُ إِنَّا — نے کہا ویا ہمارا پروردگار خوب جانتا ہے
إِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُونَ وَمَا عَلَيْنَا — کہ ہم بے شبہ تمھاری طرف بھیجے گئے ہیں اور
إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ (یٰسین-۲) — ہمارا فرض صرف کھول کر پہنچا دینا ہے

خود اللہ تعالیٰ نے بھی رسولوں کو تسلی دی ہے کہ ان منکروں کے انکار سے دل شکستہ

نہ ہوں، اگلے پیغمبروں کے منکروں نے بھی یہی کیا تھا، پیغمبروں کا فرض لوگوں سے منوانا نہیں بلکہ ان تک خدا کا پیام پہنچانا ہے،

وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ	اور مشرکوں نے کہا اگر خدا چاہتا تو ہم اس کے
اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ	سوا کسی اور کو نہ پوجتے، نہ ہم اور نہ ہمارے
نَحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ	باپ دادا، اور نہ اس کے حکم کے بغیر کسی چیز
دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ كَذٰلِكَ فَعَلَ	کو حرام کرتے (خدا کہتا ہے کہ) ایسا ہی کیا تھا
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَهَلْ عَلَى	ان کے پہلوں نے، تو کیا ہمارے پیغمبروں پر کھول
الرُّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (نحل)	کر پہنچا دینے کے سوا کچھ ہے،
وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ	اگر تم جھٹلاؤ تو (کیا ہے) تم سے پہلے بھی قومیں
مِّنْ قَبْلِكُمْ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا	جھٹلا چکی ہیں، اور رسول پر نہیں لیکن
الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (عنکبوت ۲)	کھول کر پہنچا دینا،

رسول کا کام پہنچا دینا ہے، باقی علام الغیوب جو چاہے سو کرے،

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ وَاللّٰهُ	رسول پر نہیں ہے لیکن پہنچا دینا، اور اللہ جانتا
يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ (مائدہ ۱۳)	ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو،

بقیہ آیتیں حسب ذیل ہیں، جو ایک ہی مفہوم کو ادا کرتی ہیں،

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ	اور اللہ کا فرمان اور رسول کی بات مانو
وَاحْذَرُوْا فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا	اور بچو، اور اگر تم نے منہ پھیرا تو جان لو کہ ہمارے

عَلَى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (مائدہ-۱۲)

رسول پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے،

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ، (نور-۷)

کہدے اے پیغمبر! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو پھر اگر وہ منھ پھیریں تو رسول پر وہی ہے جس کا بوجھ اس پر ہے اور تم پر وہ ہے جس کا بوجھ تم پر ہے، اور اگر اسکی اطاعت کروگے تو ہدایت پاؤگے اور رسول پر نہیں لیکن کھول کر پہنچا دینا،

كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ، فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (نحل-۱۱)

اسی طرح اللہ تم پر اپنا احسان پورا کریگا تاکہ تم مسلمان ہو جاؤ، اور اگر انھوں نے منھ پھیرا تو تجھ پر کچھ نہیں ہے، مگر کھول کر پہنچا دینا،

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ، (تغابن-۲)

اور خدا کا کہا مانو اور رسول کی فرمانبرداری کرو اگر تم نے منھ پھیرا تو ہمارے رسول پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے،

پیغمبر کا قول ہے،

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّا اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ (ھود-۵)

پھر اگر تم منھ پھیرو تو میں جو پیام دیکر تمھارے پاس بھیجا گیا تھا، وہ میں نے تمکو پہنچا دیا، (یعنی میرا فرض ختم ہو چکا)

ان تمام آیتوں کا تعلق نبوت کے منکروں سے ہے، یہاں پر یہ نکتہ بھی لحاظ کے قابل ہے کہ جو لوگ ہنوز نبوت کے منکر ہوں، ان سے رسول کا تعلق صرف تبلیغ و نصیحت، پند و موعظت اور

سمجھانے کا ہے، لیکن جو خوش قسمت اقرار نبوت کی سعادت حاصل کرلیں تو پھر ان کا تعلق رسول سے اتباع و پیروی اور اطاعت کا ہو جاتا ہے، اور اس کے بعد رسول انکو تبلیغ ہی نہیں بلکہ امر و نہی بھی کرتا ہے، کوئی حکومت، دوسرے ملک کے باشندے کو زبردستی اپنی رعایا نہیں بناتی لیکن اگر کوئی شخص از خود اس حکومت کی رعایا بنجائے، تو پھر اسکو اس کے قانون کی پیروی پر بزور مجبور کیا جائیگا کہ رعایا بننے کے معنی ہی اسکے قانون کے قبول کرنے کے ہیں،

انبیاءؑ کی تعلیم کا امتیازی نتیجہ۔

دنیا میں جسقدر پیغمبر آئے وہ ایک ہی دین اور ایک ہی عقیدہ لیکر آئے، وہی توحید، وہی نبوت، وہی عبادت، وہی اخلاق، وہی جزا و سزا اور عمل کی پرسش، اس لحاظ سے انبیا کی تعلیم میں کوئی اصولی فرق نہیں، اسلئے فرمایا کہ شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا الآیہ" یعنی خدا نے تمہارے لئے وہی دین مشروع کیا جو نوحؑ وغیرہ دوسرے پیغمبروں کو دیا تھا، اور اسی کا نام اسلام ہے" لیکن انبیا کی تعلیم کا اہم الاصول اور سب سے ضروری جز توحید ہے اور وہی نبوت کے ساز کا اصلی اور ازلی ترانہ ہے،

ممکن ہے کہ دنیا میں اسلام سے پہلے بہت سے اچھے لوگ گذرے ہوں اور انکی دعوت بھی مفید ہو، اُن کے اخلاقی وعظ بھی دل پسند ہوں، وہ یونان کے حکیم ہوں یا ہند و ستان کے اوتار لیکن ان کی تعلیم میں اگر توحید کی دعوت شامل نہیں تو وہ نبوت کے رتبہ کے قابل نہیں کہ پیغمبرانہ تعلیم کی پہچان ہی توحید کی دعوت ہے، اگر یہ نہیں تو نبوت بھی نہیں فرمایا،

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ	اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا
اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا	لیکن اسکو یہ وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں

فَاعْبُدُوْنِ، (انبیاء-۲)
میری ہی پرستش کرو،

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا
اور ہر قوم میں ہم نے ایک رسول بھیجا کہ خدا کی

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (نحل)
عبادت کرو، اور بتوں سے پرہیز کرو،

اس سے معلوم ہوا کہ تعلیمی حیثیت سے نبوت کی شناخت اسی سے ہو سکتی ہے، اسلام سے پہلے جس مدعیِ نبوت کی تبلیغ کا اہم ترین جزو توحید نہیں اُس کو دعوائے نبوت کا کوئی حق نہیں،

نبوت کی غرض وغایت انبیاء علیہم السلام کی آمد کی غرض وغایت کو شاعرانہ زبان اور خطیبانہ جوشِ بیان میں بہت کچھ بتایا جا سکتا ہے، لیکن یہاں مقصود یہ ہے کہ ان اغراض کو گنایا جائے، جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحیِ مبارک کی زبان سے ادا ہوئے ہیں، اصل دعویٰ وہی ہے، جسکو مدعی ظاہر کرتا ہو، نہ کہ گواہ،

انبیاءؑ کی بعثت کی سب سے پہلی غرض اس روزِ الست کے بھولے ہوئے ازلی عہد وپیمان بندگی کی یاددہانی ہے،

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ
اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے انکی

ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ
نسلوں سے لیا، اور انکو خود اپنے اوپر گواہ

عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰی
کیا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں

شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ
انھوں نے کہا کیوں نہیں تو ہے، ہم نے

اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ (اعراف ۲۲)
گواہی دی کہ قیامت کے دن یہ نہ کہو ہم

اس لئے ضرور ہوا کہ ان کو موقع بموقع ان کا یہ وعدہ یاد دلایا جائے،

یہی وجہ ہے کہ رسول کی بعثت کی ایک غرض یہ بھی بتائی گئی ہے کہ اس کا وجود بنی آدم پر اتمام حجت ہے، ممکن ہے کہ آدم کے فرزند یہ بجا عذر کریں کہ ہمارے پاس کوئی یاد دلانے والا نہیں آیا، اس لئے فرمایا،

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ، (نساء ۶-۲۳)

رسول خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے تاکہ رسولوں کی آمد کے بعد لوگوں کیلئے خدا پر کوئی حجت باقی نہ رہے،

تذکیر کے بعد نبی کا فرض اولین ہدایت اور رہنمائی ہے کہ وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی صفت ہادی کا مظہر اور مورد ہے، اسی لئے ایک آیت میں نبی اور رسول کیلئے ہادی کا لفظ آیا ہے فرمایا

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ، (رعد-۱)

اور ہر قوم کیلئے ایک راہ دکھانے والا آیا،

سورۂ شوریٰ میں فرمایا،

وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (شوریٰ) اور تو اے پیغمبر سیدھی راہ دکھاتا ہے

سورۂ انبیاء میں بہت سے پیغمبروں کے ذکر کے بعد ہے،

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا (انبیاء-۵)

اور ہم نے ان پیغمبروں کو ایسا پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے راہ دکھاتے تھے،

اسی طرح ان آسمانی کتابوں کو جو ان کو دی گئیں بار بار ھُدًی (ہدایت) کہا گیا ہے اور کہیں ان کو ضیاء اور نور (روشنی) کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے،

اس ہدایت و رہنمائی کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ وہ بندگان الٰہی کو باطل کے اندھیرے

سے نکال کر حق کی روشنی میں لاتے ہیں، لوگ جب فاسد خیالات، بیہودہ افکار، بے سود اعمال کی تاریکیوں میں پھنس کر فطری بصیرت اور روحانی معرفت کے نور سے محروم ہو جاتے ہیں، انبیاءؑ ان اندھوں کے ہاتھ پکڑ کر اُن کو ظلمات سے انوار میں لاتے ہیں، ان کو شک کی جگہ یقین جہل کی جگہ علم، باطل کی جگہ حق، اور ظلمت کے بجائے نور عطا کرتے ہیں،

هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (حدید-۱)

وہی اللہ جو اپنے بندہ پر کھلی آیتیں اتارتا ہے تاکہ وہ تمکو تاریکیوں سے نور میں لائے،

اس دنیا کی نجات صرف اعتدال میں ہے، جب کبھی مزاج انسانی کی طرح اس کے اُن عناصر میں جن سے اس کی ترکیب ہوئی ہے، افراط و تفریط پیدا ہو گی، روے زمین پر فساد رونما ہوگا، انسانی جماعتوں اور قوموں میں بھی یہ ترازو جب اعتدال کے معیار پر پوری نہ ہوگی کبھی دونوں پلے برابر نہ ہونگے، آسمان سے زمین تک ایک ایک ذرہ اعتدال کی ترازو میں تلا ہوا ہے، کیمسٹری اور علم الفلک کا واقف کار اس ترازو کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور حیرت کرتا ہے کہ کہیں ایک ذرہ کی کمی بیشی نہیں ہے، جس طرح اس مادی دنیا میں یہ حیرت انگیز توازن ہے، ٹھیک اسی طرح روحانی اور اخلاقی دنیا میں بھی اس توازن کی ضرورت ہے، عقائد ہوں کہ عبادات، اخلاق ہوں کہ معاملات، اسی توازن کا نام حق اور عدل ہے، فرمایا:۔

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِیْزَانَ اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ (رحمٰن-۱)

اور آسمان کو اونچا کیا اور ترازو رکھی کہ اس ترازو میں کمی بیشی نہ کرو، اور تول کو ٹھیک رکھو اور ترازو کو گھٹاؤ نہیں،

یہ توازن اور برابر تول جمادہ اور بے اختیار دنیا کے ذرہ ذرہ اور اُس کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک کام میں خالقِ فطرت کے اندازہ اور تقدیر سے قائم ہے، یہی توازن اور برابر کی تول رسولوں کے ذریعہ آئی ہوئی میزانِ شریعت کے مطابق ذی ارادہ اور خود اختیار انسانوں کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک جنبش میں ہونی چاہیئے، بے ارادہ دنیا کی میزان کا نام قانونِ فطرت ہے، اور بالارادہ دنیا کی میزان کا نام قانونِ شریعت ہے، بے ارادہ دنیا کا نام نظام عدل اسی خدائی میزانِ فطرت سے چل رہا ہے، اگر اس میزان میں ایک ذرہ بھی کمی بیشی ہو جائے تو عالم کا نظام درہم برہم ہو جائے، اسی طرح انسانی دنیا کی سکینت، طمانیت اور امن و امان کا نظام اسی میزانِ شریعت کے ذریعہ قائم ہو سکتا ہے، اگر یہ نہ ہو تو اس کے نظام کا درہم برہم ہونا بھی لازمی ہے، فرمایا،

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ	ہم نے بے شبہ اپنے پیغمبروں کو کھلی دلیلیں
اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ	دیکر بھیجا، اور اُن کے ساتھ کتاب اور میزان
لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (حدید ۳)	اتاری، تاکہ لوگ عدل کو قائم کریں،

انبیاء کی بعثت کی یہ غرض و غایت کہ لوگ شریعت کی میزان کے مطابق عدل اور توازن کو قائم رکھیں، اس موجودہ دنیا ہی کے نظام کی امن و سلامتی کے لئے ہے، آج یورپ کے اتحاد کی گونج نے دنیا کے گوشہ گوشہ کو پرشور بنا دیا ہے، آج رسولوں کی اہمیت اور ان کی تعلیمات کی ضرورت پر شکوک و شبہات کی ژالہ باری ہو رہی ہے، لیکن وہمی و خیالی مباحث سے قطع نظر کر کے عملی حیثیت سے دنیا کی ایک ایک اقلیم اور ایک ایک آبادی کا جائزہ لو آج جہاں کہیں

بھی سچائی کی روشنی اور حقیقت کی کوئی کرن چمکتی ہے، وہ اسی مطلع خورشید سے چھنکر نکلی ہے، کوئی دیندار ہو یا ملحد، خوش عقیدہ ہو بے عقیدہ، یونان کا حکیم ہو یا افریقہ کا جاہل، یورپ کا متمدن ہو یا صحاری کا وحشی، رومی ہو یا زنگی، عیسوی یا موسوی، بت پرست ہو یا موحد، مجوسی ہو یا ہندو، مسلم ہو یا غیر مسلم، شہری ہو یا دیہاتی، ہمالیہ کی چوٹی پر آباد ہو، یا زمین کی گہرائی میں کہیں بھی ہو کوئی بھی ہو، اگر وہ اللہ کے نام کی عظمت سے واقف ہے، اور نیکی و بدی کی تمیز سے آشنا ہے، تو وہ خدائی رسولوں اور ربانی پیغمبروں کے علاوہ کس معلم کی کوششوں کا ممنون ہے، آج جہاں بھی عدل و میزان کا وجود ہے، وہ کسی یونانی حکیم یا یورپین فلاسفر کی تعلیم و تصنیف اور تقریر و خطبہ کا اثر نہیں ہے، بلکہ طبقۂ انبیاء ہی کے بے واسطہ یا بالواسطہ تعلیمات کا نتیجہ ہے، آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں کیسے ہی بدترین مبلغ سہی، مگر نیکی، عدل، احسان، ہمدردی، نکوکاری، حسن خلق کی تعلیم تبلیغ اور دعوت ان ہی کی زبانوں سے ہو رہی ہے جو رسولوں کے پیرو اور پیغمبروں کے تابع ہیں، جو عقیدہ کے ملحد ہیں اُن کی بھی نکوکاری ان ہی پیغمبروں کے نادانستہ فیضانِ تعلیم کا نتیجہ ہے، اس بنا پر جو لوگ ذہنی طور سے پیغمبروں کے منکر ہیں، وہ بھی عملی طور سے ان کی تعلیم کے مقر اور معترف ہیں اسلئے انبیاءؑ کا وجود تمام دنیا کے لئے رحمت بن کر ظاہر ہوا ہے، اور قرآن نے آسمانی کتابوں کو بار بار رَحْمَةً وَهُدًى، رحمت اور رہنمائی کی غرض سے بھیجنے کا جو اعلان کیا ہے، وہ تمام تر اسی غرض و غایت کی تشریح ہے، اور اسی لئے خاتم نبوت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات و لاصفات تمام کے لئے رحمت بن کر آئی خدا نے فرمایا،

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ — اور ہم نے تجھ کو (اے محمد) تمام دنیا کے لئے

(انبیاء - ۷) رحمت بنا کر بھیجا ہے،

تائید و نصرت انبیاء علیہم السلام جو مقصد لیکر آتے ہیں، خواہ کسی قدر مشکلات پیش آئیں، کتنی ہی رکاوٹیں ہوں، کتنی ہی تکلیفوں اور زحمتوں کا سامنا ہو، بالآخر وہ مقصد کامیاب ہی ہوتا ہے، پیغمبروں کی سیرت اور اُن کی دعوت کی تاریخ، خود اس دعویٰ پر گواہ صادق ہے، قرآن نے کہا

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا — اور ہماری بات اپنے رسول بندوں کیلئے
الْمُرْسَلِينَ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ وَإِنَّ — پہلے ہی طے ہو چکی ہے، کہ یقیناً انہی کی مدد ہوتی
جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ (الصّٰفّٰت) — ہے، اور ہمارا ہی لشکر غالب ہوتا ہے،

نہ صرف اس دنیا میں بلکہ حشر کے دن بھی انہی کو اور ان کے ذریعہ اہل ایمان کو کامیابی ہوگی

إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا — بے شبہ ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں
فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ — کی مدد اس دنیا میں کرتے ہیں، اور اس دن
يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِينَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ — بھی جب گواہ کھڑے ہونگے جس دن
سُوءُ الدَّارِ، (مومن - ۲) — گنہگاروں کو اُن کے بہانے کام نہ دیں گے
— اُن پر پھٹکار ہوگی اور ان کے لئے برا گھر ہوگا،

پیغمبروں پر ایسے بھی سخت وقت آتے ہیں، جب ان کو اپنی قوم کے قبولِ ہدایت کی طرف سے پوری مایوسی ہو جاتی ہے اور امید کی روشنی کسی طرف سے دکھائی نہیں دیتی اور عذاب میں دیر ہونے کے سبب سے ان کے منکر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کو عذاب کی دھمکی جھوٹ دی گئی تو دفعۃً امید کا دروازہ کھلتا ہے، اور خدا کی تائید و نصرت کے پرے اس طرح

آتے دکھائی دیتے ہیں کہ صالح لوگوں کے دل قبول کے لئے کھول دیئے جاتے ہیں اور معاندوں پر کسی نہ کسی طرح عذاب آکر ان کا استیصال ہو جاتا ہے، فرمایا،

حَتّٰٓی اِذَا اسْتَاْیَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا (یوسف - ۱۲)

یہانتک کہ جب پیغمبروں کو اپنی قوم کے ایمان سے مایوسی ہونے لگی اور ان کے منکروں کو یہ خیال ہونے لگا کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تو ہماری مدد آگئی،

اللہ تعالیٰ کی اسی تائید و نصرت اور حفاظتِ دعوت کا یہ یقین ان کو ہوتا ہے کہ وہ ہر مشکل کو اس راہ میں جھیل لیتے ہیں، اور اپنے سروں کو ہتھیلیوں پر لئے پھرتے ہیں مخالفوں کی فوج و لشکر تیغ و خنجر اور خوف و خطر کے باوجود اپنی دعوت و تبلیغ کے فریضہ سے باز نہیں آتے اور کسی دام پر بھی مخالفوں سے صلح پر آمادہ نہیں ہوتے منکروں کو شروع شروع میں انکی ظاہر بیچارگی اور تنہائی کو دیکھ کر ان کی ناکامی کا گمان ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ اُن کے سوءِ ظن کی تردید کر کے فرماتا ہے:-

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ (ابراھیم - ۷)

سو مت خیال کر کہ اللہ اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کریگا،

ازل کے دن ہی یہ قانون بن چکا ہے کہ سچائی کے اُن پکارنے والوں ہی کی آخر جیت ہوگی

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ (مجادلہ)

اللہ لکھ چکا کہ میں ہی غالب ہونگا اور میرے رسول

خاتمہ | اس تفصیل اور تشریح سے مقصود ناظرین کو نبوت کے اصلی کمالات کا ایک جلوہ دکھانا تھا،

فلسفی را از پیمبر وا شناس
آبگینہ را ز گوہر وا شناس

آبگینہ را نہ پنداری بدست — جز دمے کہ گوہرے آری بدست

چوں گہر آمد بدستت شب چراغ — آبگینہ شد سیہ چوں پرِ زاغ

فلسفی اندر بُنِ چاہِ نژند — نردباں دارد بخورشید بلند

نردبانش می برد تا چند ارش — پس بخاک افتد نگوں گشتہ سرش

واں پیمبرؐ خود ز بامِ آسماں — رشتۂ افگندہ سوے خاکیاں

رشتۂ جاں را بدیں رشتہ بتاب — پس برآ تا بارگاہِ آفتاب

ز آسماں پیغمبر آوازت دہد — فلسفی از خاک پروازت دہد

ایں ز دورت رہ نماید سوے جاں
واں نخواند خود ترا از کوے جاں[1]

---

[1] از دیوانِ فارسی مولانا حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۱۹ جمادی الثانیہ ۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۰ء ص ۴۶، ۴۷، مطبوعہ مطبع شمسی حیدرآباد، دکن،

شبِ ظلمت

پیغمبر اسلام کی بعثت کے وقت دنیا کی مذہبی اور اخلاقی حالت

اگر یہ سچ ہے، کہ دنیا کی ہر شے اپنے ضد سے پہچانی جاتی ہے، بارش کی خنکی سخت اس کے بعد ہی زیادہ خوش گوار معلوم ہوتی ہے، روشنی کی پوری قدر شب تاری میں ہوتی ہے اور فضا جس قدر تاریک ہو، بجلی کی چمک اتنی ہی زیادہ درخشاں نظر آتی ہے، تو اس میں شبہ نہیں کہ ہر اصلاحی تحریک کی وقعت اور عظمت کے جانچنے میں یہ لحاظ رکھنا چاہئے کہ دنیا اس وقت کتنی گمراہی میں مبتلا اور اصلاح کی محتاج تھی، اور ایسی اصلاح کی محتاج تھی، جس کیلئے پیغمبر آہ دست و بازو کی حاجت تھی اور وہ بھی ایک ایسے پیغمبر کے دست و بازو کی جسکے متعلق خود خدا یہ فرما سکے،

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا	جو تیرے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں وہ خدا کے
يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ	ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں اور ان کے ہاتھوں
(فتح-۱)	کے اوپر خدا کا ہاتھ ہے،

اسلام یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام اور تعلیم کے متعلق ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دنیا کی ایک عظیم الشان روحانی و اخلاقی و معاشرتی دعوت تھی، اس بنا پر ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اس ظلمت

اسلام کے وقت دنیا کی کیا حالت تھی؟ اس وقت کی دنیا کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ وہ ایک ایسا کرۂ ارضی تھا جس پر آفتاب نہیں چمکتا تھا، تو بالکل سچ ہوگا، تمام دنیا میں سچے اور صحیح عقیدہ کا کہیں وجود نہ تھا، توحید کی روشنی سے دنیا کا ذرہ ذرہ محروم تھا، مصر و یونان و روم میں سورج چاند اور مختلف سیاروں اور ستاروں کی خدائی تھی، اُن ہی کے مجسمے تھے اور انہی کے ناموں پر بے گناہ انسانوں اور جانوروں کی قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں، ہر جگہ پتھر کی مورتیاں اور مٹی کے صورتوں اور سونے چاندی اور جواہرات کے بتوں کی پوجا کی جاتی تھی،

اس وقت کی دنیا میں اخلاق کے تین معلم تھے، رواقی عیسائی اور بودہ مت کے پیرو اور یہ تینوں کے تینوں تجرد، رہبانیت اور جوگی پن میں مبتلا ہو کر اس طرح عضو معطل ہو گئے تھے کہ دنیا کا دست ترقی شل ہو کر رہ گیا تھا، اور ایسی سخت سنگدلانہ ریاضتوں کو نیکی اور عبادت کا مترادف سمجھ رکھا تھا کہ آج ان کی تفصیلات سننے سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں،

یہ سچ ہے کہ مسیحؑ نے چھ صدی قبل تزکیۂ نفس کے کچھ درس دیئے تھے لیکن مدت ہوئی دنیا اس سبق کو بھلا چکی تھی، یہ بھی سچ ہے کہ موسیٰؑ نے اس سے بھی بیشتر ہدایت و نجات کی ایک شمع جلائی تھی، لیکن فتنوں اور ہنگاموں کی آندھی میں چراغِ طور بھی جل کر گل ہو گیا تھا، اور پھر یہ بھی سچ ہے کہ مدت مدید ہوئی کہ زردشت نے روحانیت کی آگ سلگائی تھی لیکن یہ شعلہ بھی انسانی خون کے چھینٹوں سے سرد ہو چکا تھا، یہ بھی سچ ہے کہ اس سے بھی پہلے بودھ نے آریہ ورت کے پہاڑوں اور غاروں میں روح کا دارالامن ڈھونڈھ نکالا تھا، مگر حوادث کے طوفان نے ان پہاڑوں کو بے نام و نشان صحرا، اور ان غاروں کو ہندوؤں

کا بھٹ بنا دیا تھا، ہر قوم دوسری قوم سے برسرِ پیکار اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے خون کا پیاسا تھا، حرص و طمع اور کشت و خون کی گرم بازاری تھی، نفس انسانی کی ملکوتی طاقت جذبات خبیثہ کے دیوتا کے سامنے پامال ہو چکی تھی، عدل و راستی اور پاکبازی و پارسائی کے عطر معنبر کی خوشبو انسان کے جامۂ خاکی سے اڑ چکی تھی، توحید اور خدا پرستی کا نور دیوتاؤں، دیبیوں، ستاروں، شہیدوں، ولیوں اور محبوں کی پرستش کی عالمگیر تاریکی میں چھپ گیا تھا، غرض دنیا کے حالات ہر طرح سے اس امر کے مقتضی تھے کہ کوئی عالم کا مصلح، اخلاق کا معلم حق کا داعی بنی نوع انسان کا نجات دہندہ آخری بار وجود میں آئے اور انسانیت کے شیرازہ میں جو عرصہ دراز سے پراگندہ و منتشر ہو رہا تھا پھر نظم و انتظام پیدا کر دے اور روحانیت و خدا پرستی کے خزاں رسیدہ باغ کو از سرِ نو پر بہار بلکہ صدا بہار اور دنیا کے ظلمت کدہ کو پھر مطلع انوار بنا دے،

یہ اس عہد کی دنیا کی حالت کا ایک اجمالی خاکہ تھا تفصیل کے لئے ہمیں مختلف قوموں اور ان کے مذہبوں میں سے ایک ایک قوم اور اس کے مذہب کی تاریخ پر نظر کرنی چاہیئے،

ظہور اسلام کے وقت دنیا کی تمدنی اور مذہبی حالت کیا تھی

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت مصر، یونان، کلدانیا، اسیریا اور بابل کی عظمت افسانہ پارینہ بن چکی تھی، خود عرب و مضافات عرب میں جو نامور حکومتیں کبھی تھیں مثلاً انباطی، حمیری، سبائی وغیرہ مدت گذری کہ ان کا خاتمہ ہو چکا تھا اس موقع پر صرف یہ دیکھنا مقصود ہے کہ صبح سعادت کے طلوع کے وقت کون کون قومیں دنیا میں حکمراں تھیں اور ان کی مذہبی و اخلاقی حالت کیا تھی، اور دنیا کے مذاہب اس وقت کی روحانی حالت کے سنبھالنے کی کہاں تک استطاعت رکھتے تھے اس وقت روئے زمین کی اہم طاقتیں

دو ہی تھیں، فارس اور روم، فارس کا مذہب مجوسیت تھا، جس کا دائرہ عراق سے لیکر ہندوستان کی سرحد تک محیط تھا، اور روم کا مذہب عیسوی تھا، جو یورپ، ایشیا اور افریقہ کے تینوں براعظموں کو گھیرے تھا، لیکن مذہبی حیثیت سے دو اور قومیں بھی ذکر کے قابل ہیں، جن میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ قدامت کا دعویٰ ہے، اور وہ یہود اور ہندو ہیں،

مجوس فارس عرب کی پہلی ہمسایہ سلطنت فارس تھی، جس کے تمدن کا ستارہ ایک زمانہ میں اوج کمال پر تھا، مگر عہد بعثت سے صرف ڈیڑھ سو برس پہلے سے ساسانی شان و شوکت اور کیانی جاہ و جلال مٹتے مٹتے سایہ سا رہ گیا تھا، مسلسل بغاوتوں، سفاکانہ خونریزیوں اور سیاسی بدنظمیوں نے اس کو تہ و بالا کر دیا تھا، بادشاہوں کے ظلم و ستم اور امرا کی عیاشیوں اور خود غرضیوں نے صداقت، اخلاص اور ہر قسم کے اخلاقی جوہر کو جس کے خمیر سے قوم کی زندگی تعمیر ہوتی ہے، فنا کر دیا تھا،

ایران میں بابل کے اثر سے ستارہ پرستی بہت عام تھی، اسی کا اثر ہے، کہ فارسی لٹریچر میں افلاک اور ستاروں کی کارفرمائی آج تک نمایاں ہے، زردشت نے اس تاریکی میں اپنی آگ روشن کی، اور نور و ظلمت یا خیر و شر کے دو خالق یزدان و اہرمن اس کے دو خدا اور آگ اسکی مسجود بنی، اسلام سے کچھ صدیاں پیشتر مانی نے مسیحیت اور مجوسیت کی آمیزش سے مذہب کا ایک نیا مرقع تیار کیا تھا، جس میں نور و ظلمت کے فلسفہ کا ایسا گورکھ دھندا بنایا تھا، جس سے آخر آخر تک اس قوم کو نکلنا نصیب نہ ہوا، اسکی تعلیم یہ تھی کہ دنیا سے گوشہ گیری کر کے اسکو ویران برباد اور ترک ازدواج سے نسل انسانی کو منقطع کر دیا جائے، تاکہ بدی کا خاتمہ ہو جائے، اخلاقی حیثیت

لہ کتاب الفہرست ابن ندیم ذکر مانی و کتاب البدو والتاریخ مقدسی ذکر فرقہ مانویہ ۱۲ تاریخ غرر اخبار الفرس ثعالبی مطبوعہ پیرس ص ۵۰۲

سے محرکات کا وجود ہمیشہ اُنکے ہاں مختلف فیہ رہا، باپ کا بیٹی کو، اور بھائی کا بہن کو اپنی زوجیت میں لینا، وہاں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی[1]، یہ سنکر کس قدر حیرت ہوگی کہ یزدگرد ثانی جو پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں وہاں کا بادشاہ تھا، اس نے اپنی بیٹی سے اپنا عقد کیا، اور پھر اُسکو قتل کر ڈالا[2]، عورتوں کو اس قوم اور اس مذہب میں جو حیثیت حاصل تھی، وہ ان افسانوں اور مقولوں سے ظاہر ہے جو ایرانی ادبیات کا اب بھی جزو ہیں، اور جو شاہنامہ کے اوراق میں اب بھی ہر شخص کو نظر آسکتی ہے، عورتوں کی بیوفائی، بداخلاقی اور ان پر عدم اعتماد پرانے ایرانی تمدن کا سب سے بڑا جزو تھا،

سلاطین اور امراء درجہ بدرجہ رعایا کے خدا اور دیوتا تھے، جن کو سجدے کئے جاتے تھے[3]، انکی الوہیت کے گیت گائے جاتے تھے، ان کے دربار میں کوئی بیٹھ نہیں سکتا تھا، اُنکے خلاف کوئی لب کشائی کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، اُن کے جرائم پر ان کو سزا نہیں دیجا سکتی تھی، رعایا اُن کے مظالم کے سامنے دم نہیں مار سکتی تھی،

ملک کا بڑا حصہ رومی عیسائیوں کی دائمی جنگ سے پریشان حال تھا، اور گرجاؤں اور آتشکدوں کی باہمی آویزش کا غیر مختتم سلسلہ قائم تھا، جب رومی فاتح ہوتے تو آتشخانے ٹوٹ کر کلیسے بنجاتے، اور جب ایرانی غالب آتے تو کلیسے ٹوٹ کر آفتاب دیوتا کے معبد اور آتشخانے تعمیر ہو جاتے، یہودیوں پر جو مظالم توڑے جاتے تھے، اس کا ایک مختصر سا نقشہ توراۃ کے قصۃ الیسیر میں نظر آتا ہے، اور بعد کو مفتوح عیسائیوں پر وہ جس جس طرح ظلم کرتے تھے، اسکی تفصیل گبن

---

[1] تاریخ غرر اخبار الفرس ثعالبی مطبوعہ پیرس ص۲۷ ابو داؤد میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں حکم دیا کہ مجوسیوں کو اس فعل شنیع سے باز رکھا جائے (کتاب الخراج والامارۃ والفئی جلد دوم ص ۲۶)، [2] مورخوں: تاریخ عالم ج ۸ ص ۸۴، [3] غرر اخبار الفرس ثعالبی ص ۵۰۰، پیرس۔

کے اوراق میں منتشر طور پر ملے گی،

بعثت سے پہلے جہانبانی کا قرعہ قباد اوّل بن فیروز کے نام پڑا، بیرونی حملوں اور اندرونی بدنظمیوں کا سلسلہ روز بروز بڑھتا گیا، آخر رعایا نے قباد کو قید کر دیا[1]، قباد نے قید خانہ سے بھاگ کر تاتاریوں کے پاس پناہ لی، اور ان کی اعانت سے دوبارہ تاج حاصل کیا، لیکن ملک پر اس سے بھی زیادہ مصیبت یہ نازل ہوئی کہ اس کے عہد میں مزدک نام ایک شخص پیدا ہوا جو اس امر کی تعلیم دیتا تھا کہ دولت اور عورت کسی خاص شخص کی ملک نہیں، بلکہ ان کو تمام جماعت میں مشترک ہونا چاہیئے، چنانچہ ایک شخص کی بیوی مزدک کے عقائد کی رو سے ہر شخص کے ساتھ ہمبستر ہو سکتی تھی، عیش پرست اور ہوس راں امرا اور عوام دونوں نے اسکو خوشی خوشی قبول کیا، اس مذہب نے بہت جلد شاہی سایہ میں ترقی حاصل کی اور خود قباد نے اس دین کی ترویج و اشاعت میں نمایاں حصہ لیا، قوم کی اخلاقی حالت پر اس تعلیم کا جو اثر پڑ سکتا ہے، وہ ظاہر ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ سارا ملک عیش پرستی اور ہوس رانی کے نشہ میں سرشار ہو گیا،

سنہ ۵۳۱ء میں قباد کی جگہ خسرو نوشیروان نے لی[2] ایرانیوں میں اسکی عدل پروری اب تک مشہور ہے، مگر اس کو یہ مبارک لقب اپنے عزیزوں اور افسروں اور ہزاروں بے گناہوں کے قتل کے بدولت ملا، مزدکی فتنہ کو اس نے تلوار کے زور سے دبایا اور کیش زردشتی کو دوبارہ فروغ دینا چاہا، مگر خود اس کا بیٹا نوشزاد تثلیث پرستی کی طرف مائل تھا، اسکے باداش میں قید ہوا اور قید سے بھاگ کر ایک عیسائی فوج لیکر زردشتیوں سے صف آرا ہوا اور مارا گیا،

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم جلد ۲۱ ص ۲۲۳ [2] غرر اخبار الفرس ثعالبی ص ۵۹۸ پیرس

۵۷۹ء میں نوشیرواں نے وفات پائی، اور ایران کا پایہ تخت، ہرمز چہارم کے حصہ میں آیا، اغیار کی دست اندازیوں کے ساتھ اندرونی بدنظمی اور باہمی خانہ جنگی، بادشاہوں کی تعاقب شعاری، امراء کی عیش پرستی اور عوام کے اخلاقی انحطاط میں برابر ترقی ہی ہوتی گئی، یہانتک کہ ۶۳۶ء میں مجاہدین اسلام کی غیرتمندی کے طوفانی سیل کے سامنے ملک فارس کی یہ سلطنت ہوئی شمع ہمیشہ کے لئے بجھ گئی،

اوپر کے بیانات سے معلوم ہوا ہوگا کہ ایران کی سرزمین نغمۂ توحید سے کبھی گوش آشنا نہیں ہوئی اخلاق کے متعدد ابواب ہیں، جو اُن کے آئین میں کبھی داخل نہیں ہوئے، یزدان و اہرمن نور و ظلمت اور خیر و شر کی بھول بھلیوں نے انکو ہمیشہ سرگرداں رکھا، حکومت اور شاہی کے متعلق انکا تخیل خدائی کا ہمرتبہ تھا، اسلام و فارس کی جنگ میں مغیرہ بن شعبہؓ مسلمانوں کی طرف سے سفیر بنکر جب سپہ سالار ایران کی بارگاہ میں گئے اور آزادی کے ساتھ جاکر اسکے برابر بیٹھ گئے، تو ایرانی امیروں کو اس میں اپنے نائب السلطنت کی توہین نظر آئی اور مغیرہ کو سامنے سے ذلت کے ساتھ اٹھا دیا انھوں نے جواب میں کہا ہم عربوں میں دستور نہیں کہ ایک خدا بنکر بیٹھے اور دوسرے اس کے سامنے غلامی اور بندگی کریں[1]"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے تقریباً ڈیڑھ صدی پیشتر سے ایران میں جس قسم کا سیاسی اتحاد شروع ہوگیا تھا، وہ روز بروز بڑھتا ہی گیا، اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ فارس کے روحانی آتشکدہ میں اب زندگی کی کوئی چنگاری باقی نہیں رہ گئی تھی، اسی لئے

[1] تاریخ طبری واقعات ۱۴ھ ص ۲۲۷، ۲۲۴، مطبع یورپ،

اسلئے جب اسلام کا نور طلوع ہوا تو اسکے شیوع کیلئے کوئی دوسرا پردہ بیچ میں حائل نہ ہوا ہر جان ملکم جن کا مسیحی تعصب عیاں کر اسلامی کہنکی زبان سے قرآن عرب کا لقب دلوا لیا ہے، فتح فارس کے متعلق حسب ذیل رائے دیتے ہیں:

"یزدجرد ثالث کا عہد حکومت اس لئے یادگار ہے، کہ اسی زمانہ میں فارس کی قدیم شہنشاہی کا تختہ برہم تن سوسمار خواروں کے ایک دستہ نے الٹ دیا کہ اسی تحقیر آمیز لقب کے ساتھ عرب قبائل کے یہ مغرور ہمسایے انکا ذکر کرتے تھے، اس انقلاب عظیم کی علت کوئی معمولی سبب نہیں ہو سکتا، مسلمان، فارسی مورخین کچھ تو اپنے حب وطن اور کچھ اہم وہم پرستی کی بنا پر اس واقعہ کو ایک معجزہ عظیم خیال کرتے ہیں جن کے ذریعہ سے خدا نے محمدؐ کی صداقت کو ظاہر کر دیا لیکن جو لوگ بنیادی حیثیت سے اس واقعہ پر غور کرتے ہیں، انھیں فوراً نظر آجاتا ہے، کہ فارس کی ایسی سلطنت جو عیش پرستی کے ہاتھوں لاغر و نحیف ہو چکی ہو، جسمیں اندرونی منافقات کے باعث بدنظمیاں پھیلی ہوئی ہوں، جو بیرونی محاربات سے یکسر خستہ و ناتوان ہو اور جو اپنی کبر سنی اور نقاہت سے قعر زوال کی جانب خمیدہ پشت ہو اسکے لئے پرجوش قرآن عرب کی مدافعت کرنا سخت دشوار تھا۔"[1]

مگر سوال یہ ہے کہ پاک نژاد ساسانیوں کی خستگی و ناتوانی، نقاہت و کمزوری قرآن عرب ہی کی ترقی کی کیوں تمہید بنی؟ کیا بہتے عربوں کے پاس اس سے زیادہ سامان جنگ اور سپاہی تھے، جو عراق و ایران کے اخیر اخیر معرکوں میں بھی ایرانی عربوں کے مقابلہ میں لاتے رہے، واقعہ یہ ہے کہ زرتشت کی آگ میں اب گرمی نہیں باقی رہی تھی نور و ظلمت

[1] ملکم صاحب کی تاریخ ایران جلد اول ص ۱۳۳،

خیر و شر، نیکی و بدی کے فلسفہ نے ایران کی ہر قسم کی عملی طاقت فنا کر دی، تھی، "یزدان اور اہرمن" کی دوعملی حکومت نے روحانی امن و امان کی سلطنت برباد کر دی تھی بیسیوں چھوٹے چھوٹے بڑے فلسفیانہ مذہبی فرقے پیدا ہو گئے تھے جن میں سب سے اہم مانوی فرقہ تھا جو عیسائیت اور مجوسیت کا معجونِ مرکب تھا، آخر میں مزدک کی فرقہ کی بیہمانہ تعلیم نے ایران کی اخلاقی روح کو اور بھی موت کے قریب کر دیا، نوشیروان نے تلوار کی نوک سے اس فتنہ کو دبایا اور اسکے صلہ میں "بادشاہ عادل" و "دادگر" کا خطاب بھی پایا، تاہم ایران کی روحانی زندگی ان خونی کے چھینٹوں کے بعد بھی اسی طرح تشنہ لب رہی جس طرح پہلے تھی، اور منتظر تھی کہ دنیا کے خشک صحرائے عرب سے چشمۂ اہل ادھر آئے تو وہ اپنی پیاس بجھائے،

عیسائی روم آغازِ اسلام کے وقت جس قدر ایران کی جسمانی و روحانی شہنشاہی کے اوراق منتشر و پراگندہ تھے، روم کی قیاے سلطنت اس سے کچھ کم کرم خوردہ نہ تھی، حالانکہ یہ وہی رومۃ الکبریٰ ہے، جو یونان کے زوال کے بعد دنیا کی سب سے بڑی سلطنت سمجھی جاتی تھی، اور جس کے ایک تاجدار جولیس سیزر کا نام ہمیشہ کے لئے قیصر کی صورت میں بادشاہ و شہنشاہ کا مرادف بن گیا حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اسی سلطنت میں مبعوث ہو کر دنیا کو امن و سلامتی کا پیام سنا کر رخصت ہوئے، انکے رفع و صعود کے بعد ہی انکے شاگردوں میں فرقہ آرائیاں شروع ہو گئیں[1] پال نے جو ایک نو عیسائی یہودی تھا اس طرح عیسائیوں پر غلبہ پایا کہ اسکے بدعات کی خاک میں اصلی عیسویت ہمیشہ کیلئے دفن ہو گئی اور باپ بیٹے اور روح القدس کا مشرکانہ عقیدہ ایسا

[1] تفصیل کیلئے فہرست ابن ندیم دیکھو ص ۴۴۲ مصر

داخل ہو گیا، اور تورات جس کا کوئی نقطہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی مٹا نہیں سکتے تھے[1] وہ انکی روحانی شاگردی کے مدعی پال، کے ہاتھوں ہمیشہ کیلئے لعنت قرار پائی ۳۲۵ء میں رومی سلطنت کے مشرقی و مغربی دو حصے ہو گئے، مشرقی حصہ کے تاجدار قسطنطین اعظم نے عیسائی مذہب اختیار کیا اور رفتہ رفتہ پوری رومی حکومت میں یہ مذہب پھیل گیا مگر درحقیقت اس مشرقی تاجدار روم کے اس قبولِ مذہب کا جذبہ اخلاص و صداقت سے زیادہ سیاست اور سلطنت کی مصلحت پر مبنی تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اب باپ بیٹے اور روح القدس کی تثلیثی الوہیت میں ہر نیا ملک جو فتح ہوتا اسکا دیوتا کسی نہ کسی نام اور رسم سے اس مذہب میں شامل ہو جاتا، تختِ سلطنت کے غیر متوقع حصول نے مذہبی خاکسار دل میں یہ حوصلہ پیدا کر دیا کہ کلیساؤں نے مذہبی شہنشاہی کا خواب دیکھنا شروع کر دیا، اس کیلئے عقائد کی وہ لڑائیاں کھڑی کی گئیں کہ شاہانہ سایہ میں بیٹھ کر کونسلوں نے خدا کے دین کا خاکہ تیار کیا، اتحاد اور اجتماع کی ہر نئی کوشش نئی مذہبی تفریق کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور ایک عیسوی مذہب ایک صدی کے اندر اندر بیسیوں فرقوں میں تقسیم ہو گیا،

۳۳۷ء میں قسطنطین کی وفات پر مذہبی خانہ جنگی کے ساتھ ساتھ رومیوں کی سیاسی خانہ جنگیوں کی زیر خاکستر آگ بھی زور شور سے شعلہ زن ہوئی، ارکان سلطنت میں مختلف گروہ بندیاں ہو گئیں اور باہمی نفاق اور فتنہ و فساد کا بازار گرم ہو گیا، بالآخر سلطنتِ روم مختلف صوبوں میں تقسیم ہو کر مختلف دعویداران حکومت کے حصہ میں[2] آئی، نا قابل فرمانروا دل کی کمزوری دیکھ کر ایک طرف گوتھ، وندال وغیرہ بعض وحشی قوموں نے حملے شروع کئے اور

---

[1] انجیل متی ۵:۱۷-۱۸ [2] یہ مضامین عیسائیوں کی انجیل کے حصہ اعمال اور خطوط میں جا بجا تصریح مذکور ہیں،
[3] گبن کی تاریخ زوال و انحطاط سلطنت روم، جلد اول ص ۴۸۸، ۴۹۱،

دوسری طرف خود دو افتادہ صوبوں کی رعایا بغاوت پر آمادہ ہو گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ پانچویں صدی عیسوی کے آخر میں سلطنت روم کا مغربی بازو جو برطانیہ، فرانس وغیرہ پر مشتمل تھا، بالکل کٹ گیا اور خود روم کا دارالحکومت دشمنوں کے حملوں سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اس وقت یعنی پانچویں صدی کے تیسرے میں لوگوں کو صاف نظر آرہا تھا، کہ ان کے مورث اعلیٰ نے جو بارہ گرگسوں کو خواب میں دیکھا تھا، اور جسکی بنا پر اس زمانے کے کاہنوں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ یہ سلطنت بارہ صدیوں تک قائم رہے گی، اب اس پیشینگوئی کے پورا ہونے کا وقت آگیا ہے۔ گبن اس زمانہ کی تصویر ان لفظوں میں کھینچتا ہے[1]

"اس پیشین گوئی نے جس پر اس قوم نے اپنے عروج و اقبال کے زمانہ میں کبھی اعتبار بھی نہ کیا تھا، اب بارہ صدیوں کے خاتمہ پر جب کہ ہر طرف سے ذلت اور بدقسمتی کا سامنا تھا، اہل روم کو یاس آمیز جذبات سے پُر کر دیا۔ ..... لیکن ان کے زوال کی علامتیں گرگسوں کے خواب سے زیادہ واضح و نمایاں موجود تھیں، رومن حکومت مخالفین کی نظروں میں روز بروز زیادہ کمزور اور خود اپنی رعایا کی نظر میں زیادہ ظالمانہ اور ناقابل برداشت ہوتی جاتی تھی کفایت شعاری جتنی زیادہ ضروری ہوتی جاتی تھی اسی نسبت سے اسکی جانب سے بے اعتنائی بڑھتی جاتی تھی، اور جس نسبت سے رعایا کے مصائب روز افزوں تھے، اسی نسبت سے ٹیکس میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔[2]"

امرا نے اپنے مصارف کا بار بھی عام رعایا پر ڈالنا شروع کیا، جس کے باعث وہ اپنی قلیل آمدنی سے بھی محروم ہو گئی، محصول کی عدم ادائیگی کی صورت میں رعایا پر اس قدر جبر کیا جاتا تھا کہ اس کے دل میں حکومت کی طرف سے نفرت و عداوت پیدا ہو گئی، یہاں تک کہ وہ رومن

---

[1] گبن کی تاریخ زوال سلطنت روم" جلد دوم باب ۳۶ و باب ۳۸۔ [2] ایضاً ص ۴۶۱،

قوم جو کبھی اپنے اس لقب پر فخر کرتی تھی، اب اپنے کو اس قوم کی طرف منسوب کرتے شرمانے لگی اور رومن حکومت پہر وحشی سے وحشی سلطنت کی محکومیت کو ترجیح دینے لگی، امرا، وزرا اور سلاطین خود اپنی ناعاقبت اندیشیوں سے رعایا کو اپنا دشمن بناتے، اور جب بغاوت ہوتی تو فوجکشی کرتے اور ناکام رہتے، غرض اندرونی بدنظمیوں سے ملک کی جو نوبت پہنچ گئی تھی کہ گبن کے الفاظ میں

"اگر اس وقت روم کے تمام بیرونی وحشی مخالفین قابو بھی ہو جاتے تو اُن کی مجموعی معدومیت بھی سلطنت کے مغربی بازو کو زوال و بربادی سے نہیں بچا سکتی تھی"[1]

پانچویں صدی کے خاتمہ پر مغربی حصہ کے نکل جانے کے بعد مشرقی صوبوں تک یعنی ڈینوب سے لیکر دجلہ و نیل تک کی سرزمین روم کے ماتحت رہ گئی تھی، لیکن اسکی حالت بھی روز بروز نازک سے نازک تر ہوتی جاتی تھی، مورخین کا بیان ہے کہ رومن فوج کی مجموعی تعداد جو ایک زمانہ میں ۶۴۵۰۰۰ تھی، اب شاہ جسٹینین کے زمانہ (یعنی ۵۲۷ء) میں گھٹ کر ایک چوتھائی سے بھی کم یعنی کل ۱۵۰۰۰۰ رہ گئی تھی، اور وہ بھی نہایت متفرق و ابتر حالت میں، رسالہ کی جیبیں خالی تھیں، فوج کی تنخواہیں چڑھی ہوئی تھیں، اور امرا و اعیان سلطنت اپنے ذاتی مصارف کے لئے ہر طرح کے حیل و فریب، رشوت ستانی اور لوٹ مار کو جائز رکھتے تھے، فوج میں یوں تو بہت سے سپاہیوں کے نام لکھے ہوئے تھے، لیکن میدانِ جنگ میں جانیکے وقت بہت تھوڑے سے لوگ تیار ہوتے، فوجی افسر فنِ جنگ کے بجائے اپنا وقت باہمی حسد و رقابت میں صرف کرتے، اور ہر افسر کی یہ کوشش رہتی کہ دوسرے افسر کی بدنامی و ذلت

---

[1] گبن کی تاریخ زوال و انحطاط سلطنت روم، جلد ۲ ص ۴۶۱،

فائدہ اٹھاکر خود ترقی و منصب حاصل کرتے،

اندرونی بدنظمیوں پر مستزاد یہ تھا کہ بیرونی غنیم اہل روم کو ایک دم کھلے چین سے بیٹھنے نہیں دیتے تھے، روم فارس کے درمیان مدت سے لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا، پھر ہون، لومبارڈس، گوتھس، وندالس وغیرہ کے پیہم حملے روم کی رہی سہی قوت کو اور بھی پامال کر رہے تھے،

الغرض چھٹی صدی عیسوی کے خاتمہ پر یعنی خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے چار یا دو سال بعد روم بقول گبن کے اپنے زوال کے پست ترین نقطہ تک پہنچ گیا تھا، اور گبن کی زبان میں، اس کی مثال بعینہٖ اس عظیم الشان درخت کی ہو گئی تھی، جس کے سایہ میں ایک وقت تمام اقوام عالم آباد تھیں، مگر اس پر ایسی خزاں آئی کہ برگ و بار کے ساتھ اسکی شاخیں اور ٹہنیاں بھی رخصت ہو گئی تھیں اور اب خالی تنہ خشک ہو رہا تھا، خود پایۂ تخت کے اندر غنیم کے گھس آنے کا ایسا خوف تمام آبادی پر چھایا ہوا تھا، کہ تقریباً کل کاروبار بند ہو گئے تھے، وہ بازار اور تماشا گاہیں جہاں دن رات چہل پہل رہتی تھی، اب ویران اور سنسان پڑی تھیں، عیش پرستی کا یہ عالم تھا کہ لوگ ایک عرصہ سے تاہل کے بجائے تجرد کی زندگی زیادہ پسند کرتے تھے تاکہ زیادہ آسانی اور آزادی کے ساتھ اپنے شہوانی جذبات کی تشفی کر سکیں،

ملک کی عام سیاسی و اخلاقی حالت سے قطع نظر کر کے جب ہم مذہبی پہلو پر نظر کرتے ہیں، تو اس سے بھی زیادہ دلخراش تصویر نظر آتی ہے، بت پرست رعایا کو چھوڑ کر جو ستاروں دیوتاؤں اور بتوں کی پوجا میں بدستور مصروف تھی اور لوگ جنھوں نے عیسائیت قبول بھی کر لی تھی، وہ بھی باپ، بیٹا، روح القدس اور مریم کی خدائی کے معتقد تھے، حضرت

عیسیٰؑ اور مریمؑ و روح القدس کی شخصیت اور مرتبہ کی تعیین نے بیسیوں فرقے پیدا کر دیئے تھے جنمیں زبانی مناظروں سے گذر کر جنگ و جدل کی نوبت آگئی تھی، یہانتک کہ ۵۱۴ء میں خود عیسائیوں کے دو گروہوں کے درمیان ایک عظیم الشان مذہبی جنگ چھڑی جسمیں ۲۵۰۰۰ عیسائیوں کو خانہ جنگی ہونا پڑا[1] اس جنگ عظیم کے علاوہ ہمہ وقت ہر فریق دوسرے فریق کے خون کا پیاسا رہا کرتا اور بار بار چھوٹی چھوٹی باتوں پر کشت و خون کی نوبت آجاتی پادریوں نے اپنے منصب مذہبی کو حصول جاہ کا ایک ذریعہ قرار دے لیا تھا، اس بنا پر محض حبِّ جاہ کی خاطر وہ ہر طرح کی ناجائز کوششوں میں مصروف رہتے، ان پادریوں کے ایک اسقفِ اعظم، سینٹ سرل نے جو جو سفاکیاں کی ہیں اُنکی تفصیل کے لئے ایک پوری کتاب درکار ہے، ایک مرتبہ اس نے اپنے مریدوں کو ہمراہ لیکر غیر مسلح یہودیوں پر دھاوا کیا، اور ان سب کو جلا وطن کر دیا، انکا مال و اسباب سرل کے مریدوں کے ہاتھ لگا، اور ان کے معابد زمین کے برابر کر دیئے گئے، سرل کا حریف ارسٹس نامی پادری تھا، ایک روز جب ارسٹس راستہ سے گذر رہا تھا، تو ۵۰۰ راہبوں کی جماعت اس پر ٹوٹ پڑی اور اپنی سنگ باری سے اسکو خون میں نہلا دیا، سرل کی ایک خاتون دوست ہپشیا نامی تھی، ایک روز وہ اپنی درسگاہ سے واپس آرہی تھی، کہ راہبوں کے ایک بہت بڑے گروہ نے اس پر حملہ کر دیا، گاڑی سے اتار کر برہنہ کی گئی، اور اس حالت میں تمام شہر کی سڑکوں پر گھسیٹتے ہوئے اسے کلیسا میں لائے جہاں پہنچکر پادری پیٹر کے گرزسے اس کا خاتمہ کر دیا گیا، قتل کے بعد اس کا گوشت ہڈیوں سے جدا کیا گیا، نعش کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے، اور آلائش جسم کو آگ میں

---

[1] گبن جلد ۳ ص ۳۴۴ [2] ایضاً ص ۲۲۰ [3] ایضاً ص ۳۲۳، نیز ڈیپر تاریخ معرکہ آرائی مذہب و سائنس، ص ۱۵۶،

ڈالدیا گیا، یہ واقعات ایسے ہیں، جنکے ذکر سے آج قلم لرزتا ہے، مگر یہ عیسائی مذہب کے علمبرداروں کا سب سے روشن کارنامہ ہے،

یہی حالت ان تمام ملکوں کی تھی، جہاں رومیوں کے زیر سایہ عیسوی مذہب پھیلا ہوا تھا، یعقوبی نسطوری اور دوسرے فرقے جو سرکاری عیسوی مذہب سے الگ تھے، وہ دور دراز صوبوں اور ملکوں میں اپنی پناہ ڈھونڈھتے تھے، نائیس کی کونسل کے بعد آریوس اور اس کے حریفوں میں جو معرکہ آرائیاں ہوئیں انہوں نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ شہزادۂ امن کا مذہب ان جنگجویوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہونے سے بچ نہیں سکتا،

مسٹر مارس، جو پیغمبر اسلام کو نعوذ باللہ، بہت بڑا مکار قرار دیتے ہیں اپنی تاریخ ہندوستان میں ضمناً ایک موقع پر تحریر کرتے ہیں:۔

"اس نازک موقع پر (یعنی ظہور اسلام کے وقت) ان بے باکانہ بدعات کے درمیان جو چرچ کو پنجہ کر رہی تھے، اور اختلافات کے اس غیر منقطع سلسلہ کے درمیان جو چرچ میں ایک ہلچل ڈالے ہوئے تھے، اگرچہ مشرق میں اصلی مسیحیت کی شعاع نظر آتی تھی، لیکن بہت ہی مدھم روم کے قیصروں کی قوت کچھ تو اندرونی نزاعوں اور کچھ بیرونی حملوں کے باعث اپنی بنیاد سے اکھڑ کر تنزل کی طرف تیز رفتاری کیساتھ جا رہی تھی، یہود بے صبری کیساتھ گلیلی کے اس تیسرے شخص کے مذہب پر نظر کر رہے تھے، جس کے دین کو اب شاہ قسطنطین کے مذہبی ہو جانے کے بعد پوری شان و شوکت اور شاہی عظمت حاصل ہو گئی تھی، اور ہر اس تحریک کی مدد کیلئے تیار تھے، جو ایسے قابل نفرت مذہب کا خاتمہ کرنا چاہے، ..... اہل فارس نہایت غیظ و غضب کے ساتھ ان پر جوش و تازہ دار فتحمند عیسائیوں کو دیکھ رہے تھے، جنہوں نے انکے معبود آتش شمس کا

بیحرمتی کی تھی اور شرک کی ساری دنیا اپنے برباد شدہ معبودوں اور ڈھئے ہوئے معبودوں پر ماتم کر رہی تھی، ان کے انتقام کے لئے آمادہ اور مستعد تھی"[1]

مارس صاحب واقعات کی نقشہ کشی میں خواہ کتنا ہی مسیحی رنگ بھریں لیکن نفس واقعات کی صحت اُن کو شاید ہم سے بھی زیادہ مسلّم ہے،

بہرحال مورخین کا بیان ہے کہ تیسری صدی سے لیکر ساتویں صدی تک مسیحیت کی جو حالت رہی ہے، وہ اسکے لئے باعثِ ننگ ہے، مشرکانہ رسوم نے مذہب کی جگہ لے لی تھی اصل رومی بت پرستانہ عقیدوں نے مسیحی مذہب کا روپ بھر لیا تھا حضرت مسیحؑ کے ناسوتی اور لاہوتی دو عنصروں کی تحلیل مصر کو قابو میں لانے کے لئے کیگئی، جس سے حضرت مسیحؑ کے وہی ایک ہے، کی تعلیم ہمیشہ کیلئے انکے مذہب سے مٹ گئی، ضعیف الاعتقادی اس درجہ بڑھ گئی تھی، کہ ایک قبر پرستی عام ہو گئی تھی اور ہر بڑے پادری سے اسکی وفات کے بعد دعا مانگی جاتی تھی، ملک شام میں جو بڑے پادری اور بطریق تھے، اُنکے معتقد انکو سجدے کرتے تھے[2] مسیحؑ و مریمؑ روح القدس اور حواریین اور مسیحیت کے دیگر اساطین کے مجسمے بنا کر اُن کی پرستش اس کثرت سے ہونے لگی کہ اسکی نظیر زمانہ بعد کے رومن کیتھولک فرقہ کی بت پرستی میں بھی نہیں ملتی[3]

سیل صاحب اپنے ترجمۂ قرآن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں،

"گرجا کے پادریوں (CLERG) نے مذہب کے ٹکڑے کر ڈالے تھے اور امن و محبت اور

---

[1] مارس کی تاریخ ہندوستان جلد اول ص ۲۱۸ [2] سنن ابن ماجہ باب حق الزوج علی المرأۃ [3] سیل صاحب کا انگریزی ترجمۂ قرآن مقدمہ ص ۲۵-۲۶،

نیکی کو مفقود کر دیا تھا، اصل مذہب کو بھول گئے تھے اور اسکے متعلق اپنی خیال آرائیوں پر جھگڑتے تھے

اسی تاریک زمانہ میں اکثر وہ توہمات جو رومن چرچ کیلئے باعث ننگ ہیں، مذہبی صورت میں قائم کئے

گئے، خصوصاً ولیوں اور مجسموں کی پرستش نہایت بے شرمی سے ہونے لگی،،

کی نیس کاؤنسل کے بعد مشرقی چرچ روزانہ کے مناظرات میں مشغول ہو گیا، اور ایرینس سلینس نسطورنیس

اور یوٹیکنیس کے جھگڑوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، انصاف علانیہ فروخت کیا جاتا تھا اور ہر طرح کی

بدعنوانیاں ہوتی تھیں،

مغربی چرچ میں ڈمیسس اور ارسلسی نس نے بشپ کی جگہ حاصل کرنے کیلئے قتل تک نوبت پہنچادی

اور آخر ڈینس کی فتح ہوئی، اس موقع پر کہا جاتا ہے کہ سیسی نیس (Sicininus) کے

گرجا میں ایک روز میں ۱۳۷ آدمی قتل کئے ہوے پائے گئے، اور کوئی حیرت نہیں کہ یہ لوگ ان جگہوں

کے اسقدر خواہاں ہوتے تھے، اسلئے اس ذریعہ سے انکو گرانبہا تحفے ملتے تھے، اپنی گاڑیوں پر نہایت

تزک و احتشام سے نکلتے تھے، اور انکے دسترخوان پر بادشاہوں سے زیادہ شان و شوکت ہوتی تھی،،

ان مناقشات کا سبب زیادہ تر شہنشاہ ہوا کرتے تھے، جسٹنین کے وقت میں حالت اور زیادہ خراب

ہو گئی، اس کے نزدیک اپنے عقیدہ کے مخالفوں کو مار ڈالنا کوئی جرم نہ تھا،

بادشاہوں اور پادریوں میں عقائد اور اخلاق کی جو خرابیاں پھیلی ہوئی تھیں اُسکا لازمی نتیجہ

یہ تھا کہ عوام کی حالت بھی مبتذل ہو گئی، انکا مقصد صرف روپیہ پیدا کرنا رہ گیا، خواہ کسی ذریعہ

سے ہو اور اس روپیہ کو وہ نفاست اور عیاشی میں اڑاتے تھے،

عقائد کی خرابی کے علاوہ روم و فارس کی سلطنتیں بھی کمزور ہو گئی تھیں، شہنشاہ

قسطنطین کے بعد روم کی سلطنت روز بروز کمزور ہوتی گئی، عام طور سے اسکے جانشین بزدلی اور مظالم کیلئے مشہور تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت تک ملک کا مغربی حصہ گاتھ وحشی لوگوں نے روند ڈالا تھا، .... یونانیوں کی عیش پسندی اور اخلاقی خرابیوں نے انکی قوت کو زائل کر دیا تھا رومیوں نے عیسوی مذہب کو جس صورت میں قبول کیا تھا، اسکی تصویر ڈریپر کے الفاظ میں حسب ذیل ہے :-

"دونوں (عیسائیت اور بت پرستی) کی باہمی کشمکش کا یہ نتیجہ ہوا کہ دونوں کے اصول شیر و شکر ہو گئے اور ایک نیا مذہب پیدا ہو گیا، جس میں بت پرستی و عیسائیت دونوں کی شانیں پہلو بہ پہلو جلوہ گر تھیں[1]، .... جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، وہ مذہبی عقائد جنکی تفصیل ٹلمین نے بیان کی ہے، متغیر ہو کر ایک عام پسند مگر پایۂ اخلاق سے گرے ہوئے مذہب کی شکل اختیار کرتے گئے، ان عقائد میں قدیم یونانی اصنام پرستی کا عنصر مخلوط ہو گیا .... عقیدۂ تثلیث قدیم مصری روایات کے سانچہ میں ڈھال لیا گیا .... مریم عذرا کو خدا کی ماں کا لقب دیا گیا[2]"

اسی زمانہ میں ایک گروہ "مریمی" کے نام سے پیدا ہوا جو حضرت مریم کو بھی شریک الوہیت کر کے بجائے اقانیم ثلاثہ کے اقانیم اربعہ کا اعتقاد رکھتا تھا، جس کی تردید قرآن پاک نے سورۂ آل عمران میں فرمائی ہے، اسی کے ساتھ اور بہت سے معتقدات رومی بت پرستوں نے لیکر عیسائیت میں داخل کئے گئے، اور نام بدل بدل کر رومی بت پرستوں کے دیوتاؤں کے رسوم مقدس عیسائی کلیساؤں میں جگہ پانے لگے اور ان مسائل میں بھی مختلف فرقوں کے اندر اختلافات باہمی

نہایت شد و مد سے پیدا ہوئے، یہاں تک کہ ان مذہبی مناقشات کے تصفیہ کے لئے حکومت کو بارہا دست اندازی کرنا پڑتی تھی، رفتہ رفتہ رشوت ستانی کا بازار گرم ہو گیا، اور یہ حالت ہو گئی کہ جو شخص کسی بڑے دنیاوی عہدہ دار کے پاس جتنا رسوخ و تقرب حاصل کر سکتا اسی نسبت سے اس کو بڑی دینی خدمت مل جاتی تھی[1]

یہ تو مسیحی دنیا کے مشرقی حصہ کا حال تھا، مغربی حصہ کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب تھی، یہاں رومن امپائر کی اتحتی میں مذہبی مناصب کیلئے کشت و خون ایک عام و معمولی واقعہ تھا، یہاں تک کہ بعض دفعہ مقتولین کی تعداد کسی سخت خونریز جنگ کے مقتولوں کے مساوی پہنچ جاتی، چنانچہ ایک مرتبہ جب ایک اعلیٰ مذہبی عہدہ کیلئے دو پادریوں کے درمیان مقابلہ ہوا، تو صرف ایک دن میں ۱۳۷ آدمی کام آئے[2]، اس سفاکانہ جد و جہد کا باعث صرف یہ تھا کہ اس زمانہ کے مذہبی عہدے، اکتساب زر حصول لذائذ اور کسب جاہ کے بہت بڑے ذرائع تھے، چنانچہ جتنی نفیس غذائیں پادریوں کے دسترخوان پر رہتی تھیں، اتنی بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی تھیں[3]،

سلاطین اور مذہب کے حامیوں کے اخلاق کا پرتو عام رعایا اور پیروؤں پر لازمی طور پر پڑتا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ بد اخلاقی، اسراف اور ہوس پرستی، مسیحی دنیا کی آب و ہوا میں سرایت کر گئی، لوگ ہر طرح کے ناجائز وسائل سے روپیہ کماتے اور کمال بیدردی کے ساتھ اپنے مسرفانہ لہو و لعب اور عیاشیوں میں اڑا ڈالتے[4]،

---

[1] سیل صاحب کا انگریزی ترجمۂ قرآن مقدمہ ص ۲۶ [2] ایضاً ص ۲۶ [3] ایضاً ص ۲۶ [4] ایضاً ص ۲۶-۲۸،

پوپوں نے اور اُنکے بعد درجہ بدرجہ مذہبی عہدہ داروں نے اپنی اپنی جگہ پر شہنشاہ نہ بلکہ خدائی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے، جو وہ زمین پر کھولتے تھے، وہ آسمان پر کھولا جاتا تھا، اور جو یہاں بند کرتے تھے، وہ وہاں بھی بند ہو جاتا تھا، قرآن مجید نے اُن کی اسی حالت کا ذکر اس آیت میں کیا ہے کہ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ، انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو اپنا خدا بنا لیا تھا،

دینداری کا سب سے اہم جزو تجرد کی زندگی اور رہبانیت تھی، ہر قسم کے آرام و آسایش سے جسم کو محروم کر کے ہر قسم کی تکلیف و عذاب میں اپنے کو تمام عمر مبتلا رکھنا بہترین عبادت تھی، کسی نے تمام عمر غسل نہ کرنے کی قسم کھائی تھی، کسی نے اپنے کو دلدل میں ڈالدیا تھا، کوئی اپنے کو بوجھل زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھا، کسی نے سایہ میں بیٹھنے کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا، کسی نے اپنے کو اندھیری کوٹھری میں بند کر لیا تھا، ماں باپ، عزیز و اقارب اہل و عیال دینداری و تقویٰ شعاری کی راہ کے کانٹے تھے، اُن سے پرہیز بلکہ اُن سے نفرت کمال تقویٰ سمجھا جاتا تھا اور اسی پر فخر کیا جاتا تھا[1]

ہندوستان دنیا کے ان متمدن ملکوں میں جہاں کوئی بااثر مذہب قائم تھا، ایک ہندوستان بھی ہے، ہندوستان کے تمدن کے پانچ مختلف دور گذرے ہیں، ایک اصلی ہندو، ویدک عہد جو دو ہزار سال ق م سے لیکر تقریباً چودہ سو سال ق م تک رہا، دوسرا دور جنگ یعنی جس میں کوروؤں اور پانڈوں وغیرہ کے مناقشات رہے، اور جو چودہ سو ق م سے لیکر تقریباً ایک ہزار قبل مسیح تک رہا، تیسرا دور عقلیت جس میں حکما و عقلیین کا دور دورہ تھا، اور جو ایک ہزار قبل

[1] تاریخ اخلاق یورپ لیکی کی دوسری جلد میں یہ واقعات مفصل لکھے ہیں،

مسیح سے لیکر تقریباً تیسری قبل مسیح کے نصف تک رہا، چوتھا دور بودھ جس میں اس مذہب کا عروج، تقریباً دو سو پچاس (۲۵۰) قبل مسیح سے لیکر پانچویں صدی عیسوی کے خاتمہ تک رہا، پانچواں دور پرانک جس میں بجائے وید یا گوتم بدھ کی تعلیمات کے پرانوں کی تلقین پر عمل درآمد تھا، اور یہ عہد تقریباً پانچویں صدی عیسوی کے اواخر سے لیکر مسلمانوں کے داخلہ ہند تک قائم رہا،

مورخین کا اجماع ہے کہ قدیم ہندوستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ تاریک اور نقائص سے معمور آخری دور ہے، جو تقریباً ۵۰۰ء سے شروع ہوتا ہے، اس دور کے نمایاں خصوصیات حسب ذیل تھے:-

(۱) شرک جو ابتدا ہی سے ہندوستان کے خمیر میں داخل تھا، اب وہ حد اعتدال سے باہر ہو گیا، چنانچہ وید میں جو ۳۳ دیوتاؤں کی تعداد تھی وہ اب بڑھتے بڑھتے ۳۳ کروڑ دیوتاؤں تک پہنچ گئی،[1]

(۲) ویدک عہد میں اصنام کی پرستش کا رواج نہ تھا، لیکن اس زمانہ میں مندروں کے اندر بت پرستی علی العموم رائج ہو گئی،[2]

(۳) مندروں کے محافظین، بد اخلاقی کے سرچشمے تھے جو لاکھوں کروڑوں ناواقف پرستش کرنے والوں کو مذہب کے نام سے خوب لوٹتے،[3]

(۴) ویدک عہد میں ساری ہندو قوم میں یگانگی تھی، لیکن اب ذات پات کی تفریق شروع ہو گئی، جو نظام معاشرت کے لئے تباہ کن تھی،[4]

(۵) عورتوں کو محکومیت و غلامی کا درجہ دیا گیا،[5]

(۶) قوانین اس قدر غیر معقول و نامنصفانہ وضع کئے گئے جن سے علانیہ بعض ذاتوں کی پاسداری

---

[1] آرسی دت کی ہندوستان قدیم جلد ۳ ص ۲۷۶ [2] ایضاً ص ۲۸۱ [3] ایضاً ص ۲۸۳ [4] ایضاً ص ۳۰۷ [5] ایضاً ص ۳۳،

وحمایت اور بعض پر جبر وستم مقصود تھا، مثال کے لئے چند قوانین درج ذیل ہیں،

(الف) برہمن کو کسی حالت میں، خواہ وہ کتنے ہی سنگین جرائم کا مرتکب رہ چکا ہو سزائے موت نہیں دیجا سکتی،

(ب) کسی اونچی ذات کے مرد کا کسی نیچی ذات کی عورت کیساتھ زنا کرنا کوئی جرم نہیں،

(ج) کسی بودھ راہبہ تک کی عصمت دری کی سزا میں کچھ جرمانہ کافی تھا،

(د) اگر کوئی اچھوت ذات کا شخص کسی اعلیٰ ذات والے کو چھو لے تو اسکی سزا موت ہے،

(ہ) اگر کوئی نیچی ذات والا اپنے سے اونچی ذات والے کو مارے تو اس کے اعضاء قطع کر ڈالنا چاہیئے، اگر اسے گالی دے تو اسکی زبان کاٹ ڈالنی چاہیئے، اور اگر اسے تعلیم دینے کا دعویٰ کرے تو گرم تیل اس کے منہ میں ڈالنا چاہیئے،[1]

(ز) راجاؤں کے محل میں بادہ نوشی کثرت سے رائج تھی، اور رانیاں اسی حالت خمار میں جامۂ عصمت اُتار ڈالتی تھیں،[2]

(ح) شاہراہوں پر آوارہ گرد و جرائم پیشہ افراد کا مجمع لگا رہتا تھا،[3]

(ط) خدا کی تلاش آبادیوں اور بازاروں میں کرنے کے بجائے جنگلوں اور پہاڑوں میں کیجاتی تھی، جسم کو سخت سے سخت ایذا اور تکلیف اُن کی بہترین عبادت تھی،

(ی) اوہام اور خیالاتِ فاسدہ، بھوتوں، پریتوں اور سیکڑوں قسم کے ظنون و اوہام انکا مذہب تھا، اور آسمان سے لیکر زمین تک ہر چیز ان کا خدا تھی، اور ہر ایک کے سامنے سربسجود ہونا

---

[1] آریوں کی ہندوستانِ قدیم ص ۳۴۲، ۳۴۳، [2] ایضاً ص ۴۶۹،

انکا دھرم تھا، بتوں دیوتاؤں، دیبیوں کا شمار اندازہ و قیاس سے باہر تھا، اور اُن کے افسانوں کا گیت ان کا ترانۂ حمد تھا، ظہور اسلام کے بعد بھی جو عرب سیاح یہاں آتے رہے، انھوں نے تپشیا کرنے والے جوگیوں کے وہ دردناک حالات لکھے ہیں، جن کو پڑھ کر اُن کی حالت پر رحم و افسوس آتا ہے[1]، اور اسی طرح وہ عرب سیاح جو سندھ اور دکن کے شہروں اور ساحلوں سے گذرے ہیں، انھوں نے معبدوں میں پجاری عورتوں اور دیوداسیوں کی جو اخلاقی کیفیتیں لکھی ہیں[2]، وہ حد درجہ شرمناک ہیں اور اس سے زیادہ شرمناک یہ ہے کہ یہ سب خدا کی خوشنودی اور مذہبی عقیدہ کے رو سے انجام دیا جاتا تھا،

عورتیں جووؤں میں ہاری جاتی تھیں، ایک عورت کے کئی شوہر ہوتے تھے[3]، وہ بیوہ ہو کر زندگی کی ہر لذت سے عمر بھر کے لئے قانوناً محروم کر دیجاتی تھیں، اور اسی لئے شوہر کے مرنے پر بعض عورتیں زندہ در آتش ہونا پسند کرتی تھیں، لڑائی میں شکست کے خوف کی صورت میں اُن کو خود اُن کے باپ بھائی اپنے ہاتھوں سے قتل کر ڈالتے تھے، یہاں کے بعض فرقوں میں عورتیں مرد کو، اور مرد عورتوں کو ننگا کر کے اُن کی پوجا کرتے تھے[4]، اور مذہبی تہواروں میں شراب پی پی کر ایسے بدمست ہوتے تھے کہ پھر انھیں ماں، بہن، بیٹی اور اپنی پرائی کی تمیز باقی نہیں رہتی تھی، اور اس کو وہ نیکی کا کام سمجھتے تھے، شودروں کے نام سے ایک پوری قوم کی قوم ایسی غلامی میں مبتلا تھی کہ تعلیم و تربیت، تہذیب و اخلاق اور دین و ایمان ہر چیز سے محروم رہنا اسکا

---

[1] دیکھو ابوزید سیرافی کا سفرنامہ ص ۱۱۵ و ۱۱۸ پیرس و آثار البلاد قزوینی ص ۸۱ [2] سفرنامہ ابوزید ص ۱۳۰ و احسن التقاسیم مقدسی ص ۴۸۳،

[3] مہابھارت کے قصہ کا آغاز پڑھو [4] سیتارتھ پرکاش سمولاس گیارہ ص ۳۷۸ و ۳۷۹ مطبوعہ سیوک اسٹیم پریس لاہور سنہ ۱۹۱۲ء،

فرض تھا، وید کی آورز بھی اُس کے کان میں پڑجائے تو اُس میں سیسہ پگھلا کر ڈال دینے کا حکم تھا،
راجاؤں کی بیویوں کی کوئی تعداد قانوناً مقرر نہ تھی، قانون کی بنیاد مساواتِ انسانی پر
نہیں بلکہ ذاتوں پر تھی، عورتیں فروخت کی جاتی تھیں،

اس مختصر خاکہ سے معلوم ہوا ہوگا کہ بدر اسلام سے ایک صدی پیشتر سے دیوتاؤں کی یہ جنم بھومی بھی شیطانوں کے اس جال میں گرفتار تھی جس کے شکار فارس و روم ہو رہے تھے،

یہود دنیا کی آبادی اور اصلاح کی سب سے زیادہ امید اس قوم سے ہو سکتی ہے جو سام کی اولاد میں سب سے پہلے وحیِ الٰہی کی امانت دار بنی، اسی لئے قرآن نے ان سے کہا، وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ (بقرہ-۵) اور سب سے پہلے تم ہی پیغام الٰہی کے منکر نہ بنو، مگر یہ قوم سخت جان ہونے کے ساتھ سنگدل بھی ثابت ہوئی، اس نے پتھروں کے سینوں کو پھٹتے اور ان کی چھاتیوں سے میٹھے پانی کا دودھ بہتے دیکھا اور پیا، مگر پھر بھی اُسکے سینہ کا دل پتھر ہی رہا، قرآن نے اپنے زمانہ میں اسکو طعنہ دیا،

فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً (بقرہ-۹)

ان کے دل پتھروں کے مانند بلکہ ان سے بھی بڑھ کر سخت ہیں،

اُس نے مختلف زمانوں میں اپنے پیغمبروں کو چھٹلایا، ان کو تکلیفیں دیں بلکہ انکو قتل تک کر ڈالا، حضرت موسیٰؑ اور ان کے بعد کوئی پیغمبر ان میں ایسا نہ آیا، جس نے ان کی سنگدلی کا ماتم نہ کیا ہو، اور اُن کی سرکشی پر اُن کے حق میں بد دعا نہ کی ہو، چنانچہ قرآن مجید نے کہا،

لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ لِسَانِ دَاوُودَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ

بنی اسرائیل میں سے جنھوں نے کفر کیا، ان پر داؤدؑ اور مریم کے بیٹے عیسیٰؑ کی زبان سے لعنت

ذَالِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ
كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ
لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ،

کی گئی، یہ اسلئے کہ انھوں نے نافرمانی کی
اور حد سے آگے بڑھتے تھے، اور ایک دوسرے
کو اس برائی سے جو وہ کرتے تھے، منع نہیں
کرتے، ان کا کام کتنا برا ہے،
(مائدہ ۱۲-۱۱)

حضرت داؤدؑ نے زبور میں کئی دفعہ بنی اسرائیل کی سرکشی اور نافرمانی کا ماتم اپنے سوز و گداز کی لے میں کیا ہے، زبور ۷۸ میں ہے،

"اے میرے گروہ! میری تعلیم پر کان رکھ، میرے منہ کی باتیں کان دھر کے سنو.....

.....تاکہ آنے والی پشت سے وہ فرزند جو پیدا ہوں سیکھیں اور خدا پر توکل کریں اور خدا کے کاموں کو بھلا نہ دیں، بلکہ اس کے حکموں کو حفظ کریں اور اپنے باپ دادوں کی طرح ایک شریر اور سرکش نسل نہ ہوں؛ نہ ایسی نسل کہ جس نے اپنا دل مستعد نہ کیا، اور اسکے جی خدا سے لگے نہ رہے،..... باوجود اس سب کے پھر انھوں نے گناہ کئے اور اس کے عجائب قدرتوں کے سبب اعتقاد نہ کیا،..... لیکن انھوں نے اپنے منہ سے اس کے (خدا کے) ساتھ ریاکاری کی، اور اپنی زبانوں سے اس سے جھوٹ بولے، اور وہ اس کے عہد میں وفادار نہ رہے. کیونکہ ان کے دل انکے ساتھ قائم نہ رہے.....

...کتنی بار انھوں نے بیابان میں اس (خدا) سے بغاوت کی اور وہ ویرانہ میں اسے بیزار کیا!

....تس پر بھی انھوں نے خدا تعالیٰ کو آزمایا، اور اسے بیزار کیا، اور اسکی شہادتوں کو حفظ نہ کیا بلکہ برگشتہ ہوئے، اور اپنے باپ دادا کی مانند بیوفائی کی، وہ ٹیڑھی کمان کی مانند الٹ گئے"

زبور ۵۰ میں ہے،

"اے میرے لوگو! سنو کہ میں تجھ پر گواہی دونگا، اے اسرائیل اگر تو میری سے لگاؤ تو تیرے درمیان کوئی دوسرا معبود نہ ہو تو کسی اجنبی معبود کو سجدہ نہ کر، خداوند تیرا خدا میں ہوں جو تجھے مصر کی سرزمین سے باہر لایا، اپنا منہ کھول کہ اُسے بھر دونگا، پر میرے لوگوں نے میری آواز پر کان نہ دھرا، اور اسرائیل نے مجھے نہ چاہا، تب میں نے انکے دلوں کی سرکشی کے بس میں چھوڑ دیا۔"

بہت سے بنی اسرائیل جو حضرت داؤدؑ سے باغی ہو کر لڑنے پر آمادہ تھے، حضرت داؤدؑ نے ان کے متعلق یہ دعا کی کہ

"تو وہ خدا نہیں جو شرارت سے خوش ہو، شریر تیرے ساتھ رہ نہیں سکتا، جو شیخی باز ہیں تیری آنکھوں کے سامنے کھڑے نہیں رہ سکتے، تو سب بدکرداروں سے عداوت رکھتا ہے تو انکو جو جھوٹ بولتے ہیں، نابود کریگا، ..... اے خداوند اپنی صداقت میں میرا رہبر ہو، میرے دشمنوں کے سبب سے میرے سامنے اپنی راہ کو سیدھا کر. .....

ان کے باطن میں سراسر کھوٹا پن ہے، ..... اے خدا تو انہیں ملزم جان ایسا ہو کہ وہ اپنی مشورتوں سے آپ ہی گر جائیں، انکو ان کے گناہوں کی کثرت کے سبب نکال پھینک کہ انھوں نے تجھ سے سرکشی کی ہے۔" (زبور ۔ ۵)

حضرت عیسیٰؑ نے بھی انجیل میں بنی اسرائیل کو لعنت کی اور فرمایا۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ تم سفیدی پھیری ہوئی قبروں کے مانند ہو جو باہر سے بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں، پر بھیتر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی ناپاکی سے بھری ہیں۔

اسیطرح تم بھی ظاہر میں لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے پر باطن میں ریاکار اور شرارت سے بھرے ہو"

"اے ریاکار فقیہو! اور فریسیو! تم پر افسوس کیونکہ نبیوں کی قبریں بناتے، اور راست بازوں کی گوریں سنوارتے ہو، اور کہتے ہو کہ ہم اپنے باپ دادوں کے دنوں میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں ان کے شریک نہ ہوتے، اسی طرح تم اپنے اوپر گواہی دیتے ہو کہ تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو، بس اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھرو، اے سانپوں اے سانپوں کے بچو! تم جہنم کے عذاب سے کیونکر بھاگو گے؟" (متی ۲۳-۲۹-۳۳)

بعینہٖ یہی الزام قرآن نے بھی اُن کو دیا ہے،

وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۚ ذَٰلِكَ	اور وہ ناحق پیغمبروں کو مار ڈالتے ہیں، اسلئے
بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ (بقرہ ۱۲)	کہ وہ نافرمان اور حد سے بڑھنے والے ہیں،
قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنبِيَاءَ اللَّهِ مِن	کہہ کہ پھر کیوں اللہ کے نبیوں کو تم پہلے تم
قَبْلُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (بقرہ ۱۱)	قتل کرتے رہے، اگر تم مومن تھے،

آلِ عمران میں اس سے بھی بڑھکر ہر حق کے داعی اور خیر کے مبلغ کے قتل کر دینے کا ان پر بیجا الزام ہے،

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ	بیشک وہ لوگ جو اللہ کی آیتوں کا انکار
وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُونَ	کرتے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے اور ہر اس
الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ	شخص کی زندگی کے دشمن بنجاتے ہیں جو انکو
فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (آل عمران ۳)	عدل و نیکی کی بات سمجھائے تو انکو دردناک

سورۂ بقرہ اور آلِ عمران میں یہودیوں کے ایک ایک عیب کو کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ ان کے دین و ملت کا قوام کتنا بگڑ گیا تھا، انکی مذہبی سنگدلی اور تعصب کا سب سے دردناک سانحہ وہ ہے جو اسلام سے ۵۰-۶۰ برس پہلے یمن میں پیش آیا کہ یہودی حمیریوں نے نجران کے عیسائیوں کو گڑھوں میں آگ جلا کر ان میں جھونک دیا، اور وہ کنارے بیٹھے اس حسرتناک منظر کا تماشا دیکھتے رہے، چنانچہ قرآن مجید نے اس پر درد داستان کو ان لفظوں میں انھیں یاد دلایا،

قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ النَّارِ ذَاتِ	گڑھے والے لوگ مارے گئے، بھڑکی آگ کے
الْوَقُوْدِ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ وَّهُمْ	گڑھے، جب وہ ظالم ان کے کنارے بیٹھے یہ
عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ	والوں کے ساتھ جو کر رہے تھے اسکو دیکھ رہے تھے
وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا	ان کا گناہ یہی تھا کہ وہ غالب اور خوبیوں
بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ (بروج-۱)	والے خدا پر ایمان رکھتے تھے،

جزئیات کو چھوڑ کر کلی طریقہ سے ان میں حسب ذیل نقائص تھے،

۱- ان کو اپنے محبوب خدا، اور خاص خدا کے کنبہ ہونے پر بے انتہا غرور تھا، وہ سمجھتے تھے کہ ہم کچھ کریں ہم سے قیامت میں مواخذہ نہ ہوگا،

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (مائدہ-۳)	ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں،
وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا	اور کہا کہ ہمکو دوزخ کی آگ ہرگز نہیں
مَّعْدُوْدَةً (بقرہ-۹)	چھوئے گی، لیکن چند روز،

وہ سمجھتے تھے کہ جنت کی نعمتیں صرف انہی کے لئے خاص ہیں قرآن نے کہا،

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ — کہدے کہ اگر آخرت کا گھر تمام لوگوں کو

عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ — چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لئے ہے تو موت

فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ — کی آرزو کیوں نہیں کرتے، اگر تم سچے ہو

وہ سمجھتے تھے کہ نبوت اور رسالت صرف اُن کے گھر کی چیز ہے، کسی دوسرے کا اس میں حق نہیں، قرآن نے اُن کے جواب میں کہا،

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ (جمعہ) یہ خدا کی مہربانی ہے، وہ جس کو چاہے دے

جو ان میں پڑھے لکھے عالم تھے، وہ خدا کے احکام کو اپنے منشا اور دولتمندوں کی خوشنودی کے لئے اپنی باطل تاویلوں سے ادلتے بدلتے رہتے تھے، اور اپنی تصنیفات اور اجتہادات کو کتاب الٰہی کا درجہ دیتے تھے،

مِّنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ (مائدہ) — وہ لفظوں کو اپنی مناسب جگہوں سے ہٹا دیتے ہیں

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ — تو پھٹکار ہو اُن پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب

ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ — لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے

لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ فَوَيْلٌ لَّهُمْ — تاکہ وہ اس سے دنیا کا معمولی فائدہ اٹھائیں

مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ — تو پھٹکار ہے ان پر جو وہ لکھتے ہیں اور دھیکا

مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ (بقرہ ۷-۹) — ہو ان پر جو وہ کماتے ہیں،

جو ان میں ان پڑھ اور جاہل تھے، وہ اپنے سنے سنائے قصوں پر ایمان رکھتے تھے،

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ	اور اُن میں بعضے اَن پڑھ ہیں جنکو توراۃ کا
اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ	علم نہیں، لیکن بناوٹی باتیں معلوم ہیں،
(بقرہ - ۹)	صرف اُن کے خیالات ہیں.

احکام الٰہی میں سے جو آسان اور ضرورت کے مطابق حکم ہوتا، اسکو قبول کرتے اور دوسرے حکموں کو پس پشت ڈالتے،

نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ	جن کو خدا کی کتاب دی گئی تھی، ان میں
كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ	سے ایک فریق اللہ کی کتاب پس پشت
لَا يَعْلَمُوْنَ (بقرہ - ۱۲)	ڈالتا ہے، گویا کہ وہ جانتا ہی نہیں،
اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا	کیا جب جب کوئی رسول تمہارے پاس
لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ	وہ لیکر آیا جو تمہاری نفسانی خواہش کے
فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ	موافق نہ ہوا تم نے غرور کیا تو کچھ کو جھٹلایا
(بقرہ - ۱۱)	اور کچھ کو مار ڈالتے ہو،

ایک دفعہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لا چکے تھے، اور یہود نے بھی آپ کی ملکی سرداری کو یک گونہ قبول کر لیا تھا، تو ایک زنا کا مقدمہ آپ کی عدالت میں لائے آپ نے پوچھا کہ تمہارے مذہب میں اس جرم کی سزا کیا ہے، بولے ہم مجرم کو کوڑے مارتے ہیں اور اسکی تشہیر کرتے ہیں، آپ نے ان سے توراۃ طلب فرمائی جب وہ لائے اور اس جرم کے متعلقہ حکم کی آیتوں کو پڑھ کر سنانے لگے تو بیچ سے سنگ سازی کا حکم چھپا دیا، مگر ایک نو مسلم یہودی عالم

نے اس حکم کو پڑھ کر بتادیا، آپنے فرمایا خداوندا میں پہلا شخص ہونگا، جو تیرے مردہ حکم کو زندہ کریگا"
(صحیح بخاری و مسلم کتاب الحدود، و ابوداؤد باب رجم الیہودیین)

آپس میں قتل و خونریزی کا بازار اُن میں گرم تھا، ایک طاقتور قبیلہ دوسرے کمزور قبیلہ کو گھر سے بے گھر کر دیتا تھا، اور پھر کوئی گرفتار ہو جاتا تو فدیہ دیکر اسکو چھڑا بھی لیتے تھے، قرآن نے دیکھا

ثُمَّ أَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنفُسَكُمْ	پھر تم ہی لوگ آپس میں ایک دوسرے کو
وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِّنكُم مِّن دِيَارِهِمْ	قتل کرتے اور ایک گروہ کو انکے گھروں سے
تَظَاهَرُونَ عَلَيْهِم بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ	نکالتے ہو انکے برخلاف گناہ اور ظلم سے مدد
وَإِن يَأْتُوكُمْ أُسَارَىٰ تُفَادُوهُمْ	کرتے ہو، اور اگر وہ تمہارے پاس قیدی بنکر
وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ	آتے تو تم فدیہ دیکر چھڑاتے ہو، حالانکہ انکا نکالنا
أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ	تم پر حرام تھا: کیا تم کتاب کے کچھ حکموں کو مانتے
بِبَعْضٍ (بقرہ ۲-۱۱)	اور کچھ کا انکار کرتے ہو،

۲- دوسری خرابی دولت کی حرص و طمع تھی، اسکی وجہ سے اُن میں ہر قسم کی لالچ اور اخلاقی کمزوری پیدا ہو گئی تھی، کسی بڑے کام کی خاطر وہ اپنی راحت و آرام اور جسم و جان کو قربان نہیں کر سکتے تھے،

وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَىٰ	ان کو سب لوگوں سے زیادہ زندگی کا لالچی
حَيَاةٍ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا	پاؤگے مشرکوں سے بھی زیادہ ان میں ایک ایک
يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ (بقرہ ۱۱-۲)	چاہتا ہے کہ اسکو ہزار برس کی زندگی ملے،

عربوں کیساتھ ان کے لین دین کے تجارتی تعلقات قائم تھے، مگر وہ سخت نادہند تھے اور سمجھتے تھے کہ عربوں کے ساتھ جس قدر سختی اور بددیانتی کا برتاؤ کیا جائے، وہ مذہباً منع نہیں، قرآن نے اس معاملہ میں عیسائی اہلِ کتاب کی تعریف کے بعد اسرائیلی اہلِ کتاب کی نسبت فرمایا:

وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ	کتابیوں میں بعض ایسے ہیں کہ اگر تم کو ایک
لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا	دینار بھی امانت رکھنے کے لئے دو، وہ تم کو
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي	تک واپس نہ دیں، جبتک تم اُنکے سر پر کھڑے
الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ	یہ اسلئے کہ وہ کہتے ہیں کہ ان جاہل عربوں کا
الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (آل عمران ۸)	ہم پر حق نہیں، اور وہ جان بوجھکر خدا پر

توراۃ میں "اپنے بھائی" کے علاوہ "اجنبی" سے سود لینے کی اجازت کا مطلب وہ یہ لیتے تھے کہ یہودیوں سے نہ لیں اور اہلِ عرب جو یہود نہ تھے، ان سے بھاری بھاری شرحِ سود وصول کرنا جائز سمجھتے تھے۔ اور تعجب پر تعجب یہ تھا کہ اُن کے علماء انکو اس سے باز نہیں رکھتے تھے، اس حرام خوری اور اُن کے علماء کی اس خاموشی پر اُن کو قرآن نے بار بار ٹوکا،

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي	اور انمیں سے بہتوں کو تو دیکھے گا کہ وہ گناہ اور
الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ	ظلم کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے
لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ، لَوْلَا يَنْهٰهُمُ	کی کوشش کرتے ہیں، انکے کرتوت کتنے برے
الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ	ہیں، اُن کے درویش اور عالم گناہ کی بات
وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا	بولنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں باز

يصنعون (مائدہ - ۹) ان کے کام درحقیقت کتنے خراب ہیں،

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ (مائدہ ۶) جھوٹ کو سننے والے اور حرام کھانے والے ہیں،

وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَ اور ان کے سود لینے کے سبب، حالانکہ وہ

اَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ان سے روکے گئے تھے، اور لوگوں کا مال ناحق

(نساء - ۲۲) طریقوں سے کھا جانے کی وجہ سے،

اسی لئے وہ تورات کی آیتوں میں تحریف اور ان کے معنوں میں تاویل کرکے ایسے فقہی حیلے تراشتے تھے، کہ ان سے ہر حکم کو اپنے مطلب کے مطابق بنا لیتے تھے، خدا نے فرمایا،

اِنَّا اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ہمنے توراۃ اتاری جسمیں ہدایت اور روشنی

يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا ہے، اسی کے مطابق نبی جو تابعدار تھے یہود

لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ کا فیصلہ کرتے تھے اور ان کے درویش عالم بھی خدا

بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ کی کتاب کے جن حصوں کو انھوں نے بچا رکھا

(مائدہ ۷-۱) تھا اُن پر فیصلہ کرتے

اس کے بعد اس کے احکام کے اجرا اور خاص کر قصاص کا ذکر کیا، اور فرمایا،

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ اور جو خدا کے اتارے ہوئے حکم کے مطابق

هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (مائدہ ۷-۱) فیصلہ نہ کرے، وہی لوگ کافر ہیں،

ان میں مشرکانہ بت پرستی کے بھی بعض اثرات پیدا ہو گئے وہ جبت اور طاغوت کی پرستش میں مبتلا تھے، قرآن اُن کو خطاب کرکے کہتا ہے،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا — اے کتاب والو! ہم نے جو اتارا جو تمہاری کتاب

بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ... — کی تصدیق کرتا ہے اس پر ایمان لاؤ بیشک...

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ — خدا شرک کو معاف نہیں کرتا، اور اسکے سوا

يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (نساء) — جس کو چاہے معاف کر دے،

..... اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا — ..... کیا تو نے ان کو نہیں دیکھا جن کو

نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ — کتاب کا ایک حصہ دیا گیا، وہ بتوں اور شیطان

وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا — پر ایمان رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کافر مسلمانوں

هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا (نساء ۸) — سے زیادہ صحیح راستہ پر ہیں،

اوہام و خرافات پر ان کا ایمان تھا، تعویذ، گنڈا، جادو اور عملیات پر فریفتہ تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ حضرت سلیمانؑ کی تعلیم ہے، (بقرہ ۱۲۰) لبید اعصم وغیرہ مدینہ میں بہت سے عامل تھے، جو گنگھیوں اور بالوں میں منتر پڑھ کے پھونکتے تھے[1]

عرب سے باہر یہودی، یونانیوں اور رومیوں کی حکومتوں میں یورپ، افریقہ اور ایشیا کے مختلف ملکوں اور شہروں میں اس طرح پراگندہ اور منتشر تھے کہ عرب سے باہر دنیا کی قوموں میں انکا کوئی شمار نہ تھا عرب کے اندر جو یہود زمانہ دراز سے آباد تھے، ان کا بڑا مشغل زراعت اور تجارت تھا، سودی کاروبار کرتے تھے، غریب عربوں کو اپنے گراں شرح سود اور قرضوں کے بار میں اسطرح دبائے تھے، کہ ان کی حالت ان کے سامنے غلاموں کی سی تھی۔ اس سلسلہ میں صرف ایک

[1] صحیح بخاری جلد دوم کتاب الطب باب السحر ص ۸۵۰

واقعہ کا ذکر پوری حالت کے اندازہ کے لئے کافی ہوگا،

محمدؓ بن مسلمہ انصاری اور ان کے رفقاء جو مدینہ کے یہودی سردار کعب بن اشرف کے قتل پر مامور ہوئے تھے، وہ اس سے ملنے اور بات چیت کرنے گئے، انھوں نے اس سے کہا، اے کعب! اس شخص (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے تو صدقہ وصول کر کر کے ہمکو دق کر ڈالا، اب میں تم سے کچھ قرض لینے آیا ہوں، اس نے کہا خدا کی قسم مجھے معلوم تھا کہ تم اس سے آخر بیزار ہو جاؤ گے، انھوں نے کہا میں نے اسکی پیروی اختیار کی ہے، لیکن میں اسکو چھوڑنا نہیں چاہتا، انتظار ہے کہ معاملہ کی صورت کس رُخ پلٹتی ہے، میں تم سے کچھ غلہ قرض لینے آیا ہوں، اس نے کہا، مگر تم کفالت میں کیا چیز رہن رکھو گے، انھوں نے کہا تم بتاؤ کیا چاہتے ہو، اس نے کہا اپنی بیویاں گرو رکھو، انھوں نے جواب دیا ہم اپنی بیویاں کیسے گرو رکھ سکتے ہیں کہ تمام عرب میں تمھارے حسن کا جواب نہیں، بولا، اچھا تو اپنے لڑکوں کو گرو رکھو، کہا ہم اپنے لڑکوں کو کیسے گرو رکھیں، انکی کوئی بے عزتی نہ کرے، یہ ہمارے لئے بڑی شرم کی بات ہے، ہاں اپنے ہتھیار گرو رکھ سکتے ہیں[1]"

اس سوال و جواب سے اندازہ ہوگا کہ یہود کی اخلاقی حالت کتنی پست اور ذلیل ہو چکی تھی کوئی غیر عورت اگر اُنکے بازار کی طرف جا نکلتی تو اسکی عزت بچنی مشکل ہو جاتی[2]، کسی بچہ کو معمولی سے زیور کے لالچ میں موقع پاتے تو بیدردی سے قتل کر کے زیور اتار لیتے[3]، علما اور پیشوایان دین کی وہی کیفیت تھی جس کا ماتم اس وقت سے چھ سو برس پیشتر حضرت عیسیٰؑ نے کیا تھا، لفظی موشگافیوں اور ظاہری دینداری کے سوا روح و اخلاق کا جوہر ان سے کھو گیا تھا، اسلام

---

[1] صحیح بخاری جلد دوم قتل کعب بن اشرف ص ۵۷۶ [2] دیکھو کتب سیر میں غزوہ بنی نضیر کے اسباب [3] صحیح بخاری جلد دوم باب من اقاد بحجر ص ۱۰۱۶

جو ابراہیم حنیف کے ترانۂ توحید اور طور کی صدائے غیبی کی آواز بازگشت تھا، وہ اُن کے نزدیک عرب کے بت پرستوں کے جاہلانہ مذہب سے زیادہ بُرا تھا، وہ کہتے تھے کہ ان مسلمانوں سے یہ مشرک زیادہ راہ راست پر ہیں[۱]

اسلام کی اس مصالحانہ دعوت،

يَا أَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ	اے کتاب والو! آؤ اس ایک بات پر ہم
بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا	سب متحد ہو جائیں جو ہم میں تم میں مشترک ہے
اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا	کہ ہم خدا کے سوا کسی کو اپنا معبود نہ بنائیں اور
يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّنْ	اسکے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں اور
دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران-۷)	نہ ہم خدا کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو اپنا رب بنائیں

میں بھی عداوت اور دشمنی ہی کی جھلک دکھائی دیتی تھی، اسلئے مدینہ میں اسلام کی صلح کی ہر کوشش کو وہ ٹھکراتے رہے، کیونکہ روحانی عظمت کے مقابلے میں اس دعوت کے قبول میں ان کو اپنی قومی و مالی و تجارتی عظمت کی بربادی نظر آتی تھی،

عیسائیوں کی نقل میں وہ بھی عزیر (عزرا) کو خدا کا بیٹا کہتے تھے، وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ، (توبہ-۵) اپنی دولت و ثروت کے غرور میں وہ کہتے تھے، يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ (مائدہ-۹) خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں" قرآن کی دعوت کے جواب میں کہتے تھے کہ ہم پر اس دعوت کا اثر نہیں ہو سکتا کہ ہمارے دل نا محرّف ہیں"، وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ (بقرہ-۱۱) ان فقروں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اب دنیا میں نیابت الٰہی کے منصب کے قابل نہیں رہے تھے، عرب کے باہر یہودیوں کی پراگندہ ٹولیاں مختلف سلطنتوں کے سایہ میں پناہ گزیں تھیں،

اُن کا مذہبی مرکز انکے ہاتھ سے نکل چکا تھا، سیاسی اہمیت وہ مدت ہوئی کہ کھو چکے تھے، ابراہیمؑ و یعقوبؑ کے خدا کے بجائے ہر جگہ وہ سونے چاندی کے ڈھیر ہی کو وہ خدا بنائے تھے، اُنکے مذہبی فرقوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی جن میں باہمی عداوت قائم تھی اور اس وقت سے چھ سو برس پہلے کی طرح بنی اسرائیل اب پھر ایک نبی اعظم کی بعثت کا بیتابانہ انتظار کر رہے تھے (بقرہ-۱۱) خود عرب میں یہود اس وقت اس نبی کے جلد پیدا ہونے کی بشارت کا اپنی مجلسوں میں تذکرہ کرتے رہتے تھے، جس کی پیشینگوئیوں سے توراۃ کے صحیفے بھرے تھے، اور ان ہی سے سن سنکر یثرب کے اوس و خزرج ایک نبی کی آمد کی پیشین گوئی سے باخبر تھے[1]

دنیا کی ان مختلف قوموں کے حالات پر ایک اجمالی نظر ڈالنے کے بعد ضرورت ہے کہ اس قوم کے حالات پر ایک تفصیلی نظر ڈالی جائے، جس کے وطن کے افق سے نبوت کی صبح سعادت طلوع ہونے والی تھی،

ظہور اسلام کے وقت عرب کی مذہبی و اخلاقی حالت

یمن میں جب وہ مشہور سیلاب آیا، جس کی بلندی سطح زمین سے ایک سو بیس ۱۲۰ فٹ تھی تو اس کا پائے تخت مآرب اور اس کے اضلاع دفعۃً برباد ہو گئے، یہ دوسری صدی عیسوی کا واقعہ ہے[2] قرآن مجید نے اسی سیلاب کو سیل عرم کہا ہے، اس سیلاب کا ایک یہ نتیجہ ہوا کہ

---

[1] سیرت ہشام ذکر بیعت عقبہ [2] اس بند کے انہدام کی تاریخ کی تعیین مشکل ہے، اور اسی لئے اس کی تعیین میں کئی نظریے ہیں، ایک اس کو دوسری صدی عیسوی کا واقعہ بتاتا ہے تو دوسرا پانچویں صدی عیسوی کا اصلیت معلوم ہوتی ہے کہ اس بند کے مختلف حصے مختلف زمانوں میں منہدم ہوتے رہے، اور بنتے رہے، آخری دفعہ پانچویں صدی عیسوی میں بالکل برباد ہو گیا، (سلیمان)

آٹھ بڑے بڑے خاندان جلاوطن ہوکر ادھر اُدھر نکل گئے، جس سے نظام سلطنت میں ضعف آگیا، چھٹی صدی عیسوی میں یہاں کے فرماں روا ذونواس نے جو مذہباً یہودی تھا رعایا نے بغاوت کی اور شاہ حبش سے اعانت چاہی، اس نے ۵۲۵ء میں ایک فوج بھیجی جس نے ذونواس کو معزول کر دیا، اور اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا، ۶۰۳ء میں قبیلۂ حمیر کے ایک باحوصلہ شخص ذویزن نے فارس کی مدد سے اپنا ملک واپس لیا، لیکن چند روز کے بعد وہ قتل کر دیا گیا، اور یمن شاہنشاہی فارس کا ایک معمولی صوبہ رہ گیا،

جو قبیلے یمن سے نکلے، اُن میں سے ایک نے دوسری صدی عیسوی میں حیرہ میں جہاں اب کوفہ آباد ہے، ایک سلطنت قائم کی، لیکن وہ فارس کے زیر اثر اور مذہبی خیالات میں مجوس سے متاثر تھی، دوسرا قبیلہ شام میں جاکر آباد ہوا، جو غسانی خاندان کہلاتا ہے[1] چونکہ یہ خاندان رومیوں کے زیر اثر تھا، اس لئے رفتہ رفتہ عیسائی ہوگیا، اور اسلام کے زمانہ تک عیسائی رہا،

غرض عرب کے اصلی تمدن پر بیرونی اثر جو کچھ پڑا تھا وہ مجوسیت یا نصرانیت کا تھا، یہودی معتقدات اور خیالات کا اثر بھی بہت کچھ تھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ عرب کا ایک بڑا حصہ یعنی وادی القریٰ اور خیبر و فدک تمام تر یہودی آبادیاں تھیں اور خود مدینہ میں یہودی ہی صاحب اقتدار اور صاحب حکومت تھے، باقی تمام ملک میں مشرکانہ رسوم جاری اور جاہلانہ مذاہب پھیلے تھے، لوگ بتوں، پتھروں، درختوں، ستاروں، فرشتوں اور جنوں کی پرستش کرتے تھے

[1] اکثر علمائے انساب کا بیان ہے کہ یہ قبائل یمن سے آئے تھے لیکن میں نے ارض القرآن میں بدلائل اس سے اختلاف کیا ہے، (سلیمان)

خدا کا اعتقاد | تاہم اس میں شبہہ نہیں کہ عرب زمانۂ دراز سے ایک خدائے برتر پر اعتقاد رکھتے تھے، آج کل عرب کے جو قدیم کتبات دستیاب ہوئے ہیں، اُن پر اللہ کا لفظ خدا کے معنی میں لکھا ہوا ہے، البتہ اُن کا اِلٰہ اللہ نہیں بلکہ ھَلٰہ ہے، عرب شمال کے عرب جو نابتی کہلاتے ہیں انکے ناموں کے ساتھ اللہ کا لفظ بھی شامل ہوتا تھا مثلاً زید اللّٰہ، عبد اللّٰہ جو قرآن مجید میں خدا کفار کی نسبت کہتا ہے

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ	اور جو تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے
وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ	(لقمان ۳) پیدا کیا ہے، تو بول اٹھیں گے کہ خدا نے، تم کہو، کہ شکر ہے

یہ اصل میں حضرت ابراہیمؑ کی تعظیم تھی لیکن رفتہ رفتہ شرک کا اعتقاد پیدا ہوا، یعنی یہ کہ خدائے اعظم کے سوا اور بھی چھوٹے چھوٹے خدا ہیں گو اللہ ان سب میں بڑا ہے، یہ اعتقاد اس قدر راسخ ہو گیا کہ اور معبودوں کے انکار سے ان کو اسی قدر رنج ہوتا تھا جس قدر خود خدا کے انکار سے ہو سکتا تھا، بلکہ چونکہ ان کے نزدیک دنیا کا کاروبار اور روزمرہ کی ضرورتیں ان ہی چھوٹے چھوٹے خداؤں سے انجام پاتی تھیں، اور کام اکثر ان ہی خداؤں سے پڑتا تھا، اسلئے اللہ کا خیال کچھ یونہی سا رہ گیا تھا، ان ہی خداؤں کی پرستش کرتے تھے، ان ہی پر قربانی چڑھاتے تھے، ان ہی سے حاجتیں مانگتے تھے، اللہ تو زمین و آسمان بنا کر بے کار سا ہو چکا تھا، جو کچھ کرتے تھے، یہی خدایانِ اصغر کرتے تھے، یہی سبب تھا کہ کوئی شخص اللہ کا خالی نام لیتا تھا، تو لوگ بہت کبیدہ ہوتے تھے،

وَإِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ	اور جب خالی اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو یہ لوگ جو
قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ	کہ قیامت کے معتقد نہیں ہیں، ناک بھوں چڑھاتے

[1] مذاہب اخلاق کی انسائیکلوپیڈیا جلد اول صفحہ ۴۶۴ بحوالہ پروفیسر نولدیکی،

وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (سورہ زمر-۵)

ہیں لیکن جب خدا کے سوا اوروں (معبودوں) کا بھی ذکر کیا جائے تو دفعتہً وہ کھل جاتے ہیں،

اور سمجھتے تھے کہ ان چھوٹے معبودوں کی نذر و نیاز و قربانی سے خدا خوش ہوگا، اور وہ اسکے دربار میں سفارش کریں گے، چنانچہ وہ کہتے تھے،

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى، (زمر-۱)

اور ہم ان بتوں کو اسلئے پوجتے ہیں کہ وہ ہمکو خدا کے قریب کر دیں،

ملائکہ کی الوہیت | شرک کے علاوہ خدائے اعظم کی نسبت یہ مانتے تھے کہ اُس کے بال بچے بھی ہیں، چنانچہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے،

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى (نجم-۲)

جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں لاتے وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے ہیں،

اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى تِلْكَ (نجم-۱)

تمہارے تو لڑکے ہوں اور خدا کے لڑکیاں؟

اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى (نجم-۱)

یہ تو کچھ اچھی تقسیم نہیں،

اس لئے جس طرح بعض یہود حضرت عزیرؑ کو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰؑ کو خدائی کا مستحق سمجھتے تھے، وہ فرشتوں کو خدا کی اولاد سمجھ کر اُن کی الوہیت کے بھی قائل تھے،

وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ يَّتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا (آل عمران-۸)

اور نہ خدا تمکو اس کا حکم دیتا ہے کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا ٹھہراؤ،

وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا

اور ان مشرکوں نے خدا کے بندوں میں سے خدا

إِنَّ الْإِنسَانَ لَكَفُورٌ مُّبِينٌ

کا ایک حصہ بنایا، بیشک انسان کھلا نافرمان

أَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنَاتٍ وَأَصْفَاكُم

ہے، کیا خدا جو پیدا کرتا ہے وہ اپنے لئے لڑکیاں

بِالْبَنِينَ ..... وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ

لے اور تمکو لڑکے دیکر عزت دے ..... اور ان

الَّذِينَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمَٰنِ إِنَاثًا

مشرکوں نے فرشتوں کو جو رحمت والے خدا کے

أَشَهِدُوا خَلْقَهُمْ ۚ سَتُكْتَبُ

بندے ہیں، لڑکیاں قرار دیا، کیا وہ انکی پیدائش کے

شَهَادَتُهُمْ وَيُسْأَلُونَ وَقَالُوا لَوْ شَاءَ الرَّحْمَٰنُ

موجود تھے ان کی گواہی لکھی اور باز پرس کی

مَا عَبَدْنَاهُمْ (زخرف - ۱۲ رکوع)

جائیگی اور کہتے ہیں کہ اگر خدا نہ چاہتا تو ہم

فَاسْتَفْتِهِمْ أَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَ

تو ان سے پوچھ کہ کیا تیرے رب کی لڑکیاں ہوں

لَهُمُ الْبَنُونَ ۝ أَمْ خَلَقْنَا الْمَلَائِكَةَ

اور انکے لڑکے ہوں، کیا ہم نے فرشتوں کو لڑکیاں

إِنَاثًا وَهُمْ شَاهِدُونَ ۝ أَلَا إِنَّهُم

پیدا کیا اور وہ حاضر تھے ہاں یہ مشرکوں کی

مِّنْ إِفْكِهِمْ لَيَقُولُونَ وَلَدَ اللَّهُ

بناوٹ ہے، وہ کہتے ہیں کہ خدا کے اولاد

وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ (صفت - ۵ رکوع)

ہوئی، اور وہ جھوٹے ہیں،

ان کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ یہ فرشتے خدا کے ہاں اپنے پرستاروں کے سفارشی بنیں گے، خدا نے اس کی تردید میں کہا،

وَكَم مِّن مَّلَكٍ فِي السَّمَاوَاتِ لَا تُغْنِي

اور آسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں کہ انکی شفاعت

شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا (الآیۃ (نجم ۲ رکوع)

خدا کی اجازت کے بغیر کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی،

قیامت میں فرشتوں سے پرسش ہوگی کہ یہ مشرک تمہاری پوجا کرتے تھے،

ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ (سبا-۵) پھر فرشتوں سے کہے گا کیا یہ انسان تمہی کو پوجتے تھے،

جنات کی الوہیت فرشتوں کی طرح وہ جنات کو بھی خدا کا عزیز و قریب سمجھتے تھے، اور خدا کے ان سے رشتے لگاتے تھے،

وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (صفت-۵) اور مشرکوں نے خدا اور جنوں کے درمیان رشتہ داری بنائی،

اسی لئے وہ جنات کو خدائی میں شریک کرتے تھے،

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ (انعام-۱۲) انھوں نے جنوں کو خدا کا شریک بنایا اور وہ خدا کی مخلوق ہیں اور بن جانے خدا کے لئے بیٹے اور بیٹیاں گھڑیں،

اور جب وہ خدا کے رشتہ دار اور خدائی کے شریک ٹھہرے تو انکی عبادت اور پرستش بھی ضروری ہوئی، چنانچہ جاہلیت میں اہل عرب ان جنوں کی بھی پوجا کرتے تھے، بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ (سبا-۵) بلکہ یہ جن کو پوجتے تھے اور انمیں سے اکثر انہی پر ایمان رکھتے تھے، مسافر جب راستہ میں کہیں قیام کرتے تھے تو پہلے وہاں کے جنوں کی دہائی پکار لیتے تھے، قرآن میں ہے، وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا (جن) اور بات یہ تھی کہ کچھ انسان بعض جنوں کی دہائی پکارا کرتے تھے اور انھوں نے انکو اور مغرور بنا دیا، چنانچہ بعض خوفناک مقامات میں خاص طور سے اُن کے نام کی قربانی کیجاتی تھی، انمیں سے ایک

لہ صحیح مسلم کتاب التفسیر،

مشہور مقام مراہم تھا، جہاں کے رہنے والے جنون (سکان الدراہم) جانور ذبح کرکے چڑھائے جاتے تھے، تاکہ قربانی کرنے والے ان کی شرارت سے محفوظ رہیں[1]، قبیلہ خزاعہ کی شاخ بنو ملیح خاص طور سے جنوں کی پوجا کرتی تھی، اور کلبی کا بیان ہے کہ انہی کے متعلق یہ آیت اتری ہے[2]

اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ	خدا کو چھوڑ تم جنکو پکارتے ہو، وہ تمہاری
عِبَادٌ اَمْثَالُکُمْ (اعراف ۔۲۴)	ہی طرح بندے ہیں،

بت پرستی جن خداؤں کو یہ لوگ مانتے تھے، اُن کے بُت بنالیے تھے، اور جا بجا عظیم الشان تبکدے قائم ہوگئے تھے، یہ رواج اس قدر عام ہوگیا تھا کہ جہاں کوئی خوبصورت پتھر مل گیا اٹھالیا اور اُس کی پرستش شروع کردی، اس سے زیادہ خوبصورت مل گیا تو اسکو پھینکدیا اور اسکی پرستش کرنے لگے، جہاں کوئی پتھر نہ ہاتھ آیا، خاک کا ایک تودہ بنالیا، ایک بکری لاکر اسکا دودھ اس پر دوہا پھر اس کے گرد طواف کیا، اور اب وہ ایک معبود بن جاتا تھا، چنانچہ صحیح بخاری کتاب المغازی باب وفد بنی حنیفہ میں یہ پوری تفصیل مذکور ہے،

اس بُت پرستی کی ابتدا یوں ہوئی کہ قبیلۂ خزاعہ کا ایک شخص جس کا نام عمرو بن لحی تھا اور جو قبیلۂ جرہم کو شکست دیکر کعبہ کا متولی بن گیا تھا، ایک دفعہ بلقا گیا، وہاں لوگوں کو بُت پرست دیکھ کر بُت پرستی کی طرف مائل ہوا، اور وہیں سے ایک بت لاکر کعبہ میں نصب کیا، چونکہ اس کا اثر تمام عرب پر تھا، اسلئے تمام عرب نے بت پرستی قبول کرلی، اور گھر گھر بتخانے بن گئے، ان میں ہبل سب سے بڑا تھا، اس سے اترکر، منات، لات اور عزیٰ تھے،

---

[1] لسان العرب لفظ "سکن"، [2] کتاب الاصنام ہشام الکلبی مطبوعہ مصر ص ۳،

مناۃ مدینہ منورہ سے سات میل پر تھا، انصار کے قبیلے یعنی اوس و خزرج اور آس پاس کے اور قبائل اسی کا حج کرتے تھے، کعبہ کا حج بھی جب یہ لوگ کرتے تھے، تو احرام یہیں آکر اتارتے تھے، طیفہ معاہدے بھی یہیں ہوتے تھے. عبد العزیٰ مزنی کہتا ہے[1]،

انی حلفت یمین صدق برۃ	میں نے مناۃ کی سچی قسم کھائی اہل خزرج
بمنات عند محل آل الخزرج	کے احرام اتارنے کی جگہ کے پاس،

لات، قبیلۂ ثقیف کا معبود تھا، جو مقام طائف میں نصب تھا، اہلِ طائف اسکو کعبہ کے برابر تسلیم کرتے تھے،

عزیٰ ایک درخت تھا، اس کے پاس ایک بُت تھا، یہ قبیلہ غطفان کا بت تھا، لیکن قریش بھی اس کی نہایت عزت کرتے تھے، اور اس کی زیارت کو جاتے تھے. قریش جب کعبہ کا طواف کرتے تھے، تو یہ پڑھتے تھے،

وَاللّٰتَ وَالْعُزّٰی وَمَنَاۃَ الثَّالِثَۃَ	لات، عزیٰ اور تیسرا مناۃ یہ بُت برگزیدہ
الْاُخْرٰی، اِنَّھُنَّ الْغَرَانِیْقُ الْعُلٰی	ہیں اور ان کی سفارش کی خدا
وَاِنَّ شَفَاعَتَھُنَّ لَتُرْتَجٰی،	کے ہاں امید ہے،

بُت پرستی نے رفتہ رفتہ اور بہت سی بُرائیاں پیدا کر دیں، جانوروں سے گذر کر انسانوں کی قربانیاں اُن پر چڑھائی جانے لگیں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جد امجد عبد المطلب نے جو اپنے صاحبزادہ (عبد اللہ) کی قربانی کرنی چاہی تھی، وہ اسی کہنہ رسم کی تقلید تھی،

---

[1] یہ پوری تفصیل معجم البلدان لفظ مناۃ میں ہے، [2] معجم البلدان لفظ لات و کتاب الاصنام لکلبی مطبوعہ دار الکتب المصریہ ۱۹۲۳ء

بحیرہ، سائبہ، حام کے نام سے بتوں کے نام پر سانڈ چھوڑتے تھے، کعبہ کے سامنے جو قربانی کرتے تھے اس کا خون کعبہ کی دیواروں پر ملتے تھے، بتوں کے سامنے نگون تیر رہتے تھے، ان میں سے ایک پر "ہاں" ایک پر "ناں" لکھا رہتا تھا، جو کام کرنا چاہتے پجاری سے کہتے کہ فال نکالے "ہاں" کا تیر نکلتا تو اس کام کو کرتے ورنہ باز رہتے،

جاہلیت میں جن چیزوں کی پرستش کیجاتی تھی، وہ مختلف قسم کی تھیں، اصنام و اوثان، نصاب اور بیوت، اصنام، و اوثان جن کا واحد صنم اور وثن ہے، یہ انسانی شکل و صورت کے بت تھے، اگر وہ لکڑی کے ہوتے تو نعیم کہلاتے اور اگر رنگ اور مسالہ سے بنتے تو انکو دمیہ کہتے، اور انصاب اور نصب بن گھڑے پتھر ہوتے تھے جن کو کھڑا کر کے اُن پر چڑھاوے چڑھاتے اور جانور ذبح کرتے تھے، بیوت جس کا واحد بیت ہے، چند گھر تھے، جیسے رضا، رئام، قلیس وغیرہ جنمیں بت پرستانہ رسوم ادا کئے جاتے تھے، جن بتوں کے ارد گرد چکر لگاتے تھے، ان کو دوار کہتے تھے، اور اُن پر جو قربانی کیجاتی تھی، اسکو عیترہ کہتے تھے، پتھروں کا ڈھیر لگا کر اس کے چاروں طرف چکر لگاتے تھے، اس ڈھیر کو رجمہ کہتے تھے، جاہلی شاعر کہتا ہے:-

کما طاف بالرجمۃ المترنم — جیسے پتھروں کے ڈھیر کا طواف کرنیوالا طواف کرتے[۲]

جن بتوں کی پرستش کی جاتی تھی، ان کی کوئی انتہا نہ تھی، ع

قبیلہ قبیلہ کا اک بت جدا تھا،

خاص خانۂ کعبہ اور اس کے اطراف میں تین سو ساٹھ بت[۳] تھے، ان میں سے قرآن پاک میں جن کے

---

[۱] نیل المرام فی تفسیر آیات الاحکام صفحہ ۱۱۱ [۲] ان الفاظ کیلئے دیکھو لسان العرب کو صحیح بخاری باب فتح مکہ،

نام بتائے گئے ہیں، وہ یہ ہیں، لاتؔ، عزیٰؔ، منا ۃؔ، یغوثؔ، یعوقؔ، نسرؔ، ودّؔ، سواعؔ، ہبلؔ، لیکن جاہلیات کے پرانے مورخوں اور لغت نویسوں نے جاہلیت کے شخصی ناموں اور شعراء کے اشعار سے بہت سے نام ذکر کئے ہیں، ہشام کلبی کی کتاب الاصنام میں جو اس موضوع پر پہلی کتاب ہے، اور جو اب مصر میں چھپ بھی گئی ہے، تقریباً تیس بتوں کے نام ہیں، علامہ زکی پاشا جنھوں نے کلبی کی اس کتاب کو ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء میں تجشیہ و تکملہ کے بعد شائع کیا ہے، اپنے تکملہ میں چھیالیس نام اور بڑھائے ہیں، یمن اور حجاز میں آثار قدیمہ کے محققوں نے عہد جاہلیت کے جو کتبے پڑھے ہیں، ان میں المقہ، عشار، نکرہ، قینان وغیرہ بہت سے اور ناموں کا پتہ لگایا ہے، میں نے ارض القرآن کی دوسری جلد میں جو ۱۳۳۶ھ/۱۹۱۸ء میں چھپی ہے، ان معلومات کو یکجا کر دیا ہے،

ذیل میں ہم ان بتوں کی فہرست درج کرتے ہیں جن کے نام ابتک معلوم ہو چکے ہیں،

بتوں کے نام	قبیلوں کے نام جو ان کو خاص طور سے پوجتے تھے،
لاتؔ	ثقیف،
عزیٰؔ	قریشؔ و بنو شیبانؔ بن جابر،
منا ۃؔ	اوسؔ و خزرجؔ اور عام عرب،
یغوثؔ	بنو مذحج داہل جرشؔ،
یعوقؔ	بنو ہمدانؔ داہل خیوانؔ
نسرؔ	حمیر،
ودّؔ	بنو کلبؔ،

سواع	بنو لحیان
اساف	بت، جس پر حج میں قربانی ہوتی تھی،
نائلہ	بت جس پر حج میں قربانی ہوتی تھی،
اُقیصر	قضاعہ و لخم و جذام، و عاملہ و غطفان،
باجر	ازد و طی و قضاعہ،
ذوالخلصہ،	بنو دوس، خثعم، بجالہ، ازد السراۃ
رُضا یا رُضیٰ	بنو ربیعہ کا بتخانہ،
رُام	حمیر کا بتخانہ
سبجہ	
سعد	بنی کنانہ بن لحیانہ،
سُعَیر	عنزہ
ذوالشریٰ	بنو حارث
عائم	ازد السراۃ
عم انس دیا عمیانس	خولان
قلس	طی
ذوالکفین	بنو دوس
مناف	قریش

نُہم	مزنیہ
ہُبل	قریش
بَعل	قبائلِ بنی عدنان
یعیوب	جدیلہ (بنی طی)
اشہل	بنو عبد الاشہل
اوال	بکر و تغلب
بس	غطفان کا بُت خانہ
بعیم	ایک لکڑی کا بُت
بلج	ایک بُت
جبہ	" "
جُریش یا جَریش	ایک بُت جس کی طرف عبد جریش کی نسبت ہے،
جلسد	ایک بت کا نام
جہار	ہوازن کا معبود
دار	بنو عبد الدّار
دوار	ایک بُت کا نام
ذوالرجل	حجاز کا ایک بُت
شارق	ایک بُت کا نام جس کی طرف عبد الشارق کی نسبت ہے،

شمس	بنو عبد شمس،
صدا	عاد کا بت،
صمودا	〃
ضمار	عباس بن مرداس سلمی کا قبیلہ،
ضیزن	منذر اکبر،
عبب	قضاعہ،
عوض	بکر بن وائل،
عوف	ایک بت کا نام،
عنعب	اس پر جانور ذبح کیے جاتے تھے،
فراض	سعد العشیرہ،
کثریٰ	جذیمہ وطسم،
کعبہ	ایک بت کا نام،
محرق	بکر بن وائل،
مدان	عبد المدان،
مرحب	حضرموت،
منہب	ایک بت کا نام،
ہبا	عاد،

ذات الوَدْع	ایک بت کا نام
یالیل	عبد یالیل

ستارہ پرستی عرب میں ستارہ پرستوں کا بھی ایک گروہ تھا، مختلف قبیلے مختلف ستارون کی پوجا کرتے تھے، اُن مین سب سے اہم سورج اور چاند تھے، اسی لئے قرآن پاک نے خصوصیت کیساتھ کہا:

لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ (حٰمٓ سجدہ ۵) نہ سورج کو سجدہ کرو، نہ چاند کو،

یمن مین سبا کی قوم سورج ہی کو دیبی مانتی تھی، (نمل-۳) یمن کے بادشاہ شمر یرعش نے شمس دیبی کا مندر بنوایا تھا[1] سورج اور چاند کے بعد ستارون میں شعریٰ کی بڑی قدر و منزلت تھی، اسی لئے قرآن پاک نے کہا:

وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى (نجم-۳) اور وہی خدا شعریٰ کا مالک ہے،

صاعد اندلسی المتوفی ۴۶۲ھ نے اپنی کتاب طبقات الامم مین عرب کے حسب ذیل قبیلون کو مختلف ستارون کا پرستار بتایا ہے،

قبیلۂ حمیر سورج کو پوجتا تھا، کنانہ چاند کو، تمیم دبران کو، لخم اور خذام مشتری کو، ملی سہیل کو قیس شعریٰ العبور کو، اور اسد عطارد کو،

جن اور شیاطین اور بھوت پلیت جن اور شیطان کی نسبت عرب کے عجیب عجیب اعتقاد تھے، وہ جن شیطان، اور بھوت پلیت، سب کو ایک ہی جنس سمجھتے تھے، گو اختلافِ صورت اور اشغال کی وجہ سے اُن کے الگ الگ نام پڑ گئے تھے، جو اکثر جنگلون اور میدانون میں رہتے تھے،

[1] تاریخ ملوک الارض حمزہ اصفہانی ص۱۱ کلکتہ ۲ طبقات الامم قاضی صاعد اندلسی ص۴۳، بیروت،

اور مسافروں کو اپنی صورتین یا لباس، بدل بدل کر دھوکا دیتے تھے، اُن کا نام غول تھا، یہ مذکر بھی ہوتے تھے، اور مؤنث بھی،

عبید بن ایوب الغیری،

وَغولا قفرۃ ذکر وانثے — اور بیابان کے دو غول، مرد بھی، اور عورت بھی

کانّ علیھما قطع البجاد — گویا کہ اُن دونون پر کمل کے ٹکڑے پڑے ہین

مؤنث کو سعلاۃ کہتے تھے،

ازلّ وسعلاۃ وغول بقفرۃ — میں پھسلتا ہون اور چڑیل اور غول بیابان

اذا اللیل واری الجنّ فیہ ارنّت — میں جب رات پردہ پوش ہوتی تھی، تو اُسمین آواز

عمرو بن یربوع ایک ممتاز شخص تھا، اس نے سعلاۃ سے نکاح بھی کیا تھا، اور اس سے ولاد بھی ہوتی تھی، راجز کہتا ہے،

یا قاتل اللہ بنی السعلاۃ — خدا سعلاۃ کے فرزندوں کو مارے،

بلقیس، ملکۂ یمن (اُن کے زعم مین) سعلاۃ ہی کے پیٹ سے تھی،

یہ اکثر گاتے بجاتے تھے، اور اہل عرب اُن کے نغمون سے محفوظ ہوتے تھے،

کم جبت دونک من بھماء مظلمۃ — کتنی اندھیری گھپ راتون مین مین نے صحرا کو

تیہ اذا ماء مغنّی جنّہ سمرا — قطع کیا، جب وہان کے جنات کا مغنی افسانہ گوئی

یہ صحرانشین بدوون کی صحبتون مین شریک ہوتے تھے، جاڑون مین جب بدو آگ جلا کر بیٹھتے تھے تو یہ بھی آگ تاپنے کو آجاتے تھے، لیکن جب اُن کو کھانے پر بلاتے تھے، تو وہ عذر کرتے تھے کہ

ہم آدمیوں کی غذا نہیں کھا سکتے،

اتوا ناری فقلت ممون انتم	وہ لوگ رات کو میری پاس آئے تو میں نے کہا تم کون ہو
فقالوا الجن قلت عموا ظلاما	انھوں نے کہا ہم جن ہیں، میں نے کہا اس تاریکی میں خوش ہو،
دعوت الی الطعام فقال منهم	میں نے انکو کھانے کیلئے بلایا، تو اُن میں سے ایک سردار نے کہا
زعیم نحد الانس الطعاما	ہم انسانوں کے کھانے پر حد کرتے ہیں،

یہ زیادہ ترجمان آباد تھے ان موضعوں کے نام بدی، بقار، اور عبقر تھے،

ع: حی البدی رواسیا اقدامها	بدی کے جن، جن کے قدم جمے تھے،
ع: تحت السنور حبهم البقار	زرہوں کے نیچے بقار کے بھوت تھے،
ع علیهن فتیان کجنة عبقر	اور اُن پر شمشیر جوان عبقر کے بھوت معلوم ہوتے تھے

اُن کے اقسام حسب ذیل تھے،

جو آدمیوں کے ساتھ مل جل کر رہتے تھے، اُن کو عامر کہتے تھے،

جو بچوں کو ستاتے تھے، اُن کا نام روح تھا،

جو زیادہ شریر تھے اُن کو شیطان کہتے تھے،

اس درجہ سے بڑھ کے جو شریر ہوتا تھا اُس کو عفریت کہتے تھے،

یہ اکثر بچوں اور جوانوں کو اٹھا لیجاتے تھے، حضرت علیؓ کے ایک بھائی طالب تھے، انکو اٹھا لے گئے اور پھر اُن کا پتہ نہ لگا، عمرو بن عدی لخمی جو عرب کا بادشاہ تھا، اس کو بھی اٹھا لے گئے تھے لیکن کئی برس کے بعد بذریعہ ابرش کو لا کر دے گئے،

اسی طرح خرافہ کا قصہ ہے جس کو جن اٹھالے گئے تھے، مدت کے بعد وہ واپس آیا تو عجیب عجیب باتیں بیان کرتا تھا،

ان اجنہ یا شیاطین سے جن لوگون کے تعلقات زیادہ بڑھ گئے تھے، ان میں سے تابط شرًا اور ابو البلاد طہوی زیادہ مشہور ہین طہوی نے ایک دفعہ ایک بھوت کو مار ڈالا تھا، اس کے واقعات ایک نظم مین لکھے ہین،

لقیت الغول تہوی فی ظلام	مین غول بیابانی سے ملا جو رات کو اندھیرے مین چلتے ہیں،
.....	.....
فصدت و انتحیت لها بعضب	کو اس نے روکا اور مین نے بنی ہوئی اصیل تلوار
حسام غیر مؤتشب یمانی	لے کر اسکی طرف بڑھا،
فقد سراتها و البرد منها	تو اُس نے اس کے سر کو اور اسکی اندھیوں کو کاٹ ڈالا،
فخرت للیدین و للجران[2]	اور وہ دونوں ہاتھوں اور سینہ کے بل زمین پر گر پڑا،

ان ہی اجنہ اور شیاطین کا زور توڑنے کے لئے قرآن نے قیامت کے اس سوال و جواب کا انداز اختیار کیا کہ ان کے دوست انسان وہان بھی اُن کی دوستی کا دم بھرتے جائین گے، اس سے اندازہ ہوگا کہ جاہل عربوں پر ان کا کس قدر استیلا تھا،

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَکْثَرْتُمْ مِنَ الْاِنْسِ	اے جنوں کے گروہ! تم نے انسانون سے بہت کچھ

[1] شمائل ترمذی باب السمر [2] یہ تمام تفصیل کتاب الحیوان جاحظ سے ماخوذ ہے اُس نے کئی ورق مین نہایت تفصیل سے یہ واقعات لکھے ہیں، دیکھو کتاب مذکور از ص ۴۸ تا صفحہ ۵۰ جزء ششم مطبوعہ مطبع سعادت، مصر،

وقال اولیٰئھم من الانس ربنا — وصول کیا، اور ان کے دوستدار انسان نے

استمتع بعضنا ببعض (انعام ۱۵) — اے ہمارے رب! ہم میں سے ایک نے دوسرے کا[۲]

کہانت کہانت ایک سخت بلا تھی، جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھی، ہر جگہ یا کئی کاہن ہوتے تھے، جو آئندہ واقعات کی پیشین گوئیاں کرتے اور آسمانی خبریں بتاتے تھے، اہل عرب کا اعتقاد اور خود کاہنوں کا دعویٰ تھا، کہ انکے ساتھ ایک ایک جن رہتا ہے اور وہی انکو القا کرتا ہے، وہ اپنی شکل وصورت بناتے تھے کہ پہچان لئے جاتے تھے چنانچہ ایکبار حضرت عمرؓ کے پاس سے ایک آدمی گذرا، انھوں نے قیافہ سے پہچان لیا کہ وہ کاہن ہے، اسکو بلا کر پوچھا کہ تیرے جن نے تجھ سے سب سے عجیب تر بات کیا بیان کی؟ اس نے کہا میں ایک روز بازار میں پھر رہا تھا، کہ میرا جن گھبرایا ہوا، آیا اور کہا،

الم تر الی الجن وابلاسھا، — کیا تم جن کو سراسیمگی، ان کی ناامیدی

ورسھا من بعد انکاسھا وخوفھا — اور ان کے کاروبار کی ابتری نہیں

بانقلاص واحلاسھا، — دیکھتے،

حضرت عمرؓ نے فرمایا سچ ہے، میں ایک روز زمانۂ جاہلیت میں بتوں کے پاس سویا ہوا تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی نے ایک گوسالہ لاکر ذبح کیا، اس کے بعد ایک شخص زور سے چلایا،

یا جلیح، امر نجیح رجل فصیح یقول — اے جلیح، کامیاب مرد، ایک فصیح شخص

---

[۱] کتاب البیان والتبیین للجاحظ جلد اوّل ص ۱۱۳ مطبوعہ مطبع علمیہ مصر،

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، لا الہ الا اللہ کہتا ہے،

اس کے چند ہی دنوں کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، صحیح بخاری تفسیر سورۂ والضحیٰ میں روایت ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کچھ علیل ہو گئے، اور دو تین دن رات میں عبادت کے لئے نہیں اٹھے، اس پر ایک عورت (یہ ابولہب کی زوجہ تھی) نے آکر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کہا،

انی ارجوان یکون شیطانک قد ترکک،	میرا خیال ہے کہ تیرے شیطان نے تجھ کو چھوڑ دیا،

یہ وہی خیال تھا، چونکہ کفار آپ کا کاہن خیال کرتے تھے، اس لئے ان کا خیال تھا کہ آپ کے ساتھ کوئی جن یا شیطان رہتا ہے، قرآن پاک نے اسی کی تردید اس آیت میں کی ہے،

ھَلْ اُنَبِّئُکُمْ عَلٰی مَنْ تَنَزَّلُ الشَّیٰطِیْنُ تَنَزَّلُ عَلٰی کُلِّ اَفَّاکٍ اَثِیْمٍ یُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَکْثَرُھُمْ کٰذِبُوْنَ ۝ (شعراء - ۱۰)	کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں، شیطان ہر جھوٹے گنہگار پر اترتے ہیں، وہ سنی سنائی بات اتار کرتے ہیں اور اکثر وہ جھوٹے ہوتے ہیں،

یہ کاہن تمام مقدمات اور نزاعات کا فیصلہ بھی کرتے ہیں، اور اس بنا پر تمام ملک پر ان کا اثر چھایا ہوا تھا، ان میں سے حازی، شق، سطیح، عزیٰ، بہت مشہور تھے، جاحظ نے ان کے کاہنانہ فقرے کتاب البیان میں نقل کئے ہیں،

لہ صحیح بخاری جلد اول ص ۷۴۶،

والارض والسماء، والعقاب	قسم ہے زمین اور آسمان کی اور عقاب اور
والصقعاء، واقعة بيعاء الله	آقاب کی، ایک واقعہ میدان میں واقع
نفر المجد بني العشراء للمجد	ہوا کہ بزرگی بنو عشراء پر غالب آگئی بوجہ
والسناء؛	بڑائی اور بلندی کے،

یہ کاہن جو خبریں بتاتے یا تلقین کرتے وہ بڑے تکلف کے مقفیٰ اور مسجع فقرے ہوتے اس لئے جب ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک ساقط الحمل بچہ کا مقدمہ پیش ہوا اور آپ نے اس کی دیت کا فیصلہ کیا، تو ایک شخص نے عرب کے دستور کے مطابق اعتراضاً کہا،

أدأيت من لا شرب ولا أكل ولا	غور فرمایئے کہ جس بچہ نے نہ کھایا نہ پیا چیخا
صاح فاستهل، فمثل ذلك يطل	نہ رویا کیا اس کا خون معاف نہ ہوگا،

آپ نے فرمایا یہ کاہنوں کے بھائیوں میں سے ہے، (صحیح مسلم دیۃ الجنین و صحیح بخاری باب الکہانۃ) یہ کاہن بتخانوں میں رہتے تھے، اور کسی خاص بت کے پجاری ہوتے تھے جب لوگ اُن سے غیب کی بات پوچھتے، یا وہ خود آئندہ کے متعلق پیشین گوئی کرنے لگتے تو ایک خاص کیفیت اپنے اوپر طاری کرتے، مرد بھی کاہن ہوتے تھے، اور بعض عورتیں بھی ہوتی تھیں جو کاہنہ کہلاتی تھیں، یہ مصیبتوں اور بلاؤں کے دور کرنے کے لئے جنتر منتر علاج اور تدبیر بتاتے تھے، یہ اپنی کہانت کی اجرت میں بڑی بڑی رقمیں اور نذرانے وصول کرتے تھے، اسلام کے بعد ان میں جو مسلمان ہو گئے تھے وہ علانیہ اپنے خدع و فریب کا اعتراف کرتے تھے[1]

---

[1] بخاری جلد اوّل ص ۵۴۲ کتاب الطب باب الکہانۃ،

ان کو نذر و نیاز اور اجرت کی جو رقم یا تحفہ ملتا، اس کا نام حلوان الکاہل تھا یعنی کاہن کا منہ میٹھا کرنے کیلئے تحفہ اسلام نے آکر اسکو روک دیا،

غرض ان کاہنوں نے عوام فریبی کا بڑا جال پھیلا رکھا تھا، اور یہ ان ہی کا اثر تھا کہ ملک کا ملک سیکڑوں قسم کی وہم پرستیوں میں مبتلا ہو گیا تھا،

شعرا کی نسبت بھی عرب کا یہ خیال تھا کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک شیطان رہتا ہے اور وہی اس کو اشعار القا کرتا ہے، چنانچہ مخبل شاعر کی شیطانہ عمرو کی بیٹی تھی، اور اعشیٰ جو عرب کا مشہور شاعر تھا، اس کے شیطان کا نام مسحل تھا، اعشیٰ خود کہتا ہے،

دعوت خلیلی مسحلا ودعوا له ۔۔۔ میں نے اپنے دوست مسحل کو پکارا اور انھوں نے

بجهام مدعی للهجین الملذمم ۔۔۔ اس کیلئے جہام کو پکارا، اور یہ کمینہ بدطور کیلئے

حبانی اخی الجنی نفسی فداءه ۔۔۔ بلایا جاتا ہے، مجھ کو میرے جن دوست نے میری جان

یا قبح جیاش العشیات مرجم[1] ۔۔۔ اس پر فدا ہو شاموں کے وقت سب سے برے جوش

جو اعلیٰ درجہ کا شاعر ہوتا تھا، اسکا شیطان یا جن مذکر ہوتا تھا، ابو النجم کہتا ہے،

انی وکل شاعر من البشر ۔۔۔ ہر شاعر کا شیطان تو مونث ہے،

شیطانة انثی وشیطانی ذکر ۔۔۔ مگر میرا شیطان مذکر ہے،

شنقنان اور شیصبان، روسائے شیاطین تھے جو شاعری سکھلاتے تھے، ایک شاعر کو اس پر فخر تھا کہ اس کا معلم اسی شیصبان کی اولاد سے ہے،

---

[1] صحیح بخاری جلد اول ص ۵۲۲ کتاب الطب باب الکہانۃ [2] اعشیٰ کے دیوان مطبوعہ ویانا ص ۶۵ میں صرف پہلا شعر ہے، اور اسکا بھی دوسرا مصرعہ اس طرح ہے، جهنام جلفا للهجین الملذمم،

ولی صاحب من بنی الشیصبان — میرا ساتھی شیصبان کی اولاد ہے،
قطوراً اقول وطوراً هُوَ لا — تو کبھی میں شعر کہتا ہوں کبھی وہ

۱ وہم پرستی

سانپ کو قتل نہیں کرتے تھے، یہ اعتقاد تھا کہ سانپ مار ڈالے تو اس کا جوڑا کر بدلہ لیتا ہے[1]، یہ اعتقاد تھا کہ مرنے کے بعد روح ایک پرند بن کر اڑتی رہتی ہے، اسکو ہامہ کہتے تھے، یہ اعتقاد تھا کہ پیٹ میں ایک سانپ رہتا ہے، جو بھوک کے وقت کاٹتا ہے، جو کام کرنا چاہتے پہلے شگون لے لیتے تھے، مثلاً اس وقت کوئی پرند داہنی جانب سے اڑا تو مبارک سمجھتے تھے، اور بائیں جانب سے اڑا تو اس وقت اس کام سے باز رہتے تھے، بکری کے جب بچہ پیدا ہوتا تو اگر نر ہوتا تو بت پر چڑھا دیتے، اونٹنی جب دس بچے جن لیتی، اسکو چھوڑ دیتے، وہ سانڈ کی طرح پھرتی،

کسی شخص کے پاس جب اونٹوں کی تعداد ہزار تک پہنچ جاتی تو ایک اونٹ کی ایک آنکھ پھوڑ دیتے، کہ نظر نہ لگ جائے، جب کبھی قحط پڑتا تو بھیڑ یا دنبہ کی دم میں گھاس پھونس باندھ کر آگ لگا دیتے اور سمجھتے کہ اس سے پانی برسے گا، سفر میں جاتے تو کسی درخت میں ڈورا وغیرہ باندھ کر گرہ لگا دیتے، واپس آکر دیکھتے اگر گرہ کھل گئی ہے تو سمجھتے کہ ان کی بیوی نے بدکاری کی، سفر میں راستہ بھول جاتے تو کپڑے الٹ کر پہن لیتے اور سمجھتے کہ اس سے راستہ مل جائیگا[2]، یہ خیال تھا کہ جو شخص لات و عزیٰ کو گالی دیتا ہے، اسکو برص یا جزام ہو جاتا ہے[3]، ہاتھوں میں پیتل کی انگوٹھی پہنتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ اس سے ضعف جاتا رہتا ہے[4]،

---

[1] ابو داؤد مطبوعہ مجتبائی جلد ۲ ص ۳۶۶ [2] یہ باتیں بلوغ العرب و اطوار العرب وغیرہ کتابوں میں مذکور ہیں
[3] مسند دارمی ص ۵۹، [4] ابن ماجہ ص ۱۸۸، تیسیر التمائم، ابواب الطب،

اس قسم کے سیکڑوں ادہام پھیلے ہوئے تھے، جن کا شمار نہیں ہو سکتا،
یہ تو اُن کے مذہبی حالات و خیالات تھے، انکی اخلاقی کیفیت بھی ایسی ہی پست تھی،
اُن کے اخلاقی معائب میں سب سے نمایاں چیز ان کی جنگجوئی تھی، جس نے انکو حد درجہ خونخوار و سنگدل
اور سفاک بنا دیا تھا،
جنگجوئی ذرا ذرا سی بات پر لڑ مرنا، اور ایک دوسرے کا سر کاٹ لینا اُن کے نزدیک کوئی بات
ہی نہ تھی، ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے، اور ہر خاندان دوسرے خاندان سے برسرپیکار تھا، ہر بچہ اپنے
باپ اور عزیزوں کے قاتل سے انتقام لینے کے جذبہ میں پرورش پاتا تھا، اور جوان ہو کر اس مقدس
فرض کو انجام دیتا تھا اور اس طرح ایک ایک لڑائی کا سلسلہ برسوں تک قائم رہتا تھا
انہی لڑائیوں کو مورخین اور اہلِ ادب ایام العرب کہتے ہیں، جن کی تعداد سیکڑوں سے
متجاوز ہے، میدانی نیشاپوری المتوفی ۵۱۸ھ نے کتاب الامثال میں ان میں سے ۳۲ لڑائیوں
کے نام بتانے کے بعد یہ لکھا ہے:-

ھٰذا الفن لا یتقصاہ الاحصا	یہ فن شمار کا استقصا نہیں کر سکتا،
فاقتصرت علیٰ ما ذکرت (جلد ۲ ص ۱۰۳ طبع مصر)	اس لئے جو کچھ میں نے بیان کیا ہے، اسی پر میں نے قناعت کی،

یہ تمام لڑائیاں وہ ہیں جو اسلام سے چالیس پچاس برس پیشتر سے اسلام تک ہوئیں،
ان میں سب سے مشہور لڑائی حرب داحس و غبراء کی ہے، جس کا واقعہ یہ ہے کہ ان دو قبیلوں کے دو
گھوڑے داحس اور غبراء کا باہمی مقابلہ تھا، ان میں سے ایک فریق نے گھوڑ دوڑ کے قواعد کی

خلافت درزی کی لڑائی ہوئی تھی، یہ لڑائی ان دونوں قبیلوں میں پورے چالیس برس تک قائم رہی
دوسری مشہور لڑائی حرب بسوس ہے، اس کا واقعہ یہ ہے کہ بسوس نامی ایک قبیلہ کی
عورت کی اونٹنی کلیب بن وائل کے چراگاہ میں جا پڑی، کلیب نے اپنے تیر سے اسکے تھن کو زخمی
کیا، اس بات نے قبیلہ میں آگ لگا دی، کلیب مارا گیا، اور بکر و تغلب میں خونریز جنگ
ہوئی، عکاظ کے میلہ میں سلیم اور غطفان کے سرداروں میں کچھ مناقشہ ہوا، چند روز کے بعد
موقع پاکر ایک قتل کر دیا گیا، اسکے انتقام میں خون کی ندیاں بہ گئیں، بکر و تمیم میں ایک چراگاہ
کے معاملہ میں خونریز لڑائی ہوئی، اوس و خزرج مدینہ کے دونوں قبیلوں میں جو ہولناک
لڑائیاں ہوتی رہیں، ان میں سب سے مشہور یوم بعاث ہے، جس میں دونوں قبیلوں کے اکثر
سردار کام آئے، اس لڑائی کا خاتمہ انصار مدینہ کی ہجرت پر ہوا، قریش کی مشہور لڑائیوں کا نام
ایام فجار ہے، ایک اور مشہور لڑائی کا نام ذی قار ہے،

الغرض معمولی سے اشتعال سے قتل تک نوبت پہنچتی تھی، قتل سے انتقام کا جذبہ پیدا
ہوتا تھا، اور لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہو جاتا تھا[1]، ان میں لڑنا اور مر جانا اور مارنا جانبت
کا شرف اور قبیلہ کی آن سمجھی جاتی تھی، اور اس خون آشامی کا ذوق انکی فطرت ثانیہ بن گئی
تھی ان لڑائیوں میں سفاکی، بیرحمی اور قتل و غارت کی بدترین مثالیں پیش آتی رہتی تھیں،

شراب خواری شراب جو ہر قسم کے فسق و فجور اور مظالم اور بدکاری کا سرچشمہ ہے، عربوں میں
اسکا اسقدر رواج تھا کہ ہر گھر ایک میکدہ بنگیا تھا اسکا زینا اسقدر نامانوس بات تھی کہ جن چند

[1] ان لڑائیوں کے مفصل حالات کیلئے دیکھو عقد الفرید ابن عبد ربہ جلد ۳ اور امثال میدانی لفظ "یوم"

آدمیوں نے اسلام سے پہلے اسکے پینے سے پرہیز کیا تھا، انکے نام یاد رکھے گئے ہیں، دوست احباب کسی گھر میں جمع ہوتے، شراب کا دور چلتا، ساتھ ہی جوا کھیلتے، اسمیں اونٹوں کی ہار جیت ہوتی، جو جیتا وہ جیتے ہوئے اونٹوں کو اسی وقت ذبح کرکے کھلا دیتا، کبھی نشہ میں سرشار ہوکر خود صاحب خانہ اٹھ کھڑا ہوتا، اور اپنے اونٹوں کو کاٹ کاٹ کر ڈھیر کر دیتا، لوگ گوشت بھونتے، کباب لگاتے اور کھاتے کھلاتے اور اپنی اس بیجا فیاضی پر فخر کرتے ہے، سامنے فاحشہ مغنیہ عورتیں گانے بجاتیں، اور وہ اسی مخموری کے عالم میں بے شرمی کی باتیں کرتے

جاہلیت کا مشہور شاعر طرفہ کہتا ہے،

فان تبغنی فی حلقۃ القوم تلقنی — وان تقتنصنی فی الحوانیت تصطہ

پس اگر تو مجھے لوگوں کے حلقہ میں ڈھونڈے تو پائیگا — اور اگر شرابخانوں میں مجھے شکار کرنا چاہے تو کرسکتا ہے

متی تاتنی اصبحک کاسا رویۃ — وان کنت عنہا غانیا فاغن وازدد

جب بھی تو میرے پاس آئے میں تجھے شراب کا پیالہ پلاؤنگا، اور اگر تو اس سے بے نیاز ہوکر آئے، تو جا اور بے نیاز ہی کر

ندامای بیض کالنجوم وقینۃ — تروح الینا بین برد ومجسد

میری محفل شراب کی ہنستیں ستاروں کی طرح گورے چٹے ہیں اور ایک مغنیہ ہے جو شام کو ہمارے پاس یمنی چادر اور عنبر الی کپڑے میں آتی ہے

رحیب قطاب الجیب منہا رفیقۃ — بجس الندامی بضۃ المتجرد

اسکے گریبان کا شگاف بڑا ہے شراب کی رفیقوں کی دست درازی سے مانوس اور اسکے بدن کے برہنہ حصے لطیف ہیں

اذا نحن قلنا اسمعینا انیرت لنا — علی رسلہا مطروقۃ لم تشدد

جب ہم کہتے ہیں کہ ہمیں سناؤ، تو آہستہ آہستہ ..... نزاکت کے ساتھ آگے بڑھتی ہے

ومازال تشرابی الخمور ولذتی ۔۔۔ وبیعی وانفاقی طریفی ومتلدی

اور میری شراب نوشی اور لذت اندوزی اور اپنی حاصل کردہ اور موروثی دولت کو خرچ کرنا میرا شغل رہا

ولو کانت ھن من لذۃ الفتی ۔۔۔ وجدک لم احفل متی قام عودی

اور اگر تین باتیں نہ ہوتیں جو ایک شریف کا لطف ذوق ہیں، تو تیری قسم میں اپنی موت کو نہ گنتا

فمنھن سبقی العاذلات بشربۃ ۔۔۔ کمیت متی ما تعل بالماء تزبد

انمیں سے ایک تو نصیحت کرنیوالیوں کی بات کا خیال کئے بغیر سرخ و سیاہ رنگ کا پیارہ پی لینا جسمیں پانی پلانے سے جوش آئے

وتقصیر یوم الدجن والدجن معجب ۔۔۔ ببھکنۃ تحت الخباء المعمد

اور دوسری بات گھنگھور گھٹا کے دن کو اور وہ کیسا پر لطف دن ہوتا ہے کسی بلند خیمہ کے نیچے حسین معشوقہ سے لطف اندوزی میں

کریم یروی نفسہ فی حیاتہ ۔۔۔ ستعلم ان متنا غداۃ بینا الصدی

میں وہ فیاض ہوں جو اپنی زندگی میں اپنے آپ کو شراب پلا کے سیراب کرتا ہے، موت کے بعد معلوم ہوگا کہ ہم میں پیاسا کون ہے

وبرک ھجود قد اثارت مخافتی ۔۔۔ بوادیھا امشی بعضب مجرد

اور کتنے بیٹھے ہوئے سوئے اونٹ تھے کہ میرے خوف نے ان کے گلوں کو بھڑکا دیا، جب میں تلوار لیکر چلا

فمرت کھات ذات خیف جلالۃ ۔۔۔ عقیلۃ شیخ کالوبیل یلندد

تو ایک موٹی اونٹنی جو ایک بڈھے کی جو لٹھ کی طرح جھگڑالو تھا، قیمتی چیز تھی، سامنے آگئی

وقال الا ماذا ترون بشاربٍ ۔۔۔ شدید علینا بعینہ متعمد

اور جب میں نے تلوار سے کونچیں کاٹکر اونٹنی کو گرا دیا، تو اس بڈھے نے کہا کہ اس بدمست کو دیکھو جو ہمیں دیکھ کر بھی ظلم کرنے سے

فظل الاماء یمتللن حوارھا ۔۔۔ ویسعی علینا بالسدیف المسرھد

تو لونڈیاں اونٹنی کے بچہ کو (جو اسکے پیٹ سے نکلا تھا) بھوننے لگیں اور چربی دار کوہان کا گوشت لیکر ہمارے پاس دوڑا جانے لگا

لبید بن ربیعہ جو عرب کا مشہور شاعر، اور سبعہ معلقہ کی محفل کا چوتھا ممبر ہے کہتا ہے،

بل انت لا تدرین کم من لیلۃ ۔۔۔ طلق لذیذ لھوھا وندامھا

بلکہ تو نہیں جانتی کہ کتنی کھلی ہوئی راتیں جن کی دلچسپی اور ہم نوشی پر لطف تھی،

قد بت سامرھا وغایۃ تاجر ۔۔۔ وافیت اذ رفعت وعز مدامھا

میں ان کا قصہ گو تھا، اور شراب فروش کی منزل میں آتا جاتا رہا، جب جھنڈا بلند ہوا، اور اسکی شراب گراں ہوگئی

اغلی السباء بکل ادکن عاتق ۔۔۔ او جونۃ قدحت وفض ختامھا

میں اسکی قیمت کو اور گراں کر رہا تھا، پرانی خاکی رنگ کی مشک یا خم کو خرید کر جو پیالوں میں بھری جاتی اور اسکی مہر توڑی جاتی

وصبوح صافیۃ وجذب کرینۃ ۔۔۔ بموتر تاتالہ ابھامھا،

اور کتنی صبح کی صاف شراب، اور مغنیہ کا عود کو کھینچ کر اپنے انگوٹھے سے دبانا،

بادرت حاجتھا الدجاج بسحرۃ ۔۔۔ لاعل منھا حین ھب نیامھا

میں نے شراب کی ضرورت مرغ سحر کی آواز سے پہلے پوری کی، تاکہ میں اسکے سونے والوں کے جاگنے سے پہلے دہرالوں،

تغلب اُن قبیلوں میں تھا، جنھوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا، لیکن اس مذہب نے بھی عربوں کو اس بُری عادت سے باز نہیں رکھا تھا، بلکہ شراب کی درآمد زیادہ تر انہی عیسائیوں کے ملک شام سے ہوتی تھی، تغلب کا سب سے بڑا شاعر اپنے فخریہ میں کہتا ہے،

الا ھبی بصحنک فاصبحینا ۔۔۔ ولا تبقی خمور الاندرینا

ہاں اپنا پیالہ لیکر اُٹھ جا اور مجھے صبح کی شراب پلا اور اندریں (شامی گانوں) کی کوئی شراب چھوٹنے نہ پائے

مشعشعة كأن الحص فيها اذا ما الماء خالطها سخينا

پانی میں ملی ہوئی گویا اس میں کسم کے پھول پڑے ہیں، جب گرم پانی اسمیں ملا دیا جائے

تجور عن ذي اللبانة عن هواه اذا ما ذاقها حتى يلينا

غرضمند کو اسکی غرض بھلا دے، اگر اسکو چکھ لے، یہانتک کہ اسکو نرم کردے

ترى اللحز الشحيح اذا أبت عليه لما له فيها مهينا

تنگدل بخیل پر بھی اگر اس کا ایک دور گذار دیا جائے، تو وہ اپنی دولت کو ذلیل کردے

صبنت الكاس عنا أم عمرو وكان الكاس مجراها اليمينا

اے عمرو کی ماں! تو نے ہم سے پیالہ ہٹا لیا، حالانکہ پیالہ کا دور داہنی طرف تھا

وما شر الثلثة أم عمرو بصاحبك الذي لا تصبحينا

حالانکہ تیرا وہ ہمنشین جس کو تو نہیں پلاتی، تین میں سب سے بدتر نہیں،

كأس قد شربت بيعلبك واخرى في دمشق وقاصرينا

اور کتنے پیالے بعلبک میں پیے، اور کتنے دمشق اور قاصرین میں

ان اشعار سے اندازہ ہوگا کہ جاہلیت میں شراب نوشی کا کیا عالم تھا، شراب فروشوں کی دوکانیں کسی ممتاز مقام پر ہمیشہ کھلی رہتی تھیں، اور نشان کیلئے وہاں جھنڈا اڑا کرتا تھا، جس کو غایۃ کہتے تھے، (دیکھو اوپر لبید کا دوسرا شعر) انتہا یہ ہے کہ مجازاً کا لفظ شراب فروشی کا مترادف بن گیا تھا، ایک جاہلی شاعر عمرو بن قمیہ کہتا ہے:

اذا سحب الريط والمرط الى ادنى تجاري وانفض اللعب

یاد ہے وہ دن جب میں اپنی چادر گھسیٹتا ہوا قریب کی شرابخانہ میں جاتا تھا، اور اپنے گیسوؤں کو سنوارتا تھا

بدر میں قریش کے دولتمند رؤسا مارے گئے تھے، ان کے مرثیے میں قریش کا ایک شاعر خاص طور سے ان کی بزم شراب اور مجلس رقص و سرود کی بربادی کا ماتم کرتا ہے،

وھاذا بالقلیب قلیب بدر — من القینات والشرب الکرام[1]

بدر کے گڑھے میں (جسمیں مقتولین لاشیں ڈالی گئی تھیں) ناچنے والیوں اور فیاض شرابیوں کا ماتم ہے

شراب کے رواج عام کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ عربی زبان میں شراب کے ڈھائی سو نام ہیں، اور علامہ مجد الدین فیروز آبادی نے خاص ان ناموں پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے، تمام گھروں میں شراب کی مجلسیں قائم ہوتیں، گھر کی عورتیں اور چھوٹے بچے ساقی بنتے تھے، یہ شعر اوپر گذر چکا ہے، جس میں شاعر اپنی بیوی سے کہتا ہے،

صبینت الکاس عنا اُم عمرو — اے ام عمرو! تو نے شراب کا پیالہ ہم سے ہٹا لیا

وکان الکاس مجراالیمینا — حالانکہ پیالہ کی گردش داہنی طرف سے تھی

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اسلام لانے سے پہلے میں اپنے باپ (عباس) کی ران سے لگی میں یہ سنا کرتا تھا، اسقنا کاسا دھاقا "شراب کا ایک لبریز پیالہ ہمکو پلا"

صحیح بخاری کتاب الاشربۃ میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب شراب حرام ہوئی ہے تو اُس وقت ایک مجلس قائم تھی، جس میں حضرت ابو عبیدہؓ، ابو طلحہؓ، سہیل بن بیضا شریک تھے، اور میں جو کہ سب سے کمسن تھا، ساقی گری کی خدمت انجام دے رہا تھا،

[1] صحیح بخاری باب البحرۃ، جلد اول ص ۵۵۲ ایضاً باب ایام الجاہلیۃ جلد اول ص ۵۵۱،

شراب کس بے تکلفی سے پی جاتی تھی، کس درجہ کے لوگ پیتے تھے، کس قسم کے افعال اس حالت میں سرزد ہوتے تھے، اس کا اندازہ صحیح بخاری کی ایک روایت[1] سے ہوگا، جو حرمت شراب سے قبل کا واقعہ ہے،

غزوۂ بدر میں حضرت علیؓ کو مالِ غنیمت میں سے ایک اونٹنی ملی تھی، خمس میں سے ایک اور اونٹنی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عطا فرمائی، حضرت علیؓ کا نکاح حضرت فاطمہؓ سے ہو چکا تھا، اور وہ دعوت ولیمہ کی تیاری کر رہے تھے، ارادہ تھا کہ جنگل میں جاکر اذخر (ایک گھاس کا نام ہے) لائیں اور زرگروں کے ہاتھ فروخت کریں، اس ارادہ سے باہر نکلے تو دیکھا کہ ان کی اونٹنیوں کے کوہان کسی نے کاٹ لئے ہیں اور پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکال لیا ہے لوگوں نے پوچھا یہ کس کا کام ہے؟ معلوم ہوا کہ پاس ہی ایک گھر میں حضرت حمزہؓ چند انصاری کے ساتھ شراب پی رہے تھے، ایک مغنیہ نے گاتے گاتے یہ مصرع گایا،

الا یا حمز للشرف النواء — اے حمزہ! موٹی اونٹنیوں کے لئے،

حضرت حمزہؓ تلوار لیکر اٹھے اور اونٹنیوں کے پیٹ چاک کر کے ان کے کلیجے نکال لئے، حضرت علیؓ نے جاکر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خبر کی، اور یہ ماجرا بیان کیا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے چادر اوڑھی اور حضرت علیؓ اور زیدؓ کو لیکر حضرت حمزہؓ کے پاس گئے، حضرت حمزہؓ نشہ میں مخمور تھے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا، اور کہا تم سب میرے باپ کے غلام ہو، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ حالت دیکھ کر پلٹے آئے،

---

[1] صحیح بخاری کتاب المغازی، غزوۂ بدر ص ۵۷۰،

حضرت حمزہؓ نے ۳ھ میں شہادت پائی ہے، اُسوقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی[1]

شراب کی حرمت جس تدریج سے نازل ہوئی ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ تمام ملک کس طرح اس میں مبتلا تھا، کس طرح وہ معمول عام ہو چکی تھی کہ اسکی حرمت کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا تھا، اور کنائے اور اشارے سے گذر کر جب تک صاف صاف ممانعت نہیں کر دی گئی، لوگ سمجھ نہیں سکے،

ابوداؤد، کتاب الاشربہ میں روایت ہے کہ جب شراب کی ممانعت نازل ہوئی تو حضرت عمرؓ نے کہا اے خدا! شراب کے بارہ میں ہمکو صاف صاف بتادے" انکے اصلی الفاظ یہ ہیں:۔

اللّٰھم بین لنا فی الخمر بیانا شفاء	اے خدا! شراب کے بارے میں ہمارے لئے شافی بیان کر دے،

اس پر سورہ بقرہ کی یہ آیت اتری،

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ قُلْ فِیْھِمَآ اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُھُمَآ اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِھِمَا (بقرہ ۲۷)	لوگ تم سے شراب اور قمار بازی کی نسبت سوال کرتے ہیں تو کہدو کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کیلئے فائدے بھی ہیں لیکن فائدے سے

اس آیت کے اترنے کے بعد بھی لوگ شراب پیتے پلاتے رہے یہانتک کہ ایک دفعہ ایک انصاری نے حضرت علیؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف وغیرہ کی دعوت کی شراب کا دور چل رہا تھا کہ مغرب کی نماز کا وقت آگیا، ایک صاحبؓ نے امامت کی، مگر نشہ کے نماز میں

[1] شراب کی حرمت کی یہ تدریجی صورت حضرت عمرؓ، ترمذی تفسیر سورہ، ابوداؤد کتاب الاشربہ، حضرت ابوہریرہؓ۔

یَا اَیُّھَا الْکَافِرُوْنَ کے سورہ کو کچھ کا.... کچھ پڑھ گئے، اس پر یہ آیت اتری

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکَارٰی	نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو، یہانتک کہ
حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (نساء)	تم جو کہو اس کو سمجھ بھی سکو،

(بقیہ حاشیہ ص۲۶۶) (مسند احمد ج۲ ص۳۵) اور حضرت علیؓ (ابو داؤد کتاب الاشربہ) سے مروی ہے، یہ بات کہ وہ کون صحابی تھے جنھوں نے نشہ کی حالت میں غلط سلط سورہ پڑھ دی تھی، روایات سے صاف طور سے ظاہر نہیں ہوتی لیکن دو میں حضرت علیؓ کا نام ہے، اور دوسری میں عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا نام اور تیسری میں کوئی مہاجر مذکور ہے، حضرت لالہ نے سیرۃ جلد دوم (تاریخ احکام) ذکر حرمت شراب میں ابو داؤد کتاب الاشربہ کے حوالہ سے حضرت علیؓ کا نام لکھدیا تھا، مگر مرتد محقق سے یہ نسبت مشکوک معلوم ہوتی ہے، اس خاص روایت کا مرکزی راوی عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمٰن ہے، ابو عبدالرحمٰن سلمی حضرت علیؓ سے روایت کرتا ہے، اس یہ روایت مختلف طریقوں سے آئی ہے، اور ہر ایک میں شراب پینے والوں اور حالت نشہ میں نماز پڑھانے والے کا نام کا اختلاف ہے، چنانچہ ہر روایت کے اصل الفاظ یہ ہیں:

وہ روایتیں جنمیں حضرت علیؓ کا نام ہے،

۱۔ عن ابی جعفر الرازی عن عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمٰن السلمی عن علی بن ابی طالب قال صنع لنا عبدالرحمٰن بن عوف طعاما فدعانا وسقانا من الخمر فاخذت الخمر منا و حضرت الصلوٰۃ فقدموا نی فقرأت قل یا ایھا الکافرون لا اعبد ما تعبدون ونحن نعبد ما تعبدون فانزل اللہ یا ایھا الذین آمنوا لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاری (ترمذی تفسیر نساء)	ابو جعفر رازی نے عطاء بن سائب سے، عطاء نے ابو عبدالرحمٰن سلمی سے، ابو عبدالرحمٰن سلمی نے حضرت علی بن ابی طالب سے روایت کی، کہ علیؓ نے فرمایا کہ عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ہمارے لئے کھانا تیار کرایا، اور ہمکو دعوت دی، اور شراب پلائی، جب ہم شراب کے نشہ میں چور ہو گئے اور نماز کا وقت آگیا تو لوگوں نے مجھکو امام بنایا اور میں نے قل یا ایھا الکافرون لا اعبد ما تعبدون ونحن نعبد ما تعبدون پڑھی اس پر خدا نے یہ آیت اتاری یا ایھا الذین آمنوا لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاری (یعنی مسلمانو نشہ کی حالت

اس کے بعد جب نماز کا وقت آتا تو منادی اعلان کرتا تھا کہ کوئی مخمور نماز میں شامل نہ ہونے پائے"
لیکن چونکہ اب بھی ممانعت کا کوئی عام حکم نہ تھا، اسلئے نماز کے علاوہ اور اوقات میں لوگ
پیتے پلاتے رہتے تھے، حضرت عمرؓ نے پھر دعا کی، اتفاق سے اسی زمانہ میں بعض انصار نے حضرت سعدؓ

(بقیہ حاشیہ ص ۲۶۷) ۲۔ عن سفیان حدثنا عطاء بن
السائب عن ابی عبدالرحمٰن السلمی
عن علی علیہ السلام ان رجلا من
الانصار دعا.. وعبدالرحمٰن بن عوف
فسقاھما قبل ان تحرم الخمر، وامهم
علی فی المغرب فقرء قل یا ایھا
الکفرون فخلط فیھا فنزلت لا
تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاری حتی
تعلموا ما تقولون (ابوداؤد کتاب
الاشربہ)

۲۔ سفیان نے عطاء بن سائب سے عطاء نے ابوعبدالرحمٰن
سلمی سے ابوعبدالرحمٰن سلمی حضرت علی علیہ السلام
سے یہ روایت کی ہے کہ انصار کے ایک شخص نے ان کو
اور عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو مدعو کیا اور تحریم شراب
سے پہلے ان دونوں کو شراب پلائی، پھر علیؓ نے
نماز مغرب ۔ ۔ ۔ کی امامت کی اور قل یا
ایھا الکافرون پڑھی لیکن اسمیں گڑبڑ
کر دیا، اس پر آیت اتری لا تقربوا الصلوٰۃ
وانتم سکاری حتی تعلموا ما تقولون"
نشے کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ تم

وہ روایتیں جن میں عبدالرحمٰنؓ بن عوف کا نام ہے،

۳۔ عن سفیان عن عطاء بن السائب
عن ابی عبدالرحمٰن السلمی عن علیؓ رضی
اللہ عنہ قال دعانا رجل من الانصار
قبل ان تحرم الخمر، فتقدم عبدالرحمٰن
ابن عوف وصلی بھم المغرب فقرء
قل یا ایھا الکافرون فالتبس علیہ فترکت
لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاری
(مستدرک حاکم کتاب الاشربہ)

سفیان نے عطاء بن سائب سے عطاء نے ابوعبدالرحمٰن
سلمی سے ابوعبدالرحمٰن سلمی نے حضرت علیؓ رضی اللہ
عنہ سے روایت کی ہے کہ تحریم شراب سے پہلے انصار
کے ایک شخص نے ہمکو مدعو کیا تو عبدالرحمٰن بن
عوف نے امامت کی اور انکو مغرب کی نماز پڑھائی اور
قل یا ایھا الکافرون پڑھی، لیکن اس میں خلط
ہو گیا، اس پر یہ آیت اتری لا تقربوا
الصلوٰۃ وانتم سکاری" الآیۃ
نشے کی حالت میں نماز نہ پڑھو،

وقاص کی دعوت کی، اس میں شراب کا دور بھی چلا، یہ پی کر مست ہی میں کہنے لگے کہ مہاجر انصار سے بہتر ہیں، اس پر بات بڑھی اور مار پیٹ تک نوبت پہنچی، اس پر یہ حکم آیا، (صحیح مسلم فضائل سعد وقاص)

(بقیہ حاشیہ ص۲۰)

۴۔ سفیان عن عطاء بن السائب عن (؟) عبد الرحمن عن علی رضی اللہ عنہ ان رجلا کان ھو وعبد الرحمن او رجل آخر شربوا الخمر فصلی بھم عبد الرحمن بن عوف فقرء قل یا ایھا الکافرون فخلط فیھا فنزلت لا تقربوا الصلوٰۃ (مستدرک حاکم کتاب الاشربہ)

۴۔ سفیان نے عطاء بن السائب سے، عطا نے ابن عبد الرحمن سے، ابن عبد الرحمن نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ وہ اور عبد الرحمن ابن عوف اور ایک دوسرے آدمی شراب پی رہے تھے اور انکو عبد الرحمن بن عوف نے نماز پڑھائی اور قل یا ایھا الکافرون پڑھی جس میں خلط ملط کر دیا، اس پر یہ آیت اتری لا تقربوا الصلوٰۃ

۵۔ خالد بن عبد اللہ عن عطاء بن السائب عن ابی عبد الرحمن ان عبد الرحمن صنع طعاما فدعا ناسا من اصحاب النبی صلعم فلیھم علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فقرء قل یا ایھا الکافرون لا اعبد ما تعبدون ونحن عابدون ما عبدتم فزلت لا تقربوا الصلوٰۃ الایہ (مستدرک حاکم، کتاب الاشربہ)

۵۔ خالد بن عبد اللہ، عطاء بن سائب سے عطاء ابی عبد الرحمن سے روایت کرتے ہیں کہ عبد الرحمن نے کھانا تیار کرایا، اور صحابہ میں سے چند لوگوں کو جن میں علی ابن ابی طالب بھی تھے بلایا پھر انھوں نے قل یا ایھا الکافرون لا اعبد ما تعبدون ونحن عابدون ما عبدتم پڑھی اس پر یہ آیت اتری لا تقربوا الصلوٰۃ الایہ،

وہ روایت جنمیں نام کی تعیین نہیں،

۶۔ سفیان عن عطاء بن السائب عن ابی عبد الرحمن عن علی رضی اللہ عنہ قال

۶۔ سفیان، عطاء بن سائب سے، عطا ابو عبد الرحمن سے وہ حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا، تحریم شراب سے

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (مائدہ ۹۰-۱)

اے ایمان والو! بیشک شراب، جوا بت اور پانسے ناپاک اور شیطان کے کام ہیں، تو ان سے بچو تاکہ فلاح پاؤ،

اس کے بعد شراب قطعاً حرام ہو گئی، حرمتِ شراب کی یہ آخری آیت جس وقت اتری ہے

(بقیہ حاشیہ ص ۲۷۹) قال دعانا رجل من الأنصار قبل تحريم الخمر فحضر صلوٰة المغرب فتقدم رجل فقرء قل يا أيها الكافرون فالتبس عليه فنزلت لا تقربوا الآية (مستدرک حاکم تفسیر نساء)

پہلے ہم کو انصار کے ایک شخص نے دعوت کیا، نماز مغرب کا وقت آیا تو ایک آدمی امامت کی، اور قل یا أیها الکافرون، پڑھی، لیکن اس میں خلط ملط کر دیا، اس پر آیت اتری لا تقربوا الصلوٰة (الآیہ)

ان چھ روایتوں میں مختلف قسم کے اختلافات ہیں،

۱۔ پہلی اور پانچویں روایت میں ہے کہ داعی عبدالرحمٰن بن عوفؓ تھے، دوسری، تیسری اور چھٹی میں ہے کہ داعی کوئی انصاری تھے، چوتھی میں دعوت کے بغیر مجلس شراب کا ذکر ہے،

۲۔ پہلی اور دوسری میں ہے کہ امام حضرت علیؓ تھے، جنھوں نے نشہ میں کچھ کا کچھ پڑھ دیا، تیسری چوتھی اور پانچویں میں ہے کہ وہ امام عبدالرحمٰن بن عوفؓ تھے، اور چھٹی میں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ کوئی آدمی امام تھا،

۳۔ اور روایتوں میں ہے کہ وہ اس دعوت کی مجلس میں شراب تھی، چھٹی میں شراب کا مطلق ذکر نہیں ہے بلکہ وہ شخص جو امام بنا تھا، وہی شاید کہیں سے پی کر آیا ہو گو کہ حرمت شراب سے پہلے پینا کوئی شرعی جرم نہیں تاہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پینا جو بچپن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و تربیت میں پل کر جوان ہوئے، قیاس کے خلاف ہے، خصوصاً اس آیت کے بعد قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ (کہدے کہ شراب اور جوے میں بڑا گناہ ہے،) حضرت علیؓ کا پینا اور بھی زیادہ واقعہ کی صورت میں شک پیدا کرتا ہے، پھر جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس روایت میں مختلف قسم کے ایسے اختلافات ہیں جو ناقابلِ تطبیق ہیں،

حضرت ابو عبیدہؓ امین اور ابی بن کعبؓ جو سید القراء تھے، ابو طلحہؓ کے گھر میں مہمان تھے اور شراب کا دور چل رہا تھا، ساقی گری کی خدمت حضرت انسؓ سے متعلق تھی، چنانچہ صحیح بخاری کتاب الاشربہ میں خود حضرت انسؓ سے زبانی روایت ہے،

(بقیہ حاشیہ ص۲) ان اختلافات کا راز اس وقت کھل جاتا ہے، جب انکے راویوں پر نظر ڈالی جاتی ہے، سب سے پہلا راوی ابو عبدالرحمن اسلمی جس کا نام عبداللہ بن حبیب ہے وہ پہلے حضرت علیؓ کا طرفدار و حامی (شیعہ) تھا، بعد کو عثمانی (بنی امیہ کا طرفدار) اور حضرت علیؓ کا مخالف ہو گیا، پھر اسکا یہ دعویٰ کہ اس نے حضرت علیؓ سے سنا ہے، محدثین میں مسلم نہیں، بخاری نے اسکو مانا ہے لیکن ابن ابی حاتم نے اس سے انکار کیا ہے، روایت کے دوسرے راوی عطاء بن سائب کا حافظہ خراب ہو گیا تھا، اسلئے لوگوں نے اسکو چھوڑ دیا تھا، گو سفیان کی اس سے روایتیں حافظہ کی خرابی سے پہلے کی سمجھی جاتی تھیں مگر اوپر کی روایتوں میں دیکھو کہ خود سفیان کی روایتوں میں بھی وہی ناقابل تطبیق اختلاف موجود ہے، ان وجوہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے، کہ مختلف فیہ جزئیات غیر مسلم ہیں اور واقعہ کی اصلی صورت وہی ہے، جو چھٹی روایت میں ہے کہ وہ مجلس محض دعوت کی تھی جس میں حضرت علیؓ اور دوسرے صحابہؓ موجود تھے کہ نماز کا وقت آگیا اور ایک صاحب جو مخمور تھے، نماز پڑھانے کھڑے ہو گئے، اور آیتیں غلط سلط پڑھ دیں، چونکہ اس واقعہ کے راوی حضرت علیؓ تھے اور وہ دعوت میں شریک تھے، اسلئے یا تو ابو عبدالرحمن اسلمی عثمانی نے فرقہ داری کے جذبہ میں یا عطا نے ذرا سی بھول میں واقعہ کی نسبت ادھر سے اُدھر کر دی،

اس آخری چھٹی روایت کی تائید حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے ہوتی ہے جسکی سند پورے سلسلہ سے الگ اور مستقل ہے

۔ عن ابی هريرة قال حرمت الخمر ثلاث مرات قدم رسول الله صلى الله عليه وسلم المدينة وهم يشربون الخمر ويأكلون الميسر فسألوا رسول الله صلى الله عليه وسلم عنهما فانزل الله على نبيه صلى الله عليه وسلم يسئلونك عن الخمر والميسر قل فيهما اثم كبير،

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ شراب تین بار حرام کی گئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو لوگ شراب پیتے تھے اور جوئے کا مال کھاتے تھے لوگوں نے آپ سے ان دونوں کے متعلق سوال کیا تو خدا نے آپ پر یہ آیت نازل فرمائی یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیھما اثم کبیر،

كنت اسقي اباعبيدة وابا طلحة
وابي بن كعب فجاء هم آتٍ فقال
ان الخمر حرمت،

میں ابو عبیدۃ اور ابو طلحہ اور ابی ابن
کعب کو شراب پلا رہا تھا، کہ ایک شخص
نے آکر کہا کہ شراب حرام ہو گئی،

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کی شرح میں صحیح مسلم اور دیگر حدیث کی کتابوں کے حوالے سے لکھا ہے،

(بقیہ حاشیہ ص۱۳۱) وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا الآية فقال الناس ما حرم علينا انما قال فيها اثم كبير وكانوا يشربون الخمر حتى اذا كان يوم من الايام صلى رجل من المهاجرين امم صحابه في المغرب خلط في قرأته فانزل الله فيما اغلظ منها يا ايها الذين آمنوا لا تقربوا الصلوة وانتم سكارى حتى تعلموا ما تقولون، وكان الناس يشربون حتى يأتي احدهم الصلوة وهو مفيق ثم انزلت آية اغلظ من ذلك يا ايها الذين آمنوا انما الخمر والميسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشيطان فاجتنبوه لعلكم تفلحون فقالوا انتهينا ربنا (مسند احمد جلد ۲ ص)

وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا الآیہ لیکن لوگوں نے کہا خدا نے ہمیں حرام نہیں کی صرف یہ کہا کہ ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے"۔ اب بھی لوگ شراب پیتے رہے یہاں تک کہ ایک دن ایک مہاجر نے نماز مغرب پڑھائی اور اپنی قرأت میں خلط کر دیا اسلئے خدا نے شراب کے متعلق اس سے زیادہ سخت آیۃ اتاری یا ایھا الذین آمنوا لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاری حتی تعلموا ما تقولون"۔ اب بھی لوگ شراب پیتے رہے البتہ جب کوئی نماز پڑھا تا تھا تو نشہ کی حالت میں جاتا تھا، پھر اس سے زیادہ سخت آیت نازل ہوئی یا ایھا الذین آمنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون فقالوا انتهينا ربنا (مسند احمد جلد ۲ ص)

اب لوگوں نے کہا کہ خداوندا ہم باز آئے،

اسمیں حضرت علیؓ کا کہیں ذکر بھی نہیں، حضرت علیؓ جیسے قرآن کے صاحب فہم کی نسبت یہ خیال کرنا کہ پہلی آیت کے اشارہ سے وہ شراب کی حرمت کو نہ سمجھ سکے تھے، قبول کے قابل نہیں اسی حدیث میں حاکم نے مستدرک میں بھی روایت کو لکھ کر

کہ اس جلسہ میں گیارہ بزرگ شریک تھے، جنہیں حضرت معاذ بن جبلؓ بھی شریک تھے اس موقع پر لحاظ کے قابل یہ بات ہے کہ اگرچہ یہ مدتوں کی عادت تھی، اور اس وقت بھی سب خمار میں جھوم رہے تھے، تاہم جوں ہی یہ آواز آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کی ممانعت کر دی، کسی نے پوچھ گچھ تک نہ کی، اور دفعۃً جام و سبو توڑ ڈالے، یہ صرف ابو طلحہؓ کے گھر کا حال نہ تھا، بلکہ تمام مدینہ کے گلی کوچوں میں شراب کی ندیاں بہ گئیں، بخاری باب المظالم میں ہے،

فجرت فی سکک المدینۃ — مدینہ کی گلیوں میں شراب بہتی پھرتی تھی،

ان ندیوں کی روانی سے اندازہ ہوگا کہ عرب میں شراب نوشی کی کثرت کا کیا عالم تھا،

قمار بازی شرابخوری کے ساتھ ساتھ ان میں قمار بازی کا بھی عام رواج ہو گیا تھا،

(بقیہ حاشیہ ص۲۸۳) بیان کیا ہے کہ اس واقعہ میں حضرت علیؓ کا نام شامل کرنا خوارج کی کارستانی ہے، جس کی تردید اس روایت سے ہو جاتی ہے، جس کو خود علیؓ روایت فرماتی ہیں، حاکم کہتے ہیں،

وفی ھذا الحدیث فائدۃ کثیرۃ وھی ان الخوارج تنسب ھذا العسکر وھذہ القراءۃ الی امیر المومنین علی بن ابی طالب وقد برأ اللہ منھا فانہ راوی ھذا الحدیث (مستدرک تفسیر سورۂ مائدہ)

اور اس حدیث میں بہت بڑا نکتہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ خوارج نے اس نشہ اور اس غلط قرأت کو امیر المومنین علی بن ابی طالب کی طرف منسوب کیا تھا، تو خدا نے انکو اس الزام سے بری کر دیا کہ وہی اس حدیث کے راوی ہیں،

درحقیقت واقعہ کے صرف راوی تھے، لیکن عثمانی اور خارجی راوی نے خود حضرت علیؓ کو جیسا کہ بیان کیا

نوٹ: (باری جلد (۱۰) مطبوعہ مصر طبع اوّل ص ۱۳۱ بحوالہ دولابی ابی عاصم،

عرب کے مال و دولت کا تمامتر سرمایہ اونٹوں کے چند گلوں تک محدود تھا، اسلئے جوا بھی انہی کے ذریعہ سے کھیلا جاتا تھا، چنانچہ ایک جاہلی شاعر اپنے حریف سے کہتا ہے،

أعيّرتنا ألبانها و لحومها وذالك عار يا بن ريطة ظاهر

کیا تو ہمپر عیب لگاتا ہے کہ ہم اونٹ کا دودھ اور گوشت کھاتے ہیں؟ اے ابن ریطہ ہمپر یہ عیب نہیں لگ سکتا

نحابی بها اکفاءنا و نهینها ونشرب فی اثمانها و نقامر

ہم انکو اپنے ہمسروں کو بطور عطیہ کے دیتے ہیں اور ان کو ممانی میں صرف کرتے ہیں اور انکی قیمت سے شراب پیتے اور جوا کھیلتے ہیں

اس غرض سے اونٹوں کو ذبح کرکے ان کے گوشت کو دس ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور ان ہی ٹکڑوں پر پانسے ڈالتے تھے، ان پانسوں کی صورت یہ تھی کہ دس تیر مقرر کر لئے تھے جنکے نام یہ ہیں، فذ، توام، رقیب، حلس، نافس، مسبل، معلی، منیح، سفیح، و رغد، ان میں ہر تیر کے مختلف حصے معین کر لئے تھے اور جب جوا کھیلتے تھے تو ان کو ایک تھیلے میں ڈال کر ایک منصف شخص کے ہاتھ میں دیدیتے تھے، وہ ان کو گڈمڈ کرکے ایک ایک تیر کو ایک ایک شخص کے نام پر نکالتا جاتا تھا جن کے نام پر وہ تیر نکلتے تھے، جن جن کے حصے مقرر تھے، وہ کامیاب ہوتے تھے اور جن تین تیروں کا کوئی حصہ نہ تھا، وہ جن کے نام پر نکلتے ان کو ناکامیابی ہوتی تھی، اس طرح گوشت کے جو ٹکڑے جمع ہو جاتے تھے ان کو فقیروں اور محتاجوں اور دوستوں میں تقسیم کر دیتے تھے، چونکہ یہ فیاضی کے اظہار کا ایک طریقہ تھا، اس لئے قمار بازی کی مجلسوں میں شریک نہ ہونا ایک قومی عار تھا اور اس قسم کے لوگوں کو نہایت بخیل خیال کرتے تھے، اور نکو تیسر[1] کا خطاب دیکر کہا تھا، جو لوگ

[1] یہ پوری تفصیل تفسیر کبیر جلد ۲ ص ۲۳۱ میں ہے،

خطاب حاصل کر لیتے تھے ان سے شادی بیاہ کرنا ننگ عار خیال کیا جاتا تھا چنانچہ ایک جاہلی شاعر اپنی بیوی کو وصیت کرتا ہے،

واذا ھلکت فلا تریدی عاجزاً ۔۔۔ غسلا ولا بر ماد لا معزالا

اگر میں ہلاک ہو جاؤں تو عاجز کمزور اور جوے میں نہ شریک ہونے والے اور سفر میں قوم سے علیحدہ رہنے والے کا نکاح نہ کرنا

جوے کی ایک صورت جسکو "ہان" کہتے تھے، یہ تھی کہ کسی شرط پر بازی لگاتے تھے اور جب وہ شرط پوری نہیں ہوتی تھی، جو جس چیز پر بازی لگائی جاتی تھی، اسکو لے لیتے تھے، چنانچہ جب رومیوں اور ایرانیوں میں جنگ ہوئی اور باوجود رومیوں کی شکست کے قرآن مجید نے پیشین گوئی کی کہ انکو چند سال میں ایرانیوں پر غلبہ حاصل ہو جائیگا، تو کفار نے حضرت ابوبکرؓ سے اسی قسم کی شرط لگائی۔ اور اس فتح کیلئے پانچ برس کی مدت مقرر کی، چنانچہ جب یہ مدت گذر چکی اور رومیوں کو فتح وظفر نصیب نہیں ہوئی تو حضرت ابوبکر کو بازی ہار جانا پڑی[1]، رفتہ رفتہ اس قمار بازی کا مذاق ان میں اس قدر عام ہو گیا تھا کہ لوگ مال و دولت کھو چکنے کے بعد بی بی اور بال بچوں پر بازی لگا دیتے تھے[2]، یہ قمار بازی اور وہ بھی شراب کی بدمستی کے عالم میں اکثر مار پیٹ اور لڑائی پر ختم ہوتی تھی، عبس و ذبیان کی چالیس سالہ جنگ گھوڑ دوڑ ہی کی قمار بازی کا نتیجہ تھی، حصول دولت اور کسب شہرت کے اس غلط طریقہ سے خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے تھے،

سود خواری عرب میں سود خواری کا عام رواج تھا، تمام دولت مند سود پر لین دین کرتے تھے، حضرت عباسؓ بن عبد المطلب نے جو قریش کے سردار اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے

[1] ترمذی ص ۱۶۰ جوے کی صورت کو ہان کہتے تھے اور اب تک وہ حرام نہیں ہوئی تھی، [2] تفسیر کبیر جلد ۲ ص ۳۳

تجارت کا کاروبار نہایت وسیع پیمانہ پر پھیلا رکھا تھا، اور اس تعلق سے سود خواری میں نہایت شہرت رکھتے تھے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حجۃ الوداع میں سود کی حرمت کا اعلان کیا، تو سب سے پہلے انہی کے سود کو باطل قرار دیا، حضرت عثمانؓ اور خالد بن ولیدؓ سود پر قرض دیتے تھے، مسعود ثقفی طائف کا مشہور رئیس تھا، اور اس کے بھائی عبد یالیل اور حبیب بن ربیعہ نہایت دولتمند تھے، بنو مغیرہ ان ہی لوگوں میں سود پر داد و ستد کرتے تھے، چنانچہ جب طائف فتح ہوا اور یہ چاروں بھائی اسلام لائے تو انھوں نے مغیرہ سے سود کا تقاضا کیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی[1]

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا	مومنو! خدا سے ڈرو، اور بقیہ سود کو
مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ	اگر تم مسلمان ہو، تو چھوڑ دو،

ان کے علاوہ طائف ایک سرسبز اور دولتمند شہر تھا، اسلئے وہاں کے لوگ عموماً سود پر بیوپار کرتے تھے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے جن شرائط پر مصالحت کی ان میں ایک ضروری شرط یہ بھی تھی کہ وہ لوگ سود خواری نہ کریں گے[2]، اسی طرح یمن کے نجرانی سوداگر بھی سود کی کاروبار کرتے تھے، ان سے بھی یہی شرط کی گئی[3]،

سود کا عام اور متداول طریقہ تو یہ تھا کہ ایک معین شرح پر قرض دیتے تھے، اور راس المال کے ادا کرنے کے لئے میعاد مقرر کر دیتے تھے، جب میعاد گذر جاتی تھی، تو اس کا تقاضا کرتے تھے اگر مدیون اس کو ادا نہیں کر سکتا تھا، تو میعاد میں اور اضافہ کر دیتے تھے، اور اسکے عوض میں شرح سود بڑھا دیتے تھے لیکن اس نے ترقی کر کے ایک نہایت ظالمانہ صورت اختیار کر لی تھی جو

---

[1] تفسیر کبیر جلد ۲ ص ۴۵۰ [2] فتوح البلدان بلاذری فتح طائف [3] ابوداؤد کتاب الامارت،

سود در سود سے بھی زیادہ خطرناک تھی یعنی ایک متعینہ معینہ کے لیے کسی کو مثلاً سو روپیہ دیتے تھے لیکن مدت گذر چکتی اور تقاضا کرنے پر مدیون اس رقم کو ادا نہیں کر سکتا تھا تو میعاد اور بڑھا دیتے تھے لیکن اسکے معاوضہ میں راس المال میں بھی اضافہ کروا لیتے تھے، یہانتک کہ کبھی کبھی یہ اضافہ دوگنی چوگنی مقدار تک پہنچ جاتا تھا، اسطرح اضافہ ہوتے ہوتے مدیون کی کل جائداد مستغرق ہو جاتی تھی یہ معاملہ زیادہ تر غریبوں اور کاشتکاروں کے ساتھ پیش آتا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ غریبوں اور کاشتکاروں کا تمام طبقہ چند دولتمندوں اور خصوصاً یہودیوں کے ہاتھ میں گرو تھا۔ قرآن مجید کی یہ آیت اسی طریقہ سود کو مٹانے کے لئے نازل ہوئی،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَوا	مسلمانو! دونا، چارگنا، سود نہ کھاؤ، اور
أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ	خدا سے ڈرو، یقین ہے کہ تم کامیاب
تُفْلِحُونَ (آل عمران ۱۴۰)	ہو جاؤ،

سود کے علاوہ قرض کے متعلق اور بھی مختلف قسم کی ناجائز سختیاں پیدا ہو گئی تھیں مثلاً اگر راہن میعاد کے اندر مال مرہونہ کو چھڑا نہ سکتا تھا، تو مرتہن اس کا مالک ہو جاتا تھا[1]، مال دولت سے گذر کر عورتیں اور بال بچوں تک کو رہن رکھواتے تھے[2]،

لوٹ مار عرب میں روزی کی لوٹ مار نے اگرچہ ہر قبیلہ کو غارت گر اور راہزن بنا دیا تھا تاہم بعض قبائل میں اس قسم کے خاص خاص جتھے قائم ہو گئے تھے جنھوں نے راہزنی کو اپنا ذریعۂ معاش اور عام مشغلہ بنا لیا تھا۔ اس قسم کے لوگوں کو "لصوص" کہتے تھے، اور قبیلہ طے کو عرب میں عام

[1] موطا امام مالک ص ۳۰۴ [2] بخاری قتل کعب بن اشرف،

طور پر جو شہرت حاصل تھی، وہ اسی گروہ کی بدولت تھی،

یہ گروہ شہر سے باہر میدانوں میں، جنگلوں میں، پہاڑوں کے کھوؤں میں رہتا تھا، اور ادھر سے جو مسافر یا قبیلے گذرتے تھے، انکو لوٹ لیتا تھا، اسکا استیصال صرف ایک پرزور نظام حکومت ہی سے ہو سکتا تھا، جو عرب میں مفقود تھا، چنانچہ قبیلہ طے کے عیسائی سردار عدی بن حاتم مسلمان ہو کر جب آپ سے ملنے آئے اور آپنے ان سے یہ پیشین گوئی کی کہ وہ دن آئیگا جب حیرہ سے ایک پردہ نشین عورت بے خوف و خطر حضرموت کا سفر کریگی، تو چونکہ وہ قبیلۂ طے کے ایک رئیس تھے، اور ان کو اس قبیلہ کے ڈاکوؤں کا حال معلوم تھا، اس لئے ان کو تعجب ہوا کہ ہیں! طے کے نصوص کیا ہو جائیں گے؟

ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے مال و دولت، مویشی، بلکہ اہل و عیال تک پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے تیار رہتا تھا، تاجروں اور سوداگروں کے قافلے بغیر کسی بھاری انعام کے کسی میدان سے بسلامت گذر نہیں سکتے تھے، ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کی عورتوں اور بچوں کو پکڑ کر کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیتا تھا، اور مویشیوں کو ہانک کر لیجاتا تھا، چنانچہ "صبح" کا وقت جبکہ رات بھر چلنے کے بعد مسافر آرام کرتے تھے، اس کام کے لئے مخصوص ہو گیا تھا، چنانچہ صبح کا وقت عربی میں لوٹنے کے معنی میں جاہلیت میں عام طور سے بولا جاتا تھا، کامیاب ڈاکو اپنے کارناموں کو نظم کرتے تھے اور فخریہ پڑھتے تھے، ایک قبیلہ کا شاعر عارث نامی ڈاکو کے سلامت نکل جانے پر کہتا ہے،

یا لھف زیابۃ للحارث الصابح فالغانم فالآئب

اے زیابہ کا افسوس حارث کیلئے جو صبح کو ڈاکہ ڈالنے والا پھر لوٹنے والا پھر بسلامت واپس جانیوالا ہے

حج کے تین مہینوں میں البتہ وہ اس پیشہ سے باز رہتے تھے. لیکن اس سے زیادہ مدت پر وہ صبر نہیں کرتے تھے، اور چونکہ ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے مال و دولت اور مویشی پر موقع پاکر اسی طرح تصرف کرتا تھا، اس لئے وہ اسکو عیب نہیں بلکہ بہادری کا کام سمجھتے تھے اور اس طرح ملک میں مسلسل قتل و غارت اور لوٹ مار کا طریقہ جاری تھا،

چوری ڈاکہ کے علاوہ اقتصادی حالات کی مجبوری سے بدؤں میں چوری کا رواج بھی تھا، مختلف قبیلوں کے ایسے بہادر جو قبیلہ میں کوئی نمایاں حیثیت نہیں رکھتے تھے وہ خصوصیت کے ساتھ اس پیشہ کو اختیار کرتے تھے، وہ تنہا بڑے بڑے خطرناک موقعوں پر جاکر اس کام کو انجام دیتے تھے، اور اس پر فخر کرتے تھے، ان میں سے سلیک بن السلکہ اور تابط شرّا شہرتِ عام رکھتے تھے. تابط شرّا کا ایک قطعہ حماسہ میں ہے، جس میں اپنی چوری اور حیلہ گری کا ذکر بڑے فخر سے کیا ہے.

قریش میں تجارت کے سبب سے دولت بھی تھی اور خود خانہ کعبہ میں تحفوں اور نذرانوں کا خزانہ جمع رہتا تھا، اس لئے ان میں چوری کے مواقع بھی زیادہ تھے، چنانچہ کلبی نے متعدد ممتاز قریشیوں کے نام بتائے ہیں، جنھوں نے اس خزانہ سے سونے کا ہرن چرا لیا تھا[1]، بلکہ اس کے لئے خاص طور سے ابولہب کا نام لیا جاتا ہے[2].

عام بدو عربوں میں یہ برائی جتنی عام ہوگئی تھی، اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان مردوں اور عورتوں سے جو اسلام قبول کرنے آتے تھے، دوسری باتوں کے ساتھ یہ معاہدہ

[1] فتح الباری جلد ۱ ص ۷۷، [2] کتاب المعارف لابن قتیبہ

بھی لیتے تھے کہ آیندہ وہ چوری نہ کرینگے[1]، بلکہ خود قرآن پاک نے آپ کو اسکا معاہدہ لینے کا حکم دیا تھا[2]

چوری کرنے کے عجیب عجیب طریقے ایجاد کر لئے تھے، ایک شخص نے اپنی چھڑی کے کنارے ایک تیر لوہے کا مجن، لگا رکھا تھا حج کے زمانہ میں آتا، اور جب حاجیوں کو غافل پاتا تو اس لوہے کے سہارے سے ان کے اسباب کو کھینچ لیتا[3]

جس طرح عرب میں لٹے کے ڈاکو لوٹ مار میں مشہور تھے اسی طرح بعض قبائل چوری میں شہرت عام رکھتے تھے، چنانچہ اسلم، غفار، مزینہ اور جہینہ کے قبیلے تمام عرب میں اس بنا پر بدنام تھے کہ وہ خاص طور پر حاجیوں کے مال و اسباب کی چوری کیا کرتے تھے[4]

چونکہ یہ چوری عربوں کی اقتصادی کمزوری کا نتیجہ تھی، اسلئے اسکے لئے غیر دیانتداری کی تخصیص نہ تھی، بلکہ اس کا اثر اعزہ و اقارب، ہمسایہ، دوست و آشنا، خاندان، غرض سب پر پڑتا تھا، چنانچہ مدینہ میں بشر، بشیر، بشیر تین آدمی تھے، جن کو بنو ابیرق کہا جاتا تھا، ان میں بشیر منافق تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں شعر کہہ کر دوسروں کی طرف منسوب کر دیتا تھا، یہ لوگ نہایت تنگدست اور فاقہ مست تھے، انھوں نے رفاعہ نامی ایک شخص کے بالاخانہ سے جس میں ہتھیار و تلوار و زرہ وغیرہ بھی رکھی ہوئی تھی نقب لگا کر چوری کی، آپ نے رفاعہ کے ہتھیار واپس دلائے، لیکن رفاعہ نے ان کو خدا کی راہ میں وقف کر دیا اور بشیر بھاگ کر مشرکین سے جا ملا[5]

مردوں کے علاوہ عورتیں بھی اس مرض میں گرفتار تھیں، اسی لئے قرآن پاک نے عورتوں سے بیعت لیتے وقت یہ عہد لینے کی بھی تاکید کی کہ وَلَا يَسْرِقْنَ (ممتحنہ-۲) یعنی وہ چوری

---

[1] صحیح بخاری کتاب الحدود ص ۱۰۰۱ ج ۲ [2] سورۂ ممتحنہ رکوع ۲ [3] مسلم باب فی صلوٰۃ الکسوف، [4] مسلم و بخاری کتاب المناقب باب اسلم و غفار [5] ترمذی ص ۱۹۴ ج ۲ کتاب التفسیر سورۂ نساء،

نہ کرینگی، شرفاء اگر اس الزام میں پکڑ جاتے تو وہ چھوڑ دیئے جاتے تھے، اسلئے یہ بُرائی رکنے نہیں پاتی تھی، چنانچہ اسلام کے بعد بھی جب قبیلہ مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی تو اس پر قریش کو سخت تردد ہوا اور لوگوں نے کہا اسکے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کون سفارش کریگا، لوگوں نے اسامہ بن زید کو منتخب کیا جنکو آپ بہت پیار کرتے تھے، انھوں نے سفارش کی تو آپ نے فرمایا تم حدود اللہ کے متعلق سفارش کرتے ہو،،؟ پھر کھڑے ہوکر خطبہ دیا، اور اس میں فرمایا کہ گذشتہ قومیں صرف اسی لئے ہلاک ہوگئیں کہ جب شریف آدمی چوری کرتا تھا تو اسکو چھوڑ دیتے تھے اور ضعیف چوری کرتا تھا تو اسکو سزا دیتے تھے، خدا کی قسم اگر فاطمہ بنت محمدؐ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ لیتا[1]،،

خود شہر کے اندر اس قسم کی وارداتوں کی یہ حالت تھی کہ صفوان بن امیہ ایک روز ایک بیش قیمت چادر اوڑھ کر سو رہے تھے، ایک شخص نے موقع پاکر اس کو اڑا لیا، وہ گرفتار کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا، تو آپ نے اسکے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، صفوان کو اس پر رحم آیا، اور آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ! ایک چادر کے لئے ایک عرب کا ہاتھ کاٹا جائیگا، آپ نے فرمایا، میرے پاس لانے سے پہلے ہی اس کا خیال رکھنا تھا، حاکم تک معاملہ پہنچنے کے بعد کسی کو سفارش کا حق حاصل نہیں[2]،،

سفاکی، بیرحمی، وحشت، رات دن کی لوٹ مار اور کشت وخون سے ان میں درندوں کے تمام اوصاف پیدا ہوگئے تھے، زندہ اونٹ اور دنبہ کے کوہان اور چکیاں کاٹ کر کباب لگاتے اور یہ انکی بڑی

---

[1] بخاری جلد ۲ ص ۱۰۰۳ کتاب الحدود [2] دار قطنی ص ۴۳۰، کتاب الحدود،

مرغوب غذا تھی،

زندہ جانوروں کو درخت وغیرہ سے باندھ دیتے، اور ان پر تیر اندازی کی مشق کرتے، لڑائیوں میں حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر ڈالتے، مقتولوں کے ناک کان کاٹ لیتے اور عورتیں اُنکے بنا کر پہنتیں، منت مانتے کہ دشمن کو قتل کرینگے تو اسکی کھوپڑی میں شراب پئیں گے،

سزا دینے کا ایک طریقہ تھا کہ مجرم کو دو درختوں کی ٹہنیاں جھکا کر اسکے اعضا ان میں باندھ دیتے اور پھر ٹہنیوں کو چھوڑ دیتے، مجرم کا بدن چر کر ٹہنیوں کے ساتھ رہ جاتا،

کبھی کبھی عورتوں کو گھوڑے کی دم سے باندھ کر گھوڑے کو سرپٹ ڈال دیتے، اُن کے بدن کے ٹکڑے اڑ جاتے، اس قسم کی سزائیں اکثر عرب کے سلاطین اور رؤسا دیا کرتے تھے،

کبھی آدمی کو کسی کوٹھری میں قید کر کے اس کا کھانا پانی بند کر دیتے تھے یہانتک کہ وہ اسی طرح بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جاتا تھا، اس طریقہ سزا کا نام انکے یہاں "صبر" تھا، مُردوں کی قبر پر اونٹ باندھ دیتے تھے، اور اسکو کھانے کو نہیں دیتے تھے، وہ چند روز میں مر جاتا تھا، سمجھتے تھے کہ یہ مردے کی سواری بنے گا، اس اونٹ کو "بلیہ" کہتے تھے،

زنا اور فواحش زنا اور فسق و فجور عام تھا، اور یہ واقعات فخریہ اشعار میں بیان کئے جاتے تھے، امرؤالقیس عرب کا سب سے بڑا شاعر تھا، اسکے ساتھ شاہزادہ اور والی ملک بھی تھا، اس نے اپنی پھوپھی زاد بہن عنیزہ اور اور عورتوں کے ساتھ جو افعال شنیعہ اور بے حیائی کئے اپنے قصیدۂ لامیہ میں فخر کے ساتھ تفصیل سے لکھی ہیں، باوجود اسکے اس قصیدہ کے اشعار عرب میں بچہ بچہ کی زبان پر تھے،

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ اہل جاہلیت گو بالاعلان زنا کو جائز نہیں سمجھتے تھے لیکن جیسے

چوری کرنے کو جائز سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ کھلم کھلا کرنا تو کمینہ پن ہی لیکن چھپکر کرنے میں مضائقہ نہیں[1]
فاحشہ عورتیں گھروں کے سامنے جھنڈیاں لگاکر بیٹھتی تھیں[2] اور صاحب رایات کہلاتی تھیں، انکی اولاد
اصلی اور حقیقی اولاد کے برابر سمجھی جاتی تھی، اسلام سے پہلے ایسی عورتیں خود مکہ معظمہ میں تھیں، ان میں
سے ایک کا نام عناق تھا، مرثد غنوی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، سے اجازت مانگی کہ میں عناق سے نکاح کرلوں اس
پر یہ آیت اتری،

وَالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَا إِلَّا زَانٍ أَوْ مُشْرِكٌ (نور-۱) اور زانیہ عورت سے زانی یا مشرک ہی نکاح کرتے ہیں،

بڑے بڑے رؤسا گھر کی لونڈیوں کو یہ حکم دیتے تھے، کہ بدکاری کے ذریعہ سے جاکر کچھ کما لائیں
اور انکی مدد کریں، عبداللہ بن ابی مدینہ کا رئیس تھا، اور اس درجہ کا شخص تھا کہ ہجرت سے پہلے تمام انصار
نے تاج بنوایا تھا کہ اسکو بادشاہ بناکر پہنائیں گے، چنانچہ صحیح بخاری میں یہ واقعہ منقول ہے، عبداللہ
ابن ابی کی دو لونڈیاں تھیں، ایک کا نام مسیلۃ اور دوسرے کا نام امیمۃ تھا، وہ ان دونوں کو
زناکاری کرانے پر مجبور کرتا تھا، اس پر قرآن مجید کی آیت اتری[3]،

وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ (سورۂ نور) اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو،

موجودہ طریقہ کے علاوہ نکاح کی اور چند قسمیں جاری تھیں، جو حقیقت میں بدکاری ہی
کی قسمیں تھیں، مثلاً ایک یہ کہ کوئی شجاع اور بہادر شخص ہوتا تو اپنی عورت کو اسکے پاس بھیجدیتے،
کہ اس سے ہمبستر ہو، بچہ پیدا ہوتا تھا تو سمجھتے تھے، کہ اسمیں بھی وہی اوصاف آجائیں گے جس کا یہ نطفہ ہے،
دوسرا طریقہ یہ تھا کہ چند آدمی جنکی تعداد ایک وقت میں دس سے زیادہ نہیں ہوتی تھی کسی عورت

---

[1] تفسیر طبری آیت محصنٰت غیر مسافحات ج ۵ ص ۱۲ مصر، [2] صحیح بخاری کتاب النکاح جلد ۲ ص ۷۶۹
[3] ابوداؤد کتاب النکاح [3] صحیح مسلم باب التفسیر،

کے پاس جاتے اور سب اس سے ہم صحبت ہوتے، جب وہ حاملہ ہوجاتی اور بچہ جنتی تو سب کو بلوا بھیجتی اور کسی ایک سے کہتی کہ یہ بچہ تمہارا ہے، اسکو قبول کرنا پڑتا، اور پھر وہ اس کا بیٹا سمجھا جاتا،

تیسرا طریقہ یہ تھا کہ فاحشہ عورتیں جو سر بازار جھنڈیاں لگا کر بیٹھتی تھیں انکے لڑکا پیدا ہوتا تو قیافہ شناس کو بلوا بھیجتیں، وہ صورت شکل دیکھ کر بتاتا کہ فلاں شخص کا نطفہ ہے عورت اسکو بلا کر کہتی کہ یہ تمہارا بچہ ہے، صحیح بخاری کتاب النکاح میں یہ تینوں طریقے تفصیل سے مذکور ہیں

ایک اور قسم عارضی نکاح کی جاری تھی، اور وہ یہ تھی کہ کسی عورت سے مدت معینہ کیلئے نکاح کر لیتے تھے اس مدت کے گذرنے کے بعد اسکی اجرت دیکر اسکو الگ کر دیتے تھے اسکو متعہ کہتے تھے، اسلام نے شروع میں اسکو ضرورۃً جندے باقی رکھا پھر ہمیشہ کیلئے اسکو حرام کر دیا[1]

بے شرمی و بیحیائی شرم و حیا کا وجود نہ تھا، حج کعبہ میں ہزاروں لاکھوں آدمی جمع ہوتے لیکن (قریش کے سوا باقی) سب مادر زاد ننگے ہو کر کعبہ کا طواف کرتے، عورتیں جب ننگی ہو کر طواف کرتیں تو لوگوں سے کہتیں کہ کوئی ہم کو اتنا کپڑا دیتا کہ ستر عورت ہو جاتا، پھر یہ شعر پڑھتیں۔

الیوم یبدو بعضہ او کلہ	آج بدن کا کچھ حصہ کھلے گا یا سارا
فما بدا منہ فلا احلہ	اور جو کھلا ہو اس سے لطف اٹھانے کی میں اجازت

صحیح مسلم باب التفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے، نہانے وقت اوٹ نہیں کرتے تھے، کھلے میدان میں بے ستر ہو کر نہاتے تھے[1]، پاخانہ پیشاب کے وقت پردہ نہیں کرتے تھے[2]، جلسوں میں بیٹھتے تو یہودیوں سے ہم صحبتی کے

[1] نسائی باب الاستتار عند الغسل [2] ابو داؤد کتاب الطہارۃ،

تمام واقعات بیان کرتے،

سوتیلی ماؤں پر وراثۃً قبضہ کرکے ان کو بیوی بناتے،

عورتوں پر ظلم | عورتوں کی حالت نہایت خراب تھی، مورث کے متروکہ میں سے انکو کچھ نہیں ملتا تھا، عرب کا قول تھا کہ میراث اسکا حق ہے جو تلوار پکڑ سکتا ہو، اسی بنا پر چھوٹے بچے بھی وراثت سے محروم رہتے تھے،

لڑائیوں میں مفتوحہ قبیلہ کی عورتیں عین میدانِ جنگ میں فاتحین کے تصرف میں آجاتیں اگر صلح ہو جاتی اور عورتیں واپس دیدیجاتیں، تو باوجودیکہ سب کے ناموس برباد ہو چکے ہوتے. بدستور گھروں میں لے لیجاتیں اور یہ کوئی عیب نہیں خیال کیا جاتا تھا، فاتحین اس تصرف پر فخر کرتے اور اسکو اشعار میں ظاہر کرتے، بنو ضبہ نے جب بنو عامر پر فتح پائی تو ان کی عورتوں کو عین میدانِ جنگ میں روا کیا، فرزدق نے اس شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے

فظلت وظلت یرکبون عبیرھا — تو لوگ عورتوں پر متصرف ہو گئے، اور

ولیس لھم الا عوالیھا ستر — اگر کوئی پردہ بیچ میں تھا تو وہ صرف نیزے تھے،

قبیلہ قیس اور بنو دارم میں جو معرکہ ہوا جو رحرحان کے نام سے مشہور ہے، اسکی نسبت جریر کہتا ہے

نکحت نساءھم بغیر مھور — ان کی عورتوں سے بغیر مہر کے نکاح کیا،

عمرو معدیکرب، عرب کے مشہور بہادر اور شاعر تھے، ان کی بہن ریحانہ کی عصمت اسی طرح جب برباد ہوئی تو عمرو نے کہا.

امن ریحانۃ الداعی السمیع — کیا ریحانہ کیطرف سے کوئی پکارنے والا سننے والا ہے

یؤرقنی واصحابی ھجوع — جسکو مجھے جواب دینا ہے، لیکن میرے اصحاب سوتے ہیں،

اذا لم تستطع امرا فدعه	اگر تم کسی کام کو نہ کر سکو تو اسکو چھوڑ کر
وجاوزہ الی ما تستطیع	وہ کرو جو کر سکتے ہو،

طلاق کیلئے کوئی مدت اور عدت نہ تھی، یعنی جب تک شوہر چاہے، عورت نہ شوہر کے پاس رہ سکتی تھی، نہ کسی اور سے شادی کر سکتی تھی:

نکاح کی کوئی حد نہ تھی، غیلانؓ بن سلمہ ثقفی جب اسلام لائے تو انکی دس بیویاں تھیں، وہب اسدیؓ نے اسلام قبول کیا، تو آٹھ بیویاں انکے عقدِ نکاح میں تھیں[1]،

دو حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرتے، باپ مرجاتا تو اسکی کل بیویاں (بجز حقیقی ماں کے) بیٹے کے تصرف میں آتیں، اور اسکی جائز بیویاں سمجھی جاتیں،

ایام کے زمانہ میں. عورتوں کو الگ کر دیتے اور ان کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے

عورت جب بیوہ ہو جاتی تو گھر سے باہر ایک نہایت تنگ کوٹھری رہنے کو اور خراب سے خراب کپڑے پہننے کو دیئے جاتے، خوشبو وغیرہ قسم کی کوئی چیز استعمال نہ کر سکتی اس حالت کے ساتھ جب پورا سال گذر جاتا تو ایک بکری یا گدھا لاتے، اس سے وہ اپنے جسم ... کو مس کرتی پھر کوٹھری سے باہر نکلتی اور اسکے ہاتھ میں مینگنی دیجاتی، وہ مینگنی کو پھینک دیتی اس وقت سوگ سے نکل آتی اور قدیمی حالت قائم ہوتی. عورت کا جو مہر مقرر ہوتا، وہ باپ کو ملتا، عورت کو اس سے سروکار نہ ہوتا،

غرض مجموعی حیثیت سے عورت، بدترین مخلوق اور ہر قسم کے جبر و تعدی کا تختہ مشق تھی،

---

[1] ابو داؤد کتاب النکاح [2] ابو داؤد کتاب النکاح باب صداق المتوفی عنہا زوجہا،

رفتہ رفتہ یہانتک نوبت پہنچی کہ جس کے گھر میں لڑکی پیدا ہوتی، اسکو سخت رنج ہوتا، اور شرم کے مارے لوگوں سے چھپتا پھرتا،

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى	اور جب انمیں سے کسی کو لڑکی کی خوشخبری
ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ	سنائی جاتی ہے تو اس کا منہ کالا پڑجاتا ہے اور غصہ
يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا	کے گھونٹ پی کر رہجاتا ہے، اس خوشخبری کے
بُشِّرَ بِهٖ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ	رنج سے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے (اور سوچتا ہے)
يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ، (سورۂ نحل)	کہ ذلت کے ساتھ اسکو قبول کرلے یا ؟

ابو حمزہ ایک رئیس تھا، اس کے لڑکی پیدا ہوئی تو اس نے گھر میں رہنا چھوڑ دیا، اس کی بیوی یہ اشعار پڑھ پڑھ کر بچی کو لوریاں دیتی تھی،

مالابی حمزۃ لا یاتینا	ابو حمزہ کو کیا ہوگیا ہے کہ ہمارے پاس نہیں آتا،
یبیت فی بیت الی تلینا	اور ہمسایہ کے گھر میں رات بسر کرتا ہے،
غضبان الا نلد البنینا	اس پر ناراض ہے کہ ہم بیٹے نہیں جنتے،
تاللہ ماذاک بایدینا	خدا کی قسم یہ ہمارے اختیار کی بات نہیں
ونحن کالزرع لزارعینا	ہم بطور کھیت کے ہیں،
ننبت ماقد زرعوکا فینا	ہم میں جو بویا جائیگا وہی اُگے گا،

رفتہ رفتہ دخترکشی کی رسم جاری ہوگئی، لڑکی پیدا ہوتی تو اسکو میدان میں لیجاکر گڈھا کھودتے اور زندہ گاڑدیتے، اس کو عربی میں وأد کہتے ہیں،

ایک صاحب نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں آکر ظاہر کیا تھا کہ انھوں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ لڑکیاں زندہ دفن کیں،[1]

عورت کو وراثت کا کوئی حصہ نہیں ملتا تھا، ان کا قانون تھا کہ وراثت کا حق اسی کو ہے جو تلوار چلائے،[2] عورت بیوہ ہونے کے بعد اپنے شوہر کے وارثوں کی ملک سمجھی جاتی تھی، وہ اگر آکر بیوہ پر چادر ڈال دیتا تو وہ اسکی جائز مدخولہ بنجاتی،[3]

وحشت وجہالت حرام وحلال کی کوئی تمیز نہ تھی، ہر چیز اور ہر جانور کھا سکتے تھے، کھاتے تھے، حشرات الارض عام غذا تھی، چھپکلی تک کھا جاتے تھے، خون کو جما لیتے اور قاشیں تراش تراش کر کھاتے، مردہ جانور کھانا عام بات تھی،[4] چمڑے کو آگ مین بھون کر کھاتے، زندہ جانور کا گوشت کا ٹکڑا کھا لیتے تھے، گردن مروڑ کر ڈنڈے سے مار کر، درندوں کا مارا ہوا سب کھاتے،[5] گدہے کا گوشت بھی کھاتے تھے،[6]

عرب کا مشہور جاہلی شاعر اعشی میمون جس نے آغاز اسلام کا زمانہ پایا ہے، اور اہل عرب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں اس کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے، اس میں وہ اسلام کی تائید میں اہل عرب کو جن باتوں کی طرف متوجہ کرتا ہے، وہ یہ ہیں،

وایاک والمیتات لا تاکلنھا[7]	ولا تاخذن سھما حدا لتقصدا
مرداروں سے پرہیز کر اور انکو نہ کھا	اور نہ تیز تیر سے جانور کو فصد دیکر مار کر کھا

---

[1] تفسیر ابن جریر وابن کثیر سورۂ واذا الشمس کورت [2] تفسیر یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین [3] تفسیر ولا تعضلوھن [4] اسباب النزول سیوطی آیت علیکم المیتۃ [5] تفسیر طبری سورۂ مائدہ بیان ماکولات [6] صحیح نسائی کتاب الصید والذبائح [7] دیوان اعشی مطبوعہ ویانا ۱۹۲۷ء ص ۱۰۳،

وذا النصب المنصوب لا تنسکنه ولا تعبد الاوثان والله فاعبدا

اور نہ کھڑے کئے ہوئے بتوں پر قربانی کر اور نہ بتوں کی پوجا کر بلکہ اللہ کی عبادت کر

ولا السائل المحروم لا تنزکنه لعاقبة ولا الاسیر المقیدا

اور محروم بھیک مانگنے والے کو کسی اور انجام کیلئے مت چھوڑ، اور نہ زنجیر میں بندھے ہوئے قیدی کو

ولا تسخرن من بائس ذی ضرارة ولا تحسبن المرء یوما مخلدا

اور نہ کسی مصیبت زدہ مفلس سے ٹھٹھا کر اور نہ کبھی یہ سمجھ کہ آدمی ہمیشہ رہنے والا ہے

ولا تقربن جارة ان سرها علیک حرام فانکحن او تابدا

اور نہ اپنی ہمسایہ خاتون سے بدکاری کر وہ تجھ پر حرام ہے تو یا نکاح کر اور یا کنوارا رہ جا

عربوں کی خصوصیات

خیرالامم بننے کی اہلیت

لیکن ان تمام مفاسد اور برائیوں کے باوجود اہل عرب میں کچھ ایسی خصوصیات بھی تھیں، جو دنیا کی تمام قوموں میں ان ہی کے ساتھ مخصوص تھیں اور انکی ان ہی فطری اور طبعی خصوصیات و امتیازات کا اثر تھا کہ خلاق فطرت نے ان کو اپنی نبوت، رسالت اور تعلیم و شریعت کا اہل سمجھا اور اُن کو اپنے اس خلعت خاص سے سرفراز کیا،

صحت نسب ان خصوصیات میں سب سے پہلی چیز اُن کی صحیح النسبی ہے، شمالی عرب کے تمام قبیلے حضرت ابراہیمؑ کی اولاد اور ان کی نسل سے تھے، اور یہ بات ایسی مشہور و متواتر روایتوں سے ثابت تھی کہ کسی نے انکی تردید کی ہمت نہیں کی، تورات نے حضرت ابراہیمؑ کی جن اولادوں کے نام بتائے ہیں، اُن میں سے ایک ایک نام کا سراغ عرب کی پرانی آبادیوں میں ملتا ہے، چنانچہ ریورنڈ فارسٹر نے ۱۸۴۴ء میں عرب کا جو تاریخی جغرافیہ لکھا ہے، اس میں پوری دلیل اور تفصیل اور شہادتوں کے ساتھ ان آبادیوں کا پتہ لگایا ہے، اور انکی جگہیں متعین کی ہیں، قدیم یہودی مورخ یوسیفوس نے بھی یہی لکھا ہے[1]، اور آجکل ایک یہودی فاضل ڈاکٹر اسرائیل ولفنسون نے تاریخ الیہود فی بلاد العرب

---

[1] ترجمہ انگریزی ۱۸۲۲ء جلد اول ص ۲۵،

ایک کتاب لکھی ہے، اس میں بھی اس نے اس واقعہ کو تسلیم کیا ہے، اور اس کی صحت پر دلیلیں پیش کی ہیں[1]، اور بعض حال کے مناظر عیسائیوں کے علاوہ اس واقعہ کے تواتر میں کسی نے شک نہیں کیا ہے، اور غالباً اسی لئے سینٹ پال نے اپنے خطوط میں عرب کی ہاجرہ کی تمثیل استعمال کی ہے[2]، اور قرآن پاک نے اہل عرب اور قریش کو خطاب کرکے صاف کہا ہے

مِلَّةَ اَبِیْکُمْ اِبْرَاهِیْمَ (حج) تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب

حضرت ابراہیمؑ تک نام بنام سلسلۂ نسب کے پہنچنے میں پشتوں کی کمی بیشی یا ناموں کا گھٹنا بڑھنا ممکن ہے، مگر مجموعی حیثیت سے یہ دعویٰ کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد تھے کسی حیثیت سے مشکوک نہیں ہے، خصوصاً جب اسکے ساتھ خارجی قرائن پر بھی نظر کر لیجائے کہ وہی تمدن اور طرز معاشرت جو تورات میں حضرت ابراہیمؑ اور ان کے اہل وعیال کا نظر آتا ہے، اسلام کے عہد تک بلکہ آج تک وہ اسی طرح عربوں میں قائم و باقی ہے، وہی خیمے ہیں، وہی صحرا ہیں، وہی مویشی ہیں، وہی بدویانہ زندگی ہے، وہی رسم و رواج ہیں جنکو اسلام نے آکر اور زیادہ نکھار دیا، وہی بیت اللہ، حج اور قربانی کی عادتیں ہیں، اور یہ ایسا کھلا قرینہ ہے جو آج بھی یورپ کے محققوں کی نگاہوں کے سامنے ہے، مشہور جرمن محقق نولڈیک کہتا ہے،

اور نیز عربوں میں قدیم سامی کیرکٹر اپنے خالص رنگ میں باقی سمجھا جاتا ہے، اور ان کی زبان اصل زبان کے بہت قریب ہے[3]،

---

[1] تاریخ الیہود فی بلاد العرب لاسرائیل ولفنسون مطبوعہ مطبعۃ الاعتماد مصر صفحہ ۵۰، ۵۱، [2] سینٹ پال گلتیوں کے نام باب ۴۔ ۲۵ [3] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم، مضمون "السنہ سامیہ" میں نے ارض القرآن جلد اول ص ۱۰۷ سے ص ۱۱۶ تک اس پر مدلل بحث کی ہے، اور علمائے یورپ کے حوالے یکجا کر دیئے ہیں،

اہلِ عرب کو اپنے حسب و نسب کی حفاظت کا جو خیال و لحاظ تھا، اسکے ذکر سے عرب کی تاریخیں معمور ہیں، چنانچہ نسب پر فخر کرنا ان کی شاعری کا اور نسبی مفاخرت اُنکی تقریر کا سب سے بڑا موضوع تھا، اپنے باپ دادوں کے مسلسل ناموں کو یاد رکھنا انکا خاندانی فرض سمجھا جاتا تھا، یہانتک کہ انسانوں سے ہٹکر جانوروں (گھوڑوں) تک کے نسب نامے وہ محفوظ رکھتے تھے، قبائل کے نسبی تعلقات کو یاد رکھنے والے خاص خاص لوگ ہر قبیلہ میں موجود رہتے تھے اور یہی سبب ہے کہ آج بھی انکے اکابر اور مشاہیر کا سلسلۂ نسب آپکو معلوم ہوسکتا ہے، اور اس پر بہت سی اہم کتابیں لکھی گئی ہیں، اور یہ وہ خصوصیت ہے جو دنیا میں صرف اہلِ عرب کے ساتھ مخصوص ہے، یہود اور بنی اسرائیل بھی گو حضرت ابراہیمؑ ہی کی نسل سے تھے، مگر وہ بھی اس خصوصیت میں انکی برابری نہیں کرسکتے کہ دوسری قوموں کے اختلاط اور میل جول اور کسی خاص وطن کے نہ ہونے کے سبب سے ان کی اکثر خاندانی خصوصیتیں مٹ گئیں،

نسب بجائے خود کوئی فخر کی چیز نہیں، اسی لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کے مقابلہ میں نسبی فخر کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ کردیا لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کی ہدایت کیلئے جو دعا کی تھی، اور انکو جس بیت اللہ کی پاسبانی سپرد کی تھی، اور ان میں ایک نبی کی بعثت کی جو دعا مانگی تھی، اور خدا نے انکی نسل کو دینی اور دنیاوی برکات کے عطا کرنے کا اُن سے جو عہد کیا تھا، ان سب کے پورا ہونے اور انکے حقیقی مصداق بننے کیلئے نسلِ ابراہیمؑ کی صحیح النسبی کی ضرورت تھی، اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انکو اس شرف کے ساتھ مخصوص کیا، کسی بیلے مذہب میں داخل نہ تھے | اسی طرح اُنکو ان تمام اثرات سے محفوظ رکھا جو قوموں کے عادات

اور استعدادات کو بدل دیتے ہیں، مثلاً وہ باوجود اس کے کہ ہر چہار طرف سے مختلف بڑے بڑے مذہبوں سے ٹکرا رہے تھے، مگر کوئی مذہب ان کو فتح نہیں کر سکا تھا، یہودیت خلیج فارس سے لیکر یمن تک حکمراں تھی، یہودیت یمن اور حجاز کی تجارت گاہوں پر قابض تھی، عیسائیت اپنی فوج و لشکر اور راہبوں اور قیسیوں کے دل بادل کے ساتھ یمن سے لیکر شام کے حدود تک پھیلی تھی اور بعض افراد اور بعض قبیلوں کو وہ برائے نام عیسائی بنا بھی چکی تھی، مگر پورا عرب بدستور اپنی خالص حالت پر باقی تھا، عرب میں جو نیک طبع اور دیندار لوگ ہوتے تھے، وہ مجوسی یا یہودی یا عیسائی ہونے کے بجائے اپنے کو دین ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے، اور اسی لئے اپنے مذہب کا نام دین حنیفی رکھتے تھے، یہ سب اسی لئے ہو رہا تھا، تاکہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دین ابراہیمی کی دعوت و تجدید کا راستہ کھلا رہے،

محکوم نہ تھے عرب کا ملک تخلیق عالم کے آغاز سے اسلام تک ہر غیر قوم کی حکومت سے ہمیشہ آزاد رہا، شمالی عرب نے کبھی کسی قوم کی غلامی نہیں کی، بابل کے بخت نصر نے بنی اسرائیل کو زیر و زبر کر دیا، مگر عرب کی طرف آنکھ نہ اٹھا سکا، یونانیوں اور رومیوں نے مصر سے لیکر عراق کی سرحد تک صدیوں تک حکومت کی، مگر خاص عرب کے اندر قدم نہ رکھ سکے، سکندر نے اور اس کے بعد کے رومی سپہ سالاروں نے جب ادھر نظر اٹھائی تو فطرت نے ہمیشہ ان کو شکست دی، عرب کا ملک دنیا کی دو عظیم الشان حکومتوں یعنی ایران و روم کی سرحد پر واقع تھا، مگر وہ دونوں اپنی حرص و آز کا ہاتھ اسکی طرف بڑھانے سے قاصر رہیں، گستاخ عیسائی حبشیوں نے یمن فتح کرنے کے بعد ہاتھیوں کے ریلے کے ساتھ مکہ معظمہ پر چڑھائی کی، مگر قدرت الٰہی

نے انکو تباہ کر دیا، یہ تمام اہتمام و انتظار اسلئے تھا، کہ کوئی دوسری جابرانہ قوت اُنکے دل و دماغ کی استعداد کو برباد نہ کر سکے، ان کی آزادی کی روح برقرار اور اُن کی فاتحانہ طاقت بدستور قائم رہے، تاکہ یہ مخفی خزانہ خدا کے آخری مذہب کی حکومت کے قیام و بقا میں کار آمد ہو،

کتابی فاسد تعلیم سے ناآشنا تھے

جس طرح وہ خارجی اثرات سے پاک تھے، اسی طرح صحیفۂ فطرت کے سوا ہر قسم کے کتابی علم سے وہ ناآشنا تھے، یعنی اس ذریعہ سے بھی وہ دوسری قوموں کے دماغی اثرات سے محفوظ تھے، اور علم کی جاہلانہ اور کج بحثانہ ذہنیت سے پاک تھے، وہ امی تھے، تاکہ ایک اُمی معلم کی ربانی تعلیم کے قبول کرنے کے لئے ہر طرح تیار رہیں،

وہ زمین کے وسط میں آباد تھے

عرب کا ملک پُرانی دنیا کے وسط میں واقع ہے، ایک طرف ایشیا، دوسری طرف افریقہ، اور تیسری طرف یورپ کا راستہ اُس سے قریب ہے، پھر بحری جانے نے اسکو جزائر اور دور دراز ملکوں سے قریب کر دیا تھا، اس لئے عرب سے نکل کر وہ ایک طرف عراق ہو کر ایران، ترکستان، خراسان، سیستان، کابل، ہندوستان تک پہنچ گئے اور دوسری طرف شام ہو کر مصر، افریقہ، الجزائر، ٹیونس، مراکش اور اسپین تک جا پہنچے اور بحری راستوں سے ایک طرف تمام جزائر افریقہ، حبشہ، زنجبار، پھر ادھر جزائر ہند، جاوا، ساٹرا اور چین تک انکا گذر ہوا، اور دوسری طرف سائپرس، کریٹ اور سسلی تک ان کا پرچم لہرایا، یہ تمام مواقع اسلئے میسر آئے کہ عرب کا جائے وقوع اس دعوت کے لئے مناسب مرکز تھا، فرض کرو کہ اگر اس دعوت کی جگہ ہندوستان یا چین ہوتا تو اسپین اور سسلی تک پہنچنے کے لئے کتنا عرصہ درکار ہوتا، پھر یہ اس وقت تک دنیا جن دو مشرقی اور مغربی طاقتوں کے زیر فرمان تھی، ان دونوں کے زور کو برابر

طور سے اور ایک ساتھ توڑنے کیلئے عرب کے سوا دنیا میں کوئی جگہ موزوں نہ تھی جہاں سے دونوں پر ایک ساتھ حملہ کرنا اور دنیا کو ان کے خون آشام پنجوں سے نجات دینا آسانی ممکن ہو،

بعض اخلاقی خوبیاں ان کے علاوہ اہلِ عرب کو خیر الامم بننے اور عالم کے لئے شاید نمونہ اور مصلح ہونے کیلئے کچھ اور اخلاقی خوبیوں کی بھی ضرورت تھی، اور وہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں، ان خوبیوں کے بغیر وہ اسلام کی عظیم الشان تحریک کے علم بردار نہیں ہو سکتے تھے اور نہ وہ دنیا کی رہنمائی کا فرض انجام دے سکتے تھے،

شجاع و بہادر تھے وہ حد سے زیادہ شجاع و بہادر تھے، وہ خطرات سے بے خوف تھے، وہ لڑائی کو کھیل سے زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے، یہی سبب ہے کہ وہ تمام دنیا کی قوموں اور سلطنتوں کے مقابلہ میں تنہا کھڑے ہوئے اور کسریٰ و قیصر کو انھوں نے ایک ساتھ چیلنج دیا اور اس تحریک کے پھیلانے میں تھوڑی تھوڑی غیر مسلح جمعیتوں سے ہزاروں اور لاکھوں کی فوج کا بے خطر مقابلہ کیا، اور کامیاب ہوئے،

پرجوش تھے ساتھ ہی وہ پُرجوش بھی تھے، اسلئے جس دعوت اور تحریک کو لیکر اٹھے اسکو پوری کوشش، عزم اور جوش کے ساتھ دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلایا، اُن کے عزم اور جوش کو نہ پہاڑ روک سکا اور نہ سمندر اس سے ٹکرا سکا، ہر جگہ وہ توحید کا علم لئے بحر و بر دشت و جبل میں پھیل گئے، اور اپنے عزم راسخ سے ارکانِ عالم کو متزلزل کر دیا،

حق گو تھے ان کی جسمانی شجاعت و بہادری کیساتھ ان کا دل شجاع اور بہادر تھا، جو بات ان کے دل میں ہوتی تھی، وہی اُنکی زبان پر تھی، اہلِ مدینہ میں جو نفاق کا عنصر پیدا

ہو گیا تھا وہ یہود کے اثر کا نتیجہ تھا، ورنہ قریش اور عام اہل عرب میں یہ بات نہ تھی، یا تو وہ کھلے دشمن تھے، یا کھلے دوست، اپنے نزدیک وہ جس کو حق سمجھتے تھے، اس کے ظاہر کرنے میں ان کو کسی کا باک نہیں ہوتا تھا،

عقل و دانش والے تھے

باوجود اس کے کہ وہ عموماً ظاہری نوشت و خواند سے عاری تھے، مگر فطرت کے عطیۂ عقل و دانش سے وہ کافی طور پر بہرہ مند تھے، حضرت ابو بکر صدیقؓ عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ، علی مرتضیٰؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، خالدؓ، ابو عبیدہؓ بن الجراح وغیرہ سینکڑوں ہزاروں صحابہؓ نے علم و مذہب، اخلاق اور سیاست میں جو نکتہ سنجیاں کیں وہ خود انکی عقل و دانش کی گواہ ہیں، روم و ایران کی متمدن قوموں سے جس طرح انھوں نے معاملۂ مراسلہ اور نامہ و پیام کیا اور علم و سیاست کے الجھے سے الجھے ہوئے مسئلہ کو جس طرح سلجھایا وہ خود اسی نتیجہ کو ظاہر کرتا ہے، انکے شعرا کے کلام، انکے مقرروں کی تقریریں، انکے فصحا کے مقولے سنئے تو انکی اس فطری صلاحیت کا اندازہ ہو گا کہ ظاہری تعلیم کے بغیر کیونکر یہ لعل و گہر وہ اپنے منہ سے اگل سکے،

ذہن اور حافظہ کے تیز تھے

فطرت کا قاعدہ ہے کہ اگر اسکے بعض قویٰ بیکار ہیں، تو ان کی قوت دوسرے زیر عمل قویٰ کو وہ منتقل کر دیتی ہے، اور جس عضو سے زیادہ کام لیا جاتا ہے، اسکی قوت کو وہ ترقی دیتی رہتی ہے، اسی اصول کے موافق ظاہری تعلیم اور نوشت و خواند سے محرومی ہونے کے سبب سے جہاں عرب کے بعض قویٰ بیکار ہو رہے تھے وہاں انکو اپنی یادداشت کیلئے تحریری اوراق اور صفحوں پر بھروسہ کرنے کے بجائے خود اپنے دل و دماغ پر بھروسہ کرنے کی عادت تھی اسکا نتیجہ یہ تھا کہ انکا ذہن اور حافظہ بہت قوی تھا، یہی سبب ہے کہ انکے شعرا اپنے بڑے بڑے

قصیدوں کو زبانی پڑھتے تھے، اور جو کچھ کہتے تھے، اسکو برزبان یاد رکھتے تھے، اور ان کی اسی قوت کا یہ فیض تھا کہ اُن میں کا بڑا طبقہ تحریر کے بغیر قرآن پاک کی بڑی بڑی سورتوں کو یاد رکھتا تھا اور بہتیرے ایسے تھے جو پورے قرآن کو یاد رکھتے تھے، اور یہ ان ہی کی تقلید ہے کہ دنیا کے ہر حصہ میں ایسے ہزاروں مسلمان پائے جاتے ہیں، جو پورے قرآن کے حافظ ہوتے ہیں اور اہل عرب کی اسی خصوصیت کا مظہر یہ بھی تھا کہ احادیث و سیر اور واقعات کا بڑا سرمایہ تحریر کے علاوہ زبانی ایک دوسرے کو پوری ذمہ داری اور حفاظت کے ساتھ منتقل ہوتا رہا، اور سینکڑوں اصحاب ایسے تھے جو ہزاروں لاکھوں احادیث کو ایک ایک حرف اور ایک ایک لفظ کی پابندی کیساتھ یاد رکھتے تھے۔

اہل عرب کی اس خصوصیت نے اسلام کی حفاظت اور اشاعت کا نہایت اہم فرض انجام دیا فیاض تھے | اہل عرب کی ایک خاص امتیازی صفت انکی فیاضی تھی، مہمان نوازی ان کی سب سے بڑی خصوصیت تھی، ہمسایوں اور پناہ گزینوں کی امداد میں وہ اپنی جان تک لڑا دیتے تھے اپنی شہرت اور ناموری کے لئے اونٹوں کو ذبح کرکے کھلا دینا، یا جوے میں جیتی ہوئی دولت کو احباب کے جلسۂ دعوت میں اڑا دینا، اور اس پر فخر کرنا اُن کی قومی صفت تھی اور یہی اوصاف ان کی شاعرانہ مدح میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ اسلام نے انکی اسی صفت کو تھوڑی سی اصلاح کے بعد خدا کی راہ میں خیرات و صدقات زکوٰۃ سے بدلدیا، اور اسلام کی مشکل کشائی میں اس نے سب سے زیادہ مدد دی

مساوات پسند تھے | چونکہ وہ کبھی کسی دوسری قوم کے محکوم نہیں ہوئے تھے، اور نہ کسی ایک مطلق العنان بادشاہ کے تابع فرمان بنے تھے، اسلئے ان کی خودداری کا جذبہ بیدار تھا، وہ غلام بنانا نہیں جانتے تھے، وہ اپنے کو ذلیل کرنا پسند نہیں کرتے تھے، اور وہ بڑے سے بڑے شخص کے سامنے

برابری کے ساتھ بے باکانہ بیٹھکر باتیں کرتے تھے،

عرب میں بیسیوں لڑائیاں صرف اسی خودداری کی حفاظت میں پیش آئی تھیں جس کا ایک منظر سبعہ معلقہ کے آخری قصیدہ میں نظر آتا ہے، اہلِ عرب کے اس جذبہ نے حق گوئی بیباکی اور جمہوریت پسندی وغیرہ اسلامی تعلیمات کے پھیلانے میں بڑی مدد دی،

عملی تھے اہلِ عرب کے فطری اخلاق و کردار کی آخری دفعہ یہ ہے، کہ وہ طبعاً عملی اور عملیت پسند تھے، وہ اہلِ ایران اور اہلِ ہند کی طرح محض تخیل پسند، خیال آرا اور نظریہ باز نہ تھے، وہ مجسم عمل تھے، اور عملیت کو پسند کرتے تھے. وہ چون وچرا اور کیسے کیونکر کی فلسفیانہ الجھنوں سے پاک تھے، وہ دنیا کے کاروباری آدمیوں اور سپاہیوں کی طرح چند اچھی باتوں کو قبول کرکے ان پر فوراً عامل بنجاتے تھے، یہی سبب ہے کہ عجیبانہ نکتہ آفرینی اور بال کی کھال نکالکر اسکی الجھنوں کے سلجھانے میں وہ کبھی گرفتار نہیں ہوئے، وہ ہمہ تن عمل اور صرف عمل تھے، اسی بنا پر شارع علیہ السلام نے انکے سامنے عملی مذہب کو پیش کرکے انکو سرتاپا عملی بنا دیا، اور جو کچھ وہ تعلیم لائے تھے، اس کا مجسم پیکر بنکر چند سال میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا، دور دور سے بدوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتے تھے، اور بحث اور مناظرہ وقیل وقال کے بغیر فرائض و اخلاق کی عملی تعلیم حاصل کرکے اپنے قبیلہ میں واپس جاتے تھے اور بالآخر اپنی عملی دعوت سے اپنے پورے قبیلہ کو مسلمان بنا لیتے تھے، وہ اگر مگر اور ممکن و ناممکن کی بحث میں نہیں پڑتے تھے، وہ تعلیم کو دیکھتے تھے اور سنتے تھے وہ اچھی معلوم ہوتی تو اسکو قبول کرتے اور اس پر عمل کرکے دینی و دنیاوی فوائد اور نتائج کے حصول کا یقین کرتے تھے اور اسی غیر متزلزل یقین اور ایمان کے بھروسہ پر مشکل سے مشکل اور خطرناک سے خطرناک کام کر گذرتے تھے، اہل عرب

کی اسی خصوصیت نے اسلام کی سادگی کو برقرار اور عجمی فلسفیت و نظریت سے اسکو پاک و مبرا رکھا اور ساتھ ہی چند سال کے اندر اندر مغرب و مشرق، شمال و جنوب میں اسلام کا پھریرا آسمان پر اڑنے لگا

ان اوصاف کی مصلحت اہلِ عرب کے ان تمام فطری و طبعی اوصاف و اخلاق کو دیکھکر یقین کرنا پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری دین کی اشاعت اور حفاظت کیلئے جس قوم کا انتخاب کیا تھا وہ ازل سے اسکے لئے منتخب ہو چکی تھی، باوجود انکی ہر قسم کی گمراہیوں کے یہ چند اچھے اوصاف اسلئے اُن میں ودیعت کئے گئے تھے، تاکہ جب خدا کی بادشاہی کا دن آئے تو ان کی فطری استعداد کا یہ سرمایہ اسکی امداد و اعانت کے لئے خزانۂ غیب کا کام دے، یہی وہ سرمایہ تھا جو اسوقت نہ ہند و عجم میں تھا نہ روم و فرنگ میں، نہ ترک میں تھا، نہ زنگ میں تھا، وہ عرب اور صرف عرب میں تھا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری نبوت کیلئے اسی قوم کو برگزیدہ کرکے یہ امانت اسکے سپرد کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کی اولاد میں اسمٰعیلؑ کو پسند کیا اور اسمٰعیلؑ کی اولاد میں بنی کنانہ کو اور بنی کنانہ میں سے قریش کو اور قریش میں سے بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم میں سے مجھ کو[1] ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں عبدالمطلب کے بیٹے عبداللہ کا بیٹا ہوں، اللہ نے تمام لوگوں کو پیدا کیا تو مجھے اُن ان سب میں سب سے بہتر نسل میں رکھا ان کو دو حصوں (عرب و عجم) میں تقسیم کیا تو مجھے اس حصہ میں (یعنی عرب میں) بنایا جو سب سے بہتر تھا، اس حصے کو بھی قبیلوں میں تقسیم کیا تو مجھے اس قبیلہ میں پیدا کیا جو سب سے بہتر تھا، پھر اس قبیلہ کو گھرانوں میں تقسیم کیا تو مجھے سب سے بہتر گھرانے میں پیدا کیا، پھر اس گھرانے کو افراد پر تقسیم کیا تو مجھے اس گھرانے کا سب سے بہتر فرد بنایا،

---

[1] یہ دونوں حدیثیں ترمذی باب المناقب میں ہیں ۱۲،

صبحِ سعادت

دنیا اور عرب کی سرزمین اسی ظلمت میں تھی کہ صبح سعادت نمودار ہوئی اور خورشید نبوت کے طلوع کا غلغلہ برپا ہوا، ظلمتِ شب کافور ہوئی، اور تھوڑی دیر میں ذرہ ذرہ سورج کی کرنوں سے پُرنور ہو گیا، یہ ظاہر ہے کہ یہ سورج گو دنیا کو روشن کرنے نکلا تھا، لیکن وہ نکلا عرب ہی کے افق سے تھا، اسلئے ضروری تھا کہ اس کے نور سے پہلے اسی ملک کی سرزمین روشن ہو،

ایک قوم کا انتخاب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو گو خدا نے تمام عالم کی اصلاح کیلئے بھیجا تھا اور اس بنا پر ایک ایسی شریعت کامل عطا کی جو صرف عرب بلکہ تمام عالم کیلئے ابد تک کافی ہے، لیکن کوئی شریعت، کوئی قانون، کوئی دستورالعمل اُسوقت تک مفید اور کارآمد نہیں ہو سکتا جب تک اُسکے ساتھ ایسا گروہ موجود نہ ہو جو اس شریعت کی عملی تصویر ہو اور جسکی ہر بات ہر ادا ہر جنبش عملی خطیر بنکر گرد و پیش کو اپنا ہم زبان اور اپنا ہم عمل بنالے،

اس بنا پر خاتم النبیا، صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے اہم مقصد ایک خاص قوم کو تربیت دیکر اصلاحِ عالم کیلئے تیار کرنا تھا[1]، دنیا کی اور قومیں باری باری اس منصب پر ممتاز ہو چکی تھیں، ایک زمانہ تھا جب بنی اسرائیل جیسی قوم جو آج تمام دنیا میں خوار و ذلیل ہے، اِنِّی فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعَالَمِیْنَ (میں نے

[1] شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ جو پیغمبر تمام عالم کیلئے مبعوث ہوتا ہے، وہ علاوہ ان اصول کے جو اور مذاہب میں ہیں

تمکو تمام دنیا کی قوموں پر فضیلت دی) کا تاج پہن چکی تھی، لیکن اوپر بہ تفصیل گذر چکا کہ اب تمام قوموں میں صلاحیت کا مادہ مفقود ہو چکا تھا، ایران تین ہزار برس تک ناز و نعمت میں پل کر ترقی کی روح فنا کر چکا تھا، رومیوں کے تمام قواے عمل بوسیدہ ہو چکے تھے، ہندوؤں کا دل و دماغ وہم پرست ہو کر رہ گیا تھا، صرف ایک عرب تھا جو بن جتی زمین کی طرح مادہ ہائے نشو و نما سے لبریز تھا اور ایک لوح سادہ کی طرح ہر قسم کی نقش آرائیوں کے قابل تھا، مشیت ایزدی نے اسی کو تاکا اور چند روز میں وہی عرب جو سرتاپا جہل سرتاپا وحشت اور سرتاپا درندہ پن تھا، کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ[1] کا مظہر بن گیا،

ان لوگوں کا حلیہ و جمال اور خط و خال یہ تھا،

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنَّاھُمْ فِی الْاَرْضِ	ایسے لوگ کہ ہم اگر انکو دنیا میں اقتدار دیں
اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا	تو وہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں اچھی باتوں کا
بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (حج)	حکم دیں اور بری باتوں سے روکیں،

اصلاح و ہدایت کی مشکلات ہر قوم کی اصلاح و ہدایت میں اول سخت اور متعدد مشکلات پیش آتی ہیں، لیکن ان کی نوعیت ایک دو سے زیادہ نہیں ہوتی، لیکن عرب کی اصلاح میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۰) چند اور نئے اصول اختیار کرتا ہے جن میں سے ایک یہ ہے،

یدعو قوماً الی السنۃ الراشدۃ ویزکیھم ویصلح شانھم ثم یتخذھم بمنزلۃ جوارحہ یجاھد بھم اھل الارض ویفرقھم فی البلاد وھو قولہ تعالیٰ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس حجۃ اللہ البالغۃ صفحہ ۱۲۳ مطبوعات ھند)	وہ ایک قوم کو سنت راشدہ کیطرف دعوت دیتا ہے، انکو پاک اور درست کرتا ہے پھر انکو اپنا دست و بازو بناتا ہے اور انکو دنیا میں پھیلا دیتا ہے، اور انکے ذریعہ سے مجاہدہ کرتا ہے جیسا کہ خدا نے کہا، "تم بہترین امت ہو جو دنیا کے لئے پیدا کئے گئے ہو"

[1] تم بہترین قوم ہو جو انسانوں کیلئے (پردہ عدم سے) باہر لائی گئی، جو نیکیوں کا حکم دیتی اور برائیوں سے روکتی ہے،

ہر نوع، ہر حیثیت، ہر جہت کی گوناگوں اور لاعلاج مشکلات تھیں اور ایسی تھیں جنمیں سے
ایک کا حل کرنا بھی قدرتِ انسانی سے بالاتر تھا، بنو اسرائیل ایک مدت سے مصر میں
قبطیوں کی غلامی کر رہے تھے، اور قبطیوں کے جور و ظلم کا طوفان اُنکے سر سے گذر چکا تھا حضرت
موسیٰ علیہ السلام نے ان پر یہ احسان عظیم کیا کہ فرعون کے پنجۂ ستم سے انکو چھڑا کر مصر سے نکال لائے،
لیکن غلامی میں رہتے رہتے اُنکی طبیعت میں اسقدر ذلت پسندی آگئی تھی کہ جب ان سے کہا گیا
کہ آگے کنعان کی زمین ہی، اُسکو لڑکر لے لو اور اسی پر تخت سلطنت بچھاؤ تو انھوں نے حضرت
موسیٰؑ سے صاف کہدیا کہ تم اور تمہارا خدا دونوں جاکر لڑو، ہم تو یہاں سے آگے قدم نہیں بڑھاتے،
یہ ایک امتداد ماحول کا اثر تھا، جو مرتے مرتے ان لوگوں کی طبیعت سے نہیں گیا، اور جبتک یہ نسل پوری
اپنی موت سے مرکر منقرض نہیں ہوگئی، بنو اسرائیل کو کنعان کی زمین میں قدم رکھنا نصیب نہ ہوا،
یہ صرف ایک مشکل کی مثال تھی، اب عرب کی مشکلات کا اندازہ کرو،

جہالت عرب کی قوم اُمی محض تھی، الوہیت، رسالت، کتاب، معاد، عبادت ان میں
سے کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے ان کے کان آشنا ہوں، اسلام کا ہر لفظ جو اُنکے کان میں
پڑتا تھا، انکو ایک تعجب انگیز اور بالکل بیگانہ آواز معلوم ہوتی تھی، قرآن مجید نے انکی اس
جاہلانہ حیرت و استعجاب کو متعدد آیتوں میں ذکر کیا ہے،

یٰسٓ ۝ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝ اِنَّكَ لَمِنَ	قرآن حکیم کی قسم، تو بے شبہ پیغمبروں میں
الْمُرْسَلِيْنَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝	سے ہی راہ راست پر ہے، یہ قرآن رحمت والے
تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝ لِتُنْذِرَ	غالب خدا کے پاس سے اترا ہی، تاکہ تو اس قوم کو ڈرائے

قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ (یٰسین۔۱)

کرے، جن کے اسلاف کو آگاہ نہیں کیا گیا اور اس لئے وہ غفلت میں پڑے ہیں

یہ نبوت کے شرف سے محروم قوم ایک آسمانی مذہب کے تمام خصائص سے محض بیگانہ تھی،

وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ۝ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ ۚ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۔ (ص۔۱)

اور انھوں نے تعجب کیا کہ ان میں ایک پیغمبر ہوکر انکے پاس آیا، کافروں نے کہا یہ دروغگو جادوگر ہے، اس نے اتنے خداؤں کو ایک خدا بنادیا، یہ عجیب بات ہے، ان کے بیچ اٹھ کھڑے ہوئے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر جمے رہو، اسمیں اس پیغمبر کی کوئی غرض ہے، ہم نے سنا تو سابق مذہب میں یہ نہیں سنا، یہ سب گھڑی ہوئی بات ہے،

بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ (ق۔۱)

بلکہ ان کو تعجب ہوا کہ ان ہی میں سے ایک ان کے پاس پیغمبر بنکر آیا، کافروں نے کہا یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے،

صفاتِ الٰہی، آثارِ نبوت، احوالِ معاد، ان میں سے ہر بات کو سنکر وہ اسیطرح سرتاپا حیرت بنجاتے تھے، اور نبوت کے متعلق یہ سمجھتے تھے کہ انسان تو اسکے سزاوار نہیں، اس منصب پر تو فرشتوں کو ممتاز ہونا چاہئے تھا،

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ (فرقان-۳)

اور جو ایک دن ہمارے سامنے آنے کے منکر ہیں، وہ کہتے ہیں کہ فرشتے پیغمبر بنا کر ہم پر کیوں نہ اتارے گئے،

اِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (فصلت-۳)

پیغمبر جب اُن کے پاس سامنے سے اور پیچھے سے آتے ہیں کہ ایک خدا کے سوا کسی اور کو نہ پوجو تو وہ کہتے ہیں کہ خدا اگر کسی کو پیغمبر بنا کر بھیجنا چاہتا تو فرشتوں کو اتارتا ہم تو تمہاری باتوں کا انکار ہی کریں گے،

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا قُلْ لَّوْ كَانَ فِى الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل)

ہدایت آنے کے بعد صرف اس شبہہ نے لوگوں کو ایمان لانے سے باز رکھا ہے کہ کیا خدا نے آدمی کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے؟ جواب میں کہدو کہ اگر زمین میں فرشتے چلتے پھرتے بستے ہوتے تو البتہ ہم آسمان سے کسی فرشتہ کو پیغمبر بنا کر بھیجتے،

نبی کا تخیل اگر اُن کے ذہن میں کبھی آتا تھا تو بشریت سے ماورا صورت میں، یعنی یہ کہ وہ انسانی ضروریات سے منزہ ہو، اس کے پیچھے خدا اور فرشتوں کا پرا ہو، آسمان اور زمین کے خزانے اس کے دست قدرت میں ہوں،

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ

انھوں نے کہا اے پیغمبر ہم تجھ پر اُس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک زمین سے ہمارے لئے تو چشمہ نہ بہادے، یا تیری ملکیت میں کھجوروں اور انگوروں

خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا، اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ
كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ
وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا، اَوْ يَكُوْنَ لَكَ
بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ

(بنی اسرائیل-۱۰)

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ
الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ لَوْلَآ
اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ
نَذِيْرًا، اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ
لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا (فرقان-۱)

کا کوئی باغ نہ ہو، جسمیں نہریں جاری کر دی ہوں،
یا جیسا کہ تو نے کہا ہے، ہم پر بادل کا کوئی ٹکڑا
نہ گرادے، یا خدا اور فرشتوں کو پرا بنا کر نہ لے آئے،
یا تیرے پاس کوئی سونے کا گھر نہ ہو یا تو آسمان
پر نہ چڑھ جائے،

انھوں نے کہا یہ عجیب پیغمبر ہے، یہ تو کھانا پیتا ہے، بازاروں
میں چلتا پھرتا ہے، اس پر کوئی فرشتہ کیوں نہ اترا
جو اس کے ساتھ مل کر لوگوں کو ڈراتا یا اسکے پاس
کوئی خزانہ کیوں نہیں ڈال دیا گیا، یا اسکے لئے کوئی
کوئی باغ کیوں نہ ہو جس سے یہ کھاتا،

پیغمبر کے لئے ان کے خیال میں یہ بھی ضروری بات تھی کہ وہ بڑا دولتمند ہو اسکے قبضہ میں کوئی بڑی جائداد ہو، میووں کے ہرے بھرے باغ اور سونے چاندی کے خزانے اسکے پاس ہوں، چنانچہ گذشتہ آیت میں کفار کے اس خیال کی طرف بھی اشارہ ہے، اسی لئے مکہ اور طائف کے جو رؤسا دولتمند تھے، وہ اس منصب کے سب سے زیادہ مستحق سمجھے جاتے تھے،

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ
عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (زخرف-۳)

وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن مکہ یا طائف کے کسی بڑے
آدمی پر کیوں نہیں اترا،

کسی کتاب کے نازل ہونے کے معنی اُن کے خیال میں یہ تھے کہ آسمان سے کاغذوں میں ایک

لکھی لکھائی، ترشی ترشائی، جلد بندھی ہوئی ایک کتاب سب کے سامنے مجمع میں اتر آئے،

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً (فرقان-۳)

کافروں نے کہا اس پر قرآن یکبارگی کیوں نہیں اترا،

وَلَنْ نُؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَقْرَؤُهُ ط (بنی اسرائیل-۱۰)

اور (کافروں نے کہا) ہم تیرے آسمان پر چڑھ جانے کے بھی اس وقت تک قائل نہیں ہونگے جب تک ہمپر کوئی ایسی کتاب نہ اتار لائے جسکو ہم لیکر پڑھنے لگیں،

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ (انعام-۱)

اور اگر کاغذوں میں لکھی ہوئی کوئی کتاب ہم آسمان سے تمپر اتارتے جسکو وہ اپنے ہاتھوں سے چھو بھی لیتے، تو کافر یہی کہتے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے،

غرض ایک آسمانی مذہب کی کیفیت سے بالکل بیخبر تھے، الوہیت اور صفاتِ الٰہی کے اسرار نبوت کے خصائص، نزولِ کتاب کی حقیقت، ہر چیز انکے لئے حیرت و استعجاب کا سرمایہ تھی،

أَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ أَمْ جَاءَهُمْ مَا لَمْ يَأْتِ آبَاءَهُمُ الْأَوَّلِينَ أَمْ لَمْ يَعْرِفُوا رَسُولَهُمْ فَهُمْ لَهُ مُنْكِرُونَ (مومنون-۴)

کیا انھوں نے بات پر غور نہیں کیا یا ان کے پاس وہ تعلیم آئی ہے، جو ان کے اسلاف کے پاس نہیں آئی یا انھوں نے اپنے رسول کو نہیں پہچانا، تو اس کے منکر ہیں،

اس بنا پر عرب کے مشرکین اور کفار کو ایک مدت تک صدائے نبوت سے گوش آشنا ہونے کی حاجت تھی، اور اس میں کئی برس صرف ہو گئے، لیکن وہ لوگ جو اس صدا سے نامانوس تھے ان

آواز پہنچنے کی دیر تھی کہ وہ سرتاپا لبیک تھے، حصۂ اوّل میں گذر چکا ہے کہ سابقین اسلام عموماً وہی لوگ تھے جو اہلِ کتاب یا حنفاء کے آغوش پروردہ تھے، اشخاص کے علاوہ قبائل کا بھی یہی حال تھا، مشرکین کلام الٰہی کا جواب خندۂ تحقیر سے دیتے تھے اور رموز نبوت کے دانا چشم پرنم اور دلِ پُرکیف سے۔

إِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مِن قَبْلِهِ إِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ يَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ سُجَّدًا وَيَقُولُونَ سُبْحَانَ رَبِّنَا إِن كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُولًا وَيَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا،

(بنی اسرائیل۔۱۲)

جنکو اس سے پہلے علم دیا گیا ہے (یہود و نصاریٰ) جب انکو قرآن کی آیتیں سنائی جاتی ہیں، تو منھ کے بل وہ سجدے میں گر پڑتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ پاک ہے ہمارا پروردگار ہم سے (ایک پیغمبر آخرالزماں کے بھیجنے کا) جو وعدہ کیا تھا، وہ ضرور پورا ہوا، اور وہ منھ کے بل گر پڑتے ہیں اور یہ ان کے خشوع کو اور بڑھا دیتا ہے۔

وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُم مَّوَدَّةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ذَٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ، وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ

(مائدہ۔۱۱)

اُن میں سب سے زیادہ مسلمانوں کے ساتھ محبت رکھنے والے وہ ہیں جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں، سبب یہ ہے کہ اُن میں قسیس اور رہبان ہیں، اور وہ تکبر نہیں کرتے، اور جب وہ کلام سنتے ہیں جو پیغمبر پر اترتا ہے، تو ان کی آنکھوں کو تو دیکھے گا کہ حق کو پہچان کر آنسو بہاتی ہیں اور کہتے ہیں کہ خدایا ہم ایمان لائے، ہم کو بھی شہادت دینے والوں میں لکھ لے،

مدینہ کے یہود جو اسلام سے سیاسی اور دینی کینہ اور تعصب رکھتے تھے، اور اس بنا پر اسلام کے مقابلہ میں زبان سے اپنی کور باطنی کا اظہار وہ اپنا فرض سمجھتے تھے، وہ بھی چشم دل کو نبیشِ حق سے باز نہیں رکھ سکتے تھے،

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنْھُمْ لَیَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ

(بقرہ ۱۷-۱۷)

جن کو ہم کتاب دے چکے ہیں وہ اس پیغمبر کو اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، ان میں سے کچھ لوگ جان کر حق پوشی کرتے ہیں،

وَلَمَّا جَآءَھُمْ کِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَھُمْ وَکَانُوْا مِنْ قَبْلُ یَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَی الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَھُمْ مَّا عَرَفُوْا کَفَرُوْا بِہٖ،

(بقرہ ۱۱-۱)

اور جب خدا کے پاس سے پیغمبر وہ کتاب لیکر آیا جو خود ان کی آسمانی کتابوں کو سچ کر رہی ہے تو باوجود اس کے کہ وہ کافروں کو اس سے پہلے اسی کے نام سے دباتے تھے، اب حق پہچان کر اس کا انکار کرتے ہیں،

قرآن مجید کی شہادتوں سے قطع نظر کرکے، اگر واقعات پر غور کیا جائے تب بھی یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی، مجرد دعوت حق سننے کیساتھ جن اشخاص اور جن قبائل نے اسلام کو لبیک کہا انکے حالات پیشِ نظر کر لینے کے بعد صاف ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اپنے لئے صرف اثر پذیر دل اور ذوق آشنا نگاہ کا جویاں تھا، حضرت سعید بن زیدؓ عثمان بن مظعونؓ، صہیبِ رومیؓ، ابو ذر غفاریؓ، سلمان فارسیؓ وغیرہ جو سابقینِ اسلام

ہیں، اسی قسم کے لوگ تھے، ابوجہل، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل وغیرہ، قریش کے مشرکین و کفار خدا کا کلام تیرہ برس تک متصل سنتے رہے لیکن ان کے دل کی سنگینی میں کوئی فرق نہ آیا، ورقہ مکہ کا قریش عیسائی صرف ایک بار قرآن سنتا ہے اور ناموس اکبر کی آواز پہچان لیتا ہے، مکہ کے مشرک ترپن ۵۳ برس تک آپ کے چہرہ پُرنور کو دیکھتے رہے لیکن نورِ الٰہی کو نہ پہچان سکے اور عبداللہ بن سلامؓ یہودی عالم نے صرف ایک دفعہ جمال پُرانوار کو دیکھا اور پکار اٹھے کہ یہ حق کی تجلی ہے، روسائے قریش ہر روز اپنی آنکھوں سے نزولِ وحی کا تماشا دیکھتے ہیں اور اجنبی نہیں کرتے اور نجاشی حکومت کی مسند پر اور ہرقل شہنشاہی کے تخت پر بیٹھ کر غائبانہ کلام اللہ کی چند آیتیں سنتے ہیں اور تڑپ جاتے ہیں، قریش کے گھر یہ دولت خود اترتی ہے اور وہ اس کو ٹھکرا دیتے ہیں، لیکن مدینہ سے بنی اسرائیل کے پڑوسی جو انکی زبان سے آخری نبی کی بشارت سن چکے تھے اتفاقاً مکہ آتے ہیں اور اس دولت ابدی کو اپنے گھر اٹھا لیجاتے ہیں، طائف کے سنگدل جاہل، نبی پر پتھر برساتے ہیں، اور اسکی ہنسی اڑاتے ہیں اور نجران کے عیسائی عالم مناظرہ کی غرض سے مدینہ آتے ہیں لیکن چہرہ پر پیغمبری کی معصومیت دیکھ کر دہل جاتے ہیں، اور صلح کا ہدیہ پیش کرتے ہیں،

قریش اور حجاز کے رازِ نبوت کے نامحرم دعوتِ حق کا جواب اکیس ۲۱ برس تک تیغ و سناں سے دیتے ہیں، لیکن یثرب، ہجر، یمن، عمان اور بحرین کے بڑے بڑے اور عظیم الشان قبائل جو یہود نصاریٰ اور مجوسیوں کے اثر سے ان رموز سے کسی قدر آگاہ ہو چکے تھے، وہ آوازِ حق پہنچتے کے ساتھ دفعۃً مسلمان تھے،

آبائی دین و رسوم کی پابندی ہر نئی تحریک کو غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اس کے قبول کرنے میں جو چیز سب سے پہلے عائق ہوتی ہے، وہ قومی رسم و رواج اور آبائی دین و مذہب کی پابندی ہے، انسانیت کے پاؤں میں اس سے بھاری کوئی زنجیر نہیں، دوست و آشنا کا چھوٹنا، ماں باپ سے علیحدگی آل و اولاد سے کنارہ کشی، مال و جائداد سے دست برداری، جماعت کی مخالفت، قوم سے انقطاع، وطن سے دوری، ایسی چیزیں نہیں ہیں جنکو ہر انسان آسانی سے برداشت کر سکے، ملکی رسم و رواج کی دیرینہ محبت اور آبائی کیش و آئین کی موروثی الفت، حق و باطل کی تمیز اور نیک و بد کی پہچان کی حس مٹا دیتی ہے، عام دنیا کی فطری حالت کے علاوہ، عرب کی قوم قدامت پسندی اور قدیم حالت پر بقا و استحکام میں خاص شہرت رکھتی ہے، دنیا کہاں سے کہاں بدلتی چلی گئی، پرانی سامی نسل کی بدویانہ خصوصیتیں جو ہم توراۃ میں پڑھتے ہیں وہ تمام سامی قوموں سے مٹ گئیں، مگر عرب میں اسوقت بھی نمایاں تھیں اور آج بھی نظر کے سامنے ہیں، دین ابراہیم کے چند اصول حج، ختنہ اور قربانی وغیرہ ہزاروں برس کے بعد بھی عرب میں مٹ مٹا کر باقی رہ گئے تھے، اور ان سے نہیں چھوٹے تھے، انکے شعر و شاعری اور فخر و مباہات کا سب سے پرجوش مضمون آبا و اجداد اور نام و نسب پر فخر و غرور تھا، جس کو چھوڑنا انکے نزدیک اپنی پرانی عزت و عظمت کی دیوار کو خود گرا دینا تھا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ میں دین حق کی منادی شروع کی تو اسکی شدت مخالفت جس بنا پر سب سے زیادہ کی گئی، وہ یہی دین آبائی کے ترک کا مسئلہ تھا، اور یہی دین جدید کے بطلان کی سب سے مستحکم دلیل انکے پاس تھی، چنانچہ قرآن مجید نے بار بار

اُن کے اس قول کو دہرایا ہے، اور اسکی لغویت کو ظاہر کیا ہے،

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ،

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے، اُسکی پیروی کرو، کہتے ہیں (نہیں) بلکہ ہم اسکی پیروی کرینگے، جس پر اپنے باپ دادا اں کو ہم نے پایا، کیا اگرچہ انکے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں" اور نہ راہ ست پر ہوں (تب بھی)

(بقرہ - ۲۱)

بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝

بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک دین پر پایا ہے، اور ہم ان ہی کے نقش قدم پر چل کر رہنمائی پائیں گے اور اسیطرح ہم نے اے پیغمبر تم سے پہلے کسی آبادی میں کوئی پیغمبر نہیں بھیجا، لیکن اسکے دولتمندوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک دین پر پایا ہے اور ہم اُن ہی کے نقش و قدم کے پیرو ہیں، کہو اے پیغمبر کیا اگرچہ میں اس دین سے جس پر تم نے اپنے بزرگوں کو پایا زیادہ سیدھا راستہ لیکر تمہارے پاس کیوں آؤں (تب بھی تم اُن ہی کی پیروی کروگے) انھوں نے کہا ہم تو

(زخرف - ۲)

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا قُلْ

اور جب کوئی بے شرمی کی بات کرتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو اسی پر پایا اور

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ أَتَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ
مَا لَا تَعْلَمُونَ (اعراف-۳)

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنْزَلَ
اللّٰهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا
وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ
لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ

(مائدہ ۱۴-۱۰۴)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ
عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُنِيرٍ
وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ
قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا
أَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطَانُ يَدْعُوهُمْ إِلَىٰ
عَذَابِ السَّعِيرِ،

لقمان-۳)

اللہ نے ہمکو اسی کا حکم دیا ہی، کہدو اے پیغمبر کہ اللہ تو
بے شرمی کی بات کا کبھی حکم نہیں دیتا، کیا تم اللہ پر وہ تہمت باندھتے ہو
اور جب ان سے کہا جاتا ہی کہ اللہ نے جو اتارا ہی اُسکے
پاس اور رسول کے پاس آؤ تو کہتے ہیں ہم نے اپنے
باپ دادوں کو جس پر پایا ہی وہی ہمکو کافی ہی کیا
ان کے باپ دادا کچھ نہ جانتے ہوں اور نہ سیدھے راستہ
پر ہوں (تب بھی وہ انہی کی پیروی کریں گے)
کچھ لوگ ایسے ہیں، جو علم و ہدایت اور روشن کتاب کے
بغیر اللہ کے بارہ میں جھگڑا کرتے ہیں، اور جب
ان سے کہا جاتا ہی کہ اللہ نے جو اتارا ہی اسکی پیروی کرو
تو کہتے ہیں، بلکہ ہم اسی کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے
اپنے باپ دادوں کو پایا، کیا اگرچہ انکو شیطان دوزخ
کے عذاب ہی کی طرف کیوں نہ بلائے (تو وہ
اسی کی پیروی کریں گے،)

کفار کے یہ سوال و جواب خود ظاہر کرتے ہیں کہ اُن کو اپنے آبائی رسوم کا چھوڑنا کس
درجہ محال نظر آتا تھا آپ نے بعثت کے تین برس بعد جب بت پرستی کی علانیہ مذمت شروع
کی تو قریش کی عدالت میں آپ پر سب سے بڑا جرم یہی قائم کیا گیا کہ یہ خاندانی دیوتاؤں کی تحقیر

بزرگوں کی توہین، اور آبائی رسم و رواج کی مذمت کرتے ہیں مکہ میں جب آپ نے علی الاعلان لوگوں کو اسلام کی دعوت دی اور بہت سے نیک لوگوں نے دعوت پر لبیک کہا، تو قریش کے بڑے بڑے رئیسوں نے ابو طالب کے پاس جاکر آپ کے خلاف جو الزامات قائم کئے، وہ یہ تھے، اے ابو طالب! تمہارا بھتیجا ہمارے دیوتاؤں کو برا کہتا ہے، ہمارے مذہب کی توہین کرتا ہے ہمکو بیوقوف اور نادان کہتا ہے، اور ہمارے باپ دادوں کو گمراہ بتاتا ہے، تو یا تو تم اس کو روکو یا ہم کو اور اس کو چھوڑ دو کہ باہم سمجھ لیں۔"

یہ ان کی عدالت کا پہلا مطالبہ تھا، ابو طالب نے اُن کو سمجھا بجھا کر واپس کیا، تو کچھ دنوں کے بعد انھوں نے پھر اپنا مطالبہ ان الفاظ میں پیش کیا، "اے ابو طالب! تم نے اپنے بھتیجے کو ابتک منع نہیں کیا، اب خدا کی قسم ہم اپنے بزرگوں کی برائی اپنی نادانی اور اپنے دیوتاؤں کی ہجو نہیں سن سکتے تو یا تو اسکو باز رکھو اور یا ہم سے لڑنے پر آمادہ ہو جاؤ۔" اس اعلانِ جنگ سے کام نہ چلا تو وہ تیسری دفعہ ابو طالب کے پاس جاتے ہیں، اور کہتے ہیں "اے ابو طالب! ابو لہب کا بیٹا عمارہ کیسا خوشرو جوان ہے، تم اسکو متبنیٰ بنا لو اور اپنے بھتیجے کو قتل کے لئے ہمارے حوالہ کر دو کہ اس نے تمہارے اور تمہارے بزرگوں کے دین و مذہب کی مخالفت کی ہے تمہاری قوم کی جماعت کو پراگندہ کر دیا ہے۔ اور اُن کو بیوقوف اور نادان کہتا ہے، سب سے آخری دفعہ قریش کے رئیسوں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مل کر گفتگو کی اور کہا کہ اے محمد! تمہارے سوا کسی قوم میں ایسا آدمی نہیں ملا، جو اپنی قوم پر وہ مصیبت لایا ہو، جو تم لائے ہو، تم نے باپ دادوں کو برا کہا، ہمارے مذہب کی تحقیر کی، دیوتاؤں کو گالی دی، ہمکو بیوقوف اور نادان بنایا اور جماعت میں تفرقہ

ڈالا غرض کوئی برائی نہ تھی جو تم نے ہمارے ساتھ نہیں کی،[1]

ان الزامات کی فہرست کی ایک ایک دفعہ پڑھو، معلوم ہوگا کہ آبائی دین، موروثی رسم و رواج، اور خاندانی دیوتاؤں کی غلامی سے آزاد ہونا ان پر کتنا بار تھا؟ اور وہ اس جرم کو کتنا سنگین سمجھتے تھے موسم حج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب لوگوں کے پاس جا جا کر توحید کا پیغام سناتے تھے، تو ابولہب آپ کے اثر کو باطل کرنے کے لیے آپ کی تقریر کے بعد آپ کے پیچھے پیچھے صرف یہ کہتا جاتا تھا، لوگو! یہ وہی ہے جو تمکو تمہارے باپ دادوں کے مذہب سے برگشتہ کرتا پھرتا ہے،[2]

ابو طالب جنھوں نے ہر موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کی تھی، اور وہ آپ کو اپنے جان و دل سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، وہ بھی آپ کی دعوتِ حق کو اپنے دینِ آبائی کے مقابلہ میں پذیرائی کے قابل نہ سمجھے، بھتیجے نے بار بار کہا "چچا جان! کلمۂ شہادت ایک دفعہ پڑھ لیجئے کہ قیامت میں آپ کی شفاعت کی ایک سند مجھے ہاتھ آجائے" ابو طالب نے جواب دیا "جانِ برادر! سب کچھ تم پر نثار لیکن بزرگوں کے مذہب کو نہیں چھوڑ سکتا" عین اس وقت جب ابو طالب دنیا سے رخصت ہو رہے تھے، اور نزع کی حالت تھی، آپ اُن کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ "چچا جان آپ تو لا الٰہ الا اللہ کہہ دیجئے کہ میں خدا کے ہاں آپ کے ایمان کی شہادت دوں" ابو جہل اور عبد اللہ بن امیہ نے جو ان کے پاس بیٹھے تھے کہا "ابو طالب کیا تم (اپنے باپ) عبد المطلب کے دین سے پھر جاؤ گے" آپ بار بار لا الٰہ الا اللہ پڑھنے کی درخواست کرتے تھے، اور یہ دونوں انکو وہی عبد المطلب کے دین سے علیحدگی پر شرم دلاتے تھے، بالآخر ابو طالب نے یہی کہا کہ میں عبد المطلب کے دین پر مرتا ہوں،

---

[1] یہ تمام واقعات ابن اسحٰق اور سیرۃ کی تمام کتابوں میں بتفصیل مذکور ہیں [2] مستدرک حاکم ج ۱ ص ۱۵ کتاب الایمان

اور لاالہ الا اللہ نہیں کہا، یہ صحیح بخاری کی روایت ہے[1]، صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے کہ ابو طالب نے کہا کہ "بھتیجے! جو فقرہ تم کہتے ہو میں کہکر تمھاری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا، لیکن قریش کہیں گے کہ ابو طالب موت سے ڈر گیا[2]"، ابن اسحٰق میں ہے کہ انھوں نے آہستہ آہستہ وہ فقرہ کہدیا[3]، بہرحال اس واقعہ سے جو دکھانا ہے، وہ یہ ہے کہ اس حالت میں بھی مخالفین کے پاس اسلام سے باز رکھنے کیلئے اس سے زیادہ پر زور اور پُر اثر دلیل نہ تھی کہ ابو طالب کیا آبائی مذہب کو چھوڑ دوگے"؟ اس سے معلوم ہوگا کہ اسلام کی اشاعت کے راستہ میں یہ تخیل کتنا بڑا پتھر تھا

توہم پرستی عرب کی اصلاح و ہدایت کی راہ میں ایک اور عائق عرب کی توہم پرستی تھی، ہر قوم میں جاہلوں کا جس طرح یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ فلاں بُرا بولا یا فلاں پیر کے خلاف اگر کچھ زبان سے نکلا، تو فوراً بلائیں آکر ہم کو لپٹ جائیں گی عرب میں گھر گھر سینکڑوں بت اور انسیوں صنم خانے تھے، دنیا کے تمام کام ان ہی اصنام اور بتوں سے متعلق سمجھے جاتے تھے، مدتوں سے یہ خیال راسخ چلا آتا تھا کہ فلاں بت کی پرستش یا خدمت گذاری میں اگر کوتاہی کی گئی تو آسمان سے پانی برسنا بند ہو جائیگا، فرزند نرینہ پیدا نہ ہوگا، باغوں میں پھل نہ آئیں گے، اسی بنا پر اسلام کے نام سے ان کو لرزہ آتا تھا، اور یہ تخیل صرف اسی وقت پیدا نہیں ہوا تھا، بلکہ ایک مدت سے عرب میں چلا آتا تھا، حضرت ہودؑ کی دعوت کے جواب میں ثمود نے کہا،

اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ — ہم تو اس کے سوا کچھ اور نہ کہیں گے کہ ہمارے

---

[1] کتاب جنائز، باب اذا قال المشرک عند الموت لا الہ الا اللہ [2] صحیح مسلم کتاب الایمان باب ۹،

[3] ابن ہشام، وفاتِ ابی طالب۔

اٰلِهَتُنَا بِسُوْٓءٍ[1] (ھود-۵) کسی دیوتا نے تمکو ستایا ہے،

ابتداءً جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتوں کے خلاف وعظ کہنا شروع کیا، تو اکثر لوگوں نے (نعوذ باللہ) پاگل سمجھ لیا[2]، جاہلیت کے زمانہ کے بعض کافر احباب ہمدردی کی راہ سے جھاڑ پھونک کرنے آئے[3]، ضمام بن ثعلبہؓ ایک صحابی تھے، وہ مسلمان ہو کر اپنے قبیلہ میں جب واپس گئے اور لات وعزیٰ کی مذمت شروع کی تو تمام قبیلہ خوف سے کانپ گیا کہ ضمام انکو برا نہ کہو، دیکھو کہیں تمکو برس، جنون یا جذام نہ ہو جائے[4]" حضرت زنیرہؓ مسلمان ہونے کے بعد بصارت سے محروم ہو گئی تھیں کفار نے کہنا شروع کیا کہ "لات وعزیٰ ان کو اندھا کر دیا ہے[5]، حضرت طفیلؓ بن عمرو دوسی مسلمان ہو کر جب اپنے وطن تشریف لے گئے، اور اپنی بیوی کو اسلام کی دعوت دی تو انھوں نے کہا دیکھو دوالشری (بت) کہیں برباد نہ کر دے[6]"

فتح مکہ کے بعد جبکہ دیوتاؤں کے زور و قوت کا راز افشا ہو چکا تھا، اور اکثر قبائل نے اسلام قبول کر لیا تھا، تاہم لات، عزیٰ، مناۃ، ذی الکفین، سواع کے بتخانوں کو وہ اپنے ہاتھ سے نہ توڑ سکے، خاص مدینہ سے راسخ الایمان مسلمان بھیجے گئے، جنھوں نے اس فرض کو انجام دیا، پوجاریوں نے کوئی مزاحمت نہ کی، وہ سمجھتے تھے کہ ان دیوتاؤں کو کون توڑ سکتا ہے، جو اس گستاخی کا ارادہ کریگا، وہ خود تباہ و برباد ہو جائیگا[7]

---

[1] ابن کثیر، زمخشری، ابن حبان، بغوی وغیرہ تمام مفسرین نے لکھا ہے [2] دیکھو تفسیر آیہ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ونیز مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ [3] صحیح مسلم باب تخفیف الصلوٰۃ والخطبہ [4] مسند دارمی کتاب الصلوٰۃ [5] اسد الغابہ ترجمہ حضرت زنیرہؓ و سیرۃ ابن ہشام ذکر مستضعفین مسلمین [6] اسد الغابہ ذکر طفیل بن عمرو دوسیؓ [7] ابن سعد و طبری ذکر ہدم اصنام،

توہم پرستوں میں کسی مذہب کی صحت و بطلان کی دلیل شواہد عقلی نہیں، بلکہ دنیا کے ظاہری مادی فوائد اور جانی و مالی خیر و برکت ہوتی ہے، لیکن قوانین گاہ عالم میں ایک مذہب پرست بھی اسی طرح آلام و مصائب میں گرفتار ہو سکتا ہے، جس طرح ایک غیر مسلمان عرب کے بدو اور اعراب ابتداءً مسلمان ہونے کی ہمت بھی کرتے تھے، تو معاً یہ توقع بھی کر لیتے کہ اب وہ ہر قسم کے آفاتِ ارضی و سماوی سے محفوظ ہیں، اس بنا پر اگر کبھی ان کی اس توقع کو صدمہ پہنچتا تو دفعۃً وہ متزلزل ہو جاتے تھے، صحیح بخاری کتاب التفسیر میں ہے[1]،

کان الرجل یقدم المدینۃ فان	باہر کا جو شخص مسلمان ہو کر مدینہ آتا تھا، اسکی
ولدت امرأتہ غلاما ونتجت	یہ حالت تھی کہ اگر اسکی بیوی لڑکا جنتی اور اسکی
خیلہ قال ھذا دین صالح وان	گھوڑی بچہ دیتی تو وہ کہتا کہ یہ نہایت عمدہ مذہب ہے
لم تلد امراتہ ولم تنتج خیلہ،	لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کہتا کہ یہ نہایت برا
قال ھذا دین سو ء	مذہب ہے،

قرآن مجید کی یہ آیت اسی قسم کے لوگوں کی شان میں نازل ہوئی ہے[2]،

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ	اور بعض لوگ وہ ہیں جو خدا کی بندگی کنارہ کھڑے ہو کر
فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ	کرتے ہیں، (یعنی دل سے نہیں کرتے) اگر انکو فائدہ
وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۨ انْقَلَبَ عَلٰى	پہنچا تو انکو اطمینان ہو جاتا ہے، لیکن اگر مبتلائے
وَجْهِهٖ (حج - ۳)	مصیبت ہوئے تو فوراً روبرگشتہ ہو جاتے ہیں،

[1] تفسیر سورۂ حج جلد ثانی ص ۶۹۴ [2] صحیح بخاری تفسیر سورہ حج،

ہجرت کے بعد جب مسلمان مدینہ آئے اور اتفاق سے ایک عرصہ تک کسی مسلمان گھرانے میں کوئی لڑکا نہ پیدا ہوا تو دشمن اس واقعہ کو اپنی بددعاؤں کا نتیجہ سمجھتے تھے اور خوش ہوتے تھے آخر چھ مہینے کے بعد عبداللہ بن زبیرؓ پیدا ہوئے تو مسلمان بے انتہا مسرور ہوئے[1] سو، اتفاق یہ کہ اوّل اوّل جو لوگ مدینہ میں آتے تھے، ان کو وہاں کی آب و ہوا راس نہیں آتی تھی، ابتدائے ہجرت میں جب حضرت ابوبکرؓ و حضرت بلالؓ آئے تو سخت بیمار ہوگئے[2]، حضرت طفیل بن عمرؓ دوسی نے جب مدینہ کو ہجرت کی تو ان کو بھی مدینہ کی آب و ہوا ناموافق ہوئی، اگرچہ مخلصین اور ارباب فہم پر اس قسم کی عارضی ناگواریوں کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا، تاہم عام لوگ جن کی وہم پرستی فطرتِ ثانیہ ہوگئی تھی، وہ اس قسم کے اتفاقی واقعات سے بیحد متاثر ہوتے تھے، چنانچہ جب عکل و عرینہ کے چند لوگوں نے مدینہ میں آکر اسلام قبول کیا، اور آب و ہوا کی ناموافقت کے سبب سے بیمار ہوگئے[3] اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تبدیلِ آب و ہوا کی غرض سے انکو اونٹوں کی چراگاہ میں بھیج دیا، تو گو وہ صحیح ہوگئے، تاہم مرتد ہوگئے[4]، اسی طرح ایک بدو نے آکر آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کی، لیکن سو اتفاق سے دوسرے دن بخار میں مبتلا ہوا، تو اپنی بیعت توڑنی چاہی، آپ نے تین بار منع فرمایا، لیکن اس کے اصرار سے آخر بیعت فسخ کر دی، اور فرمایا[5]،

المدینۃ کالکیر تنفی خبثھا و — مدینہ آگ کی بھٹی ہے جو میل کو الگ کر دیتا ہے،

---

[1] مستدرک حاکم جلد ۳ و اصابہ ذکر عبداللہ بن زبیرؓ [2] صحیح بخاری کتاب المرضی و باب مقدم النبی صلعم المدینہ، [3] صحیح مسلم کتاب الایمان [4] صحیح بخاری کتاب المحاربین [5] بخاری جلد ۱ ص ۲۵۳، کتاب الحج فضائل مدینہ، و باب اعتصام السنۃ،

تنصع طیبا، اور حقیقی جوہر کو خالص کر دیتا ہے،

ان ہی اسباب کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے متعلق یہ دعا فرمائی،

اللھم حبب الینا المدینۃ کحبنا مکۃ او اشد، اللھم وصححھا وبارک لنا فی مدھا وصاعھا وانقل حماھا فاجعلھا بالجحفۃ[1]

خداوندا! مکہ کی طرح یا اس سے زیادہ ہمارے لئے مدینہ کو محبوب بنا دے، اس کو امراض سے صحیح کر دے، اس کے پیمانے میں برکت دے، اور اس کے بخار کو جحفہ میں منتقل کر دے،

قبائل کی خانہ جنگیاں اسلام کی اشاعت کا ایک بڑا مانع عرب کی باہمی خانہ جنگیاں تھیں جو عرب کے خصائص قومی کا عنصر اعظم بن گئی تھیں، یہ خانہ جنگیاں ہزاروں برس سے چلی آتی تھیں اور ان کی وجہ سے قبائل میں ایسے مستمر اور ثابت الاساس انتقامی جذبات پیدا ہو گئے تھے جن کا مٹنا قریباً محال تھا، ان ہی لڑائیوں نے ثار (انتقام خون) کی رسم پیدا کر دی تھی، جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، یہ رسم ایسی سخت اور شدید الاثر تھی کہ ایک شخص کے خون کیلئے قبیلہ کا قبیلہ مٹ جاتا تھا، ہزاروں برس کے خون قومی قرض کی طرح باقی چلے آتے تھے، جو درج بہ جیسٹر ہوتے رہتے تھے اور بچہ بچہ کی زبان پر ہوتے تھے، جو بچہ پیدا ہوتا تھا، وہ ہوش سنبھالنے کے وقت سب سے پہلے ثار کا لفظ سنتا تھا یعنی خاندان میں فلاں شخص قتل کیا گیا ہے، اور اس کا خون کا انتقام ابتک باقی ہے، اس لئے بچہ بچہ کا نصب العین ابتدائے زندگی سے یہی ثار ہوتا تھا،

اس بنا پر ایک شخص یا ایک خاندان جس خلوص اور عقیدت مندی کیساتھ اسلام کی طرف

[1] صحیح بخاری مقدم النبی صلعم المدینۃ،

جھکتا تھا، معاً اسی زور اور قوت کے ساتھ دوسرا فریق اسلام کی مخالفت اور اس سے سرکشی پر آمادہ ہو جاتا تھا، مکہ میں اسلام کی مخالفت کا صرف یہی راز تھا کہ خدا نے نبوت کیلئے ہاشم کا گھرانہ چن لیا تھا، بنی امیہ کی مخالفت اس کے لئے لامحالہ ہونی تھی،

مدینہ میں اوس و خزرج دو قبیلے تھے، اسلام سے پہلے دونوں لڑ لڑ کر تھک گئے تھے، اسلام کی آواز آئی تو گو دونوں نے ایک ساتھ لبیک کہا، تاہم قبیلہ اوس کا ایک ایک فرد اگر ہمہ تن اخلاص و جوش تھا، تو خزرج میں بیسیوں منافق تھے، انتہا یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں ہجرت سے پہلے دونوں قبیلوں کی نماز کی امامت کیلئے باہر سے ایک تیسرے قبیلہ کا آدمی بلوایا گیا تھا کہ خدا کے سامنے بھی ایک کو دوسرے کے پیچھے کھڑے ہونے سے عار تھا[1]،

خزاعہ اور بنو بکر باہم شدید دشمن تھے، اور ان میں باہم پرانی عداوت چلی آتی تھی، مدینہ آنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو صلح کا پیام اور اسلام کی دعوت دی، خزاعہ نے اسلام کی دعوت قبول کی، اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بنو بکر قریش کے حلیف بن گئے،

خوب غور کرو، انصار اسلام لاکر ہمہ تن نیکوکار می اور پاکیزہ نفسی کے پیکر بنگئے لیکن تار کے جذبات کس طرح آسانی سے دفعۃً مشتعل ہو جاتے تھے، ایک موقع پر ایک یہودی نے جنگ بعاث کا تذکرہ چھوڑ دیا، تو انصار کے دونوں قبیلوں اوس خزرج کی تلواریں میان سے نکل آئیں[2] اور بڑی مشکل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انکے جوش کو فرو کیا،

---

[1] ابن ہشام ذکر بیعت عقبہ [2] اصابہ جلد ۱، مطبوعہ مصر، صفحہ ۸۸، معجم صغیر طبرانی میں بھی ایک اور اسی قسم کا واقعہ مذکور ہے، معجم عبداللہ،

حضرت عایشہؓ کے واقعۂ افک میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر کھڑے ہو کر اس کی شکایت کی اور حضرت سعد بن معاذؓ نے کہا یا رسول اللہ اگر وہ (تہمت لگانے والا) ہمارے قبیلہ کا ہے، تو میں اس کی گردن اڑا دیتا ہوں اور اگر ہمارے بھائی خزرج کے قبیلہ سے ہے تو آپ حکم دیں میں بجا لاؤنگا"، اس پر سعد بن عبادہؓ جو قبیلہ خزرج کے رئیس تھے دفعۃً کھڑے ہو گئے اور کہا،

کذبت لعمر اللہ لا تقتلہ ولا	خدا کی قسم تو جھوٹ کہتا ہے تو اسکو قتل نہ کریگا
تقدر علی قتلہ ولو کان من	نہ کر سکتا ہے، اور وہ شخص اگر تیرے قبیلہ کا ہوتا
رھطک ما احببت ان یقتل	تو تو اس کا قتل کیا جانا پسند نہ کرتا،

اس پر اوس اور خزرج دونوں قبیلوں کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے، یہانتک کہ قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے، چنانچہ صحیح بخاری حدیث افک میں ہے،

فثار الحیان الاوس والخزرج حتی	پس دونوں قبیلے اوس اور خزرج مشتعل ہو گئے
ھموا ان یقتتلوا ورسول اللہ	یہانتک کہ دونوں کشت و خون پر آمادہ ہو گئے،
قائم علی المنبر	اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسوقت منبر پر کھڑے تھے،

ایک بار محلم بن جثامہ لیثی نے عہد اسلام میں قبیلہ اشجع کے ایک شخص کو قتل کر ڈالا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مقدمہ پیش ہوا، قاتل کے تعلقات کی بنا پر عیینہ نے مقتول ابن رفیع ابن حابس نے قاتل کی طرف سے وکالت کی بات بڑھی، اور سخت شور و شغب ہوا تو آپ نے عیینہ سے فرمایا" دیت کیوں نہیں قبول کر لیتے"، اس نے کہا خدا کی قسم اسوقت تک دیت قبول

لہ صحیح بخاری کتاب المغازی باب حدیث الافک،

کرونگا جبتک اسکی بیویوں کو اسقدر نہ ستالوں جسقدر اُس نے ہماری بیویوں کو ستایا ہے"۔ اس پر اور شور وغل ہوا۔ آپنے پھر بھی الفاظ فرمائے اور عیینہ نے وہی پہلا جواب دیا، چونکہ یہ اسلام کا ابتدائی زمانہ تھا، اور قتل کا یہ پہلا مقدمہ تھا، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا تھا، اسلئے قبیلۂ بنولیث کے ایک شخص نے جو مسلح کھڑا تھا، کہا کہ "ابتدائے اسلام میں اس واقعہ کی مثال بکری کے اس ریوڑ کی سی ہے کہ اسکے پہلے حصہ کو تیر مارا گیا تو دوسرا بدک کے بھاگ گیا، یعنی اگر قاتل کے موافق فیصلہ کیا گیا تو لوگ سمجھیں گے کہ اسلام قصاص کو دیت سے بدل دینا چاہتا ہے، اور چونکہ دلوں میں ابتک انتقام کے جذبات تازہ ہیں، اور لوگ دیت لینا پسند نہیں کرتے، اس لئے ان کو اسلام کے قبول کرنے میں تامل ہوگا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ سفر میں تھے، اس لئے دیت میں ۵۰ اونٹ اسی وقت دیئے اور مدینہ پہنچکر ۵۰ اونٹ کا عدد[1] فرمایا،

اہل عرب میں یہ جذبہ اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ گو آپنے فتح مکہ میں امن عام کی منادی کر دی، اور تلواروں کے میان میں کر لینے کا حکم دیدیا، تاہم انتقام کا جوش ابتک تازہ تھا، قبیلۂ ہذیل کا ایک شخص اسلام لانے کی غرض سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا رہا تھا، اس نے زمانۂ جاہلیت میں قبیلہ خزاعہ کا کوئی جرم کیا تھا، اور وہ لوگ انتقام کے لئے اسکو ڈھونڈھ رہے تھے، سو اتفاق سے وہ راہ میں مل گیا، اور اُن لوگوں نے اسکو فوراً قتل کر دیا، کہ اگر بارگاہِ نبوت میں پہنچ گیا، تو پھر اس کا موقع ہاتھ نہ آئیگا، آپ کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو سخت برہم ہوئے، اُن لوگوں نے حضرت عمرؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت علی رضی اللہ عنہم سے سفارش کی درخواست،

---

[1] ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۱۵۵ کتاب الدیات،

کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بعد ایک خطبہ دیا، جس کے الفاظ یہ تھے:۔

"خدا نے مکہ کو دار الحرم بنایا ہے آدمیوں نے نہیں بنایا ہے، خدا نے کل چند گھنٹوں کے لئے اسکو میرے لئے حلال کر دیا تھا، لیکن آج اس کی قدیم حرمت دوبارہ لوٹ آئی ہے اور خدا کے سب سے نافرمان بندے تین آدمی ہیں، ایک وہ جس نے حدود حرم میں کسی کو قتل کیا، دوسرا وہ جس نے اپنے قاتل کے سوا کسی دوسرے شخص کو مار ڈالا، تیسرا وہ جس نے زمانۂ جاہلیت کا انتقام لیا، تم نے جس شخص کو قتل کر ڈالا ہے، میں اسکی دیت دونگا"

چنانچہ آپ نے اس کی دیت ادا فرمائی،

بنو ثعلبہ کے ایک آدمی نے جاہلیت میں اوس و خزرج کے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا، بنو ثعلبہ اسلام لاکر جب مدینہ آئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے، ایک انصاری بے اختیار چلا اٹھے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہمارے مجرم ہیں، ان سے قصاص دلوائیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ اٹھا کر فرمایا لا یجنی والد علی ولدہ[۲] یعنی لڑکے کے جرم کا بدلہ باپ سے نہیں لیا جائیگا،

ان واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ثار کا جذبہ کس طرح رگ رگ میں سرایت کر گیا تھا، اور اس جذبہ کا مشتعل ہو جانا کس قدر آسان ہوتا تھا،

خانہ جنگیوں پر ختم نہیں، یوں بھی تمام قبائل رقیب و حریف مقابل تھے، اور مختلف قبیلوں کے آدمیوں میں کسی ذاتی معاملہ پر بھی نزاع ہو جاتی تھی، اور ان میں کوئی

---

[۱] مسند امام احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۳۱۲ [۲] دار قطنی جلد ۲ صفحہ ۲۰۸،

اپنے قبیلہ کا نام پکارتا تھا، تو قومی جنگ کا سامان ہوجاتا تھا، ایک دفعہ ایک مہاجر نے ایک انصاری کو تھپڑ مار دیا، انصاری نے یا للانصار (انصار کی دہائی) پکارا، مہاجر نے بھی یا للمہاجرین (مہاجرین کی دہائی) لگائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی، آپ نے نکل کر فرمایا کہ یہ کیا جہالت کی پکار ہے،

مابال دعوی الجاهلية[1] — یہ کیا جہالت کا دعویٰ ہے،

لوگوں کو معلوم تھا کہ اسلام اس فعلِ شنیع کا سخت دشمن ہے، اسلئے جب تک وہ انتقام نہ لے لیتے ان کو اسلام لانے میں تامل ہوتا تھا، عمرو بن امیہ ایک صاحب تھے، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام سے متاثر اور اس کے قبول کرنے کیلئے ہر طرح آمادہ تھے، لیکن ایک عائق تھا جو اس راہ میں حائل تھا، یعنی ثار، وہ جانتے تھے کہ اسلام لاکر اس خاندانی فرض ادا کرنے کی ان کو اجازت نہیں مل سکتی، ابن مندہ نے انکے حال میں لکھا ہے،

وكان له ثار في الجاهلية — انکا انتقام زمانۂ جاہلیت میں باقی رہ گیا تھا

فكره ان يسلم حتى يأخذه[2] — وہ نہ لے لیں انھوں نے مسلمان ہونا پسند نہ کیا،

اسی طرح حضرت عمرو بن مالکؓ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اسلام لاکر اپنے قبیلہ میں واپس گئے اور اسلام کی دعوت دی تو قبیلہ والوں نے کہا، بنو عقیل پر ہمارا ثار (انتقام) باقی ہے، وہ لے لیں تو اسلام لائیں، چنانچہ انھوں نے اسی وقت بنو عقیل پر جو مسلمان ہوچکے تھے حملہ کیا، اور اس فرض سے سبکدوش ہوئے،[3]

سیاسی مشکلات | جہالت، وحشت، پابندیٔ رسوم، آبائی اثر وغیرہ وغیرہ ان میں سے ایک چیز بھی مانع

[1] صحیح بخاری جلد ۱ ص ۴۹۰ ذکر تہی دعوت جاہلیہ [2] اسد الغابہ ص ۵۰۸ ج ۴ [3] اصابہ فی احوال الصحابہ ذکر عمرو بن مالکؓ

اصلاح نہ ہوئی، تاہم صرف سیاسی اسباب ایسے جمع تھے کہ قریش بادیگر قبائل عرب کبھی اسلام کے آگے سر نہیں جھکا سکتے تھے، مکہ میں دو خاندان برابر کے رقیب تھے، امیہ اور ہاشم اور آنحضرتؐ کی بعثت سے پہلے امیہ کا پلہ ترجیح علانیہ گراں ہو چکا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نبوت کا اظہار کیا، تو سب سے پہلے امیہ کے خاندان نے سرکشی کی، اور فتح مکہ تک یہی خاندان تھا، جو تمام لڑائیوں اور معرکہ آرائیوں کا علمبردار تھا، بنو امیہ کے بعد اور دوسرے جو خاندان بھی تھے اور جو حرم کے مناصب دربانہ (رفادہ وغیرہ) کے ممتاز حصہ دار تھے، اُن میں سے ہر ایک کچھ رہا تھا، کہ اس جدید انقلاب میں ان فوائد اور اقتدار کا بالکل خاتمہ ہے، ابو جہل سے جب ایک شخص نے کہا کہ "محمد کی دعوتِ اسلام کی نسبت تمہاری کیا رائے ہے؟" تو اس نے صاف کہا کہ میں کیا کہوں، محمدؐ کے خاندان نے عزت و شرف میں برتری کا دعویٰ کیا اور ثبوت میں دعوتیں کھلائیں، اسکے جواب میں ہم نے اسی شان کی دعوتیں دیں، انھوں نے خون بہا دیئے ہم نے بھی دیئے انھوں نے زر پاشیاں کیں ہم نے بھی کیں ہم دونوں دوش بدوش چلے تھے، کہ دفعۃً ان کی طرف سے یہ دعویٰ پیش ہوا کہ ہمارے خاندان میں نبوت اور آسمان سے وحی بھی آگئی، اب ہم کہاں تک برداشت کریں خدا کی قسم ہم کبھی محمدؐ پر ایمان نہیں لا سکتے[1] یہی ابو جہل جب انصار کے ہاتھ سے قتل ہوا تو اس نے مرتے وقت حسرت سے کہا کہ کاش مجھکو کاشتکاروں کے سوا، کسی اور قوم نے قتل کیا ہوتا[2]،

خوب غور سے دیکھو بدر، اُحد، حمراء الاسد، احزاب وغیرہ تمام لڑائیوں میں یہی اموی عنصر تھا، جو کام کر رہا تھا، قریش کے قبیلہ سے باہر جو بڑے بڑے قبیلے تھے، مثل غطفان اور اسد

---

[1] ابن ہشام حصہ اول ص ۱۰۰ مطبوعہ مصر طبع اول [2] صحیح بخاری واقعہ بدر،

وغیرہ وہ یا اہلِ مکہ کے خاندان کی کوئی شاخ تھی یا قریش کے حلیف و ہمعہد تھے، خیبر میں یہود تھے جو قوم کے لحاظ سے قریش سے الگ تھے، لیکن عرب تجارتی حیثیت سے تمامتر ان ہی یہودیوں کے زیر بار تھے انہی سے قرض دام لیتے تھے، انہی کے ہاں مال و متاع رہن رکھتے تھے[1] خیبر اور غطفان ایک مدت دراز سے باہم حلیف تھے اسطرح مکہ سے لیکر خیبر اور نجد تک تمام عرب ایک سلسلۂ اتحاد میں مربوط تھا،

کعبہ تمام عرب میں قبلہ گاہِ اعظم تھا، ہر سال تمام ملک حج کرنے کیلئے آتا تھا، اور آستانۂ کعبہ پر سر جھکاتا تھا، کعبہ کے مجاور معمولی پنڈوے نہ تھے، بلکہ خیمہ و خرگاہ، تیغ و سپر، جاہ و حشم غرض ریاست و امارت کے تمام سروسامان رکھتے تھے، اسلئے تمام عرب میں انکی شہنشاہی قائم تھی، یہی بات ہے کہ جب تک مکہ فتح نہیں ہوا، اسلام کو چین نصیب نہ ہو سکا، لیکن اسلام کی مخالفت صرف قریش کی متابعت تک محدود نہ تھی، بلکہ بڑا سبب یہ تھا کہ اسلام سے خاص قریش کو جو نقصان پہنچ سکتا تھا، براہ راست وہی تمام رؤسائے قبائل کو پہنچتا تھا، عرب کا ملکی نظام یہ تھا کہ تمام ملک میں قبائل پھیلے ہوئے تھے اور ہر قبیلہ کا ایک رئیسِ اعظم ہوتا تھا، جو تمام قبیلہ پر حکمراں ہوتا تھا، اور مالِ غنیمت سے چوتھ وصول کرتا تھا جس کو مرباع کہتے تھے، اسکے علاوہ غنائم میں سے جو عورت، یا اور کوئی عمدہ چیز اسکو پسند آئی تھی، اس کو چھانٹ لیتا تھا، اسکا نام صفی تھا، یہ گویا چھوٹی چھوٹی حکومتیں تھیں، جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھیں، یہ ریاست خاندانی اصول پر چلتی تھی، باپ کے مرنے کے بعد بیٹا رئیس منتخب ہوتا تھا، قبیلہ کے تمام معاملات، ذاتی نزاعیں قضا یا خونبہا کے فیصلے سب رئیس کے ہاتھ میں فیصل ہوتے تھے، یہ رؤسائے عام قوم سے بہت

[1] طبری واقعہ خیبر،

حقوق میں ممتاز ہوتے تھے،

قبائل میں یہی امتیاز مراتب تھا کہ جو قبائل زیادہ شریف مانے جاتے تھے انمیں سے ایک آدمی کو اگر کوئی دوسرا قبیلہ قتل کر دیتا تھا، تو اس کا خون دوسرے قبیلہ کے دو خون کے برابر سمجھا جاتا تھا، اور اس لئے ایک کے بدلہ میں دو کو قتل کرتے تھے، یہ امتیاز اور فرقِ مراتب اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ جب غزوۂ بدر میں قریش کی فوج میں سے عتبہ وشیبہ میدان میں آئے اور مبارز طلب ہوئے اور انصار انکے مقابلہ کو نکلے، تو عتبہ نے اس بنا پر اُن کے مقابلہ سے انکار کر دیا کہ قریش اور انصار کا جوڑ نہیں،

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جبلہ بن الایہم خاندانِ غسان کا اخیر فرمانروا اسلام لایا اور مکہ میں آیا، ایک دن طواف میں اسکی چادر کسی شخص کے پاؤں کے نیچے آگئی، جبلہ نے اسکے گال پر تھپڑ کھینچ مارا، اس نے بھی برابر کا جواب دیا، جبلہ نے حضرت عمرؓ کے پاس جاکر شکایت کی حضرت عمرؓ نے واقعہ سنکر کہا اس کا کیا قصور ہے، تم نے جو کیا اس کی جزا پائی، جبلہ نے کہا میرا یہ رتبہ ہے کہ کوئی مجھ پر ہاتھ اٹھاتا تو قتل کر دیا جاتا، حضرت عمرؓ نے کہا کہ ہاں زمانۂ جاہلیت میں یہی قاعدہ تھا، لیکن اسلام نے اس کا خاتمہ کر دیا، جبلہ نے کہا جو مذہب شرفاء کو ذلیل کردیتا ہے، میں اس سے باز آتا ہوں، یہ کہکر چوری سے روم چلا گیا اور عیسائی ہو گیا،

عرب کا ہر رئیسِ قبیلہ درحقیقت جبلہ تھا، اور اسلام قبول کرنے کے وقت اسکو یہی منظر نظر آتا تھا، اسلام ان تمام واقعات اور خصوصیات کو مٹاتا تھا، اسکے دربار میں شاہ وگدا، رئیس وعامی، شریف وحقیر کا ایک درجہ تھا، اسلئے عرب میں تمام وہ سب قبائل کو صاف

نظر آتا تھا، کہ اسلام کا پھیلنا، اُن کے ہر قسم کے فخر و امتیاز کا مٹ جانا تھا،

عرب میں ایک دوسری حریف طاقت یہودیوں کی تھی، جو حجاز سے لیکر شام کے دروازوں تک پھیلے تھے، ان کے ہاتھ میں بڑے بڑے مضبوط قلعے تھے، فن جنگ سے واقف تھے، سامان و اسلحہ وافر رکھتے تھے، دولت کی بہتات تھی، باغوں اور زمینوں پر اُن کا قبضہ تھا، عرب کے تمام مادی ذرائع معاش کے وہ تنہا اجارہ دار تھے، پھر اسلام آیا تو اس طرح کہ اس نے یہودیوں کی ایک ایک بڑائی کو طشت از بام کیا، اور اُن کے مذہبی وقار کے کھوکھلے پن کو علی الاعلان ظاہر کیا، اسلئے انھیں صاف نظر آتا تھا کہ یہ نئی طاقت ملک میں جڑ پکڑ کر ان کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دے گی، چنانچہ قریظہ، بنی نضیر بنی قینقاع، اور یثرب، خیبر، فدک، تیما، وادی القریٰ وغیرہ کے یہودی زمیندار، سوداگر، مہاجن اور قلعہ نشین دل سے چاہتے تھے، کہ اس وقت کو کسی طرح ابھرنے نہ دیں، اور آخر لڑائیاں پیش آئیں اور دین توحید کے مقابلہ میں انھوں نے اہلِ شرک کا ساتھ دیکر، خندق و احزاب و غطفان کے معرکے پیش کئے، عرب کے مختلف قبیلوں اور سرحدی صوبوں پر ایران اور روم کی سلطنتیں فرمانروائی کرتی تھیں، عراق، یمن اور بحرین پر ایران کی حکومت تھی، اور حجاز کے شمالی حدود پر قیصر کا قبضہ تھا، عرب کے مختلف ہمسایہ قبیلے انہی دو میں سے کسی ایک سلطنت کی حفاظت کا دم بھرتے تھے اور یہ دونوں سلطنتیں اس بیچ کے سرحدی ملک کی ایک ایک حرکت اور جنبش پر نظر رکھتی تھیں، اسلئے اس ملک میں ایک اتنی بڑی عظیم الشان تحریک کا نمودار ہونا ان کو کسی طرح پسند نہیں آسکتا تھا، اسی لئے عرب میں اسلام کی قوت کا ان کو جب احساس ہوا تو انھوں نے اسکی دار و گیر کرنی چاہی، کسریٰ ایران نے یمن کے اپنے

ایرانی گورنر کو لکھا کہ اس نئے مدعی کو پکڑکر ہمارے سامنے حاضر کرو، اور قیصر نے تو کھلم کھلا حملہ کی تیاری ہی کر دی تھی، جس کے باعث تبوک کی فوجکشی ہوئی اور آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں کو ان دونوں ہمسایہ طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑا،

ذریعۂ معاش، اسلام لانے کا ایک بڑا مانع یہ تھا کہ عرب کا ذریعۂ معاش عموماً قافلوں پر حملہ آوری اور سلب اموال اور رہزنی تھا، اوپر ہم امالی قالی سے نقل کر آئے ہیں کہ عرب کا ذریعۂ معاش غارتگری تھا؛ اور چونکہ حج کے چار مہینوں میں جنگ و غارت سے باز رہتے ہیں انکے ذرائع معاش مسدود ہو جاتے تھے اس ضرورت سے وہ حج کے مہینوں کو ادل بدل کر لیا کرتے تھے

اندرونی عرب تمام دشت و صحرا اور بالکل ویرانہ ہے، زراعت یا تجارت کی کوئی صورت نہیں، باوجود اس کے لاکھوں نفوس آباد ہیں، اسلئے کہ غارت گری کرنی پڑی اور امتداد زمانہ سے یہ عادت ان میں راسخ ہو گئی تھی، رفتہ رفتہ ٹھگی، رہزنی، اور سرقہ تمام ملک میں پھیل گیا تھا، یہانتک کہ بڑے بڑے نامور شعرا، چور اور راہزن ہوتے تھے،

اکثر بڑے بڑے جتھے اسلئے قائم ہوتے تھے، کہ بنجارے جو ملک میں پھر کر غلہ کی تجارت کرتے تھے ان کو لوٹ لیا کریں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دومۃ الجندل پر جو سریہ بھیجا تھا اسی کے انسداد کی غرض سے بھیجا تھا، دومۃ الجندل مدینہ منورہ سے پندرہ منزل کے فاصلہ پر ہے، تاہم یہ لوگ اس قدر فاصلہ سے خود مدینہ پر چھاپہ مارنے کی تدبیر کر رہے تھے، کہ آپ کو خبر ہو گئی اور حفظ ماتقدم کیلئے خود وہاں تک گئے اور چند روز قیام کر کے ان طرار کا بندوبست کیا

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے اسلام لانے سے پہلے چند شخصوں کو قتل کر کے انکا مال

چھین لیا تھا، چنانچہ جب اسلام لائے اور اس واقعہ کا اظہار کرکے لوٹ کا مال بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا تو آپ نے فرمایا،

اما الاسلام فاقبل واما المال فلست منہ فی شیٔ (صحیح بخاری کتاب الشروط ذکر صلح حدیبیہ)

اسلام تو میں نے قبول کیا، لیکن مال سے مجھ کو کسی قسم کا واسطہ نہیں،

ایک نکتہ یہاں خاص طور پر لحاظ کے قابل ہے، حدیثوں میں جو یہ وارد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر بیعتِ اسلام کے وقت جن باتوں کا اقرار لیتے تھے، اُن میں ایک یہ بھی ہوتا تھا کہ چوری نہ کریں گے، اسکی یہی وجہ تھی کہ ان جرائم کا رواج تھا، ورنہ آج اگر شرفاء سے بیعت کے وقت یہ اقرار لیا جائے تو لوگوں کو تعجب ہوگا کہ یہ بیعت لینے کی کیا چیز ہے،

اسلام قبول کرنے کے ساتھ ان تمام جرائم سے توبہ کرنا ہوتا تھا، اسلئے عربوں کو اسلام قبول کرنے کے وقت یہ نظر آتا تھا کہ وہ تمام ذرائع معاش سے مجبور ہوجاتے ہیں، یعنی وہ قافلوں پر حملہ نہیں کرسکتے، کہیں ڈاکہ نہیں ڈال سکتے، کسی کا مال نہیں چھین سکتے، تو اب ان کے لئے کیا باقی رہ جاتا ہے،

قریش خود رہزن اور غارت گر نہ تھے، وہ شہر کی متمدن زندگی بسر کرتے تھے تاہم دیگر اسباب کے ساتھ ان کے اسلام نہ قبول کرنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ قبول اسلام کا اثر انکے وسائلِ معاش پر بھی پڑ سکتا تھا، قریش کا ذریعۂ معاش صرف ان تجارتی تعلقات تک محدود تھا جو انھوں نے باضابطہ طور پر دوسرے قبائل اور ممالک سے قائم کر رکھے تھے اور یہ تمام قبائل اور ممالک مذہبی حیثیت سے اسلام کے دشمن اور حریفِ مقابل تھے، اس بنا پر قریش کو خوف تھا کہ

کہ اگر وہ اسلام کے حلقہ میں داخل ہو جائیں گے تو دفعۃً یہ تمام تجارتی تعلقات منقطع ہو جائیں گے،
چنانچہ علامہ ابن تیمیہ بجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح (ص ۱۳۸ جلد ۴) میں امام شافعی کی روایت سے لکھتے ہیں،

قال الشافعی کانت قریش تنتاب الشام انتیاباً کثیراً وکان کثیر من معائشها منه وتاتی العراق فیقال لها دخلت فی الاسلام ذکرت للنبی صلعم خوفها من انقطاع معائشها بالتجارة من الشام والعراق اذا فارقت الکفر ودخلت فی الاسلام، وخلاف ملک الشام والعراق لاهل الاسلام فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذ هلک کسری فلا کسری بعده فلم یبق بارض العراق کسری یثبت له امر بعده وقال اذا هلک قیصر فلا قیصر بعده فلم یکن بارض الشام قیصر فاجابهم علی ما قالوا،

امام شافعی کا بیان ہے کہ قریش شام میں اکثر تجارتی حیثیت سے آمد و رفت رکھتے تھے، اور انکی معاش کا تعلق زیادہ تر اسی سے تھا، اور اس غرض سے وہ عراق میں بھی آتے جاتے تھے، تو کہا جاتا ہے کہ کہ جب قریش کے لوگ اسلام لائے تو آنحضرتؐ سے ان ذرائع معاش کے منقطع ہو جانے کا خوف ظاہر کیا، اور شام و عراق کے بادشاہوں کی اس مخالفت کا ذکر کیا جو اُن کو اہل اسلام کیساتھ تھی، اس پر آپ نے فرمایا کہ جب کسریٰ ہلاک ہو جائیگا تو پھر اسکے بعد دوسرا کسریٰ نہ ہوگا، چنانچہ عراق سے کسریٰ کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا، اور آپ نے فرمایا کہ جب قیصر ہلاک ہو جائیگا تو پھر دوسرے قیصر کا وجود نہ ہوگا، چنانچہ ارض شام میں پھر کوئی قیصر نہیں ہوا، جس کی وہاں حکومت ہو، اس لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جواب ان کے بیان کے موافق دیا ہے،

رفع شک اس موقع پر ایک غلطی کا ذکر کرنا ضرور ہے جو عام طور پر یورپ میں پھیلی ہوئی ہے، اہلِ مغرب کا خیال ہے کہ اسلام کی اشاعت کی وجہ زیادہ تر یہ ہوئی کہ اس میں عرب کی ہر قسم کی خواہشہائے نفسانی کے پورا کرنے کا سامان موجود تھا، عرب جنگ وجدل اور لوٹ مار کے شایق تھے، اسلام نے انہی چیزوں کو جہاد وغنیمت کی صورت میں بدل دیا، عرب سخت نفس پرست تھے، اسلام نے چار بیویاں اور غیر محدود لونڈیوں کی اجازت دیدی، اہلِ عرب نے اہذار زندگی سے بالکل آشنا نہ تھے، اسلام نے بھی رہبانیت کی تحقیر کی، اب کیا چیز تھی، جو اہل عرب کو اسلام سے روک سکتی تھی،

لیکن یہ خیال تمامتر غلط ہے، جہاد اور تعددِ ازدواج اور سراری کی بحث کتاب کے دوسرے حصوں آئیگی، یہاں اس قدر بیان کر دینا کافی ہے کہ جہاد یا تعدد ازدواج جو کچھ بھی تھا قدیم آزادی سے کوئی نسبت نہیں رکھتا تھا، جہاد صرف کافروں سے جائز تھا، فرض کرو بک قبیلہ نے اسلام قبول کر لیا تو اس پر کوئی شخص ہتھیار نہیں اٹھا سکتا تھا، اور اسکے مال ومتاع سے تعرض نہیں کر سکتا تھا، لیکن قدیم رسم کے لحاظ سے اتحاد مذہب کوئی روک نہ تھی، تمام قبائل بت پرستی میں متحد تھے، لیکن ہمیشہ ایک دوسرے کو لوٹتے رہتے تھے، جہاد کیلئے اور بہت سی پابندیاں تھیں جو پہلے بالکل نہ تھیں. جہاد میں صرف پاس پاس کے قبائل شریک ہوتے تھے، دور دور کے قبائل اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتے تھے، جہاد میں جو لونڈیاں گرفتار ہوتی تھیں، اُن سے اسوقت تمتع جائز ہوتا تھا، جب ایک مہینہ کی مدت گذر جائے یا اگر حاملہ ہے تو بچہ پیدا ہو چکے، لیکن اسلام سے پہلے فتح کے ساتھ ہی عورتوں کو تصرف میں لے آتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے، پہلے نکاح کیلئے تعداد کی کوئی قید نہ تھی، ایک ساتھ

آٹھ آٹھ دن دن شادیاں کرتے تھے، اب چار کی قید ہو گئی اور وہ بھی اس سخت شرط کے ساتھ کہ سب میں عدل و مساوات رہے، اسلئے یہ کہنا کہ اسلام عرب کے مرغوبات کو قائم رکھتا تھا، تمامتر غلط ہی، برخلاف اسکے عرب کی ایک ایک چیز روایات قدیمہ جہالت، عادات رسوم نفس پرستی، ہر چیز اسلام کے قبول کرنے میں مانع تھی،

ہر قوم پر جو چیز سب سے زیادہ سختی کے ساتھ حکمراں ہوتی ہی، وہ قدیم عادات اور رسوم خیالات ہیں، آج یورپ علوم و فنون اور آزادیِ خیال میں اس حد تک ترقی کر گیا ہی لیکن یہود وہ تعجب انگیز رسمیں پہلے قائم تھیں، اب بھی قائم ہیں، تعود کی وجہ سے انکی برائیاں سرے سے نظر ہی نہیں آتیں، یا آتی ہیں تو عادت کی حکومت کے مقابلہ میں آزادیِ خیال اور علوم و فنون سب عاجز ہو رہے ہیں

عرب میں جسقدر رسمیں قومی عادتیں تھیں اور جو انکی ہستی کی عناصر بن گئی تھیں اسلام ایک ایک کا دشمن تھا، تاریخی انتقام خون، حرب کے جذبات کا سب سے بڑا مظہر تھا، اسلام نے اسکو بالکل مٹا دیا، خاندانی فخر و مباہات ان کی قومی زندگی کی روح تھی جو فنا کر دیگئی، ابو سفیان رئیس العرب کو بلال (جو حبشی غلام تھے) کے ساتھ بیٹھنا پڑا، یا تو قریش کو انصار کے مقابلہ میں تلوار اٹھانے سے بھی عار تھا یا اب قریش کی لڑکیاں غلاموں (زید و سالم وغیرہ) کے گھروں میں آئیں، عکاظ وغیرہ کے میلے جہاں عرب سال کے سال جمع ہو کر اپنے مفاخر کی داستانیں سناتے تھے سب پر گئے

اسلام ایک طرف تو عرب کے تمام مفاخر کو خاک میں ملاتا تھا، دوسری طرف خود انہیں ہوائے نفس اور تفریح طبع کا کوئی سامان نہ تھا، اسلام قبول کرنے کے ساتھ پانچ وقت کی نماز گلے کا ہار بنجاتی تھی، جو آزاد مزاجوں پر سخت گراں تھی،

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ (بقرہ-۵) اور وہ (نماز) خاشعین کے سوا اوروں پر یقیناً گراں ہے،

روزہ یعنی تیس دن تک متصل کھانا پینا چھوڑ دینا کوئی آسان کام نہ تھا، زکوٰۃ ایسا سخت ٹکس تھا کہ محض اسکے ادا نہ کرنے پر حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں عام بغاوت ہو گئی، صرف حج ایک ایسا فرض تھا، جو بظاہر زندہ دلی کا سامان رکھتا تھا، لیکن اب حج وہ جاہلیت کا حج نہیں رہا تھا، طواف عریاں کی اجازت نہیں رہی تھی، بڑی دلچسپی کی چیز بُت تھے، وہ ایک ایک کرکے حرم سے نکال دیئے گئے، مقام منیٰ میں خاندانی واقعات کی رجز خوانی کا جو طریقہ چلا آتا تھا بند کر دیا گیا، یہ فرائض اور اوامر کا حال تھا، اسی کے ساتھ محرمات اور نواہی کی وہ عالمگیری تھی کہ ان کے جاہلانہ خیال کے مطابق زندگی، زندگی نہیں بلکہ زندان بن گئی تھی، زنا حرام، شراب حرام، قمار حرام، سونا، چاندی حرام، اطلس و حریر حرام، جنگ و عود حرام، تصویر حرام، بھیر زندہ دلی اور لطف زندگی کے لئے باقی کیا رہ جاتا ہے،

خوب غور سے دیکھو، تمام دیگر مذاہب نے عبادتوں میں بھی دلچسپی کا سامان رکھا ہے، یہودیوں کی نماز گا کر ادا کیجاتی ہے، پارسیوں میں زمزمہ ہوتا ہے، ہندو بھی عبادت کے وقت بھجن گاتے ہیں، اور سامنے دلفریب بُت ہوتے ہیں، لیکن اسلام میں بظاہر دلآویزی اور دلفریبی کی ایک چیز بھی نہیں،

مذکورۂ بالا واقعات کی بنا پر یورپ کا یہ اعتراض کسقدر غلط اور تمامتر بے سر و پا ہے کہ اسلام اسلئے پھیلا کہ وہ نفس پرستی کی ترغیب دلاتا، اور اس کے سامان مہیا کرتا تھا، پھر کیا تھا؟ اس کا جواب آگے آتا ہے،

تبلیغ نبویؐ

اُس کے اصول اور اُسکی کامیابی کے اسباب

تمام گذشتہ موانع، عوائق، مشکلات اور دشواریوں کی دیواریں آہستہ آہستہ ایک ایک کرکے ٹوٹتی گئیں، اسلام پھیلا، اور اس طرح پھیلا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دنیا کو چھوڑا تو تمام عرب میں ایک بھی بُت پرست نہ تھا، اس لئے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسکے اسباب کیا تھے، مخالفین کے نزدیک تو اس کا جواب صرف تلوار ہے، لیکن کارلائل[1] کے بقول نہتے اور یکہ و تنہا اسلام کے ہاتھ میں یہ تلوار کس تلوار کے زور سے آئی، ؟ لیکن واقعہ یہ ہے، کہ یہ تلوار صرف اسلام کی تبلیغی دعوت تھی، اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں اسلام کی اس طاقت کی تشریح کردینا مناسب ہے

فریضۂ تبلیغ "تبلیغ" کے لفظی معنی پیغام پہنچانے کے ہیں اور اصطلاح میں اسکے معنی یہ ہیں کہ جس چیز کو ہم اچھا سمجھتے ہیں، اس کی اچھائی اور خوبی کو دوسرے لوگوں اور دوسری قوموں اور ملکوں تک پہنچائیں، اور انکو اسکے قبول کرنیکی دعوت دیں، قرآن پاک میں تبلیغ کے

---

[1] پیروز اینڈ ہیرو ورشپ (مدّ)

ہم معنی چند اور لفظ بھی ہیں جنمیں سے ایک لفظ اِنْذَار ہے، جس کے معنی ہشیار اور آگاہ کرنے کے ہیں، دوسرا لفظ دَعْوَۃ ہے، جس کے معنی بلانے اور پکارنے کے ہیں اور تیسرا لفظ تَذْکِیر ہے، جس کے معنی یاد دلانے اور نصیحت کرنے کے ہیں، بعثت نبوی کے وقت دنیا میں دو قسم کے مذہب تھے، دو ایسے جو تبلیغی تھے یعنی عیسائیت اور بودہ مت، باقی زیادہ تر ایسے ہی تھے جو تبلیغی نہیں تھے جیسے یہودیت، مجوسیت اور ہندوئیت، جو دو تبلیغی سمجھے جاتے تھے اُنکی نسبت یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ آیا یہ تبلیغ اُنکے اصل مذہب کا حکم تھا، یا بعد کے پیروؤں کا عمل ہے؟ کیونکہ اُنکے مذہبی صحیفوں میں اس تعلیم دعوت کی کھلی ہوئی ہدایتیں اور اُنکے بانیوں کی زندگیوں میں اسکی عملی مثالیں نہیں ملتیں، تمام مذاہب میں صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے تبلیغ کی اہمیت کو سمجھا، اور اسکے متعلق اپنے صحیفہ میں کھلے احکام دیئے، اور اس کے داعی و حامل علیہ السّلام نے اپنی زندگی میں اسکی عملی مثالیں پیش کیں،

جن مذہبوں نے تبلیغ کو اپنا اصول نہیں ٹھہرایا، اُن کے ایسا کرنے کی اصلی وجہیں دو ہیں، ایک یہ کہ اُنکے نزدیک اس حق کے قبول کرنے کی عزت کا استحقاق پیدائش سے حاصل ہوتا ہے، کوشش سے نہیں، دوسرا سبب یہ ہے کہ جو حق اُنکے پاس ہے، وہ انکے نزدیک اتنا پاک و مقدس ہے، کہ انکی خاص پاک و بزرگ و محترم نسل و قوم کے علاوہ دوسری تمام قومیں جو ناپاک و نجس و کمتر ہیں، ان تک اپنے پاک مذہب کو لیجانا، خود اس مذہب کی پاکی کو صدمہ پہنچانا ہے، یہی سبب ہے کہ حضرت مسیح علیہ السّلام نے ایک دفعہ جب ایک کنعانی (متی ۱۵) یا یونانی (مرقس ۷) عورت نے ان سے برکت چاہی تو فرمایا "میں اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے

سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا،" (متی ۱۵-۲۵) پھر فرمایا، مناسب نہیں، کہ لڑکوں کی روٹی (بنی اسرائیل کا مذہب) کتوں (غیر اسرائیلی قوموں) کو پھینک دیں۔" (۲۷) پھر فرمایا غیر قوموں کی طرف نہ جانا، اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا، بلکہ پہلے اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جاؤ، اور چلتے ہوئے منادی کرو۔" (متی ۱۰-۶) پھر ارشاد فرمایا وہ چیز جو پاک ہے، کتوں کو مت دو، اور اپنے موتی سوروں کے آگے نہ پھینکو۔" (متی ۷-۶)

ہندوؤں نے اپنے مذہب کو تمام قوموں سے جو چھپا کر رکھا، اس کا بھی یہی سبب تھا کہ وہ اپنا پاک دھرم ملیچھوں اور اچھوتوں کو سکھا کر اسکو ناپاک نہیں کرنا چاہتے تھے، یہودیوں کا بھی یہی خیال تھا کہ نامختون اس نعمت کے اہل نہیں،

تبلیغ کی اہمیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی تمام قوموں کو برابری اور مساوات کی ایک ہی سطح پر لا کر کھڑا کیا اور خدا کے پیغام کی منادی کا سب کو یکساں مستحق قرار دیا، اسلئے اپنی تبلیغ کیلئے قریش و غیر قریش، حجاز و یمن، عرب و عجم، ہند و روم کی تخصیص نہیں فرمائی، بلکہ دنیا کی ہر قوم، ہر زبان اور ہر گوشہ میں صدائے الٰہی کا پہنچانا فرض قرار دیا، ابتدائی وحی میں انجانوں کو ہشیار اور بیخبروں کو آگاہ کرنا سب سے پہلا حکم تھا، یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ (مدثر) "اے چادر پوش اٹھ کھڑا ہو اور ہشیار و آگاہ کر۔" پھر بار بار حکم ہوتا رہا کہ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْكَ "جو تیری طرف اتارا گیا اسکو اوروں تک پہنچا" فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا اُمِرْتَ (شوریٰ) "لوگوں کو دعوت دے اور مضبوط قائم رہ جس طرح تجھے حکم دیا گیا" فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى (اعلیٰ) لوگوں کو نصیحت کر، اگر نصیحت فائدہ مند ہو۔" وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ (ذاریات ۳) "اور نصیحت کر

کہ نصیحت اہلِ ایمان کو فائدہ پہنچاتی ہے" فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ (ق-۳) قرآن سے سمجھاؤ اسکو جو میری دھمکی سے ڈرتا ہو" اور ان کے علاوہ بیسیوں آیتوں میں اس فرض کی اہمیت ظاہر کی گئی، حضرت علیؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے علی! تمہاری کوشش سے ایک آدمی کا بھی دین حق کو قبول کرلینا دنیا کی بڑی سے بڑی دولت سے بھی بڑھ کر ہے[1]"

اس سے زیادہ یہ کہ اسلام نے اپنے ہر ہر دور پر خیر کی دعوت، امر بالمعروف نہی عن المنکر اور تواصی بالحق یعنی باہم ایک دوسرے کو سچائی کی نصیحت کرنا ضروری قرار دیا ہے، اور مسلمانوں کا یہ فرض بتایا ہے کہ وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی تاریکی سے نکالنے کی جدوجہد کریں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے، کہ ہر قسم کے خطرات سے بے پروا ہوکر پیامِ الٰہی لوگوں تک پہنچائیے، اور اگر ایسا نہ کیا تو رسالت کا فرض انجام نہیں دیا،

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ	اے خدا کے پیغام پہنچانے والے تیرے پروردگار
مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا	کے پاس سے جو کچھ تیری طرف اترا ہے اس کو پہنچا دے
بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ	اگر تو نے ایسا نہیں کیا تو تو نے خدا کا پیغام نہیں
مِنَ النَّاسِ، (مائدہ ۱۰۰)	پہنچایا اور تجھ کو خدا لوگوں سے بچالے گا،

اسکی وسعت اس کے بعد اس فریضۂ تبلیغ کی وسعت کی بحث ہے، پیغام الٰہی، سچائی کا ایک بہتا چشمہ ہے، جو آہستہ آہستہ قدرتی رفتار سے پہلے اپنی قریب کی زمین کو، پھر آگے کو پھر اس سے آگے کو، سیراب کرتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ زمین کے کناروں تک پہنچ جاتا ہے، آنحضرت

[1] صحیح مسلم باب خیبر،

صلی اللہ علیہ وسلم کو اس تبلیغ کا حکم اسی تدریج کے ساتھ ہوا، سب سے پہلے خاص اپنے گھر اور خاندان کے لوگوں کو سمجھانے کا حکم ہوا،

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (شعرا-۱۴) اور اپنے سب سے نزدیک کے اہل خاندان کو آگاہ کر

اس کے بعد یہ دائرہ بڑھکر شہر مکہ اور اس کے اطراف کی آبادیوں تک پہنچتا ہے،

لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا (شوریٰ-۱) تاکہ تو مکہ اور جو اسکے آس پاس (کے بستی) ہیں، ان کو آگاہ و ہشیار کرے،

اب تبلیغ کا دائرہ اس سے بھی آگے بڑھتا ہے، اور ہر زندہ روح یعنی سمجھ بوجھ احساس و عقل وغیرہ حقیقی زندگی کی علامتیں جس میں موجود ہوں اسکی مخاطب ہو جاتی ہے،

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (یٰسٓ-۵) یہ قرآن تو صرف ایک نصیحت اور صاف صاف کلام ہے تاکہ اسکو وہ ہشیار کرے جو زندہ ہے،

پھر جس حد تک بھی اسکی آواز پہنچ جائے سب سے اس کا خطاب ہے،

لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْ بَلَغَ (انعام-۲) تاکہ میں اس سے تمہیں آگاہ و ہشیار کروں اور انکو جن تک میری یہ آگاہ و ہشیار کرنے والی آواز پہنچے

پھر تمام انسانوں تک اسکی وسعت ہوتی ہے،

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ (ابراہیم-۶) یہ قرآن تمام انسانوں کے لئے پیغام ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہوا،

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سبا-۲۸) اور ہم نے تمکو تمام انسانوں کیلئے خوشخبری

لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (سبا-۳)　　سنانیوالا اور ہشیار کرنیوالا بنا کر بھیجا،

آپ کو حکم ہوا کہ تمام انسانوں کو خطاب کر کے یہ اعلان فرما دیں،

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (اعراف-۲۰)　　اے لوگو! میں تم سب کی طرف خدا کا پیغام دیکر بھیجا گیا ہوں،

اس سے زیادہ یہ ہے کہ تمام کائنات آپ کی دعوت و تبلیغ کے دائرہ میں داخل ہے، فرمایا،

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا، الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (فرقان-۱)　　برکت والا ہے وہ خدا جس نے حق اور باطل میں امتیاز بتانے والی کتاب اپنے (بندہ محمدؐ) پر نازل کی تاکہ وہ دنیا جہاں کیلئے ہشیار آگاہ کرنے والا ہو، وہ خدا جسکی ملکیت میں آسمانوں کی اور زمین کی سلطنت ہے،

اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے، کہ اس تبلیغ و دعوت کی وسعت اور اسمیں کامیابی کی خوشخبری مین اسی وقت دیدی گئی تھی، جب مسلمانوں کے دلوں میں ایک قسم کی مایوسی چھائی ہوئی تھی، چنانچہ آیت ذیل نازل ہوئی،

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ (ص-۵)　　یہ قرآن تو دنیا کے لئے نصیحت ہے اور تم لوگ زمانہ کے بعد اس کی خبر جانوگے،

انبیاء اور بانیان مذاہب کے عملی نمونوں اور مثالوں کی تلاش اور جستجو کرو تو یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہو جائے گی کہ اسلام کے سوا اور جو مذہب تبلیغی سمجھے جاتے ہیں وہ حقیقت میں تبلیغی نہیں، خود بودھ نے ہندوؤں کے علاوہ کسی کو اپنی نجات کا راستہ نہیں بتایا، اور نہ اسکا

حکم دیا، حضرت عیسیٰؑ نے اسرائیل کے علاوہ کسی دوسری قوم کو نہ اپنا وعظ سنایا، اور نہ انکو اپنا مخاطب بنایا، اور نہ ان میں سے کسی کو اپنا شاگرد کیا، نہ کسی دوسری قوم میں اپنی زندگی میں اپنا وعظ اور مبلغ بھیجا، حالانکہ فلسطین میں رومیوں اور یونانیوں کی بڑی جماعت موجود تھی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں رہ کر مکہ اور اس کے آس پاس کے لوگوں کو بیدار و ہشیار کیا، حج کے موسم میں عرب کے ایک ایک قبیلہ کے پاس جاکر حق کا پیغام پہنچایا، اور اسی زمانہ میں یمن اور حبشہ تک آپ کی آواز پہنچ گئی، اور لوگ تلاشِ حق کیلئے آپکے پاس آئے، مدینہ منورہ آئے تو قریش گو برسوں تک دوسرے قبیلوں تک اسلام کے پہنچنے میں سدِ راہ بنے رہے پھر بھی مبلغ اور داعی بھیج بھیج کر قبیلوں تک آواز پہنچائی گئی، اور بالآخر قریش کے خلاف اسلئے تلوار اٹھائی گئی کہ اسلام کو تبلیغ کی پُر امن آزادی ملے، چھ برس کے جنگ و جدل کے بعد حدیبیہ میں قریش نے اسلام کے اس مطالبہ کو تسلیم کیا، اور تبلیغ کی آزادی عطا کی، قرآن نے اسلام کی اس روحانی فتح کو فتحِ مبین قرار دیا، اور اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا نازل ہوئی، اسکے بعد ہی عرب اور بیرونِ عرب میں اسلام کے داعظ، قاصد اور مبلغ بھیجے گئے، اور دنیا کے امراء اور سلاطین کو دعوتِ اسلام کے خطوط لکھے گئے، اور عربوں کے علاوہ دیلم، ایران، حبش اور روم کے طالبین اسلام آئے اور فیضانِ حق سے سیراب ہوئے، مشرکینِ عرب، یہود، عیسائی اور پارسی سب نے آپکے زمانہ ہی میں آپکے نور سے روشنی حاصل کی،

لیکن نفسِ تبلیغ کی فرضیت و اہمیت سے بھی زیادہ اہم چیز تبلیغ کے اصول ہیں،

لہ صحیح مسلم باب صلح الحدیبیہ،

تبلیغ کے اصول یہ نکتہ کہ کس طرح لوگوں کو کسی سچائی کے قبول کی دعوت دینی چاہیے، دنیا میں پہلی دفعہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان وحی ترجمان سے ادا ہوا، وہ مذہب بھی جو تبلیغی ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں، یہ نہیں کہہ سکتے کہ اُن کے صحیفوں نے انکے لیئے تبلیغ کے اہم اصول کی تشریح کی ہے لیکن صحیفۂ محمدی نے نہایت اختصار لیکن پوری تشریح کیساتھ اپنے پیروؤں کو یہ بتایا ہے کہ پیغام الٰہی کو کس طرح لوگوں تک پہنچایا جائے، اور ان کو قبولِ حق کی دعوت کس طرح دیجائے،

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ	اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو دانائی
وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ	اور عمدہ نصیحت کے ذریعہ سے بلا، اور ان سے
بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ، (نحل - ۱۶)	مناظرہ خوش آیند طریق سے کر،

تبلیغ و دعوت کے یہ تین اصول مسلمانوں کو سکھائے گئے، عقل و حکمت، موعظۂ حسنہ اور مناظرہ بطریق احسن، مسلمان متکلموں نے بیان کیا ہے کہ تبلیغ و دعوت کے یہ تینوں اصول ہی ہیں، جو منطقی استدلال میں عموماً کام میں لائے جاتے ہیں، یعنی ایک تو برہانیات جنمیں یقینی مقدمات کے ذریعہ سے دعویٰ کے ثبوت پر دلیلیں لائی جاتی ہیں، دوسرے خطابیات جن میں موثر اور دلپذیر اقوال سے مقصود کو ثابت کیا جاتا ہے، اور تیسرے جدلیات جن میں مقبول عام اقوال اور فریقین کے مسلم مقدمات سے استدلال کیا جاتا ہے، قرآن پاک نے پہلے طریقہ کو حکمت، دوسرے کو موعظتِ حسنہ اور تیسرے کو جدال سے تعبیر کیا ہے اور استدلال کے یہی وہ تین طریقے ہیں جن سے ایک شخص دوسرے کے سامنے اپنے مدعا کو ثابت کرتا ہے،

خیر یہ تو فلسفیانہ نکتہ آفرینی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ جب ہم کسی کے سامنے کوئی نئی بات پیش کرکے اُس کے قبول کی دعوت دیتے ہیں، تو عموماً تین طریقے برتتے ہیں، یا تو اس بات کے ثبوت اور تائید میں کچھ دلنشین دلیلیں پیش کرتے ہیں، یا اس کو مخلصانہ نصیحت کرتے ہیں اور اندازسے اس کو نیک و بد اور نشیب و فراز سے آگاہ کرتے ہیں، یا یہ کرتے ہیں کہ اس کی دلیلوں کو مناسب طریقہ سے رد کرکے اسکی غلطی کو اس پر واضح کرتے ہیں، پہلے طریقہ کا نام حکمت، دوسرے کا نام موعظۂ حسنہ اور تیسرے کا نام جدال بطریق احسن ہے، تبلیغ و دعوت کے یہی تین طریقے اسلام نے بتائے ہیں،

قولِ لین حکیمانہ استدلال ہو، یا وعظ و نصیحت ہو، یا جدال و مناظرہ ہو، ضرورت یہ ہے کہ داعی نرمی اور خیر خواہی سے بات کرے کہ سختی اور شدت کا طریق دوسرے کے دل میں نفرت اور عداوت کے جذبات پیدا کرتا ہے، اور کیسی ہی اچھی اور سچی بات ہو، لیکن اس قسم کے جذبات اس کے قبول کی استعداد اس سے سلب کر لیتے اور سننے والے میں اپنی غلطی پر عناد اور ہٹ پیدا کر دیتے ہیں جس سے دعوت کا فائدہ اور نصیحت کا اثر باطل ہو جاتا ہے، اسی لئے قرآن پاک نے اپنے پیغمبروں کو اپنے مخالف سے مخالف دشمن سے بھی نرمی ہی سے بات کرنے کی تاکید کی ہے، حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو، فرعون جیسے سرکش کے سامنے پیغام ربانی لیکر جانے کی ہدایت ہوتی ہے، تو ساتھ ساتھ یہ ارشاد بھی ہوتا ہے،

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى (طٰہٰ ۲)

تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، اس نے سرکشی کی ہے تو اس سے نرم گفتگو کرنا شاید وہ نصیحت قبول کرے یا ڈرے

دعوت وتبلیغ میں رفق ونرمی اور لطف وتحمل کی اس سے بہتر مثال نہیں ہوسکتی کہ کوئی داعی اور واعظ پیغمبروں سے بہتر ہوسکتا ہے اور نہ فرعون سے بڑھ کر کوئی مجرم ہوسکتا ہے، پھر ایسے مجرم کے سامنے اس لطف ونرمی سے وعظ ونصیحت کی تعلیم جب پیغمبروں کو ہوتی ہے، تو عام داعیوں، مبلغوں اور واعظوں کو عام مخالفوں، مجرموں اور سرکشوں کیساتھ جہاں زیادہ رفق وملاطفت سے اپنا فرض ادا کرنا چاہیئے،

اعراض اور قول بلیغ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن منافقوں کے بارہ میں جو آپ کی نافرمانی کے جرم کے مرتکب ہوئے تھے، یہ حکم ہوتا ہے،

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا (نساء - ۹)

تو ان سے درگذر کر اور انکو نصیحت کر اور ان سے ایسی بات کہہ جو اُن کے دلوں میں اثر کرے،

اس تعلیم میں تین ہدایتیں ہیں، اول یہ کہ دعوت وتبلیغ میں مخالف کی بدسلیقگی بدتہذیبی اور درشتی سے درگذر اور اُن کو برداشت کرنا چاہیئے، دوسرے یہ کہ انکو نصیحت کرنا اور سمجھانا چاہیئے اور تیسرے یہ کہ گفتگو کا وہ موثر طرز واندازہ اختیار کرنا چاہیئے جو دل میں گھر کرے

تیسیر وتبشیر انہی ربانی ہدایتوں کی تعمیل میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ اور ابوموسیٰ اشعریؓ کو یمن میں اسلام کی دعوت وتبلیغ کے لئے متعین فرمایا تو رخصت کرتے وقت یہ نصیحت فرمائی یَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا وَبَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا[1] دین الٰہی کو آسان کرکے پیش کرنا سخت بناکر نہیں، لوگوں کو خوشخبری سنانا، نفرت نہ دلانا، یہ وہ تبلیغی اصول ہیں جو ایک

[1] صحیح بخاری بعث معاذ الی الیمن جلد دوم صفحہ ۶۲۴،

داعی مبلغ کی کامیابی کی جان ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کے سامنے اور صحابہؓ نے عام مسلمانوں کے سامنے اسی اصول کے مطابق دین الٰہی کو پیش کیا، اور کامیابی حاصل کی، دین کی بات آسانی اور سہولت کو پیش کرنا، اور اس کو سخت دشت اور مشکل نہ بنانا ہی، اس کے قبول عام کی راہ ہے، ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کے لطف و شفقت، رحم و کرم اور مہر و محبت کی دلنواز صداؤں سے دلوں کو پُر امید اور مسرور بنایا، اس سے بہتر ہے، کہ بات بات پر خدا کی ناری و جباری اور ہیبت و جلال کا ذکر کر کے دلوں کو خوفزدہ اور مایوس بنایا جائے،

تدریج تبلیغ کا ایک اور اصول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم فرمایا کہ کسی نئی قوم کو دعوت دیتے وقت شریعت کے تمام احکام کا بوجھ ایک دفعہ اس کی گردن پر نہ ڈالا جائے، بلکہ رفتہ رفتہ وہ اُس کے سامنے پیش کئے جائیں پہلے توحید اور رسالت کو پیش کرنا چاہئے، اس کے بعد عبادات کو، عبادات میں بھی اہم پھر اہم کے اصول کو پیش نظر رکھنا چاہئے، عبادات میں سب سے اہم نماز ہے، پھر زکوٰۃ ہے، پھر دوسرے فرائض ہیں، حضرت معاذؓ بن جبل کو یمن بھیجتے وقت آپ نے فرمایا تم یہودیوں اور عیسائیوں کی ایک قوم کے پاس جاؤ گے، تو ان کو پہلے اس کی دعوت دینا کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں، اور محمدؐ اس کا رسول ہے، جب وہ یہ مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں فرض کی ہیں، اور جب وہ یہ بھی مان لیں تو انکو بتاؤ کہ خدا نے اُن پر صدقہ فرض کیا ہے، یہ صدقہ اُن کے دولتمندوں سے لیکر اُنکے غریبوں کو دیدیا جائے، جب وہ اسکو تسلیم کرلیں تو دیکھو صدقہ میں چن چن کر اُن کے بڑھیا مال کو نہ لینا اور ہاں مظلوم کی بددعا سے ڈرتے رہنا، کہ اُس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں"

تالیف قلب تبلیغ و دعوت کے سلسلہ میں اسلام نے ایک اور طریقہ بھی پیش کیا ہے جسکو تالیفِ قلب کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے، وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ (توبہ-۸) اس کے لفظی معنی ہیں "دلوں کو ملانا" اور اس سے مقصود اس شخص کے ساتھ جس کو اسلام کی طرف مائل کرنا ہو، لطف و محبت، امداد و اعانت اور غمخواری و ہمدردی کرنا ہے، کیونکہ انسان طبعاً شریفانہ جذبات کا ممنون ہوتا ہے اور یہ ممنونیت عناد اور ضد کے خیالات کو دور کر کے قبولِ حق کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے لوگوں کو اپنے اس اعجاز سے اسلام کا حلقہ بگوش بنایا تھا، چنانچہ مکہ کے بعض رئیس اسی جذبہ سے متاثر ہو کر اسلام لائے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حنین کی غنیمت کا سارا مال ان ہی میں تقسیم کر دیا تھا، نتیجہ یہ نکلا کہ پھر حق کے خلاف اُن کی گردنیں نہ اُٹھ سکیں، صفوان جو اسلام کے سخت مخالف اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہایت بغض رکھتے تھے، وہ یہ کہتے ہیں کہ "مجھکو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا، جتنا دیا، اور مجھے ان سے سخت بغض تھا، لیکن آپ کے ان احسانات نے مجھے ایسا متاثر کیا کہ اب میری نگاہ میں اُن سے زیادہ کوئی پیارا نہیں"[1] ایک دفعہ ایک بدو نے آکر کہا کہ ان دونوں پہاڑوں کے درمیان بکریوں کے جتنے ریوڑ ہیں، مجھ کو عنایت کیجئے، آپ نے اس کو وہ سب دیدیئے، یہ فیاضی دیکھ کر ایسا اُس پر اثر پڑا کہ اس نے اپنے پورے قبیلہ سے جا کر کہا بھائیو! اسلام قبول کرو، محمدؐ اتنا دیتے ہیں کہ ان کو اپنے فقر و افلاس کا ڈر ہی نہیں رہتا"[2]

ایک یہودی لڑکا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرتا تھا، وہ بیمار پڑا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے، اور جا کر اسکے سرہانے بیٹھے، پھر فرمایا کہ لڑکے اسلام

---

[1] صحیح مسلم باب جودہ صلعم ج ۲ ص ۲۹۰ مصر [2] ایضاً،

قبول کرلے، اس نے مستفسرانہ نگاہ سے باپ کی طرف دیکھا، اس نے کہا ابوالقاسم (آپؐ کی کنیت) کی بات مان لے، چنانچہ وہ مسلمان ہوگیا، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے اُٹھے تو زبان مبارک پر یہ فقرہ تھا کہ اُس خدا کی حمد جس نے اسکو دوزخ سے بچا لیا[1]،

دعوتِ عقل اسلام نے تبلیغ و دعوت کے جو اصول بتائے ہیں، ان کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ ایک استدلالی اور عقلی مذہب ہو کہ بغیر اس کے حکمت و دانشمندی، وعظ و نصیحت اور جدال و مناظرہ کی بنیاد قائم نہیں رہ سکتی، اس بنا پر مذاہب عالم کی تاریخ میں نبوتِ محمدیہ پہلی نبانی آواز ہے، جس نے حاکمانہ قانون (توراۃ) یا صرف لفظوں کے الٹ پھیر (انجیل) یا راہبانہ کے احکام (وید) کے بجائے عقلِ انسانی کو مخاطب کیا، غور و فکر کی دعوت دی، فہم و تدبر کا مطالبہ کیا، اس نے اپنی ہر تعلیم کیساتھ اپنی تعلیم کی خوبی مصلحت خود ظاہر کی اور بار بار مخالفوں کو آیاتِ الٰہی میں غور و فکر کی ہدایت کی، فرمایا،

قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ج (انعام-۱۸)

کہہ اے پیغمبر کہ تمہارے پاس کوئی (یقینی) علم ہے کہ اسکو تم ہمارے لئے ظاہر کرو، تم تو گمان ہی کے پیچھے چلتے ہو، اور تم تو اٹکل ہی کرتے ہو کہہ کہ اللہ ہی کی ہے، پہنچتی ہوئی دلیل،

نیز ارشاد ہوا،

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ

تاکہ جو ہلاک ہو وہ دلیل سے ہلاک ہو، اور جو

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجنائز،

مَنْ حَیَّ عَنْ بَیِّنَةٍ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (انفال-۵)

جیتا رہے، وہ دلیل سے جیے، اور اللہ ہی سننے والا جاننے والا،

غفلت شعار کافروں کی نسبت فرمایا،

وَکَاَیِّنْ مِّنْ اٰیَةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یَمُرُّوْنَ عَلَیْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ، (یوسف-۱۲)

اور آسمانوں میں اور زمین میں (خدا کی توحید کی) کتنی نشانیاں (دلیلیں) ہیں، جن پر وہ گذر جاتے ہیں، اور ان پر غور نہیں کرتے،

غور وفکر کرنے والے اہلِ ایمان کی تعریف میں فرمایا،

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ، اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (آل عمران-۲۰)

بے شبہ آسمانوں اور زمین کی بناوٹ اور رات اور دن کے اُلٹ پھیر میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں، جو اللہ کو کھڑے، بیٹھے، اور اپنی کروٹوں پر یاد کرتے ہیں، آسمانوں اور زمین کی بناوٹ میں غور کرتے ہیں، (اور کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار تو نے (یہ عالم) بیکار نہیں بنایا،

اس سے زیادہ عقلی اور علمی استدلال کی دعوت اور کیا ہوگی، مگر بہرحال یہ خارجی استدلال تھا، اندرونی استدلال کی بھی اُس نے دعوت دی، فرمایا،

وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (ذاریات-۱)

اور خود تمہارے اندر نشانیاں ہیں تم دیکھتے نہیں،

صحیفۂ محمدی کی نسبت ہر جگہ یہ الفاظ فرمائے،

تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ — یہ بصیرت اور نصیحت ہے، ہر رجوع ہونے والے بندہ کے لئے،

(ق-۱)

هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ (اعراف-۲۴) — یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے بصیرتیں ہیں،

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ (جاثیہ-۲) — یہ لوگوں کے لئے بصیرتیں ہیں،

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ (نساء) — کیا یہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے،

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (محمد-۳) — کیا یہ قرآن میں غور نہیں کرتے، یا دلوں پر انکے تالے ہیں،

وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ (یٰس-۱) — حکمت والے قرآن کی قسم،

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ (یونس لقمان) — یہ حکمت والے کتاب کی آیتیں ہیں،

نہ صرف اسی قدر بلکہ خدا کا وجود، توحید، رسالت، قیامت، جزا و سزا، عبادت، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، اخلاق وغیرہ ہر تعلیم کی تلقین کرتے وقت اُس نے اسکی صداقت کی عقلی دلیلیں پیش کی ہیں، اور ہر مسئلہ کی مصلحتیں اور حکمتیں علی الاعلان ظاہر کی ہیں آئندہ صفحوں میں ہر قدم پر اسکی دلیلیں آپ کو ملیں گی،

مذہب میں زبردستی نہیں یہ وہ حقیقت ہے جس کی صدا آج ہر در و دیوار سے آتی ہے لیکن شاید لوگوں کو معلوم نہیں کہ دنیا میں اس حقیقت کا اعلان سب سے پہلے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی زبان مبارک سے ہوا، اور ظاہر ہے کہ جو مذہب اپنی اشاعت کے

صرف دعوت و تبلیغ کا راستہ رکھا ہو جس نے اس کے اصول بتلائے ہوں، جس نے عقل و بصیرت، اور فہم و تدبر کا ہر معاملہ میں لوگوں سے مطالبہ کیا ہو، ہر قدم پر عقلی استعداد اور مصلحت و حکمت کا اظہار کیا ہو، وہ کیونکر جبر و اکراہ اور زور و زبردستی کے طریقہ کو اختیار کر سکتا تھا، اسلام نے نہ صرف یہ کہ مذہب کی جبری اشاعت کو ناپسند کیا بلکہ اس کا فلسفہ بتایا کہ مذہب زبردستی کی چیز نہیں، اسلام میں مذہب کا اولین جزو ایمان ہے، ایمان یقین کا نام ہے، اور دنیا کی کوئی طاقت کسی کے دل میں یقین کا ایک ذرہ بھی زبردستی نہیں پیدا کر سکتی بلکہ تیز سے تیز تلوار کی نوک بھی کسی لوحِ دل پر یقین کا کوئی حرف نقش نہیں کر سکتی، فرمایا،

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ، (بقرہ-۳۴)

دین میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت گمراہی سے الگ ہو چکی،

یہ وہ عظیم الشان حقیقت ہے جس کی تلقین انسانوں کو صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہوئی، دوسری جگہ فرمایا،

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (کہف-۴)

اور کہدے کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے، تو جو چاہے قبول کرے اور جو چاہے انکار کرے،

ایمان اور کفر ان دو میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے پر کوئی زبردستی نہیں ہے، عقل و بصیرت والے اسے خود قبول کرینگے اور نافہم اس سے محروم رہینگے، اسی لئے بار بار یہ واضح کیا گیا کہ رسول کا کام لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے، زبردستی منوانا نہیں،

اِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ — ہمارے رسول پر تو یہی فرض ہے کہ وہ صاف صاف ہمارا پیغام پہنچا دے (مائدہ ۸-۱۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو قریش کے اعراض و مخالفت سے حد درجہ غمگین تھے تسکین دی گئی،

اِنْ عَلَیْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ (شوریٰ ۵) — اے پیغمبر تیرا فرض صرف پیام پہنچا دینا ہے،

اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ، لَسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُصَیْطِرٍ (غاشیہ ۱-۱) — اے پیغمبر، تو تو صرف نصیحت کرنے والا ہے، تو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا،

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا، اِنْ عَلَیْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ (شوریٰ ۵-۵) — پھر اگر وہ اسلام کی دعوت سے انکار کریں تو اے پیغمبر ہم نے تجھ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا، تیرے ذمہ صرف پیغام کا پہنچا دینا ہے،

کسی دین کو زبردستی پھیلانا اسلام کی نگاہ میں ایک ایسا فعل ہے، جس سے رسول کی شان کو اس نے بہت بلند بتایا ہے، فرمایا،

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا، اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ، (یونس ۱۰-۱۰) — اگر تیرا پروردگار چاہتا کہ (لوگوں کو زبردستی مومن بنا دے) تو زمین سے سب لوگ ایمان لے آتے تو کیا اے پیغمبر تو لوگوں پر زبردستی کرے گا کہ وہ ایمان لے آئیں،

اسلام میں حق کی حمایت اور باطل کی شکست کے لئے لڑنا جائز ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مجبوراً لڑنا پڑا، اس سے مخالفوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ لڑائی صرف اسلئے تھی کہ اسلام کو طوعاً

کے زور سے لوگوں میں پھیلایا جائے، حالانکہ قرآن میں ایک آیت بھی ایسی نہیں جسمیں کسی کافر کو زبردستی مسلمان بنانے کا حکم ہو اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں کوئی واقعہ ایسا ہے جس میں کسی کو زبردستی تلوار کے زور سے مسلمان بنایا گیا ہو، بلکہ اگر ہے تو یہ ہے،

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ	اور اگر (لڑائی میں) کوئی مشرک تجھ سے پناہ کا طالب
فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ	ہو تو اسکو پناہ دے، یہانتک کہ وہ خدا کا کلام سن لے
مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا	پھر اس کو وہاں پہنچا دے جہاں وہ بیخوف
يَعْلَمُوْنَ (توبہ-۱)	ہو کہ یہ بے علم لوگ ہیں،

یہ نہیں کہا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائے، اسکو پناہ نہ دو، بلکہ یہ فرمایا کہ اسکو پناہ دیکر اس کی جائے پناہ تک پہنچا دیا جائے اور اسکو کلام الٰہی سنایا جائے، تاکہ اس کو غور و فکر کرنے کا موقع ملے، ظاہر ہے کہ جو مشرک اس طرح مسلمان ہوگا، اسکے تبدیل مذہب کا محرک تلوار کے بجائے کوئی اور چیز (پیام حق) ہوگی،

حقیقت یہ ہے کہ جہاد کی مشروعیت، مظلوموں کی حمایت، جلاوطنوں کے حق دلانے، حج کا راستہ کھولنے، اور عقیدہ کی آزادی حاصل کرنے کے لئے ہوئی تھی، جیسا کہ اس کا مفصل بیان کتاب میں کہیں آئیگا، قرآن کی اس آیت میں.

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ	اور ان کافروں سے لڑو یہانتک کہ فتنہ نہ رہے
وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (انفال-۵)	اور دین پورا اللہ کے لئے ہو جائے،

"فتنہ" سے مراد عقیدہ اور مذہب کی آزادی نہ ہونا ہے، حضرت ابن عمرؓ صحابہ کی خانہ جنگیوں میں

شریک نہ تھے، ایک شخص نے ان سے آکر کہا کہ کیا خدا نے فتنہ کے مٹانے کے لئے لڑنے کا حکم نہیں دیا، اور اوپر کی آیت پیش کی، انھوں نے جواب دیا کہ ہم یہ فرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ادا کر چکے، جب مسلمان کم تھے، تو انسان اپنے دین کے سبب سے فتنہ میں مبتلا کیا جاتا تھا، اسکو لوگ یا مار ڈالتے تھے، یا قید کر لیتے تھے، یہانتک کہ مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی، تو پھر فتنہ باقی نہ رہا[1]،

میدان جنگ میں تبلیغ | ناواقفوں نے ایک اور مسئلہ کی بھی غلط تعبیر کی ہے، اسلام کی امن پسندی نے یہ قانون بنایا ہے، کہ اگر کسی مخالف قوم سے لڑائی آپڑے تو میدان جنگ میں ہتھیار بھی صلح و آشتی کا خیال دور نہ کیا جائے، بلکہ تلوار کے فیصلہ سے پہلے دو باتیں انکے سامنے پیش کرنی چاہئیں، اول یہ کہ تم کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو جاؤ، اور لڑائی سے ہاتھ اٹھا کر ہمارے بھائی بنجاؤ، اگر ایسا کرو تو تم دین، حکومت اور عزت کے تمام حقوق میں ہمارے برابر ہو جاؤ، اگر یہ منظور نہ ہو تو اپنے مذہب پر قائم رہ کر ہماری سیاسی حکومت کو قبول کر لو، اس حالت میں تمھاری حفاظت کی ہر قسم کی ذمہ داری ہمارے سر ہوگی، اگر وہ ان دو میں سے کوئی بات قبول کریں تو ان سے لڑنا جائز نہیں، اسلام کی تاریخ میں ایسے کتنے مظاہر ہیں کہ کسی دشمن سے دشمن قوم نے اسلام یا محض اطاعت قبول کرلی ہے اور خونریزی رک گئی ہے، اور لڑائی کا میدان محبت و آشتی کی بزم بن گئی ہے،

یہ قانون جو سرتاپا امن پسندی، سلامت طلبی اور خونریزی سے بچنے کی آخری کوشش ہے

[1] صحیح بخاری جلد دوم تفسیر انفال ص ۶۷۰،

مبنی ہے، اسکو مخالفوں نے اس صورت میں پیش کیا ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو تلوار کے زور سے مسلمان بنانے کی تعلیم دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جب کسی فوج کو متعین کرتے تو سردار کو یہ ہدایت فرماتے،

"جب تو مشرکوں میں سے کسی دشمن قوم سے مقابل ہو تو اسکو تین باتوں میں سے کسی ایک بات کے قبول کرنے کی دعوت دے، ان میں سے جو بات بھی وہ مان لے اسکو قبول کرلے اور اس پر حملہ کرنے سے رک جا، اسکو اسلام کی دعوت دے، اگر وہ قبول کرلے تو پھر اس سے رک جا، اسکے بعد اس سے خواہش کر کہ وہ مسلمانوں کے ملک میں آجائے تو اس کا وہی حق ہوگا جو مسلمانوں کا ہے، اگر وہ نہ مانے تو اسکی حالت بدو مسلمانوں کی سی ہوگی، قانون اس پر مسلمانوں کا جاری ہوگا، لیکن غنیمت اور فئی میں اس کا حصہ نہ ہوگا، جبتک وہ جہاد میں شرکت نہ کرے، اگر وہ اسلام قبول نہ کرے تو اسکو جزیہ دیکر ذمی بننے کو کہہ، اگر وہ اس کو مان لے تو اس سے بھی رک جاؤ، اگر وہ اسکو بھی نہ مانے تو پھر خدا کی مدد مانگ اور لڑائی شروع کردے"[1]

یہ وہ اصول جنگ ہے، جس سے خونریزی کی روک تھام مقصود تھی، نہ یہ کہ کسی کو مجبور کرکے بزور شمشیر مسلمان بنا لینا، صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں ایرانیوں سے جب لڑائی شروع ہوئی تو مسلمانوں نے تین روز تک میدان جنگ میں تلوار نہیں اٹھائی، حضرت سلمان فارسیؓ تین روز تک انکو سمجھاتے رہے، اور کہتے رہے کہ "میں تمہاری قوم سے ہوں، لیکن دیکھتے ہو کہ عرب میرے زیر فرمان ہیں، اگر تم بھی مسلمان ہو جاؤ، تو تمکو بھی وہی حقوق ملیں گے، جو ہمارے ہیں، اور اگر تم اپنے ہی مذہب پر رہنا چاہو تو جزیہ دیکر رہ سکتے ہو، لیکن محکوم ہو کر رہو گے"[2] اس سے معلوم ہوا کہ جنگ میں

[1] صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر، جامع ترمذی ابواب السیر

دشمن کو بھی تبدیلِ مذہب پر مجبور نہیں کیا گیا، بلکہ اسکے سامنے دوسری راہیں بھی کھلی تھیں؛

ثمامہ بن اثال قبیلۂ بنی حنیفہ میں سے تھے، اور یمامہ کے رئیس تھے، یہ وہ قبیلہ ہے جو آخر تک سرکش رہا، اور اسی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر زمانہ میں مسیلمہ پیدا ہوا تھا، ثمامہؓ اتفاق سے مسلمانوں کے ایک لشکر کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے، اور مدینہ لاکر مسجد نبویؐ کے کھمبے میں باندھ دیئے گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لئے تشریف لائے تو پوچھا کہ ثمامہ تمھاری کیا رائے ہے جواب دیا محمد میری رائے اچھی ہے، اگر مجھے قتل کروگے، تو ایک خون والے کو قتل کروگے، اور اگر احسان کروگے تو ایک شکر گذار پر احسان ہوگا، اور اگر زر فدیہ چاہتے ہو تو مانگو، جو مانگوگے دیا جائیگا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ نہیں فرمایا، پھر اسی طرح دوسرے دن سوال و جواب ہوا، پھر تیسرے دن ہوا، تیسرے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ثمامہ کو چھوڑ دو، لوگوں نے کھول دیا، وہ رسی سے کھل کر آزاد ہو گئے، مگر سچائی کی زنجیر ان کے پاؤں میں پڑ گئی، مسجد نبویؐ کے قریب ایک نخلستان میں جاکر غسل کیا، اور پھر مسجد میں آکر کلمۂ شہادت[1] پڑھ کر مسلمان ہو گئے کیا کسی کو زبردستی مسلمان بنانے کے لئے اس سے بہتر موقع مل سکتا تھا؟ بدر کے قیدی گرفتار ہو کر آئے لیکن ان سے یہ نہیں کہا گیا کہ تلوار یا اسلام، اسیطرح جنگ کے دوسرے قیدیوں کے ساتھ بھی یہی برتاؤ رہا، قرآن پاک نے جنگ کے قیدیوں کے متعلق کہا فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً (محمد ۴) لڑائی ختم ہونے کے بعد ان قیدیوں کو احسان دھر کر چھوڑ دو، یا فدیہ لیکر چھوڑ دو[2] یہ ارشاد نہ ہوا کہ "اسلام یا تلوار"

غزوۂ خیبر میں مسلمان روزانہ بعض قلعوں پر حملہ کرتے ہیں، اور ناکام رہتے ہیں، بالآخر

---

[1] صحیح بخاری و سنن ترمذی، ربط الاسیر [2] صحیح بخاری غزوۂ خیبر،

شیر خدا علی مرتضیٰؓ کو حکم ہوتا ہے، کہ فوج لیکر جائیں، وہ پوچھتے ہیں یارسول اللہ! کیا میں ان سے لڑوں یہانتک کہ وہ ہماری طرح ہو جائیں؟ فرمایا آہستگی سے روانہ ہو، یہانتک کہ اُن کے میدان میں پہنچ جاؤ، پھر اُن کو اسلام کی طرف بلاؤ، اور اس میں ان کا جو حق ہوگا، وہ اُن کو بتاؤ، خدا کی قسم اگر ایک شخص کو بھی خدا تمہارے ذریعہ سے ہدایت دیدے تو اس سے بہتر ہے کہ تمہاری ملکیت میں سرخ اونٹ ہوں[1]، لیکن خیبر کے یہود نے اسلام کا مذہب قبول نہیں کیا، بلکہ اسلام کی حکومت قبول کرلی اور مصالحت ہو کر تلوار نیام میں کرلی گئی،

اسی طرح ایک مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان پر ہتھیار اٹھانا جائز نہیں، بلکہ کفر کا موجب ہے، کفار کو مسلمانوں کا یہ طرز عمل معلوم تھا، اکثر لڑائیوں میں جب مشرک حملہ آور اپنی کمزوری محسوس کرتا تھا تو اپنی جان بچانے کے لئے کلمۂ توحید پڑھ دیتا تھا، اور ایک بپھرے ہوئے مسلمان کو مجبوراً اپنے غصہ کو ضبط کر کے ہاتھ روک لینا پڑتا تھا،

ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے پوچھا کہ اگر لڑائی میں میرا حریف اپنی تلوار سے میرا ہاتھ اڑادے اور جب میرے حملہ کی باری آئے تو درخت کی آڑ پکڑ کے "میں مسلمان ہوتا ہوں" تو اسے خدا کے رسول میں کیا کروں، اس کو قتل کر دوں؟ فرمایا نہیں، اسکا قتل جائز نہیں، عرض کی یارسول اللہ! میرا ہاتھ اس نے کاٹ ڈالا پھر بھی اس کا قتل جائز نہیں کہ اگر تم نے اب اسکو قتل کیا تو وہ وہ ہو گیا جو تم اس کے قتل سے پہلے تھے، اور تم وہ ہو جاؤ گے جو وہ اس اقرار توحید سے پہلے تھا،

حضرت اسامہ بن زیدؓ آپ کے بڑے پیارے خادم تھے، وہ ایک فوجی دستہ کے سپہ سالار بنا کر

---

[1] صحیح بخاری غزوۂ خیبر [2] صحیح مسلم کتاب الایمان،

ڑائی میں بھیجے گئے، جب گھمسان کا رن پڑا، تو ایک کافر اُن کی زد میں آیا، انھوں نے حملہ کا قصد کیا تو وہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پکار اُٹھا، ایک انصاریؓ جو پہلے اس پر جھپٹے تھے، وہ تو رُک گئے، مگر اسامہؓ نے اس کافر کے اس کلمہ پڑھنے کو اس کی جان بچانے کے فریب پر محمول کر کے کچھ خیال نہ کیا اور نیزہ سے اس کا کام تمام کر دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر معلوم ہوئی تو اسامہؓ سے سخت آزردہ ہوئے، اسامہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس نے صرف تلوار کے ڈر سے کلمہ پڑھا تھا، فرمایا اور کتنا بلیغ فقرہ فرمایا "اے اسامہ! تم نے کیا اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا" پھر برابر یہ فرماتے رہے، اے اسامہ تم قیامت میں اسکے لا الٰہ الا اللہ کا کیا جواب دو گے، اسامہ کہتے ہیں کہ مجھکو اتنی ندامت تھی کہ میں نے دل میں آرزو کی کہ کاش میں آج ہی مسلمان ہوا ہوتا[1]،

دیکھو کہ واقعہ کی تصویر کتنی اُلٹ دی گئی ہے، واقعہ تو یہ تھا کہ اپنی حملہ آور نہ لڑائی کے گھمسان میں بعض کفار و مشرکین جن کو یہ معلوم تھا کہ کسی کلمہ گو کو مسلمان اپنے مذہب کے حکم کے موجب قتل نہیں کرتے، جب وہ مسلمانوں کی زد میں پڑتے تھے تو اپنی جان بچانے کے لئے فوراً کلمۂ شہادت پڑھ دیتے تھے، اور بیان اس صورت میں کیا جاتا ہے، کہ اسلام نے کفار کو تلوار کی نوک سے کلمہ پڑھنے پر مجبور کیا، کیا یہ صداقت ہے؟

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور اعلان ہے، جس کو اکثر غلط معنی میں پیش کیا گیا ہے، آپ نے فرمایا، امرت ان اقاتل الناس حتیٰ یقولوا لا الٰہ الا اللہ الخ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اُس وقت تک لڑائی کروں جبتک وہ توحید کا اقرار نہ کریں اور جب

[1] صحیح مسلم کتاب الایمان ص ۵۲ ۱، مصر،

وہ اقرار کرلیں تو انھوں نے اپنے جان و مال کو مجھ سے بچالیا، اور انکی نیت کی پرسش خدا کا کام ہے،
اس حدیث کا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ مسلمان سے لڑنا تو جائز نہیں، لیکن کسی غیر مسلم قوم
سے بھی لڑنا اسی وقت تک جائز ہے، جب تک وہ توحید کا اقرار نہ کرے، اور جب اس نے یہ کرلیا
تو پھر اس سے بھی لڑنا روا نہیں، خواہ وہ حملہ کے ڈر سے لا الہ الا اللہ پڑھے یا سچے دل سے اس نے یہ اقرار
کیا، ہو، اسکی تحقیق کہ کس نیت سے اس نے کلمہ پڑھا، انسان کا فرض نہیں، خدا کا ہے، یہ بالکل
ایک مصالحانہ اعلان ہے، لیکن لوگ اسکو اس معنی میں پیش کرتے ہیں، کہ گویا اسلام کا حکم یہ تھا کہ
مسلمان دیوانہ وار تلوار لئے پھرتے اور جس کو پاتے اسکو ڈرا دھمکا کر کہتے کہ کلمہ پڑھو ورنہ سر قلم کردینگے،
غور کرو، اگر یہ حکم ہوتا تو قیدی اقرار توحید کئے بغیر اس آسانی سے چھوڑے جاتے، اور ہاری ہوئی
قوموں سے اسلام نہیں، صرف چند درہم کا جزیہ لیکر انکو آزاد کردیا جاتا، اور کیا مسلمانوں کو یہ اجازت ملتی کہ

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا	اگر کفار کا محارب فریق صلح کے لئے جھکے
(انفال-۸)	تو تو بھی جھک جا،

بلکہ اس کے بجائے یہ حکم ہوتا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہوجائیں، اُن سے صلح نہ کرنا، اور نیز کیا
مسلمانوں کو یہ حکم ہوسکتا تھا کہ،

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ	اور اگر (لڑائی کے میدان میں) مشرکوں میں سے
فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ	کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اسکو پناہ دے، یہانتک کہ
مَاْمَنَهٗ، ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ	وہ خدا کا کلام سن لے، پھر اسکو اسکے امن کی جگہ
(توبۃ-۱)	پہنچادے، یہ اسلئے کہ یہ بے علم لوگ ہیں،

بلکہ یہ ہوتا کہ پناہ ملنے اور کلام الٰہی سننے کے بعد وہ مسلمان نہ ہو تو اسکو اسکی امن کی جگہ پہنچانے کے بجائے اس کو قتل کر کے جہنم میں پہنچا دو، مگر ایسا نہیں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی امن پسندی اور رواداری کے مفہوم کو کس طرح الٹ پلٹ کر بیان کیا جاتا ہے، حالانکہ اسلام نے ان مشرکوں سے بھی جو ہمارے کسی دوست مشرک قبیلہ کے دوست ہوں اور ہم سے صلح و آشتی کے ساتھ رہنا چاہتے ہوں لڑنے کو منع کیا ہے،

فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا (نساء ۹۰-۱۲)

تو اگر وہ تم سے کنارہ پکڑیں، پھر نہ لڑیں اور تمہارے سامنے صلح کی طرح ڈالیں، تو اللہ نے تمکو اُن پر حملہ کرنے کی راہ نہیں دی،

یعنی پھر اُن پر تلوار اٹھانا درست نہیں، حالانکہ اگر اسلام کی مذہبی جنگجوئی کے وہی معنی ہوتے کہ "یا تلوار یا اسلام" تو کیا اس امن پسندی، اس صلح جوئی اور اس ترک جنگ کی صورت ممکن ہو سکتی تھی،

مسلح تبلیغی جماعتیں غلط فہمی پھیلانے کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ تبلیغ و دعوت کیلئے جو جماعتیں ملک میں بھیجی جاتی تھیں وہ مسلح ہوتی تھیں لیکن یہ حقیقت بھلا دیجاتی ہے کہ یہ عرب کا واقعہ ہے، جہاں کوئی منتظم اور باضابطہ حکومت نہ تھی، جس پر تمام رعایا کی حفاظت کی ذمہ داری ہو، ایک ایک وادی میں ایک ایک قبیلہ اپنی اپنی الگ ریاست قائم کئے ہوئے تھا اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلے سے برسرپیکار تھا، راستوں پر رہزنوں اور ڈاکوؤں کا قبضہ تھا، جن سے اکا دکا آدمی کا صحیح و سالم بچنا ناممکن تھا، اسی لئے جب کہیں کوئی تبلیغی مہم بھیجی جاتی تھی تو بدامنی کے ملک میں رہنے والوں کے عام دستور کے

مطابق وہ اپنی ممکن حفاظت کیلئے مسلح جاتی تھیں، اور اس بات کی دلیل کہ اس مسلح جماعت کا تبلیغ و دعوت کے سوا کوئی مقصد نہ تھا، اس سے ظاہر ہے کہ ان کی تعداد تھوڑی ہوتی تھی جو فوجی حملہ کے لئے کافی نہیں ہو سکتی تھی،

غزوۂ بدر کے بعد جب قریش کا زور ٹوٹ گیا، اور ملک میں اسلام بھی ایک قوت شمار ہونے لگا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض بعض قبیلوں کی درخواست پر مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو تبلیغ و تعلیم کے لئے ادھر ادھر بھیجا تب بھی وہ اکثر راستہ میں جا بجا ماری گئیں، واقعۂ رجیع میں ستر داعیوں کا مارا جانا، واقعۂ بیر معونہ میں چھ یا دس داعی مسلمانوں کا قتل ہونا، سریۂ ابن ابی العوجا میں پچاس مسلمانوں کی شہادت، واقعۂ ذات اطلاح میں چودہ داعی مسلمانوں کا تیروں سے مارا جانا، عروہ بن مسعود ثقفی کا تیروں سے چھد جانا، اس دعویٰ کی شہادت ہے،

تبلیغ و دعوت کی تنظیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ معظمہ میں تشریف فرما رہے، بنفس نفیس اس فرض کو انجام دیتے رہے، ایک ایک کے پاس جاتے اور حق کا پیغام سناتے، شہر سے نکل کر مکہ کے آس پاس جاتے اور آنے جانے والوں کو بشارت سناتے، مکہ سے نکل کر طائف گئے اور وہاں بھی اپنا فرض ادا کیا، یہ بھی خدا کی مصلحت تھی کہ اس نے اپنے آخری دین کا مرکز مکہ معظمہ کو قرار دیا جو عرب کا مرکزی شہر تھا، اور حج کے موسم میں تمام قبیلے خود یہاں آتے تھے، آپ سالہا سال حج کے موسم میں ایک ایک قبیلہ کے پاس جاتے اور خدا کی دعوت پیش کرتے، اسی سالانہ تبلیغ سے اسلام کو وہ جماعت ہاتھ آئی جس کا نام انصار ہے،

الغرض ان تبلیغی سرگرمیوں سے مکہ میں سینکڑوں آدمی مسلمان ہو چکے تھے، مگر قریش کے ظلم

سے وہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ سے وہ حبشہ کی طرف روانہ ہوئے اس سفر کی مصلحت بھی عجیب و غریب تھی، ان مظلوم مسلمانوں کی ہجرت نے یہ موقع بہم پہنچایا، کہ وہ اس مسافرت میں جہاں جہاں سے گذرے اسلام کی آواز پہنچاتے گئے، اور اس طرح مین اور حبشہ دونوں ملکوں میں اسلام کی تحریک روشناس ہوئی،

مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عام مسلمانوں میں سب سے پہلے مبلغ اور داعی حق حضرت ابوبکرؓ تھے مکہ کے بہت سے معزز گھرانوں کے پرجوش نوجوان ان ہی کی تبلیغ سے اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت ابوبکرؓ ہی کی کوششوں سے دائرہ اسلام میں آئے، حضرت ابوبکرؓ کے بعد اسلام کے دوسرے مبلغ حضرت مصعب بن عمیرؓ ہیں جن کے مؤثر وعظ کو سنکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے ہی مدینہ کے گھرانے کے گھرانے توحید کے پرستار ہو گئے تھے مدینہ منورہ آکر اسلام نے امن و اطمینان کی سانس لی، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان نومسلموں کی تعلیم کے لئے جو اطراف ملک سے دار الاسلام میں آتے تھے، نیز ملک کے مختلف گوشوں میں اسلام کی تبلیغ کیلئے ایک جماعت قائم کی جس کا نام عام طور سے اصحاب صُفّہ (چبوترے والے) مشہور ہے، اس میں بعض اوقات ستّر سے زیادہ آدمی داخل رہے ہیں، یہ لوگ ملک میں اسلام کی دعوت کے لئے بھیجے جاتے اور خود نومسلموں کو تعلیم دیتے، بیر معونہ میں ستّر کے قریب جو داعی اور مبلغ راہ میں بیدردانہ قتل ہوئے تھے، وہ اسی جماعت کے ارکان تھے،

ان کے علاوہ اکابر صحابہ جو وقتاً فوقتاً مختلف ملکوں، بادشاہوں، قوموں اور قبیلوں میں اسلام کی دعوت لیکر پھیلے، احادیث و سیر کی کتابوں میں ان کے نام متفرق طور سے ملتے ہیں،

میں نے تھوڑی سی کوشش سے اس قسم کے پینتیس ۳۵ صحابیوں کے نام جمع کئے ہیں جنھوں نے از خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اس فرض کو انجام دیا، انکے نام یہ ہیں، ابو ذر غفاریؓ، طفیل بن عمرو دوسیؓ، جعفر طیارؓ، عمرو بن عبسہ سلمیؓ، ضماد بن ثعلبہؓ، خالد بن ولیدؓ، علی ابن ابی طالبؓ، مہاجر بن ابی امیہؓ، زیاد بن لبیدؓ، خالد بن سعیدؓ، عدیؓ بن حاتم، علاءؓ بن حضرمی، ابو موسیٰ اشعریؓ، معاذ بن جبلؓ، جریر بن عبد اللہ بجلیؓ، دحیہ کلبیؓ، عمرو بن امیہ ضمریؓ، مغیرہؓ بن شعبہ، عمروؓ بن العاص، دبرؓ بن نخیس، عروہؓ بن مسعود ثقفی، عامرؓ بن شہر، منقذ بن جبانؓ، ثمامہؓ بن آثال، محیصہؓ بن مسعود، احنفؓ، ابو زیدؓ انصاری، عمرؓ بن مرہ، عیاشؓ بن ربیع مخزومی، واثلہؓ بن اسقع، عبد اللہؓ بن حذافہ سہمی، حاطبؓ بن ابی بلتعہ، سلیطؓ بن عمرو بن عبد شمس، شجاعؓ بن وہب اسدی، ان ہی مبلغوں اور داعیوں اور قاصدوں کی پکار تھی، جس نے یمن، یمامہ، بحرین، حجاز، نجد، غرض پورے عرب کو بیدار کر دیا، اور عرب سے باہر ایران، شام، مصر، حبش ہر جگہ اسلام کا پیغام پہنچ گیا،

مبلغوں کی تعلیم و تربیت سیرۃ کی دوسری جلد کے آغاز میں اشاعتِ اسلام کی تاریخ اور دعاۃ معلمین کی تعلیم و تربیت کا حال لکھا جا چکا ہے، سلسلہ بیان کے لئے یہاں صرف اس قدر کہنا ہے کہ ان کو سب سے پہلے قرآن پاک کی سورتیں یاد کرائی جاتی تھیں، لکھنا پڑھنا بھی سکھایا جاتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شب و روز کے ارشادات سننے کا موقع بھی ان کو ملتا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تبلیغ کا درس اولین قرآن اور صرف قرآن تھا،

دعوت بالقرآن قرآنِ پاک اسلام کے دعویٰ اور دلیل دونوں کا مجموعہ ہے، اور وہی اسکے مذہب کا صحیفہ ہے، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے مبلغ صحابہ بھی تبلیغ و دعوت میں صرف

قرآن کی سورتیں پڑھ کر سناتے تھے اور جہاں انکو اسکا موقع مل جاتا، وہاں اس کی تاثیر اپنا کام کر جاتی تھی، اور یہ فرض خود قرآن نے اپنا آپ قرار دیا تھا، اسکی تبلیغ کے لئے جہاد کی ضرورت تھی، مگر اس جہاد کا ہتھیار لوہے کی تلوار نہیں بلکہ قرآن کی تلوار تھی، جس کی ضرب کی روک خود اور سپر سے بھی ممکن نہ تھی، اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو اسی تلوار سے جہاد کا حکم دیا فرمایا،

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (فرقان-۵)

تو اے پیغمبر منکروں کا کہنا نہ مان، اور اس قرآن سے ان کے ساتھ بڑے زور سے جہاد کر،

اس پیغام الٰہی کے زمین میں اترنے کی غرض ہی یہ تھی کہ وہ خدا کے بھولے ہوئے بندوں کو ان کا عہد یاد دلائے، فرمایا،

فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ (ق)

تو اے پیغمبر انکو جو میری دھمکی سے ڈرتے ہوں قرآن کے

قرآن رحمت عالم کا پیام عمومی ہے، اور یہی اسکے نزول کی غرض و غایت ہے، فرمایا،

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (فرقان-۱)

برکت والا ہے وہ جس نے حق و باطل میں امتیاز کرنیوالی کتاب اپنے بندوں پر اسلئے اتاری تاکہ وہ تمام دنیا کو ڈرانے

یہی قرآن اسلام کی طاقت اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی ہتھیار تھا جسکی کاٹ نے کبھی خطا نہ کی،

اشاعتِ اسلام کی قدرتی ترتیب

عرب میں صرف تین قومیں تھیں، جن کا اسلام لانا گویا تمام جزیرہ نمائے عرب کا اسلام لانا تھا، یعنی مشرکین، یہود اور نصاریٰ، مشرکین عرب کا مرکز خانہ کعبہ تھا، اور ان کے مذہبی پیشوا قریش تھے، یہود کا صدر مقام مدینہ اور خیبر تھا، نصاریٰ اور مجوس

شام اور یمن کے اطراف میں پھیلے ہوئے تھے،

اس بنا پر الاقرب فالاقرب کے لحاظ سے اشاعت اسلام کی قدرتی ترتیب یہ تھی کہ قریش اور کفار کو پہلے دعوت توحید دیجاتی، پھر یہود کو حلقہ بگوش اسلام بنایا جاتا، اس کے بعد نصاریٰ اور مجوس کو دعوت دیجاتی، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی ترتیب کے ساتھ اسلام کی اشاعت کی، اور اسی بنا پر قرآن مجید کا طریق دعوت مختلف نظر آتا ہے، تمام مکی سورتوں کے مخاطب کفار مکہ تھے، اسی لئے ان میں بت پرستی کی مذمت، توحید کی ترغیب، عجائب قدرت کا بیان، عذاب الٰہی سے تخویف اور صنادید قریش کی مخالفت کے جواب کے سوا کچھ نہیں، لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے، تو یہود سے سابقہ پڑا، اور اب قرآن مجید کا طرز خطاب بدل گیا، چنانچہ ابتدائی مدنی سورتیں زیادہ تر یہود کی مذہبی تاریخ، ان کی تحریفات، ان کی اخلاقی کمزوریوں اور قصص بنی اسرائیل پر مشتمل ہیں، سب سے اخیر میں نصاریٰ کی باری آئی اور فتح مکہ کے بعد قبائل عرب کے وفود کے سلسلہ میں نجران کے عیسائیوں کا وفد آیا، اسی زمانہ میں سورۂ آل عمران نازل ہوئی، جس میں نصاریٰ کا ذکر ہے،

مجوس عرب میں بہت کم تھے، بحرین اور یمن میں خال خال وہ پائے جاتے تھے، وہ بھی ایرانی النسل تھے، خالص عرب نہ تھے، اسلئے قرآن مجید نے خاص طور پر کسی سورہ میں ان سے خطاب نہیں کیا ہے، البتہ جا بجا مناسب موقعوں پر انکا نام لیا ہے، اور ان کے عقائد کی تردید کی اور ان کو ثنویت یعنی دو خداؤں کی پرستش کے بجائے توحید کی دعوت دی ہے،

قبول اسلام کیلئے کیا چیز درکار تھی اگرچہ یورپ کا یہ عام دعویٰ ہے کہ عرب میں اسلام صرف تلوار کے

زور سے پھیلا، لیکن ابتدا میں جن اشخاص اور جن قبائل نے اسلام قبول کیا اُن کے اوصاف کے پیش نظر کر لینے کے بعد صاف ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اپنے لئے صرف اثر پذیر دل کا جویاں تھا، اور جب یہ آشیانہ مل جاتا تھا، تو اس کے سامنے یہ طائر قدس اپنے پر ڈال دیتا تھا، چنانچہ ابتدا بعثت میں جن اشخاص نے اسلام قبول کیا، وہ وہی تھے، جو نیک طبع، ایماندار، راستی پسند اور حق جو تھے، اور جو ہوس کے اوصاف و خصائص سے واقف تھے، گذشتہ آسمانی مذاہب سے کچھ نہ کچھ آگاہ تھے، اور معاشرت اور تمدن سے بہرہ ور تھے، اشخاص کے علاوہ جن قبائل اور آبادیوں نے اسلام کے قبول کرنے میں پیشدستی کی وہ بھی وہی تھیں جن میں یہ خصوصیتیں پائی جاتی تھیں، عرب کے دو مختلف حصوں جنوبی و شمالی میں سب سے زیادہ اسلام کو کامیابی عرب کے جنوبی حصہ یعنی یمن، عمان، بحرین، یمامہ میں ہوئی، اور شمالی حصہ میں سے مدینہ منورہ اور اس کے اطراف میں ہوئی، کیونکہ وہ تمدنی حیثیت سے دنیا کی دو ممتاز متمدن قوموں، ایرانیوں اور رومیوں سے متاثر تھے، اور مذہبی حیثیت سے یہودیوں اور عیسائیوں سے ان کا میل جول اور خلا ملا تھا، اہل مدینہ بھی یہودیوں کے تمدن و معاشرت، روایات اور رسم و رواج سے بہت کچھ متاثر تھے،[1]

اسلام کو عربوں سے جس قدر لڑائیاں پیش آئیں وہ سب نجد اور حجاز میں پیش آئیں، لیکن مسلمانوں کی کوئی جرار فوج مدینہ، یمن، عمان، یمامہ اور بحرین کو فتح کرنے کے لئے نہیں بھیجی گئی، انصار مدینہ نے خود مکہ میں آکر اسلام کو لبیک کہا، اطراف مدینہ کے قبائل میں غفار نے خود مکہ آکر قریش کی تلوار کی آگ میں کھڑے ہو کر لا الہ الا اللہ پڑھا، یمن سے دوس کے قبیلہ کے آدمیوں نے خود مکہ معظمہ پہنچکر ایمان کی دولت حاصل کی، اور اس کے سردار نے اپنا قلعہ اسلام کی پناہ کیلئے پیش

کیا، اشعر کا قبیلہ بھی اسی زمانہ میں غائبانہ مشرف بہ اسلام ہوا، ہمدان کا قبیلہ حضرت علیؓ کی دعوت پر ایک دن میں مسلمان ہو گیا،

عمان کا بھی یہی حال ہوا، وہاں بھی اسلام نے صرف اپنی تبلیغی کوششوں کے ذریعہ سے اقتدار حاصل کیا، ایک بار آپ نے عرب کے کسی قبیلے کے پاس ایک آدمی بھیجا، وہ لوگ اسکے ساتھ سختی سے پیش آئے اور اس کو زدوکوب کیا، اس نے آکر آپ سے یہ واقعہ بیان کیا، تو آپ نے فرمایا کہ اگر اہلِ عمان ہوتے تو تم کو نہ گالیاں دیتے نہ مارتے (مسلم فضائل اہل عمان)

یمامہ کے رئیس ثمامہؓ قید ہو کر مدینہ آئے، یہاں آزاد کر دیئے گئے، مگر مدینہ کی مسجد میں جو جلوہ انھوں نے دیکھا، اپنی ظاہری مادی آزادی کے بعد بھی اس کی نورانی زنجیر سے انھوں نے رہائی نہ پائی، خود بخود مسلمان ہو گئے، اور اپنے قبیلہ میں جا کر اسلام کے داعی بن گئے، اور آخر خون کا ایک قطرہ گرے بغیر اسلام نے وہاں اکثریت حاصل کر لی،

دیہاتوں میں سب سے پہلے قریۂ جواثی نے صدائے توحید پر لبیک کہا، جو مضافاتِ بحرین میں تھا، اسی قریۂ جواثی کے باشندے فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے، چنانچہ مسجد نبوی کے بعد عرب کے دیہاتوں میں سب سے پہلا جمعہ اسی گاؤں میں پڑھا گیا[1]، بارگاہ نبوت میں عرب کے وفود اگرچہ فتح مکہ کے بعد حاضر ہوئے، لیکن بحرین کے لوگوں نے اس میں تمام قبائل عرب پر سبقت کی، چنانچہ ۵ھ میں سب سے پہلا وفد جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا وہ قبیلہ عبدالقیس کا تھا، جو بحرین میں سکونت گزیں تھا،

---

[1] صحیح بخاری، باب الجمعہ فی القریٰ والمدن، [2] صحیح مسلم کتاب الایمان،

اہلِ یمن کا شمار اگرچہ مہاجرین اولین میں نہیں کیا جاتا، لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کا حال معلوم ہوا تو اسی وقت حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ بھی یمن سے ۵۲ آدمیوں کو لیکر مدینہ کی طرف ہجرت کی غرض سے روانہ ہو گئے، بحری سفر تھا، وہ لوگ کشتی میں سوار ہوئے تو باد مخالف کے جھونکوں نے اس کو حبشہ میں پہنچا دیا، جو مسلمانوں کا سب سے پہلا دار البحرت تھا، وہاں حضرت جعفر بن ابی طالبؓ سے ملاقات ہوئی، تو انھوں نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمکو یہیں اقامت کا حکم دیا ہے، تملوگوں کو بھی یہیں ٹھہر جانا چاہئے، چنانچہ وہ لوگ وہیں مقیم ہو گئے، اور فتح خیبر کے زمانے میں مہاجرین حبشہ کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے[1]،

یہ حقیقت ہے کہ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ جہالت اور وحشت تھی اور اسکی اشاعت کی سب سے بڑی محرک چیز تمدن، معاشرت اور اخلاق کی بلندی اور کتب آسمانی اور دیگر مذاہب سے واقفیت تھی، خود قرآن مجید نے اسکو ظاہر کیا ہے،

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ	دیہاتی بدوی کفر اور نفاق میں سب سے زیادہ سخت
اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى	ہیں، اور زیادہ اس کے اہل ہیں کہ وہ ان احکام کو
رَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ	نہ جانیں، جو خدا نے اپنے رسول پر اتارے ہیں،
(توبۃ - ۱۲)	اور اللہ جانتا اور حکمت والا ہے،

اور بھی اس قسم کی آیتیں ہیں، جو لوگ بادیہ سے آکر اسلام لائے تھے، اور کچھ مسائل سیکھ کر واپس چلے جاتے تھے ان سے جو بیعت لیجاتی تھی، اس کا نام بیعتِ اعرابی تھا، جو کم درجہ کی

---

[1] صحیح مسلم فضائلِ جعفرؓ بن ابی طالب و اسماءؓ بنت عمیس،

تھی، اس بنا پر بادیہ میں الگ تھلگ رہنا صحابہ کے زمانہ میں معیوب سمجھا جاتا تھا، بلکہ بعض لوگ اس کو ارتداد کی علامت سمجھتے تھے[1]،

اشاعتِ اسلام کے اسباب و ذرائع گذشتہ مباحث پر ایک نظر ڈالنے کے بعد خود بخود یہ عقدہ کھل جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دین حق کو عربوں میں کس طرح پھیلایا، اور آپ کو کیونکر کامیابی ہوئی، تاہم اگر واقعات کی روشنی میں ایک ایک صحابی کے قبولِ اسلام کے اسباب کی تلاش کی جائے، تو حسب ذیل اسباب سامنے آئیں گے،

۱- اسلام کے نشر و اشاعت کا سب سے مقدم اور اصلی سبب معجزۂ قرآنی تھا، قرآن مجید جس موثر اور دل کپکپا دینے والے طریقہ سے عقائد و معارف و اخلاق کی تلقین کرتا تھا، اُسکے سامنے وہ تمام عوائق اور موانع جن کا ذکر اوپر ہو چکا، فنا ہو جاتے تھے، جو لوگ سرے سے خدا کے وجود کے منکر تھے، قرآن مجید انکے سامنے عالم کی بوقلمونی مظاہر قدرت کی بوالعجبی، کائنات کی رنگینی، اجرام فلکی کی جلوہ گری اور عناصر کی نگار آرائی سے اس طرح استدلال کرتا تھا،

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ	تم خدا کا انکار کس طرح کرتے ہو، حالانکہ تم کبھی
اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ	بیجان تھے، تو اس نے تمکو زندگی بخشی، پھر ایک دن
يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ،	تمکو مردہ بنا دیگا، پھر زندہ کریگا، اور پھر اسی کے
(بقرہ ۳-۴)	پاس واپس کئے جاؤگے،
اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	آسمان و زمین کی پیدائش میں، شب و روز

[1] صحیح مسلم کتاب الامارۃ اور سنن نسائی کتاب البیعۃ،

وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ
الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ
وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ
فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ
فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ
وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ
وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ

(بقرہ ۱۶۴-۲۰)

کے اختلاف میں اُن کشتیوں میں جو سمندر میں لوگوں
کے لئے سود مند چیزوں کو لیکر چلتی ہیں، بادلوں
سے پانی برساتے ہیں، اس پانی سے مردہ زمین
کو زندہ کرتے ہیں، اور اس زمین میں ہر قسم کے
جاندا روں کے پھیلانے میں، ہواؤں کے چلانے
میں، ان بادلوں میں جو فضائے آسمانی میں مسخر
ہیں، دانش مندوں کے لئے یقیناً بڑی
نشانیاں ہیں،

وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ
وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ
يُرْجَعُونَ (آل عمران-۹)

آسمان و زمین میں جو بھی ہے، برضا، یا مجبوراً
اسی کا اطاعت گذار ہے، اور اسی کی طرف
وہ سب لوٹائے جائیں گے،

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ
وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِأُولِي
الْأَلْبَابِ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَ
قُعُودًا وَعَلَى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي
خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا
خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا (آل عمران-۲۰)

آسمان و زمین کی خلقت، اور شب و روز کے
الٹ پھیر میں اُن ارباب عقل کے لئے بے شبہ بڑی
نشانیاں ہیں، جو اٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے (ہر حال میں)
خدا کو یاد کرتے ہیں، اور آسمان و زمین کی خلقت
پر غور کرتے ہیں، کہ خدایا تو نے یہ بیکار پیدا
نہیں کیا،

هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُکُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ
حَتّٰٓی اِذَا کُنْتُمْ فِی الْفُلْکِ وَجَرَیْنَ
بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا
رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ
مِنْ کُلِّ مَکَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ
بِهِمْ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ

(یونس - ۳۰)

وہ وہ ہے، جو تمکو خشکی اور دریا میں سفر کراتا ہے،
یہانتک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو، اور موافق ہوا
کشتی والوں کے لئے جاری ہو، اور لوگ خوش ہوتے
ہیں کہ (دفعتہ) زور کا جھکڑ آیا، اور ہر طرف سے
موجیں آگئیں، اور لوگوں کو یقین ہو چلا کہ
اب وہ گھر گئے، اس وقت وہ خدا کو مخلص ہو کر
پکارنے لگتے ہیں،

وَمِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ
اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْهَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ
مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ
لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ وَمِنْ
اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَاَلْوَانِکُمْ
اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ وَمِنْ
اٰیٰتِهٖ مَنَامُکُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ
وَابْتِغَآؤُکُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ
لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ (روم-۳)

اور خدا کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تمہارے
لئے تم ہی میں سے جوڑے بنائے کہ تم کو ان سے تسلی ہو
اور تم میں باہمی محبت اور ہمدردی پیدا کی، بیشک
میں سوچنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں، اور اسکی
نشانیوں میں سے آسمان اور زمین کا پیدا کرنا ہی اور
تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا ہی اس بات
میں جاننے والوں کیلئے نشانیاں ہیں اور خدا کی نشانیوں
میں سے تمہارا رات اور دن میں سونا اور خدا کے فضل
(روزی) کو ڈھونڈھنا ہے، اس میں سے سننے
والوں کے لئے نشانیاں ہیں،

خدا، یا ایک قوتِ اعظم کا اعتراف، خود انسان کی فطرت ہے، لیکن غفلت شعاری اور آبائی اثر اور دیگر اسباب سے یہ فطرت کبھی کبھی مردہ اور بے حس ہو جاتی ہے، قرآن مجید اسی خفتہ حس کو بیدار کرتا تھا،

اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (ابراہیم)

کیا خدا میں شک ہے، جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے،

کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَکُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ، (بقرہ ۳-۴)

اور کیسے تم خدا کا انکار کرتے ہو، حالانکہ تم بیجان تھے، تو اس نے تمکو زندگی دی، پھر وہ تمکو موت دیگا، پھر وہ تمکو زندہ کریگا، پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤگے،

عرب میں ملحد کم تھے، زیادہ تر بلکہ قریباً تمام تر مشرکین تھے، جو خدا کو اگرچہ مانتے تھے، لیکن یہ بھی مانتے تھے کہ اس کے سوا اور بھی خدا ہیں، جو خدا کے شریک ہیں، اور نظام عالم ان ہی کے ہاتھ سے انجام پاتا ہے، انسان کی فطرت ہے کہ جس سے براہ راست اسکو کام پڑتا ہے اسکو زیادہ مانتا ہے، اسی سے زیادہ محبت کرتا ہے، اسی کی زیادہ پرستش کرتا ہے، چونکہ مشرکین کا اعتقاد تھا کہ بادلوں کی بارش، غلہ کی پیداوار، نباتات کی روئیدگی، سب اجرام فلکی یا اصنام کا کام ہے، اس لئے اُن کو عبدیت کا جو کچھ تعلق تھا، ان ہی معبودوں سے تھا، وہ انہی کی عبادت کرتے تھے، ان ہی سے محبت رکھتے تھے، ان ہی پر نذر چڑھاتے تھے، ان ہی کے سامنے فریادیاں کرتے تھے، معرکوں میں انہی کے نام کی جے پکارتے تھے، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی کام

اسی شرک اور اصنام پرستی کو مٹانا تھا، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اصل وجود باری کے متعلق بہت کم استدلال ہے، زیادہ تر شرک کا ابطال اور اسکی تحقیر اور تہجین ہے،

قرآن مجید طرح طرح سے نہایت موثر پیرایوں میں شرک کی لغویت کا اظہار کرتا تھا،

أَمَّنْ جَعَلَ الْأَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ
أَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ
بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ءَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ
بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ أَمَّنْ
يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَ
يَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ
الْأَرْضِ ءَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَّا
تَذَكَّرُوْنَ، أَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ
ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ
الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ
ءَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ
أَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ
وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ
ءَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ

کیا وہ جس نے زمین کو قرارگاہ بنایا، اور اس کے بیچ میں نہریں بہائیں، اور اس کے لئے پہاڑوں کی میخیں گاڑیں، اور دونوں دریاؤں میں اوٹ رکھا، کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان میں اکثر لوگ جانتے نہیں کیا وہ جو پریشان خاطروں کی سنتا ہے جب وہ اسکو پکارتے ہیں، اور بلا کو ہٹا دیتا ہے، اور تمکو دنیا کا حکمراں بناتا ہے، کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے تم بہت کم سوچتے ہو، کیا وہ جو تمکو خشکی اور تری کی اندھیریوں میں راستہ دکھاتا ہے، اور وہ جو کہ اپنی رحمت (بارش) کے آگے ہواؤں کو بھیجتا ہے، کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے، مشرکین جن کو خدا کا شریک کہتے ہیں، خدا ان سے برتر ہے، آیا کون ہے، جو آفرینش کا آغاز کرتا ہے، پھر اسکو لوٹاتا ہے، اور وہ کون

إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ

(نمل - ۵)

ہی جو تمکو آسمان و زمین سے روزی دیتا ہی، کیا خدا کے سوا کوئی اور ہے تو کہدے کہ اگر سچے ہو تو دلیل لاؤ:

کفار و مشرک عموماً قیامت کے منکر تھے، اور کہتے تھے کہ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ یعنی جب ہڈیاں سڑ گل چکیں، تو اب کون ان کو جلائیگا، قرآن مجید ان سے خطاب کرتا تھا،

اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى، فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى. اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰى اَنْ يُّحْيِيَ الْمَوْتٰى

کیا انسان پہلے منی نہیں تھا، پھر گوشت کا لوتھڑا بنا، پھر خدا نے اس کو ٹھیک کیا، اور اس سے دو جوڑ مرد اور عورت بنائے، کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مردے کو زندہ کر دے،

(قیامۃ - ۲)

غرض عقائد، عبادات، اخلاق، اعمال، ہر چیز کو قرآن اس موثر اور دلنشین طریقہ سے ادا کرتا تھا کہ دل میں گھر کر جاتا تھا، اور رسم و عادات کا بند اس سیلاب کو کسی طرح روک نہیں سکتا تھا، اس پر بھی جو کفر پر ثابت قدم رہے، وہ ذاتی اغراض کا اثر تھا، حقیقی جحود اور انکار نہ تھا،

تمام بڑے بڑے صحابہ، بڑے بڑے رؤسائے قبائل، بڑے بڑے شعراء اور خطباء قرآن ہی سن کر ایمان لائے. حضرت عمرؓ کس ارادہ سے چلے تھے، لیکن جب قرآن مجید کی آیتیں سنیں تو کانپ اٹھے اور اسلام قبول کر لیا، عتبہ جو رئیس قریش اور علوم عرب کا ماہر تھا جب اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر کہا کہ تم نبوت کی دعوت سے باز آؤ، ہم

تمہارے لئے سب کچھ مہیا کر دیتے ہیں، آپ نے حٰمٓ کی ابتدائی آیتیں پڑھیں، جب یہ آیت آئی،

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ (حٰمٓ۔ فصلت۔ ۲)

تو اگر وہ منہ پھیریں تو کہدے کہ میں تم کو اس کڑک سے ڈراتا ہوں جو عاد و ثمود کی کڑک کی طرح ہے،

تو عتبہ نے بیتاب ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ پر ہاتھ رکھدیا، اور کہا خدا کے لئے بس، تم کو قرابت کی قسم دلاتا ہوں، پھر واپس جاکر قریش سے کہدو کہ محمدؐ جو کلام پیش کرتے ہیں، وہ نہ تو شعر ہے نہ جادو ہے، اور نہ کہانت[1] ہے، (بلکہ کوئی اور چیز ہے)، حضرت ابوذرؓ نے اسلام لانے سے پہلے اپنے بھائی انیس کو جو شعرائے عرب میں تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تحقیقِ حال کے لئے بھیجا تھا، وہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، اور قرآن مجید سنا تو جا کر حضرت ابوذرؓ سے کہا کہ لوگ ان کو کاہن اور شاعر کہتے ہیں، لیکن میں کاہنوں اور شاعروں دونوں کے کلام سے واقف ہوں، اُن کا کلام دونوں سے الگ ہے، انیس کے بعد حضرت ابوذرؓ خود گئے، اور واپس آئے تو ان کا آدھا قبیلہ اسی وقت مسلمان ہو گیا[2]،

ولید بن مغیرہ (حضرت خالدؓ کا باپ) جو اسلام کا سب سے بڑا دشمن تھا، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور آپ نے یہ آیتیں پڑھیں

---

[1] علامہ ابن تیمیہ نے الجواب الصحیح جلد ۴ صفحہ ۴ میں مسند ابو یعلیٰ وغیرہ سے روایت نقل کی ہے، نیز یہ روایت مستدرک حاکم میں بھی ہے، [2] صحیح مسلم فضائل حضرت ابوذرؓ،

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ

(نحل - ۱۳)

خدا عدل کا، احسان کا، اور رشتہ داروں کو عطا کرنے کا حکم دیتا ہے، اور فحش سے، بُری بات سے اور ظلم سے منع کرتا ہے، وہ تمکو سمجھاتا ہے کہ شاید تم سمجھ جاؤ،

ولید نے کہا پھر پڑھنا، آپنے دوبارہ پڑھا، واپس گیا اور قریش سے جاکر کہا کہ یہ انسان کا کلام نہیں[1]،

عثمان بن مظعونؓ بڑے پایہ کے صحابی، اور سابقین اسلام میں ہیں، یہی آیتیں ہیں جن کو سُن کر ان کے دل نے سب سے پہلے اسلام کا جلوہ دیکھا، وہ خانۂ کعبہ کو جارہے تھے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے راستہ میں اپنے پاس بٹھا لیا، پھر فرمایا کہ ابھی مجھ پر یہ کلام اترا ہے، یہ کہہ کر آپنے اوپر والی آیتیں پڑھیں، عثمانؓ کہتے ہیں کہ یہ پہلا موقع تھا کہ اسلام نے میرے دل میں گھر کیا[2]،

جبیر بن مطعم نے کفر کے زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سورۂ طور پڑھتے سنا، جب اس آیت پر پہنچے،

أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ أَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بَلْ لَا يُوقِنُونَ أَمْ عِنْدَهُمْ خَزَائِنُ رَبِّكَ أَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُونَ

(طور - ۲)

کیا یہ لوگ از خود پیدا ہوگئے یا یہ خود خالق ہیں، کیا آسمان اور زمین کو ان ہی لوگوں نے پیدا کیا، بلکہ (واقعہ یہ ہے کہ) ان میں ایمان نہیں، کیا انکے پاس خدا کے خزانے ہیں، کیا یہی لوگ سربراہ کار ہیں،

---

[1] الجواب الصحیح جلد ۴ ص ۶ بحوالہ عبد الرزاق [2] مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۳۱۵ و ادب المفرد امام بخاری باب البغی،

تو خود جبیرؓ کا بیان ہے کہ مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرا دل اڑنے لگا[1]۔

طفیل بن عمرؓ دوسی مشہور شاعر اور شرفائے عرب میں تھے، ہجرت سے پہلے وہ مکہ گئے، لوگوں کو ان کے آنے کی خبر ہوئی تو اُن کے پاس گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کہا کہ ان کے پاس نہ جانا، وہ لوگوں پر جادو کر دیتے ہیں، لیکن جب حرم میں اتفاقاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قرآن سنا تو ضبط نہ کر سکے اور مسلمان[2] ہو گئے،

ہجرت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب طائف کا سفر کیا، اور مشرکین کو اسلام کی دعوت دی تو اگرچہ ادھر سے اس کا جواب ڈھیلا اور پتھر تھا، تاہم خالد العدوانیؓ نے جو طائف کے رہنے والے تھے، آپ کو

وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ (طارق) — قسم ہے آسمان کی اور رات کے چلنے والے ستارے کی

پڑھتے سنا تو وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے اسی حالت کفر میں پوری سورہ یاد کر لی، اور[3] آخر اسلام لائے،

حضرت ابوبکرؓ کو تیام مکہ کے زمانہ میں بعض مشرکین نے اپنی پناہ میں لے لیا تھا، اسی زمانہ میں انھوں نے ایک مسجد بنوائی تھی، اور اس میں نماز پڑھا کرتے تھے، لیکن نماز بلند آواز سے پڑھتے تھے، جس کو سنکر محلہ کے نوجوان اور عورتیں جمع ہو جاتیں، اور قرآن سنتیں تو انکا دل خود بخود اسلام کی طرف کھینچتا، چنانچہ اسی بنا پر کفار نے حضرت ابوبکرؓ سے شکایت کی کہ قرآن پکار کر نہ پڑھا کرو، اس سے

---

[1] صحیح بخاری کتاب التفسیر سورۂ طٰہٰ [2] ان کے اسلام کا حال ابن القیم (زاد المعاد) نے بتفصیل لکھا ہے اور ابن اسحٰق کے حوالہ سے لکھا ہے، [3] مسند ابن حنبل ج ۴ ص ۳۲۵،

ہمارے بچے اور عورتیں مفتوں ہوتی جاتی ہیں[1]، انصار اول اول جب مقام عقبہ میں اسلام لائے تو قرآن ہی سنکر اسلام لائے تھے، جو لوگ داعی بناکر بھیجے جاتے اُن کو قرآن یاد کرایا جاتا اور وہ جہاں جاتے یہی کارگر آلہ تسخیر لیکر جاتے، نجاشی کے دربار میں کفار قریش جب سفیر بنکر گئے، اور ان کی شکایت پر نجاشی نے مسلمانوں کو بلاکر باز پرس کی تو حضرت جعفر طیارؓ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں[2]، نجاشی بے اختیار رو پڑا اور کہا کہ خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل ایک ہی چشمہ سے نکلے ہیں[3]،

حبش میں جب آپ کی بعثت کا چرچا ہوا، تو بیس[20] شخص جو مذہباً عیسائی تھے تحقیقِ حال کے لئے مکہ میں آئے، اور آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپنے ان کے سامنے قرآن مجید کی آیتیں پڑھیں، ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے، اور اسی وقت اسلام لائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے یہ لوگ اٹھے تو ابوجہل نے ان سے مل کر کہا کہ تم سخت احمق ہو اتنے دور سے سفر کرکے آئے اور دم بھر میں اپنا مذہب بدل لیا، انھوں نے کہا ہم تم سے لڑنا نہیں چاہتے[4]، لَكُمْ دِينُكُمْ وَلَنَا دِينُنَا،

قرآن کی پیشین گوئیوں کی صداقت نے بھی لوگوں کے دلوں کو کھینچا، چنانچہ اہل ایران کے مقابلہ میں رومیوں کی فتح کی جو پیشین گوئی کی تھی، جس دن یہ پیشینگوئی حرف بحرف پوری ہوئی، صدہا کافر مسلمان ہوئے[5]،

ایک ضروری نکتہ عام خیال یہ ہے کہ اہلِ عرب جو قرآن مجید سنکر اسلام قبول کر لیتے تھے، وہ صرف فصاحت و بلاغت کا کرشمہ تھا، یعنی چونکہ عرب میں شعر و خطابت کا بہت چرچا تھا

---

[1] بخاری شریف ہجرت [2] مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۲۹۱ [3] ابن ہشام جلد اول صفحہ ۱۳۶ مطبوعہ مقرر کردہ ہجرت حبش [4] صحیح ترمذی تفسیر سورہ روم

اور تمام ملک میں شاعری کا مذاق سراسر کر گیا تھا، اس لئے جب وہ دیکھتے تھے کہ کسی اور شاعر یا خطیب کا کلام ایسا فصیح و بلیغ نہیں ہے، تو وہ اسلام قبول کر لیتے تھے،

بے شبہہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجزہ ہے، لیکن اس کا اعجاز جس قدر عبارت و انشاء میں ہے، اس سے کہیں زیادہ معانی و مطالب میں ہے،

فرض کرو کہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ایسا ہی معجز ہوتا ہے، جیسا اب ہے لیکن اس میں صرف تاریخی واقعات یا اسی قسم کی اور کوئی بات ہوتی تو کیا بھی اثر پیدا ہو سکتا تھا، قرآن مجید ایک طرف تو فصاحت و بلاغت کے بنا پر اعجاز کا کام دیتا تھا، دوسری طرف جو مطالب اور مقاصد ادا کرتا تھا، وہ اسلام ہی کے مقاصد اور مطالب تھے، وہ خدا کی عظمت و جلالت، اصنام کی تحقیر و تذلیل، انسان کا عجز و تعبد، سزا و جزا، بعث و نشور، جور و ظلم کی تقبیح، اخلاق حسنہ کی تحسین، ان مطالب کو اس طرح ادا کرتا تھا کہ خود بخود وہ دلوں میں گھر کر جاتے تھے اور ان کو یہ نظر نہیں آتا تھا، کہ وہ ان باتوں کو اسلئے مان رہے ہیں کہ مسلمان ہو چکے ہیں، بلکہ یہ باتیں براہ راست ان کے دل میں اتر جاتی تھیں، اور وہ مسلمان ہو جاتے تھے؛

موانع کا ازالہ عرب کو جو چیزیں اسلام سے روکتی تھیں ان میں سب سے اہم (جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں) ان کے اوہام اور اعتقادات باطلہ تھے، جو سینکڑوں ہزاروں برس سے چلے آتے تھے، یا سیاسی و معاشی ضرورتیں تھیں، مقدم الذکر باتوں کا قرآن مجید اور اعجاز نبوی نے استیصال کر دیا، عرب میں جو لوگ صاحب فہم اور ذی اثر تھے، اور سیاسی اسباب سے مجبور نہ تھے، یہ ناممکن تھا کہ وہ قرآن سنتے اور ان کے تمام عقائد اور اوہام دفعۃً قانع ہو جاتے، یہ ارباب اثر جب خود متاثر

ہو جاتے تھے، اقوان میں سے ایک ایک شخص کے اثر سے ہزاروں اشخاص مسلمان ہو جاتے تھے کیونکہ قبائل پرستی کی بنا پر قبیلہ کا ہر معزز رئیس اپنے پورے قبیلہ کے دل و دماغ کا مالک ہوتا تھا،

البتہ جو لوگ سیاسی اسباب سے مطلقاً دعوتِ اسلام کی طرف متوجہ ہی ہوتا نہیں چاہتے تھے، انھوں نے بار بار دارالنبوۃ (مدینہ منورہ) پر چڑھائیاں کیں لیکن نصرتِ ایزدی نے ان کو اس قدر شکستیں دیں کہ بالآخر مجبور ہو کر بیٹھ گئے، ان میں سے کچھ فنا ہو گئے کچھ چار و ناچار اسلام کے حلقہ میں داخل ہوئے، جن میں سے اکثر رفتہ رفتہ بالآخر دل سے مسلمان بن گئے،

قبائل کی ریاست سیاسی حیثیت سے گو اسلام کے مخالف تھی لیکن بعض وجوہ سے اسلام کو تائید بھی پہنچاتی تھی، اسلام کی جمہوریت جس قدر ریاست کی مخالف تھی، اسیقدر عام جماعت کی حامی تھی، اسلام سے اگر ایک رئیس کی شانِ ریاست و خودسری کو نقصان پہنچتا تھا، تو ہزاروں آدمیوں کو نظر آتا تھا، کہ اسلام قبول کر لینے سے ہر شخص رئیس کا ہمسر ہو جاتا ہے، غرض اسلام اگر ایک رئیس کو مٹاتا تھا، تو سینکڑوں کو رئیس بنا دیتا تھا،

اس کے ساتھ رؤسا کی ریاست بالکل زائل نہیں ہو جاتی تھی، بلکہ اسلام قبول کرنے پر وہ اپنے قبیلہ کے رئیس باقی رہتے تھے، صرف اتنا ہوتا تھا کہ ان کی بے قید مطلق العنانی قائم نہیں رہتی تھی، اور اسلامی احکام کا پابند رہنا پڑتا تھا، اسلئے اگر کوئی خود غرضی بھی کرنا چاہتا تھا، تو اسکو بھی یہ سودا گراں نہیں پڑتا تھا، مولفۃ القلوب کا گروہ اسکی ایک صریحی نظیر تھا،

اب صرف معاشی ضرورت سدِ راہ ہو سکتی تھی، لیکن لوگوں کو نظر آتا تھا کہ جن حدود میں اسلام کی حکومت قائم ہو جاتی ہے، وہاں امن و امان قائم ہونے کی وجہ سے تجارت اور دیگر

ذریعۂ معاش کثرت سے ترقی کر جاتے ہیں،

۲۔ نبوت کے متعلق اُن کو جو شکوک تھے، مشاہدہ اور تجربہ نے اُنکا پردہ چاک کر دیا، بڑی سے بڑی انسانیت اور پاک سے پاک زندگی کا جو تخیل ایک انسان کے ذہن میں آسکتا تھا محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی اس سے بھی بدرجہا بالاتر اور ارفع تھی، اُن کو نظر آتا تھا کہ گو مدعیِ نبوت بظاہر جامۂ بشریت میں ہے، لیکن اپنی معنوی زندگی، اپنے معجزانہ اخلاق، اپنے مافوق الفطرت علم و معرفت، اپنے ربانی کرشموں کی بنا پر بشریت سے کوئی بالاتر مخلوق ہے، مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَا اِلَّا مَلَكٌ کریمہ، قرآن مجید نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقِ نبوت پر اسی مقدس اور معصوم زندگی سے استدلال کیا ہے،

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (یونس-۲)

اے قریش! نبوت سے پہلے بھی میں نے تم میں ایک مدت دراز تک زندگی بسر کی ہے، کیا تم نہیں سمجھتے،

زندگی کا یہی اعجاز تھا جس نے ظہورِ نبوت سے پہلے ہی امین کا خطاب آپ نے حاصل کر لیا تھا، بیوی کے برابر انسان کے اصلی حالات و اخلاق کا واقف کار کوئی اور نہیں ہو سکتا، نبوت محمدی کا معتقد اوّلین دنیا میں کون تھا، ام المومنین خدیجۃ بنت خویلد، لیکن ان کی اس زود اعتقادی کا آخر کیا سبب تھا، چالیس برس کے معجزانہ اخلاق، اور مافوق الفطرۃ اوصاف و حالات کا تجربہ! وہ خود پیغمبر کو خطاب کر کے نبوت کی تلقین ان الفاظ میں دیتی ہیں، محمد! خدا کبھی تمہیں رسوا نہ کریگا، تم رشتہ داروں کے ساتھ احسان کرتے ہو، ناداروں کی طرف سے قرض ادا کرتے ہو، محتاجوں کی خبر لیتے ہو، مہمانوں کے ساتھ مدارات پیش آتے ہو، جو لوگ حقیقت میں مبتلائے آلام ہیں، ان کی اعانت کرتے ہو[1]،

[1] صحیح بخاری، بدء الوحی،

سُن چکے ہو کہ عرب میں آپ کی نبوت کا جب چرچا پھیلا تو ابو ذرؓ غفاری نے انیسؓ اپنے بھائی کو تحقیقِ حال کے لئے بھیجا، انھوں نے واپس آکر یکر نبوت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا میں ایک ایسے شخص کو دیکھ کر آیا ہوں جو بھلائیوں کا حکم دیتا ہے، اور برائیوں سے روکتا ہے"[1]

نبوت کے بعد قریش نے ذات نبوی کیساتھ گو عداوت اور کینہ پروری کا کوئی پہلو اٹھا نہیں رکھا، تاہم کوئی ادنیٰ اخلاقی جرم بھی آپ کی طرف منسوب نہ کر سکے، اسلام کے سب سے اوّل اعلانِ دعوت کے موقع پر جب آپنے ایک پہاڑ پر کھڑے ہو کر قریش کے مجمع کو مخاطب کیا، اور پوچھا کہ اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کی پشت پر ایک فوج گراں تم پر حملہ آور ہونے کو تیار ہے، تو کیا سچ مانو گے؟ سب نے بیک آواز کہا "محمد! تیری بات آج تک ہم نے جھوٹ نہ پائی"[2] ابو سفیان جو ہجرت کے آٹھویں سال تک اسلام کے سخت ترین دشمن تھے، ۶ھ میں ہرقل قیصر روم کے دربار میں کفارِ قریش کی ایک جماعت کے ساتھ محمد رسول اللہ کے اخلاق و اوصاف کے متعلق اپنی شہادتیں پیش کر رہے تھے، تاہم وہ ایک حرف بھی صداقت کے خلاف پیش نہ کر سکے، انھوں نے شہادت دی کہ محمد کبھی جھوٹ نہیں بولے، انھوں نے کبھی بدعہدی نہ کی، شرک سے روکتے ہیں، توحید کی تعلیم دیتے ہیں، عبادت، صدق، عفت، صلہ رحمی کی تاکید کرتے ہیں"[3] ہرقل ہر فقرہ پر کہتا جاتا تھا کہ نبوت کے یہی آثار و دلائل ہیں، یہ سب سے پہلا دن تھا کہ ابو سفیان کے دل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کا یقین کیا[4]،

---

[1] صحیح بخاری جلد اوّل ص۴۹۹ قصۂ اسلام ابی ذرؓ [2] صحیح بخاری تفسیر سورۂ تبت و صحیح مسلم کتاب الایمان باب وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ، [3] صحیح بخاری بدء الوحی،

کتاب کی دوسری جلد میں آپ کے تمام محاسن اخلاق یعنی رفق، ملاطفت، حسنِ معاملت جود و سخا، عدم تشدد، عفو، درگذر وغیرہ کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے، اس پر مجموعی طور پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک معجزہ تھا، اور یہ معجزہ تسخیر قلوب ہی کے لئے عطا ہوا تھا، قرآن مجید اس نکتہ کو خود بتاتا ہے،

وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ۔ (آل عمران ۔۷)

اور محمدؐ اگر تم درشت خو اور سخت دل ہوتے تو لوگ تمہارے پاس سے چل دیتے،

آپ کی یہی معجزانہ کشش تھی جو لوگوں کو کھینچ کھینچ کے دائرۂ اسلام میں داخل کرتی تھی، اور کفار کے جاہلانہ شکوک اور اوہام کو دم کے دم میں مٹا دیتی تھی، صحیح مسلم میں ہے کہ ایک شخص نے آپ سے بہت سی بکریاں مانگیں، آپ نے دیدیں اس پر آپ کی فیاضی کا اس قدر اثر پڑا کہ اپنے قبیلے میں جا کر اس نے کہا "لوگو مسلمان ہو جاؤ کیونکہ محمدؐ اس قدر دیتے ہیں کہ انکو خود اپنے تنگدست ہونے کا مطلق خوف نہیں ہوتا"[1]

فتح مکہ میں جب صفوان بن امیہ مجبوراً اسلام لایا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکو تین سو اونٹ دیدیئے، خود صفوان کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھکو اس قدر دیا کہ آپ پہلے میرے نزدیک مبغوض ترین خلق تھے، لیکن اس فیاضی سے محبوب ترین شخص بنگئے، ہندؓ خاندان نبوت کی قدیم ترین دشمن تھی، جنگ احد میں قوتِ بازوئے اسلام، حضرت حمزہؓ کے شکم کو اسی نے چاک کیا تھا، اسی نے ان کا جگر نکال کر چبایا تھا، جسکو نگل

[1] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۲۹۰ باب ما سئل رسول اللہ شیئاً قط فقال لا، [2] صحیح بخاری باب حسن الخلق والسخا، [3] صحیح مسلم باب

نہ سکی اور پھر اگل دیا تھا، اور اسی نے بعض شہیدوں کے ناک کان کاٹ کر گلے کا ہار بنایا تھا، فتح مکہ میں یہیں بدل کر آپ کی خدمت میں اسلام لانے کیلئے حاضر ہوئی اور اب بھی گستاخی سے باز نہیں آئی، لیکن دربار رسالت میں پہنچکر آپ کے حسنِ خلق سے اس قدر متاثر ہوئی کہ بے اختیار بول اُٹھی، یا رسول اللہ! سطحِ زمین پر آپ کے گھرانے سے زیادہ کوئی گھرانا مجھے مبغوض نہ تھا، لیکن آج آپ کے گھرانے سے زیادہ کوئی گھرانا محبوب نہیں ہے، آپنے یہ سنکر فرمایا خدا کی قسم ہمارا بھی یہی حال تھا[1]

آپؐ پر ایک یہودی عالم کا قرض آتا تھا، اس نے تقاضا کیا تو آپنے فرمایا کہ اسوقت میرے پاس کچھ نہیں ہے، اس نے کہا کہ میں تو لے ہی کے ٹلونگا، آپنے کہا کہ اب میں تمہارے ساتھ بیٹھتا ہوں، چنانچہ آپ ظہر سے لیکر فجر کی نماز تک اُسکے ساتھ بیٹھے رہے، صحابہؓ نے اسکی اس گستاخی پر ناراضی ظاہر کی، اور خدمتِ اقدس میں عرض کی کہ "یا رسول اللہ آپ کو ایک یہودی نے روک رکھا ہے، آپنے فرمایا ہاں لیکن مجھے خدا نے اس سے منع کیا ہے کہ میں کسی ذمی یا اور کسی شخص پر ظلم کروں"، دن چڑھا تو یہودی نے کلمہ پڑھا اور کہا کہ "میرا نصف مال خدا کی راہ میں صدقہ ہے، میں نے یہ گستاخی صرف اس لئے کی کہ توراۃ میں پیغمبر کے جو اوصاف مذکور ہیں ان کا تجربہ کروں"[2]

ثمامہ بن اثال یمامہ کا ایک رئیس تھا، جو اسلام کا مجرم تھا، صحابہ کا ایک دستہ نجد کے اطراف میں بھیجا گیا تھا، حسنِ اتفاق سے وہ راہ میں مل گیا، گرفتار ہوکر مدینہ آیا اور مسجد نبویؐ کے ایک ستون میں باندھ دیا گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کیلئے تشریف

---

[1] مسلم جلد ۲ ص۲۵ باب قضیۂ ہند، [2] مشکوٰۃ ص۵۲۱ کتاب الفتن فی اخلاقہ صلی اللہ علیہ وسلم،

لائے تو اس پر نظر پڑی، آپ نے دریافت کیا کہ ثمامہ تمھارے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے؟ اُس نے کہا کہ اگر قتل کرنا چاہیں تو ایک خونی مجرم کو آپ قتل کریں گے اور اگر عفو فرمائیں، تو یہ احسان ایک احسان شناس کی گردن پر ہوگا، اگر مال کی خواہش ہے تو فرمائیے جو ارشاد ہوگا، حاضر کیا جائیگا،، یہ سنکر آپ اسی حالت میں اسکو چھوڑ کر چلے گئے، دوسرے دن پھر اسی قسم کا سوال و جواب ہوا، تیسرے دن پھر یہی گفتگو کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے اسکے بند گرہ کھولدیئے اور رہا کر دیا، اس پر اس واقعہ کا یہ اثر ہوا کہ مسجد سے نکل کر ایک کھجور کے درخت کی آڑ میں گیا، اور وہاں غسل گیا، غسل کر کے مسجد میں آیا اور کلمۂ توحید پڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مخاطب ہوا "محمدؐ! زمین پر آپ کے چہرہ سے زیادہ کوئی چیز مجھکو مبغوض نہ تھی، لیکن آج وہ مجھکو سب سے زیادہ محبوب ہے، مجھ کو آپ کے دین سے زیادہ کسی دین سے عداوت نہ تھی، لیکن وہ آج میرے لئے تمام مذاہب سے عزیز تر ہوگیا ہے، مجھے آپ کے شہر سے زیادہ کسی شہر سے دشمنی نہ تھی، لیکن وہ آج مجھ کو تمام شہروں سے زیادہ خوشنما نظر آتا ہے"۔

ایک بار آپ کسی سفر میں تھے، اور پانی ساتھ نہ تھا صحابہؓ نے پیاس کی شکایت کی آپ نے ایک صحابی کے ساتھ حضرت علیؓ کو پانی کی جستجو میں روانہ فرمایا، راہ میں ایک عورت اونٹ پر پانی کی دو مشکیں بھری ہوئی لئے جارہی تھی، دونوں صاحب اسکو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے، آپ نے برتن منگوائے اور مشکوں کے منھ کھول دیئے، صحابہؓ نے باری باری سے پانی پینا شروع کر دیا، وہ کھڑی یہ تماشا دیکھتی رہی، فراغت کے بعد اس کے محنت کے صلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کا آٹا اور ستو تھوڑا تھوڑا لوگوں سے جمع کر کے ایک کپڑے میں بندھوا کر اسکے اونٹ پر رکھوا دیا

لہ صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۷۶، کتاب الجہاد والسیر

وہ گھر پہنچی تو لوگوں نے تاخیر کا سبب پوچھا، اس نے کہا راہ میں مجھ کو دو آدمی ملے اور وہ مجھکو اُس شخص کے پاس لے گئے، جس کو لوگ بد دین کہا کرتے ہیں، خدا کی قسم وہ یا تو اس آسمان و زمین کے درمیان سب سے بڑا جادوگر ہے، اور یا واقعی خدا کا رسول ہے،

لیکن اسلام کا یہ اثر صرف اسی کی ذات تک محدود نہ رہا بلکہ تربیت یافتگانِ نبوت کے فیضِ اثر سے اُس کے تمام قبیلے تک وسیع ہو گیا[1]،

نبی کے امتیاز و شناخت کا ذریعہ صرف اس کا اخلاق ہی نہیں اسکی زبان کا ایک ایک حرف، اسکی معصوم شکل و صورت اور اسکی ایک ایک ادا اعجاز اور سرتاپا اعجاز ہوتی ہی،

روے و آوازِ پیمبر معجزہ است (رومی)

آپؐ کی صداقت سے لبریز تقریر کا ایک ایک حرف دل میں اتر جاتا تھا، اور نبوت کا اصلی معیار سامع کے سامنے روشن ہو جاتا تھا،

جب آپ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو تمام مدینہ میں غل پڑ گیا، حضرت عبداللہؓ ابن سلام جو مدینہ کے مشہور یہودی عالم تھے، اپنے نخلستان میں کھجور توڑ رہے تھے، آمد آمد کی خبر ان کے کان میں پہنچی تو فوراً آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ فرما رہے تھے، افشوا السلام واطعموا الطعام، وصلوا الارحام وصلوا والناس نیام تدخلوا الجنۃ بسلام[2] واپس گئے تو اس قدر متاثر تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھ کر حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے مکان میں جونہی پہنچے حضرت عبداللہؓ بن سلام بھی آئے اور کہا کہ میں آپ کی رسالت کی گواہی دیتا

---

[1] بخاری جلد ۱ ص ۴۹ کتاب التیمم [2] ابن حنبل جلد ۵ ص ۴۵ [3] بخاری جلد ۱ ص ۵۵۶ باب ہجرت النبی صلعم و اصحابہ الی المدینہ

ہوں اور نیز یہ شہادت دیتا ہوں کہ آپ ایک حق مذہب لیکر آئے ہیں،

ضماد ایک شخص تھے، جن کے ساتھ زمانۂ جاہلیت میں آپکے دوستانہ تعلقات رہ چکے تھے، وہ جنون کا علاج کرتے تھے، اتفاق سے وہ مکہ میں آئے، تو کفار سے سنا کہ آپ (نعوذ باللہ) مجنون ہوگئے ہیں، وہ آپکے پاس آئے، اور کہا "محمدؐ! میں جنون کا علاج کرتا ہوں"، اسکے جواب میں آپنے ایک تقریر کی اور اس کو ان الفاظ سے شروع کیا،

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ من	تمام تعریفیں خدا کیلئے ہیں میں اسکی حمد کرتا ہوں اور
یھ ـلا اللہ فلا مضل لہ و من	اس سے مدد چاہتا ہوں، خدا جسکو ہدایت دیتا ہے اسکو
یضللہ فلا ھادی لہ و اشھد	کوئی شخص گمراہ نہیں کر سکتا، جسکو گمراہ کرتا ہے اسکو کوئی
الا الہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک	ہدایت نہیں کر سکتا، میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے
لہ، و اشھد ان محمدًا عبدہٗ	سوا کوئی خدا نہیں ہے وہ تنہا ہے، اور اس کا کوئی شریک
و رسولہ،	نہیں ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اسکا بندہ اور رسول ہے

ان پر ان فقروں کا یہ اثر پڑا کہ وہ مکرر سننے کے مشتاق ہوئے، آپنے تین بار ان کلمات کا اعادہ فرمایا، انھوں نے کہا میں نے کاہنوں، جادوگروں اور شاعروں کا کلام سنا ہے، لیکن آپکے اس کلام کیطرح موثر کلام کبھی نہیں سنا، وہ سمندر تک پہنچ جائیگا، ہاتھ لائیے، میں اسلام پر بیعت کرتا ہوں[2]،

حضرت حلیمہؓ کے شوہر حارث یعنی آپکے رضاعی باپ جب مکہ میں تشریف لائے تو قریش نے کہا کچھ سنا ہے، تمہارا بیٹا کہتا ہے کہ لوگ مرکر پھر زندہ ہونگے، انھوں نے آپسے کہا، بیٹا یہ کیا کہتے ہو؟

---

[1] بخاری جلد ۱ ص۵۵۶ باب ہجرت النبی صلعم و اصحابہ الی المدینۃ [2] مسلم باب تخفیف الصلوٰۃ و الخطبہ،

آپ نے نہایت زوردار لہجہ میں فرمایا، ہاں اگر وہ دن آیا تو آپ کا ہاتھ پکڑ کر بتا دوں گا کہ جو کچھ میں کہتا تھا سچ تھا، ان پر اس کا یہ اثر پڑا کہ فوراً مسلمان ہو گئے، اور یہ اثر اسقدر دیرپا ہوا کہ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر میرا بیٹا ہاتھ پکڑیگا تو جنت میں پہنچا ہی کر چھوڑے گا،[1]

انسان کا چہرہ حقیقت کا آئینہ ہے، آپ کی ایک ایک ادا صداقت اور معصومیت کا پیکر تھی، آپؐ کی شکل نہایت پُرجلال تھی، چہرہ پرنور تھا، آواز موقر اور پُررعب تھی، اور ان تمام چیزوں کا مجموعی اثر پیغمبرانہ اعجاز کیساتھ دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا، حضرت عبداللہ بن سلام نومسلم یہودی عالم آپکے چہرۂ مبارک کو دیکھ کر اسی اثر سے متاثر ہوئے اور بے اختیار بول اٹھے تھے

وجهه ليس بوجه كذاب (ترمذی ص۴۰۹) جھوٹے آدمی کا یہ چہرہ نہیں ہو سکتا،

اور یہی کشش تھی جس کا اظہار حجۃ الوداع میں اعراب بادیہ کی زبان سے ان الفاظ میں ہوا تھا

هذا وجه مبارك (ابوداؤد حج جلد ۱ ص۱۴۴) یہ مبارک چہرہ ہے،

بارگاہِ نبوت میں پہنچنے کے ساتھ ہی یہ اثر آنکھوں کی راہ سے دل میں پہنچ جاتا تھا، ابورافع نام ایک شخص قریش کی طرف سے قاصد بنکر آپ کی خدمت میں آئے تھے، جوں ہی چہرۂ اقدس پر نظر پڑی وہ بہزار جان شیدا تھے، اسلام قبول کیا،[2] اور آپ کی غلامی کو فخر سمجھا،[3]

---

[1] اصابہ جلد ۱ صفحہ ۲۹۶ تذکرۂ حارث [2] ابوداؤد کتاب الجہاد، باب یستجن بالامام فی العہود [3] اصابہ و استیعاب

اسلام

یا

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغمبرانہ کام

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس عظیم الشان پیغام کو لیکر آئے تھے اور جس مہتم بالشان کام کو انجام دینے کے لئے بھیجے گئے تھے، نیک دل اور حقیقت شناس لوگ تو سنتے اور دیکھنے کے ساتھ اسکے قبول کرنے پر آمادہ ہوگئے، لیکن جن کے دل کے آئینے زنگ آلود تھے، پیغام کی سچائی، وحی کی تاثیر، پیغمبر کی پُراثر دعوت، اعجازِ معجزیت اور اخلاق کے پرتو سے صاف و شفاف ہوتے گئے اور عوائق، موانع، شبہات اور شکوک کی تو برتو ظلمتیں اور تاریکیاں رفتہ رفتہ چھٹتی چلی گئیں اور اسلام کا نور روز بروز زیادہ صفائی اور چمک کے ساتھ عرب کے افق پر درخشاں اور تاباں ہوتا گیا، یہانتک کہ ۲۳ برس کی مدت میں ایک متحدہ قومیت، ایک متحدہ سلطنت، ایک متحدہ اخلاقی نظام، ایک کامل قانون، ایک مکمل شریعت، ایک ابدی مذہب اور عملی جماعت، خداپرستی، اخلاق ایثار، تدین، تقوی، ایمان داری، اخلاق اور سچائی کا ایک مجسم عہد یعنی ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان پیدا ہوگیا، اور گویا یہی حقیقت تھی، جس کی طرف آپنے اپنی امت کے سب سے بڑے مجمع (حجۃ الوداع) میں اپنی

وفات سے تقریباً دو ماہ پیشتر یہ ارشاد فرمایا،

الا ان الزمان قد استدار کھیئۃ یوم خلق اللہ السموات والارض (بخاری)

ہاں اب زمانہ کا دور اپنی اسی حالت پر آگیا جس حالت پر اس دن تھا جس دن خدا نے آسمان وزمین کو پیدا کیا،

اور یہی حقیقت تھی جس کی نسبت آپنے اپنی وفات سے کچھ دنوں پیشتر ایک نہایت پُر درد و داعی تقریر کے آخر میں یہ الفاظ فرمائے،[1]

قد ترکتکم علی البیضاء لیلھا کنھارھا،

میں تمکو ایک روشن راستہ پر چھوڑ جاتا ہوں جسکی روشنی کا حال ہے کہ اسکی رات بھی دن کے مانند ہے،

اور آخری حجۃ الوداع کے مجمع عام میں تکمیل کی بشارت آئی کہ

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ (مائدہ ۱-۵)

آج میں نے تمھارا دین کامل کر دیا، اور اپنی نعمت تم پر ختم کر دی،

پروفیسر مارگولیتھ جن کی تائیدی شہادت بہت کم مل سکتی ہے، لکھتے ہیں :-

"محمدؐ کی وفات کے وقت اُن کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہا، آپ ایک سلطنت کی جس کا ایک سیاسی و مذہبی دارالسلطنت مقرر کیا گیا تھا بنیاد ڈال چکے تھے آپنے عرب کے منتشر قبائل کو ایک قوم بنا دیا تھا، آپنے عرب کو ایک مشترک مذہب عطا کیا، اور ان میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا"[2]

[1] سنن ابن ماجہ ابواب سنت و بدعت و مستدرک حاکم جلد اوّل ص ۹۶ و مسند ابن حنبل جلد ۴ ص ۱۲۶ [2] لائف آف محمد مارگولیوتھ ص ۴۱۲

ایک دور (یورپ) کے بیگانہ مستشرق کی بہ نسبت جس علم، عرب اور اسلام کے متعلق صرف چند کتابوں سے مستعار ہے، خود ایک عرب عیسائی اہل قلم کو فیصلہ کا زیادہ حق حاصل ہے، بیروت کے مسیحی اخبار الوطن نے ۱۹۱۱ء میں لاکھوں عرب عیسائیوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا انسان کون ہے؟ اس کے جواب میں ایک عیسائی عالم (داور مجاحص) نے لکھا:

دنیا کا سب سے بڑا انسان وہ ہے، جس نے دس[1] برس کے مختصر زمانہ میں ایک نئے مذہب، ایک نئے فلسفہ، ایک نئی شریعت اور ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھی، جنگ کا قانون بدل دیا اور ایک نئی قوم پیدا اور ایک نئی طویل العمر سلطنت قائم کر دی، لیکن ان تمام کارناموں کے باوجود وہ امی اور ناخواندہ تھا، وہ کون؟ محمدؐ بن عبداللہ قریشی، عرب اور اسلام کا پیغمبر، اس پیغمبر نے اپنی عظیم الشان تحریک کی ہر ضرورت کو خود ہی پورا کر دیا، اور اپنی قوم اور اپنے پیروؤں کیلئے اور اس سلطنت کیلئے جس نے اس نے قائم کیا، ترقی اور دوام کے اسباب بھی خود مہیا کر دیئے، اس طرح کہ قرآن اور احادیث کے اندر وہ تمام ہدایات موجود ہیں، جن کی ضرورت ایک مسلمان کو اسکے دینی یا دنیاوی معاملات میں پیش آسکتی ہے، حج کا ایک سالانہ اجتماع فرض قرار دیا تاکہ اقوام اسلامی میں اہل استطاعت ایک مرکز پر جمع ہو کر اپنے دینی و قومی معاملات میں باہم مشورے کر سکیں، اپنی امت پر زکوٰۃ فرض کر کے قوم کے غریب طبقہ کی حاجت پوری کی، قرآن کی زبان کو دنیا کی دینی اور عالمگیر زبان بنا دیا کہ وہ مسلمان اقوام کے باہمی تعارف کا ذریعہ بنجائے، قوم کے ہر فرد کو ترقی کا موقع اسطرح عنایت کیا کہ یہ کہدیا کہ ایک مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان پر صرف تقویٰ کی بنا پر بزرگی حاصل ہے، اس بنا پر

[1] مدینہ منورہ میں آپ دس برس زندہ رہے تھے،

اسلام ایک حقیقی جمہوریت بن گیا، جس کا رئیس قوم کی پسند سے منتخب ہوتا ہے، مسلمانون نے ایک مدت تک اس اصول پر عمل کیا، یہ کہکر کہ عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر کوئی فوقیت نہین، اسلام میں داخل ہونا ہر شخص کے لیے آسان کر دیا، نامسلموں کے لیے اسلامی ملکوں میں عیش و آرام اور امن و اطمینان سے سکونت کی ذمہ داری یہ کہکر اپنے اوپر لے لی کہ "تمام مخلوق خدا کی اولاد ہے، تو خدا کا سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اسکی اولاد کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچائے"، خاندانی اور ازدواجی [illegible] اسکی نظر سے پوشیدہ نہ رہیں اس نے نکاح و وراثت کے احکام مقرر کیے، عورت کا مرتبہ بلند کیا، نزاعات اور مقدمات کے فیصلے کے قوانین بنائے، بیت المال کا نظام قائم کر کے قومی دولت کو بیکار نہ ہونے دیا، علم کی اشاعت اور تعلیم اسکی کوششون کا بڑا حصہ رہی، اس نے حکمت کو ایک مومن کا گمشدہ مال قرار دیا، اسی سبب سے مسلمانون نے اپنی ترقی کے زمانہ مین ہر دروازہ سے علم حاصل کیا، کیا ان کارنامون کا انسان دنیا کی سب سے بڑی ہستی قرار نہ پائے گا،

انگلستان کے مشہور انشاپرداز کارلائل نے اپنے ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" میں لاکھوں پیغمبرون اور مذہب کے بانیون مین صرف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کے وجود گرامی کو اس قابل سمجھا کہ وہ آپ کو نبوت کا ہیرو قرار دے، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار "محمد" آپ کی نسبت کہتا ہے:-

قرآن سے اس شخص کے روحانی ارتقا کا پتہ چلتا ہے، جو تمام نبیوں اور مذہبی لوگوں میں سب سے زیادہ کامیاب رہا،[1]

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم مضمون "قرآن" ج ۱۵ ص ۵۹۸

الغرض دوست دشمن سب کو اس کا اعتراف ہے کہ انبیاءؑ میں یہی برگزیدہ ہستی ہے جس نے کم سے کم مدت میں اپنی بعثت اور رسالت کے زیادہ سے زیادہ فرائض ادا کیے، اور اصلاحِ انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہ چھوڑا جس کی تکمیل اس کی تعلیم اور عمل سے نہ ہو گئی ہو، اور یہ اس لیے کہ تمام انبیاءؑ میں خاتمِ نبوت، مکمل دین، اور آخری معلّم کی حیثیت آپ ہی کو عطا ہوئی تھی، اگر انسان کی عملی و اخلاقی و دینی ضرورتوں کا کوئی گوشہ آپ کے فیض سے محروم رہ کر تکمیل کا محتاج ہوتا تو آپ کے بعد بھی کسی آنے والے کی حاجت باقی رہ جاتی، حالانکہ آپ نے فرما دیا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہیں نبوت کی عمارت کی آخری اینٹ ہوں[1] صلی اللہ علیہ وسلم

آپ کی تعلیمات کی یہی ہمہ گیری ہے، جس پر کوتاہ بینوں کو آج نہیں بلکہ خود صحابہؓ کے عہد میں بھی تعجب ہوتا تھا، بعض مشرکوں نے حضرت سلمان فارسیؓ سے مذاقاً کہا کہ تمہارے پیغمبر تمکو ہر چیز کی تعلیم دیتے ہیں، یہانتک کہ اس کی بھی کہ تم کو قضائے حاجت کیونکر کرنی چاہیئے حضرت سلمانؓ نے کہا ہاں یہ سچ ہے آپ نے ہم کو یہ حکم دیا ہے کہ ہم ایسی حالت میں قبلہ رخ نہ بیٹھیں نہ اپنے داہنے ہاتھ سے طہارت کریں، اور نہ تین ڈھیلوں سے کم استعمال کریں جن میں کوئی ہڈی اور گوبر نہ ہو[2] نبوتِ محمدی کی تعلیمات کی یہ ہمہ گیری ہی اس کی تکمیل کی دلیل ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے پست اور غیر متمدن اقوام سے لے کر بلند اور متمدن سے متمدن قوموں تک کیلئے یکساں تعلیمات اور ہدایات رکھتی ہے، عرب کے بدویوں اور قریش کے رئیسوں دونوں کیلئے آپ کی بعثت تھی، اس لیے آپ کی تعلیمات میں پست کو بلند اور بلند کو بلند تر بنانے کی روح

---

[1] صحیح بخاری جلد اول باب خاتم النبیین و جامع ترمذی کتاب الامثال [2] جامع ترمذی و سنن ابن ماجہ کتاب الطہارت۔

کی ہدایات ہین، آج یہی چیز ہے کہ افریقہ کے وحشیون میں اسلام اپنی تعلیمات کے ساتھ پھیلتا جاتا ہے، اور اُن کو متمدن اور مہذب بنانے کے لیے مذہب کے باہر کسی تعلیم کی اس کو ضرورت پیش نہیں آتی ہی، لیکن عیسوی مذہب کو چند اخلاقیات کو چھوڑ کر کہ جنکا ماخذ انجیل ہے عقائد پادریوں کی کونسلون سے، دعائیں اور عبادات کلیساؤں کے حکمرانوں سے اور تہذیب و تمدن کی تعلیمات یورپ کے بے دینون اور ملحدون سے حاصل کرنی پڑتی ہین، لیکن اسلام مین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کچھ نہیں، عقائد ہون کہ عبادات اور دعائین، اخلاق ہون کہ آداب تمدن خانگی معاملات ہون یا ایسے دین کے کاروبار، انسانون کے ساتھ معاملہ ہو یا خدا کے ساتھ سب کا ماخذ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمہ گیر تعلیمات ہیں،

آپ کی ان ہمہ گیر تعلیمات کی کتاب جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے، چار ابواب پر منقسم ہے، اور ان ہی کے مجموعہ کا نام اسلام ہے،

آپ نے بتایا ہے کہ ہر انسان کا ایک تعلق تو اپنے خالق کے ساتھ ہے، اور دوسرا اپنے خالق کی دوسری مخلوقات کیساتھ، اسی مفہوم کو دوسری عبارت میں یوں کہو کہ اُس کا ایک تعلق اپنے آقا اور مالک کے ساتھ ہی، اور دوسرا اپنے آقا اور مالک کے غلامون کیساتھ، یا یوں کہو کہ اُس کا ایک رخ تو آسمان کی طرف ہی، اور دوسرا زمین کی سمت، اسکو ایک لگاؤ تو عالم غیب سے ہی اور دوسرا عالم شہود سے پہلے کے ساتھ اس کا تعلق ایک مہربان آقا اور فرمانبردار غلام کا ہے، اور دوسرے کیساتھ اسکا تعلق برادری اور بھائی چارے کا ہے، خالق اور مخلوق یا خدا اور بندہ کے درمیان جو علاقہ اور رابطہ ہے، اس کا تعلق اگر صرف ہمارے ذہنی قویٰ اور قلبی حالات سے ہے، تو اس کا نام

عقیدہ ہے، اور اگر اُن قلبی حالات کے ساتھ ہمارے جسم وجان اور مال وجائداد سے بھی ہے، تو اس کا نام عبادت ہے، باہم انسانوں اور انسانوں میں، یا انسانوں اور دوسری مخلوقات میں جو علاقہ ورابطہ ہے، اس کی حیثیت سے جو احکام ہم پر عائد ہیں، اگر اُن کی حیثیت محض قانون کی ہے، تو اس کا نام معاملہ ہے، اور ان کی حیثیت قانون کی نہیں، بلکہ روحانی نصیحتوں اور برادرانہ ہدایتوں کی ہے، تو اس کا نام اخلاق ہے،

قرآن پاک کی اصطلاح میں پہلے تعلقات کی مضبوطی اور استحکام کا نام ایمان ہے، اور دوسرے تیسرے اور چوتھے کی بجاآوری کا نام عمل صالح ہے، اور ان ہی دونوں کے مجموعہ پر کامل نجات کا انحصار ہے، عمل صالح کی تین قسمیں ہیں، خدا کے سامنے اپنی عبودیت کا اظہار اور اُس کے احکام کی تعمیل، بندوں کے ساتھ کاروبار اور معاملہ میں قانونِ الٰہی کی پابندی اور اُن کے ساتھ محبت، الفت، اور نیکی اور بھلائی کا برتاؤ، اور گو اس لحاظ سے کہ ان میں سے ہر ایک عمل کو جبین خدا کی خوشنودی اور رضامندی مقصود ہو اسلام عبادت کہتا ہے لیکن اصطلاح میں پہلے کا نام عبادات، دوسرے کا نام معاملات اور تیسرے کا نام اخلاق ہے، الغرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو عالمگیر شریعت اور دائمی ہدایت لیکر آئے، وہ ان ہی چاروں عنوانوں کا مجموعہ ہے یعنی عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق، ان ہی کی اصلاح وتعلیم اور تکمیل کے لیے آپ کی بعثت ہوئی اور یہی آپ کے پیغمبرانہ فرائض کے اصلی کارنامے ہیں،

عقائد

عقائد کی حقیقت اور اہمیت انسان کے تمام افعال، اعمال اور حرکات کا محور اس کے خیالات ہیں، یہی اس کو بناتے اور بگاڑتے ہیں، یہ عام خیالات درحقیقت اس کے چند پختہ، غیر متزلزل اور غیر مشکوک اصولی خیالات پر مبنی ہوتے ہیں، ان ہی اصولی خیالات کو عقائد کہتے ہیں، یہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے، اور اس کے دائرۂ حیات کا ہر خط اسی پر جاکر ختم ہوتا ہے، ہمارے تمام افعال اور حرکات ہمارے ارادہ کے تابع ہیں، ہمارے ارادہ کا محرک، ہمارے خیالات اور جذبات ہیں، اور ہمارے خیالات اور جذبات پر ہمارے اندرونی عقائد حکومت کرتے ہیں، عام بول چال میں ان ہی چیزوں کی تعبیر "ہم دل" کے لفظ سے کرتے ہیں، اسلام کے معلم نے بتایا کہ انسان کے تمام اعضاء میں اس کا دل ہی نیکی اور بدی کا گھر ہے، فرمایا،

الا وان فی الجسد مضغۃ اذا	انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جو
صلحت صلح الجسد کلہ واذا	اگر درست ہو تو تمام بدن درست ہے اور اگر
فسدت فسد الجسد کلہ	وہ بگڑ گیا تو تمام بدن بگڑ گیا ہاں وہ ٹکڑا
الا وھی القلب (صحیح بخاری کتاب الایمان)	دل ہے،

قرآن پاک نے دل (قلب) کی تین کیفیتیں بیان کی ہیں، سب سے پہلے قلب سلیم (سلامت

دل) جو ہر گناہ سے پاک رہ کر بالطبع نجات اور سلامت روی کے راستہ پر چلتا ہے، دوسرا اس کے مقابل قَلْبٌ اَثِیْمٌ[1] (گنہگار دل) یہ وہ ہے جو گناہون کی راہ اختیار کرتا ہے، اور تیسرا قلب مُنِیْب (رجوع ہونے والا دل) یہ وہ ہے جو اگر کبھی بھٹکتا اور بے راہ بھی ہوتا ہے تو فوراً نیکی اور حق کی طرف رجوع ہوتا ہے، غرض یہ سب نیرنگیان اسی ایک بے رنگ ہستی کی ہیں جس کا نام دل ہے، ہمارے تمام اعمال کا محرک، ہمارے اسی دل کا ارادہ اور نیت ہے، اسی بھاپ کی طاقت سے اس مشین کا ہر پرزہ چلتا اور حرکت کرتا ہے، اسی لیے آپ نے فرمایا،

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ (صحیح بخاری آغاز کتاب) — تمام کاموں کا مدار نیت پر ہے

اسی مطلب کو دوسرے الفاظ مین آپ نے یون ادا فرمایا،

اِنَّمَا الْاَمْرُ مَا نَوٰی فَمَنْ کَانَتْ	ہر شخص کے کام کا ثمرہ وہی ہے جسکی وہ نیت
ھِجْرَتُہٗ اِلٰی دُنْیَا یُصِیْبُھَا اَوْ اِلٰی	کرے تو جس کی ہجرت کی غرض دنیا کا حصول
امْرَأَۃٍ یَنْکِحُھَا فَھِجْرَتُہٗ اِلٰی مَا	یا کسی عورت نکاح کرنا ہے، تو اسکی
ھَاجَرَ اِلَیْہِ	ہجرت اسی کے لیے ہے جس کیلئے اس نے
(صحیح بخاری آغاز کتاب)	ہجرت کی (یعنی اس سے اس کو ثواب حاصل نہ ہوگا)

آجکل علم نفسیات نے بھی اس مسئلہ کو بداہتہً ثابت کر دیا ہے کہ انسان کی عملی اصلاح کیلئے اسکی قلبی اور دماغی اصلاح مقدم ہے، اور انسان کے دل اور ارادہ پر اگر کوئی چیز حکمران ہے تو وہ اس کا عقیدہ ہے، اب صحیح اور صالح عمل کیلیے ضروری یہ ہے کہ چند صحیح اصول و مقدمات

[1] قرآن پاک کی آیت میں یہ ہے، فَاِنَّہٗ اٰثِمٌ قَلْبُہٗ (بقرہ - ۳۹)

کا ہم اس طرح تصور کریں کہ وہ دل کا غیر مشکوک یقین اور غیر متزلزل عقیدہ بنجائیں اور اسی صحیح یقین اور مستحکم عقیدہ کے تحت میں ہم اپنے تمام کام انجام دیں،

جس طرح اقلیدس کی کوئی شکل چند اصولِ موضوعہ اور اصولِ متعارفہ کے مانے بغیر نہ بن سکتی ہے، نہ ثابت ہو سکتی ہے، اسی طرح انسان کا کوئی عمل صحیح و درست نہیں ہو سکتا جب تک اس کیلئے بھی چند مبادی اور چند اصولِ موضوعہ ہم پہلے نہ تسلیم کر لیں،

بظاہر عقل ہمارے ہر کام کے لیے ہم کو رہنما نظر آتی ہے، لیکن غور سے دیکھو کہ ہماری عقل بھی آزاد نہیں، وہ ہمارے دلی یقین، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے، اس لیے اس پابہ زنجیر عقل کے ذریعہ ہم اپنے دلی خیالات، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات پر قابو نہیں پا سکتے، اگر پا سکتے ہیں تو اپنے صحیح دلی یقینیات اور چند مضبوط و غنی و ذہنی تصورات کے ذریعہ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے ایمان کا ذکر ہمیشہ "عملِ صالح" کے ذکر سے پہلے لازمی طور سے کیا ہے، اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قبول کے قابل نہیں سمجھا ہے کہ ایمان کے عدم سے دل کے ارادہ اور خصوصاً اس مخلصانہ ارادہ کا بھی عدم ہو جاتا ہے جس پر حسنِ عمل کا دارومدار ہے، عبداللہ ابن جدعان ایک قریشی تھا جس نے جاہلیت میں بہت سے نیکی کے کام کئے تھے، مگر بانیہمہ مشرک تھا، اسکی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عائشہ رضؓ نے ایک دفعہ دریافت کیا کہ یا رسول اللہ عبداللہ بن جدعان نے جاہلیت میں جو نیکی کے کام کئے کیا ان کا ثواب اسکو ملے گا؟ فرمایا نہیں اے عائشہ رضؓ کیونکہ کسی دن اس نے یہ نہیں کہا کہ بار الٰہا! میرے گناہوں کو قیامت میں بخشدے[1]

[1] یہ مصنف ابن ابی شیبہ غزوات نسخہ قلمی دار المصنفین، و ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۱۴۹، مصر،

بدر کی لڑائی کے موقع پر ایک مشرک نے جس کی بہادری کی دھوم تھی حاضر ہوکر کہا کہ اے محمدؐ! میں بھی تمہاری طرف سے لڑنے کے لیے چلنا چاہتا ہوں کہ مجھے بھی غنیمت کا کچھ مال ہاتھ آئے فرمایا "کیا تم اللہ عزوجل اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہو"؟ اس نے جواب دیا "نہیں" فرمایا واپس جاؤ کہ میں اہل شرک سے مدد کا خواستگار نہیں"۔ دوسری دفعہ وہ پھر آیا، اور وہی پہلی درخواست پیش کی، مسلمانوں کو اس کی شجاعت و بہادری کی وجہ سے اسکی درخواست سے بڑی خوشی ہوئی، اور وہ دل سے چاہتے تھے کہ وہ انکی فوج میں شریک ہو جائے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پھر وہی سوال کیا کہ "کیا تم کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان ہے" اس نے پھر نفی میں جواب دیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہی فرمایا کہ "میں کسی مشرک سے مدد نہ لونگا"۔ غالباً مسلمانوں کی تعداد کی کمی اور اسکی بہادری کے باوجود اس سے آپکی بے نیازی کی کیفیت نے اس کے دل پر اثر کیا، تیسری دفعہ جب اس نے اپنی درخواست پیش کی اور آپنے دریافت فرمایا کہ "تم کو خدا اور رسول پر ایمان ہے"؟ تو اس نے اثبات میں جواب دیا اور نور اسلام سے منور ہوکر لڑائی کی صف میں داخل ہوا[1]

قرآن پاک نے ان لوگوں کے کارناموں کی مثال جو ایمان سے محروم ہیں، اس راکھ سے دی ہے جس کو ہوا کے جھونکے اڑا اڑا کر فنا کر دیتے ہیں، اور ان کا کوئی وجود نہیں رہتا، اسی طرح اس شخص کے کام بھی جو ایمان سے محروم ہے بے بنیاد اور بے اصل ہیں؛

مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ أَعْمَالُهُمْ — جنھوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا ان کے

[1] صحیح مسلم باب غزوات جلد دوم صفحہ ۱۰۲ مصر،

لَهُمَا بِهِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ لَا يَقْدِرُونَ مِمَّا كَسَبُوا عَلَىٰ شَيْءٍ ذَٰلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ (ابراهیم-۳)

کاموں کی مثال راکھ کی ہے جس پر آندھی والے دن زور سے ہوا چلی وہ اپنے کاموں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے یہی سب سے بڑی گمراہی ہے،

سورہ نور میں ایمان کی دولت سے محروم لوگوں کے اعمال کی مثال سراب سے دی گئی ہے، کہ اُس کے وجود کی حقیقت فریب نظر سے زیادہ نہیں،

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا (نور-۵)

اور جنھوں نے خدا کا انکار کیا ان کے کام اس سراب کی طرح ہیں، جو میدان میں ہو جسکو پیاسا پانی سمجھتا ہے یہانتک کہ جب وہ اسکے پاس پہنچے تو وہاں کسی چیز کا وجود اس کو نظر نہ آئے،

اُس کی ایک اور مثال ایسی سخت تاریکی سے دی گئی ہے جس میں ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہیں دیتا اور جس میں ہوش و حواس اور اعضا کی سلامتی کے باوجود اُن سے فائدہ اٹھانا ناممکن ہے،

أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُجِّيٍّ يَغْشَاهُ مَوْجٌ مِنْ فَوْقِهِ مَوْجٌ مِنْ فَوْقِهِ سَحَابٌ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا وَمَنْ لَمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُورًا فَمَا لَهُ مِنْ نُورٍ (نور-۵)

یا اُن کے کاموں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی گہرے سمندر میں سخت اندھیرا ہو اسکے اوپر موج اور موج پر بھر موج ہو اور اس کے اوپر بادل گھرا ہو، اندھیری ہی ایک کے اوپر ایک کہ اپنا ہاتھ نکالے تو وہ بھی سوجھائی نہ دے جسکو خدا نے نور نہ دیا اس کے لیے نور نہیں

الغرض ایمان کے بغیر عمل کی بنیاد کسی بلند اور صحیح تخیل پر قائم نہیں ہو سکتی، اسی لئے ریا، نمائش اور خود غرضی کے کاموں کو کوئی عزت نہیں دی جا سکتی، وہ کام جو گو بظاہر نیک ہوں، لیکن نیکی کرنے والے کا ان سے اصلی مقصد نام و نمود پیدا کرنا ہوتا ہے تو اخلاقی نقطہ نظر سے تمام دنیا ان کو بے وقت اور ہیچ سمجھتی ہے، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ کیا، اور فرمایا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ	اے ایمان والو! اپنی خیراتوں کو احسان رکھکر اور ایذا
بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ كَالَّذِي يُنفِقُ مَالَهُ	دیکر اسطرح نہ برباد کرو جسطرح وہ برباد کرتا ہے جو
رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ	لوگوں کے دکھانے کیلئے اپنا مال خرچ کرتا ہے اور
الْآخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ	خدا پر اور جزا سزا کے قیامت
تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا	پر (جس میں نیکیوں کی جزا ملے گی) یقین نہیں کرتا
لَّا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا	پس اسکی خیرات کی مثال اس چٹان جیسی ہے
وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ	جس پر کچھ مٹی پڑی ہو، ذرا اس پر پانی برسا
	اور مٹی دھل کر تھیر نہ گیا جس پر جو کچھ بویا جائے
(بقرہ ۷-۳۷)	وہ اگ نہیں اور خدا کافر قوم کو ہدایت نہیں کرتا،

غرض ایمان ہمارے تمام اعمال کی اساس ہے جس کے بغیر ہر عمل بے بنیاد ہے، وہ ہماری سیرابی کا اصلی سرچشمہ ہے جس کے فقدان سے ہمارے کاموں کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں رہتی کیونکہ وہ دیکھنے میں تو کام معلوم ہوتے ہیں مگر روحانی اثر و فائدہ سے خالی اور

بے نتیجہ ہوتے ہیں، خدا کے وجود کا اقرار، اور اُسکی رضامندی کا حصول ہمارے اعمال کی غرض و غایت ہے، یہ نہ ہو تو ہمارے تمام کام بے نظام اور بے مقصد ہو کر رہ جائیں، وہ ہماری دل کا نور ہے، وہ نہ ہو تو پوری زندگی تیرہ و تاریک نظر آئے اور ہمارے تمام کاموں کی بنیاد ریا، نمائش، جاہ پسندی، خود غرضی اور شہرت طلبی وغیرہ کے دنی جذبات اور پست محرکات کے سوا کچھ اور نہ رہ جائے

توراۃ میں بعض عقیدوں کا ذکر ہے، مگر ایمان کی حقیقت اور اس کی اہمیت کی تعلیم سے وہ خالی ہے، انجیل میں ایمان کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے، مگر اخلاق کی سچائی، اعمال کی راستی اور دل کے اخلاص کے لیے نہیں، بلکہ معجزوں اور کرامتوں کے ظاہر کرنے کیلیے اور خوارقِ عادت کی قدرت اور اختیار پانے کیلیے، اس کے برخلاف فلسفہ یونان کے بہت سے پیروؤں اور ہندوستان کے بہت سے مذہبوں نے محض ذہنی جولانی، مراقبہ، تصور، دھیان اور علم کو انسان کی نجات کا ذریعہ قرار دیا، اور اخلاق و عمل سے کوئی تعرض نہیں کیا، عیسائیوں، بدھشتیوں اور برہمنوں نے عقائد کو یہ وسعت دی اور ان کی ایسی تفصیل کی کہ وہ سراپا خیالی فلسفہ بن گئے، جس سے تصوریت عملیت پر غالب آگئی اور انسانوں کے قوائے عملی سرد ہو گئے،

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے علم و عمل، تصور اور فعل، عقلیت اور عملیت میں لزوم ثابت کیا، مگر اصلی زور انسان کی عملیت پر صرف کیا اور عقائد کے اتنے ہی حصہ کا یقین و اقرار ضروری قرار دیا، جو دل کی اصلاح کرے، اور عمل کی بنیاد، اخلاق و عبادات کی اساس قرار پا سکے، عقائد کے فلسفیانہ الجھاؤ اور تصورات و نظریات کی تشریح و تفصیل کر کے عملیت کو برباد نہیں کیا، چند سیدھے سادے اصول جو تمام ذہنی سچائیوں اور واقعی حقیقتوں کا جوہر

اور خلاصہ ہیں، ان کا نام عقیدہ اور اُن پر یقین کرنے کا نام ایمان رکھا آپ نے صریح الفاظ میں عقائد کے صرف پانچ اصول تلقین کئے خدا پر ایمان، خدا کے فرشتوں پر ایمان، خدا کے رسولوں پر ایمان، خدا کی کتابوں پر ایمان اور اعمال جزا اور سزا کے دن پر ایمان،

یہ تمام وہ حقائق ہیں جن پر دل سے یقین کرنا اور زبان سے ان کا اقرار کرنا ضروری ہے ان کے بغیر خالص عمل کا وجود نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ پر ایمان کہ وہ اس دنیا کا تنہا خالق اور مالک ہے اور ہر ظاہر و باطن سے آگاہ ہے تاکہ وہی ہمارے کاموں کا قبلہ مقصود قرار پا سکے اور اُسی کی رضا جوئی اور اسی کی مرضی کی تعمیل ہمارے اعمال کی تنہا غرض و غایت ہو، اور ہم خلوت کے سوا خلوت میں بھی گناہوں اور برائیوں سے بچ سکیں اور ہر نیکی کو اس لئے کریں اور ہر برائی سے اسلئے بچیں کہ یہی ہمارے خالق کا حکم اور یہی اُس کی مرضی ہے اس طرح ہمارے اعمال ناپاک اغراض اور ناجائز خواہشوں سے مبرّا ہو کر خالص ہو سکیں اور جس طرح ہمارے جسمانی اعضا رگناہوں سے پاک ہوں ہمارا دل بھی ناپاک خیالات اور ہوا و ہوس کی آمیزش سے پاک ہو اور اس کے احکام اور اس کے پیغام کی سچائی پر دل سے ایسا یقین ہو کہ ہمارے ناپاک جذبات، ہمارے غلط استدلالات، ہماری گمراہ خواہشیں بھی اس یقین میں شک اور تذبذب پیدا نہ کر سکیں،

خدا کے رسولوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے کہ خدا کے ان احکام اور ہدایات اور اسکی مرضی کا علم ان ہی کے واسطہ سے انسانوں کو پہنچا ہے، اگر ان کی صداقت سچائی اور راستبازی کو کوئی تسلیم نہ کرے تو پیغام ربانی اور احکامِ الٰہی کی صداقت اور سچائی بھی شکوک و شبہ ہو جائے اور

انسانوں کے سامنے نیکی، نزاہت اور معصومیت کا کوئی نمونہ موجود نہ رہے جو انسانوں کے قوائے عملی کی تحریک کا باعث بن سکے، پھر اچھے اور برے، صحیح اور غلط کاموں کے درمیان ہماری عقل کے سوا جو ہمارے جذبات کی محکوم ہے، کوئی اور چیز ہمارے سامنے ہماری رہنمائی کے لیے نہیں ہوگی

خدا کے فرشتوں پر بھی ایمان لانا واجب ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولوں کے درمیان قاصد اور سفیر ہیں، مادیت اور روحانیت کے مابین واسطہ ہیں، مخلوقات کو قانونِ الٰہی کے مطابق چلاتے ہیں، اور ہمارے اعمال و افعال کے ایک ایک حرف کو ہر دم اور ہر لحظہ لکھتے جاتے ہیں، تاکہ ہمکو ان کا اچھا یا برا معاوضہ مل سکے،

خدا کے احکام و ہدایات جو رسولوں کے ذریعہ انسانوں کو پہنچائے گئے انکو دور دراز ملکوں اور آیندہ نسلوں تک پہنچانے کے لیے ضروری ہوا کہ وہ تحریری شکلوں یعنی کتابوں اور صحیفوں میں یا لفظ و آواز سے مرکب ہوکر ہمارے سینوں میں محفوظ رہیں، اس لیے خدا کی کتابوں اور صحیفوں کی صداقت پر اور جو کچھ ان میں ہے اس کی سچائی پر ایمان لانا ضرور ہے، ورنہ رسولوں کے بعد خدا کے احکام اور ہدایتوں کے جاننے کا ذریعہ مسدود ہو جائے اور ہمارے لیے نیکی و بدی کی تمیز کا کوئی ایسا معیار باقی نہ رہے جس پر تمام ادنیٰ و اعلیٰ جاہل و عالم بادشاہ اور رعایا سب متفق ہوکر اعمال کی باز پرس اور جوابدہی کا خطرہ نہ ہو، اور اس کے مطابق جزا اور سزا کا خیال نہ ہو تو دنیاوی قوانین کے باوجود دنیائے انسانیت سراپا درندگی اور بہیمیت بنجائے، یہی وہ عقیدہ ہے جو انسانوں کو جلوت و خلوت میں ان کی ذمہ داری محسوس کراتا ہے، اس لیے روزِ جزا اور یوم آخرت پر ایمان رکھے بغیر انسانیت کی صلاح و فلاح ناممکن ہے، اسی لیے محمد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس پر بیحد زور دیا ہے، بلکہ مکی وحی کا بیشتر حصہ اسی کی تلقین اور تبلیغ پر مشتمل ہے،

یہی پانچ باتین اسلام کے ایمانیات کے اصلی عناصر ہین، یعنی اللہ تعالیٰ پر اس کے تمام رسولون پر اس کی کتابوں پر، اس کے فرشتون پر اور روز جزا پر ایمان لانا، یہ عقائد خمسہ یکجا طور پر سورہ بقرہ میں متعدد دفعہ کہین مجمل اور کہین مفصل بیان ہوئے ہیں،

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ.....	جو لوگ غیب (خدا، خدا کی صفات اور ملائکہ
.....وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ	پر ایمان رکھتے ہیں،..... اور جو کچھ تم پر اے محمدؐ
اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ	اترا اور تم سے پہلے (پیغمبروں پر) اترا اس پر یقین رکھتے
قَبْلِکَ، (بقرہ-۱)	ہین (یعنی انبیا اور ان کی کتابون پر)
وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ (بقرہ-۱)	اور آخرت (روز جزا) پر یقین رکھتے ہین،

یہ تو سورہ کے آغاز کی آیتین ہین، سورہ کے بیچ مین پھر ارشاد ہوا،

وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ	اور لیکن نیکی یہ ہے کہ جو شخص خدا پر، آخری
الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَ	دن پر، فرشتون پر، اور کتاب پر اور سب
الْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ (بقرہ-۲۲)	نبیوں پر ایمان لائے،

سورہ کے آخر مین ہے،

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ	پیغمبر پر جو کچھ اتارا گیا اس پر وہ خود اور
مِنْ رَّبِّہٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ، کُلٌّ	تمام مومن ایمان لائے سب خدا پر،
اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ	اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر

وَرُسُلِہٖ ، (النساء - ۱۳۶)

اور اُس کے پیغمبروں پر ایمان لائے،

سورہ نساء میں ان ہی عقائد کی تعلیم ہے،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ

وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ

نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ

وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ

ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا (النساء - ۱۳۶)

اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو ایمان لاؤ

خدا پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب

پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس

کتاب پر جو اس سے پہلے اتاری اور جو

شخص خدا کا، اس کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں کا،

اس کے پیغمبروں کا اور روز آخرت کا انکار

کرے گا، وہ سخت گمراہ ہوا،

اللہ تعالیٰ پر ایمان

اٰمَنَ باللّٰہ

ایک قادرِ مطلق اور ہمہ صفت موصوف ہستی پر یقین، اور اس کو ایک جاننا تعلیم محمدی کی پہلی ابجد ہے، اسلام سے پہلے جو مذاہب تھے باوجود اس کے کہ خدا کی توحید اور صفات پر ایمان رکھنا اُن کے اصول میں بھی داخل تھا، مگر ان کی تعلیمات میں ترتیب مفقود تھی، اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کی نگاہ میں توحید کا مسئلہ اہمیت کے کس درجہ پہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس مسئلہ کی اصلی اہمیت محسوس کی اور اس کو اپنے نصابِ درس کا پہلا سبق اور روحانی معارف وحقائق جسمانی اور اعمال واخلاق کا سرنبیاد قرار دیا، خدا اگر چاہے تو انسان کے تمام گناہوں سے درگذر کرسکتا ہے، مگر اسی ایک حقیقت سے انکار وہ جرم ہے جسکو وہ کبھی معاف نہ فرمائے گا،

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ	یقیناً خدا شرک کو معاف نہ کرے گا اور
وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ	اس کے سوا جس کے جو گناہ چاہے معاف
یَّشَآءُ، (نساء ۱۶)	کردے،

پھر اسی کے ساتھ خالص توحید کا بیان، اسماء وصفات کی تشریح، شرک کے ہر پہلو کی نفی اور

توحید کے ہر پہلو کی تکمیل تعلیم محمدیؐ کی امتیازی شان ہے، معلوم ہو چکا ہے کہ نبوتِ محمدیہ کی غرض و غایت صرف تخیل، نظریہ آرائی اور الٰہیاتی فلسفہ نہ تھا، بلکہ ایک زندہ قوم، جدوجہد اور عمل والی قوم، اخلاص و ایثار اور نیکی و تقویٰ والی قوم کو پیدا کرنا تھا، اور اسکو تمام دنیا کی پیشوائی کے لیئے نمونۂ عمل بنانا تھا، اسلیئے سب سے پہلے اہل عرب کو جو اُس کے مخاطب اوّل تھے، رموز و اسرار توحید کا اس طرح حامل بنانا تھا کہ انکے رگ و ریشہ میں ولولہ اور جوش کا ایک نشہ پیدا ہو جائے، اس لیے ضرورت تھی کہ سب سے پہلے زمین کو ہموار کیا جائے، شرک کے وہ تمام عقائد جو عربوں میں پھیلے ہوئے تھے ان کو مٹا دیا جائے اور جن وجوہ اور اسباب سے شرک کے یہ عقائد پیدا ہوتے ہیں، انکی بیخ کنی کی جائے،

اصلاحِ عقائد

معلوم ہو چکا ہے کہ عرب میں جہالت اور وحشت کی وجہ سے سیکڑوں غلط عقائد اور توہمات پھیل گئے تھے، اور دنیا کے دوسرے مذاہب کے عقائد میں بھی بہت سی غلطیاں داخل ہو گئی تھیں، ان میں سب سے زیادہ بدتر اور تمام برائیوں کا اصلی محور شرک تھا، اس لیے سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اصلاح سے آغاز کیا،

شرک اور بت پرستی کا اصلی سبب یہ ہے اسباب و مؤثرات کا وجود ہے، خدا نے عالم میں ایک سلسلہ اسباب قائم کر دیا ہے، اور عالم کے تمام واقعات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں لیکن یہ تمام سلسلہ ایک قادر مطلق کے دستِ قدرت میں ہے، اور اس سلسلہ کی ایک کڑی بھی اس کے اشارہ کے بغیر جنبش نہیں کر سکتی، شرک اس طرح شروع ہوتا ہے کہ پہلے انسان اُن اسباب و علل میں سے بعض نمایاں اور قوی الاثر اسباب سے متاثر ہوتا ہے، اجرامِ فلکی کی عظمت، آفتاب و ماہتاب کی نور افشانی، سمندر کا پُر زور تلاطم، عناصر کی نیرنگ آرائیاں انسان کو مبہوت کر دیتی ہیں، وہ انکی عظمت و تاثیر سے

متاثر، پھر منفعل، اور بالآخر اُن کا غلام بنجاتا ہے، اعتقاد کے پہلے مرحلہ میں انسان، غور رسی کے دعوی سے اس قدر امتیاز اور تفریق کرتا ہے کہ یہ چیزین خود خدا یا معبود نہین ہین، لیکن یہ تمیز آخر تک قائم نہیں رہتی بلکہ رفتہ رفتہ خوش اعتقادی کا اثر غالب آتا جاتا ہے، اور یہ چیزین خدا کی شریک بنتی جاتی ہین، یہانتک کہ اصلی مسبب الاسباب نظر سے بالکل اوجھل ہو جاتا ہے،

شرک کی جو گوناگون صورتین دنیا میں موجود تھین، اور جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کا استیصال کیا، اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے،

۱۔ دنیا کی مشہور قوموں میں سے عیسائی اور مجوسی علانیہ مشرک تھے، یعنی تین اور دو خدا مانتے تھے، ہندو بھی اسی کے قریب قریب تھے، ان مذہبوں کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ خدا کے جو مختلف نمایان اور اہم اوصاف ہین، اُن کا مستقل اور مجسم وجود قائم ہو گیا، مثلاً صفت خلق اور احیا، و امانت برہما بشن مہیش کے نام سے موسوم ہین، مجوسیون نے دیکھا کہ دنیا میں جس قدر اشیا اور افعال و حرکات ہیں سب باہم متضاد ہیں، نور و ظلمت، پستی و بلندی، یمین و شمال، نرم و سخت، رات دن خیر و شر، حلم و غضب، غرور و خاکساری، فسق و صلاح، کوئی چیز مقابلہ اور تضاد سے خالی نہیں، اسلیے ایسے دو متضاد عالم کا خالق ایک نہیں ہو سکتا، اس بنا پر انھون نے دو خدا تسلیم کیے اور ان کا نام یزدان اور اہرمن یا نور و ظلمت رکھا،

قرآن مجید مین تمام احکام، نہایت تدریج کے ساتھ نازل ہوئے ہیں، یہانتک کہ ۱۳ برس کی وسیع مدت تک روزہ، زکوٰۃ، اور حج کچھ فرض نہیں ہوا تھا، لیکن شرک کا استیصال کلی نبوت کا پہلا سبق تھا، سورۂ زمر مکہ میں نازل ہوئی، اور اسی سورہ میں شرک کی تمام صورتین مٹا دی گئین، تمام دیگر سورتون

میں نہایت کثرت سے اس قسم کے شرک کا ابطال اور رد کیا ہے، اسلیے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں

مجوسیوں کے شرک کی بنیاد اس پر تھی کہ افعالِ خیر و شر کا ایک خالق نہیں ہو سکتا، ورنہ

لازم آئیگا کہ خدا شر کو پیدا کرتا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ جو شخص برائی کے پیدا ہونے کو جائز رکھتا ہے

وہ خود اچھا نہیں ہو سکتا، اس لیے قرآن مجید میں نہایت کثرت سے تصریحات آئین کہ جن کو

ہم خیر و شر کہتے ہیں سب کا فاعل خدا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت تصریح و تاکید کے

ساتھ تعلیم کی کہ جو کچھ ہوتا ہے، سب خدا کے حکم سے ہوتا ہے، بانی یہ مسئلہ کہ ہر ی چیز کا خالق اچھا

نہیں ہو سکتا، اولاً تو یہ مغالطہ آمیز غلطی ہے ایک صناع مصور اگر ایک نہایت بدصورت

جانور کی تصویر نہایت اچھی کھینچے تو اس کے کمالِ مصوری پر اس سے کچھ داغ نہیں آئیگا کہ

جانور خود برا ہے، دوسرے یہ کہ اسلام نے اس مسئلہ کی جس اصلی گرہ کو کھولا ہے، وہ یہ ہے کہ

اشیاء بذاتہٖ خیر و شر نہیں ہیں، بلکہ وہ اپنے صحیح یا غلط طریقۂ استعمال سے خیر یا شر ہو جاتی ہیں؛

آگ بجائے خود نہ خیر ہے نہ شر، اگر اس سے اچھا کام لیا جائے تو خیر ہے، اور برا لیا جائے تو شر ہے

زہر نہ اچھا ہے نہ برا، اگر اس کو بیماریوں کے استیصال میں استعمال کیا جائے تو خیر ہے، اور اگر کسی

بیگناہ کے قتل میں استعمال کرو تو شر ہے، اسی طرح دوسری اشیاء کے بھی خیر و شر کے دونوں

پہلو ہیں، نہ کوئی شی دنیا میں خیر مطلق ہے، نہ کوئی شر محض؛ اسی لیے قرآن نے شر کی نسبت خدا

کی طرف نہیں کی ہے، بلکہ خود انسان کی طرف کی ہے،

اشرٌ اُرِیدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ	آیا اہل زمین کے ساتھ شر کا ارادہ کیا گیا ہے یا
اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا (جن ۱۰)	انکے پروردگار نے ان کو راہ پر لانا چاہا ہے،

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ — تجھکو جو نیکی پہنچی تو وہ خدا کی طرف سے ہے،

وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (نسآء ۱۱) — اور جو مصیبت پہنچی وہ خود تیری طرف سے ہے،

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ — کیا جب تم کو کوئی مصیبت پہنچی جس کی دوگنی

اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا قُلْ — تم اُن کو پہنچا چکے ہو، تو تم نے کہا یہ کہاں سے

هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى — آئی، کہدے کہ خود تمھاری طرف سے ہے:

كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (آل عمران - ۱۷) — خدا ہر بات پر قدرت رکھتا ہے،

الغرض کسی شی کا ایسا پیدا کرنا جس مین خیر و شر کے دونون پہلو ہیں، شر نہین ہے، اُن میں سے شر کے پہلو کو استعمال کرنا اور کام میں لانا شر ہے، ڈاکٹر بہت سی بیماریون کے لیے زہریلی دوائین بناتے ہیں، مگر یہ شر نہیں البتہ جب کوئی شریر ان دواؤن سے اُن امراض کے ازالہ کے بجائے کسی کی جان لے لیتا ہے تو وہ شر ہے، حاصل یہ کہ اس دنیا میں جب خیر و شر اشیاء میں بذاتہ نہیں ہے، تو اچھی چیزون کیلئے الگ اور بری چیزون کیلئے الگ خالق تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ خالق ایک ہی ہے، دونین نہیں

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اِثْنَيْنِ — اور خدا نے کہا کہ دو خدا نہ بناؤ وہ ایک ہی خدا

اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنَ — ہے، تو مجھی سے ڈرو اور اسی کے لیے ہے

وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (نحل،) — جو آسمانون مین اور زمین میں ہے،

بزرگون کی مشرکانہ تعظیم سے روکنا

۲- شرک کا بہت بڑا ذریعہ کسی خاص شخص، کسی خاص شے کی تعظیم مفرط ہے، جسکو شخص پرستی یا یادگار پرستی سے تعبیر کر سکتے ہین، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، رامچندر، کرشن کو اسی خوش اعتقادی نے آدمی سے خدا بنا دیا، اس بنا پر قرآن مجید مین نہایت پُرزور اور پُر رعب الفاظ مین شخص پرستی کی تحقیر کیگئی

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَ
لَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ ، إِنَّمَا
الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ ۔ (نساء
لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْمَسِيحُ أَنْ يَكُونَ عَبْدًا
لِلَّهِ وَلَا الْمَلَائِكَةُ الْمُقَرَّبُونَ وَمَنْ
يَسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيَسْتَكْبِرْ
فَسَيَحْشُرُهُمْ إِلَيْهِ جَمِيعًا (نساء ۲۴)
لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ
الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ مِنَ
اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَنْ يُهْلِكَ
الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ وَمَنْ فِي
الْأَرْضِ جَمِيعًا وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ
وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ
وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (مائدہ ۳)
وَإِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ
ءَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَ
أُمِّيَ إِلٰهَيْنِ مِنْ دُونِ اللَّهِ قَالَ

اے اہلِ کتاب اپنے دین میں حد سے زیادہ
نہ بڑھ جاؤ، اور خدا کی نسبت وہی کہو جو حق ہے
مسیح یعنی عیسیٰ بن مریم صرف خدا کے پیغمبر ہیں،
مسیح کو خدا کا بندہ ہونے سے ہرگز عار نہیں اور
نہ مقرب فرشتوں کو (عار ہے) اور جس شخص کو
خدا کی بندگی سے عار ہوگا اور بڑائی کی لیگا تو خدا
سب کو عنقریب اپنے حضور میں بلائیگا،
وہ لوگ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ عیسیٰ بن مریم خدا
ہیں کہدو کہ اگر خدا یہ چاہے کہ مسیح بن مریم کو،
اسکی ماں کو اور دنیا میں جو کچھ ہے سب کو برباد
کردے تو کون ہے جو خدا کو روک لے، اور خدا
ہی کیلئے آسمان و زمین اور جو چیزیں ان دونوں
میں ہیں سب کی حکومت ہے، وہ جو چاہے کرے
اور خدا ہر چیز پر قادر ہے
اور جب خدا کہیگا کہ کیوں عیسیٰ! تم نے لوگوں
سے کہدیا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھکو اور میری ماں
کو خدا کہو، عیسیٰ عرض کرینگے کہ سبحان اللہ میری

مُبْحَانَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْ اَنْ اَقُوْلَ مَا
لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ
عَلِمْتَهٗ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَا
اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ اِنَّكَ اَنْتَ
عَلَّامُ الْغُيُوْبِ مَا قُلْتُ لَهُمْ
اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ
رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ (مائدہ ۱۷)

یہ محال ہے کہ میں ایسی بات کہوں جس کے کہنے
کا مجھے حق نہیں، اگر میں نے کہا ہوگا تو تو جانتا
ہوگا، تو میرے دل کی بات جانتا ہے، اور میں
تیرے دل کی بات نہیں جانتا، تو بڑا غیب دان
ہے، میں نے لوگوں سے صرف وہی کہا تھا جو
حکم تو نے مجھکو دیا تھا، یعنی یہ کہ خدا کی عبادت
کرو جو میرا بھی خدا ہے اور تمہارا بھی،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باوجود اس کے کہ حاصل کون و مکان تھے، لیکن بار بار قرآن مجید میں تاکید آتی تھی،

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ
اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ
(کہف ۱۱۰)

کہدے اے پیغمبر کہ میں تو تمہاری ہی طرح آدمی
ہوں لیکن یہ کہ میری طرف وحی بھیجی جاتی ہے کہ
تمہارا خدا ایک خدا ہے،

ایک خاص نکتہ غور کے قابل ہے جس قدر جلیل القدر انبیاء علیہم السلام گذرے ہیں ان کے خاص خاص لقب ہیں، مثلاً حضرت موسیٰ کلیم اللہ تھے حضرت ابراہیم خلیل اللہ تھے، اور حضرت عیسیٰ روح اللہ تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باوجود اس کے کہ اشرف انبیاء تھے آپ کا کیا لقب تھا، اور کلمہ توحید میں نماز میں درود میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کیساتھ کیا امتیازی وصف شامل کیا گیا، صرف رسالت اور عبدیت کا،

اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ — میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد خدا کے بندہ اور رسول ہیں،

اس میں بھی عبدیت کا وصف رسالت پر مقدم ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ بعض کفار کے حق میں دعائے بد کی اس پر یہ آیت اتری[1]

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ — تم کو کچھ اختیار نہیں ہے، خدا چاہیگا تو ان پر توجہ

اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظَالِمُوْنَ (العمران) — کریگا، یا ان کو عذاب دیگا کہ وہ ظالم ہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعض کفار کی ہدایت پانے اور اسلام قبول کرنے کے نہایت خواہشمند تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ (قصص) — تم جسکو چاہتے ہو اسکو ہدایت نہیں کر سکتے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی کیلیے دعائے مغفرت کی، اس پر قرآن مجید میں آیا

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ — تم ان کے لیے مغفرت چاہو یا نہ چاہو اگر تم ان کے

اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً — لیے ستر دفعہ بھی مغفرت چاہو گے تو خدا ان کی

فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (توبہ ۱۰) — مغفرت نہ کرے گا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ہر موقع پر اس امر کی تاکید اور اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ لوگ آپ کی زیادہ از اعتدال مدح نہ کریں، جو منبر ہو کر شرک تک پہنچ جائے، بار بار فرماتے تھے،

لَا تُطْرُوْنِيْ كَمَا اَطْرَتِ الْيَهُوْدُ — میری شان میں اسطرح مبالغہ نہ کرو جسطرح یہود

---

[1] بخاری غزوہ احد، یہ حدیث بخاری کے مختلف ابواب میں مذکور ہے

[2] بخاری کتاب التفسیر، تفسیر سورہ توبہ،

وَالنصاریٰ — ونصاریٰ نے اپنے پیغمبرون کی شان مین کیا،

ایک دفعہ آپ راستہ مین جارہے تھے، ایک شخص نے دفعۃً آپ کو دیکھا اور اس پر اس قدر رعب طاری ہوا کہ کانپنے لگا، آپنے فرمایا ڈرو نہیں مین ایک قریشی خاتون کا بیٹا ہون، جو گوشت کو خشک کرکے کھایا کرتی تھی،[۲]

بنو عامر کا وفد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین حاضر ہوا تو لوگون نے عرض کی کہ آپ ہمارے سید (آقا) ہین، آپنے فرمایا سید خدا ہے، لوگون نے عرض کی کہ آپ ہم سب سے افضل اور سب سے بزرگ ہین، آپنے فرمایا اچھا کہو لیکن دیکھو کہین تم کو شیطان اپنا دلیل نہ بنالے، اصلی الفاظ یہ ہین،

قولوا بقولکم او بعض قولکم ولا یستجرینکم الشیطان

ایک دفعہ ایک شخص نے ان الفاظ مین آپ کو مخاطب کیا، اے ہمارے آقا! اور ہمارے آقا کے فرزند! اور اے ہم مین سب سے بہتر اور سب سے بہتر کے فرزند! آپنے فرمایا، لوگو! پرہیزگاری اختیار کرو، شیطان تمھین گمراہ نہ دے، مین عبداللہ کا بیٹا محمد ہون، خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہون، مجھکو خدا نے جو مرتبہ بخشا ہے مجھے پسند نہین کہ تم مجھے اس سے زیادہ بڑھاؤ۔[۳]

غور کرو کہ رسول کی شان مین یہ الفاظ ناجائز نہین، مگر توحید کو شرک کے ہر شائبہ سے بچانے کا خیال ہر خیال پر غالب تھا،

۳۔ شرک کا اصلی ضرر یہ ہے کہ خدا سے انسان کو جس درجہ کا تعلق، جس قسم کا عجز و نیاز جس مرتبہ — درمیانی واسطون کا مشرکانہ اعتقاد

[۱] بخاری جلد اول کتاب الانبیاء باب واذکر فی الکتاب مریم، [۲] شمائل ترمذی مستدرک جلد ۳ ص ۴۸ علی شرط الشیخین واقعہ فتح مکہ، [۳] ادب المفرد امام بخاری باب ہل یقول سیدی ابوداؤد کتاب الادب باب کراہیۃ التمادح فی مسند ابن حنبل جلد ۳ ص ۱۵۳،

کی محبت جس درجہ کی التجا درکار ہے، اس کا رخ دوسری جانب بدل جاتا ہے، ہزار دن لاکھون آدمی ہین، جو اچھی طرح جانتے ہیں کہ دیوتا کائنات اور زمین و آسمان کے خالق نہیں ہین، تاہم وہ ہر قسم کی حاجتین اور مرادین ان ہی دیوتاؤن اور معبودون سے مانگتے ہین، ان ہی کو حاجت روا جانتے ہین، اٹھتے بیٹھتے ان ہی کا نام لیتے ہین، ان ہی پر نذر و نیاز چڑھاتے ہیں، غرض براہ راست انکو جو تعلق ہوتا ہے، ان ہی معبودوں سے ہوتا ہے، خود مسلمانوں میں ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا طرز عمل انبیاء و صلحا، بلکہ حرارات کی نسبت اس کے قریب قریب ہے، اس بنا پر مقدم ترین امر یہ ہے کہ معبودون کی نسبت اس قسم کا خیال نہ پیدا ہونے پائے بلکہ صاف صاف بتا دیا جائے کہ خدا کے آگے کسی کی کچھ نہیں چل سکتی اور اس کی مرضی مین کوئی دست اندازی نہیں کر سکتا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے طلب مغفرت کا وعدہ کیا تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا،

لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ (ممتحنہ ۱۰)	مین آپکے لیے مغفرت کی درخواست ضرور کرونگا لیکن مجھکو خدا کے سامنے آپ کی نسبت کوئی اختیار نہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنی والدہ کے لیے استغفار کی اجازت مانگی تھی، وہ نہین ملی، البتہ یہ درخواست قبول ہوئی کہ میں اُن کی قبر کی زیارت کر لون[1]،

قرآن مجید میں جب یہ آیت اتری، وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ تو آپنے نماز کے لوگون کو جمع کر کے فرمایا اے قریشیو! اے اولاد عبد المطلب! اے عباس! اے صفیہ!

[1] صحیح مسلم کتاب الجنائز

اے فاطمہ! میرے مال میں سے جو مانگو میں دے سکتا ہون لیکن خدا کے ہان مین تمھارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔"[1]

قرآن مجید مین نہایت کثرت اور نہایت تشدد کیساتھ اس مضمون کو ادا کیا گیا کہ تم لوگ جنکو حاجت روا سمجھتے ہو اور جن سے حاجتیں مانگتے ہو، اُن کو کارخانۂ ہستی میں کسی قسم کا اختیار نہیں،

قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِنْ	کہدو کہ خدا کے علاوہ تم جنکو پکارتے ہو وہ
دُونِهِ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ الضُّرِّ	تمھاری مصیبت کے ہٹانے یا بدلنے کا کچھ
عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا أُولَٰئِكَ الَّذِينَ	اختیار نہیں رکھتے جنکو یہ لوگ پکارتے ہیں، وہ
يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ	بھی زیادہ قرب حاصل کرنے کیلئے خود خدا
الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ	ہی کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں اور اسکی
رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ	رحمت کے امیدوار رہتے ہین اور اس کے
إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ	عذاب سے ڈرتے ہیں، بے شبہ تیرے خدا کا عذاب
مَحْذُورًا (بنی اسرائیل - ۶)	ڈرنے ہی کے قابل ہے،

۵۔ شرک کا ایک بڑا ذریعہ خوارقِ عادات کی نسبت غلط فہمی ہے جن اشخاص سے خوارق عادات سرزد ہوتے ہین، اُن کی نسبت لوگون کو پہلے یہ خیال آتا ہے کہ یہ خود خدا نہیں ہیں لیکن ان مین خدائی کا شائبہ ضرور ہے اور نہ ایسے افعال کیونکہ سرزد ہوتے جو قدرتِ انسانی سے بالاتر ہیں یہی خیال رفتہ رفتہ دیوتا اور اوتار تک ترقی کرتا ہے اور بالآخر خدائی تک پہنچا دیتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام

خوارق خدا کے حکم سے ہوتے ہیں

[1] یہ روایت اس آیت کی تفسیر میں تمام تفسیروں اور حدیث کی کتابون میں منقول ہے،

اسی بنا پر آج چالیس کروڑ آدمیوں کے خدا، یا خدا کے بیٹے ہیں،

لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہوتا کہ انبیاء علیہم السلام سے معجزات صادر ہوتے ہیں اور یہ امر خصائص نبوت میں ہے، تاہم یہ مسلہ اسلام کے زمانہ تک مشتبہ اور مجمل رہا، قرآن مجید میں اس کے متعلق حسب ذیل امور بیان کیے گئے ہیں،

(۱) معجزات صادر ہو سکتے ہیں، اور خدا اپنے مقبول بندوں کو معجزات عطا کرتا ہے،

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن	اور کفار کہتے ہیں کہ ان (آنحضرت) پر کوئی
رَّبِّهِ قُلْ إِنَّ اللَّهَ قَادِرٌ عَلَىٰ أَن يُنَزِّلَ	معجزہ خدا کے یہاں سے کیوں نہیں اترا
آيَةً وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ	کہدو کہ خدا اس پر قادر ہے کہ معجزہ نازل
(انعام-۴)	کرے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے،

(۲) باوجود اس کے کفار کو معجزہ طلبی سے روکا جاتا تھا، اور کہا جاتا تھا کہ نبوت اور رسالت معجزہ پر موقوف نہیں،

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ	اور کفار کہتے ہیں کہ ان (آنحضرتؐ) پر کوئی
عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ إِنَّمَا أَنتَ مُنذِرٌ	معجزہ خدا کے ہاں سے کیوں نہیں اترا، تم
وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ	تو صرف ڈرانے والے ہو، اور ہر قوم کے
(رعد-۱۰)	لیے ایک ہادی ہوتا ہے،
وَقَالُوا لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ	اور کفار کہتے ہیں کہ ہم تمہیں ایمان نہ لائیں گے
الْأَرْضِ يَنبُوعًا أَوْ تَكُونَ لَكَ	جبتک تم زمین سے چشمہ نہ نکال دو، یا تمہارے

جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ	پاس کھجورون یا انگورون کا باغ نہ ہو کہ جس کے
خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۙ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ	بیچ مین تم نہرین جاری کردو یا آسمان کو
كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ	ٹکڑے ٹکڑے کرکے ہم پر نہ گرادو، جیسا کہ تمھارا
بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۙ اَوْ يَكُوْنَ	گمان تھا، یا خدا اور فرشتون کو ہمارے سامنے
لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى	لے آؤ، یا تمھارا گھر سونے کا نہ ہوجائے یا تم آسمان
فِي السَّمَآءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ	پر نہ چڑھ جاؤ، اور ہم تو اس چڑھنے پر بھی نہ یقین
حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۭ	نہ لائیں گے جب تک ہم پر کوئی کتاب اتارو
قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا	جس کو ہم خود پڑھین" کہدو کہ سبحان اللہ
بَشَرًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل۔۱۰)	مین تو صرف بشر ہون اور رسول ہون،

(۳) جو معجزے اس آیت مین کفار نے طلب کیے وہ ناممکن بالذات نہ تھے، تاہم خدا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو جواب تلقین کیا، وہ یہ تھا کہ میں تو بشر ہون، دوسری جگہ اس کا جواب یہ ہے کہ معجزے تو خدا کے پاس ہین یعنی معجزے صادر ہون گے تو یہ میرا فعل نہ ہوگا، بلکہ خدا کا ہوگا،

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ	اور کفار کہتے ہین کہ ان (آنحضرت) پر انکے خدا
رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ	کے یہان سے معجزے کیون نہیں اترے، کہدو
وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ	کہ معجزے تو خدا کے ہان ہیں، اور میں تو صرف
اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ	صاف صاف ڈرانے والا ہون، کیا ان (کفار)
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ	کیلیے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے تمھارے

یُؤْمِنُوْن

اور یہ کتاب (قرآن) اتاری جو ان پر تلاوت کی جاتی ہے، اسمیں بے شبہ ایمان لانے والوں کے لیے رحمت اور یاد رکھنے کی چیز ہے، (عنکبوت ۵)

اسی لیے معجزات کے ذکر میں ہمیشہ بِاِذْنِ اللّٰہِ (خدا کی اجازت سے) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں،

۶- شرک کی ایک قسم یہ تھی کہ انبیاء یا پیشوایانِ مذہبی کو تحریم و تحلیل کا مجاز سمجھتے تھے یعنی وہ جس چیز کو چاہیں حرام کر دیں، اور جس چیز کو چاہیں حلال ٹھہرا دیں، قرآن مجید میں جب یہ آیت اتری

حرام و حلال کرنا خدا کا کام ہے،

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا، (توبہ ۵)

ان لوگوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو رب بنا لیا ہے،

تو حضرت عدیؓ نے جو حاتم طائی کے فرزند اور اسلام لانے سے پہلے عیسائی تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ ہم لوگ اپنے پیشوایانِ مذہبی کو اپنا رب تو نہیں سمجھتے تھے آپ نے ارشاد فرمایا کیا تم لوگوں کا یہ اعتقاد نہ تھا کہ یہ لوگ جس چیز کو چاہیں حلال اور جس کو چاہیں حرام کر دیں، عرض کی کہ ہاں، آپ نے فرمایا یہی رب بنانا ہے[1]، عموماً اہلِ مذاہب پیغمبروں کو شارع مستقل سمجھتے ہیں، لیکن یہ بھی ایک قسم کا شرک ہے، شریعت کی تاسیس، حلال و حرام کی تعیین جائز و ناجائز کی تفریق امر و نہی کے احکام یہ سب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں، پیغمبر صرف مبلغ اور پیغام رسان اور تعلیم الٰہی سے ان احکام کے شارح اور بیان کرنے والے ہیں، اسی بنا پر قرآن مجید میں ذات نبوی کی صفتِ رسالت کو بار بار تاکید اور اصرار کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے،

[1] جامع ترمذی و ابن کثیر تفسیر آیت مذکور،

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ — محمد تو صرف ایک رسول ہے اس سے پہلے
مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (آل عمران - ۵)
اور رسول گذر چکے ہیں،

اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ — مریم کا بیٹا عیسیٰ اللہ کا صرف
رَسُوْلُ اللّٰهِ (نساء - ۲۳)
رسول تھا،

اس حصر سے مقصود یہ ہے کہ انبیاء میں خدائی کی کوئی صفت نہیں ہوتی، بلکہ جو کچھ ان میں ہے وہ رسالت اور نبوت کے اوصاف ہیں،

غیر خدا کی سجدہ تعظیم

شرک کا ایک بڑا ذریعہ تھا کہ جو اعمال اور آداب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں، وہ اوروں کے ساتھ بھی برتے جاتے تھے، یہ اگرچہ شرک فی العبادۃ یا شرک فی الصفات ہے لیکن رفتہ رفتہ شرک فی الذات تک منجر ہوتا ہے، سجدہ عبادت خدا کے ساتھ مخصوص ہے لیکن کفار اور دیگر اہل مذاہب نبیوں اور مقتدایانِ دینی کو بھی سجدہ کرتے تھے، اور سلاطین اور امرا کو تو سجدہ کرنا عام طور سے رائج تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت سختی سے اسکو روکا، بنو اسرائیل میں سجدہ تعظیمی یا سجدہ محبت جائز تھا، چنانچہ حضرت یوسفؑ کو انکے والدین نے سجدہ کیا تھا، لیکن چونکہ اسلام میں توحید کو انتہائے کمال تک پہنچانا تھا سجدہ تعظیمی بھی منع کر دیا گیا، ایک دفعہ ایک صحابی خدمت اقدس میں آئے اور عرض کی کہ میں نے اہل عجم کو دیکھا ہے، وہ اپنے رئیسوں کو سجدہ کرتے ہیں، آپ اجازت دیں تو ہم آپ کو سجدہ کریں، آپ نے فرمایا تو کیا میری قبر پر گذرو گے تو اس کو سجدہ کروگے، عرض کی نہیں فرمایا تو آپ بھی نہ کرو، اگر میں کسی کو دوسرے کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دے سکتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے[1]، اسی طرح ایک اور صحابی ملک شام سے آئے تو آپ کو سجدہ کیا، آپ نے

[1] ابوداؤد کتاب النکاح باب حق الزوج علی المراۃ

پوچھا کہ یہ تم نے کیا کیا؟ عرض کی کہ مین نے شام مین رومیون کو دیکھا کہ وہ اپنے مذہبی افسرون کو سجدہ کرتے ہین، تو میرا جی چاہا کہ میں بھی آپ کو سجدہ کرون، فرمایا ایسا نہ کرو، اگر مین کسی کو خدا کے سوا سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے[1]

صفاتِ الٰہی کی توحید

۸۔ شرک کی ایک قسم یہ ہے کہ خدا کے ساتھ جو اوصاف مخصوص ہین، وہ اوروں مین تسلیم کیے جائین، جسکا یہ قدرتی نتیجہ ہے کہ وہ شرکتِ وصف کی بنا پر خدا کے شریک اور ہمسر بنجائین ان مین سے ایک وصف علم غیب ہے، اکثر اہل مذاہب اعتقاد رکھتے تھے، اور اب بھی رکھتے ہین کہ انبیاء اور اولیاء کو علم غیب ہوتا ہے، بنی اسرائیل کے زمانہ میں کاہنون کا یہی کام تھا کہ وہ آیندہ واقعات کی پیشین گوئیان کیا کرتے تھے، عرب میں بھی کاہن یہی پیشہ کرتے تھے، اور مختلف طریقون سے پیشین گوئی کرتے تھے، کبھی فال سے، کبھی پانسے پھینک کر اور کبھی یہ ظاہر کرکے کہ ان کو جنّات غیب کا حال بتا جاتے ہین،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت تاکید اور استقصا کیساتھ اس اعتقاد کو مٹایا، اور علم غیب کی تمام صورتین باطل کین، خود قرآن مجید مین نہایت کثرت سے اسکے متعلق آیتین نازل ہوئین

وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمہا	اور خدا کے پاس غیب کی کنجیان ہین، جن کو
الا ھو (انعام ۷)	خدا کے سوا کوئی نہین جانتا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اجمال کی تفصیل بیان فرمائی، اور فرمایا کہ مفاتیح غیب پانچ ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی نہین جانتا[2]

---

[1] ابن ماجہ باب حق الزوج علی المرأۃ [2] صحیح بخاری کتاب الرد علی الجہمیہ میں یہ تفصیل مذکور ہے،

۱۔ حمل مینی لڑکا ہوگا یا لڑکی،

۲۔ کل کیا ہوگا،

۳۔ بارش کب ہوگی،

۴۔ کس جگہ موت آئے گی،

۵۔ قیامت کب آئے گی،

اگرچہ علم غیب کی اور بھی صورتیں ہیں، لیکن زیادہ تر ان ہی امور کی نسبت لوگ علم غیب کے مدعی تھے، اور ان ہی باتوں کو لوگ پہلے سے جاننے کے خواہشمند ہوتے ہیں،

یہانتک کہ خود اپنی ذات سے بھی علم غیب کی نفی کی، ایک دفعہ ایک شادی کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، انصار کی چند لڑکیاں گا رہی تھیں، گاتے گاتے انھوں نے یہ گانا شروع کیا،

وفینا رسول یعلم ما فی غد — اور ہم میں ایک ایسا پیغمبر ہے جو کل کی بات جانتا ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ یہ نہ کہو، وہی کہو جو پہلے گا رہی تھیں[۲]، اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو خاص حکم دیا کہ آپ اس حقیقت کو واضح کر دیں،

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ (انعام - ۵) — کہدو کہ اے پیغمبر کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں،

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الرد علی الجہمیہ میں تفصیل مذکور ہے، [۲] صحیح بخاری کتاب النکاح

اور غیب کا علم صرف خدا کی ذات ہے،

قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ (نمل ۵) کہدے اے پیغمبر کہ خدا کے سوا آسمانوں میں اور زمین میں کوئی غیب نہیں جانتا۔

غیب دانی کے مدعی کاہن جو عرب کی گلی گلی میں خدع و فریب کا جال پھیلائے بیٹھے رہتے تھے اور بتخانوں میں خدائی کرتے تھے، انکی سطوت خاک میں مل گئی، بتخانے ویران ہو گئے تو انکے یہ پجاری بھی فنا ہو گئے، صحابہؓ نے آکر پوچھا کہ یا رسول اللہ! ہم جاہلیت میں کاہنوں کے پاس جایا کرتے تھے، فرمایا "آپ نہ جایا کرو"۔ عرض کی ہم پرندوں سے فال لیا کرتے تھے، فرمایا "یہ تمھارا وہم تھا، اسکے سبب سے اپنے ارادہ سے باز نہ آیا کرو"۔ بعض لوگوں کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ کاہن کچھ نہیں انھوں نے کہا یا رسول اللہ! انکی بعض باتیں سچی بھی نکل آتی ہیں، فرمایا شیطان ایک آدھ بات سن لیتا ہے اور مرغی کی طرح قر قر کر کے اپنے دوست کے کانوں میں ڈالتا ہے، اور وہ اس میں سو باتیں جھوٹ ملا دیتا ہے کبھی فرمایا کہ فرشتوں کی زبان سے شیاطین فضائے آسمانی میں چوری چھپے کچھ سن لیتے ہیں، اور کاہن اس میں سینکڑوں جھوٹ اپنی طرف سے ملا کر بیان کرتے ہیں، جاہلوں میں کچھ ایسے مکار ہوتے ہیں جو چوری کا غائبانہ پتہ بتانے کا دعویٰ کرتے ہیں، عرب انکو عراف کہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی کسی مال کا پتہ پوچھنے کیلئے کسی عراف کے پاس جائیگا اسکی چالیس دن کی نماز قبول نہ ہوگی، علم نجوم جسکے زور سے لوگ غیب کا حال دریافت کر لینے کے مدعی بنتے تھے، آپنے اسکا سیکھنا بھی حرام کیطرح گناہ بتایا ہے اور فرمایا کہ جو کسی کاہن کے پاس جا کر اسکی باتوں کو سچ سمجھے وہ محمد پر جو کچھ اترا ہے اس کا انکار

لہ مشکوٰۃ باب الکہانۃ میں صحیحین سے یہ حدیث نقل کی ہے، علم نجوم کی حرمت والی حدیث ابو داؤد، ابن ماجہ اور احمد سے کی ہے،

ان تعلیمات نے خدا کے علاوہ دوسروں کی غیب دانی کے عقیدہ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا، کہانت کی گرم بازاری سرد ہوگئی، فال، شگونِ بد، نجوم اور غیب دانی کے دوسرے خدّاعانہ طریقے مٹ گئے، پرندوں اور پانسوں کے ذریعہ سے غیب کا حال دریافت کرنا وہم و وسوسہ قرار پایا، اور غیب کی مملکت پر خدا کے سوا کسی اور کی حکومت قائم نہ رہی،

مخفی قوموں کا ابطال

۹۔ کائنات میں خدا کے سوا جن غیبی اسباب و علل یعنی سحر و طلسم، جنات و شیاطین اور ارواح خبیثہ اور دوسری قسم کی قوتوں کی غیبی قدرت و تصرف کا اعتقاد تھا، اور ان سے بچنے کیلئے ان کی دہائی پکاری جاتی تھی، نذر چڑھائی جاتی تھی، قربانی کیجاتی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور وحی نے ان تمام مزخرفات کا قلع قمع کر دیا اور خدا کے سوا تمام دوسری مخفی اور پوشیدہ قوتوں کا ڈر انسانوں کے سینوں سے ہمیشہ کے لیے نکال کر پھینک دیا، اور وہ اور کلماتِ الٰہی کے سوا ہر نوع کی جھاڑ پھونک، منتر، تعویذ، گنڈے ٹوٹکے، جن میں کسی غیر خدا سے غیبی امداد یا ترک کا کلمہ ہو، کفر قرار پائے اسی قسم کے فاسد خیالات کے استیصال کے لیے ہر نماز میں اور نماز کی ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے ضمن میں اس آیت کے پڑھنے کا حکم دیا گیا،

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ	(اے عالم کے پروردگار) ہم تیرے ہی آگے سر
(فاتحہ)	جھکاتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں

سحر و طلسم دبجادو اور ٹوٹکے کے متعلق ارشاد خداوندی ہوا،

وَمَا هُمْ بِضَآرِّیْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا	یہ جادو اور ٹوٹکے کرنے والے کسی کو کچھ نقصان
بِاِذْنِ اللّٰهِ وَیَتَعَلَّمُوْنَ مَا یَضُرُّهُمْ	نہیں پہنچا سکتے، لیکن خدا کے حکم سے اور یہ یہود
وَلَا یَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ	وہ (جادو اور ٹوٹکے) سیکھتے ہیں جو ان کو

مَالَہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنْ خَلَاقٍ ۔ نقصان رسان ہیں نفع بخش نہیں اور یقیناً انکو علم ہے کہ جو انکو حاصل کرتا ہے اسکا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے،

یہ بھی اعلان کر دیا گیا کہ سحر و جادو کی حقیقت وہم و تخیل سے زیادہ نہیں، فرمایا،

یُخَیَّلُ اِلَیْہِ مِنْ سِحْرِھِمْ اَنَّھَا تَسْعٰی (طٰہٰ ۶۶) مصری جادوگروں کے جادو سے یہ اس کو خیال ہوتا تھا کہ وہ دوڑ رہے ہیں،

بلکہ بعض صحابہ نے ان مکار جادوگروں کے قلع قمع کے لیے ان کے قتل تک کا حکم دیدیا[1]، تاکہ انسانوں کے دلوں میں ان کا جو خوف و ہراس بیٹھا ہوا ہے وہ دور ہو، اور ان کے اس عاجزانہ قتل ہونے سے یہ ثابت ہو کہ ان میں کوئی غیر معمولی طاقت نہیں، وہ بالکل بے بس ہیں،

ابو داؤد میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہم جاہلیت میں جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے، اب آپ کیا فرماتے ہیں؟ ارشاد فرمایا کہ تم اپنے منتر ہمارے سامنے پیش کرو، اگر ان میں شرک کی کوئی بات نہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں، ایک اور صحابی نے ایک بیمار یا مخبل پر سورہ فاتحہ پڑھ کر دم کی وہ اچھا ہو گیا. اس نے ان کو انعام دیا انھوں نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے واقعہ عرض کیا، فرمایا کہ میری عمر کی قسم، ہر جھاڑ پھونک باطل ہے لیکن تم نے سچی جھاڑ سے روزی کھائی. ایک اور صحابی روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا،

ان الرقی والتمائم والتولہ شرک (ابو داؤد و ابن ماجہ) بیشک جھاڑ پھونک، گنڈے اور میاں بیوی کے چھڑانے کے تعویذ شرک ہیں،

---

[1] جامع ترمذی باب ماجاء فی حد الساحر و ابو داؤد باب اخذ الجزیہ من المجوس

ان ہی صحابی کے گھر میں ایک بڑھیا آیا کرتی تھی، گھر والوں نے اس سے کسی بیماری کا کوئی ٹوٹکا کرایا، ایک دھاگا پڑھکر اس نے باندھ دیا تھا، وہ گھر آئے تو اس دھاگے پر ان کی نظر پڑی، انھوں نے ہاتھ بڑھایا اور اس کو توڑ کر پھینک دیا، پھر فرمایا کہ عبداللہ کا خاندان شرک کی باتوں سے مستغنی ہے، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے کہ "جھاڑ پھونک، گنڈے اور میاں بیوی کے چھڑانے کے تعویذ شرک ہیں"، ان کی بیوی نے کہا کیا وجہ ہے کہ ایک دفعہ میری آنکھوں میں کچھ پڑ گیا جب میں جھاڑتی تھی تو پانی رک جاتا تھا اور جب چھوڑ دیتی تھی تو پانی بھر آتا تھا، انھوں نے جواب دیا، یہ شیطانی بات ہے، تم نے کیوں نہ وہ کیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے، آنکھوں میں پانی ڈالتیں اور یہ دعا پڑھتیں "اے لوگوں کے پروردگار! اس بیماری کو دور کر تو ہی شفا دینے والا ہے، تیری شفا بخشی کے سوا کوئی شفا نہیں، ایسی شفا دے کہ پھر کوئی بیماری نہ رہے"[1]

۱۰۔ وہ تمام اوہام و خرافات جنسے شرک اہل عرب لرزہ براندام رہتے تھے اور جنکو وہ بالذات مؤثر اور متصرف سمجھتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انکا طلسم توڑ دیا اور اعلان فرمایا کہ انکی کوئی اصل نہیں فرمایا،

لا عدوی ولا طیرۃ ولا صفر	نہ چھوت ہے، نہ بدفالی ہے، نہ پیٹ میں بھوک کا
ولا ھامۃ (ابوداؤد و ابن ماجہ)	سانپ ہے، نہ مردہ کی کھوپڑی سے پرندہ نکلتا ہے

ایک اور صحابی کی روایت ہے کہ آپنے فرمایا:۔

الیافۃ والطیرۃ والطرق من	پرندوں کی بولی سے فال لینا، انکے اڑنے سے فال لینا
الجبت (ابوداؤد و ابن ماجہ)	اور کنکری پھینکر یا خط کھینچکر حال بتانا شیطانی کام ہے

[1] یہ تمام روایتیں ابوداؤد جلد دوم باب التمائم و باب ما جاء فی الرقی اور ابن ماجہ باب تعلیق التمائم میں ہیں،

ایک اور صحابی آپ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ "فال نکالنا شرک ہے" پھر ان صحابی نے کہا کہ ہم صحابہ میں کوئی نہیں جو اس کو برا نہ سمجھتا ہو، بلکہ خدا پر بھروسہ رکھنا چاہیئے[1]۔ یہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بچھتر (نحوست) کچھ نہیں[2] یعنی پانی کی بارش میں اس کو بالذات کوئی دخل نہیں، اسی طرح غول بیابانی کے متعلق عربوں کے جو معتقدات تھے ان کو آپ نے ایک لفظ سے باطل فرما دیا۔ فرمایا:-

لا غول (ابوداؤد باب فی الطیرۃ) غول بیابانی کچھ نہیں،

بحیرہ اور سائبہ وغیرہ جانوروں کے متعلق انکے خیالاتِ فاسدہ کا قرآن نے ابطال کیا، سورۂ انعام میں ان کے ان مشرکانہ عقائد اور اعمال کی تصریح تردید کی گئی، اور سورہ مائدہ میں فرمایا گیا:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ نہ تو بحیرہ اور سائبہ اور وصیلہ اور حام مقرر کئے

بحیرہ اُس بچہ کو کہتے تھے جس کا کان پھاڑ کر بتوں کی نذر کرتے تھے،

سائبہ اُس جانور کو کہتے تھے جو بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا،

وصیلہ بعض لوگ نذر مانتے تھے کہ اگر بچہ نر ہوا تو اس کو بت پر چڑھائیں گے اور اگر مادہ ہوا تو اپنے پاس رکھیں گے، پھر اگر نر و مادہ پیدا ہوتے تو مادہ کے ساتھ نر بھی رکھ لیتے تھے، یہ وصیلہ تھا

حام وہ اونٹ جس کے دس بچے بوجھ اٹھانے اور سواری کے لائق ہو چلتے تو دیوتا کے نام پر آزاد کر دیا جاتا تھا

یہ اور اسی قسم کے دوسرے اوہام جو عرب میں پھیلے ہوئے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا استیصال فرمایا، یہ اوہام پرستی حقیقت میں قوموں کی تباہی کا ایک بڑا سبب ہوتی ہے، یہ اوہام حقیقت کے خلاف ہونے کے علاوہ بہت سے کاموں میں خلل انداز ہوتے ہیں، اور غور سے دیکھو تو انکا سلسلہ بالآخر کسی نہ کسی شرک تک منجر ہوتا ہے، اور انسان کو صحیح طریق عمل سے روک دیتے ہیں

---

[1] ابوداؤد و ابن ماجہ ذکر فال [2] ابوداؤد و ابن ماجہ

مثلاً بیماری مین طب کے قاعدہ کے موافق علاج کیا جائے تو مفید ہوگا لیکن بہت سے لوگ وہم پرستی کے بنا پر ٹوٹنے ٹوٹکے کو دافعِ مرض سمجھتے ہیں، اس قسم کے اوہام عرب میں نہایت کثرت سے پھیلے ہوئے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو تصریح اور تعیین کے ساتھ باطل قرار دیا، مثلاً

۱- عرب کا خیال تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مرجاتا ہے تو چاند اور سورج میں گرہن لگتا ہے، آپکے صاحبزادہ حضرت ابراہیمؓ نے جب انتقال کیا تو سورج گرہن لگا ہوا تھا، لوگوں نے خیال کیا کہ ان ہی کے مرنے کا اثر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو مسجد میں جاکر خطبہ دیا کہ چاند اور سورج خدا کی قدرت کے مظاہر ہیں کسی کے مرنے سے ان میں گرہن نہیں لگتا۔[1]

۲- یہ خیال تھا کہ سانپ اگر مارا جائے تو اس کا جوڑا آتا ہے اور انسان کو ہلاک کرتا ہے

۳- ایک دفعہ آپؐ مسجد مین تشریف رکھتے تھے، ایک ستارہ ٹوٹا، آپنے دریافت فرمایا کہ جاہلیت میں تم لوگ اس کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے تھے، لوگوں نے عرض کی کہ ہمارا اعتقاد تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مرجاتا ہے یا کوئی بڑا شخص پیدا ہوتا ہے تو ستارے ٹوٹتے ہیں، آپنے فرمایا کہ کسی کے مرنے یا پیدا ہونے سے ستارے نہیں ٹوٹتے۔[2]

۴- شیر خوار بچون کے سرہانے استرا رکھ دیا کرتے تھے کہ ان کو جنات نہ ستانے پائین، ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے دیکھا تو اٹھا کر پھینک دیا اور کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان باتون کو ناپسند کرتے تھے۔[3]

۵- نظر بد سے بچنے کے لیے اونٹوں کے گلے مین قلادہ لٹکاتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ کسی اونٹ کے گلے میں قلادہ نہ رہنے پائے۔[4]

---

[1] صحیح بخاری باب صلوٰۃ الکسوف [2] مسند ابن حنبل جلد اول ص ۴۱۱ [3] ادب المفرد باب الطیرۃ من الجبت ص ۱۰۳ مصر [4] موطا امام مالک باب ما جاء فی نزع التطیق والجرس من العین ص ۳۷۳۔

الغرض توحید کامل کی تعلیم نے عربوں کے تمام مشرکانہ اوہام وخرافات کو ہمیشہ کیلئے مٹادیا، اسلام کی اس اصلاح اہمیت کا اندازہ عیسائیت کی ان مقدس روایات وحکایات سے کرو، جنھوں نے صدیوں تک دنیا کو دیووں، بھوتوں اور چڑیلوں کے تسلط اور عذاب کے شکنجہ میں مبتلا رکھا، اور ان کو نکالنا اور بھگانا عیسائیت کا کمال اور اعجاز سمجھا جاتا رہا،

کفارہ اور شفاعت کے غلط معنی کی تردید

۱۱۔ شرک کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب کفارہ اور شفاعت کے وہ غلط معنی تھے جو عربوں اور عیسائیوں وغیرہ میں رائج تھے، عربوں نے شفاعت کے جو غلط معنی سمجھ رکھے تھے اسکا اصلی سبب ان کا وہ تخیل تھا جو خدا اور بندوں کے تعلق کی نسبت انکے ذہن میں قائم تھا، وہ خدا اور بندوں کے درمیان وہی نسبت سمجھتے تھے جو ایک قاہر وجابر بادشاہ اور اسکی رعایا کے درمیان ہے، اور جس طرح بادشاہ کے دربار تک ایک عام اور معمولی رعایا کی رسائی دربار میں سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر ممکن نہیں، اسی طرح اس شہنشاہ کے دربار میں بھی وہ اسکے دربار میں سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر رسائی ممکن نہیں سمجھتے تھے، اسی لیے وہ ان درمیانی ہستیوں کی خوشنودی کے ضرورت کے بھی معتقد تھے، چنانچہ وہ اپنے بتوں، دیوتاؤں اور فرشتوں کو اسی نیت سے پوجتے تھے، اور کہتے تھے،

هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (یونس ۲)

یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انکی اس بت پرستی پر انکو ملامت کی تو انھوں نے صاف کہا

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (زمر ۱)

ہم ان کو اسی لیے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ کے تقرب میں نزدیک کردیں۔

یہودیوں میں بھی اسی قسم کی دوسری غلط فہمی تھی، وہ یہ سمجھتے تھے کہ بنی اسرائیل کا گھرانا خدا کا

خاص کنبہ اور خاندان ہے، اور ان کے خاندان کے پیغمبر اور نبی چونکہ خدا کے پیارے اور محبوب ہیں اس لیے ان کی اولاد اور نسل بھی دنیا اور آخرت میں یہی درجہ رکھتی ہے، اگر ان پر کوئی مصیبت بھی پڑے گی تو بھی ان کے خاندان کے بزرگ جو خدا کے مقرب اور برگزیدہ ہیں، وہ ہر طرح ان کو اس سے بچا لیں گے ان کا دعویٰ تھا کہ

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (مائدہ ۳)

ہم خدا کی اولاد اور اسکے پیارے ہیں۔

قرآن نے کہا:۔

بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ (مائدہ ۳)

بلکہ تم بھی خدا کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہو، یہ اسی کو اختیار ہے جس کو چاہے بخشے اور جس کو چاہے سزا دے،

اور اسی بنا پر ان کا دعویٰ تھا:

لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ (البقرہ ۳)

ہم کو دوزخ صرف چند گنتی کے دن چھو کر چھوڑ دے گی۔

قرآن نے کہا:۔

وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (البقرہ ۳)

اور یہ اپنے دل سے بنا کر جو جھوٹ عقیدہ گھڑ چکے ہیں وہ ان کے مذہب کے بارہ میں ان کو دھوکا دے رہا ہے،

عیسائیوں کا عقیدہ یہ تھا اور ہے کہ باپ (خدا) نے تمام انسانوں کی طرف سے جو موروثی

اور طبعی طور سے گنہگار ہیں، اپنے اکلوتے بیٹے (حضرت عیسیٰؑ) کو قربانی دیکر ان کے گناہوں کا کفارہ دیدیا، اور وہ گناہوں سے پاک وصاف ہوگئے اور حضرت عیسیٰؑ اور ان کے بعد ان کے جانشین پوپوں کو گناہوں کے معاف کرنے کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جو زمین پہ کھولیں گے، وہ آسمان پہ کھولا جائے گا، اسی لیے پوپوں کے سامنے اعتراف گناہ کا عقیدہ عیسائیوں میں پیدا ہوا اور ان کو بندوں کے گناہوں کے معاف کرنے کا دنیا میں حق ملا۔

پیغامِ محمدی نے ان کو ملزم قرار دیا اور کہا:۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ	انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں
اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (توبہ)	اور راہبوں کو اپنا خدا بنا رکھا ہے،

اور اصولی طور پہ اس نے یہ بتا دیا کہ

وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ (آل عمران)	اور خدا کے سوا کون گناہوں کو معاف کر سکتا ہے

ان کا عقیدہ تھا کہ بیٹا قیامت کے دن باپ کے داہنے بازو پہ برابر بیٹھکر خلق کا عدل وانصاف کرے گا، قرآن پاک نے ایک بڑے موثر طرز میں ان کی تردید کی ہے، قیامت کے دن خدا حضرت عیسیٰؑ سے پوچھے گا:۔

ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ	اے عیسیٰؑ کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کو
اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (مائدہ-۱۶)	چھوڑ کر مجھکو اور میری ماں کو خدا بناؤ،

وہ کہیں گے، بار الہا! میں نے تو ان سے وہی کہا جو تو نے کہا تھا، میں نے تو ان کو یہ تعلیم نہیں دی تھی، میں نے تو ان سے یہی کہا تھا کہ صرف ایک خدا کو پوجو، اب

إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۖ	اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں
وَإِن تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنتَ	اور اگر تو بخشدے تو تو سب کچھ کر سکتا ہے
الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (مائدہ ۱۲۷)	کہ تو غالب اور حکمت والا ہے،

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ گناہوں کی مغفرت اور معافی یا گناہوں پر سزا اور عذاب دینا صرف خدا کے ہاتھ میں ہے کسی دوسرے کو اس میں کوئی دخل نہیں،

بت پرست عربوں کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ یہ دیوتا اور ان کے یہ بت خدا کی طرف سے دونوں عالم میں مختار کل ہیں، وہ یہاں دینے نہ دینے کا، اور اس عالم میں بخشنے کا اختیار رکھتے ہیں، اس عقیدہ کا اہم ان کے یہاں شفاعت تھا، اور یہ دیوتا ان کے شفیع تھے، قرآن مجید نے کفار کے غیر خدا کے اختیار مغفرت اور ربط پرستانہ طریقہ شفاعت کے عقائد باطلہ کی ہر طرح تردید کی اور بتایا کہ یہ اختیار خدا کے سوا کسی اور کو نہیں، سب اس کی عظمت اور جلال کے سامنے عاجز اور درماندہ ہیں۔

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ	یہ کافر خدا کو چھوڑ کر جنکو پکارتے ہیں وہ شفاعت
الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَن شَهِدَ بِالْحَقِّ	کا اختیار نہیں رکھتے، لیکن وہ جس نے حق کی
وَهُمْ يَعْلَمُونَ (زخرف ۷)	شہادت دی اور وہ جانتے بھی ہوں
لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ	یہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ
عِندَ الرَّحْمَٰنِ عَهْدًا (مریم ۷۰)	جس نے رحمٰن والے خدا سے اقرار لے لیا
ءَأَتَّخِذُ مِن دُونِهِ آلِهَةً إِن يُرِدْنِ	کیا خدا برحق کو چھوڑ کر جھوٹے معبودوں
الرَّحْمَٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّي شَفَاعَتُهُمْ	کو خدا بناؤں، اگر رحمٰن مجھے نقصان پہنچانا

شَيْئًا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ

(یٰسین-۲)

چاہے تو انکی شفاعت مجھے ذرا بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی اور نہ وہ مجھے چھڑا سکتے ہیں،

کفار فرشتوں کو بھی اسی غرض سے پوجتے تھے، حکم ہوا،

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى (نجم-۳)

اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہ انکی شفاعت کچھ فائدہ نہیں پہنچاتی لیکن اس کے بعد کہ اللہ اجازت دے جس کے لیے چاہے اور پسند کرے،

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ (زمر-۶)

کیا ان کافروں نے خدا کے سوا کوئی شفیع بنا رکھے ہیں کہدے کہ اگر یہ کچھ اختیار اور سمجھ نہ رکھتے ہوں تو بھی؟ (شفیع بننے کے قابل ہیں)

خدا قیامت میں ان سے کہے گا:

وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا (انعام-۱۱)

اور ہم دیکھتے نہیں تمہارے ساتھ تمہارے ان شفیعوں کو جن کو تم سمجھتے تھے کہ وہ تمہاری ملکیت میں خدا کے شریک ہیں

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا (روم-۲)

اور جب قیامت قائم ہوگی تو مشرکین ناامید ہونگے کہ جنکو وہ خدا کا شریک کار بناتے تھے ان میں سے کوئی انکا شفیع نہ ہوا،

خاص یہود کو مخاطب کر کے ان کے عقیدہ کی تردید میں کہا گیا،

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ	اے فرزندانِ اسرائیل
وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ	اور ڈرو اس دن سے جس میں کوئی دوسرے کے ذرہ کام
نَّفْسٍ شَیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا	نہ آئیگا اور نہ اسکی طرف سے کوئی شفاعت قبول
شَفَاعَةٌ وَّلَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ	کیجائیگی اور نہ کچھ اس کے بدلہ میں لیا جائیگا
وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ (بقرہ - ۱۵)	اور نہ کوئی ان کو مدد پہنچائی جائے گی،

پھر اسی معنی کی آیت اسی سورہ میں دوسری جگہ ہے،

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ	اے فرزندانِ اسرائیل .....
وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ	اور ڈرو اس دن سے جس میں کوئی کسی کے ذرا بھی
نَّفْسٍ شَیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ	کام نہ آئیگا اور نہ اسکی طرف سے کوئی بدلہ قبول
وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ (بقرہ - ۱۵)	ہوگا اور نہ شفاعت فائدہ دے گی۔

اور اسی معنی میں مسلمانوں سے بھی کہا گیا کہ وہ عمل پیش کریں شفاعت کے بھروسے نہ رہیں،

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا	اے مسلمانو جو کچھ ہم نے تم کو روزی دے رکھی
رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ	ہے اس میں سے کچھ خرچ کر دیا کرو اس دن کے
یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّ	آنے سے پہلے جس میں نہ لین دین ہے نہ دوستی
لَا شَفَاعَةٌ (بقرہ - ۳۴)	ہے نہ شفاعت ہے،

غرض آپکے پیغام نے ان معنوں میں شفاعت کے عقیدہ باطل کی ہر جگہ تردید کی ہے،

اور اعلان کیا ہے کہ اس شفاعت کا اختیار صرف خدا کے ہاتھ میں ہے،

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ	کیا انھوں نے خدا کے سوا اوروں کو شفیع بنا رکھا ہے
قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْئًا	کہدے کہ اگرچہ انکو کسی چیز کا اختیار نہو اور نہ انکو
وَّلَا يَعْقِلُوْنَ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ	سمجھ ہو، تو بھی کہدے کہ شفاعت کا کل اختیار
جَمِيْعًا لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ	خدا ہی کو ہے، اسی کا راج آسمانوں اور زمین میں
الْاَرْضِ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ	ہے، پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے،

اس آیت پاک نے کفار و مشرکین کے عقیدۂ شفاعت کی قطعی طور سے تردید کی، دوسری آیت میں یہود و نصاریٰ کے عقیدۂ شفاعت کا صرف اتنا حصہ تسلیم کیا کہ خدا کے نیک بندے اپنے دوسرے بھائیوں کے حق میں شفاعت کریں گے،

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ	اور یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر جنکو پکارتے ہیں وہ شفاعت
دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ	کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جنھوں نے حق کی
بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (زمر ۷)	گواہی دی اور وہ دانش رکھتے ہیں۔

دوسری جگہ اسی شہادت کو اقرار لینا کہا گیا ہے،

لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ	یہ لوگ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے، لیکن
اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا	وہ جو خدا کے نزدیک دنیا میں اپنے عمل کے
(مریم - ۷)	ذریعے) اقرار لے چکا ہے،

لیکن اس شہادتِ حق اور عہد الٰہی کے باوجود اس اختیار کے استعمال کے لیے اللہ تعالےٰ

کی اجازت اور ضامندی شرط ہے،

مَامِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْ بَعْدِ اِذْنِهٖ (یونس-۱)

(خدا کی بارگاہ میں) کوئی شفیع نہیں اس کی اجازت کے بعد

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (بقرہ-۳۴)

وہ کون ہے جو خدا کے سامنے کسی کی شفاعت کرسکے لیکن اس کی اجازت سے،

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْئًا اِلَّا مِنْ بَعْدِ اَنْ یَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَرْضٰی

اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہ انکی شفاعت ذرا بھی کام نہیں آسکتی، البتہ اسکے بعد کہ خدا اجازت دے جسکو چاہے اور پسند کرے

لَا یَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا۔ (نبا-۲)

یہ فرشتے اور روح کوئی خدا سے اذن پائے بغیر کلام نہ کرسکیں گے لیکن جسکو وہ رحم والا اجازت دے اور ٹھیک کہے،

پھر یہ شفاعت بھی ان ہی لوگوں کے حق میں ہوسکے گی جن کے حق میں اللہ تعالیٰ انبیاء اور صالحین کو اس کی اجازت دے گا، فرمایا۔

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ (سبا-۳)

اور شفاعت خدا کے نزدیک نفع نہ دیگی لیکن اس کیلئے جس کیلئے وہ شفاعت کی اجازت دے

یَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِیَ لَهٗ قَوْلًا۔ (طٰہٰ-۷)

اس دن شفاعت نفع نہ دیگی لیکن اسکو جس کے لیے خدا اجازت دے اور اسکے لیے بات کرنا پسند کرے،

بلکہ خود انبیاء علیہم السلام بھی سفارش ان ہی کی کرینگے جن کی سفارش خدا خود چاہے گا، فرمایا

وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ	اور وہ شفاعت نہیں کرینگے لیکن اسکی جب
مِنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ	کیلئے خدا اپنی خوشنودی ظاہر کرے اور وہ
(انبیاء - ۲)	اس کے خوف سے ترساں ہوں گے۔

پھر ایک جماعت ایسی بھی ہے جس کے افراد کے لیے ازل ہی سے یہ اعلان عام ہو چکا ہے کہ ان کے لیے مغفرت اور شفاعت کا دروازہ بند ہے، اور یہ وہ مجرم ہیں جن کے دل حق کی شہادت سے محروم ہو گئے،

فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِيْنَ	تو ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت
(مدثر - ۲)	فائدہ نہ دے گی۔
وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا	ظالموں (مشرکوں[1]) کا نہ کوئی دوست (اس دن)
شَفِيْعٍ يُّطَاعُ (مومن - ۲)	ہوگا اور نہ کوئی شفیع جس کی بات مانی جائے،

اور وہ بدنصیب گروہ جس کے حق میں رحمت کا یہ دروازہ بند رہے گا، مشرکین ہیں، جیسا ذیل کی آیت سے ظاہر ہے،

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ	اللہ اس گناہ کو کہ اس کے ساتھ کوئی
بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ	شریک ٹھہرایا جائے نہیں بخشتا، اور اس سے
لِمَنْ يَّشَآءُ (نساء - ۱۸)	نیچے کے گناہ جس کو چاہے بخش دے،

---

[1] اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمان - ۲) بیشک شرک بڑا ظلم ہے (صحیح بخاری ذکر لقمان، جلد ۱ صفحہ ۴۷۲)

لیکن اب ایسی حالت میں جبکہ وہ شفاعت کرسکیں گے جن کو اللہ تعالیٰ اس کی اجازت دے گا، اور وہ بھی ان ہی کی شفاعت کرینگے جن کی شفاعت کرنا خود خدا کو منظور ہوگا تو حقیقت میں خود اللہ تعالیٰ ہی اپنے دربار میں اپنا آپ شفیع ہوگا، یا صوفیانہ اصطلاح میں یوں کہو کہ جلال الٰہی کی بارگاہ میں اس کی صفتِ کریمی و رحیمی خود شفیع بنکر کھڑی ہوگی، اسی لیے ارشاد ہوا:۔

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ	اور اس قرآن کے ذریعہ (اے پیغمبر) ان لوگوں
اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ	کو ہشیار کردے جو اس سے ڈرتے ہیں کہ وہ اپنے
دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ	رب کے پاس جمع کیے جائیں گے، ان کے لیے اس رب کے سوا
يَتَّقُوْنَ (انعام-۵)	کوئی حامی اور شفیع نہیں، شاید وہ بچتے رہیں
مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا	خدا کے سوا تمہارا کوئی حامی اور شفیع نہیں
شَفِيْعٍ، اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ (سجدہ-۱)	پھر کیا تم سوچتے نہیں،

خدا کی اس صفتِ کریمی و رحیمی کے مظہر اس دنیا میں بھی وہی ہوں گے جو اس دنیا میں اسکے مظہر بنکر آئے تھے، اور وہ انبیائے کرام ہیں کہ خدا کے رحم و کرم ہی کے سبب سے جو اس کو اس دنیا اور دنیا والوں کے ساتھ ہے، ان انبیاء کی بعثت ہوئی، اور وہ انبی اپنی اپنی امت پر شاہد قرار پائے، اسی طرح خدا کی اجازت کے بعد اس دنیا میں بھی وہی خدا کے اس رحم و کرم اور فضلِ عمیم کے مظہر قرار پائیں گے، نیز رحمت کے فرشتے اور امت کے نیکوکار اور صالح افراد بھی جن کو رحمتِ الٰہی نے چنا ہو، اس مذہب پر ممتاز ہوسکیں گے، خصوصاً وہ سراپا رحمت نبی جو اس دنیا میں رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ، اور خدا کی صفت رحیمی کا مظہر بنکر آیا۔

احرام کے سماوی کی قدرت کا اظہار

۱۲- بظاہر دنیا میں بہت سی باتیں آفتاب ماہتاب کی گردش اور ان کے سبب سے اختلاف موسم کے اثرات سے ہوتی ہیں، اس لیے ستارہ پرست قوموں میں یہ اعتقاد پیدا ہوا ہو گیا تھا کہ دنیا جو کچھ ہوتا ہے وہ ستاروں کی گردش کے اثر سے ہوتا ہے، یہی اعتقاد عرب کے مشرکوں میں بھی پھیلا تھا، وہ سورج اور چاند کو سجدے کرتے تھے، اسلام نے ان کو اس شرک سے روکا اور کہا

لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ (حٰمٓ سجدہ) سورج اور چاند کو سجدے نہ کیا کرو

اسی طرح وہ زمانہ کو دنیا کے کاروبار میں حقیقی موثر جانتے تھے اور یہ کہتے تھے،

وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ (جاثیہ ۳) ہم کو تو زمانہ مارتا ہے

اسی کا اثر ہے کہ ہماری شاعری کی زبان میں فلک کج رفتار" اور "دہر ناہنجار" کی شکایت اب تک چلی جاتی ہے عرب کے مشرکین بھی اسی طرح بولا کرتے تھے، انکو جب کوئی خلاف توقع تکلیف پہنچتی تھی تو زمانہ کی شکایت کیا کرتے تھے، اور اس کو برا کہتے تھے[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا، اور فرمایا کہ زمانہ کو گالی نہ دیا کرو کہ زمانہ خود خدا ہے[2] اور فرمایا کہ خدا ارشاد فرماتا ہے کہ "آدم کا بیٹا مجھے تکلیف پہنچاتا ہے، وہ زمانہ کو برا کہتا ہے، زمانہ میں ہوں، میرے ہاتھ میں تمام کام ہیں میں شب و روز کا انقلاب کرتا ہوں[3] یعنی زمانہ کو جن تکلیفوں اور مصیبتوں کا خالق سمجھکر لوگ برا کہتے ہیں حقیقت میں ان کا پیدا کرنے والا خدا ہی ہے، اس لیے یہ گالی حقیقت میں خدا کو دیجاتی ہے:

اسی خیال کا یہ بھی اثر تھا کہ اہل عرب بارش کو نچھتر کی طرف منسوب کیا کرتے تھے اور کہا کرتے

---

[1] فتح الباری شرح بخاری جلد ۸ صفحہ ۱۴۴ و کتاب الاسماء والصفات بیہقی صفحہ ۱۱۵- الہ آباد [2] صحیح مسلم الفاظ الاب [3] صحیح بخاری تفسیر سورہ جاثیہ و کتاب الرد علی الجہمیہ جلد ۲ صفحہ ۱۱۱۶-

تھے کہ فلان نچھتر کے سبب سے ہم پر پانی برسایا گیا، حدیبہ کے موقع پر اتفاق سے رات کو بارش ہوئی، صبح کو نماز کے بعد آپ صحابہ کی طرف مخاطب ہوے اور فرمایا جانتے ہو تمھارے رب نے کیا کہا؟ صحابہ نے عرض کی کہ خدا اور اس کا رسول زیادہ جانتا ہے، ارشاد ہوا، اس نے فرمایا، آج صبح کو میرے بندوں میں سے کچھ مومن ہو کر اٹھے، اور کچھ کافر ہو کر، جنھوں نے یہ کہا کہ خدا کے فضل و رحمت سے ہم پر پانی برسا وہ تو خدا پر ایمان لانے والے اور ستارہ کے انکار کرنے والے ہیں، اور جنھوں نے یہ کہا کہ فلان نچھتر سے پانی ہم پر برسا تو وہ خدا کے انکار کرنے والے اور ستارہ پر ایمان لانے والے ہیں"[1]

سورج گرہن اور چاند گرہن کو بھی لوگ عظیم الشان واقعات اور انقلابات کی علامت سمجھتے تھے، کم و بیش دنیا کی تمام قوموں میں وہ آسمانی دیوتاؤں کے غیظ و غضب کے مظہر یقین کیے جاتے تھے، ۹ھ میں اتفاق سے ایک دن سورج میں گرہن لگا، اور اسی دن آپ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم نے وفات پائی صحابہ نے خیال کیا کہ یہ سورج میں گرہن لگنے کا سبب حضرت ابراہیم کی موت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ سنا تو تمام مسلمانوں کو مسجد میں جمع ہونے کا حکم دیا، اور ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا، جس میں اس خیال کی تردید کی، فرمایا کسوف و خسوف (گرہن) کو کسی کے جینے مرنے سے کوئی تعلق نہیں، یہ بھی خدا کے نشانوں میں سے ایک نشان ہے"[2]

غیر خدا کی قسم کھانا

۱۳- شرک کی ایک نہایت ہی باریک صورت یہ تھی کہ لوگ غیر خدا کی قسمیں کھاتے تھے، قسم کھانے کے معنی حقیقت میں شہادت کے ہیں، جس کی قسم کھائی جاتی ہے، اسکو دراصل واقعہ پر گواہ بنایا جاتا ہے، عربوں میں بت پرستی کے رواج کے باعث تبوں اور دیوتاؤں کی قسمیں کھائی

[1] صحیح بخاری باب الاستسقاء و باب الذکر بعد الصلوٰۃ و صحیح مسلم کتاب الایمان [2] صحیح بخاری صلوٰۃ الکسوف

جاتی تھیں، جو صریح کفر تھا، قریش اپنے دیوتا لات اور عزیٰ کی قسمیں کھایا کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا[1] لیکن رواج اور عادت کے باعث مسلمان ہونے کے بعد بھی بے اختیار اُن کی زبان سے اُن کی قسمیں نکل جاتی تھیں، آپ نے فرمایا کہ جس شخص کی زبان سے لات اور عزیٰ کی قسم نکل جائے تو وہ فوراً لا الٰہ الا اللہ کہہ لے[2] یہ گویا اس کفر کے کلمہ سے توبہ ہے، قریش میں باپ کی قسم کھانے کا بھی رواج تھا، اس سے بھی آپ نے منع فرمایا، ایک دفعہ حضرت عمرؓ کو آپ نے باپ کی قسم کھاتے سنا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو اس سے منع کیا ہے کہ اپنے باپ کی قسم کھایا کرو، جسکو قسم کھانی ہو وہ یا تو خدا کی قسم کھائے اور یا چپ رہے"، حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کے ارشاد کا یہ اثر ہوا کہ اس وقت سے آج تک میں نے نہ تو اپنی بات میں اور نہ کسی اور کی بات دہرانے میں کبھی باپ کی قسم کھائی[3]، ماں کی قسم بھی لوگ کھایا کرتے تھے، اس سے بھی آپؐ نے منع فرمایا، اسی طرح کعبہ کی بھی قسم لوگ کھایا کرتے تھے، اس پر ایک یہودی نے آکر مسلمانوں کو طعنہ دیا کہ تم بھی شرک کرتے ہو، کعبہ کی قسم کھاتے ہو، آپ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ کعبہ نہیں بلکہ کعبہ والے (خدا) کی قسم کھایا کرو[4]، ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کسی کو کعبہ کی قسم کھاتے سنا تو اس کو منع کیا اور کہا کہ غیر خدا کی قسم نہ کھائی جائے، میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے، کہ جس نے غیر خدا کی قسم کھائی اس نے کفر کیا، یا شرک کیا[5]، دوسری روایت میں ہے کہ ہر وہ قسم جو غیر خدا کی کھائی جائے شرک ہے[6]۔

---

[1] سنن نسائی کتاب الایمان والنذور [2] یہ تمام واقعات صحیح بخاری، صحیح مسلم، نسائی کتاب الایمان میں مذکور ہیں نسائی کتاب الایمان والنذور [3] جامع ترمذی ابواب النذور والایمان، و مستدرک حاکم ص ۴ ج ۱، کتاب الایمان [4] مستدرک بحوالہ مذکورہ،

خدا کی مشیت میں کوئی رکیب نہیں،

۱۴۔ اکثر نیک لوگوں کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کی مشیئت عین خدا کی مشیئت ہے، اس میں نہ صرف بدعقیدہ لوگ بلکہ اہل توحید بھی غلطی سے مبتلا ہو جاتے ہیں، آنحضرت صلعم نے انسانوں کو اس دقیق غلطی سے بھی آگاہ کیا، اور بتایا کہ دنیا میں مشیت صرف خدا کی ہے اسی کی خواہش کے مطابق دنیا چل رہی ہے، تمام مشیتیں اور خواہشیں اسی کی مشیئت اور خواہش کے ماتحت ہیں اسکے ساتھ کسی مخلوق کی مشیئت، عالم کے کاروبار میں شریک نہیں لیکن لوگوں نے خدا کی مشیئت کیساتھ اور دن کی مشیت کو بھی شریک کر لیا تھا توحید کامل کے معلم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خیال کی سختی سے تردید کی، اور قرآن مجید نے جا بجا اس حقیقت کو واضح کیا کہ مشیئت الٰہی کے علاوہ کوئی اور حقیقی مشیئت نہیں، تمام دیگر مشیتیں اس کی تابع اور ماتحت ہیں عقیدہ کی یہ غلطی اس قدر عام تھی کہ جو لوگ عقیدہ نہیں رکھتے تھے وہ بھی سلاطین، حکام اور بزرگوں کیساتھ گفتگو میں یہ کہنا حسن ادب سمجھتے تھے کہ جو کچھ اور جو حضور چاہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرز کلام سے منع فرمایا، یہانتک کہ خدا کی مشیت کے ساتھ برابری کی خود اپنی مشیت کے ذکر سے بھی صحابہ کو روکا اس قسم کا طرز کلام لوگوں کی زبان پر چڑھ گیا تھا، اس میں یہ تصحیح فرمائی کہ خدا اور غیر کی مشیت کے درمیان عطف کا واؤ (اور) نہ لایا جائے کہ اس سے برابری کا شائبہ نکلے بلکہ ثم کا لفظ بولا جائے تاکہ معلوم ہو کہ خدا کی مشیت کے بعد اوروں کی مشیت کا درجہ ہے:

نسائی میں ہے کہ ایک یہودی نے خدمت نبوی میں آکر مسلمانوں سے کہا کہ تم لوگ شرک کرتے ہو کہتے ہو کہ جو خدا چاہے اور جو محمد چاہیں آپنے صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا یوں کہو کہ "وہ ایک ہی جو چاہے، پھر جو آپ چاہیں"[1] یہی واقعہ ابن ماجہ میں اس طرح ہے کہ ایک صحابی نے

[1] نسائی کتاب الایمان والنذر

خواب میں دیکھا تھا کہ ایک یہودی یا عیسائی اُن سے کہہ رہا ہے کہ تم مسلمان بڑے اچھے لوگ ہوتے اگر شرک نہ کیا کرتے، تم کہا کرتے ہو کہ خدا جو چاہے اور محمد جو چاہیں، ان صحابی نے خدمتِ اقدس میں آکر اپنا یہ خواب بیان کیا، آپ نے فرمایا میں اس فقرہ کی برائی جانتا تھا، یوں کہو کہ جو خدا چاہے پھر جو محمد چاہیں[1]، ابوداؤد میں یہی تعلیم اس واقعہ کی تقریب کے بغیر اس طرح مذکور ہے کہ آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ یہ نہ کہا کرو کہ جو خدا چاہے اور جو فلان چاہے، بلکہ یوں کہو کہ جو خدا چاہے پھر جو فلان چاہے، لیکن امام بخاری نے ادب المفرد میں اور بیہقی نے کتاب الاسماء میں جو روایت کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کے ساتھ کسی اور کی مشیت کا نام بھی نہ لینا چاہیئے، ایک شخص نے خدمتِ والا میں حاضر ہو کر سلسلۂ کلام میں کہا کہ جو خدا چاہے اور جو آپ چاہیں، ارشاد ہوا کہ تم نے خدا کا ہمسر اور مقابل ٹھہرایا، جو خدا تنہا چاہے، مَا شَاءَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ[2]۔

اس سلسلہ میں یہاں تک اہتمام پیشِ نظر تھا کہ اس سے بھی منع فرمایا کہ خدا اور رسول کی طرف ایک ضمیر پھیر کر ایک فعل لایا جائے، تاکہ یہ سمجھا جائے کہ خدا اور رسول کا درجہ برابر برابر ہے، ایک دفعہ آپ کے سامنے کسی شخص نے خطبہ کے اثنا میں یہ فقرہ کہا جس نے خدا اور رسول کی اطاعت کی اس نے ہدایت پائی، اور جس نے ان دونوں کی نافرمانی کی" یہاں تک اس نے کہا تھا کہ آپ نے اسکو روک دیا، اور فرمایا اُٹھ جا تُو بُرا خطیب ہے، آپ نے ناراضگی کا اظہار اس لیے فرمایا کہ اُن دونوں کو ساتھ کہنے سے سامعین پر یہ اثر ہوتا ہے کہ خدا کی اور رسول کی نافرمانی کا حکم برابر ہے

---

[1] ابن ماجہ کتاب النذور [2] ابوداؤد کتاب الادب باب لا تقولوا خبثت نفسی [3] ادب المفرد امام بخاری صفحہ ۵۴ مصر و کتاب الاسماء والصفات امام بیہقی صفحہ ۸ مطبوعہ الہ آباد۔

اور اس میں شرک کا شائبہ ہے، اس لیے خطیب کو یوں کہنا چاہیے تھا کہ اور جو خدا کی اور رسول کی نافرمانی کریگا وہ۔۔ جیسا کہ قرآنِ پاک میں بار بار آیا ہے، اور ماثور خطبوں میں بھی منقول ہے،

۱۵۔ جن باتوں میں شرک کا ذرا بھی شائبہ پایا جاتا تھا، اُن سے بالکل منع کر دیا، لوگ اولاد کا نام آفتاب، ماہتاب وغیرہ کی عبدیت کیساتھ رکھتے تھے، مثلاً عبد الشمس، عبد مناف، ان ناموں سے سخت منع فرمایا، ارشاد ہوا کہ بہترین نام عبد اللہ اور عبد الرحمٰن ہیں[1]، اہل عجم اپنے سلاطین کو شاہنشاہ یعنی تمام بادشاہوں کا بادشاہ کہتے تھے، چونکہ اس میں شرک کا احتمال تھا، آنحضرتؐ نے فرمایا کہ یہ نام خدا کو سب سے زیادہ ناپسند ہے[2]، دوسری روایت میں ہے کہ آپنے فرمایا اس شخص پر اللہ کا بیحد غضب ہوا جس نے اپنے کو شہنشاہ کہا، خدا کے سوا کوئی بادشاہ نہیں، (حاکم فی المستدرک ص ۶۲۷ ج ۴)

غلاموں کو لوگ عبد یعنی بندہ کہتے تھے، حالانکہ انسان خدا کا بندہ ہے آدمیوں کا نہیں، اسی طرح غلام اپنے مالک کو رب کہتے تھے، حالانکہ رب خدا ہے، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قطعاً منع فرمایا کہ کوئی شخص غلامون کو عبد یعنی بندہ نہ کہنے پائے، بلکہ یون کہے کہ میرا بچہ، یا بچی، اور اسی طرح غلام اور باندیان اپنے آقا کو رب نہ کہیں، مالک کہین کہ تم سب غلام ہو، اور رب اللہ ہے[3]، ہانی رضؓ ایک صحابی تھے، جن کی کنیت ابو الحکم تھی، وہ جب خدمت اقدس میں اپنی قوم کیساتھ آئے تو آپنے فرمایا کہ حکم خدا ہے اور خدا ہی حکم دینے والا ہے، تمکو لوگ ابو الحکم کیون کہتے ہیں؟ عرض کی کہ میرے قبیلہ میں جب کوئی نزاع ہوتی ہے تو لوگ مجھکو حکم یعنی ثالث بناتے ہیں، اور میں جو فیصلہ کرتا ہون اس کو سب تسلیم کر لیتے ہیں، آپنے فرمایا تمھارے بچون کے کیا نام ہیں؟

بابت شرک کی لعنت

---

[1] ابو داؤد کتاب الادب باب تغییر الاسماء [2] ابو داؤد کتاب الادب [3] ابو داؤد کتاب الادب باب الکریم وحفظ المنطق

بولے شریح، مسلم، عبداللہ، آپ نے پوچھا سب میں بڑا کون ہے، عوض کی شریح، فرمایا تو تمہاری کنیت ابو شریح ہے[1]

اکثر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی بُرا کام کرتے ہیں تو شیطان پر لعنت بھیجتے ہیں گویا اس نے برائی کرائی، ایک دفعہ ایک صاحب آنحضرتؐ کیساتھ گھوڑے پر سوار تھے، گھوڑے نے ٹھوکر کھائی، انھوں نے کہا شیطان کا ناس ہو، آپ نے فرمایا یوں نہ کہو، ورنہ شیطان غرور سے پھول جائیگا اور کہے گا، میری قوت سے یہ ہوا، خدا کا نام لو، تو شیطان ذبحر مکھی کے برابر ہو جائے گا[2]

تصویر بنانے سے سخت منع کیا، اس کی یہی وجہ تھی کہ اوّل اوّل لوگ کسی بزرگ اور مقتدا کی تصویر گھر میں رکھتے تھے تو محبت یا یادگار کے طور پر رکھتے تھے لیکن رفتہ رفتہ ان ہی تصویروں کی پرستش ہونے لگی تھی، چنانچہ ہندوؤں اور رومن کیتھلک عیسائیوں میں اسی طرح تصویر پرستی اور اس سے بڑھکر بت پرستی کا رواج ہوا، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سرے سے تصویر کھینچنے سے منع فرمایا،

تصویر یا مجسمہ یادگار سے روکنا

۱۶۔ شرک کا بڑا ذریعہ قبر پرستی اور یادگار پرستی ہے، قبروں اور یادگاروں کو لوگ عبادت گاہ بنا لیتے ہیں، سالانہ مجمع کرتے ہیں، دور دور سے سفر کرکے آتے ہیں، قبروں پر مسجدیں بناتے ہیں منتیں مانتے ہیں، نذریں چڑھاتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام افعال سے منع کیا، وفات سے پانچ دن پہلے فرمایا کہ تم سے پہلے لوگ، قبروں کو مسجد بنا لیتے تھے، دیکھو میں تم کو منع کرتا ہوں کہ قبروں کو مسجد نہ بنانا، عین وفات کے وقت چہرہ سے چادر الٹ دی اور فرمایا کہ خدا یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے، ان لوگوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو مسجد بنا لیا،

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب تغییر الاسم القبیح [2] ابوداؤد کتاب الادب باب لا یقول خبثت نفسی [3] صحیح مسلم کتاب المساجد

ریا اور عدم اخلاص بھی معنوی شرک ہے،

۱۷۔ یہ توحید کے متعلق وہ اصلاحات تھیں جن کا تعلق زیادہ تر اعمال اور روزمرہ کی بول چال سے تھا، لیکن حقیقی اصلاح جس سے توحید کی تکمیل ہوتی ہے، وہ قلب و روح کی توحید ہے۔ انسان کے تمام کاموں کا کوئی نہ کوئی نفسیاتی محرک ہوتا ہے کوئی طلب شہرت کے لیے کام کرتا ہے، کوئی دنیاوی معاوضہ کے لیے کرتا ہے۔ کوئی نمائش اور دکھاوے کے لیے کرتا ہے، کوئی غیر کی محبت یا عداوت میں کرتا ہے، ان تمام کاموں کا محرک درحقیقت غیر خدا ہے، جس نے خدا کی جگہ لے لی ہے، اسی لیے قرآن مجید نے کہا۔

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ	تم نے اسکو دیکھا جس نے اپنا خدا خود اپنی
(فرقان ۔۴)	نفسانی خواہش کو بنا لیا ہے،

اسی لیے بڑا بت وہی ہے جس کو انسان نے خود اپنے دل کے تہخانے میں چھپا رکھا ہے، اس بت کو توڑنا توحید کی اصل تکمیل ہے، آپنے بتایا کہ انسان کے تمام کاموں کا دارومدار خود اُس کے دل کے عمل پر ہے، انما الاعمال بالنیات، اس لیے ایک مسلمان کے ہر قسم کے کاموں کا اصلی محرک صرف خدا کا حکم، خدا کا خوف، خدا کی اطاعت، خدا کی خوشنودی، خدا کی محبت، غرض صرف خدا ہونا چاہیئے، جس درجہ تک ایک مومن کی اس قلبی کیفیت میں ترقی ہوگی، اسکے ایمان و توحید کی تکمیل بھی پایۂ کمال کو پہنچتی جائیگی، اسی بنا پر وحی محمدی نے ہر جگہ اور ہر موقع پر انسان کو اسکے عمل کی غرض و غایت مرضاۃ اللہ اللہ کی خوشنودی، مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ اخلاص اور وجہ رب العلمین خدا کو قرار دینے کی تعلیم دی ہے، اس بنا پر انسان جو کام خدا کے علاوہ کسی اور غرض و نیت سے کرے تو درحقیقت اُس کام کیلئے اس نے ایک موقت خدا الگ بنا

وہ گو اس وقت لفظی اور قانونی شرک کا مجرم نہیں لیکن معنوی نفسی شرک کے ارتکاب کا یقیناً مجرم ہے،
آپنے فرمایا جس نے خدا کے لیے دیا، اور خدا ہی کے لیے روکیا، خدا کے لیے چاہا، اور خدا ہی کے لیے
عداوت کی، اور خدا ہی کیلئے بیاہ کیا، اس نے اپنے ایمان کو کامل کر لیا،[1]
متعدد صحابیوں[2] سے روایت ہے کہ آپنے فرمایا کہ ریا چھپا ہوا شرک ہے، حضرت ابو سعید
خدریؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چھپا ہوا شرک یہ ہے کہ انسان کوئی کام
دوسرے کی موجودگی کے سبب سے کرے،[3] حضرت شداد بن اوس روایت کرتے ہیں کہ آپنے فرمایا
جس نے دکھاوے کی نماز پڑھی اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کا روزہ رکھا، اس نے شرک
کیا، جس نے دکھاوے کی خیرات کی اس نے شرک کیا،[4] یہی صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ صحابہ کے
مجمع میں آپ فرما رہے تھے کہ مجھے اپنی امت کے لوگوں پر سب سے زیادہ جس کا خوف ہے وہ شرک کا ہے،
ہاں میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ چاند یا سورج کو سجدہ کرینگے یا بتوں کو پوجینگے بلکہ یہ ہے کہ وہ غیر خدا
کیلئے عمل نہ کرنے لگیں اور چھپی نفسانی خواہش میں نہ مبتلا ہوں حضرت محمود بن لبید انصاری آپکا
قول نقل کرتے ہیں کہ آپنے صحابہ سے فرمایا کہ مجھکو سب سے زیادہ جسکا تمیر خوف ہے وہ شرک اصغر ہے، صحابہؓ نے

---

[1] مستدرک حاکم ترمذی آخر کتاب الرقاق ترمذی کے دو نسخوں میں اس حدیث کے متعلق دو تنقیدیں درج ہیں ایک میں منکر لکھا ہے
اور دوسرے میں جن اسکے ایک راوی اجلح کی نسبت لوگوں نے کلام کیا ہے مگر حدیث کا نفس مضمون تمام اسلامی روایات اور احکام
کے عین مطابق ہے [2] حضرت ابو سعید خدریؓ، معاذ بن جبل، ابو ہریرہ، شداد بن اوس، محمود بن لبید، ابو سعید بن ابی فضالہ
ان صحابیوں کی روایتیں ابن حنبل، ابن ماجہ مستدرک وغیرہ میں ہیں [3] مستدرک حاکم کتاب الرقاق ص ۲۹۰ ج ۴
(صحیح) [4] بحوالہ سابق مستدرک ابن حنبل مسند شداد بن اوس ص ۱۲۲ ج ۴ [5] سنن ابن ماجہ باب الریا، وسامعہ

عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شرک اصغر کیا ہی، فرمایا ریا، قیامت کے دن جب لوگون کو اپنے اپنے عمل کا بدلہ مل رہا ہوگا، خدا ریاکار لوگون سے کہیگا کہ تمھارے لیے ہمارے یہان کچھ نہیں تم انہی کے پاس جاؤ جنکے دکھانے کو دنیا میں یہ کام کیا کرتے تھے،[1] حضرت ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ ایک موقع پر ہم لوگ دجال کے متعلق آپس میں باتین کر رہے تھے کہ اسی اثنا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا کہ دجال سے بڑھکر جو خوفناک چیز میرے نزدیک ہے کیا میں تم کو اس سے آگاہ نہ کردوں، ہم سب نے عرض کی ہان یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فرمایا وہ شرک خفی ہی یعنی یہ کہ مثلاً کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہے، تو وہ نماز کو محض اسلیے درست کرکے پڑھے کہ کوئی دوسرا شخص اسکو دیکھ رہا ہی،[2] ابو سعید بن ابی فضالہ انصاری بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت مین جب خدا اگلون اور پچھلون کو یکجا کریگا تو ایک منادی آکر پکاریگا کہ جس نے اپنے کسی عمل میں خدا کیساتھ کسی غیر کو بھی شریک بنالیا ہو تو وہ اپنا ثواب اسی غیر سے لینگے کہ خدا سب سے بے نیاز ہی۔ ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ آپ نے ارشاد کیا کہ خدا فرماتا ہی کہ میں تمام شریکون میں سب سے زیادہ شرکت سے بے نیاز ہون، تو جس نے اپنے کسی کام میں میرے ساتھ کسی اور کو شریک کیا تو میں اس سے الگ ہون، اور وہ اسی کا ہی جس کو اس نے میرا شریک بنایا،[3]

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ صحابہ اپنے ہر عمل مین اس شرکِ خفی سے ڈرتے تھے، شداد بن اوس کہتے ہیں کہ ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ حیات مین ریا کو شرکِ اصغر گنا کرتے تھے،[4] ایک دفعہ حضرت

---

[1] ابن حنبل مسند محمود بن لبید انصاری ص ۴۲۸ ج ۵ و ابو داؤد و مسند ابن حنبل [2] سنن ابن ماجہ باب الریاء والسمعہ [3] سنن ابن ماجہ باب الریاء، و ترمذی، و مسند ابن حنبل [4] ابن ماجہ باب الریاء [5] مستدرک حاکم کتاب الرقاق ج ۴ صفحہ ۳۲۹۔ (صحیح)

عمر فاروقؓ جارہے تھے، دیکھا کہ حضرت معاذ بن جبلؓ صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس بیٹھے رو رہے ہیں، حضرت عمرؓ نے رونے کا سبب دریافت کیا تو انھوں نے قبر مبارک کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ اس قبر میں مدفون ہستی نے کہا تھا کہ ریا کا ادنیٰ شائبہ بھی شرک ہے[1] اسی طرح ایک دفعہ عبادہ تابعی نے دیکھا کہ حضرت شدادؓ بن اوس صحابی اپنی جانماز پر بیٹھے زار و قطار رو رہے ہیں رونے کا سبب دریافت کیا، تو انھوں نے بیان کیا کہ ایک دن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ اقدس پر غم و ملال کے آثار دیکھے، عرض کیا میرے ماں باپ حضورؐ پر فدا ہوں، اس حزن و ملال کا سبب کیا ہے ارشاد ہوا کہ میں اپنے بعد بھی امت پر ایک چیز سے ڈرتا ہوں، عرض کی یا رسول اللہ وہ کیا ہے؟ فرمایا شرک اور چھپی نفسانی خواہش، میں نے دوبارہ گذارش کی یا رسول اللہ! کیا آپ کی امت آپ کے بعد شرک میں مبتلا ہوگی؟ فرمایا اے شداد! میری امت یقیناً سورج یا چاند یا بت اور پتھر کی پرستش نہیں کرے گی لیکن وہ اپنے عمل کی نمائش اور ریا کرے گی، عرض کی یا رسول اللہ! کیا ریا شرک ہے؟ فرمایا ہاں۔

ان واقعات اور تعلیمات کو پڑھ کر ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح ہر پہلو سے شرک کی تردید اور توحید کی تکمیل فرمائی ہے، وہی عرب جو پہلے خدا کے سوا ہر چیز کی پرستش کرتے تھے، انھوں نے آپ کی تعلیم کے اثر سے خدا پرستی اور توحید کی انتہائی معراج حاصل کرلی

---

[1] مستدرک حاکم کتاب الرقاق جلد ۴ صفحہ ۳۲۰ [2] مسند کے حوالہ مذکور، حاکم نے اس حدیث کو صحیح الاسناد لکھا ہے، مگر ذہبی نے تصریح کی ہے کہ "اس کا ایک راوی عبدالواحد بن زید متروک ہے" تاہم چونکہ حدیث کا نفس مضمون مسند ابن حنبل (جلد ۴ صفحہ ۱۲۴) اور سنن ابن ماجہ (باب الریا) میں ایسے سلسلوں سے مذکور ہے جن میں یہ عبدالواحد نہیں پڑتا، اس لیے ہم نے اس حدیث کو بیان کیا ہے

توحید

اور

اس کے ایجابی اصول و ارکان

یہ توحید کے سلبی اجزا تھے یعنی توحید کے مخالف عقائد و خیالات کی نفی اور تردید لیکن نبوتِ محمدی کا کارنامہ اس سے اہم اور بالاتر ہے، اور وہ توحید کی اصل بنیاد کی استواری اس کے اصول کی تعیین، امور ایمان کی تفصیل اور اس کے اجزاء کی تکمیل ہے، عرب میں شرک و بت پرستی بھی تھی، اور کہیں کہیں آسمانی مذاہب کی محرف صورتیں بھی موجود تھیں مگر ایک صحیح مذہب کا تخیل ان کے سامنے مطلق نہ تھا، اس بنا پر عقائد اور ایمان کی کوئی صحیح اور مرتب صورت بھی ان کے ذہن میں نہیں ہو سکتی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے تمام پچھلے مزخرفات اور اوہام کو جن کو دین کا درجہ دیدیا گیا تھا، یکقلم محو کر دیا، بت پرستی، جن پرستی، فرشتہ پرستی، ستارہ پرستی، فطرت پرستی، انسان پرستی، غرض شرک کی تمام صورتیں قطعاً مٹا دیں، اور ان کی جگہ مرتب، متیقن، سنجیدہ حقائق اور سچائیوں سے معمور چند عقائد کی تعلیم دی، جو انسان کے تمام اعمال، اور اخلاق کا بنیادی پتھر ہیں،

اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلیل اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز خدا کی ہستی کا یقین، اور پھر اسکی توحید پر ایمان ہے،

دنیا میں جتنے پیغمبر آئے اُن میں سے ہر ایک نے اس قادر مطلق کی طرف لوگوں کو دعوت دی، مگر یہ دعوت ان کے ایک مسلّم دعویٰ کی حیثیت سے تھی، انھوں نے اس دعویٰ کو دلائل کا محتاج نہ سمجھا اور حقیقت میں جن نامحدود زمانوں میں قوموں کے لیے اُن کی بعثت ہوئی، ان میں دلیل اور برہان کی ضرورت بھی نہ تھی، کیونکہ ان زمانوں میں بت پرستی، ستارہ پرستی اور فطرت پرستی کا رواج تھا، الحاد کا وجود نہ تھا، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عمومی تھی، جو آخری زمانہ تک کیلئے اور تمام قوموں کے لیے تھی، اور علم الٰہی میں یہ تھا کہ بعثت محمدیؐ کے بعد عقلِ انسانی تحقیق و تلاش کے آخری مراحل طے کرنا چاہے گی، اور قدرت کے سربمہر خزانے وقفِ عام ہوں گے، اور عقلیت کا دور دورہ ہوگا، اور ہر شے دلیل و ثبوت کی محتاج قرار پائے گی، اس لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دلائل و براہین، ثبوت اور شواہد کی بھی تلقین کی گئی،

ایک اور سبب یہ ہے کہ انبیاے سابقین صرف اپنی قوموں کی دعوت پر مامور ہوئے تھے، جنمیں مشرکین کا وجود تھا، ملحدین کا نہ تھا، لیکن خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تمام قوموں اور طبقوں کے لیے ہوئی، اس لیے آپؐ کی دعوت میں یہ صاف نظر آتا ہے کہ آپ انسانی عقل کی ہر صنف کو مخاطب کر رہے ہیں، اور اس کے معیار اور سطح کے مطابق اُس قادر مطلق کی ہستی اور وجود پر دلیلیں بھی پیش کر رہے ہیں، اس لیے آپ نے دوسرے پیغمبروں کی طرح صرف مشرکوں کو مخاطب نہیں فرمایا، بلکہ مشرکوں، کافروں، ملحدوں، مشککوں، دہریوں، ہر ایک کو مخاطب فرمایا اور اُن میں سے ہر ایک کی تسکین و تشفی کا سامان بہم پہنچایا،

ایک قادر مطلق خالق عالم اور صانع کائنات کی ہستی کے ثبوت اور انکار پر جب سے فلسفہ

کا وجود ہے، ہمیشہ بحثین پیدا ہوتیں، اور دلیلین پیش کیجاتی رہی ہیں، مصر، یونان، ہندوستان، اسلامی ممالک اور آج یورپ میں بھی اس مسلہ پر عقلائے زمانہ نے اپنی جودتِ ذہن، نکتہ رسی اور دقیقہ فہمی کا بہترین ثبوت پیش کیا ہے، مگر غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ دلائل کی زبان اور طرز تعبیر میں گو تبدیلی ہوتی رہی ہے، مگر اصل مغز سخن صرف ایک ہے، اس بنا پر وحیِ محمدیؐ نے اللہ تعالیٰ کی ہستی اور وجود پر جو دلیل قائم کی اس میں اسی مغز کو لے لیا ہے، اور نہایت موثر طرز ادا میں اسکو بار بار دہرایا اور انسانون کو متنبہ کیا ہے،

وحیِ محمدی کا سب سے پہلا دعویٰ یہ ہے کہ اس ایک قادر مطلق، خالقِ عالم اور صانعِ کائنات ہستی کا اعتراف انسان کی فطرت میں داخل ہے، متمدن سے متمدن اور وحشی سے وحشی قوم میں بھی اس اعتراف کا سراغ ملتا ہے، آثار قدیمہ کی تحقیقات نے سینکڑون مردہ اور گمنام قومون کی تاریخ کا سراغ لگایا جسمیں سامانِ تمدن، اعلیٰ خیالات اور علوم کی لاکھ کمی محسوس ہوتی ہو مگر مذہبی عقیدت اور کسی خدا کے اعتراف کی کمی بالکل نظر نہیں آتی، انکی عمارتون کے منہدم کھنڈرون میں جو چیز سب سے پہلے ملتی ہے، وہ کسی معبد کی چہار دیواری ہوتی ہے آج بھی دنیا کے مختلف گوشون میں جو بالکل وحشی قومیں ملتی ہیں، وہ بھی کسی نہ کسی شکل میں عالم کے خالق اور کائنات کے صانع کے تخیل سے بہرہ ور ہیں، غرض جماعتِ انسانی کا کوئی حصہ زمین کا کوئی گوشہ زمانہ کا کوئی عہد اس تخیل سے خالی نہیں ملتا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اعتراف بھی انسان کے فطری تصورات اور وجدانی جذبات میں داخل ہے، اسی لیے وحیِ محمدیؐ نے اس کو فطرت سے تعبیر کیا ہے،

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّهِ — اپنا منہ سب طرف سے پھیر کر، دین کی طرف کر،

الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ	خدا کی وہ فطرت ہے جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا
اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ	خدا کی خلقت میں تبدیلی نہیں، یہی سیدھا اور
النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (روم-۴)	ٹھیک دین ہے لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

كُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَةِ[1]	ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے،

اسی لیے خدا کا اعتراف روزِ ازل کا وہ عہد و پیمان ہے جو خالق و مخلوق کے درمیان ہوا تھا اور یہ اسی عہد و پیمان کا احساس ہے جو انسان کی رگ رگ میں سرایت کیے ہوئے ہے کہ ہزار انکار کے بعد بھی کسی نہ کسی رنگ میں وہ اعتراف نمایاں ہو جاتا ہے، قرآن پاک نے اس واقعہ کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے،

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیْ اٰدَمَ مِنْ	اور جب تیرے خدا نے بنی آدم کی پیٹھ سے ان کی
ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ	نسل کو لیا، اور جو ان کو ان ہی پر گواہ
عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا	کیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں انھوں نے
بَلٰی شَهِدْنَا (اعراف-۲۲)	کہا، ہاں، ہم گواہ ہیں،

انسان کا یہ جذبہ فطرت کبھی کبھی خارجی اثرات سے دب جاتا ہے، وحیِ محمدی نے بارہا انسان کے اسی دبے ہوئے جذبہ کو ابھارا ہے، اور اسی نے یہ خاکستر آگ کو ہوا دی ہے، اور انسان کو اس کا بھولا ہوا وعدہ یاد دلایا ہے، وہ انسانوں سے پوچھتی ہے،

---

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان،

اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ	کیا آسمان وزمین کے پیدا کرنے والے خدا
الْاَرْضِ (ابراھیم-۲)	میں شک ہے؟

ایک اور مقام پر اس نے کہا،

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ اَمْ ھُمُ الْخَالِقُوْنَ	کیا وہ آپ ہی آپ بن گئے، یا وہی اپنے آپ خالق
اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَلْ	ہیں یا ان ہی نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے
لَّا یُوْقِنُوْنَ (طور-۲)	(یہ کوئی بات نہیں) بلکہ انکو یقین نہیں ہے،

دنیا اور کائنات جس میں انسان بھی شامل ہے اور جو اپنی عقل اور فہم کی بنا پر سب سے بالاتر ہے، بہر حال موجود ہے، اور اس کے اس وجود میں کوئی شک بھی نہیں ہے، اب سوال یہ ہے کہ کسی کے بن بنائے وہ آپ سے آپ بن گئی ہے، یا خود اس نے اپنے آپ کو بنا لیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں باطل ہیں، نہ آپ سے آپ کوئی چیز بن سکتی، اور نہ کوئی مفعول اپنا فاعل آپ ہو سکتا ہے، اگر کوئی بیوقوف یہ کہے کہ نر و مادہ مل کر اپنا بچہ پیدا کرتے ہیں تو اس سے پوچھا جائیگا کہ سلسلہ توالد و تناسل کا آغاز کیونکر ہوا، اور اولین نر و مادہ کا اور مادہ تخلیق و روح کا خالق کون ہے،

یہ گوناگون عالم یہ رنگا رنگ کائنات، یہ تاروں بھرا آسمان، یہ بوقلموں زمین یہ سورج یہ چاند، یہ درخت، یہ سبزہ، یہ پہاڑ، یہ لاکھوں جاندار اور بے جان اشیاء، یہ علل و اسباب کا تسلسل یہ تغیر و انقلاب کا نظام، یہ کائنات کا نظم، اور اس کے ذرہ ذرہ کا قاعدہ و قانون انسان کے اندرونی قویٰ اور ان کی باہمی ترتیب، موت و حیات کے اسرار، خواص و قویٰ کے دفینے انسان کی خیالی بلند پروازی، اور عملی عجز و درماندگی، یہ تمام باتیں ایک خالق و صانع کے اعتراف پر مجبور کرتی ہیں

یہ نیلگوں آسمان کی چھت یہ زمین کا سبزہ زار فرش اور ایک ہی حرکت سے شب و روز کا
انقلاب ایک خالق کل کا پتہ دیتا ہے،

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ	آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور رات
وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيٰتٍ	اور دن کے بدلنے میں عقلمندوں کے
لِأُولِي الْأَلْبَابِ (آل عمران ۲)	لیے نشانیاں ہیں،

یہ شب و روز کا نور و ظلمت، یہ سورج اور یہ چاند کی روشنی، انکی مقررہ رفتار اور باقاعدہ
طلوع و غروب اسکی دلیل ہے کہ اس ابلقِ ایام پر کوئی سوار ہے، جس کے ہاتھ میں اُس کا سیاہ و سپید ہے،

وَمِنْ آيٰتِهِ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ	اور اس کی نشانیوں میں سے رات دن اور
وَالْقَمَرُ (فصلت ۵)	سورج اور چاند ہیں،

آسمان اور زمین کی پیدائش دن اور رات کا الٹ پھیر تو ہے، دیکھو کہ خطرناک سمندروں
میں کس طرح لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک کو تجارت کا سامان لیکر دوڑتے پھرتے ہیں،
اگر پانی میں مٹی کا اور لوہے کا ذرہ بھی ڈالو تو فوراً ڈوب جائیگا، مگر یہ لاکھوں من کے لدے ہوئے
جہاز کیسے پھول کی طرح پانی پہ تیر رہے ہیں، جس طرح فطری قاعدہ کے بموجب یہ عمل ظہور میں
آرہا ہے وہ جس کے حکم سے بنا ہے اس کا کتنا بڑا احسان ہے، پھر ان سمندروں سے بخارات
اٹھتے ہیں، وہ اوپر جاکر بادل بنتے ہیں اور وہ وہیں پہنچکر برستے ہیں جہاں پیداوار اور زمین کی
نشوونما کی حاجت ہے، اور پھر وہ بادل ہواؤں کے تخت پر بیٹھکر کبھی ادھر اور ادھر فرودست کے مطابق اڑتے پھرتے ہیں،

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ	بے شبہ آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش

وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ
الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ
وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ
مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا
وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ
الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ
وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ
(بقرہ ۷-۲۰)

اور دن رات کے الٹ پھیر میں اور ان جہازوں
میں جو انسانوں کے لیے فائدہ رسان سامان
لیکر سمندر میں چلتے ہیں اور آسمان سے اللہ کے پانی
برسانے میں اور پھر اس پانی کے ذریعہ مرے
پیچھے زمین کو زندگی بخشنے میں اور زمین میں
ہر طرح کے چلنے والوں کے پھیلانے میں اور ہواؤں کے
کبھی ادھر اور کبھی ادھر چلنے میں اور آسمان و
زمین کے بیچ میں جو بادل کام میں لگے ہیں ان

آسمان اور زمین کی عجیب و غریب خلقت کیساتھ خود انسان کی اپنی پیدائش کی حکایت کتنی عجیب ہے،

إِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ
لِّلْمُؤْمِنِينَ ۝ وَفِي خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ
مِنْ دَابَّةٍ آيَاتٌ لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ۝
(جاثیہ)

بیشک آسمانوں میں اور زمین میں ایمان والوں کے لیے
نشانیاں ہیں اور خود تمہاری پیدائش میں اور جو
چلنے والے پھیلائے ہیں یقین کرنیوالوں کے لیے دلیلیں ہیں۔

سورہ انعام میں نباتات اور ان کی نیرنگیوں کو اپنی ہستی کی دلیل میں پیش کیا یہ کتنے تعجب کی بات ہے کہ ایک ہی زمین ہے جس میں سے وہ اگتے ہیں، ایک ہی پانی ہے جس سے وہ سینچے جاتے ہیں، ایک ہی ہوا ہے جس میں وہ سانس لیتے ہیں، مگر کتنے رنگ برنگ کے پھل پھول، میوے اور درخت لگتے ہیں جن میں سے ہر ایک کا رنگ، ہر ایک کا مزہ، ہر ایک کی بو، ہر ایک کا

قد و قامت، ہر ایک کے خواص اور فائدے، دوسرے سے بالکل الگ ہوتے ہیں،

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ	اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اُتارا، پھر
مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ	ہم نے اس سے اگنے والی ہر چیز نکالی، پھر اس سے
فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ	سبز خوشے نکالے جن سے ہم جڑے ہوئے دانے
حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ	نکالتے ہیں اور کھجور کے گابھے میں سے لٹکتے گچھے
طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ	اور انگور کے باغ اور زیتون اور انار ہمشکل
اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ	اور جدی جدی شکل کے جب وہ پھلیں تو ان کے
مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ اُنْظُرُوْٓا	پھل اور پکنے کو دیکھو بے شک ان میں
اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ	ایمان والے لوگوں کے لیے دلیلیں ہیں
ذَالِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (انعام ۱۲)	

سورۂ روم میں پہلے مٹی سے انسان کی پیدائش کو پھر اس میں عورت مرد کے جوڑے ہونے کو اور ان کے درمیان مہر و محبت کے جذبات کے ظہور کی اپنی ہستی کی دلیل بتایا ہے پھر اپنی قدرت کے دوسرے عجائبات کو جو آسمان سے زمین تک پھیلے ہیں، ایک ایک کر کے پیش کیا ہے، اوّل تو خود انسانوں کی پیدائش پھر ان میں عورت مرد ہونا، اور ان کے درمیان جذبات کی لہر، پھر مختلف قوموں کی بولیوں، شکلوں اور رنگوں کو دیکھو کہ ایک ایک سے الگ ہے، پھر انسانوں کے اندر کے اعمال کو دیکھو، ایک نیند ہی کی حقیقت پر غور کرو یہی تمھاری آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے،

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ

اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ۝ وَمِنْ

اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ

اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ

مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ

خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ

اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ

بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاۗؤُكُمْ

مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ

يَّسْمَعُوْنَ ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ

خَوْفًا وَّطَمَعًا .....

وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَيُحْيٖ بِهِ

الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ

اَنْ تَقُوْمَ السَّمَاۗءُ وَالْاَرْضُ

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اُس نے

تم کو مٹی سے بنایا، پھر تم آدمی بنکر چلتے پھرتے ہو،

اور اسکی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے

تمہاری جنس سے تمہارے جوڑے بنائے

کہ تم ان سے سکون حاصل کرو، اور تم سب کے

درمیان پیار اور درد رکھا، اور اس میں ان

لوگوں کیلئے جو سوچتے ہیں، دلیلیں ہیں،

اور اسکی نشانیوں میں سے آسمانوں کی

اور زمین کی بناوٹ اور تمہاری بولیوں اور

رنگوں کی بوقلمونی ہے، اسمیں جاننے والوں

کیلئے یقیناً دلیلیں ہیں اور اسکی عجیب قدرتوں

میں سے تمہارا رات اور دن میں سونا، اور تمہارا

اسکی مہربانیوں کو تلاش کرنا ہے، اسمیں ان

کیلئے جو سنتے ہیں دلیلیں ہیں، اور اُس کے

عجائب قدرت میں یہ ہے کہ تمہیں وہ بجلی کی

چمک دکھاتا ہے جس سے تم ڈرتے ہو اور کبھی

رحمت کی بارش کی امید بندھتے ہو، اور وہ

بِاَمْرِہٖ

آسمان سے پانی برساتا ہے، پھر اس سے زمین کو اسکے
مرے پیچھے زندہ کرتا ہی اسمین انکے لیے جو سمجھ
رکھتے ہیں دلیلیں ہیں اور اسکی دلیلوں میں تو
یہ ہے کہ آسمان اور زمین اسکے حکم سے قائم ہیں (دوم-۳)

اس اخیر آیت میں آسمان و زمین کے اس کے حکم سے قائم رہنے کا ذکر ہے، تم کہتے ہو کہ یہ باہمی جذب و کشش سے قائم ہیں، لیکن خود یہ جذب و کشش کس کی کشش کا نتیجہ ہے؟ یہ خود حیرت انگیز ہے، سورہ لقمان میں آسمانوں کے بلا کسی نظر نہ آنے والے سہارے کے کھڑے ہونے اور زمین کے اپنی جگہ پر ٹھہرے ہونے کا ذکر ہے، یہ نظر نہ آنے والا سہارا قوت کشش ہی سہی لیکن وہ بھی تو اسی کے اسرار میں سے ہی، اسکے بعد ایک جامد اور بے حیات مردہ زمین کے اندر سے پانی برسنے کیساتھ انواع و اقسام کی زندگی کے نمونوں کا ابھر آنا کتنا حیرت انگیز ہے، یہ بھی اسی کا کرشمہ ہے،

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا
وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ
بِكُمْ وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَاَنْزَلْنَا
مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ
زَوْجٍ كَرِیْمٍ (لقمان-۱)

اس نے آسمانوں کی چھت کو کسی ایسے ستون
کے بغیر کھڑا کیا ہی جو تمکو نظر آتے ہوں اور زمین
میں ایسے کھونٹے ڈالدیئے کہ وہ تمکو لیکر ہل جائے
اور اس نے اس زمین پر ہر قسم کے چلنے پھرنے
والے پھیلائے اور آسمان سے پانی برسایا، پھر ہم

سورہ سجدہ میں انسان کی پیدائش کا مٹی سے آغاز، پھر قطرہ آب (نطفہ) سے ذریعہ توالد و تناسل، پھر اس کے سڈول جسم کا بنجانا، پھر اس مٹی کے مردہ قالب میں دفعۃً کہیں سے زندگی

آجانا، اور اس میں روح پھک جانا، اور اس میں علم و حواس کے حیرت انگیز آلات کا پیدا ہوجانا
ان سب کو اپنی صفت میں پیش کیا ہے،

اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَہٗ وَبَدَاَ	وہ جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی، اور انسان
خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ثُمَّ جَعَلَ	کی پیدائش مٹی سے شروع کی پھر اسکی نسل
نَسْلَہٗ مِنْ سُلٰلَۃٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّہِیْنٍ	ذلیل سے نچڑے پانی سے بنائی پھر اسکو سڈول
ثُمَّ سَوّٰىہُ وَنَفَخَ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِہٖ	کیا، اور اس میں اپنی جان سے کچھ پھونک دیا
وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ	اور تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل
وَالْاَفْـِٕدَۃَ قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ	بنادیئے، تم ان احسانوں کا بہت کم
(سجدہ ۷-۱)	شکر ادا کرتے ہو،

مردہ زمین کے اندر کیا کیا قوتیں ودیعت ہیں، اور خود انسانوں کے جسم و جان میں عجائبات کا کتنا خزانہ رکھا ہے لیکن کوئی صاحب نظر ادھر نہیں دیکھتا، انسان کی زندگی، اسکے اندرونی جذبات و حواس، ذہنی قویٰ اور دماغی حرکات، ان میں سے ہر شے معمّا ہے،

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ وَفِیْٓ	اور زمین میں یقین کرنیوالوں کیلیے نشانیاں
اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ،	ہیں اور خود تمہاری جانوں کے اندر کیا تم
(ذاریات-۱)	نظر نہیں کرتے

جانوروں کے جسموں کے اندر جو عجیب و غریب نظام ہے، وہ بھی غور کے قابل ہے، ایک ہی گھاس پھوس کی نہ اُن کے پیٹ میں جاتی ہے، پھر اسی کا کچھ حصہ لید اور گوبر، کچھ

خون اور نہ کچھ دودھ بنجاتا ہے، اور اسی لید اور گوبر کے باہر آنے کے راستوں، اور سرخ خون کی رگوں کے درمیان سے خالص سپید شیریں دودھ کی دھاروں کا نکلنا کتنا عجیب ہے؟،

وَاِنَّ لَكُمْ فِى الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ج	اور تمہارے لیے جانوروں میں عبرت ہے،
نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِىْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ	ہم تمہیں ان کے پیٹوں کے اندر سے لید اور
فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا	خون کے بیچ سے خالص اور پینے والوں
لِّلشّٰرِبِيْنَ (نحل۔۹)	کے لیے خوشگوار دودھ پلاتے ہیں،

ایک ہی قسم کے پھل ہیں، اگر ان کو ایک طرح سے کھاؤ تو تمہاری عقل اور قوت کو بڑھاتے ہیں، اور دوسری طرح کھاؤ تو اسکو ضائع کر دیتے ہیں،

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ	اور کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں کو دیکھو
مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ۭ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ	کہ ان میں سے تم نشہ اور اچھی روزی بھی
لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (نحل۔۹)	حاصل کرتے ہو، اسمیں سمجھ والوں کے لیے دلیل ہے

زمین اور زمین پر کی مخلوقات کو چھوڑ کر اوپر آسمان کی طرف نظر اٹھاؤ، سورج کا روشن چراغ اور چاند کی خوشنما قندیل کتنی عجیب ہے پھر سورج کو دیکھو کہ سال کے بارہ مہینوں میں آسمان کے بارہ برج طے کر کے کس طرح زمین میں مختلف موسموں اور زمانوں کو نمایاں کرتا ہے،

تَبٰرَكَ الَّذِىْ جَعَلَ فِى السَّمَآءِ بُرُوْجًا	بابرکت وہ ہستی جس نے آسمانوں میں برج بنائے
وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا (فرقان)	اور اُن میں ایک چراغ اور چمکانے والا چاند بنایا

ان ہی چند چیزوں تک اسکی قدرت کے عجائبات محدود نہیں، بلکہ ہر شے اپنی مخلوقیت، اپنی محکم روش اور اپنے قانونِ فطرت سے اس کی گواہی دیتی ہے،

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ (نمل ۔۸۸) — اس اللہ کی صنعت ہے جس نے ہر شے کو مضبوط (نظام پر) بنایا،

اسکی صنعت ہر قسم کے عیب سے پاک ہے، اسمیں مستحکم نظم و نسق کی بندش نظر آتی ہے،

مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ — تجھے رحمٰن کی بنا میں کوئی بے برابری نظر
فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ — آتی ہے؟ پھر نگاہ کر، کیا کوئی شگاف تجھے دکھائی پڑتا ہے؟
ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ — پھر دہرا کر دو بار نظر کر، تیری نگاہ ذلیل ہو کر تھک
الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ (ملک ۔۱) — کر تجھ تک پلٹ آئیگی (مگر کوئی نقص نہ پا سکے گی)

اس قسم کی اور سیکڑوں آیتیں ہیں جن کا استقصا بھی مشکل ہے، ان آیتوں میں تین قسم کے دلائل

۱۔ قدرت کے عجائبات اور نیرنگیاں، اور پھر اُن کا ایک قانون کے ماتحت ہونا،

۲۔ عالم کا نظم و نسق اور اس کا مرتب سلسلہ،

۳۔ کائنات اور سلسلۂ عالم کی ہر کڑی میں بے انتہا مصلحتوں، حکمتوں اور فائدوں کا ہونا،

ان مقدمات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کے یہ عجائبات اور اس کے یہ منظم علل و اسباب، خود بخود بخت و اتفاق سے نہیں بن گئے، بلکہ کسی حکیم و دانا اور قادرِ مطلق صانع نے اپنی قدرت اور ارادہ سے ان کو بنایا ہے،

اہل فلسفہ اور متکلمین عالم کے وجود پر عموماً یہ دلیل پیش کیا کرتے ہیں کہ ہم بداہتہً دیکھتے ہیں کہ

عالم میں ہر چیز کے لیے علل و اسباب کا سلسلہ ہی، یہ سلسلہ یا تو کہیں جا کر ختم ہو گا یا یوں ہی مسلسل چلا جائیگا، اگر یہ یونہی مسلسل چلا جائیگا تو لازم آتا ہے کہ ہر چیز کے پیدا ہونے پر غیر متناہی علل گذر جائیں اور غیر متناہی علل کا خاتمہ نہیں ہو سکتا، اور نہ کہیں ان کا آغاز ہو سکتا ہی، اسلئے کوئی چیز پیدا بھی نہیں ہو سکتی، تسلسل عقلاً بھی محال ہی، بلکہ انسان اسکے تخیل سے بھی عاجز ہے، اس بنا پر لامحالہ سلسلۂ علل کا کہیں خاتمہ ہونا ضروری ہے جس علتِ کل پر تمام علتیں ختم ہو جاتی ہیں وہی خلق و پیدائش اور وجود کون کی اصلی علت العلل ہے،

یہ دلیل گو بہت کچھ پیچیدہ اصطلاحات سے لبریز اور بہت سے محذوف مقدمات پر مبنی ہے، تاہم وہ انسانی عقل میں آئی ہے، اور بہتوں کے لئے تسلین کا باعث ہے، قرآن پاک کی ایک دو آیتوں میں بھی اس دلیل کا ماخذ مذکور ہے، سورہ ہود نے آخر میں ہے،

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	"اور خدا ہی کے پاس ہے آسمانوں اور زمین کی
وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ، فَاعْبُدْهُ	چھپی بات اور اسی کی طرف پھریں سب باتیں تو اسی
وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ (هود-۱۰)	کی بندگی کر اور اس پر بھروسہ کر،
وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى، (نجم-۱)	اور یہ کہ تیرے رب کی طرف ہے سب کی انتہا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انسانی کمزوریوں سے واقف تھے چند صحابیوں نے آکر عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی ہمارے دلوں میں ایسے خیالات اور وسوسے آتے ہیں جنکو ہم زبان سے ادا نہیں کر سکتے، فرمایا، کیا تم کو یہ کیفیت حاصل ہو گئی، گذارش کی ہاں یا رسول اللہ فرمایا یہ تو خالص ایمان ہی، مقصود یہ ہے دل میں وسوسوں کا آنا اور پھر ان وسوسوں کو اتنا

بدتر جاننا لہ ان کا زبان پر لانا بھی وہ گناہ سمجھے، یہ کیفیتِ ایمانی کے بغیر ممکن نہیں، اسی طرح آپ نے فرمایا لوگ علم و دانش کا سوال کرتے ہیں کہتے ہیں کہ خیر اسکو تو خدا نے پیدا کیا، اور پھر اس خدا کو کس نے پیدا کیا، آسمان کو خدا نے بنایا، زمین کو خدا نے بنایا، یہاں تک کہ ٹھنے ٹھنے پھر پوچھتے ہیں، اچھا تو پھر خدا کو کس نے پیدا کیا، فرمایا یہ شیطانی وسوسہ ہے، جب یہ حالت کسی کو پیش آئے تو کہدے اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ میں اللہ پر ایمان لایا[1]

یہ تعلیم درحقیقت اسی مسئلہ کی ہے کہ خدا پر تمام علتوں کی انتہا ہے، اور اسکے بعد کوئی علت نہیں، اس لیے یہ وسوسہ لائق جواب نہیں یہ جہالت اور نادانی کا سوال ہے،

توحید پر عقلی دلیلیں اگر کوئی عالم کا خالق و صانع ہے تو وہ یقیناً ایک ہے، دو نہیں، تاہم دنیا میں ایسے عقلمند بھی ہیں، جو دو تین بلکہ متعدد خداؤں کے قائل ہیں، اور عالم کی ایک مملکت کو سینکڑوں حصوں میں تقسیم کرکے ان کو مختلف خداؤں کی حکومتیں قرار دیتے ہیں: وحیِ محمدی نے اس شرک کے ابطال پر سب سے زیادہ جس دلیل کو پیش کیا ہے، وہ نظامِ عالم کی یکسانی اور وحدت اور کائنات کے علل و اسباب کا باہم توافق، تعاون، اشتراک اور اتحاد ہے، دنیا میں ایک ذرہ بھی اسوقت تک پیدا ہو نہیں سکتا جب تک آسمان سے لیکر زمین تک کی تمام کارکن قوتیں اور اسباب ایک دوسرے کے موافق و مناسب نہ ہوں، اور باہم ان میں اشتراکِ عمل نہ ہو، ایک دانہ زمین سے اس وقت تک اگ نہیں سکتا جب تک دانہ اگنے کے لائق نہ ہو، زمین میں اگانے کی صلاحیت نہ ہو، موسم اسکے مناسب نہ ہو، بارش موافق نہ ہو، آفتاب اسکو گرمی اور روشنی اس کے مزاج کے مطابق

---

[1] یہ دونوں حدیثیں صحیح مسلم کتاب الایمان میں متعدد روایتوں سے مذکور ہیں،

بہم نہ پہنچے، پھر اس کے اُگنے کے موانع اور عوائق ایک ایک کرکے دفع نہ ہوں، ان سب مراحل کے بعد وہ دانہ اُگے گا، اور پھل لائے گا، قرآن پاک نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا	اگر زمین و آسمان میں اس ایک خدا کے برحق
فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا	سوا چند اور خدا بھی ہوتے تو زمین و آسمان بیا
يَصِفُونَ (انبیاء-۲)	ہو جاتے تو پاک ہے عرش والا خدا ان باتوں سے

آسمان و زمین کا یہ تمام کاروبار، یہ تمام قوانینِ قدرت، اگر ایک کے بجائے دو طاقتوں کے ہاتھوں میں ہوتے تو یہ باہمی تصادم میں ایک لمحہ کے لیے بھی قائم نہ رہتے، فلسفیانہ اصطلاحات میں اس مطلب کو ادا کرو، تو یوں ہوگا کہ عالم کائنات معلول ہے، اسکی کوئی علتِ تامہ ہوگی، یہ ظاہر ہے ایک معلول کی دو علتِ تامہ نہیں ہو سکتیں کیونکہ علتِ تامہ اسکو کہتے ہیں جس کے وجود کے بعد معلول کے وجود میں کسی اور چیز کا انتظار نہ ہو، اب عالم کی علتِ تامہ اگر ایک نہ ہو، بلکہ دو ہوں تو سوال یہ ہے کہ ایک علتِ تامہ کے وجود کے بعد، عالم کے وجود میں دوسری علتِ تامہ کا انتظام رہیگا یا نہیں، اگر رہے گا تو پہلی شے علتِ تامہ نہیں رہے گی، اور اگر انتظار نہ رہے گا تو دوسری شے علتِ تامہ نہ ہوگی، اس سے یہ ثابت ہوا کہ عالم کی علتِ تامہ ایک ہی ہو سکتی ہے،

توحید کے ثبوت اور شرک کے ابطال کی دوسری دلیل نظامِ عالم کی وحدت ہے، سورج چاند اور تاروں سے لیکر انسان حیوان، ہوا پانی، درخت گھاس پات تک کو دیکھو تو معلوم ہوگا، کہ یہ سب ایک مقررہ نظام اور بندھے اصول کے ماتحت ہیں، جنمیں کبھی سرمو فرق نہیں ہوتا ہر شے ایک اصول کی پابند اور ایک عادتِ جاریہ کے مطابق چل رہی ہے، گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان

سب میں یکسانی اور مساوات کی ایک خاص وحدت قائم ہے اور وہ سب کسی ایک ہستی کے اشارے پر چل رہے ہیں،

وَمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (مومنون: ۹۱)

اور نہ اس خدائے برحق کیساتھ کوئی اور خدا ہے اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو الگ لیجاتا اور ایک دوسرے پر چڑھ جاتا،

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَاِنْ مِّنْ شَىْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (بنی اسرائیل)

کہہ اگر خدائے برحق کیساتھ کچھ اور خدا ہوتے جیسا کہ یہ مشرکین کہتے ہیں تو ایسی حالت میں وہ تخت والے (حکمران خدا) سے حکومت چھیننے کا راستہ ڈھونڈھتے، پاک اور بلند ہے، وہ خدا اس بات سے جس کو یہ (مشرک) کہتے ہیں۔ اس (خدائے برحق) کی پاکی ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ انکے اندر ہے، بیان کرتے ہیں اور کوئی چیز

اسی وحدتِ نظام کے استدلال کو ایک اور آیت میں خدا نے بیان فرمایا ہے،

مَا تَرٰى فِىْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ (ملک)

تو خدا کے بنائے میں کوئی فرق نہیں دیکھیگا پھر نگاہ کر کیا کوئی شگاف تجھ کو دکھائی دیتا ہے؟ پھر بار بار نظر دوڑا، تیری نظر ذلیل ہو کر تھک کر واپس جائیگی،

اس واقعاتی استدلال سے بڑھ کر جو بالکل نظم فطرت پر مبنی ہو کوئی دوسری صحیح دلیل نہیں

ہوسکتی، اسی لیے قرآنِ پاک نے اس کو اختیار کیا ہے، یہ دنیا وحدتِ نظام ہی کے ماتحت چل رہی ہے، ورنہ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی چل نہ سکے، اسی سے اس دنیا کے حاکم و فرمانروائے مطلق کی وحدت بخوبی ثابت ہے،

توحید کی تکمیل توحید خواہ کسی قدر مخرف، شرک آمیز اور ناقص شکل میں ہو دنیا کے تمام مذاہب و ادیان کی مشترک اور اولین تعلیم ہے، لیکن ان مذاہب میں وہ کسی خاص اصل پر مبنی نہ تھی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس عمارت کو چند خاص اصول کے بنیادی پتھروں پر قائم کیا، یہ پتھر کیا ہیں؟ خدا کی حقیقی عظمت کی شناخت اور اس عالمِ کائنات میں انسان کی اصلی حیثیت اور مرتبہ کی تعیین۔

خدا کی حقیقی عظمت اہلِ عرب ایک حقیقی قوت کے نام سے واقف تھے، اور اسکو خالق بھی مانتے تھے مگر قدرت کے کارخانہ کا اسکو تنہا مالک نہیں سمجھتے تھے، یہودیوں کا خدا، ایک خاندانی خدا تھا، جس نے ساری دنیا صرف بنی اسرائیل کیلئے پیدا کی تھی، اور اس کو بنا کر ساتوین دن وہ تھک کر بیٹھ گیا تھا، وہ انسانوں سے کشتی لڑتا تھا، اسکی اولادیں تھیں، عیسائیوں کا خدا سب کچھ مسیح بن مریم کو دیکر خود معطل ہوگیا تھا، ایرانیوں کے خدا کی خدائی نیکی و بدی کی دو مملکتوں میں بٹی ہوئی تھی، ہندوؤں کا خدا، تاروں کا بھیس بدل کر لاکھوں خدا بن گیا تھا، اور برہما، بشن، مہیش تینوں نے مل کر خدائی کے کاروبار باہم تقسیم کر لیے تھے، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خدا کا جلوہ نمایاں کیا جو آسمان کے اوپر سے لیکر زمین کے نیچے تک کا تنہا مالک ہے، اس کے کاروبار میں کوئی دوسرا شریک نہیں، اسکی شاہنشاہی میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں، اس کے کارخانہ قدرت میں کوئی دوسرا سا بھی نہیں، کائنات کا کوئی ذرہ اس کے حکم سے باہر نہیں،

منسوب کیجا سکتی ہیں، کن کن باتوں سے وہ پاک ہی، اُس کا تعلق اپنے بندوں کیساتھ کیسا ہے؟ ہمکو اس کے آگے کیسے جھکنا چاہئے؟ اس سے کیا مانگنا چاہئے؟ اور کیونکر مانگنا چاہئے؟ اس کے حضور میں دعا کیونکر کرنی چاہئے؟ ہم اس سے کیوں ڈریں اور کیونکر ڈریں؟ اور اس سے ڈرنے کی کیا حقیقت ہی، اس سے محبت بھی کیجا سکتی ہی یا نہیں؟ اگر کیجا سکتی ہے تو کیونکر؟ اور اس سے محبت کی حقیقت کیا ہے؟ اسکی قدرت کہانتک ہی، اسکے علم کی کیا حیثیت ہی؟ کیا وہ ہم سے دور ہے، یا بالکل قریب؟ اسکے تقدس، بڑائی اور عظمت کی کوئی حد ہے؟ اس پر ہم توکل اور بھروسہ کیونکر کریں؟ کیا وہ انسانوں کی کسی صنف سے کلام بھی کرتا ہے؟ کیا اس کے کچھ احکام بھی ہیں؟ اور وہ احکام واجب الاطاعۃ بھی ہیں؟ وہ کن باتوں سے خوش اور کن سے ناخوش ہوتا ہے؟ کیا وہ ہمارے دلوں کے چھپے ہوئے رازوں سے بھی آگاہ ہے؟ کیا اسکی اجازت کے بغیر زمین کا ایک ذرہ بھی اپنی جگہ سے حرکت کرسکتا ہی؟ اسکی مشیت اور اس کا ارادہ کیونکر آسمان سے زمین تک ہر چیز کو محیط ہی؟ کیا اسکے بنائے ہوئے قاعدے اور قانون بھی ہیں؟ کیا وہ انسانوں کی تعلیم اور اصلاح کیلئے پیغمبروں کو بھی مبعوث کرتا ہی، کیا ہم اس کی بارگاہ میں اپنے اعمال کے جوابدہ بھی ہیں، ہم سے وہ کیوں اور کیونکر ہمارے اعمال کا مواخذہ کریگا؟ یہ وہ باتیں ہیں جن سے عرب جاہلیت کا دل و دماغ بالکل عاری اور خالی تھا، اور ان چیزوں کے متعلق ان کے ذہن میں کوئی تخیل نہ تھا، عرب جاہلیت کا ایک ایک ذرہ پڑھ جاؤ ان کے مذاہب و اعتقادات کا ایک ایک حرف تلاش کرلو، اس سے زیادہ کچھ نہ پاؤگے کہ اللہ ایک طاقتور اعلیٰ ہستی ہے، جس نے سب کو پیدا کیا ہے، اور مصیبتوں اور بلاؤں میں اسکو پکارنا چاہئے،

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ربانی تعلیمات سے ان کو اللہ تعالیٰ کی حقیقی عظمت سے

هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (مومن ۔ ۷)	وہی زندہ ہے اسکے سوا کوئی خدا نہیں
وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا	غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں اسکے سوا انکو کوئی نہیں
هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا	جانتا خشکی اور تری میں جو کچھ ہے اسکو جانتا ہے
تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا	درخت کا کوئی پتہ نہیں گرتا اور نہ زمین کی
حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ (انعام ۔ ۷)	تاریکیوں میں کوئی دانہ ہے لیکن وہ اسکے علم میں ہے
اَللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ	اے اللہ اے بادشاہی کے مالک تو جس کو چاہے
مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ	سلطنت دے اور جس سے چاہے چھین لے اور
وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ	جسکو چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت
بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ	نصیب کرے تیرے ہاتھ میں بھلائی ہے
قَدِيْرٌ (آل عمران ۔ ۳)	بیشک تو ہر بات پر قادر ہے،
وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ	اور اگر اللہ تجھے مصیبت پہنچائے تو اسکے سوا اسکو
لَهٗٓ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا	اسکا دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تیرے ساتھ
رَآدَّ لِفَضْلِهٖ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ	بھلائی کرے تو اسکے فضل و کرم کا کوئی روکنے والا نہیں
مِنْ عِبَادِهٖ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ	اپنے بندوں میں سے جسکو چاہے اپنے فضل سے نوازے
(یونس ۔ ۱۱)	کرے اور وہی گناہوں کو معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہے
اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ	اللہ اسکے سوا کسی اور کی بندگی نہیں ہوسکتی
لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ لَهٗ	جیتا ہے اور سب کے سہارے جیتے ہیں

مَالَهٗ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مَنْ

ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ

یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ

وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا

شَآءَ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ

وَالْاَرْضَ وَلَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا

وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ،

(بقرہ ۷-۳۴)

یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ

مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا

یَعْرُجُ فِیْهَا وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ لَهٗ

مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَی

اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (حدید ۱-۵)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (فاتحہ ۱)

وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ

وَالْاَرْضِ طَوْعًا (آل عمران - ۱۰)

اسکو اونگھی نہ نیند آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے

اسی کا ہے کون ایسا ہے جو اسکے سامنے اسکی اجازت

کے بغیر سفارش کر سکے جو لوگوں کے روبرو ہے اور

جو انکے پیچھے ہے سب کو جانتا ہے اور وہ اسکے علم

کے حصہ کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جتنا وہ چاہے اسکا

تخت آسمانوں کو اور زمین کو سمائے ہوئے ہے اور ان

آسمانوں کی اور زمین کی نگہبانی اسکو تھکاتی

نہیں اور وہی عالیشان اور بڑا ہے،

جو زمین میں گھستا ہے اور جو اس سے نکلتا ہے

جو آسمان سے اترتا ہے اور اس میں چڑھتا ہے،

وہ سب کو جانتا ہے اور تم جہاں بھی ہو وہ

تمہارے ساتھ ہے اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اسکو

دیکھتا ہے اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہی

اسی کی ہے اور تمام کاموں کا مرجع وہی ہے

سب تعریف اللہ کیلئے ہے جو تمام عالم کا پالنے والا ہے،

اور آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے سب

اُس کے زیر فرمان ہے،

وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ذُو الْعَرْشِ	وہی گناہوں کا بخشنے والا ہے اور بندوں سے
الْمَجِيْدُ، فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ،	محبت کرنے والا ہے، تخت کا مالک ہے بڑی
(البروج-۱)	شان والا ہے، جو چاہتا ہے کر دیتا ہے،
يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا	آسمانوں میں اور زمین میں جو ہے سب اللہ
فِي الْأَرْضِ (جمعہ-۱)	کی پاکی بیان کرتے ہیں
وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (بنی اسرائیل)	اور کوئی چیز نہیں جو اس کی حمد کی تسبیح نہ پڑھتی ہو

ان مضمون کی ہزاروں آیتیں قرآنِ پاک میں ہیں، ان تعلیمات نے خدا کی عظمت و جلالت اور کبریائی کا وہ جلوہ پیش کیا جس کے سامنے معبودانِ باطل کی عزت خاک میں مل گئی، بتوں کی بڑائی کا طلسم ٹوٹ گیا، سورج چاند، تاروں کی خدائی کا چراغ ہمیشہ کیلئے بجھ گیا، جن و انس، شجر و حجر، بحر و بر سب اسکے جلال و ہیبت کے سامنے سجود نظر آئے، پھر اس کے سوا کون تھا، جو بزرگ و جود کے ساز سے (انما اللہ لا الٰہ الا ھو) میں ہوں خدا جس کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں کی صدا بلند کر سکتا

انسان کا مرتبہ توحیدِ محمدی کا دوسرا بنیادی اصول اس عالمِ خلق میں انسان کی حیثیت اور مرتبہ ہے جو لوگ بتوں کو سجدہ کرتے ہیں، پتھروں کو پوجتے ہیں، درختوں کے آگے جھکتے ہیں، جانوروں کو دیوتا مانتے ہیں، جمادات اور ارواحِ خبیثہ کے نام کی دہائی پکارتے ہیں، آسمانی مخلوقات کو ارباب جانتے ہیں، انسانوں کو خدا سمجھتے ہیں، وہ حقیقت میں انسان کے درجہ اور مرتبہ سے ناواقف ہیں، وہ دراصل اس طرح انسان کو پتھروں سے درختوں سے، جانوروں سے، دریاؤں سے پہاڑوں سے اور چاند تاروں سے کمتر جانتے ہیں، انھوں نے درحقیقت انسان کے اصلی رتبہ اور حیثیت کو نہیں پہچانا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وحی کی زبان سے جاہل عربوں کو یہ نکتہ سوجھایا کہ انسان اس عالم خلق میں تمام مخلوقات سے اشرف ہے، اور وہ اس دنیا میں خدا کی نیابت کا فرض انجام دینے آیا ہے، قرآن کے ابتدائی سورہ میں آدمؑ کی خلافت کا قصہ محض داستان نہیں، بلکہ انسان کی اصلی حیثیت کو عیاں اور نمایاں کرنے والی تعلیم کا آئین دیباچہ ہے، اسکو فرشتوں کا مسجود بنانا گویا تمام کائنات کا مسجود بنانا تھا، اسکو تمام اسماء کا علم عطا کرنا گویا تمام اشیا کو اسکے تصرف میں دینا تھا، وہ انی جاعل فی الارض خلیفۃ کے فرمان کے رو سے اس عالم میں خدا کا نائب ہے، اور اسکا سر الٰہی کے تاج سے ممتاز ہے، کروڑوں مخلوقاتِ الٰہی میں خدا کی امانت کا حامل وہی منتخب ہوا، یہ منصب اعلیٰ نہ فرشتوں کو ملا، نہ آسمان کو عطا ہوا، نہ زمین کے حصہ میں آیا، نہ پہاڑ اس کے مستحق قرار پائے صرف انسان ہی کا سینہ تھا جو اس امانت کا خزینہ دار ہوا اور اسی کی گردن تھی جو اس بوجھ کے قابل نظر آئی فرمایا

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَھَا وَاَشْفَقْنَ مِنْھَا وَحَمَلَھَا الْاِنْسَانُ، (احزاب۔ ۹)	ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی، تو سب نے اس بار امانت کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اسکو اٹھا لیا،

وحیِ محمدی نے انسان کا رتبہ یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے اسکو بزرگیوں سے سرفراز فرمایا، عالم مخلوقات میں برتر بنایا، اور انعام و اکرام سے معزز کیا ہے،

وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰھُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰھُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ	ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے خشکی اور تری میں انکو سواری دی، اور ستھری

وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (بنی اسرائیل ۷) — چیزوں کی اُن کو روزی بخشی اور اپنی بہت سی پیدا کی ہوئی چیزوں پر انکو فضیلت عطا کی

انسان ہی وہ مخلوق ہے جو سب سے معتدل قوی اور بہترین اندازہ کیساتھ دنیا میں پیدا ہوئی

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (تین ۱) البتہ ہم نے انسان کو بہتر اندازہ پر پیدا کیا

یہاں تک کہ انسان خدائی صورت کا عکس قرار پایا، متعدد حدیثوں میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "خدا نے آدم کو اپنی صورت[1] پر پیدا کیا، اسی بنا پر آپ نے تعلیم دی کہ "غلام کو سزا دو تو اس کے چہرہ پر نہ مارو کہ وہ صورت الٰہی کا عکس ہے، عین میدانِ جنگ میں اگر تلواریں برس رہی ہوں تو حریف کے چہرہ پر وار نہ کرنا چاہئے[2]، کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر بنایا ہے[3]، غصہ میں یہ بھی نہ کہنا چاہئے کہ خدا تیرے چہرہ کو اور تیرے جیسے چہرہ کو بگاڑ دے کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر خلق کیا[4]، ان حدیثوں کا مطلب یہ نہیں کہ انسان کی طرح خدا کی کوئی جسمانی شکل ہے، اور آدم کی شکل اسکی نقل ہے، لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ بلکہ یہ مطلب ہے کہ انسان میں خدا کی صفاتِ کاملہ کی ایک دھندلی سی جھلک موجود ہے، علم، قدرت، حیات، سمع، بصر، ارادہ، غضب، رحم، سخا وغیرہ صفات کی ناقص مثالیں اسکے اندر اللہ نے ودیعت رکھی ہیں، اور چونکہ انسان کے تمام اعضا میں اسکا چہرہ ہی اسکی شخصیت کا آئینہ دار اور اس کے اکثر حواس کا مصدر ہے جن سے اسکے تمام اوصاف کا ظہور ہوتا ہے، اسلئے آنحضرت

---

[1] صحیح بخاری کتاب الاستیذان، ابن ابی عاصم فی السنہ والطبرانی من حدیث ابن عمر باسناد رجالہ ثقات و ادب المفرد بخاری و احمد بن ابی ہریرۃ و صحیح مسلم کتاب البر، نیز توراۃ میں بھی یہ فقرہ ان الفاظ میں ہے، جس دن خدا نے آدم کو پیدا کیا، خدا کی صورت پر اسے بنایا" (پیدائش ۵-۲) [2] صحیح بخاری کتاب العتق، و صحیح مسلم کتاب البر والصلہ [3] صحیح مسلم کتاب البر آخری ٹکڑا صرف مسلم میں ہے، [4] ادب المفرد امام بخاری باب لا تقل قبح اللہ وجہہ،

صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کے اعضا میں اُسی کو فیضِ رحمانی کا مورد ظاہر کیا، اب غور کرو کہ وہ چیز جس کو خدا سے ایسی نسبت ہے، کیا اس لائق ہے کہ غیر خدا کے آگے زمین پر رکھا جائے،

انسان تو کائنات میں خلیفۃ اللہ بنکر آیا ہے،

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ (انعام ۲۰) اور اسی نے تم کو زمین کا نائب بنایا،

تو اب وہ عالمِ کائنات میں خدا کے سوا کس کو سجدہ کرے،

روئے زمین کی تمام چیزیں اسکے خاطر ہیں وہ روئے زمین کی چیزوں کی خاطر نہیں بنا ہے،

خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (بقرہ ۳) جو کچھ زمین میں ہے خدا نے سارا کا سارا تمہارے لیے بنایا

إِنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ (حج ۹) زمین میں جو کچھ ہے خدا نے اسکو تمہارے بس میں دیدیا ہے،

تو اب وہ روئے زمین کی کس ہستی کے سامنے سر جھکائے،

مشرک، بت پرست، ستارہ پرست، فطرت پرست، حقیقت میں غیروں کے آگے جھک کر یہ ثبوت دیتے ہیں کہ یہ اُن کیلئے نہیں، بلکہ وہ اُن کے لیے بنے ہیں، جو چاند اور سورج کو پوجتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ چاند اور سورج اُن کے لیے نہیں، بلکہ وہ چاند اور سورج کیلئے بنے ہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وحی اور تعلیم کے ذریعہ سے یہ بتایا کہ کائنات کی ہر چیز انسان کیلئے بنی ہے اور انسان خدا کے لیے بنا ہے، اسلیے جب کائنات کا ہر ذرہ انسان کی خدمت گذاری میں مصروف ہے تو انسان کو بھی خدا ہی کی خدمت گذاری میں مصروف رہنا چاہیئے،

ابرو باد و مہ و خورشید و فلک در کارند — تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

لہ اس حدیث کی شرح میں فتح الباری شرح بخاری میں یہ قول نقل کیا گیا ہے،

انسانوں نے آسمانی مخلوقات کو اپنا معبود بنایا، تو وحی محمدیؐ نے اُن سے کہا،

وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ	اور خدا نے رات دن اور چاند اور سورج
وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ	تمہارے لیے کام میں لگایا، اور ستارے اسکے
(نحل-۲)	حکم سے کام میں لگے ہیں،

انسانوں نے جانوروں کو پوجا تو پیغام محمدیؐ نے ان انجانوں کو بتایا کہ یہ تمہارے ہیں، تم اُن کے نہیں ہو،

وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ	اور جانوروں کو اُس نے پیدا کیا تمہارے لیے
وَمَنَافِعُ (نحل-۱)	جن میں اون کی گرمی اور دوسرے فائدے ہیں

انسانوں نے دریا سمندر کو دیبی اور دیوتا بنایا، حالانکہ وہ بھی ان ہی کی خاطر عدم سے وجود میں آئے ہیں،

وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ	اور وہی خدا ہے جس نے دریا کو کام میں لگایا
لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً	کہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور تاکہ تم اس سے
تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ	آرائش کے موتی پہننے کو نکالو اور دیکھتے ہو
فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ	کہ جہاز سمندر کو پھاڑتے پھرتے ہیں اور تاکہ تم
(نحل-۲)	خدا کے فضل و کرم (روزی) کی تلاش کرو

آگ بھی انسانوں کی مسجود بنی، حالانکہ وہ خود ان ہی کی محبت میں جل رہی ہے،

الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ مِنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ	جس نے تمہارے واسطے ہرے درخت

نارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ — سے آگ پیدا کی پس اس وقت تم اس سے

(یٰسین ۸۰) — روشن کرتے ہو،

الغرض زمین سے لیکر آسمان تک جو مخلوق بھی ہے، انسان اس سے اشرف اور بلند تر ہے اور ساری مخلوق اسی کے لیے ہے، پھر اس انسان سے بڑھکر اور کون نادان ہے جو مخلوقات میں سے کسی کو اپنا معبود، اور مسجود بنائے، اس حقیقت کے آشکارا ہونے کے بعد شرک کا کوئی سہارا بھی ایسا ہے جس میں کوئی سچا مسلمان گرفتار ہو سکے اور ایک آستانہ کو چھوڑ کر وہ کسی اور چوکھٹ پر اپنا ماتھا جھکا سکے

الغرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کی تلقین کی، وہ ان ہی دو اصولوں پر قائم ہے، ایک یہ کہ انسان تمام مخلوقات میں اشرف ہے، اسلئے کسی مخلوق کے سامنے اسکا سر نہ جھکنا چاہئے، اور دوسرا یہ کہ ہر قسم کی قوت ہر قسم کی قدرت اور تمام اوصاف کمالیہ صرف ایک بزرگ و برتر ہستی کیلئے ہیں، جو ماوراے عرش سے زیر فرش تک ہر ذرہ پر حکمراں ہے، اس کی اطاعت کے دائرہ سے کوئی نقطہ باہر نہیں، انسان کی پیشانی کو ہر جگہ سے اٹھکر صرف اُسی کے آستانہ پر جھکنا چاہئے، ہماری تمام عقیدت ہماری تمام محبت، ہمارا تمام خوف، ہماری تمام امیدیں ہماری تمام دعائیں، ہماری تمام التجائیں، ہماری تمام عاجزیاں صرف اسی ایک درگاہ پر نثار ہوں اسی کے رحم و کرم کے سہارے ہماری زندگی کا ہر لمحہ بسر ہو

وہ بزرگ و برتر ہستی کیا ہے؟ اور اسکی نسبت ہمارا کیا تخیل ہو؟ تعلیم محمدی نے اسکا بھی جواب دیا ہے،

خدا کا جامع اور مانع تخیل قرآن پاک کی آیات، جاہلیت کے اشعار، اسلام سے پہلے عربوں کے واقعات بلکہ عرب کے آثار قدیمہ کے کتبات سے یہ واضح طور پر ثابت ہے کہ عربوں کے ذہن میں ایک بالاتر ہستی کا تخیل ضرور موجود تھا، جس کا نام ان کے ہاں اللہ تھا، مگر اللہ کیا ہے؟ کیسا ہے؟ اسکے صفات کیا ہیں اس کی طرف کیا کیا باتیں

منسوب کیجا سکتی ہیں، کن کن باتوں سے وہ پاک ہی، اُس کا تعلق اپنے بندوں کیساتھ کیسا ہے؟ ہمکو اس کے آگے کیسے جھکنا چاہئے؟ اس سے کیا مانگنا چاہئے؟ اور کیونکر مانگنا چاہئے؟ اس کے حضور میں دعا کیونکر کرنی چاہئے؟ ہم اس سے کیوں ڈریں اور کیونکر ڈریں؟ اور اس سے ڈرنے کی کیا حقیقت ہی، اس سے محبت بھی کیجا سکتی ہی یا نہیں؟ اگر کیجا سکتی ہے تو کیونکر؟ اور اس سے محبت کی حقیقت کیا ہے؟ اسکی قدرت کہانتک ہی، اسکے علم کی کیا حیثیت ہی؟ کیا وہ ہم سے دور ہے، یا بالکل قریب اسکے تقدس بڑائی اور عظمت کی کوئی حد ہے؟ اس پر ہم توکل اور بھروسہ کیونکر کریں؟ کیا وہ انسانوں کی کسی صنف سے کلام بھی کرتا ہے؟ کیا اس کے کچھ احکام بھی ہیں؟ اور وہ احکام واجب الاطاعۃ بھی ہیں؟ وہ کن باتوں سے خوش اور کن سے ناخوش ہوتا ہے؟ کیا وہ ہمارے دلوں کے چھپے ہوئے رازوں سے بھی آگاہ ہے؟ کیا اسکی اجازت کے بغیر زمین کا ایک ذرہ بھی اپنی جگہ سے حرکت کرسکتا ہی؟ اسکی مشیت اور اس کا ارادہ کیونکر آسمان سے زمین تک ہر چیز کو محیط ہی؟ کیا اسکے بنائے ہوئے قاعدے اور قانون بھی ہیں؟ کیا وہ انسانوں کی تعلیم اور اصلاح کیلئے پیغمبروں کو بھی مبعوث کرتا ہی، کیا ہم اس کی بارگاہ میں اپنے اعمال کے جوابدہ بھی ہیں، ہم سے وہ کیوں اور کیونکر ہمارے اعمال کا مواخذہ کریگا؟ یہ وہ باتیں ہیں جن سے عرب جاہلیت کا دل و دماغ بالکل عاری اور خالی تھا، اور ان چیزوں کے متعلق ان کے ذہن میں کوئی تخیل نہ تھا، عرب جاہلیت کا ایک ایک ذرہ پڑھ جاؤ ان کے مذاہب و اعتقادات کا ایک ایک حرف تلاش کرلو، اس سے زیادہ کچھ نہ پاؤگے کہ اللہ ایک طاقتور اعلیٰ ہستی ہے، جس نے سب کو پیدا کیا ہے، اور مصیبتوں اور بلاؤں میں اسکو پکارنا چاہئے،

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ربانی تعلیمات سے ان کو اللہ تعالیٰ کی حقیقی عظمت سے

آشنا کیا، اسکی وحدت اور بے مثالی سے باخبر کیا، اسکی مشیئت و ارادہ اور قدرت و وسعت سے آگاہ کیا،
ایک ایسی ہستی کے اعتقاد کی اُن کو تعلیم دی، جس کی قدرت بے انتہا، جس کی وسعت غیر محدود ہے، جسکی
مشیئت کائنات کے ہر ذرہ میں نافذ ہے، جس کے علم کے احاطہ میں اندھیرے اور اجالے کی ہر چیز
داخل ہے، دلوں کے اسرار انسانوں کے الفاظ، اور ہاتھ پانوں کے اعمال سب ہر لحظہ اور ہر لمحہ
اس کے روبرو ہیں، اس کے سامنے انسان اپنے ہر عمل کا جوابدہ اور ذمہ دار ہے، اسکے مواخذہ کا
خوف اور اسکی رحمت کی امید ہے، وہ محبوب ازل ہے، اسکی محبت کا نشہ ہمارے دلوں کی ہمیشہ
ہے، اس کے فضل و کرم اور لطف و محبت کی نیرنگیاں اور سے پیچ تک پھیلی ہیں، اسکی قوت ہر قوت
پر غالب، اس کا ارادہ ہر ارادہ میں نافذ اور اس کا حکم ہر حکم سے بالاتر ہے، اسکی عبادت ہر مخلوق
پر فرض، اور اسکی اطاعت ہر مکلف پر واجب ہے، وہ ہر عیب سے پاک و منزہ اور ہر وصف کا مستحق
اور اس سے متصف ہے، انسانوں کو اپنی یاد دلانے اور اُن کے تزکیہ و اصلاح کے لیے
رسولوں اور پیغمبروں کو بھیجتا رہا، اور ان سے ہم کلام ہوتا رہا، اس کے کچھ احکام اور بندھے ہوئے قوانین
ہیں جن کی اطاعت نیکی اور نافرمانی گناہ ہے، وہ اندھیرے کی روشنی بھوکوں کی سیری، مایوسوں
کی امید، زخمیوں کا مرہم، بیقراروں کی تسلی اور بیکسوں کا سہارا ہے، وہ ہم سے ہماری گردن کی رگ سے
بھی قریب تر ہے، ہم اس کو جب پکاریں وہ سنتا ہے، وہ نیکیوں کو پسند اور گناہوں سے نفرت کرتا ہے،
وہ جب چاہے آسمان و زمین کو فنا کر دے، اور جب چاہے ان کو پھر بسا دے، اسکی محبت دنیا کا
اصل اسکی عبادت ہماری زندگی کا مقصود اور اس کی یاد ہمارے دلوں کی راحت ہے،

أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ — ہاں خدا کی یاد سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ وہ لوگ جن کو بھولے سے بھی خدا کا نام یاد نہ آتا تھا، وہ اس کے سوا سب کچھ بھول گئے، اور اسکی راہ میں ہر چیز قربان کرنے کو تیار ہو گئے، وہ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، ہر حال میں اسکی یاد میں سرمست و سرشار رہتے تھے،

يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُودًا وَّ عَلٰى جُنُوبِهِمْ (آل عمران ۲۰)

وہ خدا کو کھڑے، بیٹھے، اور لیٹے یاد کرتے ہیں،

اس سرمستی و سرشاری میں بھی انھوں نے جنگلوں میں راہبانہ زندگی بسر نہیں کی، دولتمندوں کی بھیک کو اپنا سہارا نہیں بنایا، دنیا کی کشمکش سے نجات حاصل کرنے کیلئے بزدلانہ گوشہ نشینی کو تقدس کا نام دیکر اختیار نہیں کیا، بلکہ فرائض کی ادائیگی اور اس راہ میں جد و جہد اور سعی و کوشش کو اپنا مذہب سمجھا، اور خدا کا حکم جان کر اسکو پوری مستعدی کیساتھ بجالائے، اور ان تمام ہنگاموں کے ساتھ دل کا معاملہ دلدارِ ازل کے ساتھ ہمیشہ قائم رکھا، خدا نے ان کی مدح کی کہ

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللّٰهِ (نور ۴)

وہ لوگ جن کو تجارت اور خرید و فروخت خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی،

ان کی محبتِ الٰہی کا درجہ دنیا کی ہر محبت پر غالب آگیا، خدا نے انکی توصیف کی کہ

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (البقرہ ۲۰)

ایمان والے سب سے زیادہ خدا سے محبت کرتے ہیں،

ان کا توکل، ان کا صبر، ان کا استقلال، ان کی استقامت، انکی بہادری، انکی بیخوفی، انکی صداقت، ان کی راست بازی، ان کی اطاعت، غرض ان کی ہر چیز ان کے اسی جذبۂ ایمانی کا پرتو تھی، اور ہر وقت ان کے پیشِ نظر یہ تعلیم رہتی تھی کہ

وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ (طلاق-۱) جو خدا پر بھروسہ کرتا ہے تو خدا اسکو بس کرتا ہے

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ (زمر-۴) کیا خدا اپنے بندہ کو کافی نہیں،

وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ اور تو لوگوں سے ڈرتا ہے، حالانکہ سب سے زیادہ

(احزاب-۵) خدا سے ڈرنا چاہئے،

اُن میں یہ تمام روحانی و اخلاقی جوہر اسی ایمان باللہ کے بدولت پیدا ہوئے،

اسماء و صفات دنیا کے آغاز میں خدا نے کہا تھا کہ ہم نے آدمؑ کو سب نام سکھائے، دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی، اور علم کی وسعت کہاں سے کہاں پہنچی، مگر غور کیجئے تو ناموں کے ہیر پھیر سے ہم ابتک آگے نہیں بڑھے، یہی ہماری حقیقت رسی ہے، اور یہی ہمارا فلسفہ ہے، ہم اپنے مفروضہ اصولِ منطقی کی بنا پر ذاتیات اور حقائق کے ذریعہ سے اشیا کی تعریف کے مدعی بن گئے ہیں، لیکن ہزاروں صدیاں گذرنے پر بھی ذاتی اور حقیقی تعریف (حد منطقی) کی ایک مثال بھی پیش نہ کرسکے جو کچھ کرسکے وہ یہ کہ صفات، عوارض اور خواص کے مختلف رنگوں سے نئی نئی طفلانہ شکلیں بناتے اور بگاڑتے ہیں جب ادبیت کا یہ عالم ہے تو ورا الورا ہستی میں ہماری بشری طاقت اس سے زیادہ تحمل نہیں کرسکتی، تجلی گاہ طور اسی رمز کی آتشیں تصویر ہے،

ہم خدا کو بھی اُس کے ناموں، اُس کے کاموں اور اسکی صفتوں ہی سے جان سکتے ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے جاہلوں کو اسی منہاجِ انسانی کے مطابق تعلیم دی، عرب کا جاہل، اللہ نام ایک الٰہی ہستی سے واقف تھا، لیکن اسکے ناموں اور کاموں کے تخیل سے بڑی حد تک ناآشنا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات سے بھی وہ قطعاً بیگانہ تھا، دیوانِ عرب یعنی

انکی شاعری کے دفتر میں کہیں کہیں اللہ کا نام آتا ہے، مگر کہیں اسکی صفت کا ذکر نہیں، تا، قرآن پاک میں ان کے خیالات کا پورا عکس آتا گیا ہے، لیکن کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات سے بھی آگاہ تھے، بعض عیسائی عربوں میں، اللہ کے ساتھ ساتھ الرحمان کا لفظ بھی مستعمل تھا، جس کے معنی رحم کرنے والے کے ہیں، اصحاب الفیل کے عیسائی رئیس، ابرہہ کے نام سے سدعرم، (یمن) پر جو کتبہ لگا ہے، اور جس کو جرمن فاضل گلانہ نے شائع کیا ہے، اسمیں بھی دو جگہ رحمان کا لفظ آیا ہے، عرب عیسائی شعراء کے کلام میں بھی یہ لفظ ملتا ہے، عیسائیوں میں اسکے استعمال کا نتیجہ یہ تھا کہ عرب مشرکین کو اس لفظ سے چڑ ہو گئی تھی، اسلئے جب اسلام نے اس لفظ کو اختیار کیا تو مشرکین نے اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا، صلح حدیبیہ کے موقع پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ کے کاغذ پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھوایا تو قریش کے نمائندہ نے کہا کہ ہم نہیں جانتے اللہ کی ہمیں نہیں معلوم کہ رحمٰن کیا ہے،

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سننے اور قرآن مجید میں بار بار خود کیلئے رحمان کا لفظ مستعمل ہونے کی وجہ سے مشرکوں کو برہمی ہوتی تھی، اور وہ کہتے تھے کہ ہم کبھی رحمان کے آگے سرنگوں نہیں ہو سکتے، قرآن نے ان کی اسی حالت کا ذکر اس آیت میں کیا ہے[1]

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ	اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ
قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ اَنَسْجُدُ لِمَا	کرو تو کہتے ہیں کہ رحمان کیا ہے کیا ہم جسکو
تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا (فرقان ۵)	کہو اسکو ہم سجدہ کریں، رحمان کا نام ان کی

مشرکین کو یہ برا لگتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف تو انکے بتوں اور دیوتاؤں کی مذمت کرتے ہیں

[1] صحیح بخاری جلد اول کتاب الشروط ص ۳۷۵

اور دوسری طرف عیسائیوں کے رحمان کی مدح وستایش کرتے ہیں،

اَھٰذَا الَّذِیْ یَذْکُرُ اٰلِھَتَکُمْ وَھُمْ	(مشرک آپ کو دیکھتے تو مذاق سے کہتے کہ یہی
بِذِکْرِ الرَّحْمٰنِ ھُمْ کٰفِرُوْنَ،	وہ ہے جو تمہارے دیوتاؤں کو برا کہتا ہے اور
(انبیاء - ۳)	وہی مشرک رحمان کے ذکر سے انکار کرتے ہیں

تعلیم محمدیؐ نے عرب کے ناآشنایانِ حقیقت کو بالآخر آگاہ کیا کہ خدا کے اسماء وصفات کی کوئی حد نہیں، اسکو سب ہی اچھے ناموں سے پکارا جا سکتا ہے،

قُلِ ادْعُوا اللّٰہَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَیًّا	کہدو اے پیغمبر کہ خدا کو اللہ کہہ کر پکارو یا
مَّا تَدْعُوْا فَلَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی	رحمان کہہ کر جس نام سے بھی پکارو سب
(اسرائیل - ۱۲)	اچھے نام اسی کے ہیں،

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا مسئلہ اسلام کے اُن اہم مذہبی اصلاحات میں سے ہے، جن سے نہ صرف عرب کے جاہل ناآشنا تھے، بلکہ دنیا کے بڑے بڑے مذہبوں کے پیرو بھی ان کے متعلق غلطیوں میں مبتلا تھے، یہودیوں کے اسفار اور صحیفوں میں خدائے برحق کا اصلی نام یہوواہ تھا مگر کبھی عام یہودیوں کو اس مقدس نام کے زبان پر لانے کی اجازت نہ تھی، دوسرا عام نام ابیم ہے، جو ہر موقع پر استعمال ہوتا ہے، ان دو کے علاوہ خدا کے بیسیوں نام اور اسماء جو درحقیقت اسکے اوصافِ ذاتی اور اعمالِ ربانی کے ترجمان ہیں، توراتِ کا و قرآن کے ذکر سے بالکل خالی ہے، صفاتِ الٰہی میں سے جو صفت یہودی صحیفوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ "یہوواہ صبایوت" یعنی ربّ الافواج ہے، جو صرف خدا کی صفاتِ جلالی کا مظہر ہے،

عیسائیوں کی انجیل اور مذہبی کتابوں میں "باپ" کا لفظ خدا کے لیے استعمال ہوا ہی، اس لفظ کی حقیقت اور خدا پر اس کے اطلاق سے مقصود کیا ہے، گوشت پوست اور مادیت سے بھرت ہوئے لفظ کا خدا پر مجازاً اطلاق بھی کہاں تک جائز ہے؟ اور اس سے اس مذہب میں کہاں تک غلطیاں پھیلیں، ان باتوں کو چھوڑ کر بھی دیکھئے تو یہ خدا کے صرف جمالی صفات کی ناقص اور مادی تعبیر ہے، عیسائیت میں فلسفہ کی آمیزش نے تثلیث کے اختراعی عقیدہ کو اسی مسئلہ صفات کے پردہ میں چھپا لیا، اور یہ تاویل کی گئی کہ تثلیث کے اقانیم ثلثہ، باپ (خدا) بیٹا (حضرت عیسیٰ) اور روح القدس حیات، خلق اور علم تین صفتوں سے عبارت ہیں، باپ حیات، بیٹا خلق، اور روح القدس علم ہی، اور یہ تینوں ایک ہیں اور تینوں اپنے وجود میں الگ الگ ہیں، اس تشریح سے صفاتِ الٰہی کے تجسم کے مسئلہ نے جنم لیا، اور ایک خدا کئی خداؤں کا مجموعہ بن گیا،

ہندوؤں میں اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کی نیرنگی نظر آتی ہے، لیکن ہر صفت نے انکے ہاں ایک مستقل وجود حاصل کر لیا ہے، اور خود خدا ہر قسم کی صفات سے خالی اور مجرد رہ گیا ہے، اسی لیے ہندوستان کے تمام مذاہب اسی تجسیم صفات کے جلوہ کاہ ہو کر رہ گئے ہیں، برہما، بیشن و شیو تین صفات خالق، ممیت (مارنے والا) اور قیوم کے مجسمے ہیں، غلط تعبیر نے وحدت کی جگہ یہاں بھی تثلیث پیدا کر دی ہے، شنکر آچاریہ نے خدا کے صرف تین اصلی صفات تسلیم کئے، حیات، علم اور سروپا آنند، جین مذہب اور بعض ہندو فرقوں میں ایک خالقیت کی صفت کے تجسم نے اعضائے تناسل کی پرستش کی گمراہی پیدا کی، عام ہندوں میں ۳۳ کروڑ عجیب الخلقت دیوتاؤں کی عظیم الشان بھیڑ بھی صفات و اسمائے الٰہی کی تجسیم اور مستقل وجود کے غلط فلسفہ نے پیدا کی اور

اسی نے بت پرستیوں کی نت نئی صورتیں نمایاں کیں، مجوسیوں میں یزدان اور اہرمن کی ثنویت اور دوئی بھی خدا کی دو صفتوں ہادی اور مضل کو دو مستقل ہستیوں میں منقسم کر دینے کا نتیجہ ہے، اس تفصیل سے اندازہ ہوا ہوگا کہ اس مسئلہ کی غلط تعبیر نے دنیا میں کتنی گمراہیاں پیدا کی ہیں،

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کے ان تمام فاسد تخیلات کو باطل ٹھہرایا ہے، انکے غلط عقیدوں کی تصحیح کی، اور ربانی ہدایت کے نور سے سراجِ منیر بنکر جس طرح حقیقت کو روشن کیا، وہ نبوتِ محمدی کے عظیم الشان کارناموں میں ہے،

آپنے بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ گنتی اور شمار کی حد سے باہر ہیں، اور اس کی باتوں کی کوئی انتہا نہیں، آپنے یہ دعا سکھائی۔ اے خداوند! تیرے ہر اس نام کے وسیلہ سے جو تو نے اپنا رکھا یا اپنی کتاب میں اتارا، یا کسی مخلوق کو سکھایا یا اپنے لئے اپنے علم غیب میں اسکو چھپا رکھا ہے تجھ سے مانگتا ہوں"[1] حضرت عائشہؓ کو یہ الہامی دعا تعلیم ہوئی خداوندا! میں تیرے سب اچھے ناموں کے وسیلہ سے جنمیں سے کچھ کو ہم نے جانا اور جن کو نہیں جانا تجھ سے درخواست کرتا ہوں

قرآن پاک کے ذریعہ بتایا گیا،

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا (الکہف ۱۲)

کہدے اے پیغمبر کہ اگر سمندر میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کیلئے سیاہی بنجائے، تو سمندر ختم ہوجائیگا لیکن میرے پروردگار کی باتیں ختم نہ ہونگی، اگرچہ ہم ایسا دوسری جگہ کہا گیا،

---

[1] یہ تینوں دعائیں امام بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں بسند نقل کی ہیں اور پہلی روایت مسند ابن حنبل میں بھی بسند عبداللہ بن مسعود ہے،

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ط (لقمان - ۳)

اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں وہ قلم بنجائیں اور سمندر اور اس کے بعد سات سمندروں کا پانی سیاہی ہو جائے تب بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہون گی،

الغرض تمام اچھے اور کمالی نام اسی کے لیے ہیں، اور اسی کو زیبا ہیں،

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (طٰہٰ - ۱۰)

نہیں ہے کوئی معبود لیکن ہی اللہ اسی کیلئے ہیں سب اچھے نام،

بڑائی کا ہر نام اور خوبی کا ہر وصف اسی ذاتِ بے ہمتا کے لئے ہے، خواہ اس کو خدا کہو، یا اللہ کہو، لغت اور زبان کا کوئی فرق اس میں خلل انداز نہیں،

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (اسرائیل - ۱۲)

کہدے اے پیغمبر! اس کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمان کہہ کر، جو چاہو کہہ کر پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں،

لیکن مشرکوں کی طرح اسکو ایسے ناموں سے نہ پکارو جو اس کے کمال اور بڑائی کے منافی ہیں، اور بتوں اور دیوتاؤں کے ناموں سے بھی اس کو یاد نہ کرو،

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ (اعراف - ۲۲)

اور اللہ ہی کے لیے ہیں سب اچھے نام اسکو ان ناموں سے پکارو، اور ان لوگوں سے علیحدہ جو اسکے ناموں میں کمی کرتے ہیں،

تعلیمِ محمدیؐ کا صحیفہ وحی اللہ تعالیٰ کے تمام اوصافِ حمیدہ اور اسمائے حسنہ سے بھرا ہوا ہے، بلکہ اس کا صفحہ صفحہ خدا کے اسماء و صفات کی جلوہ گریوں سے معمور ہے، قرآن پاک کا کوئی ایسا رکوع ہوگا جس کا خاتمہ خدا کی توصیف اور حمد پر نہ ہو، اور یہ تمام اوصاف اور یہ نام اُس عشق و محبت کو نمایاں کرتے ہیں جو اس محبوبِ ازل اور نورِ عالم کیساتھ قرآن کے ہر پیرو کے دل میں ہونا چاہیئے

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ
اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے، اسکے نور

مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ
کی مثال یہ ہے کہ ایک طاق ہو جسمیں چراغ ہو

اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ
چراغ ایک شیشہ کے اندر ہو شیشہ اتنا صاف ہو

كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ
کہ گویا ایک چمکتا ستارہ ہے، وہ چراغ زیتون کے

شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ
مبارک درخت کے تیل سے جلایا گیا ہو جو نہ پورب

وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ
ہے نہ پچھم ہے، اسکا تیل اتنا صاف ہے کہ آگ کے

لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ
چھوئے بغیر وہ آپ ہی آپ جلنے کو ہو، روشنی پر

يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ
روشنی، خدا اپنی روشنی تک جسکو چاہے،

وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ
پہنچا دے، اور خدا لوگوں (کے سمجھانے)

وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (نور ۵)
کیلئے یہ مثالیں بیان کرتا ہے اور اللہ کو ہر چیز کا علم ہے

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ
اللہ نہیں ہے اسکے سوا اور کوئی معبود زندہ

لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا
ہمیشہ زندہ انتظام دنیا کو سنبھالے جو اسکو

فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ
اونگھ اور نیند نہیں آتی آسمانوں میں اور زمین میں جو

خا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ

کچھ ہے اسی کا ہے کون ہے جو اسکی مرضی کے بغیر

یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ

اسکے سامنے سفارش کرنے کو کھڑا ہو انہیں اور کے سامنے

وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا

اور پیچھے جو کچھ ہے اسکو وہ جانتا ہے، اور وہ کوئی اسکے

بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ

علم کا احاطہ نہیں کر سکتے، لیکن جتنے کا وہ چاہے

وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ

اسکا تخت آسمانوں اور زمینوں کو سمائے ہوئے ہے اور

وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ

ان دونوں (آسمان و زمین) کی نگہبانی اس کو

(البقرہ ۲-۲۵۵)

تھکاتی نہیں، اور وہی اونچا اور بڑا ہے،

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ

وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی اللہ نہیں چھپے اور

عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ

کھلے کا علم رکھنے والا وہی رحم کرنیوالا، اور مہربانی

الرَّحِیْمُ، هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا

والا ہے، وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی اللہ نہیں

هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ

سب کا بادشاہ، پاک پوری سلامتی، امن الاہر شے

الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ

پر گواہ غالب سب پر قابو والا، بڑائی والا ہر اُس

الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ

چیز سے پاک ہے جسکو یہ شرک خدا کا شریک بناتے ہیں

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ

وہی اللہ پیدا کرنیوالا، بنانے والا ہر چیز کی صورت

لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ؕ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا

کھینچنے والا ہے کیلئے سب اچھے نام ہیں جو کچھ آسمانو

فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ

میں اور زمین میں ہے سب اسکی پاکی بیان کرتے ہیں

الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (حشر ۵۹-۲۴)

وہی سب پر غالب اور حکمت والا ہے،

مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ	آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب خدا
وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ	کی پاکی بیان کرتے ہیں اور وہی غالب اور دانا ہے
وَالْاَرْضِ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى	آسمانوں کی اور زمین کی حکومت اسی کی ہے
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ	جلاتا ہے اور مارتا ہے اور وہ ہر بات پر قادر ہے
وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ	وہی پہلا اور وہی پچھلا ہے اور وہی کھلا ہے اور
عَلِيْمٌ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ	وہی چھپا ہے اور ہر بات کو جانتا ہے وہی ہے جس نے
وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى	آسمانوں کو اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا پھر
عَلَى الْعَرْشِ ط يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ	تخت پر برابر ہوا، وہ جانتا ہے جو زمین میں گھستا ہے
وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ	اور جو اس سے نکلتا ہے اور جو آسمان سے اترتا ہے
وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ط وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا	اور جو اس میں چڑھتا ہے اور جہاں بھی تم ہو وہ
كُنْتُمْ ط وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ	تمہارے ساتھ ہے اور اللہ تمہارے کاموں کو دیکھتا
لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَاِلَى	ہے آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی
اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ تُوْلِجُ الَّيْلَ	ہے اور اللہ ہی تمام چیزوں کا مرجع ہے وہ رات
فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ	کو دن میں داخل کر دیتا ہے اور دن کو رات میں
وَهُوَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ	داخل کرتا ہے اور وہ سینوں کے سب بھیدوں

(حدید ۱)

سے واقف ہے،

خدا کے متعلق اہل عرب کا جو بیت تخیل تھا، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکو مٹا کر ان کے

سامنے جو بلند تخیل پیش کیا، اس کا اندازہ حسب ذیل واقعہ سے ہو سکتا ہے، آپ نے جب توحید کا آوازہ بلند کیا، تو مشرکین جو اپنے دیوتاؤں کی آل و اولاد اور بیویوں اور گوپیوں کی حمد کے ترانے گاتے تھے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور فرمائش کی کہ ذرا اپنے خدا کا نسب تو ہمارے سامنے بیان کرو، گویا وہ اپنے دیوتاؤں سے اسلام کے خدا کا مقابلہ کر کے بتانا چاہتے تھے کہ اس حیثیت سے اسلام کا خدا ہمارے دیوتاؤں کی ہمسری نہیں کر سکتا، اس کے جواب میں وحیِ محمدی نے اپنے خدا کی حقیقت قرآن پاک کی اس سب سے مختصر سورہ میں پیش کی[1]

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ، اَللّٰهُ الصَّمَدُ	کہدے (اے پیغمبر) اللہ ایک ہے وہ تنہا اور یگانہ اور
لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ	بے نیاز اور عالم کا مرجع اور جا پناہ ہے نہ اسکے
لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ،	کوئی اولاد ہے، اور نہ اس کے ماں باپ ہیں،
(اخلاص)	(جھوٹے) اس کو جنا ہو اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے

یہ روایت حضرت ابی بن کعبؓ سے مروی ہے، جو صحابہ میں سب سے زیادہ قرآن کے ماہر سمجھے جاتے تھے، وہ اسی کے بعد اس سورہ کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ "صمد وہ ہے جو نہ جنتا ہو، اور نہ کسی نے اس کو جنا ہو، کیونکہ جو جنا جاتا ہے، وہ مرتا بھی ہے، اور جو مرتا ہے، وہ اپنا وارث اور جانشین بھی چھوڑ جاتا ہے، اور صمد نہ مرتا ہے نہ اس کا کوئی جانشین ہے اور کوئی اسکا ہمسر نہیں ہے یعنی کوئی اسکے برابر نہیں، اور نہ کوئی اسکے مثل ہے، غور کرو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے پہلے اہل عرب میں خدا کا کتنا پست تخیل تھا، جس کا اندازہ تم انکے سوال سے کر سکتے ہو، اور آپ کی تعلیم کے بعد

[1] مستدرک حاکم تفسیر اخلاص (صحیح) و جامع ترمذی تفسیر سورہ مذکورہ و کتاب الاسماء بیہقی صہ ۲۳ (الہ آباد)

وہ تخیل کتنا پاک تھا اور بلند ہو گیا جس کا اندازہ حضرت ابیؓ کی تفسیر سے ہو سکتا ہے جو اسی عرب نژاد قبیلہ کے ایک ممتاز فرد تھے لیکن انکا دل اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض تعلیم سے منور ہو چکا تھا، حضرت ابوہریرہؓ آپ سے سن کر کہتے ہیں کہ خدا فرماتا ہے کہ آدم کے بیٹے نے مجھے جھٹلایا، اور آدم کے بیٹے نے مجھ کو گالی دی، اسکا جھٹلانا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ خدا دوبارہ پیدا نہیں کریگا، حالانکہ پہلی بار کے پیدا کرنے سے دوسری بار کا پیدا کرنا بہت آسان ہے، اور اس کا گالی دینا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ خدا کی اولاد ہے، حالانکہ میں وہ ایک اور صمد ہوں جس نے نہ کسی دوسرے کو جنا ہے اور نہ اس کو کسی نے جنا ہے اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے[1]، حضرت ابوہریرہؓ یمنی عرب ہیں یعنی اس عرب کے ایک فرد ہیں جو تعلیم محمدی سے پہلے ان حقائق سے بے بہرہ تھا، اور اب وہ تنزیہ و تقدیس کے یہ موتی اپنے منہ سے اگل رہے ہیں،

اس مختصر سورہ میں سب سے چھوٹا لفظ "صمد" ہے لیکن درحقیقت قرآن کی بلاغت نے اس ایک لفظ میں صفاتِ الٰہی کا بے پایاں وفر چھپا رکھا ہے، صمد کے معنی لغت میں اونچی پتھریلی زمین یا چٹان کے ہیں جو کسی ایسے علاقہ میں ہو جہاں جب سیلاب آتا ہو، تو اس پر نہ چڑھتا ہو، اور لوگ اس وقت دوڑ دوڑ کر اسی پر چڑھ کر اپنی جانیں بچائیں، پھر صمد کے اس لغوی معنی سے اس سردار کے معنی پیدا ہوئے جو بزرگی اور شرافت میں انتہائی معراجِ کمال پر ہو، اور اس سردار کو بھی کہنے لگے جس کی موجودگی کے بغیر مجلس میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکتا ہو، اور اس سردار کو بھی کہتے ہیں جس کے اوپر کوئی سردار نہ ہو، اور اس جائے پناہ کے معنی میں بھی مستعمل ہوا جو سب کو مصیبت کے وقت اپنے دامن میں پناہ دے سکے اور اس مرجع و مرکز کے معنی میں بھی آیا جس کی طرف ہر شخص دوڑ دوڑ کر جاتا ہے، صمد ٹھوس کو بھی کہتے ہیں جس کے اندر خول نہ ہو، اسی سے اس کو بھی کہتے ہیں جو کھاتا پیتا نہ ہو اور جس کے آل و اولاد نہ ہو

[1] صحیح بخاری سورہ اخلاص

اُس کو بھی کہتے ہیں جس سے کوئی بے نیاز نہ ہو، اُس بہادر کو بھی کہتے ہیں جس کو لڑائی میں بھوک اور پیاس نہ لگتی ہو، صمدۃ اُس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کے حمل نہ رہا ہو، حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ صمد وہ سردار ہے جو اپنی بزرگی اور سرداری میں درجہ کمال پر ہو، وہ شریف جس کی شرافت کامل ہو، وہ بڑا جسکی بڑائی میں کوئی نقص نہ ہو وہ بردبار جس کی بردباری بدرجہ اتم ہو، وہ بے پروا بے نیاز جسکی بے پروائی و بے نیازی کی کوئی حد نہ ہو، وہ زبردست جس کے جبروت کی انتہا نہ ہو، وہ علم والا جس کا علم بدرجہ اتم ہو، وہ حکیم جس کی دانائی بمرتبہ کمال ہو، یعنی وہ جو بڑائی اور بزرگی کی ہر صنف میں کامل ہو،

ان معنوں کے علاوہ صحابہ و تابعین نے اسکی تفسیر میں حسب ذیل معانی بھی لکھے ہیں،

ابن عباسؓ وہ جس کی طرف مصیبت کے وقت لوگ رجوع کریں،

حسن بصریؒ وہ حی و قیوم جس کو زوال نہ ہو، اور جو باقی ہو،

ربیع بن انسؒ جس کے نہ اولاد ہو، نہ ان باپ،

عبداللہ بن مسعودؓ جس کے اندر معدہ وغیرہ جسمانی اعضاء نہ ہوں،

کریدہؓ جس میں جوف نہ ہو،

عکرمہ و شعبیؓ جو کھاتا نہ ہو،

عکرمہؓ جس میں سے کوئی دوسری چیز نہ نکلے

قتادہؓ باقی غیر فانی

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام معانی اس[2] ایک لفظ کے اندر پوشیدہ ہیں، اور یہ سب صرف

---

[1] کتاب الاسماء والصفات امام بیہقی بسند ص۳۳، [2] ان معانی کیلئے دیکھو کتاب الاسماء بیہقی ص۳۳، مفردات القرآن راغب اصفہانی، ابن جریر طبری، ابن کثیر اور تفسیر سورۃ الاخلاص لابن تیمیہ

ایک حقیقت کی مختلف تعبیرین ہیں، کیونکہ اوپر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس لفظ کے اصلی معنی "چٹان" کے ہیں، جو لڑائی اور مصیبتوں کے وقت جائے پناہ کا کام دے، اسرائیلی الٰہیات میں بھی یہ لفظ یہی اہمیت رکھتا ہے، اور بنی اسرائیل کے صحیفوں میں جائے پناہ کے لیے چٹان کا لفظ آیا ہے، استثناء (۳۲-۳۰-۱۳) میں ہے،

اگر ان کی چٹان ان کو بیچ نہ ڈالتی، اور خداوند اُن کو اسیر نہ کروا تا، کیونکہ ان کی چٹان ایسی نہیں جیسی ہماری چٹان"

یہ چٹان اس موقع پر حقیقت میں خدا کی مدد و نصرت سے کنایہ ہے، سموال کے پہلے صحیفہ میں، یہ کنایہ تصریح سے بدل جاتا ہے "خداوند کے مانند کوئی قدوس نہیں، تیرے سوا کوئی نہیں، کوئی چٹان ہمارے خدا کے مانند نہیں" (۲-۲)

اس سورہ میں خدا کی صفت میں دو لفظ ہیں، "اَحَدٌ" (ایک) اور "صَمَدٌ" (جائے پناہ) اور یہ دونوں خدا کے دو متضاد کمالی اوصاف کو حاوی ہیں، اسکی یکتائی کا نتیجہ تو یہ ہے کہ اس جیسا کوئی نہیں، نہ اسکو کسی کی حاجت نہ اسکو کسی سے غرض، وہ یکہ و تنہا، اکیلا لیے ہمتا، بے نیاز بے پروا، سب سے مستغنی اور سب سے الگ ہے، لیکن اسی کمال یکتائی کے ساتھ، وہ سب کے ساتھ سب کا دستگیر سب کی جائے پناہ، سب کا محتاج الیہ، سب کا مرکز، سب کا مرجع، سب کا ملجا یعنی سب کی چٹان ہے جو مصیبتوں میں سہارا، بلاؤں میں تسلی اور اضطراروں میں تشفی ہے،

فَفِرُّوا اِلَی اللّٰہِ — ہر جگہ سے بھاگ کر اللہ کے ہاں پناہ لو

یہ سورہ پاک توحید اسلامی کے ہر شعبہ کو حاوی ہے، اور اسی لیے اسکو ثلث القرآن (تہائی قرآن

کا درجہ دیا گیا ہے، ایک صحابی تھے، جو نماز کی ہر دو رکعت میں قرأت کے آخر میں اس سورہ کو پڑھا کرتے تھے لوگوں نے یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا، آپ نے ان سے اس کی وجہ دریافت کرائی، انھوں نے کہا اس میں میرے رب کی صفتیں بیان ہوئی ہیں، جو مجھکو بہت محبوب ہیں،" آپ نے فرمایا، بشارت ہو کہ خدا بھی تم سے محبت کرتا ہے[1]، ایک اور انصاری صحابی تھے، جو قبا کی مسجد میں امامت کرتے تھے، ان کا یہ حال تھا کہ ہر رکعت میں فاتحہ کے بعد پہلے اس سورہ کو پڑھ لیتے تھے، تب کوئی دوسری سورہ پڑھتے تھے، ان کے مقتدی صحابہ نے اس پر اعتراض کیا، تو انھوں نے کہا کہ مجھے امامت چھوڑنی منظور ہے مگر اپنی روش بدلنی منظور نہیں، لوگوں نے اس واقعہ کا تذکرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا، آپ نے ان سے اسکی وجہ دریافت کی، تو گذارش کی کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے یہ سورہ بہت محبوب ہے، ارشاد ہوا کہ یہ محبت تمکو جنت میں لیجائیگی[2] قتادہ بن نعمان ایک صحابی تھے، جو رات بھر اسی ایک سورہ کو دہراتے اور لطف حاصل کرتے رہتے تھے لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا، تو فرمایا کہ سورہ قرآن کا تہائی حصہ ہے[3]"

اُس گمراہی اور تاریکی کا اندازہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب پر چھائی ہوئی تھی، اس روحانی لطف اور نورانی فیض سے کرو جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس کے حصہ میں آیا،

قرآن مجید اور احادیث میں اللہ تعالیٰ کے سو سے زیادہ نام اور اوصاف آئے ہیں، صحیح حدیثوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں، جو انکو محفوظ رکھے یا شمار

---

[1] صحیح بخاری کتاب التوحید [2] ایضاً کتاب الصلوٰۃ [3] مسند احمد بسند ابی سعید الخدری،

میں رکھے وہ جنت میں داخل ہوگا، خدا طاق ہے، وہ طاق عدد کو پسند کرتا ہے، آخری فقرہ اس علت کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ نام کیوں رکھے گئے، پورے سو کیوں نہ مقرر کئے گئے، یہ اس لیے کہ اگر پورے سو ہوتے تو عدد طاق نہ رہتا اور اس سے توحید کا رمز آشکارا نہ ہوتا، صحیح احادیث میں اسی قدر ہے یعنی ان ۹۹ ناموں کی تصریح نہیں ہے، ترمذی میں اور بعض کم درجہ حدیثوں میں ان ناموں کو گنایا بھی ہے لیکن محدثین نے عموماً یہاں تک کہ حافظ ابن حجر نے بھی لکھا ہے کہ "یہ روایتیں ضعیف اور کمزور ہیں، پھر ان روایتوں میں بعض ناموں کا دل بدل اور الٹ پھیر بھی ہے، اور بعض ایسے نام بھی ان میں ہیں جو قرآن مجید میں مذکور نہیں، اور بعض ایسے نام جو قرآن میں ہیں ان میں نہیں ہیں اسی لیے علما کا فیصلہ یہ ہے کہ ان روایتوں میں ناموں کا انتخاب راویوں نے خود اپنی تلاش و تفحص سے کیا ہے، اس لیے ان روایتوں سے یہ شبہ نہ ہو کہ اسمائے الٰہی صرف ان ننانوے میں محصور ہیں، بلکہ بڑے بڑے ائمہ اور محدثین مثلاً عبدالعزیز بن یحییٰ، ابوبکر بن عربی، امام نووی، حافظ ابن حجر امام خطابی ابن تیمیہ اور قرطبی وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ اسمائے الٰہی ان ننانوے میں محصور نہیں، اور یہ بھی تصریحات ملتی ہیں کہ اسماء اور صفاتِ الٰہی کی کوئی حد و پایاں نہیں ہے[1] اور اس پر محدثین نے حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایتوں سے جو آغازِ مضمون میں اوپر گذر چکی ہیں استدلال کیا ہے،

بہر حال قرآن پاک اور احادیثِ صحیحہ کے تتبع سے علما نے ننانوے ناموں کا پتہ چلایا ہے، اور ان کو الگ الگ ایک ایک کر کے گنایا ہے، یہ تمام نام وہ ہیں جو یا بطور علم اور بطور صفت قرآن پاک

---

[1] صحیح بخاری کتاب التوحید و صحیح مسلم کتاب الذکر و مسند احمد بن حنبل ہریرہؓ و جامع ترمذی و نسائی و ابن ماجہ ابن خزیمہ و ابوعوانہ و ابن حبر و طبرانی و بیہقی وغیرہ [2] تمہید ابوشکور سالمی القول الثالث فی عدد الاسماء الہیہ ماتریدیہ کی مشہور مستند کتاب ہے

میں آئے ہیں، یا افعال کی حیثیت سے خدا کی طرف منسوب ہوئے ہیں، اور یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاؤں میں ان کی تعلیم کی ہے، ہم ذیل میں بہ ترتیب ایک ایک نام لکھتے ہیں، اور اس کی مختصر لغوی تشریح کرتے ہیں، تاکہ معلوم ہو سکے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کا جو تخیل اور عقیدہ اپنے پیروؤں کو سکھایا وہ کتنا وسیع، کتنا بلند، کتنا منزہ اور پاکیزہ ہے، علما نے ان ناموں کو یا ان صفات کو مختلف معنوی مناسبتوں سے ترتیب دیا ہے، لیکن ہم نے ان کے صرف تین مرتبے قرار دیئے ہیں، ایک وہ جن سے اس کے رحم و کرم، عفو و درگذر یعنی صفاتِ جمالی ظاہر ہوتے ہیں، دوسرے وہ جن سے اسکی شاہنشاہی جلال و جبروت اور حکومت و استیلا کا اظہار ہوتا ہے اور ہم انکو صفاتِ جلالی کہتے ہیں، تیسرے وہ اسما اور صفات جن سے اسکی تنزیہ، بلندی، کمالات کی جامعیت اور ہر قسم کے اوصافِ حسنہ اور محامدِ عالیہ کا ثبوت ملتا ہے، اور ان کو ہم صفاتِ کمالی سے تعبیر کرتے ہیں،

الغرض خدا کے تمام اسماء و صفات ان ہی تین عنوانوں کی تشریح ہیں، یعنی یا تو ان سے خدا کی رحیمی و کریمی ظاہر ہوتی ہے، یا اسکے جاہ و جلال کا اظہار ہوتا ہے، اور یا اسکی تنزیہ و کمال کا اثبات ہوتا ہے،

صفاتِ جمالی | یعنی وہ اسماء و صفات جن سے خدا کے رحم و کرم اور شفقت و محبت کا اظہار ہوتا ہے

اللہ، یہ خدا کا وہ نام ہے جو قرآن پاک میں بطور علم ہر جگہ استعمال کیا گیا ہے، اسلام سے پہلے بھی یہ عرب میں خدائے برحق کے لیے استعمال ہوتا تھا، اس لفظ کی لغوی تحقیق میں بہت کچھ اختلاف کیا گیا ہے، کسی نے کہا ہے کہ اسکے معنی اس ہستی کے ہیں جسکی پرستش کیجائے، بعضوں نے کہا ہے کہ وہ جس کی حقیقت و معرفت میں عقل انسانی حیران و سرگرداں ہو، دوسروں کی تحقیق ہے کہ اسکے معنی ہیں وہ جو اپنی مخلوقات کے ساتھ ایسی شفقت اور رغبت رکھے جو ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ

ہوتی ہے، اس اخیر تعبیر بنا پر اللہ کے معنی پیار کرنے والے یا پیارے کے ہیں،

الرحمٰن، اللہ کے بعد یہ دوسرا لفظ ہے جس کو علم کی حیثیت حاصل ہے اسکے معنی رحم والے کے ہیں، یہ گذر چکا ہے کہ رحمان کا لفظ اسلام سے پہلے صرف عیسائی عربوں میں مستعمل تھا، عام اہل عرب میں اللہ کا لفظ مستعمل تھا، قرآن مجید نے ہر سورہ کے شروع میں نیز اور مقامات میں اللہ کو الرحمٰن کہہ کر سینکڑوں جگہ استعمال کیا ہے، بظاہر تو یہ وصف موصوف کی معمولی ترکیب ہے مگر درحقیقت یہ بدل و مبدل منہ ہیں، اور اس سے اس رمز کی طرف اشارہ ہے کہ عام عربوں کا اللہ اور عرب عیسائیوں کا رحمان دو الگ الگ ذاتیں اور دو بیگانہ ہستیاں نہیں، بلکہ ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں اور ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں، اس طرح ان دو مختلف قوموں کو وحدت الٰہی کی دعوت دیگئی، جو ناموں کے تعدد کو حقیقت کے تعدد کا مرادف سمجھتی تھیں اور کہا گیا

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا — اللہ کہو یا رحمٰن کہو جو چاہو کہو اسی کے لیے

تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (اسرائیل) — سب اچھے نام ہیں،

الرَّحِيْمِ رحم کرنے والا، رحم کا لفظ اس رحم سے نکلا ہے جس سے بچہ کی پیدائش ہوتی ہے، اس لیے اصل لغت کے لحاظ سے اس لفظ میں بھی مربیانہ محبت کا جذبہ نمایاں ہے الرحمٰن اور الرحیم خدا کی وہ دو صفتیں ہیں جن سے قرآن کا صفحہ صفحہ منور ہے، کائنات میں جو کچھ ہوا جو کچھ ہے، جو کچھ ہوگا، وہ اسکی رحمانی اور رحیمی ان ہی دو صفتوں کا پرتو ہے اس عالم اور اس عالم دونوں میں اسکی ان ہی دونوں شانوں کا ظہور ہے، اور ہوگا،

اَلتَّوَّابُ، پے در پے توبہ قبول کرنے والا یعنی ہستی کے اول نقطہ سے لیکر آخر منزل تک ہر لمحہ اور ہر لحظہ مخلوقات

کی نشوونما اور ظہور و ترقی کا ذمہ دار،

اَللَّطِیْفُ، لطف والا مہربان،

اَلْعَفُوُّ، معاف کرنے والا درگذر کرنے والا،

اَلْوَدُوْدُ، محبوب، محبت کرنے والا پیار کرنے والا،

اَلسَّلَامُ، امن و سلامتی، صلح و آشتی، ہر عیب سے پاک و صاف،

اَلْمُحِبُّ، محبت والا، پیار والا، چاہنے والا،

اَلْمُؤْمِنُ، امان دینے والا، امن بخشنے والا، ہر خوف سے بچانے والا اور ہر مصیبت سے نجات دینے والا

اَلشَّکُوْرُ، اپنے بندوں کے نیک عمل کو قبول، اور پسند کرنے والا،

اَلْغَفُوْرُ وَالْغَفَّارُ، معاف کرنے والا، گناہ بخشنے والا، درگذر کرنے والا،

اَلْحَفِیْظُ وَالْحَافِظُ، حفاظت کرنے والا نگہبان، بچانے والا،

اَلْوَهَّابُ، دینے والا، عطا کرنے والا بخشنے والا،

اَلرَّازِقُ، وَالرَّزَّاقُ، روزی دینے والا، نشوونما کا سامان بہم پہنچانے والا،

اَلْوَلِیُّ، دوست، حمایتی، طرفدار،

اَلرَّءُوْفُ، مہربان، نرمی اور شفقت کرنے والا،

اَلْمُقْسِطُ، انصاف والا، عادل،

اَلْهَادِیْ، راہ دکھانے والا، رہنما،

اَلْکَافِیْ، اپنے بندوں کی ہر ضرورت کے لیے کافی،

اَلْمُجِیْبُ، قبول کرنے والا، دعاؤں کا سننے والا،

اَلْحَلِیْمُ، بردبار، بندوں کی برائیوں سے چشم پوشی کرنے والا،

اَلتَّوَّابُ قَابِلُ التَّوْب، توبہ قبول کرنے والا، گنہگار کے گناہوں سے درگذر کرکے

دوبارہ اس کی طرف رجوع ہونے والا،

اَلْحَنَّانُ، ماں کی طرح بچوں پر شفقت کرنے والا،

اَلْمَنَّانُ، احسان کرنے والا،

اَلنَّصِیْرُ، مدد کرنے والا،

ذُوالطَّوْلِ، کرم والا،

ذُوالْفَضْلِ، فضل والا،

اَلْکَفِیْلُ بندوں کی کفالت کرنے والا،

اَلْوَکِیْلُ، بندوں کی ضرورتوں کا ذمہ لینے والا، سامان کرنے والا،

اَلْمُقِیْتُ، روزی پہنچانے والا،

اَلْمُغِیْثُ، فریاد کو پہنچنے والا. فریاد سننے والا،

اَلْمُجِیْرُ، پناہ دینے والا،

اَلْمُغْنِیْ بندوں کو اپنے سوا ہر چیز سے بے نیاز کرنیوالا،

صفات جلالی | یعنی وہ اسماء وصفات جن سے خدا کی بڑائی کبریائی شہنشاہی کا اظہار ہوتا ہے،

اَلْمَلِکُ وَالْمَلِیْکُ، بادشاہ، فرمان روا،

اَلْعَزِیْزُ، غالب جس پر کوئی دسترس نہ پائے،

اَلْقَاھِرُ وَالْقَھَّارُ، جس کے حکم سے کوئی باہر نہیں جا سکتا سب کو دبا کر اپنے قابو میں رکھنے والا

اَلْمُنْتَقِمُ، سزا دینے والا، برائیوں کی جزا دینے والا،

اَلْجَبَّارُ، جبروت والا جس کے سامنے کوئی دم نہ مار سکے جس سے کوئی سرتابی نہ کر سکے،

اَلْمُھَیْمِنُ، سب پر شاہد اور گواہ اور دلیل،

اَلْمُتَکَبِّرُ، اپنی بڑائی دکھانے والا، کبریائی والا، سخت سزا دینے والا،

شَدِیْدُ الْعِقَابِ، سخت سزا والا،

شَدِیْدُ الْبَطْشِ، بڑی گرفت والا جس سے کوئی چھوٹ نہیں سکتا۔

نکتہ خدا کے صفات جلالی کا ذکر زیادہ تر تورات میں ہے لیکن صحیفہ محمدی میں جہاں کہیں خدا کی ان جلالی صفتوں کا ذکر آتا ہے، ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ خدا کے عادل، حکیم اور علیم ہونے کا بھی ذکر ہوتا ہے جس سے انسان کی اس غلط فہمی کا مٹانا مقصود ہے کہ خدا کی ان جلالی صفتوں کا یہ منشا نہیں ہے کہ وہ نعوذ باللہ ایک لاابالی کی طرح دم کے دم میں جو چاہے کر گذرتا ہے بلکہ اس کا قہر اسکا غلبہ اس کا انتقام اور اسکی گرفت عدل و انصاف اور حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتی ہے اور اسطرح ان جلالی ناموں سے بے رحمی اور ظالمانہ سخت گیری کا جو شبہ پیدا ہو سکتا ہے وہ دور ہو جاتا ہے فرمایا

اِنَّ اللّٰہَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ (آل عمران ۱۹) بیشک خدا بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں

اسی لیے اللہ تعالیٰ کے وصف میں عَزِیْزٌ (غالب) کیساتھ حَکِیْمٌ (حکمت والا) ہمیشہ قرآن میں آیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ خدا کے عذاب کے ذکر کیساتھ اسکی رحمت کا تذکرہ بھی ہمیشہ قرآن میں کیا

جاتا ہے، اور دوزخ کے بیان کیساتھ جنت کا سماں بھی لازمی طور پر دکھایا جاتا ہے،

جہاں یہ کہا گیا کہ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ وہیں یہ بھی کہا گیا، رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ (ص-ہ) قوموں کی تباہی و بربادی کا ذکر کیا گیا تو فرمایا

وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ (مومن) اور اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرنا چاہتا،

اس کی صفت ذُو عِقَابٍ اَلِيْمٍ دردناک عذاب دینے والا، جہاں بیان کیگئی تو اس سے پہلے لَذُو مَغْفِرَةٍ یعنی بخشش والا، (حٰمٓ السجدۃ-ہ) بھی فرمادیا گیا، غرض صفاتِ جلالی کے بیان میں یہ رعایت پیش نظر رکھی گئی ہے کہ ان کے ساتھ یا آگے پیچھے خدا کی صفاتِ جمالی کا بھی ذکر ہو، تاکہ خوف و خشیت کے ساتھ اسکی محبت اور لطف و کرم کے جذبات بھی نمایاں ہوں،

صفاتِ کمالی یعنی وہ اسماء و صفات جن سے خدا کی خوبی، بڑائی، بزرگی اور ہر وصف میں اس کا کامل ہونا ظاہر ہوتا ہے، اس طرح کے اسماء و صفات پانچ قسم کے ہیں، ایک وہ جو اس کی وحدانیت سے متعلق ہیں، دوسرے وہ جو وجود سے تعلق رکھتے ہیں، تیسرے اسکے علم سے چوتھے، اس کی قدرت سے، اور پانچویں اس کی تنزیہہ اور پاکی سے،

صفاتِ وحدانیت یعنی وہ صفتیں جو خدا کی یکتائی اور بیمثالی کو ظاہر کرتی ہیں، اور وہ یہ ہیں،

اَلْوَاحِدُ، ایک

اَلْاَحَدُ، ایک

اَلْوِتْرُ، طاق جس کا کوئی جوڑا نہیں،

صفاتِ وجودی یعنی وہ صفتیں جن سے اسکا وجود، بقا، دوام، ازلیت اور بے زوالی ظاہر ہوتی ہے،

اَلْمَوْجُوْدُ، وجود والا ہست،

اَلْحَیُّ ، ہمیشہ زندہ، غیر فانی،

اَلْقَدِیْرُ، وہ جس سے پہلے کوئی دوسرا موجود نہیں، جو ہمیشہ سے ہے،

اَلْقَیُّوْمُ ، جو اپنے سہارے تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے،

اَلْبَاقِیْ ، جس کو ہمیشہ بقا ہے،

اَلدَّائِمُ، ہمیشہ رہنے والا،

اَلْاَوَّلُ ، وہ پہلا جس کے پہلے کوئی نہیں،

اَلْاٰخِرُ ، وہ پچھلا جو سب کے فانی ہونے کے بعد بھی ہمیشہ باقی رہے گا،

اَلْمُقَدِّمُ، جو سب کے آگے سے ہے،

اَلْمُؤَخِّرُ ، جو سب سے پیچھے رہجائیگا،

اَلظَّاھِرُ ، جس کا وجود کھلا، اور نمایاں ہے، (یعنی جو اپنے کاموں اور قدرتوں کے لحاظ سے ظاہر ہے)

اَلْبَاطِنُ ، جو چھپا اور مخفی ہے، (یعنی جو اپنی ذات کے لحاظ سے پوشیدہ ہے)

علم

یعنی وہ صفتیں جو اس کے ہر چیز سے باخبر اور آگاہ ہونے کو ظاہر کرتی ہیں،

اَلْخَبِیْرُ، خبر رکھنے والا

اَلْعَلِیْمُ ، جاننے والا،

عَلَّامُ الْغُیُوْبِ، جو باتیں سب سے پوشیدہ ہیں ان کو جاننے والا،

عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ، دلوں کے چھپے ہوئے بھید کو جاننے والا،

اَلسَّمِیْعُ، سننے والا،

اَلْبَصِیْرُ، دیکھنے والا،

اَلْمُتَکَلِّمُ، بولنے والا، اپنے علم اور ارادہ کو ظاہر کرنے والا،

اَلْوَاجِدُ، پانے والا، جس کے علم سے کوئی چیز گم نہیں،

اَلشَّهِیْدُ، حاضر، جس کے سامنے سے کوئی چیز غائب نہیں،

اَلْحَسِیْبُ، حساب کرنے والا، یعنی جن چیزوں کا علم حساب کے ذریعہ سے حاصل کیا جاتا ہے،
یعنی وزن اور مقدار ان کا بھی جاننے والا،

اَلْمُحْصِیْ، گننے والا، یعنی جن چیزوں کا علم گن کر حاصل کیا جاتا ہے، یعنی اعداد انکا بھی جاننے والا۔

اَلْمُدَبِّرُ، تدبیر کرنے والا، انتظام کرنے والا،

اَلْحَکِیْمُ، حکمت والا، عقل والا، سب کاموں کو مصلحت سے کرنے والا،

اَلْمُرِیْدُ، ارادہ کرنے والا، مشیت والا،

اَلْقَرِیْبُ، نزدیک، جو اپنے علم کے لحاظ سے گویا سب کے پاس ہے،

قدرت

یعنی وہ صفتیں جن سے اسکی قدرت کی وسعت کا اظہار ہوتا ہے،

اَلْفَاتِحُ وَالْفَتَّاحُ، ہر مشکل کو کھولنے والا،

اَلْقَدِیْرُ وَالْقَادِرُ، قدرت والا،

اَلْمُقْتَدِرُ، اقتدار والا، جس کے سامنے کوئی چون چرا نہیں کر سکتا،

اَلْقَوِیُّ، زبردست، جس کے سامنے کسی کا بس نہیں چل سکتا،

اَلْمَتِیْنُ ، مضبوط جس میں کوئی کمزوری نہیں ،

اَلْجَامِعُ ، جمع کرنے والا، متفرق اور پراگندہ چیزوں کو اکٹھا کرنے والا ،

اَلْبَاعِثُ ، اٹھانے والا، مردوں کو قبروں سے اٹھانے والا، یا دنیا میں ہر واقعہ اور ہر حادثہ کا محرک اول ،

مَالِكَ الْمُلْكِ ، سلطنت کا مالک جس کے سامنے کسی کی کوئی ملکیت نہیں ،

اَلْبَدِیْعُ ، نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے والا ،

اَلْوَاسِعُ ، سمانے والا، جو ہر چیز کو سمائے ہوئے ہے ،

اَلْمُحِیْطُ ، احاطہ کرنے والا، جو ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے، کوئی اسکے احاطہ سے باہر نہیں ،

اَلْمُحْیِیْ وَالْمُمِیْتُ ، جلانے والا اور مارنے والا ،

اَلْقَابِضُ وَالْبَاسِطُ ، سمیٹنے والا اور پھیلانے والا ،

اَلْمُعِزُّ وَالْمُذِلُّ ، عزت دینے والا اور ذلت دینے والا ،

اَلْخَافِضُ وَالرَّافِعُ ، نیچا کرنے والا اور اونچا کرنے والا ،

اَلْمُعْطِیْ وَالْمَانِعُ ، دینے والا اور روک لینے والا

اَلنَّافِعُ وَالضَّارُّ ، نفع پہنچانے والا، اور نقصان پہنچانے والا یعنی نفع اور ضرر دونوں اسی کے ہاتھ میں ہیں ،

اَلْمُبْدِیُ وَالْمُعِیْدُ ، جو چیز پہلے سے موجود نہ ہو اس کو وجود میں لانے والا، اور جو ہو کر فنا کر دی گئی اس کو پھر دوبارہ وجود میں لانے والا ،

نکتہ :- اس قسم کی صفتیں جنمیں بظاہر قبح نظر آتا ہے، جیسے اَلضَّارُّ (نقصان پہنچانیوالا)

اَلْمُذِلُّ (ذلت دینے والا) اَلْخَافِضُ (پست کرنے والا) اَلْمَانِعُ (روکنے والا) وغیرہ، انکا تنہا استعمال چونکہ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے، اس لیے جب تک انکے ساتھ انکے مقابل کی صفت نہ بولی جائے ان کا استعمال جائز نہیں رکھا گیا ہے، یعنی خدا کو صرف اَلضَّارُّ، اَلْخَافِضُ، اَلْمَانِعُ اور اَلْمُذِلُّ کہنا درست نہیں، جبتک اسکے ساتھ اسکے دوسرے پہلو کو بھی نہ ملایا جائے، یعنی اَلضَّارُّ کیساتھ اَلنَّافِعُ، اَلْخَافِضُ کیساتھ اَلرَّافِعُ، اَلْمَانِعُ کیساتھ اَلْمُعْطِیْ اور اَلْمُذِلُّ کیساتھ اَلْمُعِزُّ، جیساکہ اوپر لکھا گیا ہے، قرآن پاک اور احادیث دونوں میں ان صفات کے استعمال میں رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے، کیونکہ تنہا نقصان پہنچانے والا، ذلت دینے والا، اور روکنے والا کوئی خوبی نہیں، بلکہ ایک طرح کی برائی ہے، ہاں نقصان نفع پہنچانے والا، عزت و ذلت دینے والا اور دینے والا اور روکنے والا، دونوں کو ملاکر کہا جائے تو جائز ہوگا، اس سے مقصود خدا کی قدرت کی وسعت ہے، اگر کوئی ایسا نفع پہنچانے والا ہے جس میں نقصان پہنچانے کی قدرت ہی نہیں، یا ایسا عزت دینے والا جسمیں ذلیل کرنے کی استطاعت ہی نہیں تو وہ اس عزت دینے اور نفع پہنچانے پر مجبور و مضطر ہوگا، اور اس کی قدرت کا یہ کمال نہ ہوگا، البتہ جو نقصان پہنچانے کی طاقت رکھنے کے باوجود نفع پہنچاتا، اور ذلت دے سکنے کے باوصف عزت دیتا ہے، اس کا کمال ہر شخص کو تسلیم کرنا پڑتا ہے،

تنزیہہ | یعنی وہ صفات جو اس کی بڑائی، کبریائی، پاکی اور نیکی اور ہر عیب و نقصان سے اس کی برأت کو ظاہر کرتی ہیں،

اَلْعَلِیُّ، مرتبہ والا

اَلْعَظِیْمُ، عظمت والا،

اَلْکَبِیْرُ، بڑا

اَلرَّفِیْعُ، بلند،

اَلْجَلِیْلُ، بزرگ،

اَلْکَرِیْمُ، شریف،

اَلْغَنِیُّ، بے نیاز،

اَلصَّادِقُ، سچا راست باز،

اَلْمَاجِدُ، عزت والا،

اَلْحَمِیْدُ، تعریف والا،

اَلْقُدُّوْسُ، پاک،

اَلْحَقُّ، سچا اور اصلی، یعنی یہ کہ اس کے سوا سب باطل ہیں

اَلْجَمِیْلُ، اچھا،

اَلْبَرُّ، نیک

اَلْعَدْلُ، عادل

سُبُّوْحٌ، ہر عیب سے پاک،

اَلصَّمَدُ، بزرگی کی ہر صفت میں کامل،

اَلرَّشِیْدُ، سیدھی راہ چلنے والا، نہ بہکنے والا،

ان تعلیمات کا اثر اخلاقِ انسانی پر

اللہ تعالیٰ کے اُن اسماء وصفات کا عقیدہ دین محمدیؐ میں محض نظری نہیں، بلکہ عملی حیثیت بھی رکھتا ہے، یعنی اسکے یہ محامد واوصاف اخلاق انسانی کا معیار ہیں، ان اوصاف کو چھوڑ کر جو اُس ذوالجلال کے لیے خاص ہیں، اور جو بندہ کی حیثیت اور طاقت سے زیادہ ہیں، بقیہ اوصاف ومحامد انسان کے لیے قابل نقل ہیں کہ وہ خدا کے محامد اوصاف سے دور کی نسبت رکھتے ہیں، اسلیے انسان پر فرض ہے کہ اگر وہ خدا سے نسبت پیدا کرنا چاہتا ہے تو اپنے اندر اسکے محامد واوصاف سے نسبت پیدا کرے، اور ان کو خوبیوں کا انتہائی معیار جان کر انکی نقل وپیروی کی خواہش کرے، محامد الٰہی گویا استاد اعلیٰ کی وصلی ہے جس کو دیکھکر شاگرد کو اپنے خط کی خوبی میں ترقی کرنی چاہیے، اس لیے انسان کو بھی اپنے حرف کے لکھنے (محامد الٰہی کی نقل اتارنے) میں ایک نظر اُس استاذ ازل کی وصلی پر ڈال لینی چاہیے تاکہ معلوم ہو کہ اس کی ذاتی مشق کہانتک اصلی وصلی کے مطابق ہے،

گذر چکا ہے کہ قرآن کا پہلا سبق یہ ہے کہ بحکم اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (بقرہ) آدم کا بیٹا زمین میں خدا کا خلیفہ اور نائب بنایا گیا ہے، خلیفہ اور نائب میں اصل کے اوصاف ومحامد کا پرتو جتنا زیادہ نمایاں ہوگا، اتنا ہی وہ اپنے اندر اس منصب کا استحقاق زیادہ ثابت کریگا، اور نیابت کے فرائض زیادہ بہتر ادا کرسکے گا، یہانتک کہ اس میں وہ جلوہ بھی نمایاں ہوگا جب وہ سرتاپا خدائی رنگ میں رنگ کر نکھر جائے گا،

صِبْغَۃَ اللّٰہِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبْغَۃً (بقرہ-۱۶)

خدا کا رنگ اور خدا کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے،

تمام اہلِ تفسیر متفق ہیں کہ اس "خدائی رنگ" سے مقصود خدا کا "دین فطرت" ہے۔

یہ حدیث اوپر گذر چکی ہے کہ انَّ اللّٰہَ خَلَقَ آدم علی صورتِہٖ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا"، اور ساتھ ہی اس کی تشریح بھی گذری ہے کہ اس "صورت" سے مقصود جسمانی نہیں بلکہ معنوی شکل وصورت ہے یعنی یہ کہ خدا نے انسان میں اپنے صفاتِ کاملہ کا عکس جلوہ گر کیا ہے، اور ان کے قبول کرنے کی صلاحیت عطا کی ہے، اور ان میں حد بشری تک ترقی کی استعداد بخشی ہے، اور انسان کو اخلاق وصفت میں ملاء اعلیٰ سے تشبیہ اور ہمشکلی کا جوہر مرحمت فرمایا ہے، اور یہی صوفیہ اور خاصانِ خدا کے اس مقولہ تخلّقوا باخلاقِ اللّٰہ خدا کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو" کا مطلب ہے، حدیث میں یہی مفہوم بروایت طبرانی ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ حسن الخلق خلق اللّٰہ الاعظم حسنِ خلق خدا تعالیٰ کا خلقِ عظیم ہے۔"[1]

[1] کنز العمال ج ۱۲ ص ۲ بروایت حضرت عمار بن یاسر۔

اللہ تعالیٰ کے صفاتِ کاملہ کی تین قسمیں اوپر بیان ہوئی ہیں، جلالی، کمالی اور تنزیہی صفات جلالی جو کبریائی، عظمت، شہنشاہی اور بڑائی کے اوصاف ہیں، اللہ تعالیٰ کے سوا مخلوقات انکی مستحق نہیں، اور نہ یہ اوصاف بندگی وعبودیت کے رتبہ کے مناسب ہیں، انکا انعکاس یہ ہے کہ بندوں میں انکے مقابل کے صفات پیدا ہوں یعنی عاجزی، تواضع، فروتنی اور خاکساری، اسی لیے ترفع، تکبر اور بڑائی کا اظہار منع ہے، اور اسی لیے آدم جس نے فروتنی اختیار کی اور عجز وقصور کا اعتراف کیا، وہ مغفرت کے خلعت سے سرفراز ہوا، اور شیطان جس نے ترفع اور غرور ظاہر کیا دائمی لعنت کا مستحق ٹھہرا،

اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکَافِرِیْنَ	اس نے (آدم کے سجدہ سے) انکار کیا اور
(بقرہ ۴-۴)	غرور کیا، اور کافروں میں سے ہوگیا،

قرآن پاک میں ہے کہ بڑائی اور کبریائی صرف خدا کے لیے ہے، اس کے سوا کوئی اور اسکا مستحق نہیں،

وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ — اور آسمانوں اور زمین میں اسی کیلیے بڑائی ہے،

صحیح مسلم[1] میں، ابو سعید خدریؓ اور ابو ہریرہؓ دو صحابیوں سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ عزت اس کا لباس اور کبریائی اسکی چادر ہے، (خدا فرماتا ہے) تو جو کوئی عزت و کبریائی میں میرا حریف بنے گا میں اسے سزا دونگا۔" دوسری جگہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "خدا کے نزدیک سب سے برا وہ ہے جو اپنا نام بادشاہوں کا بادشاہ اور شہنشاہ رکھتا ہے، خدا کے سوا کوئی بادشاہ اور مالک نہیں[2]۔" اَلْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ۔ (حشر-۳) اسی کی شان ہے، البتہ اللہ تعالیٰ اپنی عزت و جلال اور قوت و جبروت کا فیضان بعض بندوں اور امتوں پر نازل کرتا ہے اور وہ ان کو طاقت اور قوت اور بادشاہی عطا کرتا ہے، مگر اس نوازش کے بعد بھی نیک بندوں اور صالح امتوں کا فرض یہی ہے کہ میں اس وقت جب ان کے دست و بازو سے قوتِ حق اور ربانی جاہ و جلال کا اظہار ہو رہا ہو، انکی پیشانیاں فرط عبودیت سے اس کے آگے جھکی ہوں، اور سر نیاز اظہار بندگی کے لیے اسکے سامنے خم ہوں کہ عزت و جلال خاص خدا کی شان تھی، جس کا فیضان رسول پر ہوا، اور رسول کی وساطت سے مومنوں پر ہوا، یہ ترتیب خود قرآن میں ملحوظ رکھی گئی ہے،

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ — اور عزت خدا کے لیے ہے اور اس کے رسول کیلیے اور مومنوں کے لیے ہے۔ (منافقون-۱)

حاکم میں ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تین کپڑے ہیں، وہ اپنی عزت و جلال کا

---

[1] کتاب الادب باب الکبر جلد دوم صفحہ ۴۰۰ مصر [2] صحیح بخاری و مسلم کتاب الادب۔

ازار باندھتا ہے، اور اپنی رحمت کا جامہ پہنتا ہے اور اپنی کبریائی کی چادر اوڑھتا ہے، تو جو شخص اس عزت کے سوا جو خدا کی طرف سے اس کو عنایت ہوئی ہے، معزز بننا چاہتا ہے، تو وہی وہ شخص ہے جس کو قیامت میں کہا جائیگا (اسکا) مزہ چکھ تو معزز اور شریف بنتا تھا" (قرآن) اور جو انسانوں پر رحم کرتا ہے، خدا اس پر رحم کرتا ہے، کیونکہ اس نے وہ جامہ پہنا جس کا پہننا اسکو روا تھا، اور جو کبریائی کرتا ہے تو وہ خدا کی اس چادر کو اتارنا چاہتا ہے، جو خدا ہی کے لیے تھی"[1]

خدا کے صفاتِ کمالی میں سے وحدانیت اور بقائے ازلی و ابدی کے سوا کہ ان سے تمام مخلوقات اور ممکنات طبعاً محروم ہیں، بقیہ اوصاف کے فیضان سے انسان مشرف ہوتا ہے صفاتِ تنزیہی مثلاً قدرت، علم، سمع، بصر، کلام وغیرہ سے بھی مخلوقات تمامتر محروم ہیں، انکی تنزیہ یہی ہے کہ وہ خدا کے عصیان، نافرمانی اور گنہگاری کے عیب سے بری اور پاک ہوں،

خدا کے صفاتِ جمالی وہ اصلی اوصاف ہیں جن کے فیضان کا دروازہ ہر صاحبِ توفیق کے لیے حسب استعداد کھلا ہوا ہے، ان صفات کا سب سے بڑا مظہر عفو و درگذر ہے، عیسائیوں کی عام دعا میں ایک فقرہ ہے کہ "خداوندا! تو ہمارے گناہوں کو معاف کر جس طرح ہم اپنے قرضداروں کو معاف کرتے ہیں"، اسلام نے اس الٹی تشبیہ کو جائز نہیں رکھا ہے، اس کے ہاں یہ ہے کہ "اے انسان تو اپنے مجرموں کو معاف کر کہ خدا تیرے گناہوں کو معاف کرے"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو کوئی اپنے بھائی کے گناہ پر پردہ ڈالے گا، خدا اس کے گناہوں پر پردہ ڈالے گا"[2]۔ قرآن کہتا ہے کہ "تم دوسروں کو معاف کرو کہ خدا تم کو معاف کرتا ہے"۔

---

[1] کنز العمال جلد ۲ ص ۹، ۱، و مستدرک حاکم [2] صحیح مسلم کتاب البر و الصلۃ،

اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ	اگر تم کوئی نیکی دکھا کر یا چھپا کر کر دیا کسی
تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ	کی برائی کو معاف کرو، تو اللہ (بھی) معاف
عَفُوًّا قَدِيْرًا (نساء۔۳۱)	کرنے والا، قدرت والا ہے،

ایک دفعہ عہد نبوت میں بارگاہِ عدالت قائم تھی، ایک مجرم کو سزا دیجا رہی تھی، سزا کا منظر دیکھ کر حضورؐ کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو رہا تھا، اداشناسوں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ آمام تک معاملہ پہنچنے سے پہلے ہی اپنے بھائیوں کو معاف کر دیا کرو، خدا معاف کرتا ہے، اور عفو و درگذر کو پسند کرتا ہے، تو تم بھی معاف اور درگذر کیا کرو، کیا تمھیں یہ پسند نہیں کہ خدا تمھیں بھی معاف کرے، وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے،[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ صحابہ کے مجمع میں فرما رہے تھے کہ "جس کے دل میں غرور کا ایک ذرہ بھی ہوگا، وہ بہشت میں داخل نہ ہوگا"، ایک صحابی نے عرض کی یا رسول اللہؐ! انسان چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں، اسکا جوتا اچھا ہو، کیا یہ بھی غرور ہے، فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ عزوجل جميل يحب	اللہ تعالیٰ اچھا ہے، جمال والا ہے،
الجمال[2]	اچھائی اور جمال کو پسند کرتا ہے،

یہ غرور نہیں، غرور حق کو پامال کرنا اور انسانوں کو دبانا ہے"۔ یہی روایت حدیث کی دوسری کتابوں میں ان الفاظ کے ساتھ ہے، "خدا جمال والا ہے، وہ جمال کو پسند کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے بندہ پر اسکی نعمت کا اثر ظاہر ہو[3]"۔ یہ روایت بھی ہے، "خدا جمیل ہے، جمال کو پسند کرتا ہے، وہ سخی ہے۔

---

[1] مستدرک للحاکم جلد ۴ ص ۳۸۲، کتاب الحدود [2] صحیح مسلم کتاب الایمان و ترمذی باب الکبر [3] کنز العمال کتاب الزینۃ بحوالہ شعب الایمان بیہقی۔

سخاوت کو پسند کرتا ہے، وہ صاف ستھرا ہے، صفائی اور ستھرے پن کو پسند کرتا ہے[1]۔" روایت کے یہ الفاظ بھی آئے ہیں، "وہ جمیل ہے، جمال کو پسند کرتا ہے، اخلاق عالیہ سے محبت اور بداخلاقیوں سے نفرت رکھتا ہے[2]۔" ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہؓ کو نصیحت فرماتے ہیں "اے عائشہ! خدا نرمی والا ہے، وہ ہر بات میں نرمی کو پسند کرتا ہے[3]"، ایک مرتبہ آپ نے خطبہ میں ارشاد فرمایا "لوگو! خدا پاک ہے اور پاک ہی کو قبول کرتا ہے[4]"، عام مسلمانوں کو مخاطب کرکے فرمایا "اے قرآن کے ماننے والو! وتر نماز پڑھا کرو کہ خدا یکتا (وتر) ہے، وہ یکتا (وتر) کو پسند کرتا ہے[5]۔"

رحمت و شفقت اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے، مگر خدا کی رحمت و شفقت کے وہی مستحق ہیں جو دوسروں پر رحمت و شفقت کرتے ہیں، آپ نے فرمایا "رحم کرنے والوں پر وہ رحم کرنے والا بھی رحم کرتا ہے، لوگو! تم زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔" (ابوداؤد باب فی الرحمۃ) رشتہ داری اور قرابت کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، تمام رشتہ داریاں اور قرابتیں رحم کے تعلق پر قائم ہیں، آپ نے فرمایا ہے کہ رحم کی جڑ رحمان سے ہے، خدا فرماتا ہے کہ اے رحم! جو تجھکو قطع رحم کریگا میں اس کو قطع کروں گا، جو تجھکو ملائیگا، اس کو میں بھی ملاؤں گا[6]، ترمذی میں یہی تعلیم ان الفاظ میں ہے "میں خدا ہوں، میں رحمان ہوں، میں نے رحم پیدا کیا ہے، اور اپنے نام (رحمان) سے اس کا نام (رحم) مشتق کیا ہے، تو جو اسکو ملائیگا میں اس کو ملاؤں گا، جو اس کو قطع کریگا میں اسکو قطع کرونگا[7]۔" پھر فرمایا "جو انسان پر رحم نہیں کرتا، خدا اس پر رحم نہیں کرتا[8]"، بخاری میں اس روایت کے یہ الفاظ ہیں "جو رحم نہیں کرتا، اس پر

کنز العمال کتاب الزینۃ بحوالہ کامل لابن عدی [2] ایضاً بحوالہ معجم اوسط طبرانی [3] صحیح مسلم، ابوداؤد، حاکم، نسائی ابن ماجہ بیہقی فی الآداب [4] صحیح مسلم کتاب الصدقات و ترمذی تفسیر سورہ بقرہ [5] ابوداؤد باب استحباب الوتر [6] صحیح بخاری باب صفۃ الرحم [7] ابواب البر والصلۃ، [8] ترمذی باب مذکور۔

رحم نہیں کیا جاتا۔"[1] آپنے فرمایا "خدا نے رحم کے سو حصے کیے، ۹۹ حصے اپنے پاس رکھے اور ایک حصہ زمین والوں کو عنایت کیا، اسی کا یہ اثر ہے کہ باہم لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رحم و شفقت سے پیش آتے ہیں، یہانتک کہ گھوڑی بھی اپنے بچہ کیلیے اس خوف سے پاؤں اٹھا لیتی ہے کہ اسکو صدمہ نہ پہنچے۔"[2]

بخل خدا کی صفت نہیں، مگر آپنے فرمایا "تم اپنی ہتھیلی کے منہ نہ بند کرو، ورنہ تم پر بھی ہتھیلی کا منہ بند کیا جائیگا۔"[3] یہ نصیحت بھی فرمائی کہ جو بندہ دوسرے بندہ کی پردہ پوشی کریگا، قیامت میں اسکی پردہ پوشی خدا کریگا۔[4] "یہ بھی تعلیم دی گئی ہے کہ جب تک تم اپنے بھائی کی مدد میں ہو خدا تمھاری مدد میں ہے۔"[5]

ایک اور موقع پر آپنے کہ خدا سے بڑھ کر کوئی غیرت مند نہیں، اسی لیے اس نے فحش باتوں کو حرام کیا ہے۔"[6] اسی کی تفسیر دوسری حدیث میں ہے، آپنے فرمایا کہ خدا بھی غیرت والا ہے اور مومن بھی غیرت والا ہے، اور خدا کی غیرت یہ ہے کہ اس نے اپنے مومن پر جس بات کو حرام کیا ہے اگر کوئی اسکا ارتکاب کرے تو وہ اس پر خفا ہوتا ہے۔"[7]

اللہ تعالیٰ ظلم سے پاک ہے۔

وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (آل عمران ۱۹) اور بیشک خدا بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

اس لیے اس کے بندوں کا فرض ہے کہ وہ بھی آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کریں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی زبان سے اسکی اس عملی تعلیم کو ان الفاظ میں ادا فرمایا،

یاعبادی انی حرمت الظلم علیٰ — اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام

---

[1] جامع بخاری باب رحمۃ الولد [2] ایضاً [3] صحیح ترمذی ابواب البر والصلۃ [4] مسلم کتاب البر والصلہ باب بشارۃ من ستر اللہ تعالیٰ علیہ فی الدنیا بان یستر علیہ فی الآخرۃ [5] ابوداؤد کتاب الادب باب فی المعونۃ للمسلم [6] صحیح بخاری کتاب التوحید جلد دوم ص ۱۱۰۳ [7] جامع ترمذی باب ما جاء فی الغیرۃ من ابواب النکاح۔

نفسی وجعلته بینکم محرماً — کیا ہی، اور اسکو تمھارے درمیان بھی حرام

فلا تظالموا[1] — کیا ہی، تو تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنا۔

پاکیزگی اور لطافت خدا کی صفتیں ہیں، اس لیے خدا کے ہر بندہ کو بھی پاک وصاف رہنا چاہیے، آپؐ نے فرمایا،

اِنّ اللہ طیب یحب الطیب — خدا پاکیزہ ہی، پاکیزگی کو پسند کرتا ہی اور پاک وصاف

ونظیف یحب النظافۃ فتنظفو — ہی، پاکی اور صفائی کو پسند کرتا ہی تو تم پاک وصاف

ولا تشبھوا الیھود[2] — رہا کرو، یہودیوں کی طرح گندے نہ بنو۔

یہ توحید کا ایک رخ تھا، اب اس کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ کے قابل ہی،

وہ قومیں جو توحید سے آشنا نہ تھیں، انھوں نے انسانیت کا مرتبہ بھی نہیں پہچانا تھا، وہ انسان کو فطرت کے ہر مظہر کا غلام سمجھتی تھیں، یہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم توحید ہی تھی جس نے خدا کے سوا ہر شے کا خوف انسانوں کے دلوں سے نکالدیا، سورج سے لیکر زمین کے دریا اور تالاب تک ہر چیز آقا ہونے کے بجائے انسانوں کی غلام بنکر انکے سامنے آئی، بادشاہوں کے جلال وجبروت کا طلسم ٹوٹ گیا، اور وہ بابل ومصر، ہند وایران کے خدا اور ربکم الاعلیٰ ہونے کے بجائے، انسانوں کے خادم، راعی اور چوکیدار کی صورت میں نظر آئے جن کا عزل ونصب دیوتاؤں اور فرشتوں کے ہاتھ میں نہ تھا، بلکہ خود انسانوں کے ہاتھ میں تھا۔

تمام انسانی برادری جس کو دیوتاؤں کی حکومتوں نے اونچے نیچے، بلند وپست، شریف وذلیل

---

[1] صحیح مسلم کتاب البر والصلہ ومسند ابن حنبل جلد ۸ ص ۱۶ مصر، وادب الفرد امام بخاری باب الظلم ص ۹۵ [2] ترمذی باب فی النظافۃ ص ۴۵۶

مختلف طبقوں اور ذاتوں میں منقسم کر دیا تھا، اور جنہیں سے کچھ کی پیدائش برہمن کے منہ، کچھ کی اسکے ہاتھ اور کچھ کی اسکے پاؤں سے تسلیم کیجاتی تھی، اس عقیدے کی وجہ سے ایسی مختلف جنسوں میں بٹ گئی تھی جن کو کسی طرح متفق نہیں کر سکتے تھے، اور اس طرح مساوات انسانی کی دولت دنیا سے گم ہو چکی تھی، اور زمین قوموں اور ذاتوں کے ظلم و جبر اور غرور و فخر کا دنگل بنگئی تھی، توحید نے آکر اس اونچائی نیچائی، بلندی و پستی اور نشیب و فراز کو برابر کیا، سب انسان خدا کے بندے، سب اسکے سامنے برابر، سب باہم بھائی بھائی اور سب حقوق کے لحاظ سے یکساں قرار پائے، ان تعلیمات نے دنیا کی معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی اصلاحات میں جو کام کیا، اس کے نتائج تاریخ کے صفحوں میں ثبت ہیں،

بالآخر اس اصول کی صداقت کو انھوں نے بھی تسلیم کر لیا، جو حقیقی توحید سے ناآشنا ہیں اور اسی لیے وہ مساوات انسانی کے حقیقی کوچہ سے بھی ابتک نابلد ہیں، انتہا یہ ہے کہ خدا کے گھر میں جاکر بھی تفاوت درجہ کا خیال ان کے دل سے دور نہیں ہوتا، اور وہ دولت و فقر اور رنگ و قومیت کے امتیازات کو خدا کے سامنے سرنگوں ہو کر بھی نہیں بھولتے، مسلمانوں کو تیرہ سو برس سے مساوات کی نعمت اسی توحید کامل کی بدولت حاصل ہے، اور وہ ہر قسم کے مصنوعی امتیازات سے پاک ہیں، اسلام کی نظر میں سب ایک خدا کے بندے ہیں، اور سب یکساں اس کے سامنے سرافگندہ ہیں، دولت و فقر، رنگ و روپ اور نسل و قومیت کا کوئی امتیاز انکو منقسم نہیں کرتا، اگر کوئی امتیاز ہے تو صرف تقویٰ اور خدا کی فرمانبرداری کا ہے،

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (حجرات - ۲)

تم میں خدا کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے تقویٰ کرتا ہے۔

خدا کا ڈر اور پیار

اس سلسلہ میں ایک اور اہم مسئلہ خدا سے ڈرنے اور اس سے محبت کرنے کا ہے،

عام طور سے مخالفوں نے یہ سمجھا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس خدا کی تعلیم دی ہے وہ فقط قہار، جبار اور مہیب شہنشاہ مطلق ہے، جسکی ہیبت و جلال سے تمام بندوں کو صرف ڈرتے، کانپتے رہنا چاہیے، اس کے گوشۂ چشم میں لطف و عنایت کا گذر نہیں، محبت و پیار کا نذرانہ اسکے دربار میں قبول نہیں ہوتا، وہ اپنے کمزور بندوں پر نہ خود محبت کی نظر رکھتا ہے اور نہ بندوں سے اپنی محبت کا تقاضا کرتا ہے، لیکن درحقیقت یہ تعلیم محمدی کی بالکل غلط تصویر ہے، اللہ تعالیٰ کے جو اسماء و صفات اوپر گذر چکے ہیں، ان میں سے ایک ایک پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ اس کے چند پُرجلال ناموں کو چھوڑ کر جو اسکی قدرت تامہ اور مالکیتِ عامہ کی حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں، بقیہ تمام نام صرف محبت اور پیار اور لطف و کرم، رحمت اور مہر کی تجلی گاہ ہیں، مخالفوں کو اس حقیقت کے سمجھنے میں دو وجہوں سے مغالطہ ہوا،

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے خوف اور خشیت کی بھی انسانوں کو دعوت دی،

۲۔ دوسرے مذہبوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کے اظہار کی جو اصطلاحیں مقرر کی تھیں، آپ نے شدت کے ساتھ ان کی مخالفت کی اور ان کو شرک قرار دیا،

محبت کے ساتھ خوف و خشیت کی تعلیم

یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم میں خدا کی محبت اور پیار کے ساتھ اس کے خوف و خشیت کو بھی جگہ دی ہے، غور کرو انسانوں میں تمام کاموں کے محرک دو ہی جذبے ہوتے ہیں، خوف اور محبت، یہ دونوں جذبے الگ الگ بھی پائے جاتے ہیں، اور ایک ساتھ یا آگے پیچھے بھی، ان دونوں جذبات کے لوازم بھی الگ الگ ہوتے ہیں، ادعائے محبت کا نتیجہ، ناز تبختر اور کبھی گستاخی اور کبھی اپنے مہربان و محبوب پر غایتِ اعتماد کی بنا پر نافرمانی بھی ہے اور ظاہر ہے کہ جذبۂ محبت کے ان لوازم اور اثرات کا افساد صرف خوف کے جذبہ سے ہو سکتا ہے، اس لیے خالق و مخلوق

کے درمیانی رابطہ کی تکمیل نہ تنہا خوف سے ہوسکتی ہے اور نہ تنہا محبت سے، بلکہ ان دونوں کے اشتراک، امتزاج اور اعتدال سے یہ مقصد حاصل ہوسکتا ہے، اور یہی نبوتِ محمدیؐ کی تعلیم ہے،

اسلام سے پہلے جو آسمانی مذاہب موجود تھے، انکے اندر اس مسئلہ میں بھی افراط و تفریط پیدا ہوگئی تھی، اور صراط مستقیم سے وہ تمام تر ہٹ گئے تھے، یہودی مذہب کی بنا سراسر خوف و خشیت اور سخت گیری پر تھی، اس کا خدا فوجوں کا سپہ سالار[1] اور باپ کا بدلہ پشتہا پشت تک بیٹوں سے لینے والا تھا،[2] حالانکہ یہودیت کے صحیفوں میں خدا کے رحم و کرم اور محبت و شفقت کا ذکر کہیں کہیں موجود ہے،[3] اس کے برعکس عیسائیت زیادہ تر خدا کے رحم و کرم اور محبت و شفقت کے تذکروں سے معمور تھی، گو ایسا نہیں ہے کہ اس میں خدا کے خوف و خشیت کی مطلق تعلیم نہ ہو، بلکہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنے کی تاکید ہے،[4] مگر دونوں مذہبوں کے پیروؤں نے ان دو متقابل تعلیموں کے درمیان اعتدال ملحوظ نہیں رکھا تھا، اسلام نے اسی نقطۂ اعتدال کو پیش نظر رکھا ہے، وہ نہ تو خدا کو محض جبار، قہار، رب الافواج اور صرف بنی اسرائیل یا بنی اسمٰعیل کا خدا مانتا ہے، نہ اس کو مجسم انسان، انسانوں کا باپ یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا باپ سمجھتا ہے، اور نہ تنہا رحم و کرم اور محبت و شفقت کے صفات سے اسکو متصف کرتا ہے، بلکہ وہ خدا کی نسبت یقین رکھتا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر قاہر بھی ہے، اور رحمٰن و کریم بھی، وہ منتقم اور شدید العقاب بھی ہے اور غفور و رحیم بھی، وہ اپنے بندوں پر سزا بھی دیتا ہے اور پیار بھی کرتا ہے، خفا بھی ہوتا ہے اور نوازتا بھی ہے، اس سے ڈرنا بھی چاہیے اور اس سے محبت بھی کرنی چاہیے،

---

[1] یرمیاہ ۳۲، ۱۴، ۱۵ وغیرہ [2] خروج ۲۰، ۵، ۳۴، ۷ و استثناء ۴، ۳۴ و ۶، ۱۵ وغیرہ [3] خروج ۳۴، ۶، ۷ و زبور ۸۶، ۱۵ و ۱۰۳، ۸ وغیرہ میں خدا کے پیار اور رحم و کرم کا ذکر ہے [4] لوقا کی انجیل ۱۲، ۵ اول پطرس ۲، ۷، دوم قرنتیون ۷، ۱ افسیون ۵، ۲۱۔ الغرض خدا سے ڈرنے کی تعلیم عیسائیت میں بھی دی گئی ہے۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً	(لوگو!) اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے
اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ، وَلَا	پکارا کرو، وہ حد سے بڑھ جانیوالوں کو پیار
تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا	نہیں کرتا، اور زمین کی درستی کے بعد اسمیں فساد
وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ	نہ پھیلاؤ اور اسکو (اسکے عذاب سے) ڈرتے ہوئے
قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ	اور (اسکے فضل وکرم کی) لو لگاتے ہوئے پکارا کرو
(اعراف - ۷)	بیشک خدا کی رحمت اچھے کام کرنیوالوں کے قریب رہتی ہے

چند نیک بندوں کی مدح میں فرمایا،

اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ	وہ نیکی کے کاموں میں جلدی کرتے تھے اور
وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا (انبیاء)	ہمکو امید اور ڈر کے ساتھ پکارتے تھے،

اس سے زیادہ پُرلطف بات یہ ہے کہ اسلام خدا سے لوگوں کو ڈراتا تو ہے، مگر اس کو جبار وقہار کہکر نہیں بلکہ مہربان اور رحیم کہکر، چنانچہ خدا کے سعید بندوں کی صفت یہ ہے کہ

وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ (یٰس-۱۰)	اور رحم کرنے والے سے بن دیکھے ڈرا،
مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ (ق-۳)	جو رحم کرنے والے سے بن دیکھے ڈرا۔

نہ صرف انسان بلکہ تمام کائنات کی زبان اس مہربان کے جلال کے سامنے گنگ ہے،

وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ	اور رحم والے کے ادب سے تمام آوازیں پست ہوگئیں

دنیا میں جتنے بھی پیغمبر آئے وہ دو قسم کے تھے، ایک وہ جن کی آنکھوں کے سامنے صرف خدا کے جلال وکبریائی کا جلوہ تھا، اسلیے وہ صرف خدا کے خوف وخشیت کی تعلیم دیتے تھے، مثلاً حضرت

نوح اور حضرت موسیٰؑ، دوسرے وہ جو محبتِ الٰہی میں سرشار تھے اور وہ لوگوں کو اسی مخمورۂ عشق کی طرف بلاتے تھے، مثلاً حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ،

لیکن پیغمبروں میں ایک ایسی ہستی بھی آئی جو ان دونوں صفتوں کی برزخ کبریٰ، جلال و جمال دونوں کا مظہر اور پیار اور رعب دونوں کی جامع تھی، یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ایک طرف آپ کی آنکھیں خوفِ الٰہی سے اشک بار رہتی تھیں اور دوسری طرف آپ کا دل خدا کی محبت اور رحم وکرم کے سرور سے سرشار رہتا تھا کبھی ایسا ہوتا کہ ایک ہی وقت میں یہ دونوں منظر آپ کے چہرۂ انور پر لوگوں کو نظر آجاتے تھے، چنانچہ جب راتوں کو آپ شوق و ولولہ کے عالم میں نماز کے لیے کھڑے ہوتے، قرآن مجید کی لمبی لمبی سورتیں زبانِ مبارک پر ہوتیں، اور ہر معنی کی آیتیں گذرتی جاتیں تو جب کوئی خوف و خشیت کی آیت آتی، آپ پناہ مانگتے، اور جب کوئی مہر و محبت اور رحم و بشارت کی آیت ہوتی تو اس کے حصول کی دعا کرتے تھے،[1]

الغرض اسلام کا نصب العین یہ ہے کہ وہ خوف اور محبت کے کناروں سے ہٹا کر جہاں سے ہر وقت نیچے گرنے کا خطرہ ہے، خوف و خشیت اور رحم و محبت کے بیچ کی شاہراہ میں انسانوں کو کھڑا کرے، اسی لیے کہا گیا ہے کہ "الایمان بین الخوف والرجاء" ایمان کامل خوف اور امید کے درمیان ہے" کہ تنہا خوف لوگوں کو خدا کے رحم و کرم سے ناامید اور محض رحم و کرم پر بھروسہ انکو خود سر اور گستاخ بنا دیتا ہے، جیسا کہ اس عملی دنیا کے روزانہ کے کاروبار میں نظر آتا ہے، اور مذہبی حیثیت سے اس کے نتائج کا مشاہدہ عملاً یہودیوں اور عیسائیوں میں کیا جا سکتا ہے، اسی لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۹۳،

تعلیم میں ان دونوں متضاد کیفیتوں کو ایمان اور عقیدہ کے رو سے برابر کا درجہ دیا لیکن ساتھ ہی عاجز و درماندہ انسانوں کو یہ بھی بشارت سنائی کہ خدا کی رحمت کا دائرہ اسکے غضب کے دائرہ سے زیادہ وسیع ہے، فرمایا

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ (اعراف - ۱۹) اور میری رحمت ہر چیز کو سمائے ہوئے ہے،

اور اس کی تفسیر خود صاحبِ قرآن علیہ السلام نے ان الفاظ میں کی،

سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ غَضَبِیْ (بخاری) میرے غضب سے میری رحمت آگے بڑھ گئی

عیسائیوں نے خدا سے اپنا رشتہ جوڑا، اور اپنے کو فرزند الٰہی کا لقب دیا، بعض یہودی فرقوں نے بنی اسرائیل کو خدا کا خانوادہ اور محبوب ٹھہرایا، اور حضرت عیسیٰؑ کے جوڑ پر حضرت عزیرؑ کو فرزند الٰہی کا رتبہ دیا، لیکن اسلام یہ شرف کسی مخصوص خاندان یا خاص قوم کو عطا نہیں کرتا، بلکہ وہ تمام انسانوں کو بندگی اور اطاعت کی ایک سطح پر لاکر کھڑا کرتا ہے، مسلمانوں کے مقابلہ میں یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کو دعوی تھا

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (مائدہ ۳) ہم خدا کے بیٹے اور چہیتے ہیں،

قرآن مجید نے اس کے جواب میں کہا،

قُلْ فَلِمَ یُعَذِّبُکُمْ بِذُنُوْبِکُمْ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ط (مائدہ ۳ - ۵) کہدو کہ اگر ایسا ہے تو خدا تمہارے گناہوں کے بدلہ تمکو عذاب کیوں دیتا ہے، (اسلیے تمہارا دعوی صحیح نہیں) بلکہ تم بھی انہی انسانوں میں سے ہو

دوسری جگہ قرآن نے تنہا یہودیوں کے جواب میں کہا،

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّکُمْ اَوْلِیَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا (اے وہ جو یہودی ہو اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو کہ تمام انسانوں کو چھوڑ کر تم ہی خدا کے خاص چہیتے

اَلْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ (جمعہ) ہو تو موت (یعنی خدا کی ملاقات) کی تمنا کیوں نہیں کرتے،

اسلام رحمتِ الٰہی کے دائرہ کو کسی خاندان اور قوم تک محدود نہیں رکھتا بلکہ وہ اسکی وسعت میں انسانوں کی ہر برادری کو داخل کرتا ہے، ایک شخص نے مسجد نبویؐ میں آکر دعا کی کہ "خدایا مجھکو اور محمدؐ کو مغفرت عطا کر"، آپ نے فرمایا "خدا کی وسیع رحمت کو تم نے تنگ کر دیا"[1] ایک اور اعرابی نے مسجد میں دعا مانگی کہ خدایا! مجھ پر اور محمدؐ پر رحمت بھیج، اور ہماری رحمت میں کسی کو شریک نہ کر"، آپ نے صحابہ کی طرف خطاب کر کے فرمایا "یہ زیادہ گمراہ ہے یا اس کا اونٹ"[2]

محبت کے جسمانی اصطلاحات کی ممانعت

اس مسئلہ میں تعلیم محمدی کے متعلق غلط فہمی کا دوسرا سبب جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے یہ ہے کہ بعض مذاہب نے خدا کی محبت و کرم کی تعبیر کیلیے جو مادی اور جسمانی اصطلاحیں قائم کی تھیں، اسلام نے انکی مخالفت کی، اور ان کو شرک قرار دیا، اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ اسلام کا خدا رحم و کرم اور محبت اور پیار کے اوصاف سے معرا ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان دوسرے غیر مادی خیالات کی طرح خدا اور بندہ کے باہمی مہر و محبت کے جذبات کو بھی اپنی ہی انسانی بول چال میں ادا کر سکتا ہے، محبت اور پیار کے یہ جذبات انسانوں کے اندر باہمی مادی اور جسمانی رشتوں کے ذریعہ سے نمایاں ہوتے ہیں، اس بنا پر بعض مذاہب نے اس طریقۂ ادا کو خالق و مخلوق کے ربط و تعلق کے اظہار کیلیے بھی بہترین اسلوب سمجھا، چنانچہ کسی نے خالق اور مخلوق کے درمیان باپ اور بیٹے کا تعلق پیدا کیا، جیسا کہ عیسائیوں میں ہے، دوسرے نے ماں کی محبت کا بڑا درجہ سمجھا، اسلیے اس تعلق کو ماں اور بیٹے کی اصطلاح سے واضح کیا اور دیہیاں انسانوں کی ماتائیں بنیں جیسا

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب [2] ابو داؤد کتاب الادب،

کہ ہندوؤں کا عام مذہبی تخیل ہے، خاص ہندوستان کی خاک میں زن وشو کی باہمی محبت کا امتیازی خاصہ ہے جسکی نظیر دوسرے ملکوں میں نہیں مل سکتی ہے، اسکی نگاہ میں محبت کا اس سے زیادہ پُراثر منظر اور ناقابلِ شکست پیمان کوئی دوسرا نہیں، اسلیے یہاں کے بعض فرقوں میں خالق ومخلوق کی باہمی محبت کے تعلق کو زن وشو کی اصطلاح سے ادا کیا گیا، سداسہاگ فقراء اس تخیل کی مضحکہ انگیز تصویر ہیں،

یہ تمام فرقے جنھوں نے خدا اور بندہ کے تعلق کو جسمانی اور مادی رشتوں کے ذریعہ ادا کرنا چاہا راہ سے بے راہ ہوگئے اور لفظ کے ظاہری استعمال نے نہ صرف ان کے عوام بلکہ انکے خواص تک کو گمراہ کر دیا، جو لفظ کی اصلی روح کو چھوڑ کر جسمانیت کے ظاہری مغالطوں میں گرفتار ہوگئے، عیسائیوں نے واقعی حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا سمجھ لیا، ہندوستان کے بیٹوں نے ماتاؤں کی پوجا شروع کر دی، سداسہاگ فقیروں نے چوڑیاں اور ساڑیاں پہن لیں، اور خدائے قادر سے شوخیاں کرنے لگے اسی لیے اسلام نے جو توحید خالص کا مبلغ تھا، ان جسمانی اصطلاحات کی سخت مخالفت کی، اور خدا کیلیے ان الفاظ کا استعمال ضلالت اور گمراہی قرار دیا، لیکن وہ ان الفاظ کے اصلی معنی اور منشار کا اور اس مجاز کے پردہ میں جو حقیقت مستور ہے، اسکا انکار نہیں کرتا بلکہ وہ ان جسمانی معنوں کو خالق ومخلوق اور عبد ومعبود کے ربط وتعلق کے اظہار کیلیے ناکافی اور غیر مکمل سمجھتا ہے، اور وہ ان سے زیادہ وسیع وکامل معنی کا طالب ہے،

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا (بقرہ ۲۰۰)

تم خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو،

دیکھو کہ باپ کی طرح کی محبت کو وہ اپنے پروردگار کی محبت کیلیے ناکافی قرار دیتا ہے اور عبد ومعبود کے درمیان محبت کے رشتہ کو اس سے کہیں زیادہ مضبوط واستوار ظاہر کرنا چاہتا ہے،

الغرض رحم ومحبت کے اس جسمانی طریقۂ تعبیر کی مخالفت سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسلام سرے سے خالق ومخلوق اور عبد ومعبود کے درمیان محبت وپیار کے جذبات سے خالی ہے، اتنا کون نہیں سمجھتا کہ مذہب کی تعلیمات انسانوں کی بولی میں اتری ہیں، انسانوں کے تمام خیالات اور تصورات اسی مادی اور جسمانی ماحول کا عکس ہیں، اس لیے انکے ذہن میں کوئی غیر مادی اور غیر جسمانی تصور کسی مادی اور جسمانی تصور کی وساطت کے بغیر براہ راست پیدا نہیں ہوسکتا، اور نہ اسکے لیے انکے لغت میں کوئی ایسا لفظ مل سکتا ہے جو کسی غیر مادی اور غیر جسمانی مفہوم کو اسقدر منزہ اور بلند طریقہ سے بیان کرے جسمیں مادیت اور جسمانیت کا مطلق شائبہ نہ ہو، انسان ان دیکھی چیزوں کا تصور صرف دیکھی ہوئی چیزوں کی تشبیہ سے پیدا کرتا ہے اور اسطرح ان ان دیکھی چیزوں کا ایک دھندلا سا عکس ذہن کے آئینہ میں آجاتا ہے، اس ان دیکھی ہستی کی ذات وصفات کے متعلق جسکو خدا کہتے ہیں، ہر مذہب میں ایک تخیل ہے، غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ تخیل بھی اس مذہب کے پیروؤں کے گرد وپیش کی اشیاء سے ماخوذ ہے، لیکن ایک بلند تر اور کامل تر مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ اس تخیل کو مادیت، جسمانیت اور انسانیت کی آلایشوں سے اس حد تک پاک ومنزہ کردے جہانتک بنی نوع انسان کیلئے ممکن ہے، خدا کے متعلق باپ ماں اور شوہر کا تخیل اس درجہ مادی، جسمانی اور انسانی ہے کہ اس تخیل کے معتقد کیلیے ناممکن ہے کہ وہ خالص توحید کے صراط مستقیم پر قائم رہ سکے، اسی لیے نبوت محمدیؐ نے ان مادی تعلقات اور جسمانی رشتوں کے ظاہر کرنے والے الفاظ کو خالق ومخلوق کے اظہار ربط وتعلق کے باب میں یکقلم ترک کردیا بلکہ ان کا استعمال بھی شرک قرار دیا، تاہم چونکہ روحانی حقایق کا اظہار بھی انسانوں ہی کی مادی بولی میں کرنا تھا، اسلیے جسمانی ومادی رشتہ کے بجائے جسکو دوسرے مذاہب نے منتخب کیا تھا، اس رشتہ کے محض جذبات

احساسات اور عواطف کو خالق و مخلوق کے تعلقاتِ باہمی کے اظہار کے لیے اسلام نے مستعار لیا،
اس طرح خالق و مخلوق کے درمیان کوئی جسمانی رشتہ قائم کیے بغیر اس نے ربط و تعلق کا اظہار کیا، اور
استعمالات کی لفظی غلطی سے جو گمراہیاں پہلے پیش آچکی تھیں، ان سے انسانوں کو محفوظ رکھا،

ہر زبان میں اس خالق ہستی کی ذات کی تعبیر کے لیے کچھ نہ کچھ الفاظ ہیں جنکو کسی خاص تخیل اور نصب العین کی بنا پر مختلف قوموں نے اختیار کیا ہے، اور گو انکی حیثیت اب علم اور نام کی ہے، تاہم وہ در حقیقت پہلے پہل کسی نہ کسی وصف کو پیش نظر رکھکر استعمال کیے گئے تھے، ہر قوم نے اس علم اور نام کے لیے اسی وصف کو پسند کیا ہے، جو اسکے نزدیک اس خالق ہستی کی سب سے بڑی اور سب سے ممتاز صفت ہو سکتی تھی،

اسلام نے خالق کے لیے جو نام اور عَلَم اختیار کیا ہے، وہ لفظ اللہ ہے، اللہ کا لفظ اصل میں کس لفظ سے نکلا ہے، اس میں اہل لغت کا یقیناً اختلاف ہے، مگر ایک گروہ کثیر کا یہ خیال ہے کہ یہ وَلَہٌ سے نکلا ہے اور وَلَہٌ کے اصل معنی عربی میں اس "غم" اور "محبت" اور "تعلق خاطر" کے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے، اسی سے بعد میں مطلق عشق و محبت کے معنی پیدا ہو گئے، اور اسی سے ہماری زبان میں لفظ وَالِہ (شیدا) مستعمل ہے، اس لیے اللہ کے معنی "محبوب اور پیارے" کے ہیں، جن کے عشق و محبت میں نہ صرف انسان بلکہ ساری کائنات کے دل سرگرداں، متحیر اور پریشان ہیں، حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی قرآن مجید کی آیتوں کے ترجمے اکثر ہندی میں فرمایا کرتے تھے، اللہ کا ترجمہ وہ ہندی میں "من موہن" یعنی "دلوں کا محبوب" کیا کرتے تھے،

قرآن مجید کھولنے کے ساتھ ہی خدا کی جن صفتوں پر سب سے پہلے نگاہ پڑتی ہے وہ "رحمان" اور "رحیم" ہیں، ان دونوں لفظوں کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں "رحم والا" مہربان" لطف و کرم والا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(محبوب، مہربان رحم والا) کے ضمن میں قرآن مجید کے ہر سورہ کے آغاز میں انہی صفاتِ ربانی کے بار بار دہرانے کی تاکید کی گئی ہے، ہر نماز میں کئی کئی دفعہ ان کی تکرار ہوتی ہے، کیا اس سے بھی بڑھکر اللہ تعالیٰ کے متعلق اسلام کے تخیل کو واضح کرنے کے لیے کوئی دلیل ہو سکتی ہے؟

لفظ اللہ کے بعد اسلام کی زبان میں دوسرا اعلم یہی لفظ "رحمان" ہے، جو رحم و کرم اور لطف و مہر کے معنی میں صفتِ مبالغہ کا صیغہ ہے۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ — اس کو "محبوب" (اللہ) کہو یا "مہربان" (رحمان)

ایا ما تَدْعُوا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (بنی اسرائیل) — کہو جو کہکر اسکو پکارو، سب اچھے نام اسی کے ہیں"

قرآن مجید نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی صدہا بار کی تکرار کے علاوہ خاص طور سے ۵۳ موقعوں پر خدا کو اس رحمان کے نام سے یاد کیا ہے۔

ابھی اس سے پہلے باب میں اسمائے الٰہی کا ایک ایک نام تمہاری نظر سے گذر چکا ہے، ان ناموں میں اللہ تعالیٰ کے جلالی و جمالی اوصاف آگئے ہیں، استقصا کرو تو معلوم ہوگا کہ ان میں بڑی تعداد انہی ناموں کی ہے، جن سے اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور مہر و محبت کا اظہار ہوتا ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ایک نام یا ایک وصف اَلْوَدُوْد (سورۂ ذات البرج میں) آیا ہے، جس کے معنی "محبوب" اور "پیارے" کے ہیں کہ وہ سرتاپا مہر و محبت اور عشق اور پیار ہے، اسکے سوا خدا کا ایک اور نام الولی ہے، جسکے لفظی معنی "یار" اور "دوست" کے ہیں، خدا کا ایک اور نام جو قرآن مجید میں بار بار استعمال ہوا ہے، الرؤف ہے، رؤف کا لفظ رافت سے نکلا ہے، رافت کے معنی اُس محبت اور تعلق خاطر کے ہیں جو باپ کو اپنی اولاد سے ہوتا ہے، اسی طرح خدا کا ایک اور نام حَنَّان ہے جو حَنَ سے مشتق ہے،

"حنّ اور حنین" اس سوزِ دل اور محبت کو کہتے ہیں، جو ماں کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے، یہ الفاظ ان مجازی اور مستعار معانی کو ظاہر کرتے ہیں جو اسلام نے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے ربط و تعلق کے اظہار کے لیے اختیار کیے ہیں، دیکھو وہ ان رشتوں کے نام نہیں لیتا، لیکن ان شیتوں کے سبب سے محبت اور پیار کے جو خاص جذبات پیدا ہوتے ہیں، ان کو خدا کے لیے بے تکلف استعمال کرتا ہے اور اس طرح مادیت اور جسمانیت کا تخیل آئے بغیر وہ ان روحانی معنوں کی تلقین کر رہا ہے،

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ غفار (بخشش کرنے والا) اور غَفُوْرٌ (بخشنے والا) یعنی بندوں کے گناہوں کو معاف کرنے والا ہے، وہ سَلَامٌ (امن و سلامتی) ہے یعنی اپنے بے پناہ بندوں کے لیے وہ سرتاپا امن و سلامتی ہے، وہ مُؤْمِنٌ (امن دینے والا) ہے، وہ اَلْعَدْلُ ہے، یعنی سرتاپا انصاف ہے، وہ اَلْعَفُوُّ (معاف کرنے والا) ہے، اَلْوَهَّابُ (عطا کرنے والا) ہے، اَلْحَلِیْمُ (بردبار) ہے، اَلصَّبُوْرُ (بندوں کی گستاخیوں پر صبر کرنے والا) ہے، اَلتَّوَّابُ (بندوں کے حال پر رجوع ہونے والا) ہے، اَلْبَرُّ (نیک اور مجسم خیر) ہے، اور اَلْمُقْسِطُ (منصف و عادل) ہے، ان میں سے ہر لفظ پر ٹھہر کر ذرا غور کرو کہ اسلام کا تخیل کس قدر بلند اور برتر ہے۔

توراۃ کے اسفار، انجیل کے صحائف اور وید کے حصص کا ایک ایک ورق پڑھ جاؤ، کیا اللہ تعالیٰ کے لیے ایسے پر محبت اور سراپا مہر و کرم سے لبریز اسماء و صفات کی یہ کثرت تمکو وہاں ملیگی؟ یہ سچ ہے کہ اسلام اللہ تعالیٰ کے لیے ماں اور باپ کا لفظ یہود و نصاریٰ اور ہنود کی طرح استعمال کرنا جائز نہیں سمجھتا، مگر اس سے یہ قیاس کرنا غلطی ہے کہ وہ اس لطیف احساس اور مہر و کرم کے جذبات و عواطف سے یکسر خالی ہے، جن کو یہ فرقے اپنا مخصوص سرمایہ سمجھتے ہیں، بات یہ ہے کہ اسلام ان روحانی جذبات اور

معنوی احساسات کے ساتھ شرک و کفر کی اس ضلالت و گمراہی سے بھی انسانوں کو بچانا چاہتا ہے جو ذرا سی لفظی غلط فہمی سے مجاز کو حقیقت اور استعارہ کو اصلیت سمجھ کر پاک اور سرتاپا روحانی معنوں کو مادی اور مجسم یقین کر لیتے ہیں، اور اسطرح وہ توحید کی بلند ترین سطح سے بہت نیچے گر کر سررشتۂ حقیقت کو ہاتھ سے چھوڑ بیٹھتے ہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم متکلم ازل کا آخری پیغام لیکر آئے تھے، اس لیے ضرورت تھی کہ آپ کی تعلیم اس قسم کی لغزشوں سے پاک و مبرا ہو، روحانی حقایق کی تعبیر کے لیے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا، یقیناً مادی اور جسمانی استعارات و مجازات سے چارہ نہیں، تاہم ایک دائمی تعلیم کا یہ فرض تھا کہ وہ اپنے کو استعمالات کی غلطیوں اور مجازات کی غلط فہمیوں سے محفوظ رکھتی، چنانچہ اسلام نے اسی بنا پر ان استعارات و مجازات کے استعمال میں بڑی احتیاط برتی ہے، اور خدا کے مہر و کرم اور عشق و محبت کے تذکروں کے ساتھ ادب و لحاظ کے قواعد کو فراموش نہیں کیا ہے، قرآن مجید اور احادیث روحانی عشق و محبت کے ان دلآویز اور ولولہ انگیز حکایات سے معمور ہیں، باایں ہمہ اسلام انسان کو بیٹا اور خدا کو (باپ) نہیں کہتا کہ عبد و معبود کے تعلقات کے اظہار کیلیے اسکے نزدیک یہ کوئی بلند تر تعبیر نہیں، وہ خدا کو اَب (باپ) کے بجائے "رَب" کہہ کر پکارتا ہے، وہ اسکو تمام دنیا کا باپ نہیں بلکہ تمام دنیا کا رب کہتا ہے،

اَب اور رَب ان دونوں لفظوں کا باہمی معنوی مقابلہ کرو تو معلوم ہوگا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کا تخیل اسلام کے مطمح نظر سے کس درجہ پست ہے، اَب یعنی باپ کا تعلق اپنے بیٹے سے ایک خاص حالت کی بنا پر ایک خاص لحظہ میں قائم ہوتا ہے، اور پھر اس کی حیثیت بدل کر پرورش اور حفاظت کی صورت میں بچپن کے ایک محدود عرصہ تک قائم رہتا ہے، اس طرح گو باپ کو بیٹے کے وجود میں یک گونہ تعلق ضرور ہوتا ہے، مگر یہ تعلق حد درجہ ناقص، محدود اور آنی ہوتا ہے، بیٹے کے وجود، قیام و بقا،

ضروریات زندگی، سامانِ حیات، نشو ونما، اور ارتقاء کسی چیز میں باپ کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ اپنے باپ سے الگ، مستقل اور بے نیاز زندگی بسر کرتا ہے، مگر ذرا غور کرو کیا عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان جو ربط و تعلق ہے اس کا انقطاع کسی وقت ممکن ہے، کیا بندہ اپنے خدا سے ایک دم اور ایک لمحہ کے لیے بھی بے نیاز اور مستغنی ہو سکتا ہے، کیا یہ تعلق باپ اور بیٹے کے تعلق کی طرح محدود اور مخصوص الاوقات ہے؟

ربوبیت (پرورش) عبد اور معبود، خالق و مخلوق کے درمیان اس تعلق کا نام ہے جو آغاز سے انجام تک، پیدائش سے وفات تک بلکہ وفات کے بعد سے ابد تک قائم رہتا ہے، جو ایک لمحہ کے لیے منقطع نہیں ہو سکتا، جس کے بل اور سہارے پر دنیا اور دنیا کی مخلوقات کا وجود ہے، وہ گہوارۂ عدم سے لیکر فنائے محض کی منزل تک ہر قدم پر ہر موجود کا ہاتھ تھامے رہتا ہے، انسان ذرہ ہو یا بصورت خدا قطرۂ آب ہو یا قطرۂ خون، مضغۂ گوشت ہو یا مشتِ استخواں، شکم مادر میں ہو یا اس سے باہر، بچہ ہو یا جوان، ادھیڑ یا بوڑھا، کوئی آن، کوئی آنہ، رب کے مہر و کرم اور لطف و محبت سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہو سکتا

علاوہ ازیں باپ اور بیٹے کے الفاظ سے مادیت، جسمانیت، ہم جنسی اور برابری کا جو تخیل پیدا ہوتا ہے، اس سے لفظ رب یک قلم پاک ہے، اور اس میں ان ضلالتوں اور گمراہیوں کا خطرہ نہیں جن میں نصرانیت اور ہندویت نے ایک عالم کو مبتلا کر رکھا ہے،

اب ان آیتوں اور حدیثوں کو دیکھو جن سے یہ روشن ہوتا ہے کہ اسلام کا سینہ اس ازلی و ابدی عشق و محبت کے نور سے کس درجہ معمور ہے، اور وہ خمخانۂ الست کی سرشاری کی یاد بھکے ہوئے انسان کو کس کس طرح دلا رہا ہے، اسلام کا سب سے پہلا حکم ایمان ہے، ایمان کی سب سے بڑی خاصیت اور علامت حبِ الٰہی ہے، اور یہ وہ دولت ہے جو اہلِ ایمان کی پہلی جماعت کو عملاً نصیب ہو چکی تھی، زبانِ الٰہی نے شہادت دی،

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (بقرہ) اور جو ایمان لائے وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھتے ہیں،

اس نشۂ محبت پر باپ، ماں، اولاد، بھائی، بیوی، جان، مال، خاندان، سب کو قربان اور نثار ہو جانا چاہیے، ارشاد ہوتا ہے،

اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَ	اگر تمھارے باپ، تمھارے بیٹے، تمھارے بھائی، تمھاری
اِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ	بیویاں اور تمھارا کنبہ اور وہ دولت جو تم نے کمائی
وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ	ہے اور وہ سوداگری جسکے مندا پڑ جانے کا تمکو
تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ	اندیشہ ہے اور وہ مکانات جنکو تم پسند کرتے ہو
اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ	خدا اور اسکے رسول اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے
وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا	سے تمکو زیادہ محبوب اور پیارے ہیں تو اس وقت
حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (توبہ ۳۰)	تک انتظار کرو کہ خدا اپنا فیصلہ لے آئے۔

ایمان کے بعد بھی اگر نشۂ محبت کی سرشاری نہیں ملی تو وہ بھی جادۂ حق سے دوری ہے، چنانچہ جو لوگ راہ حق سے بھٹکنا چاہتے تھے، ان کو پکار کر سنا دیا گیا،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ	مسلمانو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین (اسلام)
مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ	سے پھر جائیگا تو خدا (کو اسکی کچھ پروا نہیں، وہ)
بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ	ایسے لوگوں کو لا کر کھڑا کریگا جنکو وہ پیار کریگا
(مائدہ ۷-۸)	اور وہ اس کو پیار کریں گے۔

حضرت مسیحؑ نے کہا درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، ہر معنوی اور روحانی حقیقت ظاہری

آثار اور جسمانی علامات سے پہچانی جاتی ہے، تم کو زید کی محبت کا دعویٰ ہے، مگر نہ تمہارے دل میں اس کے دیدار کی تڑپ ہے، نہ تمہارے سینہ میں صدمۂ فراق کی جلن ہے اور نہ آنکھوں میں ہجر و جدائی کے آنسو ہیں، تو کون تمہارے دعویٰ کی تصدیق کریگا، اسی طرح خدا کی محبت اور پیار کے دعویدار تو بہتیرے ہو سکتے ہیں، مگر اس غیر محسوس کیفیت کی مادی نشانیاں اور ظاہری علامتیں اس کے احکام کی پیروی اور اس کے رسول کی اطاعت ہے، خدا کے رسول کو اس اعلان کا حکم ہے،

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ	اگر تم کو خدا سے محبت ہے تو میری پیروی کرو
يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران-۴)	کہ خدا بھی تم کو پیار کریگا۔

محبت کیونکر حاصل ہو، وحی محمدی نے اس رتبۂ بلند کے حصول کی تدبیر بھی بتا دی، فرمایا،

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے، رحمت
سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (مریم)	والا خدا ان کے لیے محبت پیدا کرے گا،

اس آیت میں محبت کے حصول کے دو ذریعے بتائے گئے ہیں، ایمان اور عملِ صالح، یعنی نیک کام، چنانچہ طبقاتِ انسانی میں متعدد ایسے گروہ ہیں جن کو ان ذریعوں سے خدا کی محبت اور پیار کی دولت ملی ہے،

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (مائدہ، بقرہ)	خدا نیکی کرنے والوں کو پیار کرتا ہے،
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ (بقرہ-۳۸)	خدا توبہ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے،
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ (آل عمران)	خدا توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (مائدہ، حجرات)	خدا منصف مزاجوں کو پیار کرتا ہے،

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ (توبہ ۱ و ۴)	خدا پرہیزگاروں کو پیار کرتا ہے،
اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ (صف - ۱)	خدا ان کو پیار کرتا ہے جو اس کی راہ میں راستے میں لڑتے ہیں،
وَاللّٰہُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ (آل عمران ۱۵)	اور خدا صبر کرنے والوں کو پیار کرتا ہے،
وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُطَّہِّرِیْنَ (توبہ ۱۳)	اور خدا پاک صاف لوگوں کو پیار کرتا ہے،

مسند احمد میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تین قسم کے آدمیوں سے محبت کرتا ہے، اور تین قسم کے آدمیوں کو پیار نہیں کرتا، محبت ان سے کرتا ہے جو اس کی راہ میں خلوص نیت کے ساتھ اپنی جان فدا کرتے ہیں، اور ان سے جو اپنے پڑوسی کے ظلم پر صبر کرتے ہیں اور ان سے جو وضو کر کے خدا کی یاد کیلیے اس وقت اٹھتے ہیں جب قافلہ رات کے سفر سے تھک کر آرام کے لیے بستر لگاتا ہے، اور خدا کی محبت سے محروم یہ تین ہیں، اترانے والا مغرور، احسان دھرنے والا بخیل، جھوٹی قسمیں کھا کھا کر مال بیچنے والا سوداگر،[1]

دنیا کے عیش و مسرت میں اگر کوئی خیال کانٹا سا چبھتا ہے اور ہمیشہ انسان کے عیش و سرور کو مکدر اور منغض بنا کر بے فکری کی بہشت کو فکر و غم کی جہنم بنا دیتا ہے، تو وہ ماضی اور حال کی ناکامیوں کی یاد اور مستقبل کی بے اطمینانی ہے، پہلے کا نام حزن و غم اور دوسرے کا خوف و دہشت ہے، غرض غم اور خوف یہی دو کانٹے ہیں، جو عاجز و درماندہ انسان کے پہلو میں ہمیشہ چبھتے رہے ہیں، لیکن جو محبوب حقیقی کے طلب گار اور اس کے والہ و شیدا ہیں، ان کو بشارت ہے کہ ان کے عیش کا چمن زار ان کانٹوں سے پاک و صاف ہوگا۔

---

[1] احمد بن حنبل مسند ابوذر جلد ۵ ص ۱۷۶

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (یونس - ۷)

ہاں خدا کے دوستوں کو نہ کوئی خوف ہو اور نہ وہ غمگین ہوں گے،

محبت کا وہ درجہ جو بڑے کو چھوٹے کے ساتھ احسان، نیکی، درگذر اور عفو و بخشش پر آمادہ کرتا ہے، اس کا نام "رحم" اور "رحمت" ہے، اسلام کا خدا تمام تر رحم ہے، اسکی رحمت کے فیض سے عرصۂ کائنات کا ذرہ ذرہ سیراب ہے، اس کا نام رحمان و رحیم ہے، جو کچھ یہاں ہے سب اسکی رحمت کا ظہور ہے، وہ نہیں تو کچھ نہیں، اسلیے اسکی رحمت سے ناامیدی جرم اور مایوسی گناہ ہے، مجرم سے مجرم اور گنہگار سے گنہگار کو وہ نوازنے کے لیے ہمہ وقت آمادہ و تیار رہتا ہے، گنہگاروں اور مجرموں کو وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے میرے بندو! کہہ کر انکے پاس تسلی کا یہ پیام بھیجتا ہے۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ، اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (زمر - ۶)

اے پیغمبر! میرے ان بندوں کو پیام پہنچا دے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے کہ تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اللہ یقیناً تمام گناہوں کو بخش سکتا ہے، بیشک وہی بخشش کرنے والا اور رحم کھانے والا ہے،

فرشتے حضرت ابراہیم کو بشارت سناتے ہیں تو کہتے ہیں،

فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ (حجر - ۶)

تم ناامید ہونے والوں میں سے نہ ہو،

خلیل اللہ اس رمز سے ناآشنا نہ تھے کہ مرتبۂ خلت، محبت سے مافوق ہے، اسلیے جواب دیا،

وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖ

اپنے پروردگار کی رحمت سے گمراہ لوگوں کے

اِلَّا الضَّالُّوْنَ (حجر-۶) سوا اور کون ناامید ہوتا ہے؟

بندوں کی جانب سے خدا پر کوئی پابندی عائد نہیں، مگر اس نے اپنی رحمت کے اقتضا سے اپنے اوپر خود کچھ چیزیں فرض کرلی ہیں، منجملہ انکے ایک رحمت بھی ہے، خدا مجرموں کو سزا دیسکتا ہے گنہگاروں پر عذاب بھیج سکتا ہے، سیہ کاروں کو انکی گستاخیوں کا مزہ چکھا سکتا ہے، وہ غالب قاہر ہے، جبار ہے، منتقم ہے، لیکن ان سب کے ساتھ وہ غفار و غفور بھی ہے، رحمان و رحیم بھی، اور عفو و رؤف بھی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنے اوپر رحمت کی پابندی خود عائد کرلی ہے، اور اس کو اپنے اوپر فرض گردان لیا ہے،

کَتَبَ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ (انعام-۲) اللہ نے از خود اپنے اوپر رحمت کو لازم کرلیا ہے

قاصدِ خاص کو حکم ہوتا ہے کہ ہمارے گنہگار بندوں کو ہماری طرف سے سلام پہنچاؤ اور تسلی کا یہ پیام دو کہ ہمارا باب رحمت ہر وقت کھلا رہتا ہے،

وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ	اے پیغمبر جب تیرے پاس وہ آئیں جو میری آیتوں
بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ	پر یقین رکھتے ہیں تو انسے کہہ کہ تم پر سلامتی ہو،
كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ	تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر از خود اپنے بندوں
اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا	پر مہربان ہونا لازم کرلیا ہے کہ جو کوئی تم میں سے
بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهٖ	براہ نادانی برائی کر بیٹھے، پھر اسکے بعد بارگاہ الٰہی
وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ	کی طرف رجوع کرے اور نیک بنے تو بیشک
(انعام-۶)	خدا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے،

قرآن کی تعلیم کے مطابق اس وسیع عرصۂ کائنات کا کوئی ذرہ اس سایۂ رحمت سے محروم نہیں،

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ (اعراف ۱۹) اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر لیا ہے،

بخاری و ترمذی وغیرہ کی صحیح حدیثوں میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اس عالم کو پیدا کیا تو از خود اپنے اوپر رحمت کی پابندی عائد کرلی، جامع ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ آپ نے فرمایا "اگر مومن کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کے پاس کتنا عقاب ہے تو وہ جنت کی طمع نہ کرتا اور اگر کافر کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کی رحمت کس قدر بے حساب ہے تو وہ جنت سے مایوس نہ ہوتا"، یہ اسلام کے تخیل کی صحیح تعبیر ہے، بارگاہ احدیت کا آخری قاصد اپنے دربار کی جانب سے گنہگاروں کو بشارت سناتا ہے کہ "اے آدم کے بیٹو! جب تک تم مجھے پکارتے رہو گے اور مجھ سے آس لگائے رہو گے، میں تمھیں بخشتا رہوں گا، خواہ تم میں کتنے ہی عیب کیوں نہ ہوں، مجھے پروا نہیں، اے آدم کے بیٹے اگر تمھارے گناہ آسمان کے بادلوں تک بھی پہنچ جائیں، اور پھر تم مجھ سے معافی مانگو تو میں معاف کردوں، خواہ تم میں کتنے ہی عیب کیوں نہ ہوں، مجھے پروا نہیں، اے آدم کے بیٹو! اگر پوری سطح زمین بھی تمھارے گناہوں سے بھری ہو پھر تم میرے پاس آؤ اس حال میں کہ کسی کو میرا شریک نہ بناتے ہو تو میں بھی تمھارے پاس پوری سطح زمین بھر مغفرت لے کر آؤں"[1] کہ انسانوں کے کانوں نے اس رحمت، اس محبت، اس عفو عام کی بشارت کسی اور قاصد کی زبان سے بھی سنی ہے؟

حضرت ابو ایوبؓ صحابی کی وفات کا وقت جب آیا تو انھوں نے لوگوں سے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر تم لوگ گناہ نہ کرتے تو خدا اور کوئی مخلوق پیدا کرتا جو گناہ کرتی،

---

[1] جامع ترمذی (ابواب الدعوات) و دیگر کتب احادیث (صحیح)

اور وہ اس کو بخشتا ہے" یعنی اللہ تعالیٰ کو اپنے رحم و کرم کے اظہار کے لیے گنہگاروں ہی کی تلاش ہے کہ نیکوکاروں کو تو سب ڈھونڈتے ہیں، مگر گنہگاروں کو صرف وہی ڈھونڈتا ہے،

دنیا میں انسانوں کے درمیان جو رحم و کرم اور مہر و محبت کے عناصر پائے جاتے ہیں، اور جن کی بنا پر دوستوں، عزیزوں، قرابتداروں اور اولادوں میں میل ملاپ اور رحم و محبت ہے، نیز جس کی بنا پر دنیا میں عشق و محبت کے شاندار مناظر نظر آتے ہیں، تم کو معلوم ہے کہ یہ اس شاہد حقیقی کے سرچشمۂ محبت کا کونسا حصہ ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو[1] حصے کیے، ان میں سے ایک حصہ اپنی مخلوقات کو عطا کیا جس کے اثر سے لوگ ایک دوسرے پر باہم رحم کیا کرتے ہیں، باقی ننانوے[2] حصے خدا کے پاس ہیں، اس لطف و کرم اور مہر و محبت کی بشارتیں کس مذہب نے انسانوں کو سنائی ہیں، اور کس نے گنہگار انسانوں کے مضطرب قلوب کو اس طرح تسلی دی ہے، صحیح بخاری میں ایک واقعہ مذکور ہے، کہ ایک شخص شراب خوری کے جرم میں بار بار گرفتار ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا، صحابہ نے تنگ آکر کہا "خداوندا! تو اپنی لعنت اس پر نازل کر کہ یہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے"، رحمۃ للعالمین کو لوگوں کی یہ بات ناپسند آئی، فرمایا "اس پر لعنت نہ کرو کہ اس کو خدا اور رسول سے محبت ہے"[3]، تم نے دیکھا کہ اسلام نے گنہگاروں کے لیے خدا کی محبت کا دروازہ کس طرح کھول رکھا ہے،

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے ان عربوں کو جو خدا کی محبت کیا خدا کی معرفت سے بھی

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۵ ص ۴۱۲ [2] بخاری کتاب الادب باب صفحہ ۸۸۰ [3] بخاری کتاب الحدود باب ما یکرہ من لعن شارب الخمر، ص ۱۰۰۲،

ناآشنا تھے، کس طرح آشنائے حقیقت کر دیا، اور اُن کو ذاتِ الٰہی کے ساتھ وابستگی، محبت اور سرشاری کے لطف سے کس درجہ بہرہ اندوز کر دیا، بلالؓ کو دیکھو، ٹھیک دوپہر کے وقت عرب کی جلتی ہوئی ریت پر اُن کو لٹایا جاتا ہے، ایک گرم پتھر سینہ پر رکھا جاتا ہے، اور خدا لے واحد سے انحراف کیلئے اُن کو مجبور کیا جاتا ہے، وہ یہ سب تکلیفیں اٹھاتے ہیں، مگر زبان سے وہی احد احد (ایک ایک) کا ترانہ نکلتا ہے، مکہ کا ذرہ ذرہ صدائے حق کا دشمن ہے، ابوذر غفاریؓ یہ جان کر بھی صحن کعبہ میں جوشِ وحدت پرستی سے سرشار ہو کر کلمۂ توحید کا بآوازِ بلند اعلان کرتے ہیں، ہر طرف سے پتھروں اور ہڈیوں کی بارش ہوتی ہے، بعض لوگ آکر چھڑا دیتے ہیں، لیکن جب دوسری صبح نمودار ہوتی ہے، تو پھر محبتِ الٰہی[1] کے کیف و مستی کا وہی عالم نظر آتا ہے، اور مشرکین کی طرف سے وہی سزا ملتی ہے[2]،

ایک صحابی جو رات کو میدانِ جنگ میں ایک پہاڑ پر پہرہ دینے کے لئے متعین تھے، وہ اپنی نیند ٹالنے کے لئے خدا کی یاد میں مصروف ہوتے ہیں، دشمن پے در پے تین دفعہ تیر مارتا ہے جو بدن میں پیوست ہو جاتا ہے، اور وہ بدستور نماز میں محو رہتے ہیں، انکے ساتھی پوچھتے ہیں کہ تم نے نماز کیوں نہیں توڑی، کہتے ہیں کہ جو سورہ شروع کی تھی، جی نہ چاہا کہ اسکو تمام کئے بغیر چھوڑ دوں[3]،

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو جانشین عین حالت نماز میں زخم کھا کر گرتے ہیں، مگر مقتدیوں کی صف اس حی و قیوم کے سامنے کھڑی ہو کر ہر فانی و میت ہستی کی محبت سے بے نیاز رہتی

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ذکر عدوان المشرکین و اسد الغابہ جلد ۵ ص ۲۰۲ مصر [2] طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت ابوذر غفاری [3] صحیح بخاری و سنن ابی داؤد، کتاب الطہارت باب الوضوء من الدم،

ہے، اسی لئے خدا نے بشارت دی کہ وہ خدا کے محبوب اور خدا ان کا محبوب ہی یعنی رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ

مدینہ میں ایک اللہ والے مسلمان نے وفات پائی، اس کا جنازہ اٹھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اس کے ساتھ نرمی کرو کہ اللہ نے بھی اس کیساتھ نرمی کی ہی، کیونکہ اسکو اللہ اور اس کے رسول سے محبت تھی، قبر کھودی جانے لگی، تو فرمایا، اسکی قبر کشادہ رکھو کہ خدا نے بھی اسکے ساتھ کشادگی فرمائی ہی، اس بار بار کے اہتمام کو دیکھ کر صحابہؓ نے پوچھا "یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کو اس مرنے والے کے موت کا غم ہے؟ فرمایا "ہاں، کیونکہ اسکو خدا اور رسول پیارے تھے"

ایک دفعہ آپنے ایک صاحب کو کسی جماعت کا افسر بنا کر بھیجا، وہ جب نماز پڑھاتے تو سورۃ کے آخر میں قل ھو اللہ ضرور پڑھتے جب یہ جماعت سفر سے لوٹ کر آئی تو خدمتِ اقدس میں یہ واقعہ عرض کیا، فرمایا ان سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں، لوگوں نے پوچھا تو جواب دیا کہ "یہ میں اسلئے کرتا ہوں کہ اس سورہ میں رحم والے خدا کی صفت کا بیان ہی تو مجھکو اسکے پڑھنے سے محبت ہی" فرمایا کہ ان کو بشارت دو کہ وہ رحم کرنے والا خدا بھی ان سے محبت کرتا ہی" یہ بشارت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک کے سوا کسی اور نے بھی سنائی ہے؟

صحیح بخاری اور مسلم میں متعدد طریقوں سے حضرت انسؓ سے روایت ہی کہ ایک دفعہ ایک صحابی نے خدمتِ والا میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ "یا رسول اللہ! قیامت کب آئیگی" فرمایا تم نے اسکے لئے کیا سامان کر رکھا ہے" انھوں نے نادم ہو کر شکستہ دلی سے عرض کی "یا رسول اللہ! میرے پاس نہ تو نمازوں کا بڑا ذخیرہ ہے، نہ روزوں کا، اور نہ صدقات و خیرات کا، جو کچھ سرمایہ ہی، وہ صرف خدا اور

لہ ابن ماجہ کتاب الجنائز باب ما جاء فی حفر القبر ۲ مسلم کتاب صلوٰۃ المسافرین قصرہا، باب فضل قراءۃ قل ھو اللہ احد، یہ واقعہ بخاری کتاب الصلوٰۃ باب الجمع بین السورتین میں دوسری طرح مروی ہی، اور اس میں رسول اللہ صلعم کے الفاظ بھی دوسرے ہیں،

رسول کی محبت ہے، اور بس!" فرمایا تو انسان جس سے محبت کریگا، اسی کے ساتھ رہیگا،" صحابہؓ نے اس بشارت کو سن کر اُس دن بڑی خوشی منائی،[1]

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا جب خدا کسی بندہ کو چاہتا ہے تو فرشتۂ خاص جبریلؑ سے کہتا ہے کہ میں فلاں بندہ کو پیار کرتا ہوں۔ تم بھی اسکو پیار کرو، تو جبریلؑ بھی اسکو پیار کرتے ہیں اور آسمان والے بھی اسکو پیار کرتے ہیں، اور پھر زمین میں اسکو ہر دلعزیزی اور حسنِ قبول بخشا جاتا ہے[2]

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "جو بندہ اپنی طاعتوں سے میری قربت کو تلاش کرتا رہتا ہے، تو میں اُس سے محبت کرنے لگتا ہوں یہانتک کہ میں اسکا کان بنجاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے، اور اسکی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، میں ہاتھ بنجاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور پانوں بنجاتا ہوں، جس سے وہ چلتا ہے[3]" یہ دولت، یہ نعمت یہ سعادت آستانۂ محمدیؐ کے سوا کہیں اور نہیں بٹتی،

امام بزار نے مسند میں حضرت ابو سعیدؓ سے روایت نقل کی ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں ان لوگوں کو پہچانتا ہوں جو نہ نبی ہیں اور نہ شہید ہیں لیکن قیامت میں انکے مرتبہ کی بلندی پر انبیا اور شہدا بھی رشک کرینگے، یہ وہ لوگ ہیں جنکو خدا سے محبت ہے، اور جنکو خدا پیار کرتا ہے وہ اچھی باتیں بتاتے اور بُری باتوں سے روکتے ہیں[4]" الخ یہ قابلِ رشک رتبہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کس کے ذریعہ عطا ہوا ہے،

---

[1] مسلم کتاب الادب باب المرء مع من احب، بخاری کتاب الادب باب ما جاء فی قول الرجل ویلک [2] مسلم کتاب الادب باب اذا احب اللہ عبدا حبہ بعبادہ [3] بخاری کتاب الرقاق باب التواضع [4] اسکی ہم معنی حدیثیں ترمذی، مالک اور شعب الایمان بیہقی میں بھی ہیں، دیکھو مشکوٰۃ کتاب الآداب فی حب اللہ فصل ثانی،

امام مالک نے روایت کی ہے کہ آپنے فرمایا خداوند تعالیٰ یہ ارشاد فرماتا ہے، کہ ان کو پیار کرنا مجھ پر لازم ہے، جو آپس میں ایک دوسرے کو میری محبت کے سبب سے پیار کرتے ہیں، اور میری محبت میں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے ہیں اور میری محبت میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں، اور میری محبت میں ایک دوسرے کے لئے اپنی جان و مال وقف کرتے ہیں"

یہ محبت الٰہی کی نیرنگیاں اسلام ہی کے پردہ پر نظر آتی ہیں،

ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپنے فرمایا "لوگو! خدا سے محبت کرو کہ وہ تمہیں اپنی نعمتیں عطا کرتا ہے اور اسی کی محبت کے سبب سے مجھ سے محبت کرو، اور میری محبت کے سبب سے میرے اہل بیت سے محبت کرو" یہ عشق و محبت کی دعوت محبوب ازل کے سوا اور کون دے سکتا ہے؟

عام مسلمانوں میں پیغمبر اسلام کا لقب "حبیب خدا ہے"، دیکھو کہ حبیب اور محبوب میں خلت محبت کے کیا کیا ناز و نیاز ہیں، آپ خشوع و خضوع کی دعاؤں اور خلوت و تنہائی کی روحانی ملاقاتوں میں کیا ڈھونڈھتے اور کیا مانگتے تھے، کیا چاہتے اور کیا سوال کرتے تھے، امام احمد اور بزار نے اپنی اپنی مسندوں میں، ترمذی نے جامع میں، حاکم نے مستدرک میں اور طبرانی نے معجم میں متعدد صحابیوں سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں محبت الٰہی کی دولت مانگا کرتے تھے، انسان کو اس دنیا میں سب سے زیادہ محبوب اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جان ہے لیکن محبوب خدا کی نگاہ میں اس سے بھی عزیز تر چیز محبت الٰہی ہے، اس لئے آپ دعا فرماتے تھے، خداوندا

اَسئلُ حبّکَ وحبَّ من یحبّکَ	میں تیری محبت مانگتا ہوں اور جو تجھ سے محبت
وحبَّ عملٍ یقرّبُ الیٰ حبّکَ	کرتا ہو اسکی محبت اور اس کام کی محبت جو
(احمد۔ ترمذی۔ حاکم)	تیری محبت سے قریب کر دے،

اللّٰھُمَّ اجْعَلْ حُبَّکَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنْ	الٰہی تو اپنی محبت کو میری جان سے، میرے اہل و
نَفْسِی وَاَھْلِی وَمِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ،	عیال سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ
(ترمذی وحاکم)	میری نظر میں محبوب بنا،

عرب میں ٹھنڈا پانی دنیا کی تمام دولتوں اور نعمتوں سے زیادہ گراں اور قیمتی ہے، لیکن حضورؐ کی پیاس اس مادی پانی کی خنکی سے نہیں بجھتی تھی، وہ صرف محبت الٰہی کا زلالِ خالص تھا، جو اس تشنگی کو تسکین دیسکتا تھا، عام انسان روٹی سے جیتے ہیں مگر ایک عاشقِ الٰہی (مسیح) کا قول ہے کہ انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا، پھر وہ کون روٹی ہے جسکو کھاکر انسان پھر کبھی بھوکا نہیں ہوتا، حضورؐ دعا فرماتے ہیں:

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِی حُبَّکَ وَحُبَّ مَنْ	خداوندا! تو اپنی محبت اور اسکی محبت جو
یَنْفَعُنِی فِی حُبِّکَ، (ترمذی)	تیری محبت کی راہ میں نافع ہو مجھے روزی کر

عام ایمان خدا اور رسول پر یقین کرنا ہے، مگر جانتے ہو کہ اس راہ میں آخری منزل کیا ہے صحیحین میں ہے،

مَنْ کَانَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَحَبَّ اِلَیْہِ	یہ کہ خدا اور رسول کی محبت کے آگے
مِمَّا سِوَاھُمَا،	ماسوا کی محبتیں ہیچ ہوجائیں،

بعض مذاہب کو اپنی اس تعلیم پر ناز ہے، کہ وہ انسانوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ وہ اپنے خدا کو ماں باپ سمجھیں اور اُس سے اسی طرح محبت کریں جس طرح اپنے والدین سے کرتے ہیں اور چونکہ اسلام نے اس طریقۂ تعبیر کو اس بنا پر کہ وہ شرک کا راستہ ہے، ممنوع قرار دیا ہے، اسلئے

لہ مسلم کتاب الایمان باب بیان خصال من اتصف بھن وجد حلاوۃ بخاری کتاب الایمان باب حلاوۃ الایمان

ان مذاہب کے بہت سے پیرو یہ سمجھتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم محبت الٰہی کے مقدس جذبات سے خالی ہے، لیکن جیسا کہ پہلے گذر چکا کہ یہ دعویٰ سرتاپا بے بنیاد ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تعلیم محمدیؐ کی بلندی نظر اور محبت کا علوے معیار دونوں ان مذاہب کے پیش کردہ نظر و معیار سے بہت بالاتر ہیں، ثبوت میں قرآن کی یہ آیت پاک بھی پہلے پیش کی جاچکی ہے،

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا (بقرہ ۲۰۰)

تم خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو، بلکہ اس سے بہت زیادہ (یاد کرو)

لیکن احادیث سے ہمارا دعویٰ اور بھی زیادہ واضح ہوجاتا ہے، لڑائی کا میدان ہے، دشمنوں میں بھاگ دوڑ مچی ہے، جس کو جہاں امن کا گوشہ نظر آرہا ہے، اپنی جان بچا رہا ہے، بھائی بھائی سے، ماں بچہ سے، بچہ ماں سے الگ ہے، اسی حال میں ایک عورت آتی ہے، جس کا بچہ میدان حشر میں گم ہوگیا ہے، محبت کی دیوانگی کا یہ عالم ہے کہ جو بچہ بھی اس کے سامنے آجاتا ہے، اسکو اپنے بچہ کے جوش محبت میں چھاتی سے لگا لیتی ہے، اور دودھ پلا لیتی ہے، دفعۃً رحمۃ للعالمینؐ کی نظر پڑتی ہے، اور آپ صحابہ سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں "کیا یہ ممکن ہے کہ یہ عورت خود اپنے بچہ کو اپنے ہاتھ سے دہکتی آگ میں ڈال دے"؟ لوگ عرض کرتے ہیں ہرگز نہیں" آپ فرماتے ہیں "تو جتنی محبت ماں کو اپنے بچہ سے ہے، خدا کو اپنے بندوں سے اس سے کہیں زیادہ محبت ہے"[1]

ایک دفعہ ایک غزوہ سے آپ واپس تشریف لا رہے ہیں، ایک عورت اپنے بچہ کو گود میں لیکر سامنے آتی ہے اور عرض کرتی ہے "یا رسول اللہ! ایک ماں کو اپنی اولاد سے جتنی محبت ہوتی ہے، کیا

[1] صحیح بخاری کتاب الادب، باب رحمۃ الولد،

خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ نہیں ہے؟ فرمایا "ہاں بیشک اس سے زیادہ ہے"، تو بولی کوئی ماں تو اپنی اولاد کو خود آگ میں ڈالنا گوارا نہ کریگی" یہ سُن کر فرط اثر سے آپؐ پر گریہ طاری ہو گیا، پھر سر اٹھا کر فرمایا خدا صرف اس بندہ کو عذاب دیتا ہے، جو سرکشی سے ایک کو دو کہتا ہے[1]"

آپ ایک مجلس میں تشریف فرما ہیں، ایک صحابی ایک پرند کو مع اس کے بچوں کے چادر میں باندھکر لاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یا رسول اللہ! میں نے ایک جھاڑی سے ان بچوں کو اٹھا کر کپڑے میں لپیٹ لیا، ماں نے یہ دیکھا تو میرے سر پر منڈلانے لگی، میں نے ذرا کپڑے کو کھول دیا تو فوراً آکر بچوں پر گر پڑی، ارشاد ہوا، کیا بچوں کے ساتھ ماں کی اس محبت پر تمکو تعجب ہے، قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھکو حق کیساتھ مبعوث کیا، جو محبت اس ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہے، خدا کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے بدرجہا زیادہ ہے[2]

ایک صاحب ایک چھوٹے بچہ کو لیکر خدمت اقدس میں حاضر ہوتے ہیں، محبت کا یہ حال تھا کہ وہ بار بار اسکو گلے سے لگائے جاتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ کیا تمکو اس بچہ سے محبت ہے، انھوں نے کہا "ہاں" فرمایا تو اللہ کو تم سے اس سے زیادہ محبت ہے، جتنی تمکو اس بچہ سے ہے، وہ تمام رحم کرنے والوں میں سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے[3]"

جمالِ حق کا پہلا مشتاق، اور مستورِ ازل کے زیرِ نقاب چہرہ کا پہلا بند کشا، زندگی کے آخری مرحلوں میں ہے، مرض کی شدت ہے، بدن بخار سے تپ رہا ہے، اٹھ کر چل نہیں سکتا، لیکن یک بیک وہ اپنے میں ایک اعلان خاص کی طاقت پاتا ہے، مسجد نبویؐ میں جاں نثار حاضر ہوتے ہیں، سب کی

---

[1] سنن نسائی، باب مایرجی من الرحمۃ [2] مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد کتاب الادب باب رحمۃ اللہ وغضبہ [3] ھذا فی المفرد امام بخاری باب رحمۃ العیال ص ۵، ۔ مصر،

نظریں حضورؐ کی طرف لگی ہیں، نبوت کا آخری پیغام سننے کی آرزو ہے، دفعۃً لبِ مبارک ہلتے ہیں اور یہ آواز آتی ہی، لوگو! میں خدا کے سامنے اس بات کی برأت کرتا ہوں کہ انسانوں میں میرا کوئی دوست ہی مجھکو خدا نے اپنا پیارا بنایا ہی، جیسے ابراہیم کو اس نے اپنا پیارا بنایا تھا[1]، یہ تو وفات سے پہلے کا اعلان تھا، عین حالت نزع میں زبان مبارک پر یہ کلمہ تھا، "خداوندا رفیق"

اللہ تعالیٰ کی کریمی و رحیمی اُسکی بیچارہ نوازی، عاجزوں اور درماندوں کی دستگیری اور اپنے گنہگار بندوں پر اسکی شانِ بخشش کا ترانہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے کانوں سے سنا، اور نادم و متاسف سیہ کاروں تک اس مژدہ کو پہنچا کر اُنکے شکستہ اور زخمی دلوں پر مرہم رکھا، حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ حضرت رحمۃ للعالمینؐ نے یہ پیام ربانی ہم کو سنایا

میرے بندو! میں نے اپنے اوپر بھی اور تمھارے درمیان بھی ظلم کو حرام کیا ہی، تو ایک دوسرے پر تم ظلم نہ کیا کرو، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک گمراہ تھا، لیکن جسکو میں نے راہ دکھائی، تو مجھ سے راستہ پوچھو، میں بتاؤنگا، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک بھوکا تھا، لیکن جسکو میں نے کھلایا تو مجھ سے کھانا مانگو میں تمکو کھلاؤنگا، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک پیاسا تھا، لیکن جسکو میں نے پلایا تو مجھ سے پانی مانگو میں تمکو پلاؤنگا، اے میرے بندہ! تم میں ہر ایک ننگا تھا، لیکن جسکو میں نے پہنایا، تو مجھ سے کپڑا مانگو میں تمکو پہناؤنگا اے میرے بندو! تم دن رات گناہ کرتے ہو، اور میں سب گناہوں کو معاف کرتا ہوں تم مجھ سے معافی مانگو، میں تمکو معاف کرونگا، اے میرے بندو! مجھے نقصان پہنچانا تمھاری طاقت میں نہیں ہی اور نہ مجھے نفع پہنچانا تمھاری قدرت میں ہے، اے میرے بندو! اگر تمھارے اگلے پچھلے جن اور انس، چھوٹے اور بڑے مرد اور عورت، دنیا کے سب سے بڑے پرہیزگار کے دل کے برابر ہو جائیں، تو میری شہنشاہی میں ایک ذرہ اضافہ نہ ہوگا، اور اے میرے بندو! اگر تمھارے اگلے اور پچھلے، جن و انس، چھوٹے اور بڑے مرد اور عورت دنیا

[1] صحیح مسلم کتاب المساجد
[2] صحیح بخاری ذکر وفات نبوی

کے سب سے بڑے گنہگاروں کے برابر ہو جائیں تو بھی میری شہنشاہی میں ذرہ برابر کمی نہ ہوگی اے میرے بندو! اگر تمھارے اگلے اور پچھلے اور جن وانس، سب کسی ایک زمین میں کھڑے ہو کر مجھ سے مانگیں اور میں سب کے سوال کو پورا کروں، تو میرے خزانہ میں کچھ کمی نہ ہوگی لیکن اتنی جتنی ایک سوئی سمندر کے پانی میں ڈبو کر نکال لیجائے، اے میرے بندو! تمھارے ہی عمل ہونگے جنکو میں گن گن کر تمکو واپس کرونگا اور پورا کرونگا تو جس کو بھلائی ملے، وہ خدا کا شکر ادا کرے، اور جس کو بُرائی ملے، وہ خود اپنے ہی کو ملامت کرے،[1]

محبت کا یہ پُرکیف نغمہ دنیا نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی زبان مبارک سے سنا، تسلی و تشفی کا یہ روح افزا پیام آپ ہی کے مبارک لبوں سے ادا ہوا، عفو و کرم کے بحر بیکراں کا یہ ساحلِ امید آپ ہی کے دکھانے سے ہمکو نظر آیا، اور گنہگاروں کو "میرے بندو!" کہہ کر پکارے جانے کی عزت آپ ہی کے وسیلہ سے میسر آئی صلی اللہ علیہ وسلم۔

---

[1] صحیح مسلم و ترمذی کتاب الزہد و مسند احمد بن حنبل جلد ۵ ص ۱۶۰ و صفحہ ۱۷۷، و ادب المفرد امام بخاری باب الظلم، ص ۹۵ و مصر میں نے صحیح مسلم کی روایت سامنے رکھی ہے، لیکن بعض الفاظ مسند سے لیکر بڑھا دئے ہیں، اس کے بعض بعض ٹکڑے انجیل میں بھی ملتے ہیں، (دیکھو متی ۲۵-۲۵ تا ۴۵) مگر دونوں کے ملانے سے وہی فرق نمایاں ہوتا ہے جو ناقص اور کامل میں ہونا چاہئے،

فرشتوں پر ایمان

وَمَلٰٓئِكَتِهٖ

ملائکہ کا لفظ جمع ہے، اس کا واحد مَلَک مِلَاک اور مالک تین طرح سے مستعمل ہی اسکے لغوی معنی قاصد اور "رسول" کے ہیں اسی لئے قرآن پاک میں ملائکہ کے لئے رُسُل کا لفظ بھی آیا ہی، جس کے معنی قاصد اور "پیام رسان" کے ہیں، ان سے مراد وہ غیر مادی مگر مخلوق نیک ہستیاں یا ارواح ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق عالم اور اس کے اسباب و عمل کے کاروبار کو چلا رہی ہیں، اگر یہ عالم ایک مشین ہے تو ملائکہ اسکا انجن اور اس کے کل پرزوں کو حرکت دینے والی قوتیں ہیں، جو خدا کے مقررہ احکام اور قوانین کے مطابق انکو حرکت دے رہے ہیں اور چلا رہے ہیں یعنی وہ خالق اور اسکی مخلوقات کے درمیان پیام رسانی اور سفارت کی خدمت اسطرح انجام دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حکم اور مرضی کو اُن پر القا کرتا ہے، اور وہ ایک بے اختیار محکوم کی طرح اسکو مخلوقات میں جاری اور نافذ کرتے ہیں، انکو خود نہ کوئی ذاتی اختیار ہی اور نہ انکا کوئی ذاتی ارادہ ہے، وہ سرتاپا اطاعت ہیں اور خدا کے حکم سے سرمو تجاوز نہیں کرتے، گویا ان کی خلقت طاعت اور فرمانبرداری کیلئے کی گئی ہی، دنیا پر رحمت یا عتاب جو کچھ نازل ہوتا ہے وہ انہی کے ذریعہ سے ہوتا ہی، اور خدا

انبیا پر اپنے جو احکام اتارتا یا ان سے کلام کرتا ہے، وہ انہی کی وساطت سے کرتا ہے،
دنیا کے تمام مذاہب بلکہ قدیم یونانی مصری فلسفہ میں بھی اس قسم کی ہستیوں کا وجود تسلیم کیا گیا ہے، صابئی مذہب میں یہ ستاروں اور سیاروں کی صورت میں مانے گئے ہیں، یونانی مصری (اسکندری) فلسفہ میں انکا نام عقولِ عشرہ (دس عقلیں) رکھا گیا ہے اور ساتھ ہی نو آسمانوں کے اندر بھی الگ الگ ذی ارادہ نفوس تسلیم کئے گئے ہیں، بلکہ خالص یونانی فلسفہ میں بھی بعض غیر مادی ارواحِ مجردہ کا پتہ لگتا ہے، جنہیں سب سے اہم لوگس کا تخیل ہے: جس سے مقصود وہ اوّلین ہستی ہے جسکو خدا نے تمام کائنات کی پیدائش کا ذریعہ اور واسطہ قرار دیا ہے اور جسکو اہلِ فلسفہ عقلِ اوّل سے تعبیر کرتے ہیں، پارسیوں میں ان ہستیوں کا نام امشاسپند ہے اور اُنکی بے شمار تعداد قرار دیگئی ہے، یہودی انکو "کروبیم" کہتے ہیں، اور اُن میں سے خاص خاص کے نام جبریل اور میکائیل وغیرہ رکھتے ہیں، عیسائی بھی انکو انہی ناموں سے یاد کرتے ہیں اور جبریل و روح القدس وغیرہ الفاظ سے بعض کی تعبیر کرتے ہیں، ہندوؤں میں وہ دیوتاؤں اور دیویوں کے نام سے روشناس ہیں جاہل عرب انکو خدا کی بیٹیاں کہہ کر پکارتے تھے، بہرحال یہ تمام مختلف صحیح اور غلط نام ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں، جس سے مراد وہ روحانی وسائط ہیں، جو صانع و مصنوعات اور خالق و مخلوقات کے درمیان اُسکے حکم کے مطابق عمل پیرا اور کارفرما ہیں،
مذاہب سابقہ میں ان غیر مادی ذی روح مخلوق ہستیوں کی حیثیت نہایت مشتبہ تھی وہ کبھی مخلوق کہی جاتی تھیں، اور کبھی خدائی کے مرتبے تک بھی بلند کر دیجاتی تھیں، ہندوؤں کے دیوتاؤں اور دیویوں کی یہی کیفیت تھی، پارسیوں میں امشاسپند کا بھی یہی حال تھا کہ کبھی انکی حیثیت

فرشتوں کی رہتی تھی، کبھی وہ خدا کے مقابل نچاتی تھیں، اور کبھی خود خدا اُن میں سے ایک ہو جاتا تھا
ہندوؤں کی طرح پارسیوں میں بھی وہ قابل پرستش سمجھی جاتی تھیں، انکے نزدیک سب سے عالی
رتبہ امشاسپند تھے، اور اُن کے تحت میں ۳۳، پھر ان میں سے ہر ایک کے ماتحت ہزاروں تھے،
اور چونکہ پارسی نیکی اور بدی کے دو متقابل خداؤں کے قائل تھے، اسلئے دونوں کے ماتحت اچھے اور بُرے
فرشتوں کی بیشمار تعداد تھی، نیکی کے فرشتے براہِ راست نیکی کی چیزوں کو اور بُرائی کے فرشتے مصیبتوں
اور ہلاکتوں اور بُرائیوں کو دنیا میں پیدا کرتے تھے، اور اپنے اپنے خدا کی طرف سے ان اشیاء پر حاکم
سمجھے جاتے تھے، دونوں خدا اپنی اپنی فوجوں اور لشکروں کے پرے لیکر باہم نبرد آزما رہتے تھے، یہ بھی انکا
اعتقاد تھا کہ ہر امشاسپند یا فرشتہ کے ساتھ ایک یزد یعنی مادہ (فرشتہ) بھی ہوتی تھی، جو اُسکی بیوی تھی،
ہندوؤں میں نر دیوتاؤں اور مادہ دیویوں کا تصور تھا، مگر ان نر و مادہ ہستیوں میں کسی نر کو کسی مادہ
سے خصوصیت خاص نہ تھی، بلکہ ہر ایک جنس کا ہر فرد دوسری جنس کے ہر فرد سے لطف اندوز ہو سکتا
تھا، یہودیوں میں فرشتوں کی حیثیت ایسی تھی کہ اُن کی تقدیس اور شانِ وصفت خدا سے شبہ ہو جاتی تھی،
نظر آنے والے فرشتہ کی تعظیم کیجاتی تھی، اسکے آگے جھکا جاتا تھا، اور اسکو خداوند! کہکر اس طرح خطاب کیا جاتا
تھا کہ کہیں کہیں یہ شبہہ ہو جاتا ہے کہ خدا فی الحقیقت ہے، یا فرشتہ (تکوین ۱۶، ۱۳، ۱۸، ۲، ۳، ۲۲) وہ کبھی کبھی خدا کے بیٹے بھی
کہے جاتے تھے (تکوین ۶، ۲) عیسائیوں میں ان میں سے بعض روح القدس خدا کا ایک جزو تسلیم ہو کر تثلیث کا رکن ہے،
صابئیوں میں فرشتوں کی قربانی کیجاتی تھی، انکے ہیکل بنائے جاتے تھے، اور اُن کو مظہر خدا تسلیم کیا
جاتا تھا، عربوں میں فرشتے مادہ سمجھے جاتے تھے، وہ خدا کی بیٹیاں کہہ کر پکارے جاتے تھے، انکی پرستش
ہوتی تھی، اور سمجھا جاتا تھا کہ وہ خدا کے دربار میں سفارشی ہونگے، یونانیوں میں عقلِ اوّل اور عقولِ عشرہ

تمام عالم کے خالق، کارفرما اور مرجعِ کل مانے گئے، اور خدا کو معطل ٹھہرایا گیا،

اسلام نے آکر ان تمام عقائد کو مٹا دیا، خدائی اور ربوبیت کی ہر صفت سے فرشتے محروم بتائے گئے، انکی پرستش ناجائز کی گئی، نر و مادہ کی مادی جنسیت سے وہ پاک کئے گئے، اور انسانوں کو ان پاک مخلوقات کی غلامی و بندگی سے آزاد کیا گیا، ان کی تعداد و شمار اور درجہ بندی کا کوئی تخیل باقی نہیں رکھا گیا، انکی ہستی خدائے تعالیٰ کے سامنے ایک سراپا مطیع و فرمانبردار غلام کی قرار دیگئی جس کا کام شب و روز صرف آقا کا حکم بجالانا ہے، عالم میں اُنکا کسی قسم کا تصرف نہیں مانا گیا، اور نہ نیکی بدی کی دو تقسیمیں کی گئیں نہ وہ الگ الگ جنس مخلوقات کے حاکم و منتظم قرار دیئے گئے، قرآن میں انکی ہستی صرف اس حد تک تسلیم کی گئی ہے کہ وہ غیر مادی ذی روح مخلوقات ہیں جن کا کام خدا کی حمد و ثنا اور اطاعت و فرمانبرداری ہے، خالق اور اُسکے مخلوقات کے درمیان وہ پیغام رسانی کا ذریعہ ہیں، خدا کے حکم کے مطابق وہ مخلوقات کے کارخانہ کو چلا رہے ہیں، لیکن اس چلانے میں خود اُن کی ذاتی مرضی اور ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہے، اسی لئے قرآن پاک نے یہودیوں کی طرح اُن کو خداوند کا خطاب نہیں دیا، نہ پارسیوں کی طرح اُنکو قابلِ پرستش کے لقب سے یاد کیا، نہ ہندوؤں کی طرح دیو اور دیوتا دیبی کہا، بلکہ صرف "ملک" اور رسول کے الفاظ استعمال کئے جنکے لفظی معنی فرستادہ، قاصد، پیغام رساں اور ایلچی کے ہیں، بلکہ قرآن نے آغازِ خلقتِ انسانی کے قصہ میں یہ حقیقت واضح کر دی کہ ملائکہ اس لائق نہیں ہیں کہ آدم اُنکو سجدہ کرے، بلکہ آدم میں یہ صلاحیت ہے کہ ملائکہ کا مسجود بنے، چنانچہ اسکو مرتبۂ علم میں اُن سے بالاتر ٹھہرایا گیا، اور خدا کی جس تسبیح اور تقدیس کا انکو دعویٰ تھا اس کے باوجود جب انسان کا جوہرِ طبیعت انھوں نے پہچانا تو ان کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ،

سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا — تو پاک ہے ہمکو کوئی علم نہیں لیکن جو تو نے

اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (بقرہ ۔۴) ہمکو سکھلیا بیشک تو جاننے والا اور حکمت والا ہے

اس قصہ نے شروع ہی میں یہ واضح کر دیا کہ وہ ہستیاں جن کو دوسرے مذاہب نے انسانوں کا دیوتا، انسانوں کا خداوند اور کبھی خدا کا ہمسر اور متصرف مطلق قرار دیا تھا، اسلام میں اُنکی حیثیت انسان کے مقابلہ میں کیا ہے؟ انسان اور فرشتے خدا کے سامنے برابر کے مخلوق اور بندے اور کیا ان عاجز و درماندہ ہیں، انسانوں کو مادی اشیاء پر حکومت بخشی گئی ہے کہ اپنے نفع و نقصان کیلئے ان سے کام لے سکیں اور ملائکہ کو اپنے حضور میں متعین فرما گیا ہے، کہ آسمان و زمین اور پوری مملکت الٰہی میں خدا کے احکام کی تعمیل و تنفیذ کریں،

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اسباب و علل کا ایک سلسلہ رکھا ہے، جو ہر جگہ کارفرما نظر آتا ہے، لوگ انہی ظاہری اسباب و علل کو دیکھ کر دھوکا کھاتے ہیں اور انکی پرستش کرنے لگتے ہیں، مثلاً آگ جلاتی اور روشن کرتی ہے، اسکو دیکھ کر آتش پرست اور مادہ پرست یقین کرتے ہیں کہ خود آگ میں جلانے کی طاقت ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ آتش پرست اُس کے آگے سجدہ میں گر پڑتے ہیں، اور مادہ پرست گو اپنا سر اس کے آگے نہیں جھکاتے، مگر اُن کا دل جھک جاتا ہے، کیونکہ وہ بھی یہ ایمان رکھتے ہیں کہ طاقت خود آگ کے اندر موجود ہے، کچھ لوگ ہیں، جو یہ سمجھتے ہیں کہ جلانے کی طاقت آگ میں نہیں ہے، بلکہ اس کا ایک مستقل دیوتا یا فرشتہ ہے، جو اس پر حکمراں ہے، یہ لوگ اس آگ کے فرمانروا کے سامنے جھکتے ہیں اسلام کے نظریۂ توحید نے اس شرک کو بھی مٹایا، اور بتایا کہ آگ اور آگ کا اگر کوئی فرشتہ ہے، تو وہ کل کے کل اُسی ایک رب العٰلمین اور فرمانروائے ارض و سما کے حکم کے تابع ہیں، اسی کے آگے جھکنا چاہیئے اور اُسی کی بندگی کرنی چاہیئے،

اسلام میں فرشتوں کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا جواب اُن نصوص سے مل سکتا ہے جو اُن کے

کاموں کے متعلق قرآن میں مذکور ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان سے مراد وہ غیر مادی ذی روح ہستیاں ہیں جو احکام خداوندی اور پیغام الٰہی کو دنیائے خلق تک پہنچاتے اور نافذ کرتے ہیں اور وہ اسباب وعلل جن کو مادہ پرست ذاتی طور سے موثر جانتے اور جن کو بت پرست دیوتاؤں کا کرشمہ سمجھتے ہیں انکو فرشتے احکام الٰہی کے مطابق کام میں لگاتے اور مرضیِ الٰہی کو پورا کرتے ہیں،

عقلی حیثیت سے یہ عقیدہ بھی اسی طرح قبول اور انکار کے قابل ہے، جس طرح عقیدات کے دوسرے عقائد اور نظریے ہیں، جن کی تصدیق یا تکذیب عقل کی دسترس سے باہر ہے، اسلئے اس عقیدہ کو یہ کہکر کوئی رد کرنے کی جرات نہیں کر سکتا کہ یہ خلافِ عقل ہے، بلکہ جس طرح قیاسات اور عقلی نکتہ پردازی سے دوسرے عقلی مباحث کا فیصلہ کیا جاتا ہے، ویسا ہی یہاں بھی کیا جا سکتا ہے، اشیاء میں خصائص اور لوازم کے وجود اور ان کے اسباب وعلل کا مسئلہ عقلاء میں ہمیشہ اختلافات کا محل رہا ہے اور یہ معما آج بھی اسی طرح لاینحل ہے، جس طرح پہلے تھا، اسکا حل سائنس کی مادی تحقیقات اور تجربوں کی طاقت سے باہر ہے اور فلسفہ بھی اسکی گتھی سلجھانے سے عاجز ہے اسلئے اگر حکماء ملحدین کی شاہراہ سے الگ ہٹ کر اسکے حل کی کوئی صورت ارباب مذاہب نے نکالی ہے تو وہ محلِ اعتراض نہیں ہو سکتی اور نہ خلافِ عقل کہی جا سکتی ہے، کائنات کے حوادث میں جس طرح مادی علل واسباب کارفرما ہیں، اسی طرح ان سے بالاتر روحانی علل واسباب بھی ساتھ ساتھ کارفرما ہیں اور ان دونوں قسم کے اسباب کے توافق سے حوادث کا وجود ہوتا ہے، یہی سبب ہے کہ انسان اکثر مادی علل واسباب موجود ہونے یا نہ ہونے کے باوجود کامیاب یا ناکام ہوتا ہے اور اس کا نام بخت واتفاق رکھتا ہے، حالانکہ مسئلہ علل واسباب کو مان لینے کے بعد بخت واتفاق کوئی چیز نہیں رہ جاتا یہی روحانی علل واسباب

ہیں جنکا سررشتہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مرضی سے ان فرشتوں کو سپرد کیا ہے، جو فرمانبردار چاکروں کی حیثیت سے نظام عالم کو چلا رہے ہیں، ہمارے اور دوسرے متکلمین اور حکما کے اصطلاحات میں فرق یہ ہے کہ وہ ملائکہ کی تعبیر اسباب و علل کے "قوائے طبعی" سے کرتے ہیں اور ہم قوائے روحانی سے،

اس تقریر کا یہ منشا نہیں ہے کہ اشیا میں خواص و طبائع، اور اس مادہ کی ملکیت میں مقررہ طبعی اصول و قوانین موجود نہیں ہیں، بلکہ یہ مقصد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ازلی اندازہ (تقدیر) کے مطابق ہر چیز کے خصائص و طبائع اور اصول و قوانین مقرر کر کے ملائکہ کو حکم دیا ہے کہ وہ اسکو ان ہی اصول و طبائع مقررہ کے مطابق چلاتے رہیں،

سمجھنے کے لئے اسکی صحیح مثال خود انسان بلکہ ہر جاندار ہستی ہے، مخلوقات کی دو قسمیں ہیں ذی روح اور غیر ذی روح، ذی روح مخلوقات کے اکثر افعال و حرکات اسکی روح کی ارادی قوت کی وساطت سے انجام پاتے ہیں، وہی روح اسکے ہاتھ پاؤں اور تمام اعضا، بلکہ ہر عضو کے ایک ایک رگ و ریشہ پر حکمراں اور مسلط ہے، باایں ہمہ وہ روح اصول مقررہ کے تحت ہی اعضا سے کام لیتی ہے اور ان اصول سے باہر نہیں جاتی اسیطرح غیر ذی روح اشیا میں بر و بار سے لیکر دریا پہاڑ، چاند اور سورج تک پر ارواح مقرر ہیں، جو ان اشیا سے خدا کے اصول مقررہ کے مطابق یکساں افعال و حرکات کا صدور کراتی ہیں جس طرح ہماری روح اپنے اعضا اور اعضا کے ذریعہ سے مادہ میں جو تغیرات پیدا کرتی ہے، وہ اشیا کے مقررہ خواص و طبائع کے سہارے پر کرتی ہے اسیطرح ملائکہ بھی انہی مقررہ خواص و طبائع کے ذریعہ اپنے مفوضہ فرائض انجام دیتے ہیں،

الغرض جس طرح ہمارے ارادی افعال اور حکم الٰہی کے درمیان ہماری انسانی ارواح و نفوس واسطہ ہیں اسیطرح تمام عالم مخلوقات اور کائنات کے افعال اور حکم الٰہی کے درمیان یہ ملکوتی ارواح اور

نفوس مجردہ واسطہ ہیں اور جس طرح ہماری انسانی ارواح کی اس واسطہ سے خدا کی حکومت علی الاطلاق پر کوئی اعتراض نہیں واقع ہوتا اسیطرح ان ملکوتی ارواح کی وساطت سے بھی خدا کی علی الاطلاق حکومت میں کوئی نقص نہیں واقع ہوتا نہیں یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہی کہ ہمارے ارادی افعال میں اختلافات کی اتنی نیرنگیاں نظر آتی ہیں، مگر ہمارے اور عالم کائنات کے جو نوعی افعال ہیں اُن میں اختلافات اور نیرنگیوں کے بجائے یکسانی، ہمرنگی اور عدم اختلاف پایا جاتا ہے؟ کیونکہ انسان نے ارادہ پاکر کسی قدر ذاتی اختیار پایا ہے، اور یہی ذاتی اختیار اُسکے افعال اختیاری کی ذمہ داری، بازپرس، اور مواخذہ کی بنیاد ہے، اور جس کی بنا پر وہ اپنی اطاعت کے ذریعہ سے ثواب اور عصیان کرکے عقاب کا مستحق ہوجاتا ہی، مگر دنیا کی یہ ملکوتی ارواح مجردہ یعنی یہ ملائکہ ذاتی ارادہ اور اختیار سے تمامتر محروم ہوکر صرف اطاعت فرمانبرداری اور انقیاد کیلئے پیدا کئے گئے ہیں، اسلئے اُن میں عصیان، تمرد، سرکشی، اور حکم الٰہی سے انحراف کی کوئی صلاحیت نہیں ہی، اسی بنا پر اشیاء کے تمام نوعی افعال و حرکات اور خصائص میں یکسانی ہمرنگی، اور عدم اختلاف پایا جاتا ہے یہی حقیقت ہے جو فطرت، طبیعت اور نوعی خاصیت کی اصطلاحی کی صورتوں میں ہمارے لئے دھوکے اور اشتباہ کا باعث بن گئی ہے،

۱- اب ہم کو تعلیماتِ نبوی یعنی آیات و احادیث سے ملائکہ کی حیثیت کو روشن کرنا چاہئے، ملائکہ کی سفارت و پیام رسانی، یعنی خالق کے احکام اور مرضی کو مخلوقات تک پہنچانا، اور اس کام میں اُن کا بے اختیار ہونا ان دو آیتوں سے ثابت ہوتا ہے،

اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ط اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ بَصِیْرٌ

خدا ہی ہی جو فرشتوں اور آدمیوں میں سے پیام رساں اور قاصد منتخب کرتا ہی، بیشک خدا سنتا

وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (البقرہ-۱۰) کا حال جانتا ہی اور تمام کاموں کا مرجع خدا ہی ہے

یعنی پیام رسانی اور سفارت کے سوا اُنکو اصل حکم میں کوئی دخل نہیں ہی اختیارات سب خدا کے ہاتھ میں ہیں اور وہی تمام امور اور انتظامات کا مرجع کل ہی، دوسری جگہ ہے،

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَۃٍ مَّثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ مَا یَفْتَحِ اللّٰہُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَۃٍ فَلَا مُمْسِکَ لَھَا وَمَا یُمْسِکْ فَلَا مُرْسِلَ لَہٗ مِنْۢ بَعْدِہٖ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (فاطر-۱)

حمد ہو اُس خدا کی جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، اور فرشتوں کو دو دو تین تین اور چار چار شہپر بازوؤں والے پیام رساں بنانے والا ہی، وہ پیدائش میں جو چاہتا ہے بڑھاتا ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہی، وہ لوگوں کیلئے رحمت کھولے تو کوئی اس کا روکنے والا نہیں اور روکے تو کوئی چھوڑنے والا نہیں، اور وہی غالب دانا ہے،

اس آیت پاک میں بھی یہی حقیقت ظاہر کی گئی ہی کہ ملائکہ سفارت اور درمیانگی کے علاوہ اور کوئی اختیار نہیں رکھتے، رحمت کے دروازوں کا کھولنے والا اور بند کرنے والا صرف خدا ہے یہ تعلیم اس غلط عقیدہ کی تردید کرتی ہے، کہ فرشتوں کو دنیا کی حکمرانی اور انتظامات میں کوئی ذاتی دخل ہے، یا اُن میں الوہیت یا ربوبیت کا کوئی شائبہ ہے، یا وہ پرستش کے قابل ہیں یا ان کی دہائی بھی پکارنی چاہیئے،

۲- ملائکہ خدا کے احکام کو دنیا میں جاری کرتے ہیں،

إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلٰئِكَةِ أَنِّي
مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا ط (انفال)

یاد کرو جب تیرا پروردگار فرشتوں کو وحی
کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تم مومنوں کو

تَنَزَّلُ الْمَلٰئِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا
بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ أَمْرٍ ط (قدر)

اس میں فرشتے اور روح اپنے پروردگار کے
حکم سے ہر کام کو لیکر نیچے اترتے ہیں،

وہ جس طرح احکام لیکر اترتے ہیں اسی طرح دربار الٰہی تک عروج بھی کرتے ہیں،

تَعْرُجُ الْمَلٰئِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ (معارج)

فرشتے اور روح اس تک چڑھتے ہیں،

موت کے وقت روح کا قبض کرنا انہی سے متعلق ہے،

قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي
وُكِّلَ بِكُمْ (سجدہ ۱۱)

کہدو کہ موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر ہے، وہ
تم پر موت طاری کریگا،

وَلَوْ تَرٰى إِذِ الظّٰلِمُونَ فِي غَمَرٰتِ
الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوا أَيْدِيهِمْ
أَخْرِجُوا أَنْفُسَكُمْ (انعام ۱۱)

اور اگر دیکھو تم جب گنہگار موت کی سکرات
میں ہوں اور فرشتے اپنے ہاتھوں کو پھیلائے
ہوں کہ نکالو اپنی جانوں کو،

وَلَوْ تَرٰى إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا
الْمَلٰٓئِكَةُ (انفال ۷)

اور اگر دیکھو جب فرشتے کافروں کو
موت دے رہے ہوں،

اسی کے ہم معنی اور بھی کئی آیتیں ہیں جن سے ظاہر ہے کہ حکم الٰہی کے مطابق موت و فنا کی تدبیر علل و اسباب کی انہی روحانی قوتوں سے متعلق ہے،

دنیا میں کسی شے کے وجود، انقلاب اور فنا کے لئے کسی ایک علت و سبب کا وجود کافی نہیں ہے،

بلکہ ضروری ہی کہ اُس کے متعلقہ علل و اسباب کی تمام کڑیاں باہم پیوستہ اور ایک دوسرے کی معاون ہوں اور موانع اور عوائق معدوم ہوں، یہ متعلقہ علل و اسباب کا توافق اور موانع کا انسداد ہی تدبیر ہے جو بحکم الٰہی ملائکہ کے سپرد ہے، اس تدبیر کو کبھی اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا ہی یُدَبِّرُ الْاَمْرَ (وہ کام کی تدبیر کرتا ہے) اور کبھی ملائکہ کی طرف،

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا، فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا، (نازعات-۱)

(ڈوب کر (روحوں کو) کھینچنے والوں کی قسم ہے (رگوں کی) گرہوں کو کھولنے والوں کی قسم ہے (اس فضائے آسمانی میں) تیرنے والوں کی قسم ہے (اس فضائے آسمانی میں) دوڑ کر (ماوی اسباب و علل پر سے) آگے بڑھ جانے والوں کی قسم ہے)

یہی ملائکہ خدا اور رسولوں کے درمیان بھی سفیر ہیں،

اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَا یَشَآءُ، (شوریٰ-۵)

(یا خدا آدمی سے اسطرح باتیں کرتا ہی کہ اپنا ایک ایک سفیر بھیجتا ہے تو وہ اس (خدا) کی اجازت سے جو وہ (خدا) چاہتا ہی وحی کرتا ہے)

دوسری جگہ ہے،

یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ (نحل-۱)

(خدا روح کے ساتھ فرشتوں کو اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہی اتارتا ہی،

خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہے،

؎ صحیح بخاری کتاب بدء الخلق باب ذکر الملائکہ میں ہی کہ رحم مادر میں ایک فرشتہ مقرر ہی جو بچہ کی نسبت قضائے الٰہی کو تحریر کرتا ہی

فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ — بس اُس (جبریل فرشتہ نے قرآن کو خدا کے

(بقرہ-۱۲) — حکم سے تمہارے دل پر اُتارا،

۴- یہ لوگوں پر بشارت اور عذاب لیکر بھی اترتے ہیں،

وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرَىٰ — ہمارے سفیر ابراہیم کے پاس بشارت لیکر آئے

اسی طرح حضرت زکریا اور حضرت مریم علیہما السلام کو انھوں نے بشارت دی،

إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ — میں تیرے پروردگار کا فرستادہ ہوں کہ

لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا (مریم-۲) — تجھے ایک پاک لڑکا بخشوں،

حضرت لوطؑ کے پاس اُن کی قوم کی بربادی کے لئے آئے اور

قَالُوا يَا لُوطُ إِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ (ھود-۹) — کہا اے لوط ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں

اس کے بعد یہ فرشتے حضرت لوطؑ کی قوم پر کوہ آتش فشاں کا منہ کھول دیتے ہیں اور تمام قوم برباد ہوجاتی ہے، یہ کام اگرچہ فرشتوں نے انجام دیا تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے اسکو خود اپنی طرف منسوب کیا ہے، کیونکہ وہ فرشتوں کے ذاتی اختیار کے بجائے خدا ہی کے حکم سے ہوا تھا،

فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا — تو جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے اس کے اوپر

سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّن — کو نیچے کردیا، (یعنی زمین اُلٹ دی) اور

سِجِّيلٍ مَّنضُودٍ (ھود-۷) — اس پر تہ بہ تہ پتھروں کی بارش کی،

۵- فرشتے انسانوں کے اعمال کی نگہبانی اور نگرانی کرتے ہیں، اور اُن کے ثواب و گناہ کے کاموں کو محفوظ رکھتے ہیں،

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ
يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ (انفطار-۱)

بیشک تم پر نگہبان ہیں جو بزرگ ہیں لکھنے
والے ہیں، جو تم کچھ کرتے ہو، اسکو وہ جانتے ہیں

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ
عَتِيْدٌ ۝ (ق-۲)

کوئی بات منہ سے نہیں نکالتا، لیکن اس کے
پاس ایک نگہبان حاضر ہے،

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَ
مَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۢ
بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ
مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ
مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ، (رعد-۲)

تم میں سے کوئی بات چھپا کر کہے یا زور سے کہے
یا وہ رات میں چھپے یا دن کو کرے، خدا کے
تعاقب کرنے والے اس کے سامنے اور
اس کے پیچھے ہیں، خدا کے حکم سے اس کی
نگرانی کرتے ہیں،

وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۭ حَتّٰٓى اِذَا
جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ
رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ (انعام-۸)

اور وہ (خدا) تم پر نگراں بھیجتا ہے یہاں تک کہ تم
جب کسی کی موت آتی ہے تو ہمارے قاصد اسکی
پوری کرتے ہیں اور وہ اپنے اس کام میں کمی نہیں

۶- وہ انسانوں کے اعمال کے مطابق اُن پر خدا کی رحمت یا لعنت کے نزول کا ذریعہ اور واسطہ ہیں

لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ
الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ
تُوْعَدُوْنَ (انبیاء-۷)

نیکوکاروں کو وہ بڑی گھبراہٹ (قیامت) غمگین نہ کریگی
اور فرشتے انکا آگے بڑھ کر استقبال کرینگے (کہ)
یہی
وہ دن ہے جسکا تم سے وعدہ کیا گیا تھا،

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ
جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے

اَسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ	پھر اس پر قائم رہے، ان کے پاس فرشتے یہ کہتے ہوئے
اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا	اتریں گے کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور اس جنت
بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ	کی خوشخبری سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا،
نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا	ہم ہیں جو تمہاری پہلی اور اس دوسری زندگی
وَفِي الْاٰخِرَةِ (حٰمٓ سجدہ - ۴)	میں تمہارے رفیق ہیں،
هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ (احزاب - ۶)	وہی خدا تم پر رحمت بھیجتا ہے، اور اسکے فرشتے
اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ (احزاب - ۷)	اللہ اور اسکے فرشتے نبی پر رحمت بھیجتے ہیں،
وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ	اور جو زمین میں ہیں، ان کے لئے وہ خدا سے
(شوریٰ - ۱)	مغفرت کی دعا مانگتے ہیں،

اسی طرح وہ بدکاروں پر لعنت بھی کرتے ہیں،

اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ	اُن کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ کی اور فرشتوں
وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (آل عمران - ۱۱)	کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے
اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ	جو کفر کی حالت میں مرگئے، ان پر اللہ کی
كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ	اور فرشتوں کی، اور لوگوں کی سب کی
وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (بقرہ - ۱۹)	لعنت ہے،

۷۔ جنت اور دوزخ کا کاروبار بھی ملائکہ کے زیر اہتمام ہوگا،

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ	اور کفر کرنے والے گروہ در گروہ کیسے دوزخ

زُمَرًا حَتّٰى إِذَا جَآءُوهَا فُتِحَتْ أَبْوَابُهَا

وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ

مِّنكُمْ، (زمر-۸)

وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ

زُمَرًا حَتّٰى إِذَا جَآءُوهَا وَفُتِحَتْ

أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا

سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا

خَالِدِينَ، (زمر-۸)

وَالْمَلَائِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِم

مِّن كُلِّ بَابٍ سَلَامٌ عَلَيْكُم بِمَا

صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ (رعد-۳)

عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ (تحریم)

وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَلَائِكَةً (مدثر)

کی طرف لیجائیں گے، یہانتک کہ جب اُسکے پاس

پہنچیں گے تو اسکے دروازے کھولے جائیں گے اور

اُسکے نگہبان فرشتے کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس

اور جو اپنے پروردگار سے ڈرتے تھے وہ گروہ

در گروہ جنت میں لیجائے جائیں گے، یہانتک کہ جب

وہ اُسکے پاس پہنچیں گے، اور اُسکے دروازے کھولے

جائیں گے اور اسکے پاسبان کہیں گے تم پر سلامتی ہو

خوش خوش جنت میں ہمیشہ کیلئے داخل ہو جاؤ

اور ان (جنتیوں) پر فرشتے ہر دروازہ سے

داخل ہو ہو کر کہیں گے، تم پر سلامتی ہو یہ تمہارے

صبر کا بدلہ ہے، یہ کیسا اچھا عاقبت کا گھر ہے

اس (دوزخ) پر سخت دل، طاقتور فرشتے مقرر ہیں

اور ہم نے دوزخ کا اہلکار فرشتوں ہی کو بنایا ہے

۵۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ قدس کے حاضر باش ہیں،

وَتَرَى الْمَلَائِكَةَ حَافِّينَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ

يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ (زمر-۸)

لَا يَسَّمَّعُونَ إِلَى الْمَلَإِ الْأَعْلَى (صافات)

اور تم فرشتوں کو دیکھو گے کہ عرش کے اردگرد

احاطہ کئے ہوئے ہیں پروردگار کی حمد و ثنا میں

اعلیٰ اہل مدار کی باتیں وہ (شیاطین) نہیں سن سکتے

مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَإِ الْأَعْلَىٰٓ — مجھے خدا کے بلند درباریوں کا علم نہیں جب

إِذْ يَخْتَصِمُونَ، (ص-۵) — وہ باتیں کرتے ہیں،

قیامت کے دن بھی یہ تختِ الٰہی کے حامل اور اس بارگاہ کے حاضر باش ہونگے جو ہر وقت اُس کے ہر حکم کو بجالانے کے لئے تیار رہیں گے،

وَالْمَلَكُ عَلَىٰٓ أَرْجَائِهَا ۚ وَيَحْمِلُ عَرْشَ — اور فرشتے اس کے کنارے پر ہونگے اور تیرے پروردگار

رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَانِيَةٌ (حاقہ) — کے تخت کو آٹھ (فرشتے) اس دن اپنے اوپر اٹھائے ہونگے،

كَلَّآ إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا وَجَاءَ — ہرگز نہیں جب زمین ریزہ ریزہ کر دیجائیگی اور

رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا (فجر-۱) — تیرا رب تشریف فرما ہوگا اور فرشتے قطار

يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا (نبا-۲) — جس دن روح اور فرشتے صف باندھے کھڑے ہونگے

۹- فرشتے خدا سے سرکشی اور اسکی نافرمانی نہیں کرتے ہمیشہ اسکی تہلیل و تقدیس اور حمد و ثنا میں مصروف رہتے ہیں، اُس کے جلال و جبروت سے ڈرتے اور کانپتے رہتے ہیں اور اُس کے حضور میں اہلِ زمین کے لئے عموماً اور نیکوکاروں کے لئے خصوصاً مغفرت کی دعا مانگا کرتے ہیں،

وَالْمَلَائِكَةُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ — اور فرشتے حمد کے ساتھ اپنے رب کی تسبیح کرتے

وَيَسْتَغْفِرُونَ لِمَنْ فِي الْأَرْضِ ۗ — رہتے ہیں اور زمین والوں کی بخشش کی دعا مانگا کرتے

أَلَآ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (شوریٰ) — ہیں ہشیار کہ بخشنے والا اور رحم کرنیوالا خدا ہی ہے

یعنی یہ دھوکا نہ ہو کہ فرشتوں کی دعا ہی رحمت و برکت کا ذاتی سبب ہے، بلکہ بخشش اور رحمت کرنیوالا صرف وہی خدائے واحد ہے اور یہ بخشش و رحمت اسی کے دستِ اختیار میں ہے،

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ
حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ
يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ
آمَنُوْا، (مومن-۱)

جو فرشتے عرش کو اٹھائے ہیں، اور جو اسکے
پاس ہیں وہ سب اپنے پروردگار کی حمد اور
تسبیح کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور
ایمان لانے والوں کی بخشایش کی دعا کرتے ہیں،

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط
وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ
عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ يُسَبِّحُوْنَ
اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ،
(انبیاء-۲)

آسمانوں میں اور زمین میں جو کوئی ہے اسی کا ہے
اور جو اسکے پاس ہیں (یعنی فرشتے) وہ اسکے
سامنے اپنی عبودیت کے اظہار سے غرور نہیں کرتے
اور نہ اسکی عبادت سے تھکتے ہیں وہ رات دن
خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں اور سست نہیں پڑتے،

بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ
بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ
..... وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ
(انبیاء-۲)

بلکہ وہ بزرگ بندے ہیں جو بات میں اس خدا
پر پیشدستی نہیں کرتے اور وہ اسکے حکم پر عمل
کرتے ہیں..... اور وہ اس کے خوف سے
ترساں رہتے ہیں،

لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَ
يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (تحریم-۱)

خدا انکو جس بات کا حکم دیتا ہے وہ اس میں اسکی
نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا انکو

وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ
مِنْ خِيْفَتِهٖ (رعد-۲)

اور بجلی کی کڑک اور فرشتے خدا کے خوف سے اسکی حمد
و تسبیح کرتے ہیں،

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوَاتِ وَمَا	اور آسمانوں میں اور زمین میں جو چارپائے
فِي الْأَرْضِ مِنْ دَابَّةٍ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَ	اور فرشتے ہیں وہ سب خدا کو سجدہ کرتے ہیں
هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ، يَخَافُونَ رَبَّهُمْ	اور اس کے سامنے اپنی بڑائی نہیں کرتے وہ
مِنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ	اپنے مالک سے جو اُن کے اوپر ہے ڈرتے رہتے
(نحل - ۶)	ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا انکو حکم دیا جاتا ہے

گذر چکا ہے کہ ملائکہ کا اعتقاد دنیا کے تمام مذہبوں اور قوموں میں کسی نہ کسی طرح رہا ہے، لیکن اُن کے اس اعتقاد میں بہت سی باتیں ایسی داخل تھیں جو توحید کامل کے منافی تھیں، اسکندریہ کے نو افلاطونی فلسفہ کے رو سے عقل اوّل کی اضطراری پیدائش کے بعد خدا کو معطل ہو جانا پڑا، اور فرشتوں کو عقول کی صورت میں اصلی کارفرما قرار دیا گیا تھا، عراق کے صابئی اجرام سماوی کی شکل میں اُنکی پرستش کرتے تھے اور ان ہی کو عالم کا فرمانروا مانتے تھے، یہود بھی انکو کسی قدر صاحب اختیار تصور کرتے تھے اور کبھی کبھی ان کو خداؤں کا درجہ دیتے تھے، جیسا کہ توراۃ و صحیفہ تکوین ۱۶ ر ۱۳-۱۸-۲ و ۳ و ۲۲ کے قصوں میں کہیں کہیں نظر آتا ہے، ان کو وہ خدا کے نبیوں کے خطاب سے بھی کبھی کبھی یاد کرتے تھے (تکوین ۶، ۲) ہندوؤں میں وہ دیوتا اور دیبی بن کر ایک طرف انسانی خصائص سے ملوث تھے اور دوسری طرف اپنے ذاتی اختیارات کے لحاظ سے چھوٹے خداؤں کے مرتبہ پر بھی فائز تھے، عیسائی ان میں سے بعض مثلاً روح القدس کو خدا کا ایک جزو تسلیم کرتے تھے اور یہ تثلیث کا ایک رکن تھا، عربوں میں فرشتے خدا کی بیٹیوں کا درجہ رکھتے تھے، وہ ان کی پوجا کرتے، اور اُن کو اپنے گناہوں کا شفیع سمجھتے تھے،

تعلیم محمدیؐ نے ان تمام عقائد باطلہ کو مٹادیا، اور ایک ایک کرکے اُن میں ہر عقیدہ کی تردید کردی اور بتایا کہ فرشتے بھی خدا کی دوسری مخلوقات کی طرح ایک مخلوق ہیں، اُن کو خدائی کا کوئی اختیار حاصل نہیں، وہ صرف خدا کی اطاعت، عبادت اور اُس کے احکام کی بجاآوری میں مصروف رہتے ہیں، اُن میں سے جس کے جو کام سپرد ہے وہ اُسی کو انجام دیتا ہے، وہ ہماری ہی طرح بندے محض ہیں، وہ نہ عبادت کے مستحق ہیں، نہ خدا کے بے اذن وہ شفاعت کا ایک حرف زبان سے نکال سکتے ہیں، اور نہ خدا کے سامنے کچھ عرض کرنے کی جرأت کرسکتے ہیں، یہودی ان کو خدا کے بیٹے اور عرب خدا کی بیٹیاں کہتے تھے، قرآن نے دونوں کی تردید کی اور بتایا کہ وہ انسانی خصائص اور میلانات سے پاک ہیں، وہ نہ مرد ہیں نہ عورت ہیں، نہ کھاتے ہیں، نہ پیتے ہیں، اور نہ خدائی کا دعویٰ کرسکتے ہیں، وہ خدا کے خوف سے ہمیشہ کانپتے اور لرزتے رہتے ہیں،

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ (انبیاء)

مشرکوں نے کہا کہ مہربان خدا نے اپنا لڑکا بنایا ہے، وہ اس سے پاک ہے، بلکہ یہ (فرشتے) اسکے معزز بندے ہیں، جو بات میں اس پر پیشدستی نہیں کرتے اور وہ اسکے حکم پر عمل کرتے ہیں خدا اُس جو انکے آگے اور پیچھے ہوتا ہے واقف ہے، وہ شفاعت نہیں کرتے لیکن اسی کی جس کیلئے خدا پسند کرتا ہے اور وہ خدا کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں اور ان میں سے جو یہ کہے کہ میں خدا ہوں تو اسکو بھی اسی طرح ہم جہنم کی

إِنَّمَا اللّٰهُ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ سُبْحٰنَهٗ

خدا تو ایک ہی ہی، وہ اس سے پاک ہی کہ

يَكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ

کوئی اولاد ہو، آسمانوں میں اور زمین میں

وَمَا فِي الْاَرْضِ ط وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا

جو کچھ ہے وہ اسکی ملکیت ہی، اور خدا کارساز و وکیل

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا

ہونا کافی ہی، مسیح کو اس سے عار نہ ہوگا کہ وہ

لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ط وَمَنْ

خدا کا بندہ ہی، اور نہ مقرب فرشتوں کو (اس سے عار ہے)

يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ

اور جو لوگ اسکی عبادت سے عار اور غرور کریں گے وہ

فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا (نساء ۱۲۳)

اُن سب کو اپنے پاس اکٹھا کریگا،

وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ

خدا اس کا حکم تم کو نہیں دیتا، کہ تم فرشتوں کو

وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ط اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ

اور پیغمبروں کو خدا بناؤ کیا تمکو مسلمان ہونے کے

بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (آل عمران ۸)

بعد کفر کرنے کا حکم دیگا،

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ

اور جس دن وہ سب کو جمع کریگا، پھر فرشتوں

لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ

سے کہیگا کہ کیا یہ مشرکین تمہیں کو پوجتے تھے، وہ

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ج

کہیں گے پاک ہی تو، تو ہمارا والی ہی، وہ وہ نہیں

بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ج اَكْثَرُهُمْ

ہیں بلکہ وہ جنوں کو پوجتے تھے، وہ اکثر ان ہی

بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ (سبا - ۵)

جنوں پر ایمان لائے ہیں،

يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ط

جس دن روح اور فرشتے صف بستہ خدا کے

لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ

سامنے کھڑے ہونگے تو کچھ بول نہ سکیں گے لیکن

الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا (نبا-۲)

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِي
شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْ بَعْدِ اَنْ
يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى (نجم)
اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ
مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ
قَوْلًا عَظِيْمًا، وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا
الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا وَمَا يَزِيْدُهُمْ
اِلَّا نُفُوْرًا قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ
كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ
سَبِيْلًا، سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا
يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا تُسَبِّحُ لَهُ
السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ
فِيْهِنَّ (اسرائیل ۴ ۵)
وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ
الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ
سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ وَ

وہ جسکو وہ مہربان اجازت دے اور وہ ٹھیک بات کہے
اور آسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں جن کی سفارش
کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی، لیکن اسکے بعد کہ
خدا جسکو چاہے اجازت دے اور پسند کرے،
کیا تمھارے لئے خدا نے بیٹوں کو پسند کیا، اور خود
فرشتوں میں سے لڑکیاں اپنے لئے پسند کیں تم یقیناً
بہت بڑی بات منھ سے نکالتے ہو، اور ہم نے
اس قرآن میں پھیر پھیر کر سمجھے کو باتیں بیان
کی ہیں، لیکن یہ انکی نفرت کو اور بڑھاتا ہی گیا اے
پیغمبر کہ اگر اس ایک خدا برحق کیساتھ اور بھی چند
خدا ہوتے تو اس تخت والے خدا کی طرف وہ راستہ
ڈھونڈھتے (کہ اسکے ہاتھ سے حکومت چھین کر خود
قبضہ کرلیں) یہ مشرک جو کہتے ہیں، خدا اس سے بلند
و برتر ہے، ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ انمیں ہے
اور ان مشرکوں نے فرشتوں کو جو رحمت والے خدا
کے بندے ہیں، عورتیں بنا دیا، کیا وہ انکی پیدائش
کے وقت حاضر تھے، ہم انکی گواہی لکھیں گے،

وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ (زخرف-۲)

اور ان سے اسکی بازپرس کی جائیگی اور انھوں نے کہا کہ اگر خدا چاہتا تو ہم اُن (فرشتوں) کو نہ پوجتے، انھیں اسکا (تحقیقی) علم نہیں، وہ صرف

قرآن پاک میں اس مفہوم کی اور بہت سی آیتیں ہیں، مگر یہاں استقصار مقصود نہیں، یہودیوں کا خیال تھا کہ فرشتے کھاتے پیتے بھی ہیں، چنانچہ توراۃ میں جہاں حضرت ابراہیمؑ کے پاس فرشتوں کے آنے کا ذکر ہے، یہ بھی مذکور ہے کہ ابراہیمؑ نے اُن کے لئے دعوت کا سامان کیا اور انھوں نے کھایا، (تکوین ۱۸-۸) لیکن قرآن پاک نے اس قصہ کو دہرا کر یہ تصریح کر دی ہے کہ فرشتے انسانی ضرورتوں سے پاک ہیں، چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے اُن کے لئے دعوت کا سامان کیا مگر

فَلَمَّا رَاٰ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ (ھود-۷)

جب ابراہیمؑ نے دیکھا کہ وہ کھانے کو ہاتھ نہیں لگاتے تو انکو وہ انجان معلوم ہوئے اور دل میں ڈرا، انھوں نے کہا ڈرو نہیں ہم لوط کی قوم کی طرف

کفار قریش کا مطالبہ تھا کہ انسان کے بجائے کوئی فرشتہ پیغمبر بنا کر کیوں نہیں بھیجا گیا، اُس کے جواب میں کہا گیا،

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝ (انعام-۱)

اور اگر ہم پیغمبر کو فرشتہ بنا کر بھیجتے تو (آدمیوں کیلئے اسکو آدمی ہی بناتے اور جس شبہ میں اب ہم نے ان کو ڈالا ہے اسی میں وہ پھر بھی پڑے رہتے (یعنی یہی کہتے) کہ تم

اس آیت اور دوسری آیتوں سے ملکوتیت اور بشریت کی قوتوں کا اختلاف ظاہر ہے، تاہم فرشتے

کبھی کبھی عارضی طور سے انسان کے مثالی لباس میں بھی جلوہ گر ہوتے ہیں، جیسا کہ حضرت مریمؑ وغیرہ کے قصوں میں ہے،

فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (مریم-۲) وہ فرشتہ ایک اچھے خاصے بشر کی مثالی صورت میں ظاہر ہوا

یہی وہ صورت تھی جس میں حضرت ابراہیمؑ کو فرشتوں کے انسان ہونے کا دھوکا ہوا اور اُن کے لئے دعوت کا سامان کیا، مگر یہ دھوکا جلد رفع ہوگیا اور معلوم ہوگیا کہ وہ انسان کی مثالی صورت میں فرشتے ہیں،

ان تمام تفصیلات کے بعد یہ غور کرنا ہے کہ فرشتوں پر ایمان لانے سے اسلام کا کیا مقصود ہے؟ حقیقت میں ان سے دو باتیں مقصود ہیں،

۱۔ ایک یہ کہ اسلام سے پہلے بت پرست اقوام اور دوسرے اہلِ مذاہب میں ان فرشتوں کو خدائی کا جو مرتبہ دیا گیا تھا، اُس غلط عقیدہ کو مٹا کر یہ حقیقت ظاہر کیجائے کہ اُنکی حیثیت کیا ہے محکوم بندہ کی ہے، جب تک اسکی تصریح نہ ہوتی، کلمہ احد کی تکمیل ممکن نہ تھی،

۲۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ مادہ کے خواص و طبائع کو دیکھ کر مادہ پرست جو ان مادی خواص و طبائع کی بالذات کارفرمائی کا یقین کرتے ہیں، اسکا ازالہ کیا جائے، کیونکہ یہی پتھر انکی ٹھوکر کا باعث ہوتا ہے اور بالآخر خدا کے انکار تک انکو لیجاتا ہے، درحقیقت ان مادی خواص و طبائع پر روحانی اسباب مسلط ہیں جو خدا کے حکم سے اسکے مقررہ اصول کے مطابق نظامِ عالم کو چلا رہے ہیں، مادہ اور اُس کے خواص بالذات موثر نہیں بلکہ کوئی دوسرا ہے جو اپنے ارواحِ مجردہ کے ذریعہ سے انکو موثر بناتا ہے، اس عقیدہ سے مادیت کا بت ہمیشہ کیلئے ٹوٹ جاتا ہے، غرض منزہ خالق اور مادی مخلوق کے درمیان احکام و شرائع کا نزول اور قدرت الٰہی کے افعال کا صدور ان ارواحِ مجردہ کے ذریعہ ہوتا ہے،

رسولؐ پر ایمان

وَرُسُلِہٖ

یہ عقیدہ اسلام کی اُن خصوصیات میں سے ہے جن کی تکمیل صرف اُسی کے ذریعہ سے انجام کو پہنچی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجودِ مبارک سے پہلے دنیا کی ہر قوم کو بجائے خود یہ خیال تھا کہ وہی اللہ تعالیٰ کی خاص محبوب اور پیاری ہے، تمام دنیا کی قوموں میں ہدایت ربانی کیلئے وہی منتخب کی گئی ہے، اس کے علاوہ دنیا کی تمام قومیں اس فیض سے قطعاً محروم ہیں اور وہ اسی کی سرزمین دیوتاؤں اور دیبیوں کا مسکن اور اسی کی زبان خدا کی خاص مقدس زبان ہے، بابل وینوا ہو یا مصر و یونان، ایران ہو یا آریہ ورت ہندوستان، ہر ملک کے لوگوں کو بجائے خود تنہا خدا کی مقدس اور برگزیدہ مخلوق ہونے کا دعویٰ تھا، اور وہ صرف اپنے کو خدا کے پیغام اور خطاب سے مشرف ہونے کا مستحق جانتے تھے، لیکن تعلیم محمدیؐ نے تنگ خیالی کے اس محدود دائرہ کو دنیا کی عظیم الشان وسعت سے بدل دیا، آپ نے یہ سکھایا کہ دنیا کی تمام قومیں خدا کی نظر میں یکساں ہیں، نہ عرب کو عجم پر اور نہ عجم کو عرب پر فضیلت ہے، اور نہ گورے کو کالے پر کوئی تقدم حاصل ہے[1]، ساری زمین خدا کی ہے اور تمام قومیں ایک خدا کی مخلوق ہیں، آپ نے فرمایا لوگو! تم سب ایک ہی باپ آدم کی

---

[1] مسند احمد بن حنبل، از ابو نصر تابعی۔

اولاد ہو اور وہ مٹی سے پیدا ہوا تھا، اسیطرح یہ بھی تعلیم دی کہ انسانوں اور قوموں کا امتیاز رنگ روپ، ملک و مرز بوم اور زبان سے نہیں ہے، بلکہ صرف تقویٰ اور نیکوکاری سے ہے،[۱]

اس تعلیم کا سب سے پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ قوموں اور ملکوں کی فطری فضیلت کی پرانی داستان فراموش ہوگئی، دنیا کی تمام قومیں ایک سطح پر آگئیں اور مساواتِ انسانی کا راستہ صاف ہو گیا، بنی اسرائیل جن کو خدا کا کنبہ ہونے پر ناز تھا، وحی محمدی نے اُن کی اس حیثیت کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہا

بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ (مائدہ ۳) بلکہ تم بھی خدا کی مخلوقات میں سے بشر ہو،

بنی اسرائیل کو دعویٰ تھا کہ نبوت اور پیغمبری صرف انہی کے خاندان کا ورثہ ہے، جس طرح اس آیہ وحدت کا دعویٰ ہے کہ خدا کی بولی صرف بیس کے رقموں اور بیسوں نے سنی جو وید کے اوراق میں محفوظ ہے، اسی طرح دوسری قوموں کو بھی اپنی اپنی جگہ پر یہی خیال تھا، اسلام نے اس تخصیص کو خدا کے انصاف و عدل و کرم اور رحمتِ عام کے منافی قرار دیا، اور کہدیا،

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ یہ (نبوت) اللہ کی مہربانی ہے جسکو چاہے دے

وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (جمعہ) اور اللہ بڑی مہربانی والا ہے،

قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ اَنْ کہدو کہ ہدایت اللہ کی ہدایت ہے (اسرائیلی علما

يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ اپنے ہم مذہبوں سے کہتے ہیں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ (جیسا

عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ دین تمکو دیا گیا کسی اور کو دیا جائے یا یہ تمہارے دین

يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ والے تم سے خدا کے آگے جھگڑ سکیں کہدو کہ

---

[۱] جامع ترمذی آخر کتاب المناقب [۲] قرآن اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاكُمْ،

يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ، (آل عمران - ۸)

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (بقرہ - ۱۳)

(یہ نبوت کا) فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہتا ہے اس کو دیتا ہے اور اللہ کی رحمت سب پر عام ہے اور وہ اپنی مصلحتوں کو (اچھی طرح) جانتا ہے اور جسکو چاہتا ہے اپنی رحمت کیساتھ مخصوص کرتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے

اہل کتاب میں جو منکر ہیں وہ نہیں پسند کرتے اور نہ مشرکین پسند کرتے ہیں کہ تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے کوئی بھلائی نازل ہو اور اللہ اپنی رحمت کے ساتھ جسکو چاہتا ہے مخصوص کرتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے

اس نے یہ تعلیم دی کہ روئے زمین کی ہر آبادی میں ہر قوم میں اور ہر زبان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسکی راہ دکھانے والے، اسکی آواز پہنچانے والے اور انسانوں کو انکی غفلت سے چونکانے والے پیغمبر یا نائب پیغمبر آئے اور یہ سلسلہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک برابر جاری رہا

بعثتِ محمدیؐ سے پہلے دنیا کی کل آبادی مختلف گھرانوں میں بٹی ہوئی اور ایک دوسرے سے ناآشنا تھی، ہندوستان کے رشیوں اور منیوں نے آریہ ورت سے باہر کی دنیا کو خدا کی آواز سننے کا کبھی مستحق نہیں سمجھا تھا، ان کے نزدیک پرمیشور صرف آریہ ورت کی ہدایت اور رہنمائی کا خواہاں تھا، زردشت نے پاک نژادانِ ایران کے سوا سب کو یزدان کے جلوۂ نورانی سے محروم یقین کیا تھا، بنی اسرائیل اپنے خانوادہ کے سوا کہیں اور کسی نبی یا رسول کی بعثت کا تصور بھی نہیں کر سکتے

عیسائی صرف اپنے کو خدا کی فرزندی کا مستحق سمجھتے تھے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر بتایا کہ خدا کی ہدایت اور رہنمائی کے ظہور کے لیے کسی ملک، قوم اور زبان کی تخصیص نہیں، اسکی نگاہ میں عرب وعجم، شام وہند سب برابر ہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمہ بیں آنکھوں نے پورب پچھم، اتر دکھن ہر ملک اور ہر قوم میں خدا کا نور دیکھا، اور ہر زبان میں اس کی آواز سنی،

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ (یونس ۵)	اور ہر قوم کے لیے ایک رسول ہی،
وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا (نحل)	اور یقیناً ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا
وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا	اور ہم نے تجھ سے پہلے کتنے رسول انکی اپنی
اِلٰى قَوْمِهِمْ (روم ۵-۵)	اپنی قوم میں بھیجے،
وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (رعد ۱)	اور ہر قوم کے لیے ایک رہنما آیا،
وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر ۳)	اور کوئی قوم نہیں جس میں ایک ہشیار کرنے والا نہ آیا ہو،
وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِی الْاَوَّلِيْنَ	اور ہم نے پہلی قوموں میں کتنے پیغمبر بھیجے
وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ	اور ہم نے ہر پیغمبر کو اس کی قوم کی بولی میں
قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (ابراہیم ۱)	بھیجا تاکہ وہ انکو بتا سکے،

اس آخری آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ رسول تعلیم الٰہی تشریح وبیان کے لیے مامور ہیں، ایک یہودی کے لیے حضرت موسیٰؑ کے سوا کسی اور کو پیغمبر ماننا ضروری نہیں، ایک عیسائی تمام دوسرے پیغمبروں کا انکار کرکے بھی عیسائی رہ سکتا ہے، ایک ہندو تمام دنیا کو ملیچھ، شودر، اور

چنڈال کہہ کر بھی پکا ہندو رہ سکتا ہے، ایک زردشتی تمام عالم کو بحر ظلمات کہکر بھی نورانی ہو سکتا ہے، اور وہ ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو نعوذ باللہ جھوٹا کہکر بھی دینداری کا دعوی کر سکتا ہے، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ناممکن کر دیا ہے، کہ کوئی اُن کی پیروی کا دعویٰ کرکے اُن سے پہلے کے کسی پیغمبر کا انکار کر سکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تہجد میں جو دعا پڑھتے تھے، اُس میں ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا، وَالنَّبِيُّونَ حَقٌّ وَمُحَمَّدٌ حَقٌّ[1] سب نبی برحق تھے اور محمد بھی برحق ہی، غرض کوئی شخص اُس وقت تک محمدی نہیں ہو سکتا، جبتک وہ پہلے موسوی، عیسوی اور سلیمانی و داؤدی نہ بن لے، اور کوئی شخص اُس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا، جبتک وہ دنیا کے تمام پیغمبروں کی یکساں صداقت، حقانیت، راستبازی اور معصومیت کا اقرار نہ کرے اور یہ یقین نہ کرے کہ اُن کے کا ماننا ذریعہ اللہ تعالیٰ نے عرب کی طرح ہر قوم کو اپنی ہدایت اور رہنمائی سے سرفراز کیا ہے اور اُنکا ماننا ایسا ہی ضروری ہے جیسا

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ	بیشک جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار
وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ	کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اسکے رسولوں
وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ	کے درمیان فرق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو
وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا	مانیں گے اور بعض کو نہیں مانیں گے اور چاہتے
بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا أُولَٰئِكَ هُمُ	ہیں کہ اسکے بیچ بیچ میں کوئی راستہ نکالیں
الْكَافِرُونَ حَقًّا وَأَعْتَدْنَا	وہی تو حقیقت میں کافر ہیں اور کافروں کے
لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا وَالَّذِينَ	لیے ہم نے اہانت والا عذاب تیار رکھا ہے،

[1] صحیح بخاری باب التہجد،

اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا	اور جو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے
بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ	اور ان رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق
يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ	نہیں کیا تو وہی لوگ ہیں جن کی مزدوری خدا
غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (نساء - ۲۱)	ان کو دیگا، اور اللہ بخشنے والا رحمت والا ہے
وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ	اور فرشتوں پر کتاب پر اور سب نبیوں
(بقرہ - ۲۲)	پر ایمان لانا نیکی ہے،
وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَ	اور جس نے خدا کا اور اس کے فرشتوں کا
كُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ	اور اس کی کتابوں کا، اور اسکے رسولوں کا
ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا (نساء - ۲۰)	اور قیامت کا انکار کیا، وہ نہایت سخت گمراہ ہوا

بقرہ کے خاتمہ میں ہے،

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ	ہر ایک خدا پر اور اسکے فرشتوں پر اور اسکی
وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ	کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا ہم
رُّسُلِهٖ (بقرہ - ۴۰)	خدا کے رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے
لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ،	ہم ان پیغمبروں میں سے کسی کے درمیان تفریق
(بقرہ - ۱۷ - و آل عمران - ۹)	نہیں کرتے،

پیغمبروں میں تفریق کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ان میں سے بعض کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں، اسلام نے اس کی ممانعت کی، اور عام حکم دیا کہ دنیا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو یکساں خدا کا رسول مانیں

اور راست بازی تسلیم کیا جائے،

یہودی حضرت عیسیٰؑ کو نعوذ باللہ جھوٹا اور کاذب سمجھتے، اور اُن پر طرح طرح کی تہمتیں لگاتے تھے، اور اب بھی ان کا یہی عقیدہ ہے، یہودیت اور اسلام میں جو اشتراک ہے، وہ مسیحیت سے زیادہ ہے، اس لیے اگر اسلام کی رُو سے حضرت مسیحؑ کا نام نہ آئے، تو بہت سے یہود مسلمان ہونے کو تیار ہو جائیں، مگر اسلام نے کبھی یہ ننگ گوارا نہیں کیا، اور جب تک کسی یہودی سے حضرت عیسیٰؑ کی نبوت، معصومیت اور تقدس کا اقرار نہیں لے لیا، اسکو اپنے دائرہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی، چنانچہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بہت سے یہود آپ کی رسالت اور شریعت پر ایمان لانے کو تیار تھے مگر حضرت عیسیٰؑ کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انکی دوستی کے عظیم الشان فائدوں سے محروم رہنا گوارا کیا، مگر مسیح علیہ السلام کی سچائی سے انکا محروم رہنا قبول نہ فرمایا، اور اُن سے صاف کہا:-

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ	اے یہود! کیا بُرا ہے تمکو ہم سے، مگر یہی کہ ہم
اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا	خدا پر اور جو ہماری طرف اُتارا گیا، اور
وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ	جو پہلے اُتارا گیا، اس پر ایمان رکھتے ہیں اور
فٰسِقُوْنَ (مائدہ ۷-۹)	تم میں اکثر بے حکم ہیں،

خود قریش کا یہ حال تھا کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے نام سے چڑتے تھے، تاہم اُن کی خاطر سے حضرت عیسیٰؑ کی نبوت، تقدس اور معصومیت کا انکار نہیں کیا گیا، قرآن نے کہا،

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا	اور جب مریم کے بیٹے کی کہاوت بیان کی گئی

قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ وَقَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ، اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ، (سورۂ زخرف ۷۰)

تو تیری قوم اس سے چلانے لگتی ہے، اور بولی کہ ہمارے معبود اچھے ہیں، یا وہ، یہ نام جو وہ تجھ پر دھرتے ہیں، صرف جھگڑنے کو بلکہ وہ جھگڑالو ہیں، وہ ایک بندہ ہے جس پر ہم نے فضل کیا،

قریش کو معلوم تھا کہ اسلام عیسیٰؑ بن مریم کو بندہ اور رسول مانتا ہے، خدا نہیں، باوجود اس کے عیسائیوں کی طرح مسلمانوں پر بھی حضرت عیسیٰؑ کے ماننے کی وجہ سے عیسیٰ پرستی کا الزام دھرتے تھے، قرآن نے ان کے اس سب معنی اعتراض کی تردید کی،

اسلام میں پیغمبروں کی کوئی تعداد محدود نہیں ہے، طبرانی کی ایک ضعیف روایت میں ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء مبعوث ہوئے، دوسری روایت میں اس سے کم تعداد بھی مروی ہے، قرآن پاک میں نام کے ساتھ صرف انہی انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے، جن سے عرب مانوس تھے، یا ان کے ہمسایہ یہود و نصاریٰ کے صحیفوں میں جن کے تذکرے تھے، قرآن میں بعض ایسے انبیاء بھی مذکور ہیں جن سے صرف عرب واقف تھے، اور یہود و نصاریٰ بے خبر تھے، مثلاً حضرت ہودؑ اور حضرت شعیبؑ، بعض ایسے بھی ہیں، جن کو یہود و نصاریٰ جانتے تو تھے، لیکن پیغمبر نہیں تسلیم کرتے تھے، مثلاً حضرت داؤدؑ، اور حضرت سلیمانؑ، وحی محمدی نے ان سب کو پیغمبر تسلیم کیا، اور انکی صداقت و عظمت کا اقرار کیا،

اسی سلسلہ میں ایک اور واقعیت کی طرف بھی اشارہ کر دینا مناسب ہے، اسلام سے پہلے نبوت و رسالت، اور پیغمبری کی کوئی خاص واضح اور غیر مشتبہ حقیقت دنیا کے سامنے نہ تھی، یہود کے،

ہاں نبوت کے معنی صرف پیشین گوئی کے تھے، اور نبی پیشین گو کو کہتے تھے، اور جس کے متعلق وہ یقین رکھتے تھے، کہ اُس کی دعا یا بد دعا ضرور قبول ہو جاتی ہے[1]، اسی لئے حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کی نبوت اور رسالت کا محض دھندلا سا خاکہ اُن کے ہاں موجود ہے، بلکہ حضرت ابراہیمؑ کے مقابلہ میں شام کے کاہن، ملک کی پیغمبرانہ شان انکے نزدیک زیادہ نمایاں معلوم ہوتی ہے، حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کی حیثیت انکے ہاں صرف بادشاہ کی ہے، اور اُن کے زمانہ کے پیشین گوئی کرنے والے پیغمبر اور ہیں، یہی سبب ہے یہود کے قصوں اور کتابوں میں اسرائیلی پیغمبروں کی طرف نہایت سخیف باتیں بے تامل منسوب کی گئی ہیں، عیسائیوں کے ہاں بھی رسالت اور نبوت کی کوئی واضح حقیقت نہیں بیان کی گئی ہے، ورنہ یہ نہ کہا جاتا کہ مجھ سے پہلے جو آئے، وہ چور اور ڈاکو تھے[2]، موجودہ انجیلوں میں نہ خدا کے رسولوں کی تعریف ہے، نہ انکے تذکرے ہیں، نہ انکی سچائی اور صداقت کی گواہی ہے، حضرت زکریاؑ اور حضرت یحییٰؑ جن کے تذکرے انجیل میں ہیں، وہ بھی پیغمبرانہ شان کے ساتھ اُن کے ہاں مسلّم نہیں، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر اس جلیل القدر منصب کی حقیقت ظاہر کی، اسکے فرائض بتائے، اس کے خصوصیات کا اظہار کیا، اور اُن سب پر ایمان لانے کو نجات کا ضروری ذریعہ قرار دیا، آپنے بتایا کہ نبوت و رسالت خاص خاص انسانوں کو خدا کا بخشا ہوا، ایک منصب ہے، جسکو دیکر وہ دنیا میں اس غرض سے بھیجے گئے، کہ وہ خدا کے احکام لوگوں کو بتائیں اور سچائی اور نیکی کا راستہ اُن کو دکھائیں وہ ہادی (رہنما) نذیر (ہشیار کرنیوالے)، داعی (خدا کی طرف سے بلانیوالے)، مبشر (خوشخبری

[1] دیکھو توراۃ صحیفہ تکوین باب ۲۰ - ۲۷ تکوین ۱۴-۱۸ [2] انجیل،

سنانے والے) معلّم (سکھانے والے) مبلّغ (خدا کے احکام پہنچانے والے) اور نور (روشنی) تھے، خدا اُن سے ہم کلام ہوتا تھا، اپنی باتوں سے اُن کو مطلع کرتا تھا، اور وہ اُن سے دوسرے انسانوں کو آگاہ کرتے تھے، وہ گناہوں سے پاک اور برائیوں سے محفوظ تھے، وہ خدا کے نیک اور مقبول بندے تھے، اور اپنے عہد کے سب سے بہتر انسان تھے، اُن کے سب کام خدا کے لیے تھے، اور خدا اُن کے لیے تھا۔ یہ ہستیاں اپنے فرائض کو انجام دینے کے لیے ہر قوم میں پیدا ہوئیں، جنھوں نے اُن کو مانا، نجات پائی، اور جنھوں نے جھٹلایا، ہلاک و برباد ہوئے، قرآنِ پاک نے اُن کی زندگی کے سوانح، اُن کی تبلیغ کی روداد، اُن کے اخلاق کی بلند مثالیں، اور اُن کی خدا پرستی کا اخلاص اس طرح بیان کیا ہے کہ اُن کے پڑھنے اور سننے سے اُن کی پیروی کا جذبہ، اُن کے اتباع کا شوق، اور اُن کی صداقت کا یقین دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے، اور ساتھ ہی اُس نے شانِ نبوت کے خلاف جو غلط باتیں دوسرے صحیفوں میں اُن کی طرف منسوب تھیں انکو چھوڑ دیا ہے، اور یا انکی تردید کر دی ہے۔

الغرض نبوت اور رسالت کی سب سے اہم خصوصیت اسلام نے جو یہ قرار دی کہ نبی و رسول گناہوں سے پاک اور برائیوں سے محفوظ، اور معصوم ہوتے ہیں، بنی اسرائیل کو نبوت اور رسالت کے اس بلند تخیل کی ہوا بھی نہیں لگی تھی، اس لیے انھوں نے نہایت بے باکی سے اپنے پیغمبروں کی طرف ہر قسم کے گناہ منسوب کر دیئے، عیسائی ایک حضرت عیسیٰ کو تو معصوم کہتے ہیں، باقی سب کی گنہگاری کے قائل ہیں، لیکن اسلام نے دنیا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کی عظمت کی ایک ہی سطح قائم کی ہے، اسکے نزدیک گناہوں سے پاکی اور عصمت تمام انبیاء اور مرسلین کا مشترک وصف ہے، کیونکہ گنہگار گنہگاروں کی رہنمائی کا مستحق نہیں، اور اندھا اندھے کو راہ نہیں دکھا سکتا، اس بنا پر محمد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی و تعلیم نے خدا کے تمام معصوم رسولوں کی عظمت و جلالت دنیا میں قائم کی اور جن کو باطنوں نے ان کی عصمت و بے گناہی کے دامن پر اپنے وہم و نادانی سے داغ لگائے تھے، ان کو دھو کر پاک صاف کیا، اور یہ رسالتِ محمدیؐ کا عظیم الشان کارنامہ ہے،

خود انجیل کے طرز سے ظاہر تھا کہ حضرت عیسیٰؑ احکامِ عشرہ کے برخلاف اپنی ماں کی عزت نہیں کرتے تھے، قرآن نے اس کی تردید کی، اور حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے کہلوایا،

وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا، (مریم-۲)

اور اپنی ماں کے ساتھ نیکی کرنے والا، اور مجھ کو خدا نے جبار اور بدبخت نہیں بنایا

کیونکہ احکامِ عشرہ کے مطابق ماں باپ کا ادب نہ کرنا بدبختی تھی، اسی طرح موجودہ انجیل نے حضرت عیسیٰؑ پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ نماز و روزہ کی پروا نہیں کرتے تھے، قرآن نے انکی زبان سے کہلوایا

وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا (مریم-۲)

اور خدا نے مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے جب تک میں جیتا رہوں،

یہود حضرت مریمؑ پر تہمت رکھتے تھے، قرآن نے اس الزام کو دور کیا، اور کہا،

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِن رُّوحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهِ وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِينَ (تحریم-۲)

اور مریم بنت عمران جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی اور اس نے اپنے پروردگار کی باتوں اور اس کی کتابوں کو سچ جانا اور وہ بندگی کرنے والوں میں تھی،

وہم پرست یہود حضرت سلیمانؑ کو گنڈہ، تعویذ اور عملیات وغیرہ کا موجد سمجھتے تھے، حالانکہ سحر و جادو

وغیرہ توراۃ میں شرک قرار دیا جا چکا تھا، قرآن نے علانیہ یہودیوں کے اس الزام کی تردید کی،

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ (بقرہ ۱۳)

اور سلیمانؑ نے کفر کا کام نہیں کیا، بلکہ شیطانوں نے کیا، وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے،

اسی طرح حضرت لوطؑ پر بدکاری کا جو الزام یہود لگاتے ہیں اسکی تردید کی،

اوپر گذر چکا ہے کہ قرآن نے یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے تمام پیغمبروں کے نام نہیں لیے، ہیں کہ صرف ناموں کی فہرست یا نامعلوم اشخاص کے ناموں لینے سے دلوں میں جوشِ عقیدت نہیں پیدا ہو سکتا، تاہم معلوم تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صدائے دعوت ایک دن دنیا کے کناروں تک پہنچے گی، اور بہت سی غیر قومیں اور دوسرے انبیا کی امتیں اس حلقہ میں داخل ہونگی اور اپنے اپنے انبیاء کا نام و نشان صحیفۂ محمدی میں تلاش کریں گی، اسلئے ایک جامع آیت میں تمام انبیاء کا تذکرہ کر دیا گیا، اور اُن کی صداقت کی پہچان بتا دی گئی، فرمایا،

إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِن بَعْدِهِ ۚ وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَارُونَ وَسُلَيْمَانَ ۚ وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ

ہم نے (اے محمد) تمہارے پاس وحی بھیجی جس طرح نوحؑ اور انکے بعد کے پیغمبروں کے پاس بھیجی اور ہم نے ابراہیمؑ کو اور اسمٰعیلؑ کو اور اسحاقؑ کو اور یعقوبؑ کو اور انکے خاندان کو اور عیسیٰؑ کو اور ایوبؑ کو اور یونسؑ کو اور ہارونؑ کو اور سلیمانؑ کو وحی بھیجی، اور داؤدؑ کو زبور عطا کی اور دوسرے رسولوں کو بھیجا جن کا حال ہم

مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ
وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوسٰى تَكْلِيمًا، رُسُلًا
مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ
لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ
وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا،
(نساء-۲۳)

ہم نے پہلے بیان کیا ہے اور ان رسولوں کو جن کا
حال ہم نے تم سے بیان نہیں کیا، اور خدا نے
موسیٰ سے بات کی، اور ان رسولوں کو خوشخبری
سنانے والا اور ہشیار کرنے والا بنا کر بھیجا تاکہ لوگوں کو
رسولوں کے آجانے کے بعد خدا کے آگے کوئی عذر باقی
نہ رہ جائے اور خدا غالب و دانا ہے،

انبیاء کے متعلق یہی حقیقت سورہ مومن میں دوبارہ بیان کی گئی ہے،

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ
مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ
مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ (مومن)

اور ہم نے یقیناً تم سے پہلے بہت سے پیغمبر بھیجے
ان میں کچھ وہ ہیں جن کا حال تم سے بیان کیا
اور کچھ وہ ہیں جن کا حال تم سے بیان نہیں کیا

تعلیم محمدی کے اصول کے مطابق یہ یقین کرنا ضروری ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی قوموں اور ملکوں جیسے چین، ایران اور ہندوستان میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے خدا کے انبیاء مبعوث ہو چکے ہیں، اور اس لیے یہ تمام قومیں اپنے جن بزرگوں کی عزت و عظمت کرتی ہیں اور اپنے دینی مذہب کو جنکی طرف منسوب کرتی ہیں، اُن کی صداقت اور راستبازی کا قطعی انکار کوئی مسلمان نہیں کر سکتا، اسی بنا پر بعض علمائے ہندوستان کے کرشن اور رامچندر[1] کو بلکہ ایران کے زردشت[2] کو بھی، اور بعض صاحبوں نے تو بودھ تک کو پیغمبر کہا ہے، بہرحال امکان میں تو شک ہی نہیں لیکن یقین کے ساتھ ان

---

[1] کلمات طیبات حضرت شاہ مرزا مظہر جانجاناںؒ [2] ملل ونحل ابن حزم

ناموں کی تعیین بھی حد سے تجاوز کرنا ہے، اصل یہ ہے کہ قرآن نے انبیاؑ کی دو قسمیں کی ہیں، ایک وہ جن کے ناموں کی اُس نے تصریح کی ہے اور دوسرے وہ جن کے نام اُس نے بیان نہیں کئے ہیں، اس لئے صحیح یہ ہے کہ جن انبیاؑ کے نام مذکور ہیں، تمام مسلمانوں کو اُن پر نام بنام ایمان لانا چاہیئے اور جن کے نام مذکور نہیں، اُنکی نسبت صرف یہ اجمالی ایمان کافی ہے کہ ان قوموں میں بھی خدا کے فرستادہ اور پیمبر آئے تھے، گو یہ تخصیص اُن کے نام نہیں معلوم ہیں، وہ قومیں جن کا نام لیتی ہیں، اگر اُنکی زندگی اور اُنکی تعلیم نبوت اور رسالت کی شان کے مطابق ہیں، تو ان کی نبوت اور رسالت کی طرف رجحان اور میلان بلکہ قرینہ غالب ہو سکتا ہے، لیکن یقین اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے پاس ان باتوں پر یقین کرنے کا ذریعہ صرف وحی ہے، اور وہ اس تخصیص و تعیین سے خاموش ہے،

(۲) قسم کے انبیاء جن کے نام گو قرآن میں مذکور نہیں، مگر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے گذر چکے ہیں، اور اُن کے پیرو اُن کو اپنے ہاں نبوت و رسالت کا درجہ دیتے ہیں، اُنکی شناخت اور پہچان کا ایک اصول قرآن نے مقرر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی قوم کو توحید کی تعلیم دی ہے،

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا	اور ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ
اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (نحل-۵)	کی پرستش کرو، اور جھوٹے معبود سے بچے رہو،
وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ	اور ہم نے تجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں بھیجا
اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ	لیکن اسکو یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی خدا
اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (انبیاء-۲)	نہیں، تم میری کو پوجو،

اس لیے وہ تمام قدیم پیرانِ انسانی اور رہنمایانِ عالم جو دنیا میں کسی مذہب کو لائے اور

جنکی تبلیغ و تعلیم توحید کی دعوت اور بت پرستی سے اجتناب تھی اور جن کی زندگی اس تعلیم کے شایانِ شان تھی، اُن کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنی قوم کے اور اپنے وقت کے رسول اور پیغمبر نہ تھے کہ اتنی بڑی بڑی قومیں خود قرآن کے اصول کے مطابق انبیاء و رسولوں کے وجود سے خالی نہیں رہ سکتی تھیں، اسی بنا پر اسلام کی ان تلقینات میں سے جن کے تسلیم کیے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا ایک یہ بھی ہے کہ وہ تمام ملکوں کے پیغمبروں اور تمام قوموں کے رسولوں کو جو حضرت خاتم نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے پہلے پیدا ہوئے یکساں صداقت کے ساتھ تسلیم کرے، ان سب نے تمام دنیا کو ایک ہی تعلیم دی اور وہ توحید ہے، البتہ ان انبیاء میں سے ایک کو دوسرے پر بعض بعض حیثیتوں سے ترجیح ہے،

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى	ان رسولوں میں سے ہم نے کسی کو کسی پر فضیلت
بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَ	دی، ان میں سے کسی سے اللہ نے کلام کیا اور
رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ وَاٰتَيْنَا	کسی کے بہت درجے بڑھائے اور ہم نے عیسیٰ
عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ	ابن مریم کو نشانیاں دیں اور پاکی کی روح سے
بِرُوْحِ الْقُدُسِ (بقرہ ۳۳)	اس کی تائید کی،

آپ نے دوسرے انبیاء کی جائز تعظیم و تکریم یہاں تک کی ہے کہ اُن کے مقابلہ میں کبھی کبھی اپنی ہستی بھی فراموش کر دی ہے، ایک دفعہ ایک صحابی نے آپ کو یا خیر البریۃ، اے بہترین خلق کہکر خطاب کیا، فرمایا وہ تو ابراہیمؑ تھے، ایک دفعہ ایک صاحب نے دریافت کیا کہ سب سے عالی خاندان کون تھا؟ فرمایا یوسفؑ پیغمبر بن پیغمبر بن پیغمبر بن خلیل اللہؑ، ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک یہودی

۱؎ مسند ابن حنبل جلد ۱ صفحہ ۱۵۳ ۲؎ صحیح بخاری کتاب الانبیاء مناقب حضرت یوسف ص ۴۷۹

مدینہ میں کہہ رہا تھا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس نے موسیٰ کو بشر پر فضیلت دی" ایک مسلمان یہ کھڑے سُن رہے تھے، ان کو غصہ آگیا کہ ہمارے پیغمبر کی موجودگی میں تم یہ کہہ رہے ہو، اور اسکو ایک تھپڑ کھینچ مارا، اس نے دربار نبویؐ میں جا کر شکایت کی، آپ نے اُن صحابی کو بلا بھیجا، اور مقدمہ کی روداد سنی، پھر نہایت برہم ہو کر فرمایا کہ پیغمبروں میں باہم ایک دوسرے پر فضیلت نہ دو، یعنی ایسی فضیلت جس سے کسی دوسرے نبی کی تنقیص ہوتی ہو،

یہی وہ تعلیماتِ محمدیؐ ہیں جن کے ذریعہ سے دنیا میں وحدتِ مذاہب، روحانی مساوات، انسانی اخوت اور تمام انبیاؑ اور پیغمبروں کے ادب و احترام کے جذبات پیدا ہوئے، بنی اسرائیل کے وہ پیغمبر جن کو ماننے والے تمام دنیا میں چند لاکھ سے زیادہ نہ تھے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اُن کی عظمت و جلالت اور ادب و احترام کرنے والے چالیس کروڑ سے زیادہ ہو گئے، وہ حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ جو چھ سو برس تک یہودیوں کی جھوٹی تہمت سہتے رہے، محمد رسول اللہ نے آکر دفعۃً اس کو مٹا دیا، اور اُن کی پاکی کی گواہی دی، جس کے بدولت آج چالیس کروڑ زبانیں اُن کی عصمت کی شہادت دے رہی ہیں، ہندوستان، ایران، چین، جن کے سچے رہنماؤں کا اُن کے ملک سے باہر کوئی ادب و احترام نہ تھا، جہاں جہاں مسلمان گئے اُن کے جا نماز ادب و احترام کو اپنے ساتھ لیتے گئے،

وہ عرب جو پیغمبروں کے ناموں تک سے ناواقف تھے، جو نبوت و رسالت کے خصائص کے علم سے محروم تھے، جو انبیاء اور رسولوں کی سیرتوں سے ناآشنا تھے، جو اُن کے ادب و احترام اور تصدیق و اعتراف سے بیگانہ تھے، جن کو اپنے دیوتاؤں کے سامنے عیسیٰ بن مریم پر تحقیرانہ ہنسی آتی تھی، اور جو حضرت موسیٰؑ کی فضیلت کا ذکر سُن کر اپنے غصہ کو ضبط نہیں کر سکتے تھے، محمد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے اُن کا یہ حال ہوا کہ وہ ایک ایک پیغمبر کے نام و نشان اور تاریخ و سیرت سے واقف ہو گئے، اور تبرکاً اُن کے ناموں پر اپنی اولادوں کے نام رکھنے لگے، اور جو آج بھی تمام مسلمانوں میں شائع اور ذائع ہیں، انھوں نے پیغمبروں کی صداقت اور سچائی کی گواہی دی، اُن کے ادب احترام کو اپنے سینوں میں جگہ دی، اُن کی تعظیم و تکریم کو اپنے دین و ایمان کا جزو بنا لیا، دنیا کی کسی قوم میں یہ رواج نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے نام ادب سے لئے جائیں، مگر ایک مسلمان کیلئے لازم ہے کہ جب کسی پیغمبر کا نام لے تو ادب سے لے اور اُن پر درود و سلام پڑھے،

کتبِ الٰہی پر ایمان

وَکُتُبِہٖ

ایک مسلمان کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کے صحیفۂ وحی پر ایمان لائے، ہر چند یہ عقیدہ گذشتہ عقیدۂ رسالت کا لازمی نتیجہ ہے، یعنی رسول کو رسول مان لینا، اُسکی تعلیمات اور وحی کو مان لینے کے مرادف ہے، تاہم یہ تصریح اس لیے کی گئی، تاکہ پوری طرح صاف اور واضح ہو جائے کہ رسول کو رسول مان لینے کے بعد اُس کے صحیفۂ وحی کو مان کر اسکی تعلیمات پر عمل کرنا ضروری ہے، سورہ بقرہ کے شروع ہی میں سچے مومنوں کی تعریف میں کہا گیا ہے،

وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ	(اور جو اس (کتاب یا وحی) پر ایمان رکھتے ہیں
اِلَیْکَ (بقرہ ۷-۱)	جو تجھ پر (اے محمدؐ) اتاری گئی،

کتاب الٰہی پر ایمان لانے سے مقصود، اُن تمام صداقتوں اور حکموں کو بجان و دل قبول کرنا ہے جو اُس میں مذکور ہیں، یہ گویا پوری شریعتِ مطہرہ کو قبول کر لینے کا مختصر ترین طریقۂ تعبیر ہے اور اسلئے ایمانیات کی بہت سی دوسری باتیں جنکی تفصیل ہر موقع پر ضروری نہیں، اس ایک فقرہ کے تحت میں آجاتی ہیں، قرآن پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ قرآن میں علمی و عملی عقائد و عبادات و احکام

عبادات واحکام مذکور ہیں اُن سب کو بے کم وکاست ہم تسلیم کرتے ہیں، کہ اگر کوئی سری سی اُن کو تسلیم ہی نہیں کرتا تو اُن کی تعمیل و پیروی کا اس سے کیونکر مطالبہ کیا جا سکتا ہی؟ اسی بنا پر اُس کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی ان الفاظ مین فرمائی ہی کہ بِمَا جِئْتُ بِہٖ جو کچھ مین لیکر آیا اس پر ایمان لاؤ قرآن نے کہا

وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ (محمد ۱) اور ایمان لائے اس پر جو محمد پر اُتارا گیا۔

لیکن قرآن اگر اتنا ہی کہتا کہ میرے پیرو صرف مجھ پر ایمان لائین تو یہ کوئی اہم بات نہ ہوتی کہ ہر صاحبِ مذہب کی یہی تعلیم ہوتی ہی، قرآن نے عقائد کی اس دفعہ میں بھی اپنے تکمیلی پہلو کو پیش نظر رکھا ہی، اور یہ ضروری قرار دیا ہی کہ اہلِ قرآن قرآن کیساتھ ہی دوسری آسمانی کتابوں کی صداقت کو بھی تسلیم کرین یعنی کوئی شخص اُس وقت تک مسلمان نہین ہو سکتا جب تک صحیفۂ محمدی کے ساتھ دوسرے پیغمبرون کے صحیفون کو بھی من جانب اللہ تسلیم نہ کرے، چنانچہ سورۂ بقرہ کے شروع اولی

مذکورۂ بالا آیت کے ساتھ یہ بھی فرمایا،

وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ، (بقرہ ۵-۱) اور جو ایمان لائے اس پر ... جو تجھ سے پہلے اترا

پھر اسی سورہ کے آخر میں فرمایا،

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ رسول ایمان لایا، اس پر جو خدا کی طرف سے اس پر

مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ اور اہلِ ایمان بھی، ہر ایک، خدا پر، اس کے

بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ، (بقرہ ۴۰) فرشتون پر اور اس کی کتابون پر ایمان لایا،

بقرہ کی آیتون میں بعض انبیاء علیہم السلام کا تفصیلی درجہ اور بقیہ تمام انبیاء کا اجمالی ذکر کرکے اُن کی کتابون اور وحیون کی تصدیق کا حکم دیا گیا ہے،

قُوْلُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا
وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ
وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَ
مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ
النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ،

(بقرہ ۱۶ - ۱۷)

(اے مسلمانو!) تم کہو کہ ہم خدا پر، اور جو کچھ ہماری
طرف اتارا گیا، اس پر، اور جو کچھ ابراہیم اور اسمٰعیل اور
اسحاق اور یعقوب اور خاندان یعقوب کی طرف
اتارا گیا، اس پر اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا
اس پر اور جو کچھ اور سب پیغمبروں کو اُن کے پروردگار
کی طرف سے دیا گیا، تاہم ان سب پر ایمان لائے،

آل عمران میں کسی قدر تفصیل ہے،

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا
وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ
وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ
اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ
مِنْ رَّبِّهِمْ،

(آلِ عمران - ۹)

کہہ کہ ہم خدا پر، اور جو کچھ ہم پر اتارا گیا، اس پر، اور
جو کچھ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب
اور خاندان یعقوب پر اتارا گیا، اس پر اور جو کچھ
موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا، اس پر اور دوسرے سب
پیغمبروں کو اُن کے پروردگار کی طرف سے جو
کچھ دیا گیا، اس پر، ہم اُن سب پر ایمان لائے،

سورۂ نساء میں اس پر ایمان لانے کے حکم کیساتھ ساتھ اسکے انکار کو کفر بھی قرار دیا گیا ہے،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا بِاللّٰهِ وَ
رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى
رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى

اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو، ایمان لاؤ خدا پر، اسکے
رسول پر اور اُس کتاب پر جو اُس نے اپنے رسولؐ
اتاری، اور اس کتاب پر جو پہلے اُتاری اور جس نے

وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ ..... فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا، (الآیۃ) (نسآء - ۲۰)

خدا کا اور اُس کے فرشتوں کا اور اُس کی کتابوں ..... کا انکار کیا وہ نہایت سخت گمراہ ہوا،

سورۂ مومن میں ان منکروں کو عذاب کی بھی دھمکی دی گئی ہے جو کسی پیغمبر کے پیغام کی تکذیب کریں،

اَلَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَبِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا ؕ فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ ۙ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ یُسْحَبُوْنَ (مومن - ۸)

جن لوگوں نے کتاب کو، اور جو پیغام دیکر ہم نے اپنے پیغمبروں کو بھیجا، اس کو جھٹلا دیا وہ عنقریب جانیں گے، جب اُن کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہونگی؛ وہ گھسیٹے جائینگے،

نام کی تخصیص کے ساتھ قرآن پاک میں چار آسمانی کتابوں کا ذکر ہے توراۃ جس کو ایک جگہ صحفِ موسیٰ بھی کہا گیا ہے (اعلیٰ - ۱) اور حضرت داؤدؑ کی زبور، اور حضرت عیسیٰؑ کی انجیل، اور خود قرآن اُنکے علاوہ ایک موقع پر صحفِ ابراہیم کا بھی تذکرہ ہے،

اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی (اعلیٰ)

یہ باتیں گذشتہ صحیفوں میں بھی ہیں ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں،

ان کے ماسوا اجمال کیساتھ دو موقعوں پر گذشتہ آسمانی کتابوں اور صحیفوں کے الفاظ ہمیں

اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَیِّنَةُ مَا فِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی، (طٰہٰ - ۸)

کیا اگلے صحیفوں میں جو کچھ ہے، اُس کی گواہی اُن کو نہیں پہنچی؟

وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ، (شعرا ع ۱۱) اور بے شبہہ یہ پہلوں کی کتابوں مین مذکور ہی،

اس بنا پر انبیاءؑ کی طرح ان کتابون پر بھی ہر مسلمان کا تفصیلی اور اجمالی ایمان ہی جن کتابون کے نام مذکور ہین ان پر نامون کے ساتھ، اور جن کے نام مذکور نہین اُن پر بالاحمال ایمان ضروری ہے کسی قوم مین اگر کوئی آسمانی کتاب ہی جس کا وجود قرآن سے پہلے ہی لیکن اس کا تصریحی نام قرآن مین مذکور نہین ہی اور اس مین توحید الٰہی کی دعوت اور طاغوت سے بچنے کی نصیحت بھی ہی تو اگرچہ ہم اسکو بتصریح خدا کی کتاب تسلیم نہین کرسکتے، تاہم بالتصریح اس کا انکار بھی نہین کرسکتے، اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب[1] یہی حال دوسری مشکوک کتابونکا ہے یہود توراۃ کے سوا کچھ نہین مانتے عیسائی توراۃ کے احکام نہین مانتے لیکن اسکی اخلاقی نصیحتون کو قبول کرتے ہین، تاہم انجیل سے پہلے کی دوسری زبانون اور ملکون کی آسمانی کتابونکی نسبت مسلمانون کی طرح ادب اور احتیاط کا پہلو بھی اختیار نہین کرتے، پارسی اوستا کے باہر خدا کے کلام ہونے کا شبہہ بھی نہین کرسکتے اور برہمن ویدون کے باہر خدا کے فیضان کا تصور بھی نہین کرسکتے، لیکن قرآن پر ایمان لانے والا مجبور ہے، کہ صحیفۂ ابراہیمؑ توراۃ، زبور اور انجیل کو خدا کی کتابین یقین کرے، اور دوسری اگلی آسمانی کتابون کی جن مین آسمانی تعلیمات کی خصوصیتین پائی جاتی ہون، تکذیب کرے کہ انکا کتب الٰہی ہونا ممکن ہے،

حقیقت مین اسلام کی یہ تعلیم دنیا کی مہتم بالشان تعلیمات مین سے ہی جس کا وجود کسی دوسرے مذہب مین نہ تھا، یہ رواداری بے تعصبی اور عام انسانی اخوت کی سب سے بڑی تعلیم ہی، یہودی اپنی

[1] صحیح بخاری کتاب التوحید و حدیث الافک و تفسیر سورۂ بقر،

کتاب کو چھوڑ کر تمام دوسری آسمانی کتابوں سے انکار کر کے بھی نجات کا منظر ہو سکتا ہے، عیسائی توریت اور تمام دوسرے صحیفوں کا انکار کر کے بھی آسمانی بادشاہی کا متوقع ہو سکتا ہے، پارسی اوستا کے سوا دوسری ربانی کتابوں کو باطل مان کر بھی مینو جنت کا استحقاق پیدا کر سکتا ہے، ہندو اپنے ویدوں کے سوا دنیا کی تمام آسمانی کتابوں کو دجل و فریب مان کر بھی آواگون سے نجات حاصل کر سکتا ہے، بودھ مت والے اپنے سوا تمام دنیا کی وحیوں کا انکار کر کے بھی نروان کا درجہ حاصل کر سکتے ہیں، مگر مسلمان جب تک قرآن کے ساتھ تمام دنیا کی آسمانی کتابوں کو منجانب اللہ نہ تسلیم کرے جنت کا مستحق نہیں ہو سکتا،

یہ تعلیم صرف نظریہ کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ عملاً اس پر اسلامی حکومت کے قوانین اور احکام مبنی ہیں، یہودیوں کی نظر میں صرف دو ہی قومیں ہیں، بنی اسرائیل اور غیر بنی اسرائیل یا اسرائیل کا گھرانا، اور غیر قومیں یا مختون اور غیر مختون، اور ان ہی دونوں تقسیموں پر اُن کے قانون کی بنیاد ہے، عیسائیوں میں مذہبی حیثیت سے مسیحی یہود اور بت پرست گوئیم قومیں مانی جاتی ہیں مگر چونکہ اُن کے مذہب میں قانون نہیں ہے، اسلئے وہ اکثر امور میں رومن لا کے پیرو رہے ہیں لیکن رومن عیسائیوں میں بھی ملکی حیثیت سے دو ہی تقسیمیں ہیں رومی اور غیر رومی، ایک رومی ملک میں غیر رومی کا کوئی حق نہیں کہ رومی حکومت کے لیے اور غیر رومی غلامی کے لیے پیدا ہوا ہے، پارسیوں میں پاک نژاد ایران اور بیرونی لوگ دنیا کی دو ہی حیثیتیں ہیں، ہندوؤں میں اونچی ذاتیں اور اچھوت قوموں کی دو ہی صورتیں ہیں،

مگر اسلام کے گذشتہ عقیدہ کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قانونی حیثیت سے دنیا کی قوموں کو

چار طبقوں میں تقسیم فرمایا، اور اُن کے علیحدہ علیحدہ حقوق قرار دیئے جن پر اسلام کی تیرہ صدیوں میں برابر عمل ہوتا رہا، یہ تقسیمیں حسب ذیل ہیں،

۱۔ مسلمان جو قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں کو کتاب الٰہی یقین کرتے ہیں، اُن میں سے ہر ایک دوسرے کا بھائی اور ہر اچھائی اور بُرائی میں ایک دوسرے کا شریک ہے، وہ آپس میں ایک دوسرے سے شادی بیاہ کر سکتے ہیں، اور ایک دوسرے کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھا سکتے ہیں، اسلام کی سلطنت میں اُن کے حقوق یکساں ہیں،

۲۔ اہلِ کتاب یعنی اُن کتابوں کے پیرو جن کے نام قرآن میں مذکور ہیں، یا یوں کہو کہ جو قرآن کو گو آسمانی کتاب نہیں مانتے مگر اُن کتابوں میں سے جن کا نام قرآن میں مذکور ہے کسی کو وہ آسمانی کتاب مانتے ہیں، وہ اپنی حفاظت کا اہلی ٹیکس (جزیہ) ادا کر کے اسلامی حکومت کی حدود میں رہ سکتے ہیں، ان کے معابد اور مذہبی عمارتیں محفوظ رہتی ہیں، ان کو اپنے مذہب کے بدلنے پر مجبور نہیں کیا جاتا، اُنکی جان و مال اور عزت و آبرو کے مسلمان محافظ ہوتے ہیں، اُن کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں، اور اُن کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھا سکتے ہیں، اُن کا جائز کھانا وہ کھا سکتے ہیں، اور وہ اپنا کھانا اُن کو کھلا سکتے ہیں،

۳۔ شبیہ اہل الکتاب یعنی وہ لوگ جو قرآن اور توراۃ و انجیل و زبور کو نہیں مانتے مگر وہ خود اُن کے علاوہ کسی آسمانی کتاب پر ایمان لانے کے مدعی ہیں جیسے صابی جو ایک آسمانی کتاب رکھنے کے دعویٰ کے باوجود ستاروں کو پوجتے تھے اور مجوس یعنی پارسی جو ایک آسمانی کتاب رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور ساتھ ہی سورج، آگ اور دیگر مظاہر قدرت کی پرستش کرتے ہیں، ترکستان اور سندھ کی فتح کے

موقع پر علمائے اسلام نے اپنی پر قیاس کرکے ہندوؤں اور بودھوں وغیرہ کو بھی اسی صنف میں داخل کیا، مسلمان اُن کی عورتوں سے نکاح نہیں کرسکتے، اور اُن کا ذبیحہ نہیں کھا سکتے، ان دو باتوں کے علاوہ اہل کتاب کے بقیہ تمام حقوق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو عطا کئے ہیں، وہ اسلامی حکومتوں میں ادائے جزیہ کے بعد ہر قسم کے ملکی حقوق میں شریک ہیں، ان کی جان و مال و آبرو اور اُن کے معبدوں کی حفاظت اسلامی حکومتوں کا فرض ہے،

۴۔ کفار و مشرکین یعنی وہ لوگ جن کے پاس نہ کوئی آسمانی کتاب ہے اور نہ وہ کسی دین الٰہی کی طرف منسوب ہیں، اُن کو چند شرائط کے ساتھ امن دیا جاسکتا ہے لیکن حقوق حاصل کرنے کے لیے اُن سے کہا جائیگا کہ وہ کسی نہ کسی آسمانی دین کے اندر اپنے کو داخل کریں، جیسا کہ عیسائیوں کے ابتدائی زمانہ میں خسرانی عراقیوں نے اپنے کو صابیوں میں داخل کرکے اپنے لیے حقوق حاصل کئے تھے،

اس تفصیل سے معلوم ہوسکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم نے دنیا میں امن و امان اور مسلمانوں میں مذہبی رواداری کے پیدا کرنے میں کتنا عظیم الشان حصہ لیا ہے، یہی وہ نظریہ تھا جس نے مسلمانوں کو اپنے مذہبی عقائد و شریعت کی سخت پیروی کے باوجود دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ مشارکت اور میل جول کے لیے آمادہ کیا، اور مجوسیوں، صابیوں، یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کیساتھ ملکر مختلف ملکوں میں اُن ملکوں کے مناسب مختلف تمدنوں کی بنیاد رکھنے کی انہیں قوت پیدا کی

وحدۃ الادیان تمام رسولوں اور اُن کے صحیفوں کی تصدیق کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ کی تعلیم یہ ہو کہ آدم سے لیکر محمد علیہما السلام تک جتنے سچے مذہب خدا کی طرف سے آئے وہ سب ایک تھے، چنانچہ درحقیقت آپ کی یہی تعلیم تھی، اسلام اسی ایک مذہب کا نام ہے، جو آدم سے محمد علیہما السلام

تک باری باری پیغمبروں کے ذریعہ سے آتا رہا اور انسانوں کو اسکی تعلیم دیجاتی رہی،
صحیفہ محمدی نے ہمارے سامنے دو لفظ پیش کیے ہیں ایک دین اور دوسرا شرعۃ ومنہاج ومنسک
اور منہاج شرعہ اور منہاج کے معنی راستے کے ہیں اور منسک کے معنی طریق عبادت کے ہیں، دنیا میں یہ
راز سب سے پہلے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پاک پر منکشف ہوا کہ دین الٰہی ہمیشہ سے ایک تھا
ایک ہے اور ایک رہے گا، نور معرفت ایک ہے خواہ وہ کتنی ہی مختلف شکل و رنگ کی قندیلوں میں
روشن ہو، اصل دین میں تمام پیغمبروں کی تعلیم یکساں تھی، ایک ہی دین تھا جسکو لیکر اول سے آخر
تک تمام انبیا آتے رہے، اسمیں زمان و مکان کے تغیر کو کوئی دخل نہ تھا، اور نہ قوم و ملک کے اختلاف سے اسمیں
کوئی اختلاف پیدا ہوا وہ ہر زمانہ اور ہر مقام میں یکساں آیا، اور وہاں کے ہر پیغمبر نے اسکی یکساں تعلیم دی،
یہ دائمی حقیقت اور یکساں تعلیم کیا ہے، یہ مذہب کے اصل اصول ہیں یعنی خدا کی ہستی، اس کی
توحید، اس کے صفات کاملہ، انبیا اور مرسلین کی بعثت، خدا کی خالص عبادت، حقوق انسانی، اخلاق
فاضلہ، اچھے اور برے اعمال کی باز پرس اور جزا و سزا یہ تمام مذاہب کے وہ بنیادی امور ہیں جن پر
جملہ مذاہب حقہ کا اتفاق ہے، اگر ان میں کسی جہت سے کوئی اختلاف ہے، تو طریقہ تعبیر کی غلطی ہے اور
یا باہر سے آکر اس تعلیم میں کوئی نقص شامل ہو گیا ہے،
دوسری چیز جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان وحی ترجمان نے شرعۃ منہاج اور منسک
کہا ہے، وہ جزئیات احکام اور متفقہ مقصد کے حصول کے جدا جدا راستے ہیں جو ہر قوم و مذہب کی
زمانی و مکانی خصوصیات کے سبب سے بدلتے رہے ہیں، مثلاً عبادت الٰہی ہر مذہب کا جزو لازم ہے، لیکن
طریق عبادت میں تھوڑا تھوڑا اختلاف ہر مذہب میں موجود ہے، عبادت کیلئے کوئی خاص سمت ہر

مذہب نے مقرر کی ہے، مگر وہ سمت خاص خاص مصلحتوں کے لحاظ سے مختلف مقرر کی ہے، اسی طرح اعمالِ قبیحہ کا انسداد تمام مذاہب کا متفقہ نصب العین ہے، مگر اس انسداد کے راستے اور طریقے جدا جدا ہیں، غرض یہ راستے اور طریقے مختلف پیغمبروں کے زمانے میں اگر اصلاح اور تبدیل کے قابل پائے گئے، تو بدلتے رہے، مگر اصل دین جو ازلی سچائی اور ابدی صداقت ہے، ناقابلِ تبدیل اور ناقابل تغیر رہا ہے،

انبیاء علیہم السّلام کا دنیا میں وقتاً فوقتاً ظہور اسی ضرورت سے ہوتا رہا کہ وہ اس ازلی ابدی صداقت کو ہمیشہ اہلِ دنیا کے سامنے پیش کرتے رہیں اور دین کو اس کے اصل مرکز پر ہمیشہ قائم رکھیں اور ساتھ ہی اپنی اپنی قوم و ملک اور زمانہ کے حالات کے مطابق خاص احکام اور جزئیات جو قوم کے مناسب حال ہوں، وہ اس کو بتائیں، اور سکھائیں،

انبیاءؑ کے سوانح پر نظر کرنے سے اس کی پوری تصدیق ہوتی ہے کہ ایک صاحبِ شریعت نبی کے بعد دوسرا صاحبِ شریعت نبی اسی وقت مبعوث ہوا ہے، جب کہ اگلا صحیفہ وحی جو دین و شریعت کا محافظ تھا، کھو گیا، یا انسانی دست برد سے ایسا بدل گیا کہ اسکی اصلیت مشتبہ ہو گئی، صحیفۂ ابراہیم کے گم ہو جانے کے بعد جس کا نہایت ناقص خلاصہ توراۃ کے سفر تکوین میں ہے، صحیفہ موسیٰ نازل ہوا، صحیفہ موسیٰ کے نو پیدا اختلاف کو دور کرنے کیلئے زبور وغیرہ مختلف صحیفے آتے رہے پھر انجیل آئی، اور انجیل میں انسانی تصرفات کے راہ پانے کے بعد قرآن آیا، چونکہ قرآن دنیا کے آخر تک کے لیے آیا ہے، اس لیے ہر تحریف اور انسانی تصرف سے اسکی حفاظت کی گئی ہے، اور قیامت تک کیجائے گی، اسی لیے اس کے بعد کسی اور صحیفہ کی ضرورت نہیں ہے، اور نہ کسی پیغمبر کی بعثت

کی حاجت ہے، البتہ اس کے معانی کی صحیح تشریح اور بدعات و احداثات کے انسداد کے لیے ائمہ، خلفاء، مجددین، محدثین اور علماے راسخین پیدا ہوتے رہے ہیں، اور ہوتے رہیں گے، اور انکی اصلاح کی صداقت کی پہچان سنت محمدی کا احیاء اور بدعات کا قلع و قمع ہے۔

اب ہم کو پھر اوپر سے چلنا ہے اور اپنے ایک ایک دعویٰ کو وحی محمدیؐ کی روشنی میں دیکھنا ہے، وحدتِ دین کی حقیقت کو وحی اسلامی کے آخری ترجمان نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ	اُس نے دین میں تمھارے لیے وہی راہ مقرر
نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا	کی جو نوح سے کہی تھی، اور ہم نے تیرے پاس
وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى	جو حکم بھیجا اور جو کہدیا ہم نے ابراہیم سے اور
اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا	موسیٰ سے اور عیسیٰ سے یہ کہ دین کو قائم رکھو
فِيْهِ ؕ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْا	اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو (مشرکوں کو جدھر تو
هُمْ اِلَيْهِ ؕ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ	بلاتا ہے، وہ ان پر گراں گذرتا ہے، خدا اپنی طرف
مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ	جسکو چاہتا ہے چن لیتا ہے، اور اپنی طرف
وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَ	اسکو راہ دیتا ہے جو (اسکی طرف) رجوع
هُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ وَلَوْلَا	ہوتا ہے اور یہ تفرقے لوگوں نے وحی کا علم (حقیقی)
كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ	ملنے کے بعد آپس کی ضد اور تعصب سے پیدا
مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ	کئے ہیں اور اگر تیرے رب کی طرف سے
اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ	ایک بات وقت مقررہ تک کیلئے نہ ہو چکی ہوتی

لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ مِنْ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۝ اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ۭ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ ۝ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ۭ اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ۝ اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۝ (شوریٰ-۲)

تو رکشفِ حقیقت کرکے انکے اختلافات کا
فیصلہ کردیا جاتا، اور جن کو ان لوگوں کے بعد
کتاب وراثت میں ملی وہ اس امر حق کی طرف
سے ایسے شک میں ہیں جو انکو چین نہیں لینے دیتا، تو تو
سب کو اسی حقیقت کی طرف بلا اور اسی پر استواری
سے قائم رہ جیسا کہ تجھکو حکم دیا گیا ہے اور ان لوگوں کی
اندازوں کی غلط خواہشوں کی پیروی نہ کر اور کہہ کہ میں
ایمان لایا اس کتاب پر جو خدا نے اتاری اور مجھے حکم
ملا ہے کہ میں تمہارے بیچ میں انصاف کروں ہمارا رب
اور تمہارا رب ہی ایک اللہ ہے ہمکو ہمارے کاموں کا
بدلہ ملے گا اور تمکو تمہارے کاموں کا ہم میں تم میں
کچھ جھگڑا نہیں

ان آیاتِ مبارکہ میں کس خوبی کے ساتھ اس حقیقت کے چہرہ سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہی ایک دین ہے جو نوح کو، ابراہیم کو، موسیٰ کو اور تم کو اے محمد (صلوات اللہ علیہم) عطا کیا گیا ہے، اگلوں کے بعد پچھلوں نے جن کو یہ کتاب ملی، اپنے ذہنی تحریفات اور دینی تصرفات سے اس میں تفرقے پیدا کیے اور آپس کی ضد اور تعصبات سے فرقہ واری کی الگ الگ راہیں نکالیں، پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اس وحدتِ دین کی حقیقت کا یقین اہلِ کتاب کو نہیں ہے حالانکہ وہ شکوک و شبہات کے دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں، پھر حکم ہوتا ہے کہ اے محمد رسول اللہ! تم اس حقیقت

کی طرف لوگوں کو بلاؤ، اور استواری کے ساتھ اپنی اس دعوت اور دعوی پہ قائم رہو اور یہ اعلان کر دو کہ میرا مسلک یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جو کتاب بھی دنیا میں آئی ہے اسکی صداقت کو تسلیم کرتا ہوں اور تم اے اہلِ کتاب جو مختلف فرقوں اور مذہبوں میں بٹ گئے ہو، تمھارے ساتھ انصاف کروں یعنی جس میں جو سچائی ہے اس کو قبول کروں، یا معاملات میں تمھارے ساتھ عدل و انصاف کروں، پھر فرمایا ہمارا اور تمھارا خدا ایک ہی ہے، دو نہیں، اگر اتحاد چاہو تو اس نقطہ پہ ہم تم متحد ہو سکتے ہیں، البتہ ہمارے اور تمھارے راستوں میں جو اختلاف ہے، اسکے ذمہ دار ہم تم خود ہیں، نہ تم ہمارے کاموں کے جوابدہ ہو اور نہ ہم تمھارے کاموں کے اب ہمارے تمھارے درمیان یہاں کوئی جھگڑا نہیں،

اسی وحدت کی دعوت محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبانِ وحی نے ایک اور آیت میں دی ہے،

يَاأَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ	اے کتاب والو آؤ ہم تم ایک بات پہ جو ہمارے
سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ	تمھارے درمیان یکساں ہے متفق ہو جائیں
إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا	وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں
يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن	اور نہ کسی کو اس کا شریک بنائیں، اور نہ
دُونِ اللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا	آپس میں ایک خدا کو چھوڑ کر رب بنائے
اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ،	اگر وہ اسکو قبول نہ کریں تو کہدے کہ تم گواہ
(آلِ عمران ۸)	رہو کہ ہم حکم الٰہی کے تابع (مسلم) ہیں،

یہود و نصاریٰ جنھوں نے اپنی فرقہ واریوں سے اصل دین میں تفریقیں پیدا کر دی تھیں انکی طرف اشارہ کر کے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا،

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا — بیشک وہ جنھوں نے اپنے دین میں الگ الگ
شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۚ إِنَّمَا — راہیں نکالیں اور کئی فرقے ہو گئے تجھکو ان سے
أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا — کوئی واسطہ نہیں انکا معاملہ اللہ کے حوالے ہے
كَانُوا يَفْعَلُونَ (انعام-۲۰) — وہی اُن کو جتا دیگا جو وہ کرتے تھے،

پھر دونوں کو اس کے بعد ہی اصل "دین قیم" کی جو ابراہیم کا تھا، دعوت دی گئی،

قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَىٰ صِرَاطٍ — کہدے کہ میرے خدا نے اس سیدھی راہ کی
مُّسْتَقِيمٍ، دِينًا قِيَمًا مِّلَّةَ إِبْرَاهِيمَ — طرف میری رہنمائی کی، جو دین صحیح ہے ابراہیم
حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (انعام) — حنیف کا مذہب اور وہ (ابراہیم) مشرکوں...

غرض اسلام وہ "دین قیم" ہے جو ہمیشہ انبیاء کا دین رہا، اور موجودہ دین اسلام یہود و نصاریٰ کی تحریفات و تصرفات اور فرقہ پردازیوں کو مٹا کر اسی ایک متحدہ دین کی پکار ہے جسکی طرف تمام انبیاء اپنے اپنے زمانوں میں ہمیشہ لوگوں کو بلاتے رہے، اسی لئے اکثر انبیاء علیہم السلام کے نام کو گنانے کے بعد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی:۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ — یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی
فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ (انعام) — سو تو انہی کی راہ چل،

بعض اسلامی حدود و شرائع کی تشریح کے بعد فرمایا گیا،

يُرِيدُ اللَّهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ — خدا چاہتا ہے کہ تمہارے واسطے بیان کرے
سُنَنَ الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ (نساء) — اور تم کو ان کے راستے دکھائے جو تم سے پہلے تھے

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام اپنے حدود تمرالع میں بھی اگلے پیغمبروں کی تعلیمات کے ساتھ اتحاد رکھتا ہے، اور یہ امر واقعہ ہے، جو لوگ قرآن کا اس لیے انکار کرتے تھے کہ یہ کوئی الگ صحیفہ ہے، ان سے کہا گیا،

إِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولٰى صُحُفِ	بے شبہ یہ بات، اگلے صحیفوں میں بھی ہے یعنی
إِبْرَاهِيمَ وَمُوسٰى (اعلیٰ۔۱)	ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں،

ایک اور آیت میں کہا گیا،

وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ (شعراء۔)	اور یہی پہلے پیغمبروں کی کتابوں میں تھا

ایک مقام پر یہ فرمایا گیا،

مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ	(اے محمد) تجھ سے (اس کتاب میں) وہی کہا
مِنْ قَبْلِكَ (حم السجدہ۔۵)	گیا ہے جو تجھ سے پہلے پیغمبروں سے کہا گیا،

اس اعلان میں یہ ظاہر کر دیا گیا کہ محمد رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے وہی کہا گیا جو اگلے پیغمبروں سے کہا جا چکا تھا، ان معنوں میں قرآن کوئی نئی دعوت لیکر نہیں آیا ہے، بلکہ یہ اسی پرانی دعوت کی تکرار ہے، جس کی آواز دنیا سے گم ہو چکی تھی، یا دب گئی تھی، اگر فرق ہے تو اجمال و تفصیل، یا نقص و تکمیل کا کہ اسلام گذشتہ اجمال کی تفصیل اور دینِ سابق کی تکمیل ہے،

اس لیے اسلام یہ ہے کہ اس پر یقین کیا جائے کہ وحی کے آغاز سے آخر تک ایک ہی پیغام تھا جو آتا رہا، ایک ہی دین تھا جو سکھایا جاتا رہا، اور ایک ہی حقیقت تھی، جو دہرائی جاتی رہی، لیکن وہ بار بار انسانوں کے نسیان و تغافل اور تصرف و تحریف سے بدلتی اور گم ہوتی رہی اور آخری دفعہ دنیا کے کمالِ بلوغ کے زمانہ میں وہ پوری حفاظت کے وعدہ کے ساتھ محمد رسول اللہ صلعم کے ذریعہ سے مفصل

اور کامل ہو کر نازل ہوئی اور قیامت تک محفوظ و باقی رہے گی،

دوسری چیز جس کی مذہب میں ثانوی حیثیت ہے، اور جو اصل مقصد نہیں، ذریعہ ہے، وہ بدلتی رہتی ہے اور عہد محمدی تک برابر بدلتی رہی ہے، اس کا نام شرعہ، منہاج اور منسک ہے، یہودیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض تھا کہ آپ یہودی شریعت کے جزئیات میں کیوں تبدیلی کرتے ہیں، قرآن نے اس کے جواب میں ہمیشہ کہا کہ یہ مقصود نہیں ذرائع ہیں، اصول نہیں فروع ہیں، ہر قوم کی مناسبت سے ان میں تغیر ہوتا رہا ہے، اور ہوتا رہے گا، اس کی ایک مثال قبلہ ہے کہ مقصود اصلی نماز ہے، اور سمت کا تعین ایک فرعی اور ثانوی چیز ہے، بنی اسرائیل کو اپنی آبائی مسجد (بیت المقدس) سے گرویدگی تھی، وہ ان کا قبلہ ہوئی، ابراہیمی عربوں کو اپنی مرکزی مسجد (کعبہ) سے وہی دلبستگی اور لگاؤ تھا، اس لیے یہ ان کا قبلہ بنی، چنانچہ قرآن نے تعیین قبلہ کے موقع پر کہا،

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا	اور ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے جدھر وہ
فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (بقرہ ۱۸)	منہ کرتا ہے، سو تم نیکیوں کی طرف سبقت کرو،

یعنی سمتوں اور جہتوں کی تعیین کو اہمیت کی چیز سمجھو بلکہ نیکیوں کو اصلی اہمیت دو، اسی لیے فرمایا

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ	نیکی یہی نہیں ہے کہ تم پورب یا پچھم کی طرف
قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ	رُخ کرو بلکہ نیکی یہ ہے کہ جو ایمان لائے،
الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ الآیہ (بقرہ ۱۲)	(اور دوسرے نیک کام کرے)

اسی طرح خانہ کعبہ کا حج یہودیوں میں نہ تھا، اسلام نے جب اس کو رائج کیا تو کہا ہر گروہ نے اپنے عام مذہبی اجتماع اور قومی عبادت کے لیے کوئی نہ کوئی طریقہ مقرر کیا ہے اور اسلام نے خانہ کعبہ

کے حج کو اس لیے تجویز کیا ہے،

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ	ہر قوم کے لیے ہم نے عبادت کا طریقہ بنایا
فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ وَادْعُ إِلَىٰ	جس کی اس قوم کے لوگ پابندی کرتے
رَبِّكَ ۖ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُسْتَقِيمٍ	ہیں سو اس بات میں وہ تجھ سے جھگڑا نہ کریں
وَإِنْ جَادَلُوكَ فَقُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ	تو اپنے رب کی طرف بلاتے جا تو بیشک سو جھ کی
بِمَا تَعْمَلُونَ	سیدھی راہ پر ہے، اور اگر وہ تجھ سے جھگڑنے لگیں
(ر ج ۔ ۹)	تو کہدے کہ اللہ بہتر جانتا ہے، جو تم کرتے ہو،

سورہ مائدہ میں عدل و انصاف اور قانونی جزا و سزا کے طریقوں کے ضمن میں ان یہودیوں اور عیسائیوں سے جنھوں نے اسلام قبول نہیں کیا یہی کہا گیا کہ وہ اپنی اپنی کتابوں ہی کے احکام پر عمل کریں جن کو وہ چھوڑ بیٹھے ہیں،

پہلے یہودیوں سے کہا:۔

إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى	ہم نے توراۃ اتاری، اس میں ہدایت اور
وَنُورٌ ۔ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ	روشنی تھی، پیغمبر جو حکمبردار تھے وہ یہود
أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ	کا فیصلہ کرتے، اور ان کے عالم اور
وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ	فقیہ کہ اللہ کی کتاب پر وہ نگہبان تھے
وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ (مائدہ)	اور وہ تھے اس پر خبردار،

پھر عیسائی شریعت کی نسبت کہا:۔

وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ
مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ
التَّوْرٰىةِ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ
هُدًى وَّنُوْرٌ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ
يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّ
مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ
الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ط

اور ہم نے ان پیغمبروں کے پیچھے مریم کے بیٹے
عیسیٰ کو بھیجا سچ بتاتا ہوا اسکو جو اسکے پہلے
تھا یعنی تورات اور ہم نے اسکی انجیل دی اس میں
ہدایت اور روشنی (تھی) اور تصدیق کرتی
ہوئی اپنے سے پہلے کی یعنی توراۃ کی اور ہدایت اور
نصیحت پرہیزگاروں کے لیے اور چاہیے کہ انجیل
والے اسکا حکم دیں جو اس میں خدا نے اتارا

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے کہا،

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا
لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا
عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ
مِنَ الْحَقِّ، (مائدہ ۷)

اور ہم نے تیری طرف یہ کتاب سچائی کے ساتھ
اتاری جو اپنے پہلے کی کتاب کی تصدیق کرتی
ہے اور امانت کے ساتھ اس پر شامل ہے سو
تو انکے درمیان اسکے مطابق فیصلہ کر جو خدا نے
اتارا اور تیرے پاس جو سچائی آئی ہے، اسکو م

دیکھو کس خوبی کیساتھ صحیفہ محمدیؐ نے اگلی کتابوں کی تصدیق اور مدح و تعریف کی اور ان اہلِ مذاہب کو جو اسلام پر ایمان نہیں لائے، اپنی اپنی کتبِ منزلہ پر عمل کرنے کی دعوت دی اور پھر یہ دعویٰ کیا کہ قرآن تمام گذشتہ کتابوں پر امین و محافظ بنکر آیا ہے، اور اس میں ان سب کتابوں کی سچائیاں یکجا ہیں لیکن ان لوگوں نے اپنی اپنی کتابوں کو چھوڑ کر اہواء غلط خواہشوں کی پیروی شروع کر دی

یہ ہوا کیا ہیں، کتاب الٰہی میں تحریف و تصرف کرکے آسانیاں پیدا کرنا اور احکامِ الٰہی کے مقابلہ میں انسانی اجتہادات کی آمیزش (فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ) افسوس ہو اُن پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب بناتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے، بقرہ - ۹) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ شریعتِ الٰہی کو چھوڑ کر ان اہل کتاب کی اہوا کی پیروی نہ کریں، اس کے بعد حدود و جزا و سزا میں ان خفیف اختلافات اور تبدیلیوں کو جو تورات انجیل اور قرآن میں ہیں، غیر اہم بتایا گیا، فرمایا،

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّ	ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک
مِنْهَاجًا (مائدہ ۸)	دستور اور ایک راستہ بنا دیا،

انہی اختلافات کی بنا پر یہود اور نصاریٰ دونوں ایک دوسرے کو سربسر باطل کہتے تھے

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ	اور یہود نے کہا نصاریٰ کسی راہ پر نہیں اور
شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ	نصاریٰ نے کہا یہود کسی راہ پر نہیں، حالانکہ
عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ (بقرہ ۱۳)	وہ دونوں خدا کی کتاب پڑھتے ہیں،

دونوں مل کر مسلمانوں سے کہتے تھے،

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ	اور انھوں نے کہا کہ یہودی یا نصرانی بنو تو
تَهْتَدُوا، (بقرہ ۱۷)	تو ہدایت پاؤ گے،

ارشاد ہوا کہ تم دونوں اپنے اپنے الگ راستوں کو چھوڑ کر آؤ اور اصل دینِ ابراہیمی پر متفق ہو جاؤ

قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَ	کہہ بلکہ ابراہیم کے دین کی پیروی کرو جو موحد

مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا

تھا، مشرک نہ تھا، تم لوگ کہو کہ ہم خدا پر اور

بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى

جو کچھ ہماری طرف اترا، اور جو ابراہیم اور اسمٰعیل

اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ

اور اسحٰق اور یعقوب اور اس کی اولاد پر

وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى

اتارا گیا، اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اور جو

وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ

سب نبیوں کو انکے خدا کی طرف سے دیا گیا

بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ

اور سب پر ایمان لائے، ہم ان رسولوں میں فرق

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ

نہیں کرتے اور ہم اس ایک خدا کے تابع

اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ

ہیں تو اگر یہ بھی اسی طرح لائیں جس طرح تم

شِقَاقٍ ج (بقرہ ۲-۱۶)

ایمان لائے ہو تو انھوں نے ہدایت پائی اور اگر یہ

یہود و اور نصاریٰ کو یہ دعویٰ تھا،

لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ

یہود و نصاریٰ کے سوا کوئی جنت میں

هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ج (بقرہ ۲-۱۳)

داخل نہ ہوگا،

جو اب دیا گیا،

تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ (بقرہ ۲-۱۳)

یہ اُن کی باطل آرزوئیں ہیں،

بلکہ

بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ

ہاں جس نے بھی اپنے خدا کا مطیع بنایا اور

مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ

وہ نیکوکار ہے تو اسکی مزدوری اُس کے

عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (بقرہ۔۱۴) خدا کے پاس ہو نہ انکو خوف ہوگا اور نہ غم،

تمام اہلِ مذاہب کو یکساں خطاب کرکے فرمایا،

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا بیشک جو ایمان لائے یعنی مسلمان جو یہودی

وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـُٔوْنَ مَنْ اٰمَنَ ہوئے اور نصاریٰ اور صابی جو بھی خدا پر اور

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا آخری دن پر ایمان لایا اور نیک عمل کیا تو انکی

فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ مزدوری انکے پروردگار کے پاس ہی، نہ ان

عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (بقرہ:۸) پر خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہونگے،

اب جو ایمان لائے یعنی مسلمان اور جو یہودی ہے، اور نصاریٰ اور صابین ان میں سے جو بھی اپنے دور رجعت میں خدا کی توحید پر روز آخر کی صداقت پر ایمان لایا اور اچھے عمل کیے، انکو اپنے کام کا پورا ثواب ملے گا، یعنی جس نے بھی اپنے اپنے پیغمبر کی اصلی تعلیم اور سچی شریعت کے مطابق جو شرک و کفر اور بت پرستی سے یقیناً پاک تھی عمل کیا، اسکو اس کا ثواب ملے گا، خدا کی توحید اور روزِ آخری صداقت پر ایمان لانا اور اچھے کام کرنا صرف عقل کی ہدایت سے نہیں ہوسکتا، بلکہ کسی رسول کی تعلیم ہی سے ہوسکتا ہے، اور اس پر تمام اہلِ مذاہب کا اتفاق ہے، اسلئے رسالت کی تصدیق بھی اسکے ضمن میں داخل ہے کہ:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ بیشک جو اللہ اور اسکے رسولوں کا انکار کرتے ہیں،

وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اسکے رسولوں میں جدائی

وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ کریں اور کہتے ہیں، کہ ہم کسی کو مانتے ہیں اور

نَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ کسی کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں کہ وہ اس میں

سَبِيلًا، اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا، وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا، (نساء ۲۱)

درمیان کا راستہ اختیار کریں، وہی حقیقی کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے اہانت کرنیوالا عذاب تیار کیا ہے اور جو لوگ اللہ اور اسکے رسولوں پر ایمان لائے اور ان میں کسی کا بھی انکار نہیں کیا یہ وہ ہیں جن کو انکی مزدوریاں خدا دیگا، اور خدا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے،

دوسری آیت میں ہے،

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ، (نور ۹)

مومن وہی ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے،

اس بنا پر ان آیتوں سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ قبولِ عمل کے لیے ایمان شرط ہے، دوسری یہ کہ ایمان و عمل کے علم کے لیے نبی کی تصدیق ضروری ہے، اسی لیے اوپر جن چار فرقوں کا ذکر ہوا، وہ چاروں وہ ہیں جو کسی نہ کسی پیغمبر کے ماننے والے ہیں، اس بنا پر کامل اسلام یہ ہے کہ تمام رسولوں کو صادق مانا جائے، چنانچہ اسکی تفصیل سورہ مائدہ میں ہے،

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ.

کہدے اے کتاب والو! تم کچھ نہیں جبتک تم توراۃ اور انجیل کو اور جو کچھ تمہاری طرف اتارا گیا اسکو قائم نہ کرو، اور اے پیغمبر جو تیری طرف اترا ہے، وہ انکی سرکشی اور انکار کو اور بڑھائیگا

طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى
الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ
الَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰى
مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ
صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ
يَحْزَنُوْنَ ۝ (مائدہ ۷-۱۰)

تو ان منکروں کا غم نہ کرو، اس میں کوئی
شبہہ نہیں کہ جو مسلمان ہوئے اور جو یہودی
ہوئے، اور صابی اور عیسائی جو خدا پر
اور روزِ قیامت پر ایمان لایا، اور اچھے
کام کئے، تو ان پر کوئی خوف نہیں، اور نہ
وہ غمگین ہونگے،

اس کے بعد ہی اس کا ذکر ہے کہ یہودیوں نے ہمیشہ رسولوں کا انکار کیا، اور نصاریٰ توحید کو چھوڑ کر تثلیث اور الوہیت مسیح میں مبتلا ہو گئے، اسلئے اصل اسلام سے یہ دونوں ہٹ گئے ہیں، فرمایا

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ
وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ۭ كُلَّمَا جَاۗءَهُمْ
رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا
كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ۝ وَحَسِبُوْٓا
اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ
تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا
كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا
يَعْمَلُوْنَ ۝ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ
هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ قَالَ

بیشک ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور انکی
طرف کئی رسول بھیجے جب کبھی ان کے پاس
کوئی رسول انکی نفسانی خواہشوں کے خلاف
احکام لیکر آیا، تو انھوں نے کتنوں کو جھٹلایا
اور کتنوں کا خون کرنے لگے اور خیال کیا کہ
اس سے کچھ خرابی نہ ہوگی، سو اندھے ہو گئے اور
پھر خدا ان پر رجوع ہوا، پھر ان میں
بہتیرے اندھے اور بہرے ہو گئے اور اللہ
دیکھتا ہے، وہ جو کرتے ہیں بے شبہہ وہ کافر

اَلْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ	ہوئے جنھوں نے یہ کہا کہ مریم کا بیٹا مسیح ہی اللہ
رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ	ہے، مسیح نے تو یہ کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل اللہ
فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ	کو پوجو جو میرا اور تمہارا رب ہی بیشک جو اللہ
النَّارُ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ	کا شریک بنائیگا تو اللہ نے اس پر جنت حرام
لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ	کر دی اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور گنہگاروں
ثَلٰثَةٍ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ	کی کوئی مدد کرنے والا نہیں بے شبہ وہ کافر ہے
وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ	جنھوں نے کہا کہ اللہ تین میں تیسرا ہے، حالانکہ کوئی
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ	اللہ نہیں مگر وہی ایک اکیلا وہ اپنے اس
(مائدہ ۷۔۱۰)	قول سے باز نہ آئے تو ان میں سے کافروں کو

یہ تو ان یہود و نصاریٰ کے "ایمان" کا حال تھا، اس کے بعد اسی رکوع میں ان کے حسنِ عمل کا جائزہ لیا گیا ہے، اور اسی کے بعد ہی ان سے کہا گیا ہے،

وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ	اور اگر اللہ اور اس نبی پر اور جو اس نبی پر اترا
وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ	اس پر یہ لوگ ایمان لے آتے تو ان (مشرکوں)
وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (مائدہ ۱۵)	وہ اپنا دوست نہ بناتے لیکن انہیں اکثر نافرمان ہیں

اسلام یعنی تمام نبیوں اور رسولوں کے واحد اور مشترک دین کا اصل الاصول دو باتیں ہیں، توحید کامل اور رسالتِ عمومی یعنی اللہ تعالیٰ کو توحید کی تمام صفتوں میں کامل بلا شریک ماننا اور اس کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو یکساں صادق اور راست باز تسلیم کرنا، چنانچہ فرمایا،

أَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ أَسْلَمَ	کیا وہ دینِ الٰہی کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں
مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَّ	حالانکہ جو بھی آسمانوں میں اور زمین میں ہے وہ
كَرْهًا وَّإِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ	خوشی سے یا مجبوراً خدا کا مسلم یعنی فرمانبردار ہوا اور
وَمَآ أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ أُنْزِلَ عَلٰٓى	اسی کی طرف سب لوٹائے جائیں گے (اے پیغمبر) کہہ
إِبْرٰهِيْمَ وَإِسْمٰعِيْلَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ	ہم اللہ پر اور جو ہماری طرف بھیجا گیا اور جو ابراہیم پر اور
وَالْأَسْبَاطِ وَمَآ أُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى	اسمٰعیل پر اور اسحاق پر اور یعقوب پر اور ان کی اولاد
وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ	پر اتارا اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ اور سب پیغمبروں کو
أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ	اُنکے رب کی طرف سے ملا ہم سب کی صداقت کو تسلیم
وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ	کرتے ہیں ہم اُن میں سے کسی میں کوئی فرق نہیں کرتے
يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ	ہم اسی خدا کے مسلم یعنی فرمانبردار ہیں اور جو اسلام
الْخٰسِرِيْنَ،	کے سوا اور کوئی دین چاہیگا تو وہ اس سے قبول
(آلِ عمران - ۹)	نہ کیا جائیگا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانیوالوں

اس آیت سے ظاہر ہے کہ خدا پر اور تمام رسولوں پر ایمان لانا دین اللہ ہے اور اسی کا نام اسلام ہے جس نے اس اصول کو قبول نہیں کیا، وہ آخرت میں نقصان اٹھائیگا، آلِ عمران میں ہے کہ یہود و نصاریٰ تاویلاتِ باطلہ اور اتباعِ متشابہات کی وجہ سے گمراہ ہو گئے یعنی دین اسلام سے روگرداں ہو کر اختلافات میں پڑ گئے، فرمایا،

إِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ	بیشک دین خدا کے نزدیک اسلام ہی ہے اور

وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ فَاِنْ حَاۗجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۭ (آل عمران-۲)

جن کو کتاب دیگئی، انھوں نے علم آنے کے بعد اُس میں آپس کی ضد کے سبب سے اختلاف کیا اور جو اللہ کی آیتوں کا انکار کریگا تو اللہ جلد حساب لینے والا ہی، تو اگر (اے پیغمبر) یہ تجھ سے بحث کج بحثی کریں تو کہدے کہ میں نے اور میرے پیرو نے تو اپنے کو خدا کا تابع فرمان (مسلم) کر دیا ہی،

اسی کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ یہود و نصاریٰ سے سوال کریں کہ وہ اسلام کو قبول کرتے ہیں یا نہیں ؟،

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ۭ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ، (آل عمران-۲)

اور (اے پیغمبر) ان سے جن کو کتاب دیگئی اور عرب جاہلوں سے کہدے کہ کیا تم نے بھی اسلام قبول کیا ؟ اگر کیا تو انھوں نے سیدھی راہ پائی اور اگر انکار کیا تو تجھ پر صرف پہنچا دینا ہے، اور اللہ بندوں کو دیکھتا ہی،

یہود و نصاریٰ کو اس اسلام کے قبول کرنے پر ہدایت تامہ ملنے کی بشارت ہوتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ہدایت تامہ ہے یہی دین ہے جس کو یہود و نصاریٰ اور تمام اہل مذاہب نے جو کسی گذشتہ پیغمبر کی اُمت ہون کھو دیا تھا، اور اب جس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے دوبارہ دنیا میں پیش کیا گیا ہے، اسلئے جو ہدایت اُن قوموں کے پاس تھی، وہ ناقص تھی، اور

اسلام جس کو لے کر آیا وہ کامل ہی، نیز یہ معلوم ہوا کہ جن آیتوں میں یہ کہا گیا ہی کہ "اب جو ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے، اور نصرانی اور صابئی جو بھی خدا اور یومِ آخر پر ایمان لایا، اور اس نے نیک کام کیا، اُس کو خوف و غم نہ ہوگا"، اُن میں خدا پر ایمان لانے سے مقصود توحید کامل ہی، اور اس کا یہ منشا نہیں کہ یہود و نصاریٰ اور صابئی وغیرہ اپنے موجودہ گمراہ عقیدوں کے باوجود نجات کے مستحق ہیں، یہود و نصاریٰ کیا مسلمان بھی اس توحید کامل کے بغیر نجات کے مستحق نہیں، جب تک مسلمانوں کا ایمان اور عملِ صالح ٹھیک اس تعلیم کے مطابق نہ ہو جو ان کے رسول کے ذریعہ سے دنیا میں آئی ہی، یہ اصول ہر ایک کے لیے ہی خواہ وہ مسلمان ہو یا یہودی یا عیسائی ہو یا صابئی غرض کسی نبی کی پیروی کا مدعی ہو،

نبوتِ محمدی کا یہ دعویٰ نہیں کہ وہی ایک ہدایت ہی اور اُسکے سوا سب ضلالت ہی، بلکہ یہ دعویٰ ہی کہ وہی ایک کامل ہدایت ہی، اور بقیہ مذاہب سابقہ موجودہ حالت میں ناقص ہیں یعنی وہ ابدی کامل ہدایت جو اپنے اپنے وقتوں میں سب نبی لیکر آتے رہے، چونکہ انکے پیرو اپنے تاویلات، تحریفات، تصرفات اور اختلافات سے اُسکو برباد کر چکے تھے، اسلئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کو لیکر آخری دفعہ تشریف لائے اور اب وہ ہدایت ہمیشہ کامل رہیگی کبھی ناقص نہ ہوگی کیونکہ اسکا صحیفہ ہدایت (قرآن) تحریف و اختلافات اور تصرف سے محفوظ و پاک رہے گا،

یہی وجہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کو نبوتِ محمدیؐ کی دعوت جہاں دی گئی ہی ہدایت کی بشارت بھی سنائی گئی ہے، چنانچہ اسی آیت میں جو اوپر گذری یہ ہے:-

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا

اے پیغمبر! ان سے جن کو کتاب دی گئی اور عرب کے جاہلوں سے کہو کیا تم نے اسلام لائے اگر اسلام لائے تو انھوں نے

سورہ بقر میں ہے،

قُولُوا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا
وَمَا أُنْزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ
وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا
أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ
مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ
مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ، فَإِنْ
آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا
وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ

(البقرہ ۶-۱۰)

(اے مسلمانو!) کہو کہ ہم اللہ پر اور جو ہماری
طرف اترا، اور جو ابراہیم اور اسمٰعیل پر اور اسحٰق پر
اور یعقوب پر اور انکی اولاد پر اترا، اور جو
موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور سب پیغمبروں کو انکے
پروردگار کی طرف سے دیا گیا، سب پر ایمان لائے
ہم ان میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے،
اور ہم اسی خدا کے مسلم یعنی فرمانبردار ہیں،
تو اگر یہ بھی اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم نے
تو اگر یہ بھی تو انھوں نے سیدھی راہ پائی، اور اگر

یہود و نصاریٰ اور اہلِ کتاب کو تعلیم محمدی کی طرف دعوت اسی "ہدایت" کے پانے کے لیے ہے، جو اسلام یعنی انبیاء کے دینِ ازلی سے عبارت ہے اور جس کو لیکر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے اور اب فلاح و نجات اسی کے ماننے پر منحصر ہے:

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ
وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ
هُمْ يُوقِنُونَ أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِنْ
رَبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ

(البقرہ ۱-۵)

جو اسکو جو تیری (پیغمبر) طرف اترا اور جو تجھ
سے پہلے اترا دونوں کو مانتے ہیں اور پچھلی زندگی
پر یقین رکھتے ہیں وہی اپنے پروردگار کی ہدایت
پر ہیں اور وہی کامیاب ہیں،

حضرت موسیٰؑ کے قصہ کے بعد فرمایا کہ رحمتِ الٰہی گو عام ہے مگر یہ نعمت خاص طور سے
اُن کا حصہ ہے جو تعلیمِ محمدی کو قبول کریں اور وہی نجاتِ کامل کے مستحق ہیں

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا — اور میری رحمت ہر چیز کو سمائے ہی تو اس رحمت
لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ — کو میں انکے لیے لکھدونگا جو پرہیزگار ہیں اور زکوٰۃ
وَالَّذِينَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُونَ الَّذِينَ — دیتے ہیں اور جو ہمارے حکموں کو مانتے ہیں
يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ — جو اس اَن پڑھ فرستادہ پیغمبر کی پیروی کرتے
الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ — ہیں جس کو وہ اپنے ہاں توراۃ اور انجیل
فِي التَّوْرٰىةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ — میں لکھا پاتے ہیں جو اُن کو نیکی کا حکم دیتا ہے
بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ — اور برائی سے باز رکھتا ہے اور اچھی چیزوں کو
وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ — اُن کیلئے حلال کرتا اور بُری چیزوں کو حرام
الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ — کرتا ہے اور اُن کے بندھن کو اور اُن زنجیروں
وَالْأَغْلٰلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِينَ — کو جو اُن پر پڑی تھیں اتارتا ہے تو جنھوں نے
آمَنُوا بِهٖ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ — اس پیغمبر کو مانا اور اسکی تائید کی اور اسکی مدد کی
وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهٗ — اور اس روشنی کے پیچھے چلے جو اسکے ساتھ اتری
أُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ. قُلْ — وہی کامیاب ہیں کہدے (اے پیغمبر!) کہ اے
يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ — انسانو میں تم سب کی طرف اُس خدا کا رسول
جَمِيعًا الَّذِي لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ — ہوں جسکی آسمانوں اور زمین کی شہنشاہی

وَالْاَرْضِ ج لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَ	ہو اُسکے سوا کوئی خدا نہیں وہی جلاتا اور
يُمِيْتُ ص فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ	وہی مارتا ہی سو اللہ اور اسکے اس اَن پڑھ
النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ	پیغام رسان رسول پر ایمان لاؤ اور جو اللہ پر
وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ	اور اسکی باتوں پر ایمان رکھتا ہی اور اس رسول
(اعراف - ۲۰)	کی پیروی کرو تاکہ تم سیدھی راہ پاؤ

ان آیات میں صاف ظاہر کر دیا گیا کہ گذشتہ مذاہب کے پیروؤں کو محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا اس لیے ضروری ہے کہ وہ دینِ خالص جو انسانی تصرفات اور آمیزشوں سے مکدر ہو گیا تھا وہ صحفِ الٰہی کی پیشینگوئیوں کے مطابق آپ کے ذریعہ سے پھر نکھارا گیا ہے، اور جن اضافوں اور رحجانات احکام کی سختیوں کو انسانوں نے اس میں شامل کر دیا تھا، وہ آپ کے ذریعہ سے دور کی گئیں، نیز آپ عالمگیر پیغمبر بنا کر مبعوث کئے گئے ہیں، اس لیے ہدایت تامہ، نبوتِ عمومی اور نجاتِ کامل اور فلاحِ عام اب صرف وحی محمدیؐ کے اندر محدود ہے،

الغرض دینِ محمدیؐ کو قبول کرنا اس لیے تمام انسانوں پر ضروری ہے کہ وہ دین ازلی جو ہر مذہب کا جوہر تھا اور جو اس کے پیروؤں کی تحریف و تصرف سے برباد ہو گیا تھا، اُسی کو صحیفۂ محمدی لیکر آیا ہے، اب وہ ہمیشہ محفوظ رہیگا، کیونکہ اسکا نبی خاتم النبیین ہے اس کا دین کامل دین اور اسکا صحیفہ تمام صحفِ الٰہی پر مہیمن اور حاوی ہی، اور قیامت تک خدا کی طرف سے اس کی پوری حفاظت اور بقا کا وعدہ کیا گیا ہے، یہ چاروں دعوے یعنی تکمیلِ دین، قرآن کا مہیمن ہونا، قیامت تک اس کا محفوظ و باقی رکھنا، اور ختمِ نبوت، حسبِ ذیل دلائل سے ثابت ہیں،

تکمیلِ دین قرآن کے سوا کسی اور صحیفہ نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ مکمل ہے، اور اس کے ذریعہ سے دینِ الٰہی اپنے تمام اصول و فروع (مناسک و مناہج و شرائع) کے لحاظ سے تکمیل کو پہنچ گیا، بلکہ گذشتہ مذاہب میں سے ہر ایک نے اپنے وقت میں یہی کہا کہ اس کے بعد ایک اور نبوت آئیگی جو اس کے کام کی تکمیل کرے گی، خدا نے حضرت موسیٰؑ سے فرمایا،

"میں ان کے لیے اُن کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کرونگا، اور اپنا کلام اسکے منہ میں ڈالونگا، اور جو کچھ میں اُسے فرماؤں گا، وہ سب اُن سے کہے گا" (استثنا ۱۸-۱۹)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد اُن کے مانند ایک اور نبی آنے والا تھا جس کے منہ میں اللہ تعالیٰ خود اپنا کلام ڈالے گا، اس سے ثابت ہوا کہ حضرت موسیٰؑ کی طرح ایک اور صاحب شریعت نبی خدا کے نئے کلام کے ساتھ آئیگا، اسی طرح حضرت عیسیٰؑ نے بھی کہا:-

لیکن وہ فارقلیط (احمد) پاکیزگی کی روح ہے، جسے باپ (خدا) میرے نام سے بھیجے گا، وہی تمہیں سب چیزیں سکھائیگا، اور سب باتیں جو میں نے تم سے کہی ہیں تمہیں یاد دلائیگا (یوحنا ۱۴-۲۶)

"اور وہ فارقلیط (احمد) آکر دنیا کو گناہ سے راستی اور عدالت سے قصوروار ٹھہرائیگا، گناہ اسلیئے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے، ..... میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تم سے کہوں، پر اب تم اُن کی برداشت نہیں کر سکتے، لیکن جب وہ یعنی سچائی کی روح آئے گی تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتائے گی، اس لیے کہ وہ اپنی نہ کہے گی لیکن جو کچھ سنے گی، سو کہے گی، میری بزرگی کرے گی" (یوحنا ۱۶-۸)

حضرت عیسیٰؑ نے بھی اپنے کلام کو مبہم نہ تمام ہی فرمایا، اور ایک آئندہ آنیوالے کا پتہ دیا،

جو اُس کی تکمیل کریگا،

آخر وہ موعود الامم (صلی اللہ علیہ وسلم) آیا اور دعویٰ کیا کہ میں موسیٰ کے مانند بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل میں سے آیا ہوں، اور میرے منہ میں خدا نے اپنی بولی ڈالی ہے اور یہ دعویٰ کیا کہ میں ہی وہ سچائی کی روح ہوں جو مسیح کی اصلی بڑائی ظاہر کرنے، سچائی کی راہ بتانے اور مسیح کی ادھوری بات کو کامل کرنے کے لیے آئی ہے میں اپنی نہیں کہتا بلکہ وہی کہتا ہوں، جو اور یہ سنتا ہوں اور آخر زمانہ نبوت کے ختم پر وحیِ الٰہی نے اس کی زبان سے یہ اعلان عام کیا،

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ — آج میں نے تمہارا دین کامل کردیا، اور اپنی

اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ — نعمت تم پر تمام کردی، اور تمہارے لیے

لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (مائدہ ۱) — اسلام کا دین پسند کیا،

اِسی تکمیل کا یہ اثر تھا کہ اس نے یہود کے بعض سخت فقہی احکام کو جو اُن کی سخت گیری کیلئے اُن پر عائد تھے اور اصل دین ابراہیمی میں داخل نہ تھے[1] یا انسانوں کے اضافے اور تصرفات تھے بدل کر ایسے مناسب اور آسان احکام عطا کئے جو ہر زمانہ کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں، اسی لیے اس نے اپنے بعد کسی آنے والے پیغمبر کی پیشگوئی نہیں کی، نہ کسی نئے کلام کے نزول کی خبر دی، نہ کسی نئی شریعت کا منتظر کیا، کہ تکمیل کے بعد اب کسی نئے آنے والے کسی نئے کلام اور کسی نئی شریعت کا موقع کہاں؟ اور اسی بنا پر قرآن نے ہر جگہ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نازل کیا گیا) پر ایمان لانے کی تاکید کی لیکن وَمَا اُنْزِلَ مِنْ بَعْدِكَ کے قبول کرنے کا کہیں ذکر تک نہیں کیا

---

[1] دیکھو آیت كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِبَنِيْ اِسْرَائِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَائِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ الایہ (آل عمران ۱۰)

قرآن مہیمن کتب ہے

اس دینِ کامل کا صحیفہ تمام اگلی کتابوں کا مصدّق ہے،

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (مائدہ ۷)

اپنے آگے کی کتابوں کی تصدیق کرنے والا،

وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں پر مشتمل ہے اس لیے جو کوئی اس صحیفہ کو قبول کرتا ہے، وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں کو قبول کر لیتا ہے، یہ حیثیت قرآن کے سوا کسی دوسرے صحیفہ کو حاصل نہیں، فرمایا،

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (مائدہ ۷)

اور ہم نے (اے محمد) تیری طرف سچائی لیتا یہ کتاب اتاری جو اپنے سے پہلے کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے اور اس پر شاہد و حاوی ہے،

لفظ مہیمن کی تفسیر اہل زبان مفسروں نے یہ کی ہے:-

ابن عباسؓ شاہد اور امین، قرآن اپنے پہلے کی ہر کتاب کا امین ہے،

قتادہؓ قرآن سے پہلے جو کتابیں تھیں، ان کا وہ امین اور شاہد ہے،

غرض قرآن اگلی کتابوں کی صداقتوں اور سچی تعلیموں کی امانت اپنے اندر رکھتا ہے،

قرآن محفوظ ہے اور رہیگا

پیغمبر کی تعلیم کی حفاظت اُس کے صحیفۂ الٰہی کی حفاظت پر موقوف ہے، قرآن سے پہلے کوئی کتاب الٰہی دانستہ اور نادانستہ لفظی تحریفات اور تصرفات سے پورے طور پر بری نہیں رہی، لاکھوں پیغمبروں میں سے چند کے سوا کسی کا صحیفہ دنیا میں باقی نہیں اور جو باقی ہے وہ فنا ہو ہو کر نئے نئے قالب میں بدلتا رہا ہے، توراۃ جل جل کر خاک ہوئی، پھر ان سوختہ اوراق سے تحریر کی گئی، اور ترجموں کی تحریفات سے اپنی اصل کھو بیٹھی، انجیل میں تحریف و تعدد تو اسی زمانہ میں شروع ہو چکا

تھا، پھر مترجموں کی کتر بیونت نے حقیقت بالکل مشتبہ کردی، زردشت کا صحیفہ سکندر کے نذر ہوا اب صرف گاتھا کا ایک حصہ بچا کھچا رہ گیا ہے، ان کتابوں کا یہ حال اسلیئے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انکو دائمی اور آخری کتابیں بنا کر نہیں بھیجا تھا، اسی بنا پر اُن کی دائمی حفاظت کا وعدہ نہیں کیا گیا، لیکن قرآن کی نسبت یہ وعدہ ہوا کہ وہ ہمیشہ کے لیے باقی اور محفوظ رہے گا، اسکی بقا اور حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی اور فرمایا اور کس وثوق سے فرمایا،

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ، (حجر-۱)	ہم نے اس نصیحت (کی کتاب) کو اتارا اور بے شبہ ہم ہیں اسکی حفاظت کرنے والے

یہ وعدۂ الٰہی ایک اور آیت میں ان الفاظ میں دہرایا گیا ہے،

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قُرْاٰنَهٗ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ، ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (قیامہ-۱)	بیشک ہمارے ذمہ ہے اس (قرآن) کو سمیٹ کر رکھنا، اور اُس کا پڑھنا، پھر جب ہم پڑھیں تو تو اس کے پڑھنے کے ساتھ رہ، پھر بے شبہ ہم پر ہے اسکو کھول کر بتانا،

اس آیت میں قرآن کی قرأت یعنی لفظ و عبارت اور بیان یعنی معنی دونوں کی ذمہ داری خدائے تعالیٰ نے خود اپنے اوپر لی ہے، تیسری آیت میں اسکی تصریح ہے کہ اس حق میں باطل کی آمیزش کبھی راہ نہ پا سکے گی، فرمایا،

وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ	اور بیشک، یہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو غالب ہے باطل نہ اسکے سامنے سے اور نہ اس کے

تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ، — پیچھے سے اس کے پاس آئیگا ایک حکمت والے
(حٰمٓ السجدۃ ۲-۵) — اور خوبیوں والے کی طرف سے اترا

اس کتاب کو غالب فرمایا گیا، یعنی جو اپنے ہر حریف کو اپنے دلائل کے زور سے پست کر یگی، باطل نہ اس کے سامنے سے اس میں مل سکتا ہے اور نہ پیچھے سے یعنی نہ لفظ و عبارت کی طرف سے اور نہ حقیقت و معنی کی جہت سے، کیونکہ وہ ایک حکمت والے کی طرف سے اتری ہے، اس لیے وہ اپنی حکمت و دانائی کی تعلیم سے غالب رہیگی، اور چونکہ وہ ایک سراسر خوبیوں والے کی جانب سے عطا ہوئی ہے، اس لیے ہر باطل کے عیب سے پاک رہے گی،

یہ قرآن کا اپنا دعویٰ ہے اور ساڑھے تیرہ سو برس کی تاریخ اس کی صداقت پر گواہ ہے

ختم نبوت مقدماتِ بالا کا نتیجہ گو خود یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی کی، قرآن کے بعد کسی صحیفہ کی اور اسلام کے بعد کسی دین کی ضرورت نہ ہو، لیکن وحی محمدیؐ نے ہر شک کے ازالہ کے لیے آگے بڑھ کر یہ تصریح بھی کر دی کہ اب نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا، اور اب آپ کے بعد کسی نبی کی حاجت نہیں، کہ دین کامل اور صحیفۂ الٰہی محفوظ ہو چکا، اور ہدایتِ ربانی کے دروازہ کے بند ہونے کا خطرہ دور ہو گیا، چنانچہ خود تاریخ انسانی گواہ ہے کہ بعثتِ محمدیؐ کے بعد سے دنیا کی حالت بدل گئی، متفرق قومیں پیوستہ ہو گئیں، زمین کے کونے ایک دوسرے سے مل گئے اور توحید کامل کا غلغلہ عرش سے فرش تک بلند ہو گیا، اور خدا کے تمام رسولوں کو سچا اور صادق ماننے کا ولولہ آہستہ آہستہ ترقی پانے لگا، یہاں تک کہ ان قوموں نے بھی جو مسلمان نہیں ہوئیں، ان دونوں صداقتوں کو اصولاً تسلیم کر لیا،

وحدتِ ادیان اور دینِ اسلام

تفصیلِ بالا کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ وحدتِ ادیان کا منشا کیا ہے، یعنی یہ کہ اصل میں ایک ہی دین ہے، جو تمام انبیا کا مذہب رہا، لیکن وہ بعد کو ان کے پیروؤں کے صحائف میں تحریف و تصرف کے سبب سے بگڑتا رہا، اسی دینِ ازلی کو لیکر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور اسی کا نام اسلام ہے، جو اپنے صحیفہ کی بقا و حفاظت اور دین کی تکمیل اور نبوت کے اتمام کے سبب سے ہمیشہ قائم و باقی رہے گا، اگر تمام مذاہب سابقہ اپنے اپنے اس اصلی دین پر آجائیں جس کی تعلیم اُن کے پیغمبروں نے دی تھی، تو وہ وہی دینِ ازلی ہو گا، جس کا نام اسلام ہے، اور نوحیؑ ابراہیمیؑ، موسویؑ، عیسویؑ اور محمدیؐ دینوں میں سوائے اجمال و تفصیل کے کوئی فرق نہ رہیگا، اسی لیے فرمایا گیا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ آمِنُوا	اے وہ لوگو جن کو پہلے کتاب دی گئی ہے
بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُم مِّن	پہلے کہ ہم چہروں کو بگاڑ دیں، اور اُن کو
قَبْلِ أَن نَّطْمِسَ وُجُوهًا فَنَرُدَّهَا	پیٹھ کی طرف پھیر دیں یا سبت کے گنہگاروں
عَلَىٰ أَدْبَارِهَا أَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّا	پر جس طرح لعنت کی تھی، ہم اُن پر لعنت
أَصْحَابَ السَّبْتِ،	کریں اس وحی پر ایمان لاؤ، جو ہم نے اب
(نساء-۷)	اتاری، (قرآن) جو اُن تعلیمات کی جو تمھارے

مشرکینِ عرب سے زیادہ اہلِ کتاب کو اس حقیقت کے سمجھنے کا زیادہ استحقاق تھا اسلئے اُنھی کو سب سے پہلے اس کا منکر نہ ہونا چاہیئے،

وَآمِنُوا بِمَا أَنزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا	اور جو کتاب ہم نے اب اتاری جو تمھارے پاس الہامی کتب کو
مَعَكُمْ وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ	سچا بتاتی ہے اُس پر ایمان لاؤ اور تم ہی پہلے کافر نہ بنو

لیکن اُن کی حالت یہ ہوئی کہ

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ (بقرہ ۱۱)

اور جب اُن سے کہا گیا کہ خدا نے جو بھی اُتارا اُس پر ایمان لاؤ تو جواب دیا کہ جو ہم پر اُترا ہم اُس کو مانتے ہیں اور وہ اُس کے سوا کا انکار کرتے ہیں، حالانکہ یہی (قرآن) حق ہے اور جو اُن کے پاس ہے،

اس کے برخلاف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس دین کو پیش کیا اُسکی بنیاد تمام اگلی نبوتوں اور کتابوں کی صداقت کے تسلیم کرنے پر رکھی گئی یہی سبب ہے کہ اسلام نے مسلمان ہونے کیلئے صرف یہی ضروری نہیں قرار دیا کہ وہ تنہا محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لائے بلکہ یہ بھی قرار دیا کہ وہ تمام اگلی نبوتوں اور صحیفوں پر بھی ایمان لائے، چنانچہ خود قرآن کی شہادت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف اسی کی تکلیف نہ تھی کہ آپ کے ہموطن آپ کے صحیفہ کو نہیں مانتے تھے، بلکہ اس کی بھی تھی کہ وہ اگلے صحیفوں کو بھی نہیں مانتے تھے، سورہ سبا میں ہے،

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ (سبا ۴)

اور منکروں نے کہا کہ ہم اس قرآن پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے، اور نہ اس سے اگلی کتاب (یعنی تورات) پر،

اور اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریح کے ساتھ فرمایا کہ جو میری عبدیت اور رسالت کے ساتھ عیسیٰ بن مریم کو بھی خدا کا بندہ اور اس کا رسول اور کلمہ اور خدا کی طرف سے آئی ہوئی روح تسلیم کریگا وہ جنت میں جائیگا (بخاری کتاب الانبیاء ذکر عیسیٰ) الغرض وہ ازلی ابدی دین صرف ایک ہی

تھا، اور تمام انبیاء علیہم السلام اسی ایک پیغام کو لیکر دنیا میں آئے تھے، یہی وحدتِ دین کی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن نے اپنے ان الفاظ میں ادا کیا ہے،

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ	اے پیغمبرو! ستھری چیزیں کھاؤ اور بھلا کام کرو
وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ	میں تمہارے کاموں سے آگاہ ہوں اور بیشک
عَلِيْمٌ وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً	تم سب کی امت ایک امت ہے، اور میں تم
وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ فَتَقَطَّعُوْٓا	سب کا (ایک) پروردگار ہوں، تو مجھ سے
اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا	ڈرتے رہو، تو ان کے پیروؤں نے اپنے مذہب کو
لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (مومنون۔۴)	آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا ہر فرقہ اپنے پاس

اسی حقیقت کی مزید تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ان الفاظ میں فرمائی ہے،

اَلْاَنْبِيَآءُ اِخْوَةٌ لِّعَلَّاتٍ اُمَّهَاتُهُمْ	تمام انبیاء ایسے بھائی ہیں جن کا باپ ایک
شَتّٰى وَدِيْنُهُمْ وَاحِدٌ	ہے، اور مائیں مختلف ہیں اور ان کا
(بخاری کتاب الانبیاء۔ ذکر عیسیٰ)	"دین ایک ہے،

پچھلے دن اور پچھلی زندگی پر ایمان

وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (بقرہ ۱۷۷-۱۲۲)　　وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ (بقرہ ۴-۱)

اسلام کے سلسلہ ایمانیات کی آخری کڑی[1] ایک پچھلے دن اور پچھلی زندگی یا پچھلی دنیا پر یقین کرنا ہے، سورہ بقرہ کے پہلے ہی رکوع میں ہدایت یاب اور کامیاب انسانوں کے ایمانیات کی آخری دفعہ یہ بیان کی گئی ہے،

وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ (بقرہ ۴-۱)		اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں،
مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (توبہ ۲۰-۱۹)	(توبہ)	جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لایا،
الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ	(آخر)	جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے ہیں،

"اخرۃ" کے معنی معنی پچھلی کے ہیں اور یہ لفظ صفت ہی عربی میں اوصاف کو موصوف کا قائم مقام کرکے اکثر موصوف کو حذف کر دیتے ہیں، مثلاً "دنیا" کے لفظی معنی "قریب ترین" کے ہیں اور یہ صفت ہے، اس کا موصوف الحیاۃ (زندگی) یا الدار (گھر) ہے، اس لیے الدنیا کا مفہوم الحیاۃ الدنیا (قریب ترین زندگی، یعنی اس عالم کی موجودہ زندگی) یا الدار الدنیا

---

[1] قرآن پاک میں جہاں جہاں ایمان کی تفصیلات ذکر کئے گئے ہیں، وہاں یوم آخر پر ایمان سب سے آخر میں بیان کیا گیا ہے،

(قریب ترین گھر یعنی موجودہ عالم) ہے اسی طرح الآخرۃ اور الآخرۃ کا مفہوم الیوم الآخر

والحیوۃ الآخرۃ والدار الآخرۃ (پچھلا دن اور پچھلی زندگی اور پچھلا آنے والا گھر ہے) یعنی

موجودہ زندگی کے بعد آنے والی دوسری دنیا کی زندگی اور گھر اور قرآن پاک میں یہ لفظ انہی معنوں

میں ایک سو تیرہ مقام پر آیا ہے، اور ہر جگہ اس کا مخدوف موصوف حیاۃ (زندگی) یا دار (گھر) ہے،

چنانچہ حسب ذیل آیتوں کے پڑھنے سے یہ حقیقت منکشف ہوگی،

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (عنکبوت۔۷) اور بیشک آخری گھر اصلی زندگی ہے،

وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ (انعام۔۱۹) اور بیشک آخری گھر بہتر ہے،

ان دونوں آیتوں میں دار یعنی گھر کا لفظ موجود ہے،

اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ (توبہ۔۷) کیا پچھلی زندگی کو چھوڑ کر اس موجودہ زندگی پر تم راضی ہو گئے،

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (مومنون۔۳) جنھوں نے انکار کیا اور پچھلی (زندگی) کی ملاقات کو جھٹلایا، اور ہم نے موجودہ زندگی میں ان کو نعمت دی،

ان آیتوں میں الحیاۃ الدنیا یعنی موجودہ دنیا کے تقابل سے ظاہر ہے کہ الآخرۃ سے مراد الحیاۃ الآخرۃ یعنی پچھلی زندگی ہے[1]، اور اس لفظ کے عموم میں وہ تمام منازل و مقامات داخل ہیں جو ابتدائے موت سے لیکر حشر و نشر اور اس کے بعد پیش آتے ہیں یا آئیں گے، چنانچہ احادیث صحیحہ

[1] دنیا اور آخرت کا یہ تقابل قرآن پاک کی بیشمار آیتوں میں مذکور ہے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے (بقیہ حاشیہ ص ۶۳۴ پر)

سے ثابت ہے کہ اس آیت میں:۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ (ابراهيم-۴)	جو ایمان لائے اُن کو اللہ حیات دنیا میں اور آخرت میں اسکی پکی بات (کلمۂ توحید) پر مضبوط رکھے گا،

اس آیت میں "آخرت" سے مراد "عالم برزخ" ہے اور قرائن بھی اسی پر دلالت کرتے ہیں کہ قیامت میں قولِ ثابت پر قائم رہنا کونسی بڑی بات ہوگی، جب کہ ہر چیز اُس وقت واضح اور نمایاں ہوگی، اس لئے اس آیت میں "آخرۃ" سے مراد عالم برزخ کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا، ایک اور

بقیہ حاشیہ (وَجِيْهًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (آل عمران-۵) دنیا اور آخرت میں معزز،

ص ۶۲۳ سلسلۂ دعا میں ہے،

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِى الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (البقرہ-۲۵)	پروردگار ہمکو دنیا میں نیکی اور آخرت میں نیکی دے،

کفار کے بطلانِ عمل کے ذکر میں ہے،

حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ	(بقرہ-۲۷) اُن کے عمل دنیا اور آخرت میں گر گئے،
اِسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ،	(نحل-۱۰۷) انھوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی
نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ (حم السجدہ-۳۰)	ہم ہیں تمھارے قریب کی زندگی اور پچھلی زندگی کے دوست،

اور کبھی دنیا کے بجائے "اولیٰ" (پہلی زندگی) کا لفظ اختیار کیا گیا ہے، فرمایا:

فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى (نازعات-۲۵)	تو خدا نے اسکو پچھلی زندگی اور پہلی زندگی کی سزا بنایا،
وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى (لیل-۱۳)	اور ہمارے ہی لیے ہے پچھلی اور پہلی زندگی

حدیث میں تصریحاً بیان ہے کہ قبر (یعنی برزخ) آخرت کی منزلوں میں سے سب سے پہلی منزل ہے[1]

یوم آخر اور حیاتِ آخرت پر ایمان، اسلام کی نہایت اہم تعلیم ہے، اور قرآنِ پاک میں ایمان باللہ کے بعد اسی کی اہمیت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے، کیونکہ موجودہ دنیا کے تمام اعمال اور ان کے نتائج کی اصلی اور دائمی بنیاد اسی آیندہ دنیا کے گھر کی بنیاد پر قائم ہے، اگر یہ بنیاد متزلزل ہو جائے تو اعمال انسانی کے نتائج کا ریشہ ریشہ بیخ و بن سے اکھڑ جائے، اسی لیے تمام مذاہب نے کسی نہ کسی رنگ اور کسی نہ کسی اصطلاح میں دوسری زندگی کو متفقاً تسلیم کیا ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس آیندہ زندگی کو دو دوروں میں تقسیم کیا ہے، ایک موت سے لیکر قیامت تک اور دوسرا قیامت سے لیکر ابد (ہمیشہ) تک جس میں پھر موت و فنا نہیں، پہلے دور کا نام "برزخ" اور دوسرے کا نام "بعث" یا حشر و نشر اور قیامت ہے، اور ان سب کے معنی جی اٹھنے، اکھٹے کیے جانے اور کھڑے ہونے کے ہیں، لیکن ان سب سے مقصود ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور وہ موجودہ دنیا کے خاتمہ کے بعد دوسری دنیا کی زندگی ہے، اور اسی لیے اس دوسری زندگی یا اس کے عالم کا نام قرآن میں اَلدَّارُ الْاٰخِرَۃُ اور عُقْبَی الدَّار وغیرہ ہے، جس کے معنی دوسرے یا پچھلے گھر کے ہیں،

توراۃ و انجیل میں برزخ و قیامت کی تفصیل نیز یہ کہ مرنے کے بعد اور قیامت سے پہلے انسان کی روح کس حالت اور کیفیت میں رہے گی، مذکور نہیں ہے، لیکن اسلام میں یہاں بھی گنجلک اور ابہام نہیں، بلکہ اس نے اس کی پوری تفصیل کی ہے اور بتایا ہے کہ موجودہ عالم کے علاوہ

---

[1] ابن ماجہ و حاکم بحوالہ کنز العمال جلد ۶ ص ۹۵ - حیدرآباد دکن (ترمذی)

عالمِ برزخ اور میدانِ قیامت ہمارے سزا و جزا کے دو مقام ہیں، شخصی موت کے بعد ہر شخص عالمِ برزخ میں داخل ہو جاتا ہے اور وہاں اُس کے معاملات شروع ہو جاتے ہیں، پھر اپنے مقررہ وقت پر جس کو خدا نے اپنی مصلحتوں اور حکمتوں کے لحاظ سے طے کر لیا ہے، سلسلۂ خلق کے خاتمہ پر جب موجودہ دنیا پر عام موت اور فنا طاری ہوگی، دوسری زندگی کی دنیا شروع ہو جائے گی جو تمام تر ہماری پہلی دنیا میں ہمارے اچھے یا بُرے اعمال کا سراپا عکس، اور ظل ہوگی، چنانچہ سورۂ توبہ کی حسب ذیل آیت میں ہمارے ان تینوں دور ہائے حیات کا ذکر ہے،

سَنُعَذِّبُهُمْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّونَ — ہم اُن کو دو مرتبہ عذاب دیں گے، پھر وہ
إِلَىٰ عَذَابٍ عَظِيمٍ (توبہ-۱۳) — ایک بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے

عذاب کی یہ تین منزلیں دنیا[۱]، برزخ[۲]، اور قیامت[۳] ہیں،

ان تینوں عالموں میں جو فرق ہے، وہ یہ ہے کہ اس موجودہ دنیا میں جسم (مادہ) نمایاں اور روح پوشیدہ ہے، اور روح کو جو کچھ مسرت و تکلیف یہاں پہنچتی ہے، وہ صرف اس مادی جسم کے واسطے سے پہنچتی ہے، ورنہ درحقیقت اسکی براہ راست راحت و لذت کا اس مادی دنیا میں کوئی امکان نہیں، دوسرے عالم میں جس کو برزخ کہا گیا ہے، روح نمایاں ہوگی اور جسم چھپ جائیگا وہاں جو راحت و تکلیف پہنچے گی، وہ دراصل روح کو پہنچے گی اور جسم اسکی تبعیت میں ضمناً اُس سے متاثر ہوگا، لیکن اس تیسرے عالم میں جہاں سے حقیقی اور غیر فانی زندگی شروع ہوتی ہے، روح اور جسم دونوں نمایاں ہوں گے اور دونوں کی لذت و تکلیف کے مظاہر بالکل الگ الگ ہوں گے،

برزخ

"برزخ" کا لفظ قرآنِ پاک میں تین جگہ استعمال ہوا ہے، اور ہر جگہ اس سے دو چیزوں کے درمیان کا پردہ، حاجب اور حائل مراد ہے، چنانچہ سورۂ رحمٰن میں دو دریاؤں کا ذکر ہے جنمیں ایک میٹھا اور دوسرا کھاری ہے اور اُن کے بیچ میں ایک پردہ حائل ہے، جو ان کو آپس میں ملنے نہیں دیتا،

بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ،	ان دونوں کے بیچ میں ایک پردہ ہے جس سے
(رحمان-۱)	ایک دوسرے پر بڑھ کر نہیں جاتا،

اسی عجیب و غریب بحری منظر کا ذکر سورہ فرقان میں ہے اور وہاں بھی یہی لفظ واقع ہے

وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَٰذَا	اور اُسی نے دو دریاؤں کو ملا کے چلایا
عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهَٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ	اور یہ میٹھا اور پیاس بجھاتا ہے اور وہ کھاری
وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا	کر دیا ہے اور اُن کے بیچ میں ایک پردہ
مَّحْجُورًا (فرقان-۸)	اور روکی ہوئی اوٹ بنائی ہے،

اسی بنا پر موجودہ زندگی اور آئندہ زندگی کے درمیان جو مقام حائل اور حاجب ہے اسکا نام برزخ ہے، سورہ مومنوں میں نزع کے وقت کے بیان میں ہے کہ

وَمِن وَرَائِهِم بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ	اور ان مرنے والوں کے پیچھے ایک پردہ ہے

يُبْعَثُونَ، (مومنون-۷) اُس دن تک جبکہ وہ (قیامت میں) اٹھائے جائیں گے

عربوں بلکہ کل سامی قوموں کے رسم و رواج اور مشاہدات کی بنا پر اسی درمیانی منزل (برزخ) کا نام "قبر" ہے، خواہ وہ خاک کے اندر ہو، یا قعرِ دریا میں یا کسی درندہ یا پرند کے پیٹ میں، اسی لیے فرمایا،

وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ (حج-۱) بے شبہ اللہ انکو جو قبروں میں ہیں اٹھائیگا

اب ظاہر ہے کہ "یبعث" صرف انہی مردوں کے لیے مخصوص نہیں جو تودۂ خاک کے اندر دفن ہوں بلکہ ہر میت کے لیے ہی، خواہ وہ کسی حالت اور کسی عالم میں ہو، اسی لیے قبر سے مقصود ہر وہ مقام ہے، جہاں مرنے کے بعد جسم خاکی نے جگہ حاصل کی،

موت وحیات کی منزلیں

قرآن پاک میں دو موتوں اور دو حیاتوں کا ذکر ہے، ایک جگہ دونوں کی زبان سے کہا گیا ہے،

رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ ہمارے پروردگار تو نے ہمکو دو دفعہ مارا

فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ اور دو دفعہ جلایا، ہم نے اپنے گناہوں کا

مِّنْ سَبِيْلٍ، (مومن-۲) اقرار کیا، پھر کیا نکلنے کی کوئی راہ ہے،

ان دو موتوں اور دو حیاتوں کی تفصیل خود اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ میں فرمائی ہے،

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا کیسے تم اللہ کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم پہلے

فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ مردہ تھے پھر تمکو اس نے زندہ کیا (انسان بنا کر

ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (بقرہ-۳) پیدا کیا) پھر تمکو مار دیگا، پھر تمکو جلائیگا،

پہلی موت تو ہر انسان کی خلقت سے پہلے کی ہے، جب وہ مادہ یا عنصر کی صورت میں تھا، پھر زندہ ہوکر اس دنیا میں پیدا ہوا، یہ اسکی پہلی زندگی ہے، پھر موت آئی، روح نے مفارقت کی اور جسم اپنی اگلی مادی صورت میں منتقل ہوگیا، یہ دوسری موت ہوئی، پھر خدا اس کی روح کو جسم سے ملا کر زندہ کریگا، یہ اس کی دوسری زندگی ہوئی، جس کے بعد پھر موت نہیں قرآن پاک میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے فرمایا گیا،

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ، ثُمَّ	بیشک تو بھی مرنے والا ہے اور وہ بھی مرنے
اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ	والے ہیں، پھر تم قیامت کے دن اپنے پروردگار
تَخْتَصِمُوْنَ، (زمر-۳)	کے سامنے دعویٰ پیش کروگے،
ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ثُمَّ	پھر تم اس کے بعد مرجانیوالے ہو، پھر تم قیامت
اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ (مومنون)	کے دن اٹھائے جاؤگے،

اب سوال یہ ہے کہ برزخ کے عالم میں کیا کیفیت ہوگی، اس کے سمجھنے کے لئے ایک مختصر سی تمہید کی ضرورت ہے،

نیند اور موت کی مشابہت اللہ تعالیٰ نے اس مادی دنیا میں روحانی عالم کی باتوں کے سمجھنے کے لیے اپنی عجیب و غریب قدرت سے ہمکو ایک چیز عنایت کی ہے، جس کو ہم نیند کہتے ہیں، روح کو اپنے جسم سے دو قسم کا تعلق ہے، ایک ادراک و احساس کا، اور دوسرے تدبیر و تغذیہ کا، نیند وہ عالم ہے جس میں ہمارے تمام آلاتِ ادراک و احساس اس دنیا سے بے خبر ہوکر اپنے گرد و پیش کی مادی دنیا سے یکسر بیگانہ بن جاتے ہیں تاہم ہمارے نفس یا روح کا تعلق ہمارے جسم سے باقی رہتا ہے اور

وہ اس حالت میں بھی جسم کی مادی زندگی، نشوونما اور بقا کی تدبیروں اور دل و دماغ اور دیگر اعضائے رئیسہ کے غذا رسانی اور خون کے دوران میں مصروف رہتی ہے، اسی کا نام روح کا جسم سے تدبیری تعلق ہے، اب نیند اور موت میں فرق ہے، تو یہ ہے کہ نیند کی حالت میں جسم سے نفس کا تدبیری تعلق قائم رہتا ہے، اس لئے جسم باقی اور زندہ رہتا ہے لیکن موت کی حالت میں جسم کا روح سے تدبیری تعلق بھی اکثر منقطع ہو جاتا ہے، اس لیے جسم کے اجزاء کچھ دنوں میں منتشر ہو جاتے ہیں، موت اور نیند کی یہی مشابہت ہے جس کی بنا پر تمام انسانوں کی زبانوں میں موت کو نیند سے تشبیہ دیتے ہیں، اور دنیا بھر کی زبانوں کا یہ توافق الہام طبعی کی خبر دیتا ہے، قرآن پاک میں ہی حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے،

وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُمْ بِاللَّيْلِ وَ — اور وہی ہے، جو تمکو رات میں مارتا ہے اور

يَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ — جانتا ہے جو تم نے دن میں کمایا، پھر تم کو دن

فِيهِ لِيُقْضَىٰ أَجَلٌ مُسَمًّى (انعام - ۷) — میں جلاتا ہے، تاکہ مقررہ وقت پورا کیا جائے

اس سے زیادہ تفصیل سورۂ زمر میں ہے،

اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا — وہ اللہ ہی ہے جو روحوں کو انکی موت کے وقت

وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ — وفات دیتا ہے اور جو نہیں مری ہیں انکو انکی نیند میں

الَّتِي قَضَىٰ عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ — دیتا ہے، تو جس پر موت کا حکم اس نے جاری کیا اسکو

الْأُخْرَىٰ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى ۚ إِنَّ فِي — روک لیتا ہے اور دوسری روح کو جس پر موت کا

ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ (زمر - ۵) — حکم نہیں یعنی نیند والی کو ایک مدت معینہ کیلئے

یہی وجہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی نے "برزخ" کی زندگی کو نیند کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، قرآنِ پاک میں ہے کہ قیامت میں جب لوگ دوسری زندگی پاکر قبروں سے اٹھیں گے تو گنہگاروں کی زبانوں پر یہ فقرہ ہوگا،

یٰوَیْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا	اے ہماری خرابی کس نے ہم کو ہماری نیند
(یٰسین-۴)	کی جگہ سے اٹھا دیا،

غزوۂ اُحد کے موقع پر ہے کہ جن کو مرنا تھا، اُن کی موت ٹل نہیں سکتی تھی، اگر وہ میدان جنگ کے بجائے گھروں میں بھی ہوتے تو نکل نکل کر اپنے مقتل میں خود آجاتے، اس مفہوم کو قرآن نے یوں ادا کیا ہے،

قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ	کہدے کہ اگر وہ گھروں میں بھی ہوتے
الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ	تو جن کیلئے مارا جانا لکھا گیا تھا، وہ خود
اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ، (آل عمران ۱۶)	نکل کر اپنی سونے کی جگہوں میں چلے آتے

اسی لیے قرآنِ پاک میں دوسری زندگی کے لیے اکثر "بعث" لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی جگانے اور بیدار کرنے کے بھی ہیں[1]، جیسا کہ اوپر کی اس آیت میں ہے،

وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ	اور وہی ہے جو تم کو رات میں موت دیتا ہے،

---

[1] صحیح بخاری (باب تہجد) میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے نماز تہجد کے لیے اس وقت تک بیدار نہ ہونے پر سوال فرمایا، تو حضرت ممدوح نے ان لفظوں میں معذرت پیش کی یا رسول اللہ انفسنا بید اللہ فاذا شاء ان یبعثنا بعثنا (ہماری روحیں خدا کے ہاتھ میں ہیں، وہ جب جگانا چاہتا ہے جگاتا ہے) اس حدیث میں بھی بعث جگانے کے معنوں میں آیا ہے۔

وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ	اور دن کو جو تم کرتے ہو اس کو جانتا ہی پھر
يَبْعَثُكُمْ فِيهِ (انعام-۱)	تم کو دن میں جگاتا ہی،
وَأَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُورِ،	اور بیشک اللہ ان کو جو قبروں میں ہین.
(حج-۱)	جگائے گا،

احادیث میں ہے کہ قبر میں سوال وجواب کے بعد نکوکاروں سے کہا جاتا ہے کہ نَمْ كَنَوْمَةِ الْعَرُوسِ دلہن کی نیند سو جاؤ جس کو دنیا جگاتا ہے، جو اس کو سب سے زیادہ محبوب ہی، یہاں تک کہ خدا اس کو اس خواب سے اٹھائے گا[1]

ان شواہد سے ظاہر ہے کہ برزخ کی زندگی جس مین روح، جسم سے الگ ہوتی ہے، روح کی ایک طویل وعمیق نیند کے مشابہ ہے،

خواب میں لذت والم

انسان جب سوتا ہے تو اس کے ادراک واحساس کے آلات اپنی مادی دنیا سے عارضی طور پر بے خبر ہو جاتے ہیں، مگر اس کے ادراک احساس کی تخیلی، تمثالی، یا ذہنی دنیا اس کے سامنے بالکل اسی مادی دنیا کی طرح متشکل ہو جاتی ہے، اس میں وہ خود اپنے جسم سے الگ مگر ہو بہو وہی جسم دیکھتا ہے، جو آتا جاتا، چلتا پھرتا، اور دیکھتا سنتا سب کچھ ہے، اس کے سامنے کھانے پینے اور لطف انگیزی کے سب سامان ہوتے ہیں، نیز اس میں درد ورنج اور تکلیف کی تمام وہی صورتیں ہوتی ہیں، جو مادی دنیا میں ہیں، اس کے خیالی جسم کو اگر اس عالم میں تکلیف ہوتی ہی تو وہ خود چیخ اٹھتا ہے،

---

[1] جامع ترمذی کتاب الجنائز باب عذاب القبر ص ۱۸ حدیث حسن غریب [2] شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں فھذا المبتلی فی الدنیا غیر ذاق ولا یقظۃ مع انہ الی یوم القیمۃ (باب اختلاف احوال الناس فی البرزخ) یعنی یہ عذاب قبر کا گرفتار خواب میں ہی، لیکن یہ کہ یہ ایسا خواب ہی جس سے قیامت تک جاگتا نہیں ہی،

اور اگر اس میں لذت ملتی ہے، تو لطف اندوز ہونے والے مادہ ان دونوں کے اثرات اُس کو اپنے مادی جسم میں جاگنے کے بعد بھی نظر آتے ہیں، غرض عالم خواب کی خیالی دنیا اور اسکی شادی و رنج اور لذت و الم، اور اس مادی دنیا کے جسمانی و مادی شادی و رنج، اور لذت و الم میں کوئی فرق نہیں ہوتا، اگر کچھ فرق ہے تو یہ ہے کہ عالم خواب کی لذت و تکلیف و بیداری کے بعد ختم ہو جاتی ہے اور مادی دنیا کی لذت و تکلیف، احساس و ادراک کے وجود تک قائم رہتی ہے اور جسطرح مادی بیداری والی لذت و تکلیف خواب میں معدوم ہو جاتی ہے، اسی طرح خواب والی لذت و تکلیف بیداری میں رخصت ہو جاتی ہے،

خواب والے لذائذ و آلام کے مختلف مناظر اور اُن کے حقایق اور اسباب و علل پر اگر فلسفیانہ حیثیت سے غور کیا جائے، تو عجیب و غریب معاملات سامنے آتے ہیں، کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام احساسات و معلومات جو کبھی بھی ذہن انسانی میں آئے ہوں، اور ان کو بحالت بیداری مادی دنیا کے مشاغل اور زمانہ کے امتداد کے سبب سے انسان کتنا ہی فراموش کر چکا ہو، وہ خواب میں مادی گران باری سے آزادی کے بعد سامنے مجسم شکلوں میں نمودار ہو جاتے ہیں، اور بیچ کی کڑیوں کے بھول جانے کی وجہ سے وہ اس کو بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ انسان جن چیزوں کو بھول جاتا ہے، وہ اُس کے حافظہ سے حقیقت میں معدوم نہیں ہو جاتیں، بلکہ دماغی حجرہ (ذہن) کے منتشر اسباب کے ذخیرہ (معلومات) میں چھپ کر گم ہو جاتی ہیں، اور پھر بعد کو مل جاتی ہیں، اس لیے وہ تمام اچھے اور بُرے اعمال جو انسان نے عمر بھر کئے ہیں، خواہ وہ اُن کو آج بھول گیا ہو، مگر اُن کی یاد ذہن کے گوشوں میں پڑی ہے، معدوم و مفقود نہیں ہو گئی

خواب کی عجیب و غریب صورت وہ ہے جس کو تمثیلی کہتے ہیں، جیسے حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے فرزند کے خدمتِ کعبہ پر وقف کرنے کو قربانی کی شکل میں، اور حضرت یوسفؑ نے والدین کو سورج اور چاند اور گیارہ بھائیوں کو گیارہ ستارون کی صورت میں دیکھا، شاہِ مصر کے سونی پانے والے مصاحب نے اپنے سونی پانے کو اس رنگ میں دیکھا کہ اُس کے سر پر خوان ہے، اور ٹرے ٹرے پرندے اس میں چونچ مار مار کر کھاتے ہیں، شاہ مصر نے مصر کی ہفت سالہ قحط سالی کو سات دبلی گایوں کی صورت میں دیکھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کو اس شکل میں دیکھا کہ مسلمان سر منڈوائے اور بال ترشوائے حج کر رہے ہیں، مسیلمہ اور اسود عنسی دو کذابوں کو سونے کے دو کنگنوں کی صورت میں دیکھا، شہدائے اُحد کو موٹی گائے کی صورت میں ملاحظہ کیا، مدینہ کی وبا ایک پریشاں مو کالی عورت کی صورت میں نظر آئی، خلافت کو ڈول کھینچنے کی اور حضرت عمرؓ کے علم کو دودھ کی اور انکی دینداری کو لمبی قمیص کی شکل میں دیکھا، ان کے علاوہ ہر شخص کے ذاتی تجربوں سے بھی اسکی بیشمار مثالیں فراہم کیجا سکتی ہیں،

اس سے بڑھکر یہ کہ انسان کے جسم میں اگر کسی قسم کا مادہ بڑھ جاتا ہے، تو خواب میں اس کے مناسب مجسم شکلیں نظر آتی ہیں، مثلاً اگر بلغم کی زیادتی ہو تو پانی، دریا اور سمندر نظر آئیں گے، اگر سودا بڑھ جائے، تو ہاتھی اور کالی کالی صورتیں نظر آئیں گی، اسی طرح دوسرے تغیراتِ خلطی بھی اپنے مناسب جسمانی ہیئت میں خواب میں مجسم اور متشکل ہو کر دکھائی دیتے ہیں،

۱؎ یہ کل تمثیلی خواب قرآن پاک میں مذکور ہیں، ۲؎ ان خوابوں کو صحیح بخاری کتاب التعبیر میں دیکھو ۳؎ حجۃ اللہ البالغہ شاہ ولی اللہؒ ذکر برح،

اسی طرح اعمال جو جسم و مادہ سے بالکل الگ ہیں خواب میں اپنے مناسب قالب میں مجسم ہو جاتے ہیں، اگر کسی بھائی کا حق و اجب کسی نے ادا نہیں کیا تو خواب میں اس کو نظر آئے گا کہ وہ اس کا گلا کاٹ رہا ہے، اگر کسی کی غیبت کی ہے، تو معلوم ہوگا کہ وہ مردار کھا رہا ہے، سونے چاندی کے خزانوں کو جمع کر کے اگر بخل کا اژدہا ان کی حفاظت میں بٹھایا ہے، تو سانپ بن کر وہ اس کی گردن میں لپٹتا اور کاٹتا ہے، ذلت اور خواری کتے کی، حماقت گدھے کی، اور شجاعت شیر کی شکل میں نمودار ہوتی ہے، شب معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فطرت دودھ کی اور غیر فطرت شراب کی شکل میں پیش ہوئی، اسی طرح کہن سال دنیا ایک بڑھیا کی شکل میں نظر آئی،

اسی قسم کی تمثیلات قرآن مجید میں بھی آئی ہیں، مثلاً غیبت کی نسبت فرمایا،

وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ	اور پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو برا نہ کہو کیا تم
اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ	میں سے کوئی پسند کر سکتا ہے کہ وہ اپنے مردہ
مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ (حجرات ۲)	بھائی کی بوٹی نوچ نوچ کر کھائے سو گھن آئی تم کو

سود کھانے کو جنون اور پاگل پن کی شکل میں ظاہر کیا،

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ	جو لوگ سود کھاتے ہیں، وہ نہیں اٹھیں گے
اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ	(یا نہیں اٹھتے) لیکن جیسے وہ اٹھتا ہے جس کے
الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ (بقرہ ۳۸)	حواس شیطان نے چھو کر کھو دیئے ہوں

یتیموں کا مال ناجائز طریق سے کھانے کو پیٹ میں آگ بھرنا فرمایا،

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى	وہ لوگ جو یتیموں کا مال ظلم کر کے کھاتے ہیں

ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ — وہ اپنے پیٹوں میں آگ کھاتے ہیں اور
نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا (نساء) — جہنم کی آگ میں داخل ہوں گے،

وہ خود غرض لوگ جو بیکسوں کے کام نہیں آتے، قیامت میں ان کے بھی کوئی کام نہ آئیگا اور جو خود سیر ہو کر کھاتے ہیں، اور غریبوں کے دردِ گرسنگی سے بے خبر رہکر اپنے مال کا میل کچیل (زکوٰۃ) بھی اُن کے کھانے کو نہیں دیتے، دوزخ میں اُن کو زخموں کا دھوون کھانے کو ملیگا. فرمایا،

اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ — بیشک وہ خدائے بزرگ پر ایمان نہیں
وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ — رکھتا تھا اور مسکین کے کھانے پر آمادہ نہیں کرتا
فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ وَّ — تھا تو آج اس کا بھی یہاں کوئی دوست نہیں
لَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ لَّا يَاْكُلُهٗ — اور نہ زخموں کے دھوون کے سوا کوئی کھانا ہے
اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ، (حاقہ ۱) — اس کو وہی گنہگار کھائیں گے،

بے لوث مخلصانہ فیاضی کی تمثیل سرسبز و شاداب باغ سے دی،

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ — اور ان کی مثال جو اپنی دولت خدا کی
ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا — خوشنودی چاہنے اور اپنے دلوں کی مضبوطی
مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ — کے لیے خرچ کرتے ہیں، ایک باغ کی ہے جو
بِرَبْوَةٍ، (بقرہ ۳۶-۸) — ایک ٹیلہ پر ہے،

خدا کی راہ میں جان دینے والوں اور مرنے والوں کو جانِ نو، اور حیاتِ جاودان کی خوشخبری دی گئی، فرمایا،

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ	جو خدا کی راہ میں مارا جائے، اس کو مردہ
اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَآءٌ (بقرہ ۱۵)	نہ کہو، وہ لوگ زندہ ہیں،

اسی طرح یہ ہے کہ جو خدا کو قرض دیگا، خدا اس کو بڑھا کر دے گا، جو دوسروں کو معاف کریگا خدا اس کو معاف کریگا، جو دوسرون کی عیب پوشی کریگا خدا اس کی ستاری کریگا، قرآن و احادیث اس قسم کی بالمعاوضہ جزا و سزا کے ذکر سے لبریز ہیں،

جو لوگ راہِ خدا میں اپنا مال نہیں دیتے، ان کی نسبت فرمایا،

سَیُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ یَوْمَ	جس مال کا بخل کیا تھا قیامت میں اسکا
الْقِیٰمَةِ (آل عمران ۱۸۰)	ان کے گلے میں طوق پڑے گا
یَوْمَ یُحْمٰی عَلَیْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰی	جس دن اس سونے اور چاندی کو دوزخ
بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ	کی آگ میں گرم کیا جائیگا پھر اس سے ان کی
هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا	پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائینگی
مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ،	کہ یہ ہے جو تم نے اپنے لیے گاڑ رکھا تھا، تو اب
(توبۃ ۵)	تم اس کا مزہ چکھو جس کو تم گاڑ کر رکھتے تھے،

دنیا میں اللہ کے نورِ بصیرت سے روگردانی آخرت میں ظاہری نابینائی کی صورت میں رونما ہوگی، اور اسی طرح جو خدا کو یہاں بھولیگا، خدا اس کو وہاں بھلائے گا چنانچہ حضرت آدمؑ سے جنت سے نکلتے وقت یہ فرمایا گیا تھا،

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ	اور جس نے میری یاد سے روگردانی کی تو اس کیلئے

مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ — ہے تنگ گذران، اور ہم قیامت کے دن اسکو

أَعْمٰى، قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْ أَعْمٰى — اندھا اٹھائیں گے وہ کہیگا میرے پروردگار

وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا قَالَ كَذٰلِكَ — تونے مجھے اندھا بنا کر کیوں اٹھایا میں تو دیکھتا

أَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ — میں آنکھوں والا تھا، خدا کہے گا اسی طرح

الْيَوْمَ تُنْسٰى، — تیرے پاس ہماری نشانیاں آئی تھیں، تو

(طٰہٰ - ۷) — انکو تونے بھلا دیا اور اسی طرح آج تو بھلایا جائیگا

یہی مفہوم اور زیادہ اختصار کے ساتھ اس آیت میں ہے،

وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ أَعْمٰى فَهُوَ فِي — جو کوئی دنیا میں (دل کا) اندھا تھا، وہ

الْاٰخِرَةِ أَعْمٰى وَأَضَلُّ سَبِيْلًا (بنی اسرائیل) — آخرت میں اندھا ہوگا اور راستہ سے بہت بھٹکا ہوا

اس باب میں سب سے زیادہ صریح وہ حدیث صحیح ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بخیل کا مال سانپ کی صورت میں گلے کا ہار ہو کر نظر آئے گا، یعنی وہ مال سونے اور چاندی کے سانپ کی صورت میں ہوگا،

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کو اللہ

اٰتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَلَمْ يُؤَدِّ زَكَاتَهٗ — نے مال دیا اور اس نے اسکی زکوٰۃ ادا نہیں کی تو

مُثِّلَ لَهٗ مَالُهٗ شُجَاعًا أَقْرَعَ لَهٗ — مال اسکو اچھل کر ڈسنے والے سانپ کی صورت

زَبِيْبَتَانِ يُطَوَّقُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ — میں دکھایا جائیگا جس کا سر زہر کی شدت سے

يَأْخُذُ بِلِهْزِمَتَيْهِ يَعْنِيْ شِدْقَيْهِ يَقُوْلُ أَنَا — گنجا ہوگا، اس کے منہ میں دو دانت ہوں گے،

مالك انا كنزك، وہ اس کے گلے میں قیامت کے دن پڑا

(بخاری تفسیر آل عمران ج ۲ ہوگا، اور وہ اس کے دونوں جبڑوں کو کاٹیگا،

ص ۵۵) اور کہیگا میں ہون تیرا مال ہیں ہوں تیرا خزانہ،

اسی طرح وہ حدیثین ہیں، جن میں مختلف اعمال کا مختلف شکلون میں آنا بیان کیا گیا ہے،
مثلاً یہ کہ مرنے کے بعد قبر میں نماز و روزہ وغیرہ اعمال، عذاب سے بچنے کے لیے ڈھال بن کر دائیں بائیں سے نمودار ہون گے، یہ بھی حدیث مین ہے کہ مرنے کے بعد جب ایک دفعہ فرشتہ الٰہی مردہ کو بیدار کرتا ہے، تو اس کو آفتاب ڈوبتا ہوا دکھایا جاتا ہے، (مثلت الشمس عند غروبها) نیک مرد مسلمان اس تنگ وقت کو دیکھکر نماز کی تیاری کرنا چاہتا ہے، یہ ظاہر ہے کہ یہ دنیا والا آفتاب وہان نہین بلکہ اسکی تمثیل ہوتی ہے، جیساکہ حدیث کے الفاظ میں ہے، یعنی یہ کہ اس مردہ کو ایسا نظر آتا ہے، اور وہ درحقیقت آفتاب نہیں بلکہ آفتاب کی مثالی صورت ہوتی ہے،

گناہون کی تمثیلی سزائین

اوپر کے بیانات سے ہویدا ہے کہ غیر مجسم اعمال اور معانی اپنے جن تمثیلی پیکرون میں نظر آتے ہیں، وہ درحقیقت اُن اعمال و معانی سے تمثیلی مشابہت رکھتے ہیں، مثلاً ایک صحیح حدیث میں ہے کہ مشہور صحابی حضرت عثمان بن مظعونؓ کی وفات کے بعد ایک صحابی نے خواب میں دیکھا کہ اُن کے لیے ایک نہر بہ رہی ہے، اور جب اُس کا ذکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا، تو آپ نے اُس کی تعبیر میں فرمایا،

ذلك عمله (بخاری کتاب التعبیر) یہ نہر ان کا (نیک) عمل ہے،

لہ ابن حنبل ۲ سنن ابن ماجہ ذکر البقر ص ۳۶۲،

اس تمہید کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس رویائے صادقہ پر غور کرو، جو ظاہر ہے کہ قیامت کا نہیں کہ ابھی وہ آئی نہیں، بلکہ برزخ ہی کا مرقع پیش کرتا ہے، جو اب بھی قائم ہے، آپ نے ایک صبح کو فرمایا کہ رات میں نے دیکھا کہ دو آنے والے آئے اور انھوں نے مجھے جگا دیا میں ان کے ساتھ چل کھڑا ہوا، تو میں نے دیکھا کہ ایک آدمی لیٹا ہے اور دوسرا اس کے سر پر ایک بڑا پتھر لیے کھڑا ہے، اور وہ اس پتھر کو اس کے سر پر اس طرح دے مارتا ہے کہ اس کا سر چکنا چور ہو جاتا ہے، اور پتھر لڑھکنے لگتا ہے، وہ اس کے پیچھے جا کر اس کو اٹھا لاتا ہے اور اتنی دیر میں اس کا سر درست ہو جاتا ہے اور پھر وہ مارتا ہے اور پھر وہی صورت پیش آتی ہے، ہم آگے بڑھے تو دیکھا کہ (۲) ایک شخص اوندھا پڑا ہے، اور دوسرا لوہے کا ایک آنکس لئے کھڑا ہے اور وہ اس سے اس کے جبڑے کو، پھر نتھنے کو اور پھر آنکھوں کو گدی تک چیر ڈالتا ہے، پہلے ایک طرف بعد ازیں دوسری طرف پھر آگے بڑھے تو دیکھا کہ (۳) تنور کی قسم کی ایک چیز دہک رہی ہے، اور کچھ مرد اور عورت اس میں ننگے پڑے ہیں، اور اس کے شعلے بھڑک بھڑک کر ان تک پہنچتے ہیں، اور وہ چیختے ہیں آگے بڑھے تو نظر آیا کہ (۴) ایک خون کی جیسی سرخ نہر بہ رہی ہے اور ایک آدمی اس میں تیر رہا ہے، نہر کے کنارے ایک آدمی کھڑا ہے جس کے پاس بہت سے پتھر رکھے ہیں، وہ تیرنے والا آدمی تیر کر جب اس شخص کے قریب آتا ہے تو یہ ایک پتھر اٹھا کر اس زور سے مارتا ہے کہ وہ پتھر اس کے منہ میں جا کر پیٹ میں اتر جاتا ہے،

اس کے بعد ہم آگے بڑھے تو ایک سرسبز و شاداب چمن نظر آیا جس میں بہار کی ہر کلی کھل رہی تھی، باغ کے سامنے ایک دراز قد آدمی کو دیکھا جس کا سر آسمان میں تھا، اور اس کے چاروں طرف بہت سے چھوٹے چھوٹے بچے تھے، آگے بڑھے تو ایک بہت بڑا باغ دیکھا جس سے زیادہ بڑا اور

اور خوبصورت باغ میں نے نہیں دیکھا تھا، یہاں پہنچکر اپنے دونوں ہمراہیوں کے کہنے سے اوپر چڑھا تو ایک شہر ملا جس کی دیوار میں سونے کی ایک ایک اور چاندی کی ایک ایک اینٹ لگی تھی، ہم لوگ دروازہ کے پھاٹک پر پہنچے، دروازہ کھلوایا، دروازہ کھلا تو اس کے اندر گھسے، تو اس میں کچھ لوگ ملے جن کا آدھا دھڑ نہایت ہی خوبصورت اور آدھا بہت ہی بدصورت تھا، میرے ہمراہیوں نے اُن سے ایک نہر کی طرف جو بیچ میں نہایت صاف وشفاف بہ رہی تھی، اشارہ کرکے کہا کہ اس میں جاکر غوطہ لگاؤ، وہ غوطہ لگاکر آئے، تو اُن کی بدصورتی کا حصہ جاتا رہا، اور وہ پورے دھڑ سے خوبصورت ہوگئے، میرے ہمراہیوں نے مجھ سے کہا کہ یہ جنت عدن ہے، اور وہ آپ کا دولتخانہ ہے، میں نے نظر اٹھاکر دیکھا، سپید بلکہ ابر کی طرح ایک محل دکھائی دیا،

پھر میں نے ان ہمراہیوں سے کہا کہ آج تو میں نے عجیب عجیب چیزیں دیکھیں، تو بتاؤ میں نے کیا کیا دیکھا، انھوں نے جواب دیا کہ پہلا شخص جس کا سر پتھر سے کچلا جارہا تھا، وہ ہے جو قرآن پڑھکر اس کی تعمیل سے انکار کرتا ہے، اور صبح کی مفروضہ نماز سے غافل ہوکر سو رہتا ہے اور دوسرا شخص جس کے گلپھڑے اور نتھنے اور آنکھیں پھاڑی جاتی تھیں، وہ ہے جو جھوٹ بول کر تمام دنیا میں اسکو پھیلاتا ہے، اور تنور میں جو مرد اور عورتیں ننگی جل رہی تھیں، وہ بدکار مرد اور عورتیں ہیں اور جو شخص خون کی نہر میں تیر رہا تھا، اور منہ سے پتھر نگلتا تھا، وہ سود خوار ہے، اور اس سدا بہار چمن میں جو دراز قد آدمی آپ نے دیکھا وہ ابراہیمؑ تھے اور اُن کے گرد جو بچے تھے وہ ننھے اور کمسن بچے تھے جو فطرت پر مرے تھے، کسی صحابی نے پوچھا یا رسول اللہ مشرکوں کے بچے؟ فرمایا اور مشرکوں کے بچے بھی، وہ لوگ جن کا ادھا دھڑ خوبصورت اور ادھا بدصورت تھا، وہ ہیں جنھوں نے کچھ

اچھے کام بھی کئے تھے، تو خدا نے ان کے گناہ دھو دیئے"۔

یہ رخ کی ان تمام سزاؤں پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ آن کی نوعیت اور کیفیت اُن کے اعمال کے بالکل مناسب اور مشابہ قرار دیگئی ہے، نمازِ صبح سے غافل ہوکر، بالینِ راحت سے سر نہ اٹھانے والے کا سر کچلا جانا، جھوٹے کا گلٹھپرا پھاڑا جانا، زانی اور زانیہ کا برہنہ تنور کی آگ میں جلنا خون چوسنے والے سود خوار کا انسانوں کے خون کے دریا میں تیرنا، اپنا دو بالشت کا پیٹ بھرنے کے لیے سارے غریبوں کی روزی چھین چھین کر جمع کرنے والے کا پتھر کے لقمے کھانا، سراسر اُن کے دنیاوی اعمال کی تمثیل و تصویر ہے، اور آخر میں نصف حسنِ عمل سے آدھے دھڑ کی خوبصورتی اور نصف سوءِ عمل سے آدھے دھڑ کی بدصورتی پوری مشابہ ہے، اور صاف و شفاف نہر کی صورت میں رحمت و مغفرتِ الٰہی کا ظہور بھی اسی قیاس پر ہے[1]،

ابھی تک دنیا نے جو کچھ ترقی کی ہے، وہ نفس سے باہر "آفاقی" یعنی اپنے سے باہر کی بیرونی مادی، دنیا کی اشیا کے خواص و صفات کے جاننے میں کی ہے، جن سے سائنس کی ایجادات و اختراعات کا تعلق ہے، لیکن ابھی اس سے بھی زیادہ ایک وسیع دنیا اپنے اندر کی پڑی ہے، جس کو قرآن نے انفس کہا ہے، ان انفس یا ارواح کے اوصاف و خصائص کا ابھی تک بہت کم علم ہوا ہے، ہماری سائنس کا علم (علم النفس) ابھی اپنی ابتدائی منزل میں ہے، اور اس پر بھی علم (علم ارواح) ابھی طلسم و فریب کے عجائبات میں اسی طرح گرفتار ہے جس طرح موجودہ عہد سے پہلے آج کے معمولی سائنٹفک تجربے سحر و جادو کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے، بہرحال ابھی تک علمِ نفس و روح کے

---

[1] صحیح بخاری کتاب التعبیر ملخصاً [2] حجۃ اللہ البالغہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ: ذکر واقعاتِ حشر

عجائبات پر پردے پڑے ہوئے ہیں، ایک یہی مسئلہ کہ شے کے یقین، اور اس کے خارجی وجود میں کیا تعلق ہے؟ ایک معمّا ہے، بہت سے ہندو اہلِ فلسفہ اور بعض مسلمان صوفیون اور موجودہ زمانہ کے مشہور فلاسفر برکلے کے نزدیک تو کسی شے کے یقین اور وجود، یا یون کہو کہ ذہنی اور خارجی وجود میں بہت کم فرق ہے، بلکہ گویا نہین ہے،

بہرحال نفسِ انسانی کے اندرونی قویٰ کا علم گو ابھی بہت کچھ محتاجِ تکمیل ہے، تاہم اتنا ثابت ہے کہ کسی شے کے تصوری یقین، اور خارجی وجود میں بہت ہی شدید تعلق ہے، مسمرازم نے جو سراسر اسی اصول پر مبنی ہے، اس حقیقت کو کسی قدر واضح کر دیا ہے، اسی سے معلوم ہوگا کہ مذاہب نے سب سے زیادہ ایمان پر جو یقین ہی کا دوسرا نام ہے، اس قدر زور بے سبب نہین دیا ہے،

قرآن پاک نے یقین کی دو قسمین کی ہیں، علم الیقین اور عین الیقین کسی شے کی دلیلون کو سنکر یا بعض علامتون کو دیکھکر اس کے وجود کا اقرار کر لو، تو یہ علم الیقین (یقین جاننا) ہے، اور اگر وہ شے خود تمہارے احساس اور مشاہدہ کے سامنے آجائے جس مین پھر شک و شبہ کی گنجایش نہیں ہو سکتی تو وہ عین الیقین (خود یقین) ہے، قرآنِ پاک نے یقین کی ان دونون صورتون کو سورۂ تکاثر مین بیان کیا ہے،

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ	تم کو دولت و نعمت کی بہتات نے غفلت میں
الْمَقَابِرَ، كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ثُمَّ	مبتلا کر دیا، یہانتک کہ تم نے قبرون کو جا دیکھا،
كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ	ابھی نہین، تم آگے جان لوگے، پھر ابھی نہیں
عِلْمَ الْيَقِيْنِ، لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ثُمَّ	تم آگے جان لوگے، ہرگز نہین، اگر تم یقین

لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ، (تکاثر-۱)

کا جاننا جانتے تو البتہ دوزخ کو دیکھ لیتے
پھر البتہ عین الیقین سے اس کو دیکھ لوگے

بنابریں اگر انسان اپنے اندر علم یقین حاصل کرتے جو کمالِ ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے تو وہ اپنے باطن کی آنکھوں سے اپنی دوزخ یہیں دیکھ لے،

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ
لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ (تکاثر)

نہیں یہ بات نہیں اگر تم کو علم یقین ہو، تو
دوزخ کو بے شبہ دیکھ لوگے،

کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عذاب کے عینی مشاہدہ کا فوری مطالبہ کرتے تھے، وحیِ الٰہی نے اس کے جواب میں کہا،

يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۞
وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ (عنکبوت-۷)

وہ تجھ سے جلد عذاب مانگتے ہیں، حالانکہ
دوزخ گھیر رہی ہے، منکرون کو،

ایک دوسری آیت میں ہے کہ منافقین بزعم خود آزمایش کے ڈر سے جہاد کی شرکت سے عذر کرتے ہیں، اس کے جواب میں اُن سے فرمایا گیا کہ وہ تو ابھی آزمایش میں مبتلا ہیں، اور دوزخ اُن کو گھیرے ہوئے ہے،

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ
وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ
وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ ۞
(توبہ-۷)

اور ان میں کوئی ایسا ہے جو کہتا ہے کہ مجھے (جہاد
میں عدم شرکت کی) اجازت دیجیے اور (آزمایش
میں نہ ڈالیے، ہاں وہ تو آزمایش میں پڑ چکے ہو
دوزخ منکروں کو گھیرے ہوئے ہے،

لیکن یہ علم الیقین جس کے حصول کا ذریعہ صرف ایمان ہے ہر شخص اُس سے اس دنیا میں بہرہ ور نہیں ہوتا۔ بلکہ بہتیرے اُس کے منکر ہیں، اس لیے اُن کو یہ اپنے پاس کی دوزخ اس وقت نظر نہیں آتی لیکن موت جس کا آنا ایک دن یقینی ہے، جب وہ آئے گی تو مادہ کا یہ حجاب جو آنکھوں پر پڑا ہے، اُٹھ جائے گا، اس وقت اس عالمِ غیب کے کچھ اسرار اُن پر منکشف ہو جائیں گے، اور اعمال کے تمثلی نتائج اور ثواب عذاب اور جنت و دوزخ کے بعض مناظر اُن کے سامنے آجائیں گے، اور اسی وقت وہ اپنے یقین کی آنکھوں سے کسی قدر واقعات کا مشاہدہ کر لیں گے۔

لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ (تکاثر ۵) پھر تم دوزخ کو عین یقین سے دیکھ لوگے

یہ موت کے بعد کا سماں ہوگا، جس کو برزخ کا عالم کہتے ہیں، اس کے بعد جب قیامت آئیگی تو ہر راز فاش ہو جائے گا۔ یوم تبلی السرائر (جس دن تمام بھید کھل جائیں گے) اور بہشت و دوزخ اپنی ظاہری صورتوں میں اس طرح سامنے آجائیں گی کہ پھر شک و شبہ کا شائبہ بھی باقی نہ رہے گا، وہ علم حقیق اور یقین تحقیقی کا دن ہوگا، قرآن میں قیامت کے موقع پر ہے،

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ، ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ... فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ (ق ۲۰)

اور پھونکا گیا صور، یہ ہے ڈر کا دن... تو ہم نے تیرا پردہ تجھ سے کھول دیا تو آج تیری نگاہ تیز ہے،

اس پردہ کے ہٹتے ہی اس دن انسان کے تمام اعمال ایک ایک کر کے اُس کے سامنے آجائیں گے، اور دوزخ منظرِ عام پر آجائے گی، فرمایا،

فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى (نازعات ۳۴) جب وہ بڑا ہنگامہ آئے گا جس دن انسان

يُقَدِّمُ كُلُّ اِنْسَانٍ مَا سَعٰى، و — کو جو کچھ اس نے کیا ہے، یاد آجائیگا، اور

بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى (نازعات) — دوزخ دیکھنے والے کے سامنے باہر لائی جائیگی،

احوال برزخ کا عین الیقین | ایک طرف شاعر (ابو العتاہیہ) نے حیرت کے عالم میں کیا خوب کہا ہے،

الموت باب وكل الناس يدخله — موت ایک دروازہ ہے اور تمام انسان اس دروازہ میں داخل ہونگے

يا ليت شعري بعد الباب ما الدار — کاش مجھے معلوم ہوتا کہ اس دروازہ کے بعد کون گھر ہے،

یہ علم جس کی حسرت اس شاعر نے ظاہر کی ہے، اس زندگی میں صرف علم الیقین کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے، البتہ موت کے وقت جب وہ دوسرے عالم کے دروازہ پر کھڑا ہوگا تو اس کو پس پردہ کا نظارہ تھوڑا بہت ہو جائے گا، اور وہی برزخ کا عالم ہے، فرمایا،

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ — جب ان گنہگاروں میں سے کسی ایک کو موت

قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ، لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ — آتی ہے تو وہ (زندگی کے پس پردہ کے بعض مناظر

صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۭ اِنَّهَا — کو دیکھکر) کہتا ہے اے میرے پروردگار مجھے ایک

كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ۭ وَمِنْ — بار اور دنیا میں لوٹا دے تاکہ دنیا میں جو حال

وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ — چھوڑ کر آیا ہوں اس سے شاید کوئی نیک کام

(مومنون - ۷) — کروں، ہرگز نہیں یہ بات ہی بات ہے، جو

وہ کہتا ہے، اور (اب) ان گنہگاروں کے پیچھے

دن تک ایک پردہ (برزخ) ہے جب وہ

ظاہر ہے کہ اگر موت کے وقت اور بعد کوئی نئی غیبی کیفیت اس کے مشاہدہ میں نہیں آجاتی،

تو اس کا شک و شبہ دفعۃً یقین سے کیسے بدل جاتا ہے، فرمایا،

وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ	اور موت کی بیہوشی حقیقت کو لیکر آگئی،
ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ (ق ۹)	یہی ہے وہ جس سے تو ہٹا کرتا تھا،

اس سے معلوم ہوا کہ سکرات کے وقت "حقیقت" کا کوئی منظر سامنے ضرور آجاتا ہے، اہل تفسیر نے بھی اس آیت سے یہی سمجھا ہے، ابن جریر طبری لکھتے ہیں،

بالحق من امر الآخرة فتبينه للانسان حتى تثبته وعرفه[1]	حق یعنی آخرت کا کچھ حال تو موت کی سکرات انسان پر کھول دیتی ہے یہانتک کہ انسان اسکو یقین کر لیتا ہے اور جان لیتا ہے،

حافظ ابن کثیر محدث اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں،

يقول عز وجل وَجَاءَتْ اَيُّهَا الانسان سكرة الموت بالحق اى كشفته لك عن اليقين الذى كنت تمترى فيه[2]	اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے انسان موت کی بیہوشی حق کو لیکر آگئی یعنی تیرے اس یقین کے پردہ کو کھول دیا جس میں تو شک کرتا تھا،

قاضی شوکانی محدث کی تفسیر میں ہے،

ومعنى بالحق انه عند الموت تتضح له الحق ويظهر له صدق المباءت	اور حق لیکر آنے کے معنی یہ ہیں کہ موت کے وقت حق بات کھل جاتی ہے، اور

[1] تفسیر ابن جریر طبری جلد ۲۶ ص ۹۱ [2] تفسیر ابن کثیر بر فتح البیان ج ۹ ص ۱۵۸ ۔

بہ الرسل من الاخبار بالبعث و	پیغمبر جس قیامت اور جزا و سزا کی خبریں لیکر
الوعد والوعید (ج ۵ ص ۳۳)	آئے تھے، انکی سچائی ہویدا ہو جاتی ہے،

مفتی آلوسی حنفی کی تفسیر کی عبارت یہ ہے

والمعنی احضرت سکرۃ الموت	اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ موت کی مدہوشی
حقیقۃ الامر الذی نطقت بہ	اس حقیقتِ امر کو سامنے کر دیتی ہے جسکو اللہ کی
کتب اللہ تعالیٰ و رسلہ علیہم السلام	کتابوں اور اسکے رسولوں نے بیان کیا ہے

زمخشری معتزلی کی تفسیر (کشاف ج ۲ ص ۴۰۲ کلکتہ) اور ابوحیان اندلسی مالکی کی تفسیر (بحر محیط ج ۸ ص ۱۲۴ مصر) میں بھی یہی ہے،

یہ مفسرین مختلف فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان سب کی متفقہ تفسیر یہی ہے، اس تفسیر کی صحت کی مزید دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد ہی قیامت کے ذکر میں ہے،

فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ	ہم نے آج تجھ سے تیرا پردہ کھول دیا تو
الْيَوْمَ حَدِيدٌ (ق-ی)	آج تیری نظر تیز ہے؛

اس سے معلوم ہوا کہ موت کے وقت کسی قدر انکشاف ہوتا ہے اور قیامت کے دن انکشافِ تام ہو جاتا ہے لیکن بہرحال موت کے وقت یقین کا پردہ بالکل کھل جاتا ہے،

موت کے بعد خدا کی طرف روح کی بازگشت

موت کے لیے قرآن میں اکثر "خدا کی طرف بازگشت" یعنی خدا کی طرف لوٹ جانے کی اصطلاح اختیار کی گئی ہے،

قُلْ إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِي تَفِرُّونَ	کہدو بیشک وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو اس سے

مِنْهُ فَإِنَّهُ مُلَاقِيكُمْ ثُمَّ تُرَدُّونَ إِلَىٰ
عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ
بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (جمعہ - ۱)

ملنا ہی ہے پھر تم اس (خدا) کے پاس لوٹائے
جاؤ گے، جو حاضر و غائب کا جاننے والا ہے، تو
وہ تم کو تمہارے کرتوت بتائیگا،

إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ (بقرہ - ۱۹)

ہم سب خدا کے ہیں، اور اسی کیطرف لوٹ کر جائینگے

إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا (مائدہ - ۱۲)

تم سب کو خدا ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے،

یہ طرز ادا بیسیوں آیتوں میں اختیار کیا گیا ہے، یہ بالکل بدیہی ہے کہ ہر رجوع و بازگشت کے مفہوم میں ورود و آمد داخل ہے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام ارواحِ انسانی خدا کے یہاں سے اس جسم و قالب کی قید میں آئی ہیں، اور موت کے وقت اس عناصر کی چہار دیواری سے نکل کر پھر انکو وہیں واپس جانا ہے، جہاں سے آئی تھیں، اس بازگشت کے سفر میں انکا زادِ راہ صرف وہی ہوگا جو اس دنیا سے دارالعمل میں انھوں نے کمایا ہے، یعنی اُن کے اندرونی و بیرونی اعمال، اور اسکے بعد جو ان کی زندگی ہوگی وہ ان کے ان ہی اعمال کی نوعیت پر منحصر ہوگی،

وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُمْ بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ
مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ
لِيُقْضَىٰ أَجَلٌ مُسَمًّى ثُمَّ إِلَيْهِ
مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ
تَعْمَلُونَ (انعام - ۷)

اور وہی (خدا) ہے جو تمھیں رات کو موت
(نیند) دیتا ہے، اور دن کو جو کما چکے، اس کو
جانتا ہے پھر تمکو دن میں جگا اٹھاتا ہے، تاکہ
مقررہ وقت (اصلی موت) پورا ہو، پھر اسی
کی طرف تم کو لوٹ کر جانا ہے، پھر وہ تمکو
تمھارے اعمال جتائے گا.

ایک اور آیت مین ہے،

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلَىٰ أَنفُسِكُم مَّتَاعَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (یونس-۳)

اے انسانو! تمھاری بغاوت کا نتیجہ تمھین پر ہے دنیا کی زندگی سے کچھ فائدہ اٹھانا، پھر ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے، تو ہم تم کو تمھارے اعمال جتائیں گے،

اس میں دنیا کی زندگی کے بعد ہی خدا نے اپنی طرف واپس آجانے کی اطلاع دی ہے اور اہلِ تفسیر نے بھی اس رجوع الی اللہ سے موت ہی کے معنی سمجھے ہیں، (طبری ۱۱ ص ۱۴۴ مصر)

اب ہم ایک ایسی آیت پیش کرتے ہیں، جس مین موت کا پورا نقشہ ہے، اور اس کے بعد بیان ہے کہ اس دن مرنے کے بعد ہی خدا کے ہان ہنکا کر لائے جاؤگے گویا جس طرح جانور ہنکا کر لائے جاتے ہیں، ویسے ہی گنہگاروں کی روحین موت کے بعد نکال کر لائی جاتی ہین، فرمایا،

كَلَّا إِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ، وَقِيلَ مَنْ ۜ رَاقٍ، وَظَنَّ أَنَّهُ الْفِرَاقُ، وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ، إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمَسَاقُ، (قیامہ-۱)

ہرگز نہیں جب روح اِنس (ہنسلی) تک آپہنچے، اور لوگ کہین، اب کون ہے جھاڑ پھونک کرکے بچانے والا، اور سمجھا کہ اب جدائی کا وقت آگیا، اور پنڈلی سے پنڈلی لپٹ گئی، اس دن تیرے پروردگار کی طرف ہے ہانکا جانا،

لیکن سعید اور نیکوکار روحون کو موت کے وقت یہ محبت بھری صدائے غیب سنائی دیتی ہے،

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي

اے مطمئن روح! تو اپنے مالک سے خوش

اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً (فجر)	اور تیرا مالک تجھ سے خوش تو اپنی مالک کے پاس واپس چلی جا

یہ کیسی دلآویز صدا اور کیسی دلکش واپسی ہوگی،

اس وقت کا سمان وہ لمحہ جب اس روح کی مہلت کا زمانہ اور عمل کی فہرست ختم ہوتی ہے، کتنا دردناک ہے، اُس وقت سے اس کی زندگی صرف اس کے گذشتہ اعمال کے قالب میں جلوہ گر ہوتی ہے، ہر عمل کی صورت اس کو اپنے سامنے کھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے، اور غیب کی کارکن صورتین چلتی پھرتی دکھائی، اور بولتی چالتی سنائی دیتی ہین،

وَلَوْ تَرٰی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ	اور کبھی تو دیکھے جس وقت گنہگار موت کی بیہوشی
الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ بَاسِطُوْٓا اَیْدِیْھِمْ	میں ہون اور فرشتے ہاتھ کھولے ہون کہ نکالو
اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَکُمْ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ	(اپنے جسموں کے اندر سے) اپنی روحون کو، آج
عَذَابَ الْھُوْنِ بِمَا کُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ	تم کو اس پر ذلت کی سزا ملیگی کہ تم خدا کی شان مین
عَلَی اللّٰہِ غَیْرَ الْحَقِّ وَکُنْتُمْ عَنْ اٰیٰتِہٖ	جھوٹ باتین کہتے تھے، اور اس کے حکمون کے
تَسْتَکْبِرُوْنَ، وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا	ماننے سے غرور کرتے تھے، اور تم ایک ایک کرکے
فُرَادٰی کَمَا خَلَقْنٰکُمْ اَوَّلَ مَرَّۃٍ وَّ	(تنہا) جیسے ہم نے پہلی بار تمکو پیدا کیا تھا، ہمارے
تَرَکْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰکُمْ وَرَآءَ ظُھُوْرِکُمْ	پاس آئے، اور جو سامان و اسباب تمکو دیا تھا، جس سے
(انعام - ۱۱)	تم کو مغرور بنایا تھا، اسکو اپنے پیچھے چھوڑ آئے

ان آیات سے ظاہر ہے کہ وقت کے وقت کس طرح فرشتے سامنے آتے ہیں اور روح جسم سے جس وقت الگ ہوتی ہے، اس کے گناہون کی سزا کا دور شروع ہو جاتا ہے،

یہی بات ایک اور موقع پر مذکور ہے،

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ، ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (انفال - ۷)

اور کبھی تو دیکھے جس وقت فرشتے کافروں کی جان لیتے ہیں اُن کے منہ پر اور پیچھے مارتے ہیں (اور کہتے ہیں) جلنے کے عذاب کا مزہ چکھو، یہ تمہارے ہاتھوں کے پہلے کئے ہوئے کاموں کا بدلہ ہے، اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا،

اس سے واضح ہے کہ یہ سزا موت ہی کے عالم سے شروع ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ یہ سزا نعوذ باللہ کسی انتقام کے سبب سے نہیں دیتا بلکہ وہ درحقیقت قانونِ عمل کے مطابق خود انسان کے کاموں کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے،

نکوکاروں کا نقشہ اس سے بالکل الگ ہے، اُن کو ہر طرف سے بشارتیں سنائی دیتی ہیں، اور ہر سمت خوشی و شادمانی کا سامان سامنے ہوتا ہے،

فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ، وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ، فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ، تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ، فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ، فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ

پھر کیوں نہیں جس وقت رُوح حلق تک پہنچ جاتی ہے اور تم اُس وقت دیکھ رہے ہوتے ہو، اور ہم اس سے تمہاری نسبت زیادہ نزدیک ہوتے ہیں لیکن تم کو دکھائی نہیں دیتا تو اگر تم کسی کے حکم کے نیچے نہیں ہو تو کیوں نہیں اس رُوح کو پھیر لیتے ہو اگر تم (اپنے انکار و تکذیب میں) سچے ہو، پھر

وَجَنَّتُ نَعِيْمٍ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ
اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ
اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ، وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ
الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ، فَنُزُلٌ مِّنْ
حَمِيْمٍ وَّتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ اِنَّ
هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ،
(واقعہ-۳)

تو اگر وہ مرنے والا مقرب بندوں میں سے ہوا تو
خوشی و آرام اور نعمت کی بہشت ہے اور اگر وہ اس سے
کچھ کم درجہ رہنے والوں میں ہوا تو تجھ پر سلامتی رہنے
والوں میں سے اور اگر وہ جھٹلانے والے
گمراہوں میں سے ہوا تو گرم پانی کی مہمانی اور
دوزخ میں بیٹھنا ہے بے شبہ یہ بات یقین کے
لائق ہے،

یہ تمام سامان موت کے بعد اور عالم برزخ ہی کے مناظر ہیں،

برزخ کا عذاب و راحت اوپر کی آیتوں سے پوری طرح ہویدا ہے کہ روح و جسم کی مفارقت کے بعد بھی روحوں کے سامنے رحمت کے اور بری روحوں کے روبرو عذاب کے منظر گذرتے ہیں، قرآن پاک میں کچھ اور آیتیں ہیں جن سے ثابت ہے کہ یہ منظر نہ صرف روح کے سامنے ہی سے گذرتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی وہ اپنے اعمال کے مناسب کے مطابق رحمت یا زحمت کے اندر بھی داخل کر دیجاتی ہے، منافقین کی نسبت قرآن میں ہے،

سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ، ثُمَّ يُرَدُّوْنَ
اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ (توبہ-۱۲)

ہم ان کو دو دفعہ عذاب دینگے پھر وہ ایک بڑے
عذاب کی طرف لوٹائے جائینگے،

"عذاب عظیم" سے ظاہر ہے کہ دوزخ کا عذاب مراد ہے، اب اس عذاب دوزخ کے پہلے عذاب کے دو دور ان پر گذر چکے ہونگے ایک تو یہ دنیاوی عذاب ہے، اور دوسرا

موت کے بعد ہی کا ہو سکتا ہے، قرآن میں آلِ فرعون کے ذکر میں ہے،

وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ	اور فرعون والون پر بری طرح کا عذاب
اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا	الٹ پڑا، آگ کہ اس پر وہ صبح اور شام پیش
وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْٓا	کیے جاتے ہیں اور جس دن قیامت کی گھڑی
اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ،	کھڑی ہوگی (ندا ہوگی کہ) فرعون والون کو
(مومن ۵)	(پہلے سے بھی) بڑھ کر عذاب میں ڈالو

اس سے ظاہر ہوا کہ گنہگارون کو قیامت سے پہلے برزخ کے عالم میں بھی عذاب کا کچھ نہ کچھ مزہ چکھایا جاتا ہے، ایسا ہی نیکوکارون کو بہشت کے عیش و آرام کا منظر دکھایا جاتا ہے، اسی آیت پاک کی تشریح میں گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، تم میں سے جب کوئی مرتا ہے تو اس پر صبح و شام اسکا اصلی مقام پیش کیا جاتا ہے، اگر وہ اہل جنت میں سے ہوتا ہے تو جنت اور اہل دوزخ میں سے ہوتا ہے، تو دوزخ پھر اس سے کہا جاتا ہے کہ یہ ہے تیرا مقام اسوقت تک کیلئے کہ جب تو قیامت کے دن اٹھایا جائے[1]، ایک اور صحیح حدیث میں ہے کہ جنتی مردہ کے سامنے جنت و دوزخ دونون کے منظر سامنے کرکے کہتے ہین کہ اگر تو اچھے عمل نہ کرتا تو تیرا یہ مقام نہ ہوتا، مگر تیرے نیک عمل کے سبب سے اب یہ جنت تیرا مقام ہے[2]، اور اس دن تک کیلئے کہ لوگ اٹھائے جائیں، امن و سرسبزی بھر دیجاتی ہے[3]،

---

[1] صحیح مسلم کتاب الجنۃ والنار، باب عرض مقعد المیت جلد ۲ ص ۳۸۰ مصر و جامع ترمذی کتاب الجنائز باب عذاب القبر حدیث حسن صحیح و صحیح بخاری کتاب الجنائز باب عذاب القبر ص ۱۸۴ و صلوات الموتی ص ۱۸۴ و ۱۸۵ و صحیح بخاری کتاب الجنائز ص ۱۸۴، [2] صحیح مسلم باب عرض مقعد المیت ص ۳۸۰ مصر،

مشرکون اور قیامت کے منکرون کا سوال تھا کہ اگر یہ پیغام الہٰی سچ ہے تو ہم کو فرشتے یا خدا نظر کیوں نہیں آتے، جواب میں کہا گیا کہ فرشتے جس دن نظر آئینگے، اُس دن ایمان یا غیب کہاں؟ اور اور کی آیتوں سے معلوم ہوچکا ہے کہ فرشتے موت کے وقت نظر آتے ہیں، یا پھر قیامت میں نظر آئینگے، اسلیے ارشاد ہی،

يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ	جس دن وہ فرشتوں کو دیکھینگے اُس دن ان گنہگاروں
لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا، وَ	کو کوئی خوشخبری نہین، اور کہینگے (کہ یہ ڈراؤنا منظر ہمکو
قَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ	نظر آرہا ہے) ابھی روک دیا جائے اور ہم خدا
هَبَآءً مَّنْثُوْرًا، اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ	فرماتا ہی ان کے لیے ہوئے کاموں کے پاس پہنچے اور انکو
خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا، وَ	اڑتا غبار بنا دیا (یعنی بیکار و بے سود و معدوم) جنت والے
يَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ	لوگ (یعنی جنکو جنت ملنے والی ہی) اس دن ان کیلیے خو
الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا، اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ	ٹھکانا اور دوپہر کے سونے کا مقام ہوگا اور جس دن
نِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى	آسمان بادل سے پھٹ جائیگا اور فرشتے آہستہ آہستہ
الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا (فرقان-۳)	اتاری جائیں گے، اس دن راج سچا خدا کا ہوگا اور وہ

کھلی بات ہے کہ آسمان کا بادل سے پھٹنا اور فرشتون کا اترنا قیامت کا نقشہ ہے، اب اس سے پہلے فرشتون کے دکھائی دینے کا وہ دن جس میں گنہگاروں کے لیے کوئی خوشخبری نہین، اور وہ کہین گے کہ کاش یہ ڈراؤنا منظر ہماری نگاہون کے سامنے نہ ہوتا، اور جنت کے مستحقین کو ایک اچھا مستقر (قرار گاہ) اور دوپہر کی دھوپ سے بچانے والی خوابگاہ ملی ہوگی: قیامت سے پہلے اور موت کے بعد ہی کی کیفیت ہے،

سورۂ محمد میں موت کے وقت کا حال بیان ہوتا ہے کہ جب فرشتے ان گنہگاروں کی روحوں کو قبض کرتے ہیں تو اُن کے چہروں پر اور پیٹھوں پر ضرب لگاتے ہیں، فرمایا،

فکیف اِذا توفتھم الملٰئکۃ	پھر کیا حال ہوگا جب فرشتے ان کو وفات دینگے
یضربون وجوھھم وادبارھم	اُن کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر مارتے ہوئے
ذٰلک بانھم اتبعوا ما اسخط اللہ	یہ اس لیے کہ انھوں نے اسکی پیروی کی جس نے خدا
وکرھوا رضوانہ فاحبط	کو انسے ناخوش کردیا اور جنھوں نے خدا کی خوشنودی
اعمالھم (محمد۔۳)	کو پسند نہ کیا تو خدا نے ان کے کاموں کو بے نتیجہ کردیا

یہ غیبی ضرب خواہ اسی مادی جسم پر پڑتی ہو، یا اس کے مثالی جسم پر یا روح پر جو بھی کہیئے، بہرحال اس سے یہ ثابت ہے کہ گنہگار مردہ پر موت کے وقت ہی سے عذاب کا ایک رنگ شروع ہوتا ہے،

سورۂ انعام میں اس سے زیادہ ہے،

ولو ترٰی اذ الظّٰلمون فی	اور اگر تو دیکھے جب گنہگار موت کی سکرات
غمرٰت الموت والملٰئکۃ باسطوا	میں ہوں اور فرشتے ہاتھ بڑھائے ہوں کہ
ایدیھم اخرجوا انفسکم الیوم	نکالو اپنے جسم کے اندر سے اپنی روحوں کو
تجزون عذاب الھون (انعام۔۱۱)	آج تم کو ذلت کی سزا ملے گی،

الیوم جس کے معنی آج کے ہیں، ظاہر ہے کہ اس سے وہی زمانہ مراد ہے، جس وقت سے فرشتے بدن سے روح نکالتے ہیں، اس "آج" سے مقصود ہمارا دنیاوی آج نہیں ہے جو ۲۴ گھنٹوں میں ختم ہوجاتا ہے، بلکہ برزخ کا پورا زمانہ ہے (دیکھو فتح القدیر شوکانی و تفسیر ابوالسعود

(تفسیر روح المعانی آلوسی)

قوم نوح کے غرق ہونے کے بعد ہی دوزخ میں جانے کا ذکر ہے،

أُغْرِقُوا فَأُدْخِلُوا نَارًا فَلَمْ يَجِدُوا لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْصَارًا (نوح-۲)

وہ ڈبو دیئے گئے، پھر وہ آگ میں داخل کیے گئے، تو انھوں نے خدا کے سوا مددگار نہیں پائے،

حضرت لوطؑ اور حضرت نوحؑ کی کافر بیویوں کی موت کے بعد ہی عذاب کا ذکر ہے

وَقِيلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدَّاخِلِينَ (تحریم-۲)

اور کہا گیا کہ داخل ہونے والوں کے ساتھ تم دونوں بھی آگ میں داخل ہو جاؤ،

یہ قیامت سے پہلے اور دنیا کے عذاب ہلاکت کے بعد کے واقعات ہیں، اور اسی وقعہ کا نام برزخ ہے،

سورہ یٰس میں ایک خیر خواہِ قوم کا ذکر ہے، جو عمر بھر اپنی قوم کو حق کی تبلیغ کرتا رہا تھا اور پھر وہ غالباً اسی حق کی راہ میں شہید ہوا، مرنے کے بعد جب اس کو بہشت ملی، تو اس نے بڑی حسرت سے کہا کہ کاش میری قوم کو معلوم ہوتا کہ مرنے کے بعد خدا نے کس طرح مجھے معاف فرمایا اور عزت بخشی، تاکہ وہ بھی ایمان سے میری طرح بہرہ ور ہو کر اس مغفرت اور عزت سے سرفراز ہوتی،

قِيلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ۖ قَالَ يَا لَيْتَ قَوْمِي يَعْلَمُونَ، بِمَا غَفَرَ لِي رَبِّي وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُكْرَمِينَ، وَمَا

کہا گیا جنت میں داخل ہو، اس نے کہا اے کاش میری قوم کو یہ معلوم ہوتا کہ میرے پروردگار نے میری مغفرت کی اور مجھے عزت

أَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْ بَعْدِهٖ
مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا
مُنْزِلِيْنَ، (یٰس-۲)

والون مین سے بنایا، اور ہم نے اس کے مرنے
کے بعد اسکی قوم پر آسمان سے کوئی فوج نہیں
اتاری، اور نہ ہم اتارا کرتے ہیں

شہیدوں کی نسبت تو خاص طور پر ہے،

بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ
يُرْزَقُوْنَ (اٰل عمران-۱۷)

بلکہ وہ زندہ ہین اپنے رب کے پاس
روزی پاتے ہین،

اس سے معلوم ہوا کہ شہدا کو برزخ ہی مین کامل زندگی کے ساتھ جنت کی روزی ملتی ہے اور عام نیکوکارون کا یہ حال ہے کہ ان کو فرشتے اس وقت سلامتی اور جنت کی خوشخبری سناتے ہیں، فرمایا،

اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ
طَيِّبِيْنَ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ
ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ

جنکو فرشتے (گناہون سے) پاک و صاف حالت میں
وفات دیتے ہیں کہتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہو اپنے
کامون کے بدلہ جنت میں چلے جاؤ،

قبر کی اصطلاح | سطور بالا مین عالم برزخ کے وہ مناظر دکھائے گئے ہین، جو قرآن کی آیتوں میں نظر آتے ہیں، اور احادیث صحیحہ مین اس عالم کے حالات کی جو تفصیلین مذکور ہیں، وہ عموماً قبر کی

لہ بعض معتزلہ عذاب قبر کے قائل نہ تھے، اور انکی دلیل یہ تھی کہ قرآن میں اسکا ذکر نہیں یہ غلط فہمی انکو اسلئے ہوئی کہ آیات قرآن میں لفظ قبر و قبور کیساتھ عذاب کا ذکر نہیں لیکن اگر وہ دیکھتے کہ قرآن مین بعد موت اور قبل قیامت ارواح انسانی کے عذاب ثواب اور رحمت و لعنت کا ذکر موجود ہے تو انکو اس انکار کی جرأت نہ ہوتی اور قرآن مین اسی قسم کی متعدد آیتیں موجود ہیں،

اصطلاح کے ساتھ بیان ہوئی ہیں، لیکن اس لفظ قبر سے درحقیقت مقصود وہ خاک کا تودہ نہیں جس کے نیچے کسی مردہ کی ہڈیاں پڑی رہتی ہیں، بلکہ وہ عالم ہے جس میں یہ مناظر پیش آتے ہیں، اور وہ ارواح ونفوس کی دنیا ہے مادی عناصر کی نہیں، اسی لیے قرآن پاک نے اس عالم کے تعلق سے ہمیشہ نفس اور نفوس کو خطاب کیا ہے، اور ان ہی کے عذاب وثواب اور رحمت ولعنت کا ذکر ہے، اس عالم میں جو جسم نظر آتا ہے، وہ مرنے والے کے اعمال کا مثالی پیکر ہوتا ہے، جو ہو بہو اس کے خاکی جسم کا مثنی ہوتا ہے، تم نیند میں ہو، اور تمہارا نیم مردہ بے حس جسم بستر پہ دراز ہے، مگر تم خواب میں دیکھ رہے ہو کہ بعینہٖ تمہارا جسم آگ میں جل رہا ہے، یا باغ وبہار کی لذتوں میں مصروف ہے، اور تم کو اس سے وہی تکلیف اور راحت مل رہی ہے، جو بیداری میں اپنے بستر پہ پڑے ہوئے جسم کی تکلیف وراحت سے مل سکتی ہے، اس جواب میں جس طرح تمہارے مادی جسم کے علاوہ تم کو اپنا ایک خیالی جسم نظر آتا ہے، جو ہو بہو تمہارا مادی جسم ہے، اسی طرح موت کے خواب میں بھی تم کو اپنا ایک مثالی جسم نظر آئے گا، جو اکثر حالتوں میں ہو بہو تمہارے اس خاکی جسم کے مطابق ہوگا[1]، اور تمہاری روح اسی جسم مثالی کے عذاب راحت سے متاثر ہوگی کہ اعمال کی اصل ذمہ دار روح انسانی ہے جسم خاکی نہیں، فرمایا كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ (مدثر-۲) یعنی ہر روح اور جان اپنے اعمال کے ہاتھوں گرو ہوگی"، اس لیے اصل مکلف روح ہے جسم نہیں، جسم بمنزلہ آلہ کے ہے، دنیا میں اس کا ایک جسم خاکی تھا، برزخ میں اسکا ایک اور جسم ہوگا جو

[1] اس سے اس شبہ کا ازالہ ہوتا ہے کہ ہم کو مردہ کا جسم سامنے پڑا نظر آتا ہے لیکن اس پہ عذاب کا کوئی نشان نظر نہیں آتا، اور نیز اس شبہ کا بھی ازالہ ہوتا ہے کہ قبر میں جب جسم سڑ گل جاتا ہے تو پھر عذاب وثواب کا احساس اس کو کیسے ہوتا ہے،

مادہ و مادیات سے پاک و بری ہوگا، تاہم اس کو اپنے جسم خاکی سے ایک قسم کی نسبت حاصل ہوگی، اور اسی نسبت کی بنا پر قبر کی اصطلاح عام قبول عالم میں جاری ہے، کیونکہ ہم اپنی آنکھوں سے مسلمان مردوں کو اسی قبر میں جاتے دیکھتے ہیں، قرآن پاک کی یہ آیت اوپر گذر چکی ہے،

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ (انفال)

اور اگر تو دیکھے جب فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں مارتے ہیں، ان کے منہ اور پیٹھ پر اور (کہتے ہیں) چکھو جلنے کا مزہ

اس آیت سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ گنہگاروں پر موت کے بعد ہی سے عذاب شروع ہو جاتا ہے، وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ مار ان کے منہ اور پیٹھ پر پڑنی ہے، مگر یہ منہ اور یہ پیٹھ وہ نہیں ہے جو بے جان لاشہ کی صورت میں ہمارے سامنے ہے، بلکہ اس آیت میں کافر کی روح کو جانور سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح جانور کو تیز ہنکاتے وقت کبھی آگے (منہ پر) اور کبھی پیچھے پیٹھ پر مارتے ہیں، اسی طرح گویا کافر روح کو زبردستی فرشتے مارتے ہوئے، اور ہنکاتے ہوئے لے چلیں گے اور کہیں گے کہ چلو عذاب کا مزہ چکھو، یہی مفہوم صاف لفظوں میں اس آیت میں ہے،

اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ الْمَسَاقُ (قیامہ-۱)

اس دن تیرے پروردگار کی طرف ہنکایا جانا،

بعض ایسی سعید روحیں بھی ہوتی ہیں جنکو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس برزخ میں جسم خاکی کی شکل و صورت کی قید سے آزاد کر کے کوئی دوسرا مناسب نمائی جسم عطا کرتا ہے، جیسا کہ احادیث میں آیا ہے کہ مومن کامل کی روح پرندوں کی شکل میں جنت میں اڑتی پھرتی

ہے[1]، اور خصوصاً شہداء کے متعلق آیا ہے کہ وہ سبز پرندوں کی شکل میں ہونگے، اور عرشِ الٰہی کی قندیلیں اُن کا آشیانہ ہوں گی، اسی طرح دوزخ و بہشت کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد صادق پہلے گذرا ہے، اس میں جن جسمانی قالبوں میں گنہگاروں کی سزا و تکلیف کی صورتیں دکھائی گئی ہیں، وہ تمام تر مثالی ہی ہیں، ظاہر ہے کہ مومن سعید اور شہداء کے وہ مثالی قالب اور گنہگاروں کے یہ مثالی اجسام اُن کے وہ قالب اور جسم نہیں ہیں جو ان کی قبروں میں سڑ گل کر فنا ہو گئے، یا وہ آگ میں جل کر خاکستر ہوئے، اور ذرے ہوا میں اڑ کر منتشر ہو گئے، یا کسی جانور کے پیٹ میں جا کر اُس کا جزء بدن بن گئے،

بعض حدیثوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان مٹی کی قبروں میں عذاب کے مشاہدات و مسموعات کا تذکرہ ہے تو ظاہر ہے کہ مادی زبان و منظر میں ان قوموں کے نزدیک جو مردوں کو گاڑتی ہیں اُس میت کی یادگار اس دنیا میں اُس کے اُس مٹی کے ڈھیر کے سوا اور کیا ہے، جسکی طرف اشارہ کیا جا سکے، ایک صحیح حدیث میں اُس نیک مرد کا ذکر ہے جس نے خدا کے خوف سے یہ وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد اس کا جسم جلا کر اس کی راکھ ہوا میں اڑا دی جائے، تاکہ وہ خدا کے سامنے حاضر نہ کیا جا سکے، مگر قدرتِ الٰہی نے اسکو مجسم کر کے کھڑا کر دیا، اور اُس کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اپنی رحمتوں سے نوازا؛

سوال و جواب | احادیث صحیحہ میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مرنے کے بعد قبر میں دو فرشتے آتے ہیں، اور وہ مردوں سے توحید و رسالت کی نسبت سوال و جواب کرتے ہیں،
اس کی تصدیق قرآن کی ان آیتوں سے بھی ہوتی ہے؛

---

[1] سنن ابن ماجہ کتاب الجنائز ۲۰ صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۹۰۸ کتاب الرقاق باب الخوف من اللہ،

اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَیِّبِیْنَ
یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْكُمُ ادْخُلُوا
الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (نحل-۴)

جن کو فرشتے (گناہوں سے) پاک و صاف حالت میں
وفات دیتے ہیں کہتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہو اپنے
کاموں کے بدلہ جنت میں چلے جاؤ،

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ
ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِیْمَ كُنْتُمْ
قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ ط
قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً
فَتُهَاجِرُوْا فِیْهَا فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ
جَهَنَّمُ (نساء-۱۲)

بیشک فرشتوں نے جن کی روحوں کو اس حالت
میں قبض کیا کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے، وہ
کہتے ہیں، تم کس بات میں تھے، وہ جواب دیتے ہیں،
کہ ہم ملک میں بے یار و مددگار تھے، وہ فرشتے کہتے
ہیں کہ کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اپنا وطن
چھوڑ کر باہر چلے جاتے،

ایک اور آیت ہے،

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا یَتَوَفَّوْنَهُمْ
قَالُوْٓا اَیْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ ط قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا
عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِیْنَ
قَالَ ادْخُلُوْا فِیْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ
مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ
فِی النَّارِ ط (اعراف-۴)

یہاں تک کہ جب ان جھٹلانے والوں کے پاس ہمارے
فرشتے انکی روحوں کو قبض کرنے آئیں گے اور کہینگے
کہاں ہے وہ جنکو تم خدا کے علاوہ پکارتے تھے، اس وقت
وہ مشرک کہینگے کہ ہمارے وہ دیوتا ہم سے کنارہ کش
ہو گئے اور انھوں اپنے اوپر آپ گواہی دی کہ وہ کافر
تھے، تب خدا فرمائیگا کہ تم بھی ان لوگوں میں جا ملو
جو جن و انس میں سے تم سے پہلے آگ میں جا چکے ہیں،

پہلی آیت میں عدم ہجرت کے گناہ کے مرتکب مسلمانوں کا، اور دوسری میں کافروں کا حال بیان کیا ہے، کہ اُن سے اُن کی موت کے بعد ہی یہ سوال کیا جائیگا، بہرحال یہ تو خاص گناہوں کے مجرموں کا حال تھا، اب عام لوگوں سے جو سوال ہو سکتا ہے، جس کا ذکر احادیث میں ہے، یعنی توحید و رسالت کی معرفت کا اُن سے، سوال ہوگا،

قرآن پاک میں ایک جگہ کلمۂ طیبہ (اچھی بات یعنی کلمۂ توحید) اور کلمۂ خبیثہ (بری بات یعنی کلمۂ کفر) کی ایک ایک مثال ہے، کلمۂ طیبہ کی مثال اُس درخت کی ہے، جس کی جڑیں زمین میں مضبوط گڑی ہیں، اسی کی شاخیں آسمان تک پھیلی ہیں، اور اس میں سدا بہار میوے لگے ہیں، اور کلمۂ خبیثہ کی مثال اُس درخت کی ہے، جس کی جڑ زمین سے اکھڑی پڑی ہے، وہ اب گرا اور تب گرا، اس کے بعد قرآن میں ہے،

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ (ابراهيم ۴)	اللہ ایمان والوں کو پکی بات پر اس دنیا میں مضبوط رکھے گا، اور آخرت میں بھی اور اللہ ظالموں کو بچلاتا ہے،

اس کی تفسیر صحیح حدیثوں میں یہ ہے کہ یہ برزخ کے اسی سوال و جواب سے متعلق ہے کہ صاحب ایمان جس طرح اپنی اس زندگی میں ایمان کی بات پر قائم تھا، اسی طرح برزخ میں بھی اس پر قائم رہے گا، اور جو کافر و مشرک یہاں اس پر قائم نہ تھا، وہاں وہ بھی قائم نہ رہے گا، اور بہک جائے گا،

ہر چند کہ رسول پاکؐ کی صحیح تفسیر کے ہوتے ہوئے کسی اور استدلال کی حاجت نہیں، تاہم

تائیداً یہ عرض ہے کہ اس آیت میں اہلِ ایمان کے آخرت میں بھی "قولِ ثابت" پر ثابت قدم رکھے جانے کی بشارت ہے، ظاہر ہے کہ اس آخرت سے قیامت اور بہشت و دوزخ کا دن تو مراد نہیں ہو سکتا کہ وہ تو کشفِ راز کا دن ہے، اُس دن تو کافر بھی اس قولِ ثابت سے پلٹنے کی جرأت نہیں کر سکتا، پھر یہ اہلِ ایمان کے لئے کوئی خاص بشارت نہ ہوگی، اور نہ یہ اس اظہارِ احسان کا مناسب وقت ہو سکتا ہے، البتہ اس بشارت اور احسان کا اعلان و اظہار آخرت کے اُس حصہ میں موزوں ہو سکتا ہے جہاں ہنوز اسرارِ پس پردہ کی پوری نقاب کشائی نہیں ہوتی، اور وہ برزخ کا عالم ہے،

اس آیت پاک کی اس تفسیر سے جو احادیثِ صحیحہ پر مبنی ہے، یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آخرت کی وسعتِ مفہوم میں برزخ کا میدان بھی داخل ہے،

حقیقت میں اس عالم برزخ کا سوال و جواب کوئی نیا واقعہ نہ ہوگا، بلکہ ہر روح کی پہلی زندگی کی پایانی کیفیت اقرار و انکار کی مثال ہوگی، یا یوں کہو کہ آج کے آئینہ میں کل کا عکس نمایاں ہوگا، یعنی اقرار و انکار کی جس کیفیت پر زندگی کا خاتمہ ہوا ہوگا، وہی بعد کو سوال و جواب میں نمایاں ہوگی،

برزخ میں ارواح کا مسکن آخری سوال یہ ہے کہ موت اور قیامت کی اس بیچ کی منزل (برزخ) میں ارواحِ انسانی کا مسکن کہاں ہوگا؟ قرآن پاک میں اس کا جواب متعدد آیتوں میں ملتا ہے، سب سے پہلی آیت تو ان مذکورۂ بالا آیات کے بعد ہے جس میں ذکر ہے کہ فرشتے جب نکیرین سے سوال و جواب کر چکیں گے تو خدا انکی روحوں کو حکم دیگا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ عذاب کی آگ میں داخل ہو جائیں، اس کے بعد ہے،

إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا — بیشک جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا

عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ، (اعراف - ۵)

اور ان کے ماننے سے غرور کیا، اور ان کیلئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے، اور نہ وہ جنت میں داخل ہونگے، تا آنکہ اونٹ سوئی کے ناکے میں گھس جائے (یعنی کبھی نہیں)

اس سے معلوم ہوا کہ آیاتِ الٰہی کے منکروں اور جھٹلانے والوں کی روحیں مرنے کے بعد آسمانی بادشاہی کے حدود میں قدم نہ رکھ سکیں گی، اور وہ فضائے زمین میں آوارہ پھرینگی، یا اپنے خاکی جسموں کے لگاؤ سے جہاں وہ سپردِ خاک ہوئے ہوں منڈلاتی رہیں گی اور وہیں سے دوزخ کا منظر دیکھیں گی، اور تکلیف اٹھائیں گی،

اس کے برخلاف ہمہ تن پاکیزہ مومن روح کا یہ حال ہوتا ہے کہ موت ہی کے وقت رحمتِ الٰہی کا فرشتہ، بلکہ خود زبانِ رحمت اُس کے کانوں میں یہ صدا دیتی ہے،

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً، فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (فجر - ۱)

اے مطمئن روح! اپنے پروردگار کے پاس واپس چلی جا! تیرا پروردگار تجھ سے خوش، اور تو اپنے پروردگار سے خوش، تو میرے بندوں میں شامل اور میری بہشت میں داخل ہو جا،

ان سے بڑھ کر وہ پاک باز روحیں ہیں، جنھوں نے اپنے خاکی جسموں، فانی زندگیوں مادی خوشیوں اور زوال پذیر عشرتوں کو خدا کی راہ میں قربان کیا، تو انکو خدا کی طرف سے ایک تمثالی جسم، غیر فانی زندگی اور روحانی عیش و مسرت کی لازوال دولت اسی وقت عنایت کر دیجاتی ہے، فرمایا،

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ
(بقرہ-۱۹) وہ زندہ ہیں، لیکن تم شعور نہیں کر سکتے،

جو خدا کی راہ میں مارے جائیں انکو مردہ نہ کہو

یہ پُر مسرت زندگی کیسی ہوگی، اسکی تفصیل دوسری سورہ میں ہے،

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۙ
فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ
يَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا
بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ يَسْتَبْشِرُوْنَ
بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ
لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۙ
(آل عمران-۱۷)

اور تو انکو جو خدا کی راہ میں مارے گئے مردہ نہ گمان کر، بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں انکو روزی دیجاتی ہے، خدا نے اپنی مہربانی سے انکو جو دیا ہے اس پر خوش ہیں، اور جو ابھی انکے پیچھے سے ان تک نہیں پہنچے ہیں، انکی طرف سے بھی خوش ہیں کہ ان کو نہ کوئی خوف ہوگا، اور نہ وہ غمگین ہوں گے، وہ اللہ کے مہر و کرم سے مسرور ہیں، اللہ ایمان والوں کی مزدوری ضائع نہیں کرتا،

یہ پُر مسرت زندگی شہداء کو ملے گی، اسی زندگی کا مقام خدا کے پاس "جنت" ہے

احادیثِ صحیحہ میں ہے کہ ان زندہ شہیدوں کی روحیں قفس عنصری سے پرواز کرکے جب اڑتی ہیں تو وہ سبز پرندوں کی صورت میں جنت کی سیر کرتی ہیں، اور عرشِ الٰہی کی قندیلیں انکا نشیمن بنتی ہیں، اسکے بعد غالباً ہر ذی عقل تسلیم کریگا کہ انبیاء علیہم السلام کے روحانی مدارج و مراتب شہداء سے بہرحال اعلیٰ اور برتر ہیں، اسلئے ان کا مقام بھی اسی احاطۂ قدس کے اندر ہوگا، اسی لئے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سیرِ معراج اور اپنے رویاے صادقہ میں بعض پیغمبروں کو آسمان اور بہشت کے مختلف مدارج میں دیکھا،

بعض وہ سعید روحیں ہیں، جو یہاں سے نکل کر فرشتوں کی صف میں داخل ہو جاتی ہیں، جیسا کہ حضرت جعفر طیارؓ کے متعلق احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ وہ شہادت کے بعد اپنے دونوں بازوؤں سے فرشتوں کے ساتھ عالم ملکوت میں اڑ رہے تھے، عالم برزخ کے یہ دو اڑانے والے بازو درحقیقت ان کے ان دونوں جسمانی بازوؤں کی مثال ہیں، جو اس جنگ میں ان کے جسم سے کٹ کر گر گئے تھے اور وہ اس پر بھی اسلام کے علم کو اپنے بقیہ کٹے ہوئے بازو اور گردن کے سہارے سے پکڑے تھے، عجب نہیں کہ قرآن پاک کی یہ آیت ایسے ہی لوگوں کی شان میں ہو،

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا	بیشک جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا پروردگار
تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا	اللہ ہے، پھر ثابت قدم رہے، ان پر فرشتے یہ
وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ	خوشخبری لیکر اترتے ہیں کہ خوف نہ کھاؤ اور
الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ	غمگین نہ ہو اور اس جنت کی بشارت سنو،
اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا	جس کا تم سے وعدہ کیا تھا، ہم دنیا کی زندگی میں
وَفِی الْاٰخِرَۃِ (حم السجدہ ۴-۴)	تمہارے رفیق ہیں: اور آخرت میں بھی،

یہ آوازۂ بشارت اور فرشتوں کی رفاقت، اسی برزخ کا دلکش سماں ہو سکتا ہے،

۲۔ آخرت کی دوسری اور حقیقی منزل

قیامت اور جزائے اعمال

موت تو افراد کا معاملہ ہے، ایک مرتا ہے، اور دوسرا اسکی جگہ پیدا ہوتا ہے، قومیں بھی باری باری اس بازیگاہ کے تختہ پر آتی ہیں، اور ایک قوم اپنا کھیل ختم کرکے کسی دوسری کے لئے جگہ خالی کر جاتی ہے، یہ سلسلہ ازل سے قائم ہے، اور ابتک چل رہا ہے، کائنات جس انتظام پر پیدا ہوئی تھی وہ بعینہٖ قائم ہے، اور اس محفل کی جو رونق اول روز تھی، وہ ابتک اسی طرح باقی ہے، غرض

ہزار شمع بکشتند و انجمن باقی ست

لیکن کیا کوئی ایسا دن بھی آئیگا، جب یہ ساری بساط ہستی الٹ جائیگی، کائنات کی یہ مجلس درہم برہم ہو جائیگی، اور آسمان و زمین کے گرے ٹکرا کر چور چور ہو جائیں گے، اور پھر وہ خلاقِ عالم اپنی صفتِ خلق و احسان و جزا کے نئے منظر دکھائیگا، اور نئی زمین اور نیا آسمان پیدا ہو کر ایک اور عالم کسی نئے نظام پر وجود پذیر ہوگا،

دنیا کے وہ تمام لوگ جو حال کو دیکھ کر مستقبل کا پتہ لگاتے ہیں، کسی نہ کسی طرح اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ جس طرح یہ افراد آتے اور فنا ہوتے ہیں، اسی طرح ایک دن آئے گا جب اس پوری دنیائے حیات پر موت طاری ہوگی، سب سے زیادہ اس سوال کے جواب میں کریڈ بلکہ انکار کا حق فلسفہ اور سائنس کے محققوں (سائنٹسٹس) کو ہو سکتا ہے،

اہلِ فلسفہ کا بڑا گروہ اس امکان پر یقین رکھتا ہے، اور اہلِ سائنس بھی اس کو بہرحال محال نہیں سمجھتے بلکہ طبیعیات و ہیئتِ جدیدہ کے مختلف محققوں کے خیالات اس باب میں امکان سے آگے بڑھ کر وقوع کی سرحد تک پہنچ چکے ہیں، وہ اس ہولناک دن کی آمد کے متعلق اپنے علم کے زور سے پیشین گوئیاں کرتے رہتے ہیں، اور اس عالمگیر موت کے مختلف اسباب ظاہر کرتے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ نظامِ عالم کی پوری گاڑی جس انجن سے چل رہی ہے، وہ گرم آفتاب ہے، جسکی یہ گرمی روز بروز کم ہوتی جاتی ہے، آخر ایک دن آئے گا، جب یہ انجن بالکل ٹھنڈا ہو جائیگا، اور ساری گاڑی ٹوٹ پھوٹ جائے گی، ایک سبب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ یہ پورا نظامِ کائنات جذب و کشش کے ستون پر قائم ہے، اور فضلے ہستی کے یہ تمام سیارے روز بروز کھنچتے چلے آتے ہیں، تو ایک دن وہ بھی آئیگا جب باہمی توازن باقی نہیں رہے گا، اس وقت تمام کرے ایک دوسرے سے قریب ہو کر ٹکرا جائیں گے، اور یہ تصادم ان کو چور چور کر دیگا،

ایک اور خیال یہ ہے کہ اس فضا میں کروڑوں ستارے تیر رہے ہیں، ان میں سے بہت کم کا علم ہم کو ہوا ہے، بہت ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں ہماری زمین کسی نئے ستارہ سے ٹکرا کر چور چور ہو جائے، اور اس کی ساری آبادی سہاؤ منثوراً ہو کر رہ جائے،

بہرحال اسبابِ طبعی کچھ ہوں، مگر ایسا ہونا اہلِ سائنس کے نزدیک بھی امکان بلکہ وقوع کی امید سے خالی نہیں،

اہلِ مذاہب میں یہ عقیدہ کسی نہ کسی نوع سے ہر جگہ موجود ہے، اور اس کا مجمل تذکرہ تمام آسمانی کتابوں میں ہے، تورات میں اس کے اشارے پائے جاتے ہیں، زبور میں اسکی تصریحات

ہیں، اور اُس میں اس کو "عدالت کا دن" کہا گیا ہے[1]، حضرت مسیح علیہ السّلام کے زمانہ میں یہود کے دو فرقے تھے، ایک صدوقی، جو یونانیوں کے اثر سے آزاد خیال ہو گیا تھا، اور قیامت کا منکر تھا، مگر دوسرا فرقہ جو فریسی کہلاتا تھا، بدستور اپنے پرانے عقیدے پر قائم تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو یہودی تھے، وہ قیامت، حشر و نشر اور بہشت و دوزخ کے قائل تھے، انکا عقیدہ تھا کہ جب قیامت آئے گی تو اللہ تعالیٰ ایک انگلی پر آسمانوں کو دوسری پر زمینوں کو تیسری پر درختوں کو چوتھی پر پانی کو اور اندر کی نرم مٹی کو، اور پانچویں پر تمام مخلوقات کو رکھے گا، اور ندا آویگی کہ میں ہوں بادشاہ[2]، انجیل میں یہ عقیدہ پوری تصریح کے ساتھ مذکور ہے، حضرت عیسیٰؑ نے صدوقیوں کے مقابلہ میں توریت کی ایک آیت سے حیاتِ اخروی کا ثبوت پیش کیا ہے[3]، اور مکاشفاتِ یوحنا میں قیامت کے احوال و اہوال کی پوری تفصیل و تشریح مذکور ہے، ہندو پرلے کے نام سے اس عقیدہ (فنائے عالم) پر یقین رکھتے ہیں، لیکن اس حقیقت کی کامل تشریح خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے انجام کو پہنچی ہے،

قیامت کے نام کسی شے کی حقیقت کی اوّلین گرہ کشائی، اس کے ناموں کی تشریح سے ہوتی ہے، قرآنِ پاک میں قیامت کو بیسیوں ناموں سے یاد کیا گیا ہے، اور ان میں سے ہر ایک نام اسکے ایک خاص پہلو کو نمایاں اور ظاہر کرتا ہے، قرآن میں اس کا سب سے پہلا نام جو سب سے پہلی سورہ میں ہے، وہ یوم الدّین ہے، یعنی جزا کا دن، جس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ عمومی جزا اور ربّانی عدالت کا دن ہوگا، اسکے علاوہ اس کے اور بھی بہت سے نام قرآن میں جا بجا آئے ہیں،

---

[1] زبور ۹-۱۶-۷، و ۱۰۲۲، ۲ و باب ۹۴ و ۵۰ [2] انجیل مرقس ۱۲ و ۲۴ و اعمال ۲۳ [3] صحیح بخاری تفسیر سورۂ زمر
متی ۲۲-۳۱، ۳۲ لوقا ۲۰، ۲۷ مرقس ۱۲-۱۸،

اَلسَّاعَۃ،	وہ گھڑی، (وہ مقرر وقت)
یَوْمُ الْقِیَامَۃ،	کھڑے ہونے کا دن (مردوں کے کھڑے ہونے کا دن)
اَلْیَوْمُ الْحَقُّ،	سچا دن (نہ جس کے آنے میں کوئی شک ہو اور نہ جس کے فیصلہ میں کوئی غلطی ہوگی)
یَوْمٌ مَعْلُوْمٌ،	جانا ہوا دن، یا مقررہ دن،
اَلْوَقْتُ الْمَعْلُوْمُ	جانا ہوا وقت یا مقررہ وقت،
اَلْیَوْمُ الْمَوْعُوْدُ،	موعودہ دن،
اَلْیَوْمُ الْاٰخِرُ،	پچھلا دن،
یَوْمَ الْاٰزِفَۃِ،	قریب آنے والی مصیبت کا دن،
یَوْمٌ عَسِیْرٌ،	ایک سخت دن،
یَوْمٌ عَظِیْمٌ،	ایک بڑا دن،
یَوْمٌ عَصِیْبٌ،	سخت دن،
یَوْمُ الْبَعْثِ،	جی اٹھنے کا دن،
یَوْمُ التَّلَاقِ	افسوس کا دن،
یَوْمَ التَّلَاقِ،	باہم ملنے کا دن،
یَوْمُ التَّنَادِ،	پکار کا دن،
یَوْمُ الْجَمْعِ،	اکٹھے ہونے کا دن،

یَوْمُ الْحِسَابِ،	حساب کا دن،
یَوْمُ الْحَسْرَةِ،	حسرت کا دن،
یَوْمُ الْخُرُوْجِ،	قبروں سے نکلنے کا دن،
یَوْمُ الْفَصْلِ،	فیصلہ کا دن،
اَلْقَارِعَةُ	کھڑکھڑانے والی،
اَلْغَاشِیَةُ،	چھا جانے والی،
اَلطَّامَّةُ الْکُبْرٰی،	بڑی مصیبت،
اَلْمَنَبَأُ الْعَظِیْمُ،	بڑی خبر،
اَلْحَاقَّةُ،	ضرور آنے والی گھڑی،
اَلْوَعْدُ،	وعدہ،
اَلْوَاقِعَةُ،	وقوع پذیر،
اَمْرُ اللّٰہِ،	خدا کی بات،
اَلصَّاخَّةُ،	بہرا کرنے والی گھڑی،

قیامت کے اوصاف | یہ تو وہ نام ہیں جو اسم مفرد یا اضافت، یا صفت کی صورت میں ہیں، ان کے علاوہ فقروں اور جملوں کی ترکیبوں کیساتھ اسکے اور بھی کثیر نام قرآن میں آئے ہیں، مثلاً

یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ (انعام و نمل و طٰہٰ)	جس دن نرسنگھا پھونکا جائے گا،
یَوْمَ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُھُمْ (مائدہ ۱۲)	جس دن سچوں کو ان کی سچائی کام دیگی،

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ (شعراء-۱۰)	جس دن نہ مال کام آئے گا، نہ اولاد،
وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ (فرقان-۳)	جس دن گنہگار اپنے دونوں ہاتھ چبائیگا
وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ (فرقان-۳)	اور جسدن آسمان پھٹے گا،
وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ (مومن-۱)	جس دن گواہ کھڑے ہون گے
لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ (آل عمران-۱۲)	جس دن میں کوئی شک نہین،
وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا (نمل-۷)	جس دن ہم ہر قوم سے ایک گروہ کو اکٹھا کرین گے،
يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، (مطففین)	جس دن لوگ جہان کے پروردگار کیلیے کھڑے ہونگے
يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ (قمر-۱)	(جس دن) لوگ قبرون سے نکلین گے،
يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ	جسدن آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور باپ اور اپنی بیوی
وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ (عبس-۱)	اور اپنے بیٹون سے بھاگے گا،
يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا (بقرہ-۵)	جس دن کوئی شخص کسی کے کچھ بھی کام نہ آئے گا،
يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ (نور-۳)	جس دن انکی زبانیں انکے خلاف گواہی دینگی،
يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا (انفطار-۱)	جس دن کوئی دوسرے کیلیے کچھ بھلا نہ کرسکیگا،
يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْئًا (دخان-۲)	جس دن کوئی دوست کسی دوسرے دوست کو کچھ فائدہ نہ پہنچا سکیگا

الغرض یہ اور اسی قسم کے دوسرے اوصاف اس ہولناک دن کے بیان کئے گئے ہیں، جن سے اس عظیم الشان دن مین انسان کی بیکسی، عاجزی اور اپنے اعمال کے سوا کسی دوسری چیز سے کام آنے سے قطعی مایوسی ظاہر کی گئی ہے،

قیامت میں فسادِ نظام ہوگا، قیامت کے متعلق بعض متکلمین کو یہ شبہ ہوا ہے کہ وہ مادہ کے فنائے محض یا عدم محض کا نام ہے، حالانکہ یہ بات قرآنی تصریحات کے خلاف ہے، قرآن پاک کی بیسیوں آیتوں میں قیامت کی جو تصویر کھینچی گئی ہے، وہ تمام تر فنائے حیات اور آسمان و زمین کے نظام کی برہمی اور انکی تباہی کے خاکہ کے سوا کچھ اور نہیں ہے، چنانچہ حسب ذیل آیات پر غور کرنے سے یہ نتیجہ خود بخود سامنے آجائے گا،

اَلْقَارِعَةُ مَا الْقَارِعَةُ وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ، يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ، (قارعہ-۱)	متنبہ کرنے والی اور کیا چیز ہے متنبہ کرنے والی اور تم کو کس نے بتایا کہ کیا چیز ہے متنبہ کرنے والی، یہ وہ دن ہے جب لوگ پریشان پروانوں کی طرح اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح ہوں گے،
اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا، وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا، يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا (زلزال-۱)	جب زمین خوب ہلائی جائیگی، اور وہ اپنا بوجھ نکالے گی، اور انسان کہے گا، زمین کو کیا ہوا، اس دن وہ اپنی حالت بیان کرے گی،
اِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ، وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ، وَاِذَا الْاَرْضُ... مُدَّتْ، وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ، (انشقاق-۱)	جب آسمان پھٹ جائیں گے، اور وہ اپنے رب کی فرمانبرداری کرینگے، اور وہ فرمانبرداری کے لائق ہیں، جب زمین پھیلائی جائیگی اور جو کچھ اس میں ہے اسکو ڈالدیگی، اور خالی ہو جائے گی،
اِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ	جب آسمان پھٹ جائیں گے، اور جب تارے

اَنْتَثَرَتْ، وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ، وَ
اِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ، عَلِمَتْ
نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ

کھر جائیں گے اور جب سمندر چلائے جائیں گے
اور جب قبر کے لوگ زندہ کیے جائیں گے، اس
وقت روح نے جو کچھ پہلے اور پیچھے بھیجا ہے،
اُس کو جان لے گی،

(انفطار-۱)

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ وَاِذَا النُّجُوْمُ
انْكَدَرَتْ وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ وَاِذَا
اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ، فَاِذَا النُّجُوْمُ
طُمِسَتْ، وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ، وَ
اِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ،

جب آفتاب اندھیرا کیا جائے گا، جب تارے
تاریک ہو جائیں گے جب پہاڑ چلائے جائیں گے
جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے، وہ یقیناً ہونے والا
ہے، جب تارے ماند کر دیے جائیں گے اور
جب آسمان کھولدیا جائے گا اور جب پہاڑ ریزہ
ریزہ کر دیے جائیں گے،

(مرسلات-۱)

فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ وَخَسَفَ الْقَمَرُ
وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ،

جب نگاہ ماند ہو جائے گی، جب ماہتاب
بے نور ہو جائے گا، اور آفتاب و ماہتاب اکٹھا
کر دیے جائیں گے،

(قیامہ-۱)

يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ وَتَكُوْنُ
الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ، (معارج-۱)

جب آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح اور جب
پہاڑ روئی کے گالوں کے مانند ہو جائیں گے

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ
وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا

جب صور میں ایک پھونک پھونکی جائیگی، جب
زمین اور پہاڑ اٹھائے جائیں گے، اور دونوں

دَكَّةً وَاحِدَةً ۙ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ
الْوَاقِعَةُ، وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ
يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ (الحاقہ-۱)

ٹکڑے ہو جائیں گے، اُس دن ہونے والی
بات ہو جائے گی، اور آسمان پھٹ جائے گا،
اور اس دن کمزور ہو جائے گا،

يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ
وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا..
... فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ
يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبَانِ السَّمَآءُ
مُنْفَطِرٌ بِهٖ، كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا
(مزمل-۱)

جب زمین اور پہاڑوں میں لرزہ ہو گا اور
پہاڑ بکھلا ہوا ٹیلا ہو جائیں گے . . . .
. . . . کیونکر متقی ہو سکتے ہو جب اس
دن کا انکار کرتے ہو جو بچوں کو بوڑھا بنا دیگا،
آسمان اس دن پھٹ جائیں گا، اور خدا کا
وعدہ پورا ہو جائے گا،

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ
الْاَرْضِ، (ابراھیم-۱۷)

جب یہ زمین دوسری زمین سے
بدل دیجائے گی،

فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ
وَرْدَةً كَالدِّهَانِ (رحمن-۲)

جب آسمان پھٹ جائیں گے اور سرخ تلچھٹ
کی طرح ہو جائیں گے،

اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ لَيْسَ
لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ، خَافِضَةٌ
رَّافِعَةٌ، اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ
رَجًّا وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا فَكَانَتْ

جب ہونے والی بات ہو جائے گی جس کے
ہونے میں جھوٹ نہیں ہے، زیر و زبر کر دینے والی،
جب زمین خوب ہلائی جائے گی اور پہاڑ
پراگندہ کیئے جائیں گے، اسوقت وہ پریشان

هَبَاءً مُّنْبَثًّا، (واقعہ-۱)

وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا

وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا

(نبا-۱)

غبار کی طرح ہو جائیں گے،

اور آسمان کھولدئے جائیں گے، تو وہ دروازے

دروازے ہو جائیں گے اور پہاڑ چلائے جائیں گے

تو وہ سراب ہو جائیں گے،

غرض اس قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت صرف نظام عالم کی درہمی، اور دنیا کی حیات موجودہ کی بساہی کا نام ہے، جس کے بعد ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان بنے گا اور پچھلی دنیا کے نتائج پر اس دنیا کی حکومت کا قانون جاری ہوگا،

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ

وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ

الْقَهَّارِ،

(ابراهیم-۷)

جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل

دیجائیگی، اور آسمان بھی بدل جائیں گے،

اور سب لوگ اس ایک سب پر قابو رکھنے والے

خدا کے سامنے نکل کر آئیں گے،

قیامت کی حقیقت اگرچہ قرآن پاک میں متفرق طور پر اس ہولناک دن کے احوال و کیفیات کا ذکر گوناگون طریقوں سے کیا گیا ہے، تاہم ایک خاص سورہ بھی اس نام سے اس میں موجود ہے، جس میں نہایت اختصار و ایجاز کے باوجود انتہائی بلیغانہ وسعت ہے، چھوٹے چھوٹے فقروں میں بڑے بڑے اور اہم سے اہم مطالب کو اس طرح بیان کیا ہے کہ عقل ساکت اور قلب مطمئن ہو جاتا ہے، اس سورہ کا آغاز ان آیتوں سے ہوتا ہے،

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ، وَلَآ

میں قیامت کے دن کی اور ملامت کرنیوالے

أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ، أَيَحْسَبُ
الْإِنْسَانُ أَنْ لَنْ نَجْمَعَ عِظَامَهُ
بَلَى قَادِرِينَ عَلَىٰ أَنْ نُسَوِّيَ بَنَانَهُ
بَلْ يُرِيدُ الْإِنْسَانُ لِيَفْجُرَ
أَمَامَهُ، يَسْأَلُ أَيَّانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ
فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ وَخَسَفَ
الْقَمَرُ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ
يَقُولُ الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ
الْمَفَرُّ كَلَّا لَا وَزَرَ، إِلَىٰ رَبِّكَ
يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ، يُنَبَّأُ الْإِنْسَانُ
يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ، بَلِ
الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ، وَلَوْ
أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ۔

نفس کی قسم کھاتا ہون کیا (انسان) سمجھتا ہے
کہ ہم (اسکے مرنے کے بعد) اسکی ہڈیون کو اکٹھا
نہیں کرسکتے، کیون نہین، ہم تو اس کے پورون کو
درست کرسکتے ہیں، یہ نہین بلکہ اصلی بات یہ ہے کہ
انسان چاہتا ہے کہ خدا کے سامنے ڈھٹائی کرے،
پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب ہے، تعجب نگاہ
چوندھانے لگے، اور چاند بے نور ہوجائے اور
سورج اور چاند ایک جگہ کردیے جائین، انسان
اس دن کہے گا کہ اب کہان ہے بھاگنے کی جگہ،
ہرگز نہین کہین بچاؤ نہین، اس دن تیرے رب
کے پاس ہے جا ٹھہرنا، اس دن انسان کو جو
اس نے آگے بھیجا (عمل) اور جو پیچھے چھوڑا (مال
دولت) وہ بتایا جائے گا، بلکہ انسان اپنے
حال کو آپ دیکھتا ہے، اگرچہ وہ زبان سے
بہانے تراشا کرے،

(قیامۃ-۱م)

ان مین سے پہلی ہی آیت مین اللہ تعالیٰ نے روز قیامت اور نفس لوامہ کی یکے بعد دیگرے قسم کھائی ہے، نفس لوامہ یعنی ملامت کرنے والے نفس سے مقصود انسان کے اندر کا ضمیر ہے جو

اس کے ہر برے کام کے وقت اندر سے غمگین و نادم ہوتا ہے، اور اُسکو اس کے اس کام پر ملامت کرتا ہے، آخری آیت میں اسی کیفیتِ ضمیر کو ان لفظوں میں ادا فرمایا بلکہ انسان اپنے حال کو آپ ہی خوب جانتا ہے، اگرچہ وہ زبان سے اپنی برائیوں اور کوتاہیوں کے نئے سیکڑوں بہانے تراشا کرے" انسان کی اسی قلبی کیفیت کا نام نفسِ لوامہ ہے،

(۱) اجتماعیات کے عالم اچھی طرح جانتے ہیں کہ فرد اور جماعت کے احوال میں ایک خاص قسم کی مناسبت ہے، جس طرح آدمی پیدا ہوتا ہے، بڑھتا ہے، بیمار ہوتا ہے، تندرست ہوتا ہے، گنہگار ہوتا ہے، نیکوکار ہوتا ہے، پشیمان ہوتا ہے، محنت کرتا ہے، نکو نام ہوتا ہے، بدنام ہوتا ہے، خاص طبعی قوانین کی مطابقت سے وہ قوت حاصل کرتا ہے، اور ان کی مخالفت سے وہ بیمار اور کمزور ہوتا ہے، پھر ایک خاص عمر کو پہنچ کر رفتہ رفتہ اُسکے قوائے عمل سرد پڑتے جاتے ہیں، اور وہ مرجاتا ہے، بعینہٖ یہی تمام احوال جماعتوں اور قوموں کو بھی پیش آتے ہیں، وہ بھی پیدا ہوتی ہیں، بڑھتی ہیں، تندرست ہوتی ہیں، کمزور ہو جاتی ہیں، گناہگار ہوتی ہیں، نیکوکار بنتی ہیں اور ایک خاص وقت اور عمر کو پہنچکر ان کے عملی قویٰ کمزور و مضمحل ہو جاتے ہیں اور وہ فنا ہو جاتی ہیں،

دنیا میں اسی اصول پر ہزاروں قومیں پیدا ہو کر فنا ہو چکی ہیں، جنکے نام بھی تاریخ کے صفحوں پر آج موجود نہیں ہیں تو جس اصول پر اشخاص اور اشخاص کا مجموعہ جماعتیں اور جماعتوں کا مجموعہ اقوام پیدا ہوتی اور فنا ہوتی ہیں، کیا اسی اصول پر تمام اقوامِ عالم کا یہ مجموعہ جو پیدا ہوتا بڑھتا، اور ترقی کرتا چلا جاتا ہے، کیا ایک دن فنا کے محض کے آغوش میں جاکر نہ سو جائیگا یہی وجہ ہے کہ قرآنِ پاک نے قیامت کے ثبوت میں اکثر عاد و ثمود و آلِ فرعون وغیرہ قوموں کی تباہی سے قیامت

کی عمومی تباہی پر استدلال کیا ہے، اسکی مزید تفصیل آگے آئیگی،

بہرحال اب جس طرح شخص کے اندر ایک نفس لوامہ، یا ضمیر یا احساس ہے جو اسکے ہر برے فعل کے وقت اُس کو ملامت کرتا، اور اسکو گنہگار ٹھہراتا ہے اور جب کبھی وہ اپنے تمام مجموعی کارناموں پر نگاہ ڈالتا ہے، تو اپنے کو قصوروار جانتا اور گنہگار سمجھتا ہے، اسی طرح قوموں کا ضمیر بھی اپنے گناہوں پر پچھتاتا اور اپنی تقصیروں پر نادم اور کوتاہیوں پر شرمندہ ہوتا ہے، اور ٹھیک اسیطرح یہ پوری انسانیت بھی ایک دن اپنے افراد کے مجموعی کارناموں پر نادم و پشیمان ہوگی، اور اس کا ضمیر و نفسِ لوامہ بھی اس کو ملامت کریگا، کائناتِ انسانی سے بڑھکر خود کائناتِ ہستی بھی اُس پر جو اسکے اندر کیا گیا، اپنے خالق کے سامنے اپنی پشیمانی و ندامت کا اظہار کریگی اسی عمومی اعترافِ قصور اور کلی ندامت و پشیمانی کا نام قیامت ہے، اور اسی مناسبت سے سورۂ بالا میں نفسِ لوامہ اور قیامت کو باہم ایک قسم یعنی شہادت میں یکجا کیا گیا ہے، اب اس تفصیل کی روشنی میں سورۂ مذکور کی آیتوں کو دوبارہ پڑھئے،[1]

۲- اس عالم کی ہر چیز پر اگر غور سے نگاہ ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ وہ متضاد عناصر و قوتوں کا مجموعہ ہے، اس میں سردی و گرمی، بیماری و تندرستی، بقا و فنا، اور دیگر ہر قسم کی متضاد قوتیں ودیعت رکھی گئی ہیں، ان متضاد قوتوں میں جبتک اعتدال قائم رہتا ہے، وہ چیز زندہ رہتی ہے، اور جس وقت یہ اعتدال جاتا رہتا ہے، اسی لمحہ وہ فنا ہو جاتی ہے، ایک درخت میں ایک پھول کھلا، سردی و گرمی اور موسم کی تاثیر نے اس پر عمل کیا، جبتک ان متضاد تاثیرات و استعدادات میں

[1] مستفاد از تفسیر سورۂ قیامہ مولانا حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ،

اعتدال کی کیفیت رہی، وہ پھول شگفتہ رہا، جس آن کسی ایک قوت نے شکست کھائی، پھول کی ہستی معرضِ فنا میں آگئی، یہی حال دنیا کی ہر چیز کا ہے، اور اسی اصول پر افراد خاندان، جماعتیں، قومیں، بلکہ حیوانات، شجر، حجر، غرض دنیا کی ہر چیز چل رہی ہے،

پوری کائناتِ ہستی کو لیجئے، اُسکو خلاقِ عالم نے ان ہی متضاد عناصر و اخلاط پر قائم فرمایا ہے، دن رات روشنی، تاریکی، سردی، گرمی، پانی، آگ، بہار، خزاں، تندرستی، بیماری، دولت، افلاس، حیات و موت، آسمان، زمین، نیکی، بدی، خیر، شر، غرض جس کو بھی دیکھو یہی معلوم ہوگا کہ یہ اربع عناصر کی چہار دیواری، متضاد قوی اور حالات کی بنیادوں پر قائم ہے، ان میں جبتک اعتدال قائم ہے، اس دنیا کی کل چل رہی ہے، جس دن انکے اعتدال میں فرق آیا وہی اسکی فنا کا دن ہوگا

لیکن جس طرح افراد و اشخاص میں بیماری کے بعد تندرستی اور تندرستی کے بعد بیماری کی حیت صلاحیت موجود ہے، اسی طرح اس نظام کائنات میں بھی تندرستی کے بعد بیماری اور بیماری کے بعد تندرستی کی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں، کتنی دفعہ یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ دنیا ظلم و جور سے لبریز ہو گئی اور کشت و خون کے سیلاب نے اسکے امن و امان کو غرق کر دیا کہ دفعتہً وہ پھر ابھری، اور اس کا غرق شدہ امن و امان کشتیِ نوح بن کر کرۂ ارضی کو بچا لے گیا، بارہا اس باغِ ہستی میں خزاں آئی، اور پھر بہار کا موسم اُس پر چھا گیا، اجرام سماوی کی باہمی مسابقت میں ہماری زمین کئی دفعہ ٹکرا جانے کے قریب پہنچی اور پھر بال بال بچ گئی، یہ کرے اپنی رفتار میں بسا اوقات گرنے کے قریب پہنچے، کہ پھر سنبھل گئے، مگر فساد و صلاح کا یہ نظام اسی وقت تک چل رہا ہے، جبتک ان متضاد قوی اور کائنات کے استعدادات میں اعتدال قائم ہے، جس دن اعتدال فنا ہوگا، نظام ارضی کا پورا

کارخانہ بھی درہم برہم ہو جائیگا: اُس وقت زمین اپنی عمر کی پوری تاریخ اور کارناموں کے ساتھ آ
خالق کے سامنے کھڑی ہوگی اور اپنے اوپر کی ہر کوتاہی و قصور کی شہادت اپنی زبان سے دیگی،

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا وَأَخْرَجَتِ
الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا وَقَالَ الْإِنْسَانُ
مَا لَهَا يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا
بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا يَوْمَئِذٍ
يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ
فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ
وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ

جس وقت زمین ہلائی جائیگی اور جب وہ
اندر کے بوجھوں کو اگل دیگی، اور انسان کہگا
کہ اسکو کیا ہو گیا ہے، اس دن وہ اپنی باتیں
بیان کریگی کہ اسکے پروردگار نے اس کو حکم
دیا ہے، اس دن لوگ لوٹیں گے کہ اپنے عمل
دیکھیں، تو جس کسی نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی
اسکو دیکھ لیگا، اور جس نے ذرہ برابر بدی کی
ہے وہ بھی اس کو دیکھ لے گا،

(زلزال - ۱)

صور قیامت قرآن میں قیامت کے ذکر میں صور پھونکے جانے کا بار بار ذکر ہے، فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ
پھر جب صور پھونکا جائیگا، صور کے لفظی معنی نرسنگھا کے ہیں، اصل یہ ہے کہ قدیم الایام میں
بابلیوں، کنعانیوں، آرامیوں اور عبرانیوں وغیرہ تمام پرانی قوموں میں بادشاہی جلال و جلوس اور اعلانِ جنگ
کے موقعوں پر نرسنگھا پھونکا جاتا تھا، اس لئے نرسنگھا پھونکنے کے معنی شاہی جلال کا اظہار یا غیر معمولی خطر
کا اعلان ہے، چنانچہ توراۃ میں یہ محاورہ بکثرت استعمال کیا گیا ہے، قرآن میں ہر کہ اس دن
ندا ہو گی لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ آج کس کی بادشاہی ہے، پھر اللہ تعالیٰ خود ہی جواب دیگا لِلَّهِ الْوَاحِدِ
الْقَهَّارِ اس ایک سب پر غالب آنے والی کی، غرض وہ دن آسمان و زمین اور نظم کائنات کے سنشاہ مطلق

کے اظہارِ جلال اور شدید خطرۂ حساب کے اعلان کا ہوگا، اس لئے نفخ صور اور نرسنگھا پھونکنے کا قدیم محاورہ اس کے لئے استعمال کیا گیا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ واقعۃً اس دن اپنی شہنشاہی کا نرسنگھا پھونکنے کا حکم دے اور اسکی تعمیل ہو، جیسا کہ صور کے لفظی معنی دلالت کرتے ہیں،

عربوں کا انکار

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ قیامت اپنے اندر کتنی عظیم الشان حقیقت رکھتی ہے، لیکن اہلِ عرب کو توحید کے بعد جس عقیدہ سے شدت کے ساتھ انکار تھا، جس کے ماننے پر وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہوتے تھے، اور جو ان کی عقل میں کسی طرح نہیں سماتا تھا، وہ یہی قیامت اور حشر و نشر کا مسئلہ ہے، جاہلی عرب حیات بعد الموت اخلاق کے آگے اپنے اعمال کے مواخذہ اور پرسش اور سزا و جزا سے قطعاً لاعلم تھے، اسی لئے ان کو اعمال کے خیر و شر اور نیکی و بدی میں وہ تمیز نہ تھی، جس پر اخلاق و معاملات کا تمام تر دار و مدار ہے، عرب کا شاعر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اس تعلیم کو سنکر تعجب سے کہتا ہے کہ

اموت ثم بعث ثم حشر	حدیث خرافۃٍ یا ام عمر
کیا موت ہے، پھر جی اٹھنا ہے، پھر اکٹھا ہونا ہے	اے ام عمر! شاعر کی بیوی کا نام، یہ سب خرافات ہیں

قریش کا ایک اور شاعر کہتا ہے،[1]

یُحَدِّثُنَا النَّبِیُّ بِاَنْ سَنَحْیٰ	وکیف حیات اصداء وھام
یہ نبی ہم سے کہتا ہے کہ ہم پھر زندہ کئے جائیں گے	حالانکہ صدا اور ہام ہو کر پھر زندگی کیسی؟

(انکا عقیدہ تھا کہ انسان مرکر پرندہ ہو جاتا ہے، اور آواز دیتا پھرتا ہے، اسی کا نام انکے ہاں صدے اور ہام تھا)

---

[1] صحیح بخاری جلد اوّل باب الہجرۃ ص ۵۵۸،

قرآن مجید میں بھی انکے یہ اقوال بکثرت نقل کئے گئے ہیں، مثلاً،

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيْدٌ (ق-۱) — کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی ہوجائیں گے یہ لوٹنا بہت دور ہے،

ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِى الْحَافِرَةِ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً (نٰزعٰت-۱) — کیا ہم دوبارہ الٹے پاؤں لوٹائے جائیں گے، کیا جب ہم سڑی ہوئی ہڈی ہوجائیں گے،

ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا (اسرائیل ۵-۱) — کیا جب ہم ہڈی اور چورا ہوجائیں گے تو ہم نئے بناکر پھر اٹھائے جانے والے ہیں،

مَنْ يُّحْىِ الْعِظَامَ وَهِىَ رَمِيْمٌ (یٰسٓ-۵) — ان سڑی گلی ہڈیوں کو کون جلائیگا؟

ان میں بعضوں کا عقیدہ دہریوں کی طرح تھا کہ یہ دنیا اسی طرح قائم رہے گی، موت و حیات کا بھی سلسلہ اسی طرح برابر جاری رہے گا، اور اس دنیاوی زندگی کے علاوہ کوئی دوسری زندگی نہیں ہے،

وَقَالُوْا مَا هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ (جاثیہ-۳) — انھوں نے کہا کہ یہی ہماری موجودہ زندگی ہے، دوسری نہیں، مرتے ہیں اور جیتے ہیں، اور زمانہ ہی ہمکو مارتا ہے،

وَقَالُوْٓا اِنْ هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ (انعام-۳) — اور انھوں نے کہا یہی ہماری موجودہ زندگی ہے، ہم دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے،

انھیں اپنے اعمال کے حساب و مواخذہ کا بھی یقین نہ تھا،

إِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ حِسَابًا (نبأ ۱۰) وہ حساب کی امید نہیں رکھتے تھے،

خباب بن الارت نہایت قدیم مسلمانوں میں ہیں، یہ لوہاری کا پیشہ کرتے تھے، انکے کچھ دام قریش کے ایک رئیس عاص بن وائل پر واجب الادا تھے، وہ جب جاکر تقاضا کرتے تو عاص کہتا "جب تک تم محمدؐ کا انکار نہ کروگے میں تمکو کچھ نہ دونگا"، انھوں نے کہا یہ اس وقت نہیں ہو سکتا جبتک تم مرکر پھر جیو نہیں"، اس نے کہا کیا مرکر مجھے پھر جینا بھی ہے؟ انھوں نے کہا "بیشک" اس نے مذاق سے کہا تو اچھا پھر وہیں میرا مال و دولت اور سروسامان ہوگا، وہیں تم دام بھی لے لینا[1] اس سے اندازہ ہوگا کہ اس بارہ میں اہل عرب کا کفر کتنا شدید تھا، اسلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنکے سامنے توحید کے بعد جس عقیدہ کو سب سے زیادہ زور کے ساتھ پیش کیا وہ یہی تھا، قرآن مجید کی مکی سورتوں میں سب سے زیادہ اسی مضمون کو مختلف تعبیروں اور موثر طریقوں سے روز مرہ کے عینی مشاہدات اور دلائل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، ان میں ہیبتِ الٰہی، ہنگامۂ قیامت اور حشر و نشر کے رستخیز کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ سننے والا سرتاپا اثر ہو جائے، انسان کے عجز، عقل کے قصور، خدا کی عظمت و قدرت اور کائنات کی حیرت انگیز خلقت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ سامع ہر قدم پر لرزہ براندام ہو جاتا ہے، پھر ایک طرف حیاتِ ابدی، نعیم جنت اور بہشت کی مسرتوں کا دوسری طرف موت کی بے بسی، دنیا کی فنا، دوزخ کی دہشت اور عذابِ الٰہی کی تہدید کا ایسا ہولناک نقشہ کھینچا ہے، کہ نفس انسانی اپنے تاثر کو چھپانے پر قادر نہیں رہتا،

وحی الٰہی نے قیامت اور بہشت و دوزخ کے حالات و مناظر کو سب سے پہلے جن اسباب سے

[1] صحیح بخاری تفسیر کہیعص صفحہ ۶۹۱،

پیش کیا ہے، اُن سے اہلِ نظر صحابہؓ ناواقف تھے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ پہلے ایک بڑی سورت نازل ہوئی، جس میں جنت و دوزخ کا بیان ہے، یہانتک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہوئے تب حلال و حرام کے احکام نازل ہوئے اور اگر پہلے ہی یہ حکم اترتا کہ شراب نہ پیو، بدکاری نہ کرو تو لوگ نہ مانتے، یہ آیت کہ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهٰى وَأَمَرُّ، (بلکہ اُن کے وعدہ کا وقت قیامت کی گھڑی ہے، اور قیامت کی گھڑی نہایت مصیبت کی اور تلخ ہوگی) مکہ معظمہ میں اتری اور میں اس وقت کمسن بچی تھی کھیلتی تھی، بقرہ اور نساء کی سورتیں (جن میں احکام ہیں) سورتیں اتریں جب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے لگی تھی[1]"

اس تشریح سے ثابت ہوتا ہے کہ تعلیم محمدیؐ نے اس حقیقت کو ایمان کے اصول و اساس میں کیوں داخل کیا ہے، اگر یہ تعلیم عقائد میں داخل نہ ہوتی، تو دلوں میں اعمال کی جزا و سزا کی ہیبت اور عظمت نہ بیٹھتی اور نہ احکام الٰہی کی تعمیل کی طرف دلی رجحان اور میلان پیدا ہوتا بلکہ یہودیوں کی طرح جن کے صحیفوں میں زیادہ تر دنیاوی ہی جزا و سزا کا ذکر باقی رہ گیا ہے، دوسرے اہلِ ایمان کے دل بھی سخت اور تاثر سے خالی ہو جاتے ہیں، چنانچہ اس فلسفہ کو خود قرآن مجید نے بیان کیا ہے،

فَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ قُلُوبُهُمْ	تو جو لوگ آخرت کا یقین نہیں کرتے ان کے
مُنْكِرَةٌ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ (نحل ۳)	دل نہیں مانتے اور وہ غرور میں مبتلا ہیں،

اسی لئے مسلمانوں کو حکم ہوا کہ نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کی تلاوت کریں جس کا ایک ٹکڑا یہ بھی ہے، مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ" روزِ جزا کا مالک" اسلام چاہتا ہے کہ یہ حقیقت اسکے پیروؤں

[1] صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۷۴۸ باب تالیف القرآن،

کے دلوں میں پوری طرح گھر کرلے،

قیامت پر قرآنی دلائل قرآن نے قیامت کی ضرورت پر تمام دوسری دلیلوں سے قطع نظر کرکے عموماً دو باتوں سے استدلال کیا ہے، اوّل یہ کہ انسان بے کار اور بے مقصد نہیں پیدا کیا گیا اگر اس کے اعمال کا مواخذہ اور جزا و سزا نہ ہو تو خیر و شر اور نیکی و بدی کا فطری امتیاز لغو، اور انسانی زندگی تمامتر بے مقصد، اور اُس کے تمام کام بے نتیجہ ہو جائیں،

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (مؤمنون)

(اے لوگو!) کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تمکو بیکار پیدا کیا اور تم ہماری طرف لوٹائے نہ جاؤ گے،

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى (قیامہ)

کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ بیکار چھوڑ دیا جائیگا

دوسری بات جو روز جزا کی ضرورت کے ثبوت میں قرآن نے پیش کی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا عادل اور منصف ہونا ہے، اگر اچھے اور بُرے انسانوں کے اعمال کی جزا و سزا نہ ہو تو دونوں کا درجہ برابر ہو جائے، اور نیکی و بدی اور گناہ و ثواب کے کوئی معنی نہ رہیں، بلکہ نعوذ باللہ خدا ظالم اور غیر منصف قرار پائے، اس موجودہ مادی دنیا میں بھی انسانوں کو اپنے اعمال کی کچھ نہ کچھ جزا ملتی ہے، تاہم یہ صاف نظر آتا ہے کہ بہت سے گنہگار، سیہ کار اور ظالم یہاں آرام اور چین کی زندگی بسر کرتے ہیں اور بہت سے نیکوکار، پرہیزگار اور اچھے لوگ مصیبتیں اور تکلیفیں جھیلتے ہیں، اسلئے یقیناً یہ موجودہ زندگی اعمال کی جزا و سزا کی اصلی جگہ نہیں ہو سکتی، اس بنا پر دوسری زندگی کا ماننا ضروری ہے، جہاں ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا نتیجہ مل سکے، اس موجودہ دنیا میں دنیاوی حکام اپنے ناقص علم کے مطابق اچھوں اور بُروں کو ان کے اعمال کی جزا و سزا دیتے رہتے ہیں پھر کبھی

ضروری ہے کہ پوری دنیا کا عالم الغیب حاکم اپنے صحیح علم کے مطابق لوگوں کو جزا و سزا دیکر اپنے عدل و انصاف کا ثبوت دے، سورۂ والتین میں اسی استدلال کی طرف اشارہ ہے،

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ، فَمَا یُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ اَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِیْنَ، (والتین - ۱)	لیکن جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے، ان کیلئے نہ ختم ہونے والا اجر ہے، پھر اسکے بعد تجھکو کیا چیز جزا پر یقین لانے نہیں دیتی، کیا اللہ تمام حاکموں میں سب سے بڑا حاکم نہیں (تمام فیصلہ کرنے والوں میں سب سے بہتر فیصلہ؟

اسی لئے قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے، کہ نیک و بد کا نتیجۂ عمل یکساں نہیں ہو سکتا، ایک جگہ خدا فرماتا ہے،

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِیْنَ فِی الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ كَالْفُجَّارِ (ص - ۳)	کیا انکو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے انکی طرح کر دیں جو زمین میں فساد کرتے ہیں یا پرہیزگاروں کو بدکاروں کی طرح کر دیں؟

دوسری جگہ ارشاد ہوا،

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْیَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ (جاثیہ - ۲)	کیا انھوں نے جنھوں نے گناہ کمائے یہ خیال کیا ہے، کہ ہم انکو انکی طرح کر دینگے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے، ان دونوں کی زندگی اور موت برابر ہوگی؟ ان کا یہ خیال برا ہے،

لوگوں کو روزِ جزا اور قیامت پر یقین کرنے سے جو وہم مانع تھا وہ یہ تھا کہ مرنے کے بعد پھر کوئی جیتا نہیں، تو قیامت کے دن کیونکر جلائے جائیں گے، یہ حقیقت میں استبعادی شبہہ ہے، یعنی چونکہ کر دوبارہ جینا ابتک انسان کے تجربہ میں نہیں آیا اس لئے اسکو دوبارہ زندگی کا خیال مستبعد معلوم ہوتا ہے، ورنہ اس کے ان ہونی اور محال ہونے پر کوئی عقلی دلیل نہیں ہے، وحیِ محمدی نے اس گتھی کو اس طرح سلجھایا کہ کفار کے استبعاد کے وہم کو حسب ذیل مختلف طریقوں سے دور کر دیا،

۱۔ مرکر جینے کے بعد تاریخی مثالیں پیش کیں، جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت عزیرؑ اور اصحاب کہف کے قصوں میں مذکور ہیں، اور ان سے استدلال کیا، کہ جب چند آدمی یا چند مرکر جی سکتے ہیں تو پوری دنیا بھی مرکر جی سکتی ہے،

۲۔ جس طرح زمین گرمیوں میں خشک اور بے حیات ہو جاتی ہے، اور پھر دفعۃً بارش کے ایک چھینٹے سے اس میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے، سبزہ نکل آتا ہے، کھیتاں لہلہا اٹھتی ہیں، اسی طرح قدرتِ الٰہی کی ایک بارش زمین سے انسانی دفینوں کو اگلوا دیگی وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا (اور زمین اپنے اندر کے بوجھوں کو باہر نکال دیگی) اور دوبارہ نئی زندگی پیدا کر دیگی،

۳۔ دوبارہ زندگی پر تعجب اور استبعاد اس لئے ہے کہ خدا کے دائرۂ قدرت کی وسعت ہماری سمجھ میں نہیں آئی، جس نے آسمان بنائے، زمین بنائی، آسمان سے پانی برسایا، مردہ زمین سے زندہ کھیتیاں، سبزہ اور درخت اُگائے، اور پانی کے ایک قطرہ سے انسان بنایا، کیا وہ ان کے فنا کے بعد دوبارہ ان کی ایجاد پر قادر نہیں؟

۴۔ حیات کا یہ تمام کارخانہ پہلے نیست و معدوم تھا، خدا نے اسکو ہست و موجود کیا، پھر رفتہ رفتہ اسکو معدوم کر دیا، تو جس نے پہلے بغیر کسی سابق مثال کے اس کارخانے کو پیدا کیا، وہ کیا دوبارہ اسکو پیدا نہیں کر سکتا جس نے نقشِ اوّل بنایا، کیا نقشِ ثانی کھینچنے پر اسکو قدرت نہیں ؟

(۵) دنیا میں باری باری بہت سی قومیں وجود میں آئیں اور قوانینِ الٰہی کے مطابق انھوں نے جسمانی زور و طاقت، مالی وسعت، اجتماعی اور تمدنی عظمت اور سیاسی قوت حاصل کی بڑی بڑی عمارتیں بنائیں، عظیم الشان تمدن کی بنیاد ڈالی، قوموں کو اپنا محکوم بنا کر حکومت و سلطنت قائم کی، پھر جب انھوں نے غرور و نخوت ظلم و ستم اور دوسرے قوانینِ الٰہی کی جو قومو کی ہستی اور عظمت کی بقا کیلئے ضروری ہیں، مخالفت کی، تو وہ فنا کر دی گئیں اور انکا نام و نشان بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا، عربوں سے سوال کیا کہ تمھارے عاد و ثمود جو کبھی بنو سام کے ممالک عراق و شام و مصر و عرب پر چھائے ہوئے تھے، کیا ہوئے ؟ سبا اور تبع کی عظیم الشان حکومتیں کیا ہوئیں ؟ فرعون اور اسکی سلطنت کا کیا حال ہوا ؟ قوم لوط اور قوم مدین کو زمین کیونکر نگل گئی ؟

اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا	کیا یہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ
کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ کَانُوْا مِنْ	اُن سے پہلوں کا کیسا انجام ہوا جو ان سے
قَبْلِهِمْ کَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ	قوت اور زمین میں یادگاروں کے لحاظ
قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِی الْاَرْضِ (مومن ۳)	سے کہیں بڑھ کر تھے،
اَلَمْ یَاْتِکُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ	کیا نوحؑ کی قوم اور عاد و ثمود کی اور جو انکے
قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ	بعد آئے جن کو خدا ہی جانتا ہے، انکی خبر

وَالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ۚ تمکو معلوم نہیں ہوئی؟

یہ تو وہ قومیں ہیں جن کا قرآن نے ذکر کیا ہے، انکے علاوہ دنیا کی تاریخ میں کتنی قوموں کے عروج وفنا کی داستانیں محفوظ ہیں، بابلی، اسیری، اکادی اور مصری قومیں جو کبھی رونے زمین پر کوس لمن الملک بجاتی تھیں، ہزارہا سال سے بے نشان ہیں، نارمن جیسے فاتح کیا ہوئے، یونانی اور رومی جو کبھی دنیا کے تنہا مالک بن گئے تھے، اب اُن کا کہیں وجود ہے؟ مجوس جو رومیوں کے مقابل صدیوں تک برسرپیکار رہے، اب اُن کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہیں، امریکہ کے قدیم باشندے جو کبھی اس براعظم کے مالک تھے، اب فنا کے قریب ہیں،

الغرض جس طرح افراد جی کر مرجاتے ہیں، جماعتیں وجود میں آکر مٹ جاتی ہیں، قومیں پیدا ہوکر فنا ہوجاتی ہیں، اسی طرح پوری دنیائے مخلوقات بھی ایک دن آئیگا، جب قانون الٰہی کے مطابق معدوم ہوجائے گی،

جس طرح عوام جو قوموں کی تاریخ سے واقف نہیں، صرف افراد کو جیتے اور مرتے دیکھتے ہیں، وہ گو افراد کی فنا کا یقین رکھتے ہیں، لیکن قوموں کی فنا کے مسئلہ کو نہیں سمجھ سکتے، اور اس میں شک کرتے ہیں، اسی طرح جن کی نظر دنیائے خلق کی تاریخ پر نہیں وہ اسکے فنا کے کامل پر اپنی جہالت اور نادانی سے اعتبار نہیں کرتے، حالانکہ ایک وہ دن آئیگا، جب پوری دنیا اپنے وجود کی صلاحیت سے معرا ہوکر فنا ہوجائیگی، کائنات کا یہ نظام بدل جائیگا، اس موجودہ عالم کا قانونِ طبعی ایک دوسرے قانونِ طبعی سے منسوخ ہوجائیگا اور جیسا کہ سائنس کہتا ہے اور قرآن نے نقشہ کھینچا ہے آفتاب و ماہتاب، ستارے اور تمام اجرام فلکی ٹکراکر چور چور ہوجائیں گے، اور پوری دنیا کی عمارت تہ و بالا

ہو کر نئی زمین اور نیا آسمان بنے گا،

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (ابراھیم۔۷)

جس دن یہ زمین اور زمین سے بدل جائیگی اور آسمان بھی، اور مخلوق اکیلے زبردست خدا کے سامنے نکل کھڑی ہوگی،

سورۂ ق میں قیامت پر استدلال ان ہی دلیلوں سے کیا گیا ہے،

قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيْدٌ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ

قسم ہے اس بڑی شان والے قرآن کی رجو مردہ دلوں کو زندہ کرتا ہے، ان کافروں کو عقلی انکار نہیں ہے بلکہ ان کو اس پر تعجب ہے کہ ان میں ایک آدمی انکو ان کو دوبارہ قیامت کا ڈر سناتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ تعجب کی بات ہے کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے (تو پھر زندہ ہونگے) یہ دوبارہ لوٹنا تو دور از عقل ہے، خدا کہتا ہے یہ تعجب کی کیا بات ہے ہم کو معلوم ہے کہ زمین ان (مردہ جسموں) میں جو کمی کرتی ہے اور ہمارے پاس محفوظ کتاب ہے، بلکہ بات یہ ہے کہ ان کافروں نے سچائی جھٹلا دی، جب وہ ان کے پاس آئی، پس وہ الجھی

تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ

باتوں میں پڑ گئے، کیا اُنھوں نے اپنے اوپر

وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا

آسمانوں کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اسکو کیسا

فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ، وَ

بنایا، اور کس طرح اسکو سجایا ہے کہ اسمیں کہیں

النَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ لا

سوراخ نہیں اور زمین کو پھیلایا ہے اور اسمیں

رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ط

پہاڑ کے لنگر ڈالے اور اسمیں قسم قسم کی رونق

كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ، كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ

کی چیزیں اُگائیں کہ ہر رجوع ہونے والے

قَوْمُ نُوْحٍ وَّاَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوْدُ

بندہ کو اس سے سوجھ ہو اور یاد آئے اور آسمان

عَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ لُوْطٍ وَّاَصْحٰبُ

سے برکت کا پانی برسایا پھر اُس سے باغ اور

الْاَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ ط كُلٌّ كَذَّبَ

کھیتوں کے اناج اُگائے اور کھجوروں کے لمبے

الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ

درخت جنکے خوشے اوپر تلے ہیں یہ بندوں کو روزی

الْاَوَّلِ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ

پہنچانے کے لئے ہے، اور اس پانی سے مردہ آبادی

خَلْقٍ جَدِيْدٍ،

کو ہم زندہ کرتے ہیں، اسیطرح (قبروں سے) نکلنا ہوگا

(ق - ۱)

اور کافروں سے پہلے نوحؑ کی قوم رسّ والوں اور ثمود

وعاد اور فرعون اور لوط کے بھائیوں نے اور جنگل

والوں نے اور تبع کی قوم نے اسکو جھٹلایا (ان میں سے)

ہر ایک نے پیغمبروں کو جھٹلایا، تو میری دھمکی پوری

اتری، کیا ہم پہلے پیدا کر کے تھک گئے جو دوبارہ

سورۂ قیامت میں بھی اسکا بیان ہے، اسکی آخری آیتیں یہ ہیں،

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی ط اَلَمْ یَکُ نُطْفَۃً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰی ا ثُمَّ کَانَ عَلَقَۃً فَخَلَقَ فَسَوّٰی ا فَجَعَلَ مِنْہُ الزَّوْجَیْنِ الذَّکَرَ وَالْاُنْثٰی ا اَلَیْسَ ذٰلِکَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یُّحْیِیَ الْمَوْتٰی ا (قیامہ - ۲)

کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ یونہی بیکار چھوڑ دیا جائیگا، کیا وہ پانی کی ایک ٹپکی ہوئی بوند نہ تھا، پھر وہ بندھا ہوا خون ہوا، پھر خدا نے اسکو بنایا اور اسکو ٹھیک کیا، پھر اسکو جوڑا کیا، یعنی نر اور مادہ کیا، کیا وہ خدا اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو دوبارہ جلائے؟

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا کُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِیْدًا ا اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَھُمْ (بنی اسرائیل - ۱۱)

اور وہ بولے کہ جب ہم ہڈی اور چورا ہو جائینگے تو کیا پھر نئے بنا کر اٹھائے جائیں گے؟ کیا یہ نہیں دیکھتے کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں کو اور زمین کو بنایا وہ ان لوگوں کے مثل کو (دوبارہ بھی) بنا سکتا ہے،

ایک اور جگہ فرمایا،

وَھُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُہٗ وَھُوَ اَھْوَنُ عَلَیْہِ (روم - ۳)

اور خدا وہی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے، پھر اسکو دوبارہ خلق کریگا، اور یہ (دوبارہ خلق کرنا) اسکے لئے آسان ہے،

اِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ

(لوگو!) اگر تمکو دوبارہ زندگی میں شک ہے تو

فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ (حج - ۱)

ہم تو (پہلے) تمکو (اسی مردہ) مٹی سے پیدا کرچکے ہیں (پھر دوبارہ کیوں نہیں پیدا کرسکتے)

قیامت کے متعلق تمام دور دراز اور طول طویل شکوک و شبہات کا کتنا مختصر جواب ہے،

قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ط (یٰسین - ۵)

وہ بولا کون ان سڑی گھلی ہڈیوں کو جلائیگا، کہدے وہی جس نے پہلی دفعہ ان کو بنایا۔

غرض وحیِ محمدیؐ نے ہر پہلو سے کفار کے اس استعجاب اور استبعاد کو دور کیا، اور ان کو دوبارہ زندگی کا یقین دلایا،

حشر جسمانی اس بحث پر لوگوں نے قیامت برپا کر رکھی ہے کہ یہ دوبارہ زندگی اسی گوشت و پوست کے ساتھ ہوگی، یا صرف روحانی ہوگی جہاں جسم و جسمانیت کا مطلق گذر نہ ہوگا، ؟ گو قرآن پاک کی مختلف آیتیں مختلف پہلوؤں کو پیش کرتی ہیں جنمیں اشارۃً ہر قسم کی باتیں آجاتی ہیں، تاہم قیامت کے متعلق اوپر کی آیتوں میں سے ایک ایک آیت پر غور کرو کفار کو تعجب ہے کہ کیا ہمارا یہ جسم مرکر پھر جئے گا، کیا ہماری ان سڑی گلی ہڈیوں میں دوبارہ جان پڑیگی اور ہم قبروں سے نکل کر پھر اٹھ کھڑے ہونگے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جسمانی زندگی کے علاوہ زندگی کا کوئی دوسرا مفہوم ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں تھا، مگر اسکے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم تعجب نہ کرو، اور انکار پر آمادہ نہ ہو کہ تمہارے یہ فنا شدہ جسم نہیں اٹھائے جائینگے اور نہ تمہاری ان بوسیدہ ہڈیوں میں روح پھونکی جائیگی، بلکہ وہ تو سراسر روحانی زندگی ہوگی

کیونکہ جب دوبارہ جسمانی زندگی کا تخیل اُن کیلئے ناقابلِ فہم تھا، تو خالص روحانی زندگی کا تخیل تو اور بھی اُنکے فہم سے بالاتر تھا اور اب بھی ہی کہ ہم اس مادی زندگی کے جاننے والے سرتاپا روحانی زندگی کے تصوّر سے بالکل عاجز ہیں، اسلئے مصلحتِ الٰہی اسی کی مقتضی تھی کہ وہ اصل واقعہ پر زور دے، کیسے اور کیوں سے تعرض نہ کرے، اور صاحب فہم کو اسکے فہم کے مطابق اس راز کو سمجھنے دے، چنانچہ قرآن پاک کے اس اسلوب بیان کو اگر سمجھنا ہے تو ان آیتوں پر غور کرنا چاہیے،

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ۭ بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ (سجدہ ۸-۱)

اور انھوں نے کہا کہ کیا جب ہم زمین میں کھو جائیں گے کیا ہم نئی پیدائش میں پھر ہونگے (خدا فرماتا ہے یہ کچھ نہیں بلکہ) یہ اپنے پروردگار کی ملاقات کے منکر ہیں،

غور کرو کہ ان کی مادی معدومیت کے بعد مادی پیدائش کے پُرتعجب انکار پر اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا کہ یہ شکوک و شبہات اسلئے اُن کو پیش آتے ہیں کہ مرنے کے بعد خدا کی ملاقات اور اس کے سامنے ہونے سے ان کو انکار ہے، اور حواشی کو چھوڑ کر اصل مقصود یہی ہے کہ موت کے بعد اور آخرت میں خدا کے سامنے ہونے پر یقین رکھا جائے، اس سے ان کو کیا مطلب کہ وہ کس طرح ہوگا؟ چنانچہ اس کے بعد ہی فرمایا،

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ (سجدہ ۱۱-۱)

جواب میں کہدے کہ ملک الموت جو تم پر متعین ہے وہ تمکو موت دیگا، پھر تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹا دیئے جاؤگے،

یہی ملاقات اور رجوع الی اللہ، اس عقیدۂ حشر کی اصلی روح ہے،

بات یہ ہے کہ ہم اُنہی باتوں کو سمجھ بوجھ سکتے ہیں، جنکی مثالیں اور نظیریں اس مادی دنیا میں ہماری نگاہوں سے گذرتی رہتی ہیں، اور وہ عالم جو نگاہوں سے مستور بلکہ تصور سے بھی دور ہے، اس کی باتوں کو اس طرح سمجھنا کہ ہر سوال اور تکرار سوال سے ہم بے نیاز ہو جائیں، تقریباً ناممکن ہے، اُن کے متعلق جو کچھ کیا جا سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس دیدہ شہرستانِ وجود یعنی دنیا کے قیاس پر اس نادیدہ شہرستانِ بقا یعنی آخرت کا ہر نقشہ اور خاکہ بتایا اور سمجھایا جائے اور یہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے کیا ہے

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ہر قسم کی قدرت پر یقین رکھتے ہیں، ان سے تو کچھ کہنا ہی نہیں لیکن جو شخص جسمانی حشر کا تصور اسلئے محال سمجھتا ہے، کہ عام انسانوں نے کسی مردہ جسم کو زندہ ہوتے نہیں دیکھا، تو اس کے نزدیک تنہا روحانی زندگی کا تخیل تو اور بھی زیادہ محال ہونا چاہیے کیونکہ کسی انسان نے آج تک کسی انسان کو روحانی وجود میں نہیں دیکھا ہے، بلکہ وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا ہے، وہ جب انسانی زندگی کا تصور کریگا تو جسم و شکل و اعضا کیساتھ ہی کریگا، ان سے مجرد ہو کر نہیں کریگا

موت جسم سے روح کی مفارقت کا نام ہے، اس لئے اگر یہ سچ ہے کہ قیامت میں نئی زندگی ملے گی تو ظاہر ہے کہ موت کے بعد کی کیفیت اور صورت سے کوئی الگ صورت اور کیفیت ہو گی، جس کا نام حیاتِ ثانیہ رکھا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ روح کا دوبارہ تعلق جسم کے ساتھ تسلیم کیا جائے، ورنہ غیر جسمانی زندگی تو قیامت کے پہلے بھی تھی، اب نئی بات کیا بڑھ گئی، جس کا نام حیاتِ ثانیہ رکھ دیا گیا

گو روح انسانی جسم کے اندر ہر فعل کی فاعل ہے، مگر فاعل کے فاعل بننے کے لئے آلات اور

اوزار کی بھی ضرورت ہوتی ہی جن کے بغیر وہ اپنے فعل کے بجالانے سے مجبور رہتا ہی، اسی طرح روح اپنے فعلِ لذت و الم کے انجام دینے کے لئے جسمانی آلات اور اوزار کی محتاج ہی کہ لذت و الم کا کوئی روحانی احساس، جسمانیت کے شائبہ سے مبرا ہو کر ہو ہی نہیں سکتا، اس بنا پر روح محض کا جنت کی لذتوں سے متمتع یا دوزخ کی تکلیفوں سے متالم ہونا، کسی جسمانی وساطت کے بغیر تصور میں نہیں آتا، خواب میں دیکھو کہ روح کو جو لذت یا تکلیف پہنچتی ہی، اس میں بھی جسمانی پیکر و ہیکل کی صورت نمودار ہوتی ہی

جسم وجسد

حشر جسمانی ماننے کے بعد یہ بحث بے سود ہے، کہ آیا وہی جسم دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائیگا، جس کے قالب میں وہ روح پہلے دنیا میں رہی تھی، یا کسی دوسرے نئے جسمانی پیکر میں وہ روح پھونکی جائیگی، یا یہ کہ آیندہ جسم اپنی مادیت اور ترکیب میں اسی دنیاوی جسم کے مماثل ہوگا چیکہ یہ حقیقت ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے، کہ اعمال کی ذمہ داری روح پر ہے، جسم پر نہیں، اور اسی طرح جزا و سزا کی راحت و تکلیف کا اصلی مورد روح ہے جسم نہیں تو پھر اب وہ کسی قالب میں بھی ہو اور کسی رنگ میں بھی ہو، روح پر مواخذہ، اور ثواب و عذاب کی لذت و الم کا احساس یکساں ہوگا، البتہ یہ ضروری ہے کہ جو جسم ہمکو دوسری دنیا میں ملے گا، اسکی خصوصیات و لوازم اس خاکی جسم کے خصوصیات و لوازم سے بالکل الگ ہونگے، چنانچہ خود ہمارے تخیل اور تصور اور نیز خواب و رویا میں جو جسم ہمکو نظر آتا ہے، وہ جسم ہو کر نظر آنے کے باوجود مادی جسمانیت سے سراسر پاک ہوتا ہے، اسلئے فقط جسم کے بولنے سے ان ہی خصوصیات کا جسم سمجھ لینا ضروری نہیں ہے، اور نہ اس جسم پر قیاس کر کے اس جسم پر اشکالات وارد کئے جا سکتے ہیں،

خلق جدید

چنانچہ جو جسم قیامت میں عنایت ہوگا، وہ نئی خلقت اور نئی آفرینش کا مرہون ہوگا،

اسی لئے قرآن نے منکروں کے جواب میں یہ کہا ہے کہ،

بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ (قٓ) — بلکہ یہ لوگ نئی آفرینش سے شک میں ہیں

منکرین کی زبان سے کہلوایا،

ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا (اسراء۔۵) — کیا ہم درحقیقت نئی آفرینش کرکے اٹھائے جائیں گے

ایک دوسری سورہ میں یہ تلقین ہے،

اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ، (سبا۔۱) — بیشک تم ایک نئی آفرینش میں ہونے والے ہو

پھر تمثیل دیکر فرمایا،

كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ (انبیاء۔۷) — جس طرح ہم نے پہلی پیدائش کا آغاز کیا اسی طرح ہم اس کو دوبارہ بنائیں گے

اسی لئے اُس عالم کی اس نئی خلقت و پیدائش والے جسم کو بعینہٖ اسی جسم کے مطابق سمجھنا صحیح نہیں ہے، اور نہ اس خاکی جسم کے تمام خصوصیات کا بعینہٖ اس جسم میں ہونا ضروری ہے، اسکو اگر اس عالم کے لفظ "جسم" سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اس لئے کہ ہماری زبان میں روح کے غلاف و قالب کیلئے "جسم" سے بہتر، قریب تر، اور مشابہ تر کوئی دوسرا لفظ نہیں،

یہ بات کہ حشر میں بعینہٖ گذشتہ گوشت و پوست کا ہونا اسلئے ضروری سمجھا جائے کہ وہ بھی عذاب و ثواب میں شریک ہوں، تصریح قرآنی پر اضافہ ہے، قرآن میں تو یہ تصریح ہے کہ

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ؕ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ — بے شبہہ جو لوگ ہماری آیتوں کے منکر ہوئے ہم انکو آگ میں ڈالیں گے، جب جب ان کی

جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ط — کھالیں یک جائیں گی ہم ان کو اور کھالیں
إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا (نساء ۸-۱۰) — دینگے جو پہلی کھالوں کی غیر ہونگی تاکہ وہ عذاب چکھیں

جب کھالیں یکے بعد دیگرے بدلتی جائیں گی، تو پہلا حصۂ جسم جو گناہ میں شریک تھا، کہاں باقی رہا؟ اسی طرح یہ تصریح ہے کہ انسان کے ہاتھ پاؤں اور کھالیں اسکے اعمال پر شہادت دیں گی،

اس سے معلوم ہوا وہ اصلی مجرم جو ان اعمال کا ذمہ دار اور اس مقدمہ کا مدعا علیہ ہی ان جسمانی اعضاء کے علاوہ ہے، اور وہ روحِ انسانی ہے،

ذمہ داری روح پر ہے یہی سبب ہے کہ موت وحیات، عذاب وثواب اور اعمال کے مواخذہ کا اسلام نے جس سے تعلق بتایا ہے، وہ نفس یعنی روح ہے،

اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى — تو (قیامت میں) کوئی نفس یہ کہنے لگے کہ ہائے
مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ (زمر ۷-۲) — افسوس اس پر کہ میں نے اللہ کے پہلو میں کمی کی،
وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ — اور چاہیے کہ ہر نفس دیکھے کہ اس نے کل (قیامت)
(حشر ۱۸-۳) — کے لیے کیا آگے بھیجا،
عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ (تکویر ۱۴-۱) — (اس دن) ہر نفس جان لیگا جو اس نے حاضر کیا،
عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ — (اس دن) ہر نفس جان لیگا جو اس نے آگے بھیجا
(انفطار ۵-۱) — اور پیچھے چھوڑا،
فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا (انبیاء ۴۷-۲) — (تو اس دن) کسی نفس پر کوئی ظلم نہ ہوگا

جنت کی نسبت ہے،

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ — کوئی نفس نہیں جانتا کہ ان کیلئے (جنت میں)
مِن قُرَّةِ أَعْيُنٍ ۔ (سجدہ ۱۷-۲) — کیا آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے

ان آیتوں میں دیکھو کہ عمل کی ذمہ داری اور اس کے اچھے اور برے نتیجوں کا بار جسم پر نہیں بلکہ روح اور نفس پر ڈالا گیا ہے، اور اسی کو تکلیف و لذت سے آشنا کیا گیا ہے، جنت میں داخلہ کی خوشخبری بھی اسی کو دی گئی ہے،

فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي — اے مطمئن روح! میرے بندوں میں شامل
جَنَّتِي، (فجر ۲۷-۱) — اور میری جنت میں داخل ہو جا،

دنیاوی جسم بدلتے رہنے پر بھی وہی جسم رہتا ہے

غرض اعمال اور ان کے نتائج کی اصل ذمہ دار اور جنت و دوزخ کی لذت و الم کی اصل احساس کرنے والی ہستی صرف روح ہے، اور جسم کی حیثیت صرف ایک لباس و آلۂ احساس کی ہے، اس سے زیادہ اسکی کوئی حیثیت نہیں یہ جسم لاکھ بار بدلے، مگر روح اگر وہی ہے تو وہ انسان وہی ہے، اور اسی کو اپنی ذمہ داری کی جزا و سزا مل رہی ہے،

لوگ اپنی ظاہر بینی سے اصل زور جسم پر دیتے ہیں، حالانکہ اس مٹی کے ڈھیر میں اگر روح کا خزانہ چھپا نہ ہو تو پھر اس مشتِ خاک میں دھرا کیا ہے، دیکھو انسان بچپن سے لیکر بڑھاپے تک وہی ایک شخص ہے، جو پہلے تھا، حالانکہ اس کی جسمانی ہیئت اور اس کے جسم کا مادہ ہر آن اور ہر لمحہ فنا ہو کر بدلتا رہتا ہے، بیماریوں میں وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا، پھر تندرستی کے بعد نئے ذرات داخل ہو کر لہلہائے، تم غلطی سے یہ سمجھتے ہو کہ ہر حال میں وہی جسم یکساں طور پر قائم ہے،

حالانکہ حکیم سے پوچھو تو وہ بتائیگا کہ اس کے ذرّے کیونکر ہر آن جھڑتے اور گھٹتے رہے، اور جو خوراک وہ کھاتا رہا وہ خون ہوکر کیونکر بدل ماتحلل بنی اُن کی جگہ لیتی رہی، پھر کیا ایسے ہر آن فنا ہوتے رہنے والے اور چند سال کے بعد بالکل بدل جانے والے کو دائم الوجود اعمال کا ذمہ دار اور ان کے نیک و بد کی اصلی جزا یا سزا پانے کا مستحق ٹھہرایا جا سکتا ہے، لیکن جس طرح دنیا میں اگر کوئی مجرم آج بھاگ گیا اور چند سال کے بعد پکڑ کر جب لایا گیا تو یہ عذر نہیں کر سکتا کہ چونکہ وہ ہاتھ جس سے اس نے چوری کی تھی اور وہ پاؤں جن سے وہ مال لیکر بھاگا تھا، اس عرصۂ دراز میں بدل گئے ہیں، اسلئے وہ لائق تعزیر نہیں، کیونکہ وہ روح جس نے اپنے ارادہ و نیت سے اس کام کو اس کے ہاتھوں اور پاؤں کے ذریعہ کرایا تھا جس طرح کل تھی، بعینہٖ آج بھی ہے، اور جو تکلیف اسکو اپنے پہلے جسم کے ذریعہ کل پہنچ سکتی تھی، بعینہٖ آج بھی پہنچ سکتی ہے اور اس جسمانی تغیر سے اسکی روحانی شخصیت میں اصلاً کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا، اسلئے پہلے ہی جسم کے ضروری ہونے پر زور دینا بے سود ہے، اسی سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ جسم اگر بدل بھی جائے تو اعضا کی شہادت کا مسئلہ اپنی جگہ پر صحیح ہوگا، جسم کے اعضا دنیا میں بدلتے جاتے ہیں، مگر جو بیماری اگلے اجزا میں پیدا ہو گئی تھی، وہ ان کے فنا ہو جانے کے بعد بھی قائم رہتی ہے. مٹ نہیں جاتی، بلکہ وہی ان کے بعد کے آنے والے اجزا میں برابر سرایت کرتی رہتی ہے،

اخروی جسم کیسا ہوگا

روحوں کو آخرت میں جو جسم ملیں گے وہ حقیقت میں اُنکے اعمال ہی کے ظل و عکس ہونگے، یعنی جیسے اعمال ہونگے، ویسے ہی ان کو جسم عنایت ہونگے، چنانچہ اسی دنیا کے جسمانی رنگ کے لحاظ سے خواہ کوئی کالا ہو یا گورا، مگر اس دنیا میں اس کا یہ کالا پن اور گورا پن اعمال

کی سیاہی وسپیدی کی صورت میں بدل جائیگا، خدا نے فرمایا۔

وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ مُسْفِرَةٌ ضَاحِكَةٌ	کتنے چہرے اُس دن روشن ہنستے اور شاد ہونگے
مُسْتَبْشِرَةٌ وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا	اور کتنے چہروں پر اس دن کدورت ہوگی
غَبَرَةٌ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ (عبس-۱)	اور ان پر سیاہی چھائی ہوگی؛
يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ج	جس دن کتنے چہرے سپید ہونگے اور کتنے کالے
فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ	لیکن جن کے چہرے کالے ہوئے، کیا تم وہ ہو جو
أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا	ایمان کے بعد پھر کافر ہو گئے تھے تو اپنے کفر کرنے کے
الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ وَأَمَّا	بدلہ عذاب کا مزہ چکھو، اور جن کے چہرے سپید
الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ	ہوئے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہونگے اسی میں
اللّٰهِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (آل عمران-۱۱)	سدا رہیں گے،

صحیح حدیثوں میں ہے کہ جنت میں سب لوگ جوان بنکر داخل ہونگے، اور جسم پر کبھی بڑھاپا نہیں آئیگا، ان کا قد حضرت آدمؑ کے اوّلین بہشتی قد کے مطابق ہوگا، دوزخیوں میں سے کسی کا سر پہاڑ کے برابر ہوگا، کسی کا ایک پہلو مفلوج ہوگا، کسی کے ہونٹ لٹکے ہونگے، دل کے اندھے آنکھوں کے اندھے بنکر اٹھیں گے، سزاؤں کے بعد جب ان کے جسم چور چور ہو جائیں گے تو پھر صحیح وسالم نئے جسم نمودار ہونگے اور پھر اُن کی وہی کیفیت ہوگی، یہ بھی آیا ہے کہ، اپنے کو بڑا سمجھنے والے، وہ چیونٹی بن کر قیامت میں اٹھیں گے، ان تمام شواہد سے ہویدا ہے کہ اس دنیا کے جسمانی قالب ہمارے اس دنیاوی جسم کے مطابق نہیں بلکہ ہمارے دنیاوی اعمال کے مطابق ہونگے؛

جزا و سزا

"یوم آخر" یا "یوم دین" پر ایمان لانے سے اسلام کا حقیقی منشا یہ ہے کہ لوگ اس کا یقین کریں کہ اُن کے ہر عمل کا بدلہ ہے، کچھ اس دنیا میں، اور پورا دوسری دنیا میں، اسی کا نام جزا و سزا ہے، دنیا کے دوسرے مذاہب بھی اس مسئلہ میں اسلام کے ہمنوا ہیں۔

جزا و سزا دیگر مذاہب میں درحقیقت مذاہب کا حقیقی تعلق اسی عقیدہ سے ہے کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے، اور اچھا یا بُرا جیسا کام اس سے صادر ہوتا ہے، اسکے مطابق اچھا یا بُرا معاوضہ اسکو دوسری دنیا میں ضرور ملے گا، اس عقیدہ کا نشان مصر و بابل جیسی دنیا کی قدیم قوموں میں بھی ملتا ہے، ہندوستان کے مذاہب میں اس دوسری دنیا کو دوسرے جنم سے تعبیر کیا گیا ہے، انکا خیال یہ ہے کہ انسان جب مرتا ہے تو اس کے اچھے یا بُرے کاموں کے مطابق اسکی روح کسی جانور یا گھاس پھوس یا درخت کے قالب میں جاکر اپنے عمل کا نتیجہ بھگتتی ہے، اور پھر انسانوں کے قالب میں لائی جاتی ہے، اور کام کرتی ہے، اس کے بعد جس کے گناہ زیادہ ہوتے ہیں اس کو یم لوک میں جانا پڑتا ہے، جہاں نرک (دوزخ) ہیں، وہاں وہ ہر قسم کی سزا بھگتتی ہے، بعد ازیں اپنے بعض اچھے کاموں کی بدولت چندر لوک (چاند کی دنیا) میں جاتی ہے، جس روح کے کچھ کام اب بھی باقی ہیں وہ

اس دنیا میں ہوا، بادل اور بارش کے ذریعہ سے دوبارہ آتی ہے، اور اپنے کام کے مطابق حیوانات یا نباتات کے روپ میں سزا پاتی ہے، اور پھر چھوٹ کر انسان بنتی ہے، یہانتک کہ اسکے کام اتنے اچھے ہو جائیں کہ وہ سزا کے قابل نہ رہ جائے، اس وقت وہ مادی قابلوں کی قید سے نجات پاکر سورج لوک اور چندر لوک وغیرہ اجرام سماوی کی دنیاؤں میں جاکر آرام کرتی ہے، اور پھر اپنے علم و عمل کی کسی کمی کے سبب سے بادل ہوا، اناج یا کسی دوسری مخلوقات کے قالب میں ہوکر اس کو اس دنیا میں پھر آنا پڑتا ہے، اور پھر وہی عمل شروع ہوتا ہے، یعنی وہ نئے نئے جنموں میں سزا بھگتتی ہے، اور اس وقت تک آمد و رفت اور آواگون کے چکروں میں پھنسی رہتی ہے، جب تک اس سے اچھے یا برے کاموں کا صدور ہوتا رہتا ہے، اس لئے کامل اور دائمی نجات کی صورت یہ ہے کہ انسان سے اچھا یا برا کوئی کام صادر نہ ہو، یہی ترکِ عمل روح کو مادہ کی قید سے آزاد کر کے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا (موکش) دلاتا ہے، یہانتک کہ یہ موجودہ مادی دنیا پرلے (قیامت) کے بعد پھر جب نئے سرے سے بنے گی تو پھر وہی عمل اور سزا یعنی آواگون کا چکر شروع ہوگا، اور پھر اسی طرح چھٹکارا پائے گی، اور پھر دوسری پرلے کے بعد نیا دور اسی طرح شروع ہوگا یہ چکر اسی طرح ہمیشہ رہے گا،

یہ وہ چکر ہے جس سے انسان کو کبھی نکلنا نصیب نہ ہوگا، الّا یہ کہ ہمالہ کی چوٹی یا غار میں بیٹھکر ترکِ عمل کے ذریعہ سے خود اپنے وجود سے ہاتھ دھویا جائے، لیکن اگر اس اصول نجات پر دنیا عمل کرے تو یہ بہارستان دم کے دم میں خارستان بنجائے، ہر قسم کا کاروبار بند ہوکر دنیا آپ سے آپ فنا کے قریب آجائے، بدی کے ساتھ نیکی کا وجود بھی صفحۂ ہستی سے مٹ جائے،

اور با ایمہ دائمی و ابدی نجات میسر نہ ہو، کیونکہ ہر پرلے کے بعد وہی جنم، اور کرم اور آواگون پھر شروع ہوتا ہے[1]،

لیکن دنیا کے دوسرے مذاہب نے اس چکر اور بے عملی سے انسان کو نجات دلائی ہے، انھوں نے موجودہ دنیا کے بعد ایک ہی دنیا اور تسلیم کی ہے، جسمیں لوگوں کو اچھے اور بُرے اعمال کی پوری پوری جزا ملے گی، مختلف زردشتی فرقوں نے آریہ نسل ہونے کے باوجود ہندوؤں کے تناسخ کے بجائے مختلف سامی مذاہب کے خیالات کی نقالی کی ہے اور خصوصاً بعد والوں نے اسلام کے عقائد کو "ارداے ویراف" کے عجیب و غریب مشاہدات کا رنگ دیکر اور اسکی کتاب کو اسلام سے بھی پہلے کی قرار دیکر تمام تر قبول کر لیا ہے[2]،

صحیفۂ ابراہیم یعنی سفر تکوین میں دنیا کی محنت و مشقت اٹھانے کے بعد پھر جنت میں داخلہ کا اشارہ ہے، (تکوین ۲- 19) علیٰ ہذا حضرت موسیٰ کے صحیفوں میں اُخروی جزا و سزا کے اصول مذکور ہیں، نیکوکاروں کے لئے ایک "ستھری آبادی" کا ذکر ہے جسمیں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں، بدکاروں کے لئے ہلاکت، بربادی اور دردناک عذابوں کی خبر ہے، مگر مترجموں نے ہر جگہ اسکو دنیاوی ثواب و عذاب بلکہ ارض موعودہ کی ظاہری سلطنت کے معنوں میں دکھایا ہے، حالانکہ بعض مقامات میں یہ بے جوڑ سی بات ہو کر رہ گئی ہے، حضرت آدمؑ کی جنت عدن اور اس کے چار دریاؤں کا ذکر تکوین کے دوسرے باب میں ہے، علاوہ ازیں تورات میں موت کے بعد کی زندگی

---

[1] تناسخ کے رد میں الندوہ مئی و جون سنہ ۱۹۰۶ء میں ایک مضمون ہے، [2] دبستان المذاہب کا مصنف جو زردشتی مذہب سے پوری واقفیت رکھتا تھا، اس نے اپنی کتاب میں اسکی پوری تفصیل درج کی ہے،

کی تصریح ملتی ہے، حضرت ابراہیمؑ (پیدایش ۲۵-۸) اور یعقوب علیہما السّلام (پیدایش ۴۹-۳۳) کی موت کی تعبیر ان لفظوں میں کی گئی ہے کہ "جاں بحق ہوا اور وہ اپنے لوگوں میں جا ملا"۔ ہمیشہ کی بھلائی (استثنا ۶-۲۴) کا بھی تذکرہ ہے، اور جہنم کی "آگ" (استثنا ۳۲-۲۲) کا بھی بیان ہے اور ہر ایک کو اسکے عمل کا بدلہ دیئے جانے کی بھی تصریح ہے، (یرمیاہ ۱-۱۱) روح کی بقا اور آسمان پر چڑھنے کی تعلیم بھی اُن صحیفوں میں موجود ہے (واعظ ۳-۲۱) مرنے کے بعد روح کے خدا کے پاس واپس پھر جانے کا بھی تذکرہ ہے، (واعظ ۱۲-۷) اور انسان کے اپنے ابدی مکان میں جانے کی بھی تصریح ہے، آخر میں ہی خدا سے ڈر اور اس کے حکموں کو مان کہ انسان کا فرض کلی یہی ہے، کیونکہ خدا ہر ایک فعل کو ہر ایک پوشیدہ چیز کے ساتھ خواہ بھلی ہو خواہ بُری عدالت میں لائیگا" (واعظ ۱۲-۱۳-۱۴) زبور میں خدا کی عدالت کے دن کی تصریحات بار بار ہیں، امثال سلیمانی میں ہے کہ "انسان کی راہیں خداوند کی آنکھوں کے سامنے ہیں، اور وہ اس کی ساری روشوں کو جانچتا ہے، شریر کی بدکاریاں اسکو پکڑ لیں گی، اور وہ اپنے ہی گناہوں کی رسیوں سے جکڑ جائیگا، وہ بے تربیت پائے مر جائیگا اور اپنی حماقت کی شدت میں بھٹکتا پھریگا" (۵-۲۱) دانیال میں ہے کہ "اس وقت تیرے جو زمین میں خاک پر سو رہے ہیں، جاگ اٹھیں گے، بعضے حیاتِ ابدی کے لئے اور بعضے رسوائی اور ذلت کے لئے" (۱۲-۲) حزقیال (۲۸) میں جنت کی طلائی اور جواہرات کی بنی ہوئی عمارتوں کے اشارات ہیں،

حضرت مسیحؑ سے پہلے یہودیوں میں صدوقی نام ایک فرقہ پیدا ہوا جس نے حکمران یونانیوں کا تقرب حاصل کرنے کے لئے اِن کی بعض باتیں قبول کر کے یہودی تعلیم میں شامل کیں۔ منجملہ اُن کے

وہ قیامت اور حیاتِ اخروی کا بھی منکر ہوا، مگر اسکے مقابل کا دوسرا فرقہ جس نے اپنے کو فریسی (علٰحدہ رہنے والا) کہا، اپنے پرانے عقیدوں پر قائم رہا، اور قیامت، حیاتِ اخروی اور جنت و دوزخ کے عقائد کو بدستور مانتا رہا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں فریسی یہی اعتقاد رکھتے تھے کہ جنت مادی ہوگی، اور وہاں بہشتیوں کو ان کی بیویاں واپس ملیں گی (مرقس ۱۲: ۲۴) یہودیوں کی پچھلی کتابوں میں جزا و سزا کی تفصیل موجود ہے، چنانچہ اسلام کے زمانہ میں بھی عرب کے یہودی اس پر ایمان رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ یہود کیسے ہی گنہگار ہوں، مگر چند روز سے زیادہ دوزخ میں نہیں رہیں گے، (البقرہ - ۸ و آل عمران - ۱۳) یہ چند روز باختلافِ روایت تین روز[1] چالیس روز یا گیارہ[2] مہینے ہیں.

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد میں یہودیوں کے ان دونوں فرقوں کے درمیان سخت اختلافات برپا تھے، اور دونوں ایک دوسرے کی تردید و ابطال میں مصروف تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آکر صدوقیوں کے اس عقیدے کی تردید کی[3] قیامت اور جزا و سزا پر ایمان لانے کی تعلیم دی، حضرت عیسیٰؑ کے ایک حواری یوحنا نے اپنے مکاشفہ میں جنت اور دوزخ کی یہودی تصویر کھینچی،

حضرت عیسیٰؑ کے اس جواب سے جو انھوں نے ایک صدوقی کے سوال کا دیا کہ "اس دنیا میں لوگ شادی اور بیاہ نہیں کریں گے، بلکہ فرشتوں کے مانند رہیں گے" ایسا سمجھا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے جنت کو صرف روحانی وجود بخشا ہے، مگر درحقیقت ایسا نہیں ہے حضرت عیسیٰؑ اپنی

---

[1] کتب سیر میں ان آیتوں کی تفسیر دیکھو [2] سیل کا ترجمۂ قرآن حاشیۂ زیر ترجمۂ آیت بقرہ رکوع ۸،

زندگی کی آخری شب میں اپنے شاگردوں کے ساتھ بیٹھ کر جب انگور کا افشردہ پیتے ہیں، تو کہتے ہیں:۔

"میں تم سے کہتا ہوں کہ انگور کے پھل کا رس پھر نہ پیونگا، اس دن تک کہ تمہارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہت میں نیا نہ پیوں۔" (متی ۲۶-۲۹)

وہ یہودی علماء کو خطاب کر کے فرماتے ہیں:۔

"اے سانپو! اور اے سانپوں کے بچو! تم جہنم کے عذاب سے کیونکر بھاگو گے" (متی ۲۳-۳۳)

اپنے ایک وعظ میں دوزخ کا منظر دکھاتے ہیں اور فرماتے ہیں:۔

"اس نے دوزخ کے درمیان عذاب میں ہو کے اپنی آنکھیں اُٹھائیں، اور ابرہام (حضرت ابراہیمؑ) کو دور سے دیکھا اور اس کی گود میں لعزر کو۔ اس نے پکار کے کہا کہ اے باپ ابرہام! مجھ پر رحم کر اور لعزر کو بھیج کہ اپنی انگلی کا سرا پانی سے بھگو کر میری زبان ٹھنڈی کرے، کیونکہ میں اس لو میں تڑپتا ہوں۔" (لوقا ۱۶-۲۳)

مکاشفات یوحنا میں دوزخ کو آگ اور گندھک کہا گیا ہے (۱۴-۱۰) اور متی کی انجیل میں اس کے دروازے بھی بتائے گئے ہیں، (متی ۱۶-۱۸) اسی طرح جنت اور اسکی طلائی جواہراتی تعمیر اور نہر آب حیات کا ذکر مکاشفات کے اکیسویں باب میں ہے، اور وہاں کے انگوری افشردہ کا بیان متی میں ہے (۲۶-۲۹)، وہاں کے آب سرد کا ذکر بھی انجیل میں آتا ہے، (لوقا ۱۶-۲۳)

اسی طرح ہر ایک کے عمل کا حساب لئے جانے اور عمل کے مطابق بدلہ لینے کا ذکر بھی حواریوں کے خطوط میں موجود ہے،

"مبارک وہ مرد ہے جس کے گناہوں کا حساب خداوند نہ لیگا۔" (رومیوں ۴-۸)

"سو ہر ایک ہم میں سے خدا کو اپنا حساب آپ دیگا" (رومیوں ۱۴-۱۱)
لیکن وے اس کو جو زندوں اور مردوں کا انصاف کرنے پر تیار ہے، حساب دینگے"
(۱ پطرس ۴-۵)

اس باب میں اسلام کا تکمیلی پہلو یہ ہے کہ اُس نے اس عقیدہ کو نہ صرف پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہی کیا بلکہ اُس کے تمام ضروری اجزا فراہم کئے، گذشتہ مذاہب کے تشنہ بیانات پر سیر حاصل بحثیں کیں، اُن کے نقائص کی تکمیل کی، اور جزا و سزا کے اصول اس صفائی سے بیان کئے کہ اس عقیدہ کا ہر پہلو شکوک و شبہات سے پاک ہوگیا،

آئندہ مباحث کے سمجھنے کیلئے پہلے چند اصول ذہن نشین کر لینے چاہئیں،

عالم آخرت کا فہم و ادراک

اس عالم آخر میں، جو کچھ ہوگا وہ اگرچہ ہمارے اس زیر تجربہ دنیا سے بالکل الگ ہوگا، تاہم چونکہ انسانی فہم کی مجبوری کی وجہ سے وہ اسی زبان و محاورات میں ادا کیا گیا ہے جو اس مادی عالم کے ساتھ مخصوص ہیں، اسلئے یہ الفاظ جن مادی خصائص کو مستلزم ہیں، ہم ان کے دیکھنے اور سننے کے اس دنیا میں عادی ہوگئے ہیں، ان لفظوں کو سنکر بعینہٖ وہی سمجھنا چاہتے ہیں جو اس دنیا میں اُن لفظوں سے سمجھتے رہے ہیں، اسی سبب سے بعض کم فہم وہاں کے وقائع و احوال کا بیان سنکر اُن میں سے بعض کو محال اور ناممکن کہہ اٹھتے ہیں، اور بعضے اُن کی تشریح و تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ لفظ و معنی میں ادنیٰ اشتراک بھی باقی نہیں رہتا یہ دونوں راستے سخت خطرناک ہیں، اسی لئے وحی محمدی نے ان نازک و دقیق اسرار کے بیان میں انسانی فطرت کی کمزوریوں کا پورا لحاظ کیا ہے، اس نے نہ تو یہودیوں کی طرح ان واقعات

کو سرتاپا مادی کہہ کر عالمِ آخرت کو بھی عالمِ آب وگل بنا دیا ہے، اور نہ عقل وخرد کے بعض نادان مدعیوں کی طرح اُن کو مادہ سے اتنا بلند وبرتر کر دیا ہے، کہ اُن کا وجود ہی موہوم وفرضی ہو گیا ہے، بلکہ انسانی عقلوں کے اختلافِ مراتب کا لحاظ کر کے بزم کے اہلِ نظر اور تماشائیوں دونوں کی تشفی وتسکین کا سامان مہیم پہنچایا ہے،

ان اُخروی وقائع کے مختلف مفہوموں اور مصداقوں کا لحاظ کر کے وحیِ محمدیؐ نے ایسے جچے تُلے الفاظ اختیار کئے ہیں جن سے ایک فلسفی بھی بہرہ یاب ہو سکتا ہے، اور ایک عامی بھی، اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے ایمان کا لطف اُٹھا سکتے ہیں، اور ایک ایسے مذہب کیلئے جو سارے انسانی طبقوں کو اپنا مخاطب بنانے کا دعویٰ کرتا ہے، ایسی ہی وسعت کی ضرورت تھی، تاکہ وہ سب کے لئے اپنی اپنی جگہ پر تشفی کا باعث ہو سکے، ان تمام اخروی واقعات کو جن الفاظ میں بیان کیا ہے، وہ ظاہر ہے کہ طبعاً وہی الفاظ ہو سکتے ہیں، جن کے چاروں طرف اس دنیا کا مادی ماحول، مادی مفہوم ومصداق اور جسمانی تخیلات لپٹے ہوئے ہیں، ان لفظوں کے سننے کے ساتھ جو مفہوم ہمارے ذہن میں آتا ہے، وہ سرتاپا انہی مادی قیود ولوازم کے ساتھ آتا ہے، ہم جب "آگ" کا لفظ سنتے ہیں تو معاً اس دنیاوی آگ کا مفہوم ذہن میں آتا ہے، جس کو ہم یہاں دیکھتے ہیں، جو انسانوں، درختوں اور ہر اُس چیز کو جو اسکے اندر ہوتی ہے بلا تمیز یکساں جلا دیتی ہے، مگر اُخروی آگ ایسی نہ ہوگی، اس کے اندر بعض درخت ہونگے جو نہیں جلیں گے، وہ صرف گنہگار انسانوں کو جلائیگی، کسی کے پاؤں کو چھوئیگی، کسی کی کمر تک آئیگی، کسی کے گلے تک پہنچے گی، اور وہ ایسی تیز وگرم ہوگی کہ یہ دنیاوی آگ اُسکے مقابلہ میں ٹھنڈی

"وزن" کا لفظ سننے کے ساتھ اس عالم میں تولنے کی ساری خصوصیتیں ہمارے سامنے آجاتی ہیں ترازو، پاسنگ، پلے، ڈنڈی اور تولی جانے والی چیزیں جسمیت اور ثقل کا ہونا، اسی طرح نامۂ عمل کے لکھنے کا مفہوم جب ہم سمجھنا چاہیں تو کاتب کی انگلیاں، قلم، دوات، سیاہی، کاغذ اور حروف کی ساری قیدیں ہمارے ذہن میں آئیں گی، اس بنا پر ان الفاظ کے لغوی معنی اور انکے قریب الفہم مجازی معنوں کے سمجھنے میں اختلافِ آراء کی بڑی گنجائش ہے، اسلئے حق تو یہ ہے کہ ان پر بلا مزید تشریح اسطرح ایمان لایا جائے کہ ہماری تشریح سے اُنکے الفاظ کے مفہوم کی وسعت تنگ نہ ہو جائے، یہاں ہم ان لوگوں کو بھی دائرہ سے خارج نہ کیا جائے، جو ان الفاظ سے وہ مفہوم سمجھ کر تسلی پا جانا چاہتے ہیں، جن کے وہ الفاظ متحمل ہو سکتے ہیں کہ اگر مرادِ الٰہی یہی تنگی ہوتی تو اللہ تعالیٰ انسانی عقول کے اختلافِ مراتب کا لحاظ کئے بغیر اپنے مفہوم کو اس وسعت کے بجائے تنگ سے تنگ الفاظ میں ظاہر فرما سکتا تھا، مگر ایسا نہیں کیا تاکہ اسلام مختلف العقول انسانوں کے لئے عالمگیر ثابت ہو سکے،

ایک دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ عالمِ آخرت کے وقائع اور حالات کے سمجھنے میں اشکالات و اعتراضات اسلئے پیش آتے ہیں کہ ہم وجود اور اُس کے موجودہ تمام قوانینِ فطرت کو اس طرح لازم ملزوم سمجھتے ہیں، کہ جب کسی شے کے وجود کا تذکرہ کیا جائے گا، تو معاً اسکے وہی خصوصیات و لوازم سامنے آئیں گے، جن کے دیکھنے کے ہم اس دنیا میں عادی ہیں، حالانکہ اربابِ عقل نے یہ طے کر دیا ہے، کہ اس موجودہ دنیا کے معلولات و مسببات اور ان کے موجودہ علل و اسباب میں جو لزوم ہے، وہ محض عادی ہے، یعنی اسلئے ایسا ہے کہ ہم ایسا دیکھتے ہیں یہ نہیں کہ اسلئے ایسا ہی ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہیئے،

اس بنا پر اگر صرف اتنی سی بات ذہن نشین کر لیجائے کہ موجودہ مادی دنیا میں جو قوانین فطرت اور علل و اسباب اور اُنکے نتائج کارفرما ہیں، وہ صرف اسی عالم اور موجودہ دنیا کے قوانین ہیں، اگر خدائے تعالیٰ کوئی نئی دنیا بنائے، یا نیا عالم خلق کرے، تو ضروری نہیں کہ یہی موجودہ قوانین فطرت وہاں بھی کارفرما ہوں، بلکہ بالکل ممکن ہے کہ اس نئے عالم میں نئے قوانین پر عمل ہو، نئی خصوصیات کے جسم ہوں، نئی قسم کی زندگیاں ہوں، نئی قسم کی آگ ہو، نئی قسم کے باغ اور پھل ہوں، نئی قسم کے موجودات و مخلوقات ہوں، نئے علل و اسباب ہوں اور نئے قوانین فطرت ہوں، وحیِ محمدیؐ نے اسی نئے عالم کے متعلق کہا ہے:-

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ — جس دن یہ نئی زمین سے بدل جائیگی

وَالسَّمٰوٰتُ (ابراہیم ۷) — اور آسمان (نئے آسمانوں سے)

اب کون کہہ سکتا ہے کہ اس نئی زمین اور نئے آسمان میں بھی وہی مادی قانون جاری ہونگے، جو اس موجودہ زمین و آسمان میں جاری ہیں، اس بنا پر جسمانیت و مادیت کے وہ تمام اعتراضات اور آئندہ حیات کے متعلق وہ تمام اشکالات جو اس دنیا اور اُس کے قوانین کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں، بالکل بے بنیاد اور بے حقیقت ہیں،

اس ضروری تمہید کے بعد جزا و سزا کی اسلامی تشریحات کی جانب قدم اٹھایا جاتا ہے، وَهُوَ الهادی الی الصواب،

اصول جزا: اللہ تعالیٰ نے جس طرح موجودہ عالم کو اپنے خاص نظام اور قانون پر بنایا ہے، جس کو اہلِ فلسفہ قانونِ قدرت اور اہلِ مذہب تقدیر اور اندازۂ الٰہی کہتے ہیں، اسی طرح اُس نے

اپنے ہر عالم کے لئے ایک نظام اور تقدیر قائم کی ہے، جس کے مطابق اس عالم کا کاروبار انجام پاتا ہے،
انسان غلطی سے یہ سمجھتا ہے کہ یہ اصولِ فطرت صرف مادیات تک محدود ہیں، حالانکہ
مادیات ہوں یا روحانیات، ذہنیات ہوں یا عملیات، ہر ایک میں یہ یکساں جاری
و ساری ہیں، جس طرح یہ قانون فطرت ہے کہ زہر کھانے سے انسان کا جسم مر جاتا ہے، اسیطرح
یہ بھی اصولِ فطرت ہے کہ گناہ سے اسکی روح مر جاتی ہے، اور جس طرح اصولِ حفظانِ صحت کی
عدم پیروی سے انسان بیمار ہو جاتا ہے، اسی طرح اصولِ تزکیۂ نفس کی عدم متابعت سے بھی وہ مریض
ہو جاتا ہے، پھر جس طرح وہ اصولِ حفظانِ صحت کی پابندی سے وہ اپنی جسمانی بیماری
کے آلام سے نجات پاتا ہے، ایسا ہی روحانی تدابیر علاج کے ذریعہ سے وہ شفایاب بھی ہوتا ہے،

اعمال کے لوازم و نتائج

غرض جس طرح دنیا میں ہر چیز کی ایک خاصیت ہے، اور وہ جب یہاں وجود
پذیر ہوتی ہے، تو اُس کے ساتھ اسکے خواص و آثار بھی پیدا ہوتے ہیں، اُسی طرح انسان کی
اندرونی کیفیات و اعمال کے بھی کچھ آثار و لوازم ہیں جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے، غرور اور خاکساری،
بخل اور فیاضی، انتقام اور عفو، شجاعت اور بزدلی، تقویٰ اور فسق، ایمان اور کفر ہر ایک کا ایک نہ ایک
اثر و نتیجہ ہے، اور ہر ایک کے کچھ نہ کچھ خصائص و لوازم ہیں، جو اس سے اسیطرح الگ نہیں ہو سکتے جس طرح
سنکھیا سے سمیت، نمک سے مٹھاس اور آگ سے حرارت جدا نہیں ہو سکتی، اور ان معنوی، روحانی اور
نفسیاتی چیزوں میں علت و معلول کا وہی لزوم ہے، جو جسمانی، مادی اور طبیعاتی اشیاء میں ہے،
اشخاص کی نیکوکاری و بدکاری، اور افراد کی سعادت و شقاوت کے جو اصول ہیں وہی
جماعتوں اور قوموں کی صلاح و فساد اور سعادت و شقاوت پر بھی حاوی ہیں، جس طرح

ایک سائنٹسٹ (حکیم) کا کام ان مادی فزیکل اصولوں کو جاننا اور بتانا ہے اور انکی تعلیم کا نام ہماری اصطلاح میں حکمت و سائنس ہے، اسیطرح ان روحانی اسباب علل اور آثار و نتائج کو جاننا اور بتانا، انبیاء علیہم السلام کا کام ہے، اور انکی اس تعلیم کا نام شریعت ہے، انبیاءؑ کی اس تعلیم کے مطابق ہمکو اعمال کے روحانی آثار و نتائج کا وہی یقین ہونا چاہئے، جو ایک حکیم کی تعلیم کے مطابق ہمکو جسمانی اشیا کے خواص اور آثار کا ہوتا ہے، سائیکالوجی (علم النفس) اور سوشیالوجی (علم الاجتماع) کی وسعت تحقیق نے اس مفہوم کے سمجھنے میں اب بہت کچھ سہولت پیدا کر دی ہے،

عقاب و ثواب ردِ عمل ہے | الغرض یہ مادی و جسمانی دنیا علت و معلول اور عمل و ردعمل کے جس اصول پر مبنی ہے، اسکی وسعت کے دائرہ میں انسان کا ہر قول اور ہر عمل شامل اور داخل ہے، یہی سبب ہے کہ گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام اسلام میں عقاب اور اعمالِ صالحہ کے لازمی نتیجہ کا نام ثواب رکھا گیا ہے، قرآن نے ان ہی دونوں اصطلاحوں کو بار بار استعمال کیا ہے، عقاب کا لفظ عقب سے نکلا ہے، جس کے معنی پیچھے کے ہیں، اس لئے عقاب اُس اثر کا نام ہے، جو کسی فعل کے کرنے کے بعد لازم آجاتا ہے، اور ثواب کا لفظ ثوب سے لیا گیا ہے، جس کے معنی لوٹنے کے ہیں، اسلئے یہ کسی اچھے کام کے لوٹنے والے کے نتیجہ اور جزا کے معنی میں بولا گیا ہے،

اسی ایک مسئلہ کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو جزا اور سزا کے شرعی اصول کے سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو، چنانچہ قرآن پاک میں یہ کئی دفعہ فرمایا گیا ہے،

اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (انعام) — جو تم کرتے تھے وہی آج بدلہ پاؤ گے،

اس سے معلوم ہوا کہ جزا و سزا ہمارے ہی اعمال کے ردعمل (ری ایکشن) کا نام ہے، ایک اور جگہ ہے،

لِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰی (طٰہٰ-۱) "تاکہ ہر جان کو اسکا بدلہ دیا جائے جو وہ کرتی ہے"

ان آیتوں میں یہ صاف تصریح ہے کہ یہ جزا و سزا تمامتر ہمارے دنیاوی اعمال کے آثار و لوازم ہیں

فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (نحل-۴) "تو ان کے برے کام ان پر پڑے اور ان کا ٹھٹھا کرنا اُن پر الٹ پڑا"

غرض جزا و سزا انہی اعمال کے نتائج کا دوسرا نام ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا اسی اصول کی تشریح میں یہ اشارہ فرمایا کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ فرمائیگا "اے میرے بندو! تمہارے ہی اعمال ہیں جو میں تمکو لوٹا کر یہاں دے رہا ہوں، تو جو کوئی جزائے خیر پاوے، وہ خدا کا شکر ادا کرے، اور جس کو برائی ملے وہ خود کو ملامت کرے"

حصولِ راحت کا اصول یہ فطری قانون ہے کہ ہم کسی بڑی تکلیف سے اُسی وقت بچ سکتے ہیں، جب اسکی خاطر ہم اس سے چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو برداشت اور کسی بڑی خوشی کے حصول کیلئے ہم اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو قربان کرتے رہیں، عاجلہ یعنی موجودہ اور آخرۃ یعنی آیندہ ان دونوں کا جب کبھی تقابل پیش آتا ہے تو دون ہمت اور پست خیال لوگ عموماً موجودہ (عاجلہ) راحت کو پسند کرکے آیندہ کی راحت کی فکر نہیں کرتے کہ ان کی نگاہ میں موجودہ راحت گو چھوٹی ہو مگر نقد ہے اور آیندہ کی راحت گو بڑی خوش آیند ہو، مگر وہ نسیہ ہے اور ان کا اصول یہ ہے کہ نقد را بہ نسیہ مگذار" لیکن بلند ہمت اور عالی حوصلہ طبائع کا طریق عمل اسکے بالکل برخلاف ہے، فاتح اور کشور کشا آج اپنی جانیں جوکھم میں ڈالتے ہیں تاکہ کل سلطنت انکے ہاتھ آئے، تاجر اور سوداگر آج اپنے سرمایہ کو بازار کے سپرد کر دیتے ہیں تاکہ دولتِ فردا سے بہرہ مند ہوں

ہر مہذب انسان اپنے بچہ کو بیس پچیس برس تک تعلیم و تربیت اور مشق و امتحان کی مصیبتوں کی آگ میں بے تامل جھونک دیتا ہے تاکہ اسکی آیندہ زندگی راحت و مسرت میں بسر ہو، لوگ اپنے سرمایۂ عزیز کو تکلیفیں اٹھاکر جمع کرتے جاتے ہیں تاکہ کل اس سے زیادہ ضروری موقع پر اسکو کام میں لاسکیں اور تنگدستی کی بڑی تکلیف سے بچ سکیں،

غرض اگر انسانوں کی تمام کوششوں پر ایک غائر نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ کامیابی کے حصول کا یہی اصول ان کے اندر جاری و ساری ہے کہ تھوڑی سی تکلیف کو اسلیے برداشت کرلیا جائے کہ کسی بڑی تکلیف سے رہائی ملے، چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو اسلیے برباد کیا جائے کہ کوئی بڑی خوشی حاصل ہو، اور عارضی کامیابیوں کو اس غرض سے قربان کیا جائے کہ کوئی پائیدار اور دائمی کامیابی نصیب ہو مگر یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ آیندہ کی خوشی و کامیابی کی قربانی اور اسکے دوام و پائیداری کا ہمکو یقین ہو، کیونکہ اگر ایسا یقین نہ ہو تو ہم کبھی اس ایثار و قربانی پر آمادہ نہ ہوں اسی کیلئے ایمان کی ضرورت ہے تاکہ ہمارے اندر یقین پیدا ہوجائے، اور ہم اس ایثار و قربانی کو خوشی خوشی گوارا کرلیں، جن لوگوں میں یہ یقین پیدا نہ ہوگا، ان سے یہ عظیم الشان قربانی بھی نہیں ہوسکتی، اسی لئے گنہگار انسانوں کی یہ کیفیت قرآن نے بیان کی ہے،

كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ (قیامت-۱)

ہرگز نہیں بات یہ ہے کہ تم موجودہ زندگی سے محبت رکھتے ہو اور آیندہ زندگی کو چھوڑتے ہو

حالانکہ انسان اسی اصولِ کار کو اگر دنیا کی طرح آخرت کے معاملات میں بھی برتے تو اسکی کامیابی میں کوئی شک نہ رہے، آیندہ کا خیال کرکے موجودہ سے دست بردار ہوجانا

یہی کامیابی کی کنجی ہے، اور اسی اصول کے تحت میں دین و دنیا کی تمام نیکیوں اور کامیابیوں کا راز پوشیدہ ہے، موجودہ عارضی لذت کو آیندہ کی دائمی لذت پر اور حال کی معمولی راحت کو مستقبل کی دیرپا راحت پر قربان کر دینا وہ بھائی ہے جسکے تسلیم کرنے سے کوئی انحراف نہیں کر سکتا تم صبح خیزی کی معمولی تکلیف کو صحت کی دیرپا راحت کی خاطر قربان کرتے ہو، ورزش اور دوڑ دھوپ کی محنت کو اسلئے قبول کرتے ہو کہ کل کی پیری اور بیماری کی تکلیف سے تمکو وہ بچائے غرض آج کی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو اٹھاؤ گے تو کل کی بڑی تکلیف سے تمکو نجات مل سکے گی اور آج کی عارضی خوشیوں کو قربان کروگے تو کل کی دائمی خوشی نصیب ہوگی یہی وہ فلسفہ ہے جسکو قرآن نے اس آیت میں ادا کیا ہے،

وَجَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّ حَرِيْرًا (دھر-۱) اور خدا نے اُنکے صبر کرنے پر انکو باغ اور ریشم کے کپڑے مزدوری دی،

یہ صبر کیا تھا؟ دنیا کی عارضی خوشیوں کی قربانی تاکہ آخرت کی بڑی خوشی حاصل ہو اور یہاں ادائے نیکی اور احترازِ جرم کی معمولی تکلیفوں کی برداشت، تاکہ وہاں کی بڑی تکلیف سے نجات ملے، یہی سبب ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ وَحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ یعنی جنت دنیاوی تکلیفوں سے، اور دوزخ دنیا کی معمولی خوشیوں سے گھری ہوئی ہے، نادان تقویٰ اور نیکی کی ان معمولی قیدوں سے گھبراتے اور گناہ کی عارضی وفاتی لذتوں کے طلبگار ہوتے ہیں اسلئے آخرت کی بڑی تکلیف میں گرفتار ہونگے اور وہاں کی ابدی لذت سے محروم رہینگے، اور جو دین و دیانت اور نیکی و تقویٰ کی ان معمولی تکلیفوں کو گوارا کرینگے اور گناہ کی عارضی لذتوں سے بچینگے، وہ آخرت کی لاانتہا لذتوں سے شاد کام ہونگے، یہی فلسفہ قرآن پاک کی اس آیت میں ادا ہوا ہے،

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (نازعات-۲)

لیکن جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو ناجائز لذتوں اور خواہشوں سے باز رکھا تو جنت اس کا ٹھکانا ہے،

نامۂ عمل | ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جو چیز بھی ایک دفعہ پیدا ہو جاتی ہے پھر وہ بے حکم خدا فنا نہیں ہوتی، اسی طرح افعال و اعمال بھی جو انسان سے ظہور پذیر ہوتے ہیں، وہ فنا نہیں ہوتے ہو جو وہ سائنس (جس نے یہ اصول تسلیم کر لیا ہے کہ دنیا میں کوئی حرکت بھی پیدا ہو کر فنا نہیں ہوتی یہانتک کہ فضا میں ہر آواز اور ہر صدا بھی جو کبھی بلند ہوئی ہے، آج موجود ہے، اور ہمیشہ رہیگی، اور ہم اسکو پکڑ پائیں تو سن سکتے ہیں) وہ اعمال و افعال کے دوام وجود سے اسلامی عقیدہ کو قبول کرنے میں پس و پیش نہیں کر سکتی، دنیا کے ریکارڈ میں انسان کا ہر عمل و فعل ہمیشہ کیلئے گویا بھرا ہے،

قرآن پاک نے اسی اصول کو اپنی ان آیتوں میں بیان کیا ہے،

هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ (یونس-۳)

اس وقت ہر جان جو اس نے پہلے کیا، اس کو آزمائے گی،

كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ (طور-۱)

ہر آدمی اپنے عمل کے بدلے گرو ہے،

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (مدثر-۲)

ہر جان اپنے عمل کے بدلے گرو ہے،

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (زلزال)

تو جو کوئی ایک چیونٹی بھر نیکی کریگا، وہ اسکو دیکھے گا، اور جو چیونٹی برابر بدی کریگا، وہ اسکو

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ

جس دن ہر جان جو اس نے اچھے کام کئے انکو

مُحْضَراً ج صلے وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ تَوَدُّ (آل عمران) موجود پائیگی اور جو برے کام کئے وہ بھی،

یہ بات کہ انسان کا ہر عمل و فعل صحیفۂ عالم پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہو جاتا ہے، اس کو قرآن نے کئی طریقوں سے ادا کیا ہے،

ایک اس طرح کہ انسان کی زبان سے جب کبھی کوئی لفظ نکلتا ہے، خواہ وہ کتنی ہی تنہائی میں بولا جائے خدائی شاہد اس کے سننے کو موجود رہتے ہیں اور وہ اسکو سُن کر محفوظ کر لیتے ہیں،

اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ، مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ (ق - ۲)

جب دو لینے والے داہنے اور بائیں بیٹھے لیتے جاتے ہیں، کوئی بات وہ نہیں بولتا، مگر ایک نگراں اسکے پاس حاضر رہتا ہے

کبھی اسکو اعمال کی تحریر و کتابت کے الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے،

اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰهُمْ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ (زخرف - ۷)

کیا یہ منکر سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے بھید اور انکی کانا پھوسی نہیں سنتے، کیوں نہیں! بلکہ ہمارے فرستادہ ان کے پاس لکھتے رہتے

اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ (یونس - ۳)

بیشک ہمارے فرستادہ تمہاری چالوں کو لکھتے

کبھی اللہ تعالیٰ ہر عمل کے موقع پر خود اپنی حاضری اور دائمی علم و شہادت کو ظاہر کرتا ہے،

وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ (یونس - ۷)

اور تو کسی کام میں نہیں ہوتا، اور نہ قرآن سے کچھ پڑھتا ہے اور نہ تملوگ کوئی کام کرتے ہو لیکن ہم موجود ہوتے ہیں جب تم اس میں لگے ہوتے ہو،

کبھی یہ کہا ہے کہ ہر انسان کا نامۂ عمل اس کی گردن میں لٹکا ہے، قیامت کے دن وہی فرد عمل کی صورت میں انسان کے سامنے پھیلا دیا جائیگا، کہ اپنا اعمال نامہ تم خود پڑھ لو، فرمایا:-

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا، اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (بنی اسرائیل-۲)

اور ہم نے ہر انسان کا نتیجہ عمل اس کی گردن میں چپکا دیا ہے، اور قیامت کے دن ہم دفتر کر کے نکالیں گے جس کو وہ کھلا ہوا پائیگا کہ اپنا دفتر پڑھ لے، آج تیرا نفس خود ہی محاسب ہو تو کافی ہے،

اس آیت کا ایسا محل ہے کہ نامۂ عمل کو اگر کوئی واقعی کاغذ کا دفتر یا حساب و کتاب کا رجسٹر نہ سمجھے تو سمجھ سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے، کہ یہ تعبیر اسلئے اختیار کی گئی کہ جس طرح کاغذ اور رجسٹر میں قلمبند حساب کوئی بھول نہیں سکتا اور ایک ایک چیز اس میں درج ہوتی ہے اسیطرح یہ اعمال انسانی فراموش نہ ہونگے، بلکہ لکھے ہوئے رجسٹر کی طرح محفوظ رہیں گے فرمایا،

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا (کہف-۶)

اور نامۂ عمل رکھا جائیگا، تو گنہگاروں کو دیکھے اسمیں جو کچھ لکھا، اس سے ڈر رہے ہونگے اور کہیں گے کہ ہائے افسوس کہ اس کاغذ کو کیا ہے، کہ چھوٹی بڑی بات نہیں چھوڑتا، لیکن اسکو شمار کر لیا، اور جو کچھ انھوں نے زندگی میں کیا، اسکو سامنے پائیں گے، اور تیرا پروردگار

بایں ہمہ اگر کوئی ٹھیٹ لفظوں کا پابند ہوکر نامۂ عمل کو واقعی کاغذوں کا دفتر سمجھتا ہو تو اسمیں شک نہیں کہ الفاظ کے ظاہری معنی اسکی تائید کریں گے، مگر کون سمجھا سکتا ہو کہ یہ کیونکر ہوگا، اسی لئے اس پر بحث فضول ہو کہ یہ کیونکر ہوگا، چاہے یہ ہو یا وہ، بہرحال ہمارے اعمال کا ایک ایک نقطہ محفوظ رہے گا، اور وہ خدا کے سامنے پیش ہوگا، اور یہی اس عقیدہ کا اصل مقصد ہو،

اعضا کی شہادت انسان کا ہر عمل اپنے پیچھے اپنے کرنے والے کے اندر اپنا اچھا یا برا اثر چھوڑ جاتا ہے، اگر دل کا آئینہ صاف ہو تو اسکو اپنے عمل کا چہرہ اسمیں صاف دکھائی دے، فرمایا

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ، (قیامت ۱)

بلکہ انسان کو اپنے نفس کا حال آپ دکھائی دیتا ہو، اگرچہ وہ اپنے عذر تراشتا ہے،

یہی وہ آئینہ ہے جو گناہ کے میل سے زنگ آلود ہو جاتا ہے،

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ (تطفیف)

نہیں بلکہ ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہو،

گویا اسی آیت کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہو کہ جب انسان پہلے پہل گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے، اگر وہ توبہ و انابت کرتا ہو اور آئندہ اس سے باز رہتا ہے تو وہ مٹ جاتا ہے، اور اگر اسی طرح گناہ کئے جاتا ہے تو اس نقطہ کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے، یہانتک کہ ایک دن پورے دل پر چھا جاتا ہے[1]،

اسی طرح وہ اپنے جن اعضاء سے جو برا کام کرتا ہو، اس کا اثر ان پر چھا جاتا ہو، یہانتک کہ چہروں پر اس اثر کے نقوش ابھر آتے ہیں، آنکھوں میں اسکی لکیریں پڑ جاتی ہیں

[1] ترمذی،

اور ہاتھ پاؤں پر اسکے نشان نمایاں ہو جاتے ہیں عالم غیب کو چھوڑ دو، اسی عالم ظاہر میں تاڑنے والوں کی نگاہیں، انسانوں کے چہروں، آنکھوں اور ہاتھ پاؤں کے عنوانِ بیان سے انسان کے اندر کی تحریریں پڑھ لیتی ہیں. اسی طرح قیامت میں ان کے اعمال کے آثار و نتائج اُن کے ایک ایک عضو سے نمایاں ہونگے،

يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمَاهُمْ (رحمٰن ۲)

گنہگار اپنی پیشانی سے پہچان لئے جائیں گے،

ایسی حالت میں اس وقت جب انسان کی زبان قال پر خداوند عدالت کے رعب و جلال سے مہر سکوت پڑ جائیگی، اگر انسان کے ہاتھ پاؤں اور کھال تک اسکے اعمال بد پر گواہی دیدیں تو تعجب کی کیا بات ہے؟ فرمایا،

وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ..... اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (یٰس-۴)

اے گنہگارو! آج نیکوکاروں سے الگ ہو کر پہچان میں آجاؤ.... آج ہم انکے منہ پر مہر لگا دینگے، اور انکے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور انکے پاؤں انکے کرتوتوں کی گواہی دینگے،

وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ، حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ، وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ

اور جس دن خدا کے دشمن دوزخ کی طرف انکے جائیں گے اور وہ درجہ بدرجہ بانٹے جائیں گے تا کہ جب وہ اسکے پاس پہنچے تو انکے کانوں انکی آنکھوں اور انکی کھالوں نے ان پر ان کے کرتوتوں کی گواہی دی، انھوں نے کہا تم نے ہم پر کیوں

شَهِدْنَا عَلَيْنَا قَالُوا أَنْطَقَنَا اللّٰهُ — گواہی دی، کہا جس خدا نے ہر چیز کو گویا کیا
الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (حم السجدہ) — اسی نے ہمکو بھی گویا کیا،

اس لئے ان اعضاء کی گویائی بھی اسی نوع کی ہوگی، جس نوع کی گویائی دنیا کی ہر چیز کو حاصل ہے لیکن اس گویائی سے اگر کوئی حقیقی زبان کی گویائی مراد لیکر تشفی پاتا ہے تو اس کو اسکا حق حاصل ہے،

میزان اکثر انسانوں کے اچھے یا بُرے دونوں قسم کے اعمال ہوتے ہیں، ایک قسم کا عمل کم ہوگا، اور دوسرا زیادہ، یا دونوں برابر، دو مادی چیزوں کے درمیان تفاضل اور گھٹ بڑھ کا علم ہمکو تولنے یا گننے سے ہوتا ہے، اسلئے وزن اور حساب سے عموماً عدل، انصاف، حق اور ٹھیک ٹھیک کا مفہوم ادا کیا جاتا ہے، اعمالِ انسانی کے متعلق خدا نے فرمایا ہے کہ ان کو اسکے عمل کے مطابق پورا پورا بدلہ ملے گا، فرمایا،

جَزَاءً وِفَاقًا، (نبأ-۱) — پورا پورا بدلہ،

اس برابری اور کمالِ عدل وانصاف کے مفہوم کو ترازو کی ناپ اور عدالت کی میزان کے استعارہ سے ادا کیا، فرمایا،

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَمَا كُنَّا غَائِبِينَ — پھر ہم احوال سنائیں گے، اور ہم کہیں غائب نہ تھے،
وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ (اعراف-۳) — اور وزن اس دن حق ہے، پھر جس کی تولیں بھاری ہوئیں تو وہی ہیں جن کا بھلا ہوا، اور جس کی تولیں ہلکی پڑیں، سو وہی ہیں جو اپنی جانیں ہار بیٹھے،

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (قارعہ)

تو جس کی تول بھاری ہوئی تو وہ خوش خوش عیش میں ہوگا، اور جس کی تول ہلکی ہوئی تو اسکی ماں دوزخ ہے،

ان دونوں آیتوں میں تول کے بھاری اور ہلکے ہونے سے مقصود، اعمال خیر کی کمی و بیشی ہے، پہلی آیت میں اس کا اشارہ موجود ہے کہ وزن سے مراد حق و عدل ہے، اور یہ کہ انسان کا ہر عمل علم الٰہی میں موجود ہوگا، اور وہ کسی طرح بیش و کم نہ ہوگا،

اس مفہوم میں یہ استعارہ قرآن میں بکثرت مستعمل ہوا ہے، ایک جگہ ہے،

اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ (شوریٰ) اللہ جس نے کتاب کو حق کیساتھ اتارا، اور میزان کو،

یعنی کتاب الٰہی، حقانیت کے ساتھ اتری ہے، اور اسی کے ساتھ میزان بھی، جس سے مراد عدل ہے (طبری تفسیر آیت مذکورہ) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے نظام کائنات کی ہر چیز میں جو اعتدال کامل رکھا ہے، اسکو بھی میزان ہی کے لفظ سے ادا فرمایا ہے،

وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ (رحمٰن) اور خدا نے ترازو رکھی ہے،

حساب کمی بیشی کے علم کا دوسرا طریقہ حساب ہے، دوسری آسمانی کتابوں کی طرح قرآن میں بھی یہ استعارہ استعمال ہوا ہے، اور بار بار فرمایا ہے کہ ہم قیامت میں تمہارے عمل کا حساب لیں گے مگر اس حساب سے بھی وہی مقصود ہے، جو وزن سے ہے، چنانچہ سورۂ انبیاء میں یہ مفہوم مزید تصریح کیساتھ مذکور ہے، اور جس سے میزان کی حقیقت بھی پوری طرح سمجھ میں آتی ہے، فرمایا،

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ اور ہم قیامت کے دن کیلئے ترازو میں یعنی

فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا وَكَفَىٰ بِنَا حَاسِبِينَ (انبیاء-۴)

انصاف رکھیں گے، پھر کسی پر کچھ ظلم نہ ہوگا، اگر رائی کے دانہ کے برابر بھی کچھ ہوگا، تو ہم لے آئیں گے، اور ہم کافی ہیں حساب کرنے والے،

اس آیت سے دو باتیں سمجھی جاسکتی ہیں، ایک تو یہ کہ وزن سے مقصود انصاف اور عدم ظلم ہے، اور دوسری یہ کہ حساب سے مقصود یہ ہے کہ عمل انسانی کا کوئی وزن معاوضہ میں چھوٹنے نہ پائیگا، اور نہ وہ خدا کے علم سے غائب ہے، لیکن بہرحال وزن و حساب کے مادی ہی مفہوموں کو اگر کوئی صحیح باور کرتا ہے، تو وہ بھی حق پر ہے،

جنت و دوزخ اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان اعمال کی تکلیف اور ذمہ داری سے مقصود الٰہی کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ ارواحِ انسانی کو سعادتِ ابدی اور ترقیاتِ غیر متناہی عطا کی جائیں، مگر اس سعادت و ترقی کی بنیاد خدا نے اعمال نیک کے حصول اور اعمالِ بد سے پرہیز پر رکھی ہے، اسلئے یہ کہنا صحیح ہے کہ خلقتِ انسانی کی غرض یہ ہے کہ وہ احکام الٰہی کی تعمیل کرے تاکہ وہ اپنی مقررہ سعادت اور موعودہ ترقی کو حاصل کرسکے اور اسی عالم کا نام جہاں یہ سعادتِ ابدی اور ترقیاتِ غیر متناہی ملتی ہیں "بہشت" ہے، اور اس عالم کا نام جہاں جاکر دنیاوی کمیوں کی تلافی اور گذشتہ حیاتِ فانی کے اعمالِ بد کے نتائج سے پاکی حاصل ہوگی "دوزخ" ہے، اسلئے یہ کہنا صحیح ہے کہ جنت ہی انسان کا اصلی گھر ہے، مزید تفصیل آگے آتی ہے،

جنت انسان کی وراثت ہے، حضرت آدم کا قصہ جو توراۃ اور قرآن پاک میں مذکور ہے وہ آغاز خلقت کی محض تاریخ نہیں وہ حقیقتِ انسانی کی سچی اور حقیقی تفسیر ہے، عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے حضرت آدمؑ کو اپنے فضل سے جس جنت میں جگہ دی تھی، وہ پہلے اُن کو اور اُن کی نسل کو ہمیشہ کے لئے دیدی گئی تھی. مگر چونکہ اتفاقاً ان سے گناہ سرزد ہوا اسلئے وہاں سے نکال کر زمین میں بھیج دیے گئے، مگر ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ آدم علیہ السلام کا زمین میں آنا تو اُن کی پیدائش سے پہلے ہی مقدر ہو چکا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ اُن کی خلقت سے پہلے ہی فرشتوں پر یہ ظاہر کر چکا تھا کہ

اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (بقرہ-۴) میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں،

حضرت آدمؑ کا زمین میں خلیفہ ہونا اُن کے زمین میں سکونت پذیر ہونے کی پیشین گوئی ہے، مگر زمین میں بھیجنے سے پہلے اُن کا جنت میں رکھنا، پھر گناہ کے بعد وہاں سے انکو نکال کر زمین میں بھیجنا. یہ اشارہ رکھتا ہے کہ آدم اور اُن کی نسل کی اصلی جگہ یہی جنت ہے. مگر اس سے دوری اُن کے گناہ کی وجہ سے ہے اور اس کا حصول خدا کی اطاعت اور نیکوکاری کے ذریعہ ہوگا چنانچہ اُن کے زمین میں اترتے وقت اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرمادیا،

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا فَاِمَّا	ہم نے کہا کہ تم سب اس جنت سے اترو پھر
یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ	کبھی تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت
فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ	پہنچے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی تو اُن کو
وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا	نہ ڈر ہوگا نہ غم، اور جنھوں نے نہ مانا اور ہمارے
اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا	حکموں کو جھٹلایا، تو وہی ہیں دوزخ
خٰلِدُوْنَ ۝ (بقرہ-۴)	والے، وہ اس میں رہا کریں گے
قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِیْعًا بَعْضُكُمْ	خدا نے کہا کہ اس جنت سے تم دونوں

لِبَعْضٍ عَدُوٌّ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِنِّيْ — ایک ساتھ اتر جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن

هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا — ہو تو اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی

يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ — رہنمائی آئے تو جس نے میری رہنمائی کی پیروی

ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ — کی تو وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ بدبخت ہوگا، اور

نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى، — جس نے میری یاد سے منہ پھیرا تو اس کے لئے تنگ

(طٰہٰ - ۷) — معاش ہوگی، اور قیامت میں ہم اس کو

توراۃ میں ہے کہ جنت میں دو درخت تھے، ایک نیک و بد کی پہچان کا اور دوسرا زندگی جاوید کا، توراۃ کی رو سے آدمؑ کو اسی نیک و بد کی پہچان کے درخت کا پھل کھانے سے منع کیا گیا تھا لیکن آدمؑ نے اس کو کھا لیا، اور اس کی وجہ سے سب سے پہلے اُن کو اپنی ہیبتی کا علم ہوا، آخر خدا نے اُن کو جنت سے نکال دیا کہ وہ زندگی کے درخت کا پھل کھا کر خدائی کا دعوی نہ کر بیٹھیں جب وہ جنت سے نکالے گئے تو اُن سے کہا گیا، (سفر تکوین ۔۲)

"اور اس درخت سے کھایا جس کی بابت میں نے تجھ سے حکم کیا کہ اسے مت کھانا، زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی، اور تکلیف کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس سے کھائیگا، اور وہ تیرے لئے کانٹے اور اونکٹارے اُگائے گی، اور تو کھیت کی نبات کھائیگا، اور تو اپنے منہ کے پسینہ کی روٹی کھائے گا، جب تک کہ زمین میں پھر نہ جائے،

قرآن پاک میں اس درخت کا نام جس کے پھل کھانے سے آدمؑ کو روکا گیا تھا، تصریحاً مذکور نہیں لیکن ایک آیت سے اشارۃً معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیک و بد کی شناخت کا درخت تھا"

اور شیطان نے یہ کہکر اُن کو کھلایا کہ "یہ حیاتِ جاوید اور ملکِ جاوداں کا درخت ہے" مگر اُس کے کھانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کو "برہنگی کا علم" ہوگیا، جو نیک و بد کی تمیز کا نتیجہ ہے" فرمایا،

فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَانُ قَالَ	شیطان نے آدم کو وسوسہ دیا کہا
يَا آدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَى شَجَرَةِ الْخُلْدِ	آدم! کیا میں تجھے حیاتِ جاودانی
وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ فَأَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ	اور سلطنت غیر فانی کا درخت بتاؤں
لَهُمَا سَوْآتُهُمَا، (طٰہٰ-۷)	تو آدم اور حوّا) دونوں نے اس درخت کا پھل

اب سوال یہ ہے کہ "حیاتِ جاوداں" اور "غیر فانی بادشاہی" سے مقصود کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ جنت ہے، شیطان کا مقصود یہ تھا کہ اس جنت میں جس میں تم اب ہو، بے درد سر ہمیشہ رہنے کا نسخہ تم کو بتاؤں؟ انسان نے خواہش کی تو اس نے نیک و بد کی تمیز کے درخت کا پھل بتادیا، یہ بھی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نیک و بد کی تمیز ہی پر انسان کی شرعی تکلیف اور مواخذہ کی بنیاد ہے، ہر وہ مخلوق بلکہ ہر وہ انسان جو اس ادراک سے خالی ہے، وہ شرعی تکلیف اور مواخذہ سے گرانبار نہیں، غرض اس خیر و شر کی معرفت کا لازمی نتیجہ شریعت کی تکلیف تھی، چنانچہ وہ اس کے سر ڈالی گئی اور پھر نسل آدم میں یہ نیک و بد کی تمیز فطری الہام کے ذریعہ عنایت ہوئی، فرمایا،

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَأَلْهَمَهَا	اور نفس اور اس کی بناوٹ کی قسم پھر
فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا، (والشمس)	نفس میں اس کی بدی اور اسکی نیکی کو الہام کیا،

عجب نہیں کہ قرآن پاک کی یہ آیتیں اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہوں،

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ	ہم نے اپنی امانت (تکلیف شرعی) آسمانوں

وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ	اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو انھوں نے
يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا	اس کے اٹھانے سے انکار کیا، اور انسان نے
الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا	اس کو اٹھالیا کہ وہ ظالم اور نادان تھا،
لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ	تاکہ اللہ نفاق والوں اور نفاق والیوں اور
وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ	شرک والوں اور شرک والیوں کو سزا دے،
اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ	اور ایمان اور ایمان والیوں پر رجوع ہو،
وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (احزاب ۹)	اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے،

انسان نے اپنی جہالت سے اس تکلیفِ شرعی کی امانت کو اٹھالیا، جو نیک و بد کی معرفت کا لازمی نتیجہ تھا، اور وہ اس تکلیفِ شرعی کا لازمی نتیجہ جزا اور سزا تھی، لیکن خدا کی رضامندی یہی تھی کہ اُس کے سب بندے اُس کی رحمت اور مغفرت کے مستحق ٹھہریں کہ اسکی رحمت و شفقت کا اقتضا یہی ہے کہ گنہگاروں کو معاف کرے اور نیکوکاروں پر اپنی خاص رحمت نازل کرے، لیکن اگر کاشتکار اپنے کھیتوں کو ابرِ رحمت سے مستفید ہونے کے قابل نہ بنائے تو وہ اسکی برکت سے مستفید نہ ہوگا، اسی طرح جو بندہ شرک و نفاق میں مبتلا ہو جانے سے اپنے آپ کو اُس کی رحمت کے قابل نہ بنائے، تو وہ بھی اسکی رحمت کی بارش سے سیراب نہ ہو سکے گا،

غرض اس طرح وہ مصلحتِ الٰہی جو انسان کی پیدایش سے تھی پوری ہوئی اور وہ حیاتِ جاوید اور غیر فانی بادشاہی جس کا حصول قضائے الٰہی نے انسان کی محنت، جد و جہد اور سعی و عمل پر موقوف رکھا تھا، اور جسے شیطان نے آدم کو بلا سعی و محنت محض بخت و اتفاق سے دلوانا چاہا تھا،

بالآخر اُس کا ملنا تقدیرِ الٰہی، جد وجہد، سعی وعمل، اور نظامِ ربّانی کے مطابق شریعت کی پیروی کے ذریعہ سے مقرر ہوا، جیسا کہ پہلے سے طے شدہ تھا، فرمان آیا،

اِهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ	یہاں سے تم سب اترو، پھر اگر تمہارے پاس
مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا	میری طرف سے کوئی رہنمائی آئے تو جس نے میری
خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ	رہنمائی کی پیروی کی تو ان کو نہ ڈر ہوگا،
(بقرہ - ۴)	نہ غم،
اِهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ	تم دونوں یہاں سے نیچے اترو، تم ایک دوسرے
عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى	کے دشمن ہو، پھر اگر تمہارے پاس میری طرف
فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا	سے رہنمائی آئے تو جس نے میری رہنمائی کی
يَشْقٰى ، (طٰہٰ - ۷)	پیروی کی، تو وہ نہ گمراہ ہوگا، اور نہ بدبخت،

جب انسان کا اصل مقام، وہی حیاتِ جاوید، اور مملکتِ ابد ہے، تو اسی کا حصول اسکی تمام کوششوں کا محور ہونا چاہیئے، اور اسی حیاتِ فانی اور لازوال بادشاہی کی دولت کو اپنی اس فانی زندگی اور زوال پذیر بادشاہی کے تمام کاموں کے مزدو معاوضہ میں حاصل کرنا چاہیئے تاکہ وہ اپنے باپ کی اس آسمانی بادشاہی کو پالے جس کی صفت یہ ہے :-

فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى	تو شیطان تم کو جنت سے باہر نہ کروے تو پھر تو
اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى	مشقت میں پڑجائے اور جنت میں تجھکو یہ ملے گا کہ
وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى (طٰہٰ)	اسمیں تو نہ بھوکا ہوگا اور نہ ننگا نہ پیاسا ہوگا اور

آدم اس جنّت سے نکلے تو اُن کو بھوک بھی لگی، ننگے بھی ہوئے، پیاس بھی معلوم ہوئی، اور دھوپ کی تپش کی تکلیف بھی ہوئی اور زمین میں آکر اُن ہی چار چیزوں کی مشقت میں گرفتار ہوئے، کھانا، پینا، پہننا، رہنا، یہی انسان کی چار مختصر ضروریات ہیں، اُن ہی کو اُس نے اپنی ہوا و ہوس سے پھیلا کر ضروریات کا ایک عالم پیدا کر لیا، جس کے مہیا کرنے، ضرورت سے زیادہ حاصل کرنے اور عمدہ بنانے میں اپنی موجودہ زندگی کی تمام تر توجہ کو مصروف کر کے اصل جنّت کی طلب سے ہاتھ دھو بیٹھا، یہیں سے شریعت کی تکلیف عائد ہوئی، اور جائز اکل، جائز شرب، جائز لباس اور جائز سکن کے حصول کے طریقوں کی تعلیم اور ناجائز طریقوں سے احتراز کا حکم ہوا، اسی سے شریعت کے اصول، معاملات اور اخلاقِ انسانی کی ذمہ داریاں پیدا ہوئیں، اور پھر اس لئے تاکہ اس حیاتِ فانی میں پھنس کر حیاتِ غیر فانی کی طلب کو وہ بھول نہ جائے، عرفانِ الٰہی (عقائدِ صحیحہ) اور عبادتِ الٰہی اور اطاعتِ الٰہی کی تلقین ہوئی، جو جنّت کی اصلی نذر اور روزی ہے،

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ الَّذِيْنَ	یہی وہ میراث لینے والے ہیں جو سایہ دار
يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا	باغ کے وارث ہوں گے، وہ اس میں
خٰلِدُوْنَ، (مؤمنون-۱)	ہمیشہ رہنے والے ہیں،

لیکن یہ وراثت انسان کو اپنے اعمالِ خیر ہی کے ذریعہ ملے گی، چنانچہ اہلِ جنّت کو جنّت کے داخلہ کے وقت یہ بشارت ملے گی،

وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَ	اور اس جنت میں وہ کچھ ہے جس کو دل چاہے
تَلَذُّ الْاَعْيُنُ ج وَاَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ	اور آنکھوں کو لطف ملے اور تم کو اس میں ہمیشہ

وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ (زخرف) — رہنما ہے، اور یہی وہ جنت ہے جس کے وارث اپنے کاموں کے بدلہ تم بنائے گئے،

اور اُن ہی کو منادی غیب ندا دے گا،

وَنَادَوْا أَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (اعراف ۵) — اور اُن کو پکار کر کہا گیا کہ یہی وہ جنت ہے جس کے تم وارث اپنے ان کاموں کے بدلہ

ملتِ توحید کے مبلغ اعظم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں کا ایک فقرہ یہ بھی تھا،

وَاجْعَلْنِي مِنْ وَرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيمِ ۝ (شعرا - ۵) اور مجھکو باغِ نعمت کے وارثوں سے بنا

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ اسلام نے انسان کا اصلی مقام وہی قرار دیا ہے، جہاں نہ بھوک ہے نہ پیاس، نہ برہنگی ہے، نہ دھوپ کی تکلیف، جہاں کی بادشاہی لازوال اور جہاں کی زندگی غیر فانی ہے، لیکن اُس کے حصول کا ذریعہ صرف انسان کا نیک عمل اور صحیح عرفان ہے، جن کے مجموعہ کا نام "تقویٰ" ہے،

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا (مریم ۴) — یہ وہ بہشت ہے جس کا وارث اپنے بندوں میں سے ہم اسکو بنائیں گے جو تقویٰ والا ہوگا،

انسانی جزا و سزا کے تین گھر

انسان کے تین گھر ہیں، ایک موجودہ فانی عالم جس کو دنیا کہتے ہیں، اور دوسرا درمیانی، عالمِ موت یا عالمِ قبر جس کا نام برزخ ہے، اور تیسرا اُس غیر فانی زندگی کا گھر جس کو دارِ آخرت کہتے ہیں، یہودیوں کے یہاں اصلی زور اسی دنیا کی جزا و سزا پر ہے، اُن کے ہاں تیسرے کا ذکر بہت کم، اور دوسرے کا مطلق نہیں، اور عیسائیوں میں پورا زور تیسری منزل

کی سزا و جزا پر ہے اور پہلی اور دوسری منزلوں کے ذکر سے خاموشی ہے لیکن وحی محمدیؐ کی تکمیل نے ان تینوں گھروں کو انسانی جزا و سزا کا مقام قرار دیا۔ انسان کو اپنے اعمال کی پہلی جزا و سزا تو اسی دنیا میں کامیابی و ناکامی کی صورت میں ملتی ہے، گو اس کامیابی و ناکامی کے سمجھنے کا معیار مختلف ہو اس کے بعد جب انسانی روح دوسری منزل میں قدم رکھتی ہے تو یہاں بھی وہ اپنے اعمال کی تھوڑی بہت جزا و سزا کا منظر دیکھ لیتی ہے، اس کے بعد جب موجودہ دنیا کے پورے کاروبار کا خاتمہ ہو کر اس فانی کائنات کا ہر نقش و نگار مٹ جائیگا اور پھر نئی زمین اور نیا آسمان بنے گا، تو فانی انسانوں کو دائمی زندگی کے لئے بیدار کیا جائیگا، اور اس وقت وہ اپنے اعمال کی پوری جزا و سزا پائیں گے،

انسان کا پہلا دار الجزا

غرض انسان کا پہلا دار الجزا، یہی دنیا ہے، گو اس کے ہر نیک و بد فعل کی پوری جزا تو دوسری دنیا کی زندگی میں ملتی ہے لیکن اس کے نیک و بد فعل کے مماثل اس موجودہ دنیا کی زندگی میں بھی اس کو کچھ نہ کچھ جزا ملا کرتی ہے، انسان کی عزت، شہرت، ناموری، ہر دلعزیزی، محبوبیت، تسکین، اطمینان، سرور، فارغ البالی، حکومت، یہ سب اس زندگی کے اعمالِ خیر کے نتائج ہیں، اُن کے برخلاف، ذلت رسوائی، بے عزتی، کس مپرسی، پریشان حالی، بے اطمینانی، غم، خوف، محکومیت، اُس کے اعمالِ بد کے اثرات ہیں،

یہودیوں کی توراۃ میں اعمال کے نتائج میں زیادہ اہمیت اسی دنیاوی دار الجزا کو دی گئی ہے، بلکہ توراۃ میں یہی خیال سب سے زیادہ نمایاں ہے کہ خدا کی فرمانبرداری اور نافرمانی کی جزا اسی دنیا کے رنج و راحت کی صورت میں اسی زندگی میں ملتی ہے مثلاً خدا کے حکموں پر عمل کرو گے تو اس کا

نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری کھیتیاں سرسبز ہوں گی، اولادیں برومند ہوں گی، جانور جنیں گے، درخت پھل دیں گے اور دشمن مغلوب ہونگے، اور اگر خدا کی نافرمانی کروگے تو تپ و بائیں آئیں گی کھیتیاں اولادیں جیتی نہ رہیں گی، جانور مرجائیں گے، شہر تباہ جائیں گے، باغ پھل نہ دیں گے، اور دشمن تم پر چھا جائیں گے، عیسائیت نے اس کے بالمقابل سارا زور زمین کی مملکت پر نہیں بلکہ آسمان کی بادشاہت پر دیا ہے، اور اس ظاہری زندگی کے فوز و فلاح کو اپنے مقصد سے خارج قرار دیا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس دعوت کو لیکر آئے وہ یہودیت اور عیسائیت کی اس افراط و تفریط دونوں سے پاک ہے، اس نے ایمان اور عمل صالح کا نتیجہ اس دنیا کی بادشاہی بھی قرار دی، اور اس دنیا کی بھی، زمین کی حکومت بھی، اور آسمان کی جنت بھی، یہاں کی سرسبزی و شادابی بھی، اور وہاں کا باغ و بہار بھی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انکو کا رمسلمانوں کے ذکر میں فرمایا،

فَاٰتٰهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَ	تو خدا نے اُن کو دنیا کا بدلہ بھی دیا، اور
حُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ	آخرت کے ثواب کی خوبی بھی، اور اللہ
يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (اٰلِ عمران ۱۵)	نیکی کرنے والوں کو پیار کرتا ہے،

ایمان اور عملِ صالح والوں سے یہ وعدہ تھا کہ

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا	خدا نے اُن سے جو ایمان لائے اور اچھے کام
الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا	کئے، گناہوں کی بخشش اور بڑی مزدوری
عَظِيْمًا، (فتح - ۴)	کا وعدہ کیا،

اور یہ بھی اُن ہی سے وعدہ ہے،

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ — خدا نے اُن سے جو تم میں سے ایمان لائے

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ — اور اچھے کام کئے، وعدہ کیا ہے کہ وہ

فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ — اُن کو ملک میں حاکم بنائے گا جس طرح

مِنْ قَبْلِهِمْ (نور-۷) — اُن سے اگلوں کو حاکم بنایا تھا،

لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ جس طرح اس دنیا کی فانی زندگی سے اُس دنیا کی باقی زندگی زیادہ پائدار ہے، اسی طرح اس دنیا کے ثواب سے اس دنیا کے ثواب کی قدر و قیمت بھی زیادہ ہے، اور اسی دنیا کے حسنِ عمل کی کوشش سے اُس دنیا کی بہتری بھی ملتی ہے، فرمایا،

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا — جنھوں نے نیک کام کئے، اس دنیا میں اُن کے

حَسَنَةٌ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ۭ — لئے بھلائی ہے، اور بے شبہ آخرت کا

وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ۙ (نحل-۴) — گھر بہتر ہے اور پرہیزگاروں کا گھر کیا اچھا ہے

اسی طرح بدکاروں کی جزا جہاں اُس دنیا کی دوزخ اور آگ کے عذاب کو فرمایا، اسی طرح اس دنیا کی ذلت و خواری اور رسوائی کو بھی فرمایا،

خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ، (حج-۲) — اُس نے دنیا اور آخرت کا نقصان اٹھایا،

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ — اُن کے لئے دنیا میں رسوائی ہے،

فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (بقرہ ۱۴) — اور آخرت میں بڑی مار ہے،

حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (بقرہ ۲۰) اُن کے کام دنیا اور آخرت میں برباد ہوئے

یہ بھی فرمایا :-

فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (آلِ عمران ۶)

تو میں اُن کو دنیا اور آخرت میں سخت سزا دوں گا،

تنگی اور بدحالی کی سزا بھی یہیں ملتی ہے،

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى، (طٰہٰ - ۷)

اور جس نے میری نصیحت سے منہ پھیرا تو اس کیلئے تنگ گذران ہے اور قیامت میں ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے کہ دنیا میں وہ دل کا اندھا بنا تھا

انتہا یہ ہے کہ خود صحابہ کو جنگِ اُحد میں جو فتح نہیں ملی، اللہ تعالیٰ نے اُس کو بھی اُن کی بعض فروگذاشتوں کا ثمرہ بتایا،

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ج (آلِ عمران ۱۶)

تم میں سے جو لوگ اس دن جب دونوں فوجیں بھڑیں پیچھے ہٹے، اُن کے بعض کاموں کی وجہ سے شیطان نے اُنکو پھسلا دیا،

ایک اور مقام پر عام طور سے فرمایا گیا،

وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (شوریٰ - ۱۴)

جو مصیبت تم کو پہنچی وہ تمہارے ہاتھوں کے کرتوتوں کے باعث اور وہ بہت سی باتوں سے درگذر کرتا ہے،

یہود کے ذکر میں قرآن نے اس مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا ہے، عذاب کے موقع پر فرمایا،:-

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا

ان پر ذلت ماری گئی جہاں پائے گئے لیکن

ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ
النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ
ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ذٰلِكَ
بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ذٰلِكَ
بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ،

(اٰلِ عمران ۔ ۱۲)

(جہاں عزت حاصل ہے) وہ خدا کے ذریعہ
لوگوں کے سہارے اور اللہ کا غصہ کمائے
اور اُن پر (قومی) محتاجی ماری گئی، یہ اس لئے
کہ وہ خدا کے حکموں کا انکار کرتے تھے، اور
پیغمبروں کو مار ڈالتے تھے، یہ اس لئے کہ وہ
نافرمان ہیں، اور حدودِ الٰہی سے آگے بڑھتے
ہیں،

اس کے بالمقابل عام اہلِ کتاب سے کہا گیا،

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَ
الْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ
رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ
تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ط،

(مائدہ ۔ ۹ ۔)

اور اگر یہ تورات اور انجیل کو جو اُن کی
طرف اُنکے پروردگار کی طرف سے (اب) اتارا
گیا، اُس کو قائم رکھتے تو وہ اپنے اوپر (برکات
آسمانی) سے کھاتے اور اپنے پاؤں کے نیچے
(ارضی خیر و برکت) سے کھاتے،

ایک اور موقع پر اشارہ ہے،

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَ
اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ
السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا

اور ان آبادیوں کے رہنے والے ایمان لاتے
اور پرہیزگاری کے کام کرتے، تو ہم اُن پر آسمان
اور زمین سے برکتوں کو کھولتے، لیکن

فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ

(اعراف - ۱۲)

انھوں نے خدا کے احکام کو جھٹلایا تو ہم نے اُن کے اعمال کی پاداش میں اُن کو پکڑ لیا

مگر یہ دارُالجزاء فانی ہے لیکن یہاں ایک لغزش گاہ بھی ہے جس سے اہل ہوش کو باخبر رہنا چاہیئے اس دنیا میں گو انسان کو اعمال کی جزا، و سزا کسی نہ کسی رنگ میں ضرور ملتی ہے، مگر کیا شخصی زندگی اور کیا جماعتی حیات کے لحاظ سے یہ دارالجزاء جس کا نام دنیا ہے، عارضی اور فانی ہے یہاں کا غم بھی فانی اور یہاں کی خوشی بھی عارضی ہے، اسلئے صرف اسی دنیا کی کامیابی کو اپنی زندگی کا اصل مطلوب و مقصود اور غایت و منتہا نہیں بنانا چاہیئے، بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ اس سے بھی زیادہ ایک اور وسیع آسمانی مملکت اور لازوال ربّانی سلطنت ہے، جو فنا و زوال کے ہر عیب اور ہر نقص سے پاک ہے اور جہاں کی نعمتیں اس دنیا کی نعمتوں سے کہیں زیادہ بہتر اور غیر فانی ہیں، اس لئے اس فانی دنیا کی لذتوں میں پڑکر اس کو بھول نہیں جانا چاہیئے، اس مسافر کی عقلِ سلیم کی داد کون دیگا، جو راستہ کی عارضی خوش منظریوں اور سفر کی فانی دلچسپیوں میں پڑکر اپنے خوش سواد اور سدا بہار وطن کو فراموش کر بیٹھے،

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى، (اعلیٰ -)

بلکہ تم دنیاوی زندگی کو بڑھ کر چاہتے ہو، حالانکہ آخرت کی زندگی اس سے بہتر اور اس سے زیادہ

وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ، (یوسف - ۷)

اور بیشک آخرت کی مزدوری (یہاں کی مزدوری) سے بہتر ہے،

اسی طرح گنہگاروں کے لئے یہاں کی ذلت و رسوائی سے بڑھ کر ایک اور ذلت و رسوائی کا مقام ہے،

فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْیَ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَکْبَرُ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ (زمر-۳)

تو خدا نے اُن کو اس دنیاوی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھایا، اور شبہ نہیں کہ آخرت کا عذاب اس سے بھی بڑا ہے اگر وہ جانتے،

اس دنیا کی ذلت و رسوائی تو شاید سہ بھی لی جائے مگر وہاں کے عذاب کی سختی کو کون سہ سکتا ہے کہ

وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰی، (طٰہٰ-۷)

اور آخرت کا عذاب البتہ زیادہ سخت اور زیادہ دیرپا ہے،

اس لئے اس فانی دنیا میں انسان کو اپنے حُسنِ عمل کے بدولت جو زور و قوت، جاہ و جلال، نعمت و مال، اور حکومت و سروری ملے، اُن کو بھی آخرت کی لازوال نعمتوں اور وہاں کی غیر فانی بادشاہی کے حصول میں صرف کرنا چاہیے کہ اس سے خود ان دنیاوی نعمتوں کو بھی بقا اور پائداری حاصل ہوگی، اسی فلسفہ کو محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وحیِ حقیقت طراز نے قارون کی نصیحت کے ضمن میں ان لفظوں میں ادا کیا ہے،

وَابْتَغِ فِیْمَآ اٰتٰکَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَکَ مِنَ الدُّنْیَا وَاَحْسِنْ کَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَیْکَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِی الْاَرْضِ ط (قصص-۸)

اور خدا نے جو تجھکو دیا ہے اُس سے آخرت کا گھر تلاش کر، اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھول، اور جس طرح خدا نے تجھ پر احسان کیا ہے تو بھی (خدا کے بندوں پر) احسان کر اور (اس دولت سے) زمین میں خرابی نہ چاہ،

چنانچہ ناخلف یہود پر تباہی اسی لئے آئی کہ وہ دنیاوی زندگی کی دولت و جائداد کی محبت میں

ایسے پھنسے کہ اُن کو اپنے کاروبار میں آخرت کے سود کا خیال بھول کر بھی نہ آیا،

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا	تو اُن کے بعد کچھ ناخلف کتاب کے وارث ہوئے
الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى	جو اس دنیا کے سامان و اسباب کو لیتے ہیں،
وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا وَاِنْ يَّاْتِهِمْ	اور کہتے ہیں کہ ہم کو معاف ہوگا، اور اگر ویسا
عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ۭ اَلَمْ يُؤْخَذْ	ہی سامان و اسباب پھر آئے تو پھر لیں، کیا
عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا	اُن سے کتاب کے حق میں یہ عہد نہیں لیا گیا، کہ
عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ۭ	وہ خدا پر حق کے سوا کچھ اور نہ بولیں، حالانکہ
وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ	جو اس میں ہے، وہ اس کو پڑھ چکے ہیں، اور
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ	آخرت کا گھر پرہیزگاروں کے لئے بہتر ہے
(اعراف - ۲۱)	کیا تم سمجھتے نہیں؟

یہ دارالجزا دارالاصلاح بھی ہے،

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت و شفقت سے انسان کو پیدا کیا، اور اُس کو ہمیشہ کی زندگی کا مقام بھی دکھایا، اور بتا دیا کہ اُس مقام کا دائمی و ابدی استحقاق خود تمہارے عمل سے تم کو حاصل ہو سکتا ہے، اور یہ دنیا وہی زندگی اسی لئے اس کو دی گئی کہ وہ اس زمانہ میں اس سدا بہار سرزمین کی ملکیت کو اپنے عمل کی قیمت سے خرید سکے پھر چونکہ انسان دوسری مصلحتوں کے لحاظ سے طبعاً کمزور، زود فراموش اور بھولنے والا بھی پیدا ہوا، اسلئے اللہ تعالیٰ نے اُس کو اپنی اسی مستعار زندگی میں بار بار اپنے سنبھلنے، سدھرنے اور کامیاب بننے کے موقع عنایت کئے، رسولوں کی بعثت، معلموں کی آمد، شریعت کی تعلیم، پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا

سلسلہ گناہوں پر جسمانی سزا و تعزیر عملِ خیر پر روحانی لذت اور عملِ شر پر روحانی غبار و کدورت کے لوازم اسی لئے مقرر ہوئے کہ اُس کو ہر قدم پر اپنے اعمال پر تنبہ اور اپنی غلط روی کا احساس ہو اور ان سب کے علاوہ اُس نے اپنی غایتِ رحمت سے انسانوں کی تنبیہ و اصلاح کے لئے حسب ذیل مراتب مقرر کئے،

۱۔ نیکی سے برائی کا کفارہ، چونکہ انسان کتنی ہی کوشش کرے اپنی فطری کمزوریوں کی حد سے باہر نہیں نکل سکتا اسلئے جس طرح اس دنیا میں اُس نے انسانوں کے دلوں میں یہ فطری اصول ودیعت کر دیا ہے کہ جس کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہو، اُس کی معمولی برائیوں سے چشم پوشی کی جاتی ہے، یا یہ کہ آخر میں اُس کا کوئی ایک نیک کام اتنا زبردست ہو جاتا ہے کہ اس سے اُسکی تمام اگلی بُرائیوں کی فرد دُھل جاتی ہے، اسی کا نام کفارۂ عمل ہے چنانچہ وحیِ محمدی نے اصولی طور پر یہ حقیقت ان الفاظ میں تلقین کی کہ

اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ،	بے شبہ نیکیاں، برائیوں کو دور کر دیتی ہیں

(ھود - ۱۰)

اس آیت کا یہ بھی منشا ہے کہ نیکیوں کی تدریجی ترقی بالآخر برائیوں کو کم کرتی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ پورا نیکوکار انسان بن جاتا ہے اور یہ بھی خوشخبری اس میں پوشیدہ ہے کہ یہی نیکیاں اسکی پہلی برائیوں کے نتیجہ کو بھی انشاء اللہ مٹا دیں گی، اس معنی کی اور آیتیں بھی قرآن پاک میں ہیں،

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِیْمًا (پ ۵ - ۵)	تم کو جن باتوں سے منع کیا گیا ہے اگر اُن میں کی بُری باتوں سے تم بچتے رہو گے تو ہم تمہاری تقصیریں تم سے اُتار دیں گے اور تم کو عزت کے مقام میں داخل

لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ لَاُكَفِّرَنَّ	البتہ اگر تم نماز کھڑی کرو، اور زکوٰۃ دو اور
وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ	میرے پیغمبروں پر ایمان لاؤ، اور ان کی مدد
اَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ	کروگے، اور اللہ کو اچھی طرح کا قرض دوگے
عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ	تو میں تمہارے گناہوں کو اتار دونگا، اور تمکو ان
تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (مائدہ ۳)	جنتوں میں داخل کرونگا، جنکے نیچے نہریں بہتی ہیں
اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ	یہ وہ ہیں جن کے اچھے عمل کو ہم قبولی اور
مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ	ان کی برائیوں سے درگذر کریں گے
فِیْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ (احقاف ۲)	

۲۔ توبہ کفارہ ہے، انسان کے تمام کاروبار میں اصل شے اُس کا دل ہے، اسی سے وہ پاک ہوتا ہے، اور اسی سے ناپاک بنتا ہے، انسان کا دل اگر خلوص کے ساتھ کسی وقت خدا کی طرف رجوع کرے اور اپنی تقصیروں اور فروگذاشتوں پر اُس کی بارگاہ میں نادم و شرمسار ہو کر اپنی پچھلی زندگی سے بیزار ہو کر آیندہ کے لیے نیکوکاری کا خدا سے مستحکم وعدہ کرلے تو اس کا نام توبہ ہے۔ یہ توبہ گنہگار سے گنہگار انسان کو بھی خدا کی آغوشِ محبت میں لاکر ڈال دیتی ہے، آدم علیہ السّلام قصور، اور پھر اُن کی توبہ، اور رحمتِ الٰہی کا رجوع، واقعہ کے علاوہ اس بات کی ایک مثالی صورت بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آغوشِ رحمت، کس طرح گنہگار انسان کو واپس لینے کیلئے ہمیشہ وا رہتی ہے، رحمت الٰہی کے اس پُرجوش نظارہ کی جو کیفیت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیفۂ وحی اور پیامِ نبوت میں نظر آتی ہے، اس سے ہندوستان کا ہر مت اور دھرم قطعاً محروم، توراۃ

خاموش، زبور کی سریلی آواز مدھم، اور انجیل کی خوشخبری مبہم ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیام ربانی میں اس کی کیفیات اور اصول و شرائط کو جس شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا، وہ گویا رب العلمین کی طرف سے رحمۃ للعالمین کا خاص حصہ تھا، فرمایا،

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا	مگر جس نے توبہ کی، اور ایمان لایا، اور نیک
فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا	کام کئے تو وہ جنت میں داخل ہونگے اور
يُظْلَمُوْنَ شَيْئًا (مریم-۴)	ان پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا،

اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ ایک توبہ کی بھلائی، اس کے گناہوں کے سارے دفتر دھو کر انکی جگہ آپ لے لے گی،

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا	مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا، اور اچھے کام
صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ	کئے تو یہ وہ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں میں
حَسَنٰتٍ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا	(فرقان) بدل دیگا، اور اللہ بخشنے والا رحم والا ہے،

اور یہی اس کی شان رحمت کا اقتضا ہے، یہانتک کہ چور اور ڈاکو بھی اپنے گناہوں سے توبہ کرکے تو ان کو بھی بشارت ہے،

فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ	تو جس نے اپنے پر ظلم کرنے کے بعد توبہ کی اور اپنے
فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ	کو سدھارا تو بیشک اللہ اس پر رجوع ہوگا
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ، اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ	اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے کیا تجھے نہیں معلوم
لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يُعَذِّبُ	کہ آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے،

مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ اللّٰهُ — جس کو چاہے سزا دے اور جس کو چاہے معاف
عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (مائدہ ۷-۶) — کرے اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ قطعی اصول ظاہر فرما دیا کہ

وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَ — اور بیشک میں اسکو بخشنے والا ہوں جس نے
عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى (طٰہٰ ۸-۴) — توبہ کی اور ایمان لایا، اور نیک کام کئے اور

لیکن توبہ کس کے لئے ہے، اور کس شرط کے ساتھ ہے،

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ — اللہ کو ان کی توبہ قبول کرنی ضرور ہے جو
يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ — نادانی سے برا کام کرتے ہیں، پھر جلد توبہ کرتے
مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ — ہیں تو یہی وہ ہیں جنکو اللہ معاف کرتا ہے
عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا — اور اللہ سب جانتا ہے، اور حکمت والا ہے اور
وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ — انکی توبہ نہیں ہے، جو برے کام کرتے جاتے ہیں
السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ — یہانتک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آئی تو اس نے
الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا — کہا اب میں نے توبہ کی، اور نہ انکی توبہ ہے
الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ (نساء) — جو کافر ہو کر مریں،

مقصود یہ ہے کہ توبہ کے بعد اس بندہ کے دل میں آئندہ تلافی اور تدارک کا احساس بھی موجود ہو، اور ظاہر ہے کہ موت کے وقت یہ احساس ممکن ہی نہیں، ہاں اگر وہ توبہ اپنے احساس کے اثر سے کرے، اور اس کے بعد اتفاقاً موت آجائے، تو یقیناً رحمتِ الٰہی اس کے قبول کرنے

میں تامل نہ کرے گی،

وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا	اور جنھوں نے بُرے کام کئے پھر اسکے بعد باز آئے
مِنْ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ	(توبہ کی) اور یقین کیا تو بیشک تیرا رب درگذر
مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (اعراف ۱۵۳)	اسکے بعد بخشنے والا اور رحم کرنیوالا ہے، اور
وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ	اور جو کوئی بُرا کام کرے یا اپنے آپ پر ظلم
ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا	کرے پھر اللہ سے اپنے گناہ کی معافی چاہے تو
رَّحِيْمًا۔ (نساء - ۱۷)	اللہ کو بخشنے والا اور رحم کرنے والا پائے گا،

۳۔ مصائب کی تنبیہ اور کفّارہ، دنیا میں انسان کو مصائب سے زیادہ بُری اور تکلیف دہ چیز کوئی دوسری نہیں معلوم ہوتی، لیکن یہ حقیقت بھلانے کے لائق نہیں کہ افراد بلکہ جماعتیں اور قومیں بھی مصائب ہی کی تنبیہ اور سرزنش سے متنبہ اور ہشیار ہو کر آمادۂ اصلاح ہوتی ہیں چنانچہ اکثر اخلاقی محاسن کے جوہر کو مصیبتوں ہی کی بھٹی نکھار کر کندن بناتی ہے، صبر استقلال، تواضع، شکر محبت اور رحم ان تمام اخلاقی فضائل کی تربیت ان ہی مصائب کے زیر سایہ ہوتی ہے، مغرور سے مغرور انسان بھی جب کسی اتفاقی مصیبت کی ٹھوکر کھاتا ہے، تو سنبھل جاتا ہے اسلیے، غافل انسانوں اور خود فراموش سرمستوں کو ہوش میں لانے کے لیے کبھی کبھی کی مصیبتوں سے بڑھکر کوئی دوسری چیز نہیں کہ انکی بدولت ملحد سے ملحد انسان بھی ایک دفعہ بے قرار ہو کر خدا کا نام لے ہی لیتا ہے، دولت و نعمت اور کامیابی و مسرت وہ شراب ہے، جس کے نشہ کا اُتار اتفاقی مصائب ہی کی ترشی سے ہو سکتا ہے، انسان خدا کو کتنا ہی بھولا ہوا اور اپنی دولت و ثروت پر کتنا

ہی نازاں ہو، لیکن جب وہ کسی افتاد سے دوچار ہوتا ہے، تو دفعتہً اُس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، بیماری، تنگدستی عزیزوں کی موت، آرزوں کی ناکامی اُن میں ہر چیز وہ ٹھوکر ہے، جس کو کھا کر سرمست سے سرمست دماغ بھی ایک دفعہ چونک کر ہشیار ہو جاتا ہے اور اس کو اپنے راستہ کی غلطی معلوم ہو جاتی ہے، اس لئے ان مصائب میں انسانوں کے اعمالِ بد اور گناہوں کا کفارہ بننے کی صلاحیت پوری طرح موجود ہے کہ اس تھوڑی سی تکلیف سے بندہ میں جو احساس پیدا ہوتا ہے وہ بڑی بیش قیمت چیز ہے

قرآن پاک نے اس نکتہ کو جابجا بیان کیا ہے، اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہگاروں کو اس سے پہلے کہ ان کو ہلاک کرے، مصائب کی آزمایشوں میں ڈالتا ہے، تاکہ شاید وہ اپنے بھولے ہوئے مالک کو یاد کریں، اور اپنی غلط روی پر متنبہ ہو کر اپنی ہدایت و اصلاح کی فکر کریں، فرمایا

وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ	اور بیشک ہم نے فرعون والوں کو قحطوں اور
وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ	پھلوں کی کمی کی مصیبت میں گرفتار کیا تاکہ
يَذَّكَّرُوْنَ۔ (اعراف-۱۶)	وہ نصیحت پکڑیں۔

بنی اسرائیل کے متعلق ہے۔

وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ	اور ہم نے ان کو نعمتوں اور مصیبتوں کے ساتھ
لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (اعراف-۲۱)	آزمایا تاکہ وہ شاید باز آئیں

اسی سورہ میں ایک اور جگہ اس اصول کو ایک کلیہ کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے،

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ	اور ہم نے کسی آبادی میں کوئی نبی نہیں بھیجا
اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ	لیکن وہاں کے رہنے والے کو سختیوں اور مصیبتوں

لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ (اعراف-۱۲)

مسلمانوں سے فرمایا گیا،

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۣ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (بقر-۱۹-۷)

اور البتہ ہم تمکو تھوڑے خوف، بھوک، اور دولت کی اور جانوں کی اور پھلوں کی کمی سے آزمائینگے، اور ان صابروں کو خوشخبری سنا کہ جن کو جب کوئی مصیبت ستاتی ہے تو کہتے ہیں ہم خدا کے ہیں اور اسی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، یہ وہ ہیں جن پر اللہ کی برکتیں اور رحمتیں ہونگی اور یہی سیدھی راہ پائے ہوئے ہیں،

اس اصول کے تحت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعدد جزئیات بیان فرمائے ہیں، حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت اتری مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ (نساء-۱۸) (جو کوئی برائی کریگا، اس کا بدلہ اسکو دیا جائیگا، تو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا مطلب پوچھا فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ پر عتاب ہے، اس کا بدلہ دنیا میں بندہ کی ہر تکلیف سے پورا ہو جاتا ہے، جیسے اسکو بخار آجائے، یا وہ کسی اور مصیبت سے دوچار ہو جائے، یہانتک کہ جیب میں کوئی چیز رکھ کر بھول جائے اور اس سے جو تکلیف اسکو پہنچے، وہ تکلیف بھی کفارہ بن جاتی ہے، یہاں تک کہ بندہ گناہوں سے اس طرح صاف ستھرا ہو کر نکلتا ہے، جیسے بھٹی سے سونا[1]" دوسری حدیثوں

[1] یہ اور اس کی ہم معنی حدیثیں اکثر کتب حدیث میں ہیں مثلاً ترمذی تفسیر آخر النساء عن ابی داؤد اوائل کتاب الجنائز

میں ہے، کہ آپنے فرمایا کہ مسلمان کو کوئی مصیبت پیش نہیں آتی ہے، لیکن یہ کہ اللہ تعالیٰ اُس کو اُسکے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے، یہانتک کہ اگر اس کے کوئی کانٹا چبھ جائے تو وہ بھی کفارہ بن جاتا ہے"! تیسری روایت میں ہے کہ آپنے فرمایا کہ "مسلمان کو کوئی تکلیف یا بیماری، یا غم، یا اذیت نہیں پہنچتی لیکن یہ کہ وہ اُس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے، یہانتک کہ اگر اُس کے کوئی کانٹا چبھ جائے تو وہ بھی"! چوتھی روایت میں ہے کہ آپنے فرمایا کہ کسی مسلمان کو کوئی تکلیف کانٹا چبھنے سے لیکر اوپر تک جتنی بھی پہنچے، اللہ تعالیٰ اُس سے اُس کے گناہوں کو اس طرح جھاڑ دیتا ہے جیسے درخت کے پتے جھڑ جاتے ہیں"[1]! پانچویں روایت میں ہے کہ آپنے فرمایا کہ "دنیا میں جو مسلمان کسی جرم کا مرتکب ہوا، اور اُس کی سزا اُس کو یہیں مل گئی، تو وہ اس کے لیے کفارہ اور اسکو اس گناہ سے پاک وصاف بنانے والی ہے"[2]!

سطور بالا سے ہویدا ہے کہ کوئی انسان جو اقرار توحید کے بعد گناہ سے ملوث ہو گیا ہو دنیا میں توبہ، اعمالِ نیک اور مصائب پر صبر وشکر کے ذریعہ سے نجات پا سکتا ہے، اور اس دنیا سے اسی طرح پاک وصاف ہو کر نکل سکتا ہے کہ موت کے بعد اس کو کسی نئے کفارۂ گناہ کی ضرورت پیش نہ آئے،

اسی لیے قرآن پاک میں ہے۔

وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (سجدہ ۲)	اور ہم البتہ انکو بڑے عذاب کے پہلے ادنیٰ عذاب کا کچھ مزہ چکھائیں گے تاکہ وہ اب بھی باز آئیں،

[1] صحیح بخاری اوائل کتاب المرضیٰ میں یہ تینوں روایتیں ہیں [2] صحیح بخاری کتاب الرد علی الجہمیۃ،

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ عذاب الٰہی کا مقصد انتقام اور نفس سزا اور عقوبت نہیں بلکہ شریر نفس کو راہ راست پر لانا ہے، اسی لئے ایک اور آیت میں فرمایا

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ — اللہ تعالیٰ تمکو عذاب دیکر کیا کریگا اگر تم

وَاٰمَنْتُمْ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا — شکر کرو اور ایمان لاؤ کہ خدا نیکیوں کا

(نساء - ۲۱) — قبول کرنے والا (تمھارے ہر عمل کو) جاننے والا ہے،

الغرض یہ عذاب اس دنیا میں آیندہ گناہوں سے بچانے اور گذشتہ گناہوں سے پاک کرنے کے لئے ہوتا ہے، اور عالم برزخ اور عالم بعث چونکہ عمل کے محل نہیں اس لیے ان دونوں مقاموں میں آیندہ کوئی سوال نہیں پیدا ہو سکتا، صرف گذشتہ بداعمالیوں کی سزا بھگت کر ان کے نتائج سے نجات مل سکتی ہے، اور یہی عالم برزخ اور عالم بعث کے عذابوں کا مقصد ہے، الا یہ پروردگار عالم خود اپنی رحمت سے نوازے اور معاف فرمائے،

عذاب برزخ بھی کفارہ ہے

لیکن اگر کسی انسان کے اندر گناہوں کی ناپاکیاں اتنی زیادہ ہیں کہ اسکی دنیاوی زندگی کے تمام کفارے بھی اسکو دھوکر پاک وصاف نہ بنا سکے، تو اس کو اپنے مرنے کے بعد بھی برزخ کے عالم میں اپنے اعمال بد کی مناسب سزاؤں کی صورتوں میں تکلیفیں اٹھا کر پاک وصاف بننا پڑیگا، یہی عالم برزخ کا عذاب ہے، اس سے ظاہر ہوگا کہ عالم برزخ کی یہ سزائیں اس لئے ہیں کہ ہم نے دنیا میں اپنی ناپاک خواہشوں اور ناپاک کاموں سے احتراز کرنے کی جو زحمت نہیں اٹھائی، اور اچھے کاموں کے کرنے سے جو تھوڑی تکلیف پیش آتی ہے اس کو برداشت کرکے اچھے کام جو نہیں کئے ان دونوں کے معاوضہ میں عالم برزخ میں اگر عذاب

کی تکلیفیں اٹھائیں، تاکہ حیاتِ ثانی کے دروازہ پر پہنچ کر بھی اگر ہم ان سزاؤں کے ذریعہ پاک و صاف ہو سکیں تو پاک و صاف ہو کر اپنی موروثی بہشت کے قابل بن سکیں، جو صرف پاکوں اور بے گناہوں کی جگہ ہے، یعنی اُن کی ہے جو بامرے سے کسی گناہ کے مرتکب نہ ہوئے ہوں یا یہ کہ گناہ کے مرتکب ہوئے، مگر اعمالِ نیک، توبہ اور مصائب میں صبر و شکر کر کے یا برزخ میں سزا پا کر وہ گناہوں کے داغ سے نجات پا گئے،

یہ بات کہ عذابِ برزخ بھی ہمارے گناہوں کا کفارہ ہے، اسلام کے اس اصول سے مترشح ہے کہ ایک مسلمان کی ہر تکلیف اس کے کسی نہ کسی گناہ کا کفارہ ہے، اس بنا پر عذاب برزخ بھی اس کے گناہ کا کفارہ ہو گا، قرآن پاک کی بعض آیتوں سے یہ بات بھی کنایۃً نکلتی ہے گنہگار حشر کے دن کہیں گے،

وَبَلَغْنَا اَجَلَنَا الَّذِیْ اَجَّلْتَ لَنَا (انعام - ۱۵)

اور ہم مقررہ وقت جس کو تو نے ہمارے لئے مقرر کیا تھا، پہنچ چکے،

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حشر سے پہلے عذاب کے ایک دور کو ختم کر چکے،

بعض حدیثوں میں بھی اس کنایہ کی تصریح ملتی ہے، کنز العمال میں ایک حدیث ہے،

عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ طُوْلَ مَقَامِ اُمَّتِیْ فِیْ قُبُوْرِهِمْ تَمْحِیْصٌ لِذُنُوْبِهِمْ (کنز العمال، باب عذاب القبر جلد ۹ ص ۹۶)

ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میری امت کے لوگوں کا اپنی قبروں میں طول قیام اُن کو گناہوں سے خالص کرتا ہے

اسی لئے ایک اور حدیث میں آیا ہے،

اَکثرُ عذابِ اُمتی فی قبورِھا[1] — میری امت کے لوگوں کو زیادہ تر عذاب انکی قبروں میں ہوگا،

اس حدیث کا (اگر وہ ثابت ہو تو) منشا یہ ہے کہ امتِ محمدیہ کے اکثر افراد اسی برزخ کے محدود زمانۂ عذاب میں نکھر کر اور پاک وصاف ہو کر جنت کے قابل ہو جائیں گے اور عذابِ دوزخ کی ضرورت ان کو پیش نہ آئے گی، حافظ ابن قیم ایک موقع پر لکھتے ہیں،

فَاِن وفت بالخلاص منھا فی ھذہ الدار والا ففی البرزخ، فان وفی بالخلاص والا ففی موقف القیامۃ والا ففی النار وآخرھا ما یخلصھم من تلک البقیۃ

اگر ان بیماریوں کا یہ علاج اس دنیا میں نجات کیلئے پورا ہو گیا، تو خیر، ورنہ برزخ کی سزا سے علاج کیا جائیگا، تو اگر یہ نجات کیلئے کافی ہو گیا تو خیر ورنہ پھر قیامت کا مقام، اور اسکی ہولناکیاں باقی بیماریوں سے، اور دوزخ کی سزا ہے جو کچھ باقی رہ جائے،

دوبارے برزخ کی حدیث میں جو پہلے مفصل گذر چکی ہے، وہ منظر دکھایا گیا ہے، جس میں گنہگار عذاب کے دور سے نکل کر، اور نہر حیات میں نئی زندگی پاکر بہشت کے مستحق قرار پائے ہیں، غالباً انہی نجات پانے والے مومنوں کو دیکھ کر مشرکین بھی قیامت میں یہ کہیں گے،

وَیَوْمَ یَحْشُرُھُمْ جَمِیْعًا یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَکْثَرْتُمْ مِنَ الْاِنْسِ ج وَقَالَ اَوْلِیٰٓؤُھُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِیْٓ

اور جس دن وہ ان سب کو اکٹھا کریگا اے گروہ جن! تم نے بہت سے انسانوں کو اپنا بنا لیا، اور انکے دوست انسان کہیں گے کہ ہمارے پروردگار ہم میں سے ایک نے دوسرے سے کام نکالا،

---

[1] اس حدیث کو شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ باب لوقائع الحشر یہ میں نقل کیا ہے لیکن مجھے اس کا اصل ماخذ معلوم نہ ہو سکا، [2] شفاء العلیل لابن القیم مطبوعہ حسینیہ مصر ص ۲۲۴ [3] صحیح بخاری کتاب التعبیر

اَجَّلْتَ لَنَا،	اور ہم مقررہ وقت کو جس کو تو نے ہمارے لئے
(الانعام ۱۵)	ٹھہرایا تھا پہنچ چکے،

یہ الفاظ کہ ہم اپنے مقررہ وقت کو جس کو تو نے ہمارے لئے مقرر کیا تھا، پہنچ چکے" یہ معنی رکھتے ہیں، کہ "عالم برزخ" کا مقررہ دورۂ عذاب ہم ختم کر چکے، اور اب حشر ونشر کے عذاب کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے، اسلئے بعض دوسرے نیک بختوں کی طرح ہمکو بھی اب چھٹکارا ملے جواب ملے گا،

قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ	فرمائیگا، آتش دوزخ تمہارا ٹھکانا ہوا
اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ	اس میں سدا رہوگے لیکن یہ کہ جو اللہ چاہے
عَلِيْمٌ (الانعام-۱۵)	بیشک تیرا رب حکمت اور علم والا ہے،

اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تمہارا دورۂ عذاب ختم نہیں ہوا ہے اور تمہاری پاکیزگی ابھی کامل نہیں ہوئی، اس لئے ابھی اس دوسرے عالم کا عذاب بھی تمکو سہنا ہے، پھر جب خدا چاہے گا، تم کو اس سے نجات دیگا، اس کا ہر کام علم وحکمت پر مبنی ہے، اس کے علم وحکمت اور مصلحت کا جب تقاضا ہوگا تمکو نجات[1] ملے گی۔

عذاب دوزخ کفارۂ گناہ ہے ابھی یہ آیت اوپر گذر چکی ہے،

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ	خدا کو تمہارے عذاب سے کیا کام اگر تم شکر کرو
وَاٰمَنْتُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا	اور ایمان لاؤ کہ خدا تمہاری شکر گذاری کو
(نساء-۱۴۷)	قبول کرنیوالا اور تمہارے دلوں کے حال کو

[1] حسب تفسیر ابن عباسؓ، ابن جریر طبری ج ۸ ص ۲۴ مصر،

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو گنہگاروں کے عذاب سے کوئی خوشی نہیں حاصل ہوتی نہ وہ چاہتا ہے کہ اُس کے گنہگار بندے اس عذاب میں مبتلا ہوں، لیکن ازل سے اس نے اپنے جو قانون مقرر کر دیئے ہیں، وہ اُن کو توڑتا بھی نہیں، جس وقت آدمؑ کو جنت کی سرزمین سے نکال کر اس دنیا میں اس لئے بھیجا گیا کہ وہ اپنے عمل کے استحقاق سے اس جنت کو دوبارہ ہمیشہ کے لیے حاصل کریں، اسی وقت یہ قانون بھی اُن کو سنا دیا گیا تھا،

اِهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ	یہاں سے تم سب اترو، تو اگر تمہارے پاس
مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ	میری طرف سے کوئی ہدایت اترے تو جس نے میری
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ وَالَّذِيْنَ	ہدایت کی پیروی کی، تو اُن پر نہ کوئی خوف
كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ	ہے اور نہ غمگین ہونگے، اور جنھوں نے ناشکری
اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا	کی اور ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تو وہی
خٰلِدُوْنَ، (بقرہ ۷-۴)	دوزخ والے ہونگے، وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے،

اس آیت میں مستحقِ دوزخ ہونے کی دو وجہیں بیان کی گئی ہیں، ایک کفران اور دوسری تکذیب، دیکھو کہ اوپر کی تسار والی آیت میں عذابِ دوزخ سے نجات پانے کی دو شرطیں شکر اور ایمان اُن کے بالمقابل ہیں، اس سے ظاہر ہوا کہ شکر اور ایمان استحقاق جنت کی شرطیں اور کفران و تکذیب استحقاق دوزخ کے اسباب ہیں، بقیہ تمام نیکیاں شکر اور ایمان کے فروع اور تمام برائیاں کفران اور تکذیب کی شاخیں ہیں،

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس لئے نہیں بنایا کہ وہ اُن کو پیدا کر کے دوزخ کا ایندھن بنائے

بلکہ اُس نے تو اُن کو اپنی رحمت کے ظہور کے لئے پیدا کیا، غیظ و غضب کے اظہار کے لئے نہیں فرمایا،

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ	ہم نے یہ امانت آسمانوں پر، زمین پر اور پہاڑوں
وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ	پر پیش کی، تو اُن سب نے اُس کے اُٹھانے سے
يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا	انکار کیا، اور ڈرے اور انسان نے ان کو اٹھا لیا،
الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا	کہ وہ ظالم اور نادان تھا، تاکہ اللہ نفاق کو
لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ	کرنے والوں اور نفاق کرنے والیوں اور
وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَ	شرک کرنے والوں اور شرک کرنے والیوں کو
يَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ	سزا دے اور ایمان والوں اور ایمان والیوں
الْمُؤْمِنٰتِ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا	پر وہ اپنی رحمت کیساتھ رجوع ہو اور
رَّحِيْمًا، (احزاب - ۹)	اور اللہ تو بخشنے والا اور رحمت والا ہے

اس آیت پاک سے صاف ہویدا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی اصلی صفت یہی ہے کہ وہ غفور و رحیم ہے، یعنی بخشش و رحمت اُس کی صفت ذاتی ہے، اب اگر کوئی اپنے آپ پر ظلم کر کے گناہ کرتا ہے اور اس لیے وہ اپنے کو رحمت الٰہی سے دور کر لیتا ہے، تو یہ خود انسان کا فعل ہے،

فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ	اللہ نہ تھا کہ اُن پر ظلم کرتا لیکن وہ اپنی
كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (توبہ)	جانوں پر آپ ظلم کرتے ہیں،
وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ (مومن)	اور اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا،

غرض جو کچھ ہے، وہ اپنے اعمال کا نتیجہ ہے،

لِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰی (طٰہٰ۔)　　کہ ہر جان کو اپنے ہی کئے کا بدلہ دیا جائیگا۔

اس لیے بہشت یا دوزخ جو کچھ ہے انسان کے اپنے ہی عمل کا لازمی نتیجہ ہے، جس طرح دنیا کے ہر عمل کا کوئی نہ کوئی لازمی نتیجہ ہے، مثلاً کھانے کا نتیجہ شکم سیری، پینے کا سیرابی بھوک کا تکلیف، بیماری کا بے آرامی، گرنے کا چوٹ، زہر کا موت، شہد کا مٹھاس، غرض ہر اچھے برے فعل کا ایک لازمی جسمانی نتیجہ ہے، جو دنیا میں ہمارے عمل کے بعد ہم کو ملتا رہتا ہے، اسی طرح ہمکو اپنے اعمال کا ایک روحانی نتیجہ بھی لازمی ملنے والا ہے، جو ہم کو اس دوسرے عالم میں ملے گا تو جس طرح زہر کھا کر مرنے کی ذمہ داری خود ہم پر عائد ہوتی ہے، اور ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم زہر کھا کر مر کیوں گئے بلکہ زہر نے ہمکو چوٹ کیوں آئی، اسی طرح ہم یہ سوال بھی نہیں کر سکتے کہ ہمکو انکے اعمال کے بعد دوزخ کی سزا کیوں ملی، کہ دونوں ہمارے اعمال کے یکساں لازمی نتیجے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی غایتِ رحمت سے ہمکو اعمال کے نتیجوں سے قبل از وقت مطلع فرما دیا ہے، ہم کو اس نے نیک و بد کی تمیز کا احساس بخشا، عقل عنایت کی، ضمیر عطا کیا، پھر نبی اور رسول بھیجے، شریعت دی، کتاب مرحمت فرمائی، اس پر بھی اگر ہم باز نہ آئے اور ان اعمال کا ارتکاب کیا تو ہم کو ان اعمال کے نتائج سے کون بچا سکتا ہے،

رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا　　یہ رسول بھیجے، نیکوں کو خوشخبری سنانیوالے
یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌ بَعْدَ الرُّسُلِ　　اور بدکاروں کو ہشیار کرنے والے تاکہ
(نساء۔ ۳۳)　　خدا پر انسان کی حجت باقی نہ رہے،

پھر اپنی رحمت سے سب سے آخر میں اپنی رحمت کے کامل مظہر کو دنیا میں بھیجا،

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (انبیاء-۱۰۷)

ہم نے تجھ کو (اے پیغمبر) ساری دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا،

لیکن ظالم و نادان انسانوں نے اس رحمت کے قبول سے انکار کیا، اور طرح طرح کی بداعتقادیوں اور بداعمالیوں سے اپنے کو برباد کیا، اور جس غرض سے خدا نے اُن کو پیدا کیا تھا اس سے اعراض کیا اور اپنے کو خود اپنے ہاتھوں سے ہلاکت و بربادی میں مبتلا کیا،

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ (هود-۱۰)

اور نہ تھا تیرا رب جو آبادیوں کو ظلم سے ہلاک و برباد کرتا اور انکا لیکہ ان کے رہنے والے نکوکار ہوتے اور اگر تیرا رب چاہتا تو سب لوگوں کو (زبردستی) ایک راہ پر کر دیتا، لیکن وہ ایسی زبردستی نہیں کرتا) اور وہ یونہی ہمیشہ اختلافات میں رہتے ہیں، مگر جن پر تیرے رب

اس آیت سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو رحمت کے لیے بنایا ہے، عذاب کیلئے نہیں، لیکن انسان خود اپنے عمل سے خدا کی رحمت کے بجائے اس کے عذاب کا مستحق اور اپنے کو ٹھہراتا ہے، اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں،

لِلرَّحْمَةِ خَلَقَهُمْ وَلَمْ يَخْلُقْهُمْ لِلْعَذَابِ (طبری ج ۱۲ ص ۱۱۱ مصر)

خدا نے انسانوں کو رحمت کے لیے پیدا کیا، عذاب کے لئے نہیں،

لیکن اگر ظالم و نادان انسان نے خدا کی ان پے در پے رحمتوں کے باوجود اپنے کو اُس کی

رحمت کا مستحق نہ بنایا، تو کیا وہ خدائے رحمٰن و رحیم جس کا یہ اعلان ہے،

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ط (انعام - ۲) — اُس (خدا) نے (مخلوقات پر) رحمت کو اپنے اوپر واجب کر لیا ہے۔

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ط (انعام - ۶) — تم پر سلامتی ہو تمہارے رب نے رحمت کو اپنے اوپر فرض ٹھہرا لیا ہے،

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (اعراف - ۱۹) — اور میری رحمت نے ہر چیز کو سما لیا ہے،

وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ (الکہف) — اور تیرا پروردگار بخشنے والا رحمت والا ہے،

وَرَحْمَتِيْ سَبَقَتْ غَضَبِيْ (صحیح بخاری) — اور میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی،

وہ اپنے گنہگار و سیہ کار بندوں سے ہمیشہ کے لیے اپنا منہ موڑ لے گا، حالانکہ اس کی رحمت کسی غرض سے نہیں، بلکہ بے غرض ہے، فرمایا:

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ (انعام - ۱۶) — اور تیرا رب بے نیاز رحمت والا ہے،

اور تسلی دی ہے،

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ط (زمر - ۶) — اے میرے وہ بندو! جنھوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا ہے خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو، خدا سب گناہوں کو معاف کرتا ہے بیشک

اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (زمر - ۶) — وہی بخشنے والا رحمت والا ہے،

اُس کی رحمت کا ظہور جس طرح اس دنیا میں ہوا ہے، اس دنیا میں بھی ہوگا، اور وہاں

اس کی رحمت کا سب سے بڑا مظہر اُس کے مقامِ لعنت (دوزخ) سے دوری، اور اُس کے مقامِ رحمت (بہشت) سے قرب ہی فرمایا،

مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ	جس سے خدا کا عذاب ہٹا یا گیا وہی ہے
رَحِمَهٗ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ	جس پر اُس نے اپنی رحمت کی، اور
(انعام - ۲)	اس کی رحمت کا پھول ہی کھلی کامیابی ہے،

اللہ تعالیٰ کی ان پے در پے رحمتوں کا یہ تقاضا ہے کہ وہ گنہگاروں کو زیادہ سے زیادہ یہ کہ اُن کے نتائجِ عمل کے بھگت لینے کے بعد آخر کار اپنی رحمت کے سایہ میں لے لے اور وہ اُن کو اپنی بخششوں سے سرفراز فرمائے،

دوزخ قید خانہ نہیں شفا خانہ ہے

انسان جب عدم حفظِ صحت کی غلط کاریوں کے سبب سے بیمار ہو جاتا ہے تو اکثر یہی سمجھا جاتا ہے کہ فطرت نے اس کو ان کے معاوضہ میں بیماری کی تکالیف کی سزائیں دی ہیں، مگر واقعہ یہ نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ ان غلط کاریوں کے جو بُرے نتائج انسان کے جسم کے اندر پیدا ہو گئے ہیں، اُن کو دور کرنے کے لیے جسم عہدہ جہد کرتا ہے، اس لڑائی کا نام بیماری، اور اس لڑائی کی کشمکش کا نام بیماری کی تکالیف و آلام ہے جن کو ہم درد سر، درد شکم، اعضا شکنی، اور بیخوابی وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، یہی روحانی بیماریوں کا حال ہے، جن کو ہم اصطلاح شرعی میں گناہ اور جن کے نتائجِ بد کو "عذاب" کہتے ہیں، یہ نتائج آتشِ دوزخ اور اُس کے شدائد و آلام کی صورت میں ظاہر ہوں گے، اور جن کا منشا یہ ہوگا کہ روح انسانی اپنی غلط کاریوں کے نتائجِ بد کو دور کرنے کیلئے جد و جہد میں مصروف ہوگی، وہ اُن سے عہدہ برآ ہوگی، خدا کی

رحمت سے سرفرازی پاکے اس عذاب سے نکل کر اپنی موروثی بہشت میں داخل ہوگی،

اس تمہید سے یہ ظاہر ہے کہ دوزخ کی مثال یہ نہیں ہے کہ وہ مجرموں کے لیے قیدخانہ ہے، بلکہ یہ ہے کہ وہ بیماروں کے لیے شفاخانہ ہے، بیمار کو شفاخانہ کے اندر بھی ہر قسم کی تکلیفیں محسوس ہوتی ہیں، درد، اعضار شکنی، شدتِ تشنگی، سوزشِ جسم، وہاں کڑوی سے کڑوی غذا پلائی جاتی ہے، بدمزہ سے بدمزہ کھانا کھلایا جاتا ہے، ضرورت ہوتی ہے، تو اس کو نشتر دیا جاتا ہے، اس کا کوئی عضو کاٹا جاتا ہے، کوئی داغا جاتا ہے، اور ان سب کی تکلیفیں اس کو اٹھانی پڑتی ہیں، مگر یہ ساری ایذارسانی، کسی انتقام اور تکلیف دہی کی غرض سے نہیں ہوتی، بلکہ عدم صحت کی غلط کاریوں کے بُرے نتائج سے اس کے جسم کو محفوظ رکھنے کی غرض سے کیجاتی ہے، اس کو جو تکلیفیں وہاں محسوس ہوتی ہیں، وہ گو شفاخانہ کے اندر ہی محسوس ہوتی ہیں، مگر ان کا سبب شفاخانہ نہیں بلکہ خود اس بیمار کا اصولِ صحت سے دانستہ یا نادانستہ انحراف کرنا اور اس کی وجہ سے ان بیماریوں میں مبتلا ہونا ہے،

یہ اصول اُن آیتوں اور صحیح حدیثوں سے پوری طرح سمجھ میں آتا ہے، جن میں بالآخر عذابِ دوزخ سے نجات پانے کی کیفیت بیان کی گئی ہے دنیاوی آلام و تکالیف کی نسبت قرآن نے یہ اصول پیش کیا ہے،

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	اور تاکہ خدا ایمان والوں کو پاک و خالص
وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ، (آل عمران ۱۴)	کرے، اور کافروں کو مٹائے،

یہی اصول عذاب آخروی پر صادق آتا ہے، کہ اس سے بھی مقصود گنہگار اہلِ ایمان کی پاکی و صفائی ہے، چنانچہ حدیث صحیح میں ہے کہ حقوقِ عباد کے بعد

حَتّٰی اِذَا اَھْذَبُوْا وَنُقُّوْا اُذِنَ لَھُمْ فِیْ دُخُوْلِ الْجَنَّۃِ (صحیح بخاری، باب القصاص یوم القیامۃ ص ۹۲۷)	یہاں تک کہ جب گنہگار چھٹ جائیں گے اور پاک صاف ہو جائیں گے، تب ان کو جنت میں داخل ہونے کی اجازت ملے گی،

اس حدیث میں یہ دو لفظ ھُذِّبُوْا وَنُقُّوْا در اصل تشریح طلب ہیں، ھذّبوا کا مصدر تَھذیب ہے تہذیب کے لغوی معنی یہ ہیں کہ درختوں کی خراب شاخیں اس لیے چھانٹ دیجائیں تاکہ اُن میں سرسبزی و شادابی پیدا ہو، اور ترقی کی نئی زندگی اُن کو مل جائے، اور نَقُّوا کا مصدر تنقیہ ہے، تنقیہ کے اصلی معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کے اندر سے خراب فاسد مادہ کو الگ کر دیا جائے تاکہ وہ پوری طرح نکھر جائے، اس تشریح سے صاف کھل گیا کہ گنہگاروں کو جنّت کے داخلہ کیلئے کیا درکار ہے، اسی لئے قرآن پاک میں ہے کہ اہلِ جنّت جب جنّت کے قریب پہنچیں گے تو ندا آئے گی،

طِبْتُمْ فَادْخُلُوْھَا خٰلِدِیْنَ، (زمر ۔ ۸)	تم پاک وصاف ہو چکے تو جنّت میں سدا کے لئے آرجاؤ،

الغرض جب اُس طیب پاکیزگی کا دور آئے گا تو گنہگاروں کو بھی نجات ملے گی، اسی لئے ہر گنہگار کے لیے دوزخ سے نکلنے کی مدت خواہ کتنی ہی طویل ہو مگر بہرحال اُس کی انتہا ہے، فرمایا

لٰبِثِیْنَ فِیْھَا اَحْقَابًا (نبا)	دوزخ میں وہ صدہا سال تک پڑے رہیں گے لیکن بالآخر ان صدہا سال کا بھی ایک دن خاتمہ ہوگا، اور خدا نے چاہا تو اُن کو نجات ملیگی،

حدیث رویا سے دوزخ میں ہے کہ آپ نے دوزخ میں کچھ ایسے لوگوں کو بھی دیکھا جنھوں نے کچھ اچھے اور کچھ برے کام کئے تھے، اُن کا آدھا دھڑ تو نہایت خوبصورت اور آدھا سخت

بدصورت تھا، جب اُن کی سزا کی مدت ختم ہوئی تو فرشتوں نے اُن سے کہا کہ جاؤ اور اس نہر میں جاکر پڑ جاؤ، سامنے وہ نہر تھی، جس میں خالص سپید پانی بہ رہا تھا، وہ اس میں جاکر پڑ گئے، پھر نکل کر آئے، تو ان کی وہ بدصورتی جاتی رہی، اور نہایت خوبصورت[1] ہو گئے، اس سے ظاہر ہے کہ خدا کی رحمت کیونکر گنہگاروں کو سرفراز فرمائے گی،

کیا دوزخ بھی ایک نعمت ہے

اس تفصیل کے بعد اگر یہ کہا جائے کہ قیامت اور دوزخ کی ہولناکیاں اور سزائیں بھی گنہگاروں کے لئے اللہ تعالیٰ کی اسی طرح نعمت ہیں جس طرح اس دنیا میں شفاخانوں کا وجود بیماروں کے لیے نعمت ہے، اگر دوزخ نہ ہوتی تو گنہگاروں کی پاکیزگی، اور پاکوں کی جنت میں ان کے داخل ہونے کی کوئی صورت نہ تھی اُس رحمان و رحیم کی رحمت و کرم نے گوارا نہ کیا کہ ان بدبختوں کو اُن کی نافرمانیوں کے باوجود ہمیشہ کے لیے محروم رکھا جائے، اس لئے ان کی صفائی کے لیے پہلے برزخ کا حمام مقرر کیا، اور جو اس سے بھی پاک نہ ہو سکیں، ان کے لیے دوزخ کی آگ مقرر کی کہ وہ اپنی ہر قسم کی بداعمالیوں کے میل کچیل کو جلا کر نکھر کر پاک ہو جائیں، اور کندن بن کر بالآخر اپنی آبائی اور فطری وراثت (جنت) پائیں، اس نظریہ کو پیش نظر رکھ کر قرآن پاک کی ان آیتوں کو پڑھئے، جن میں قیامت اور دوزخ کی ہولناکیوں اور مصیبتوں کو بھی نعمت سے تعبیر کیا گیا ہے، فرمایا۔

یُرْسَلُ عَلَیْکُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ	تم پر آگ کے صاف اور دھواں بے شعلے
وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرَانِ ۝ فَبِاَیِّ	چھوٹیں گے پھر کوئی تمہاری مدد کر سکے گا تو

[1] صحیح بخاری کتاب التعبیر،

اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ فَاِذَا انْشَقَّتِ	اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو تم جھٹلاؤ گے،
السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ	پھر جب آسمان پھٹ کر لچھٹ کی طرح گلابی
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ فَيَوْمَئِذٍ	ہو جائیگا، تو اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو
لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ	تم جھٹلاؤ گے، پھر اس دن کسی انس و جن سے
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ يُعْرَفُ	اس کے گناہ کی نسبت پوچھا نہ جائیگا تو
الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ	تم اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے،
وَالْاَقْدَامِ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا	گنہگار اپنی نشانیوں سے پہچان لیے جائیں گے
تُكَذِّبٰنِ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ	پھر وہ اپنی پیشانیوں کے بال اور پاؤں سے
يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ، يَطُوْفُوْنَ	پکڑے جائیں گے، تو اپنے پروردگار کی کن
بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ	نعمتوں کو تم جھٹلاؤ گے، یہ وہ دوزخ ہے، جسکو
رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ،	گنہگار جھٹلاتے تھے، وہ اس دوزخ اور
(رحمٰن - ۲)	گرم پانی کے بیچ میں گشت کریں گے، تو ہم
	اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے،

ان آیتوں کی تفسیر کسی پہلو سے بھی کیجئے، یہ بات بہرحال ماننی پڑے گی کہ قیامت اور دوزخ کے ہولناک احوال، مجرموں کے حق میں نعمت ہیں، اس لیے بھی کہ دنیا میں وہ اُن کے ڈر سے بُرائیوں کو چھوڑ کر راہِ راست پر آتے ہیں، اور اس لئے بھی کہ آخرت میں وہ انہی کے ذریعہ سے اپنے گناہوں کے نتائجِ بد سے بری ہو کر بہشتِ ربّانی کے لائق بن سکیں گے،

دوزخ رحمت الٰہی کا ظہور اور نجات،

انسان اور وہ بھی اللہ کی توحید کا قائل اور رسولوں کی صداقت کا معترف خواہ کسی قدر گمراہ اور گنہگار ہوتا، ہم اس کے نامۂ اعمال میں کچھ نہ کچھ نیکیاں ضرور ہوں گی، قیامت گو اللہ تعالیٰ کے عتاب و جلال کا روز ہوگا، جس میں ہر گنہگار کو اپنی گنہگاری کا ملزم ہونا پڑے گا، مگر بالآخر اس رحمان و رحیم کی شان رحیمی کا ظہور ہوگا، اور رَحْمَتِی سَبَقَتْ غَضَبِیْ (اور میرے غصہ سے میری رحمت سبقت لے گئی ہے) کے اعلان کا مصداق شفاعت کی صورت میں جلوہ گر ہوگا، اور گنہگاروں کو اُس کی بدولت گناہوں کے داغ سے پاک صاف ہو کر پاکوں کی بہشت میں داخلہ کی اجازت ملے گی، فرمایا،

وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا	اور جو اللہ پر ایمان لائے اور اچھے کام
يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ	کرے اس سے اس کی برائیاں جھاڑ دیگا،
جَنّٰتٍ، (تغابن - ۱۰)	اور اسکو جنت میں داخل کرے گا،
وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ	اور دوسرے لوگ جنھوں نے اپنے گناہوں
خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا	کا اقرار کیا، اور ملایا ایک کام نیک اور
عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ	دوسرا بد، شاید اللہ ان کو معاف کرے
اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (توبہ - ۱۳)	بیشک اللہ بخشنے والا رحم والا ہے

اس معافی کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ وہ بالکلیہ یعنی عذاب کے بغیر ہی معاف کر دے، دوسری یہ کہ وہ دوزخ میں کچھ دن جا کر خدا کی معافی سے سرفراز ہو کر اُس سے نکلیں، فرمایا،

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ	اور تم میں کوئی نہیں جو جہنم میں وارد نہ ہوئے

! عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا، ثُمَّ نُنَجِّي	رب کا یہ ضروری فیصلہ ہے، پھر ہم اُن کو
الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ	جو خدا سے ڈرے، نجات دیں گے اور مشرکوں
فِيْهَا جِثِيًّا، (مریم-۵)	اور کافروں کو ہم اسمیں گھٹنے کے بل گرے ۲

احادیثِ صحیحہ میں اس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حسبِ ذیل تصریحات مذکور ہیں،

۱۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شفاعت کے ذریعہ لوگ دوزخ سے چھوٹی ککڑیوں کے مانند نکلیں گے،" (صحیح بخاری، کتاب الشفاعۃ)

۲۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "دوزخ سے کچھ لوگ اس کی سلاسل کھا کر نکلیں گے، اور جنت میں داخل ہونگے" (صحیح بخاری کتاب الشفاعۃ)

۳۔ حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جنت والے جنت میں اور دوزخ والے دوزخ میں داخل ہو چکیں گے، تو خدا فرمائیگا، کہ جس کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکالو تو وہ کوئلے ہو کر نکلیں گے، پھر وہ نہر حیات میں ڈال دیئے جائیں گے، تو وہ اسطرح اگیں گے جس طرح سیلاب کے بہاؤ میں، جنگلی دانہ اگتا ہے، (صحیح بخاری کتاب الشفاعۃ)

۴۔ حضرت انس بنؓ مالک سے روایت ہے کہ آپ نے قیامت کے حالات بیان کرتے ہوئے۔ فرمایا پھر میں سجدہ میں گر پڑونگا، اور پڑا رہوں گا، تو آواز آئے گی کہ اے محمد! سر اٹھا، مانگ دیا جائیگا، تو میں سر اٹھاؤں گا، اور اس حمد سے جو خدا مجھے سکھائے گا، اس کی حمد کرونگا، اور سفارش کرونگا، تو خدا ایک حد مقرر فرمائیگا تو میں اُن کو دوزخ سے نکالوں گا، اور جنت میں داخل کر دونگا، پھر لوٹ کر آؤں گا اور سجدہ میں گر پڑوں گا، پھر وہ کچھ لوگوں کو بخش دیگا، اسی طرح تیسری، پھر چوتھی بار

کرونگا، یہاں تک کہ دوزخ میں پھر وہی رہ جائیگا جسکو قرآن نے زک رکھا ہے" (صحیح بخاری کتاب الشفاعۃ)

۵۔ حضرت عمران بن حصین سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "محمد کی شفاعت سے کچھ ایسے لوگ دوزخ سے نکلیں گے اور جنت میں داخل ہوں گے جن کا نام جہنم والے ہوگا" (۱۱)

۶۔ حضرت ابوہریرہؓ کے سوال پر آپنے فرمایا کہ "میری سفارش سے سرفراز ہونے کی خوش قسمتی اس کو حاصل ہوگی، جس نے خلوص قلب سے اللہ کی توحید کا اقرار کیا ہو" (صحیح بخاری کتاب الشفاعۃ)

۷۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے فیصلہ سے فراغت پائیگا اور چاہیگا کہ ان کو جنھوں نے اس کی توحید کی گواہی دی تھی، دوزخ سے نکالے تو فرشتوں کو ان کے نکالنے کا حکم دیگا، فرشتے ان توحید والوں کو اس علامت سے پہچانیں گے کہ ان کی پیشانیوں میں سجدہ کے نشان ہوں گے کہ خدا نے آدم کے بیٹے کی پیشانی کے نشان سجدہ کو دوزخ کی آگ پر حرام کر دیا ہے، تو وہ اُن کو جلا نہ سکے گی، فرشتے جب ان کو نکالیں گے تو وہ جلے جُھلسے ہوں گے، پھر اُن پر آبِ حیات چھڑکا جائے گا، تو وہ اس طرح اُگیں گے جس طرح سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانہ اگتا ہے" (صحیح بخاری کتاب الشفاعۃ)

۸۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "جنت والے جنت اور دوزخ والے دوزخ میں داخل ہو چکیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا، دیکھو جس کے دل میں ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہو اُس کو دوزخ سے نکالو، تو وہ جل کر کوئلہ ہو کر نکلیں گے، پھر وہ نہرِ حیات میں ڈال دیئے جائیں گے، تو اس طرح وہ اگیں گے جس طرح سیل آب کے کنارے جنگلی دانہ اگتا ہے" (صحیح بخاری کتاب الایمان)

۹۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے، آپؐ نے فرمایا کہ اہلِ دوزخ جو دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، وہ اس میں نہ مریں گے نہ جئیں گے، لیکن وہ لوگ جن کو دوزخ کی آگ بعض گناہوں کی وجہ سے چھوئے گی، تو وہ اس میں کچھ دیر کے لیے مرجائیں گے، یہاں تک کہ وہ جل جائیں گے، پھر اُن کے حق میں شفاعت کی اجازت ہوگی، تو وہ تھوڑے تھوڑے کرکے آئیں گے اور جنّت کی نہروں میں پھیل جائیں گے، اور اہلِ جنّت سے کہا جائے گا، کہ ان پر پانی بہاؤ، تو وہ اسطرح اُگیں گے جیسے سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانے۔" (صحیح بخاری کتاب الایمان)

۱۰۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "سب سے آخر میں جو شخص دوزخ سے نجات پاکر نکلے گا، وہ گھسٹتا ہوا نکلے گا، اور اس کو جنّت بھری معلوم ہوگی۔"

۱۱۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے صحیحین میں روایت ہے کہ خدا فرمائیگا کہ "ملائکہ نے سفارش کی اور پیغمبروں نے سفارش کی، اور اہلِ ایمان نے سفارش کی، اور اب صرف وہ رہ گیا جو تمام رحم کرنے والوں میں سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے، یعنی خود وہ رحمان و رحیم، تو وہ دوزخ سے مٹھی بھر کر ان لوگوں کو نکالے گا، جنھوں نے کبھی کوئی بھلائی نہیں کی۔" (صحیحین)

۱۲۔ حضرت انس بنؓ مالک سے روایت ہے کہ حکم ہوگا کہ جس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا ہو، اور اُس کے دل میں جو برابر بھی نیکی ہو اُسکو دوزخ سے باہر کرو جس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا ہو، اور گیہوں کے دانہ کے برابر بھی اُس کے دل میں نیکی ہو، اور جس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا ہو اور جَو کے دانہ کے برابر بھی اُس کے دل میں نیکی ہو، اُس کو دوزخ سے الگ کرو۔ (ترمذی صفۃ النار حدیث حسن صحیح)

احادیث کی کتابوں میں اس قسم کی اور بہت سی حدیثیں ہیں جن کا استقصا یہاں مقصود نہیں۔ ان تمام حدیثوں میں قرآن پاک کی اس اہم آیت کا جلوہ موجود ہے،

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (نساء-۱۸)

بیشک اللہ اس کو معاف نہ کریگا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے سوا جو گناہ ہو اس کو جس کے لئے چاہیگا معاف کر دیگا،

اس آیت میں تصریح ہے کہ شرک کے علاوہ ہر گناہ کے نتیجہ سے برأت کیجا سکتی ہے مگر شرک وہ بیماری ہے، جس کے نتائج سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں، اس لیے ان کے نتائج بد بھگتے بغیر نجات کا تصور بھی خدا کے قانونِ ابدی کے خلاف ہے،

شرک و کفر کی بخشایش نہیں، احکامِ الٰہی اور شریعتِ ربانی کی کھلی ہوئی دو قسمیں ہیں ایک کا تعلق دل اور قلب سے ہے اور جو بمنزلہ اصل کے ہے، اس کو مذہب کی زبان میں ایمان، فلسفہ کی اصطلاح میں علم، اور تصوف کی بولی میں عرفان کہتے ہیں، اور دوسری قسم وہ ہے جو اس عقیدۂ اوّل کی فرع اور نتیجہ ہے اور جسکا تعلق اعضاء اور جوارح سے ہے، اس کو ہم مختصراً عمل اور تفصیلاً عبادات و معاملات اور اخلاق کہتے ہیں، شرک و کفر کے گناہ کا تعلق قسم اوّل سے اور دوسرے گناہوں کا تعلق قسم دوم سے ہے، دلوں میں ایمان و عمل و عرفان کی اگر ایک کرن بھی ہو تو اس ظلمتکدہ کی روشنی کی امید کسی طرح کی جا سکتی ہے، مگر جس کا شانۂ دل میں اس نور کا ایک ذرہ بھی نہ ہو اس کی روشنی سے ہمیشہ کے لیے ناامیدی ہے، اسی لیے ایمان کے بغیر اعمال بھی کالعدم ہو جاتے ہیں، اور جہاں ایمان کچھ بھی موجود ہے، اعمالِ خیر کا کچھ نہ کچھ وجود ضروری ہے، البتہ اعمالِ شر کا بھی ساتھ ساتھ وجود ہے،

جن کی تلافی عذابِ دوزخ کے بعد باخدا کی رحمت سے ہو سکتی ہے، اور نجات مل سکتی ہے، ایمان: علم وعرفان جس کی حقیقت "ایمان بالغیب" ہے، اُس کا حصول موت کے بعد جب حقائق خود بخود ہمارے سامنے آجاتے ہیں، ہماری وسعت کا نتیجہ نہیں، بلکہ خود اُن حقائق کے ظہور کا نتیجہ ہوگا، اس بنا پر شرک وکفر کے گناہ کی مغفرت کی امید قانونِ الٰہی کے مطابق ناممکن ہے، البتہ عمل کی کمی کی تلافی جو دوسری قسم کا گناہ ہے، خدا کی رحمت سے بعید نہیں ہے،

سمجھنے کے لئے ان دونوں کی کھلی ہوئی مثال یہ ہے کہ دنیا میں تعلیمی امتحان کے لئے ۳۳ نمبر کم از کم فرض کیا گیا ہے، اب اگر کسی کا پرچہ بالکل سادہ ہے، اور اس لئے اس کا نمبر صفر محض ہے، تو رحمدل ممتحن کے لیے بھی یہ ناممکن ہے کہ اُس کو ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ میں بھی کامیاب کرسکے، لیکن جس نے کچھ جوابات لکھے ہیں، اور کچھ چھوڑ دیئے ہیں، اور کچھ غلط لکھے ہیں تو اگر وہ ۲۹ و ۳۰ کے قریب بھی پہنچ گیا ہے، تو رحمدل ممتحن ۳۳ تک اس کو پہنچا کر ادنیٰ درجہ میں کامیاب بنا سکتا ہے،

الغرض ایمان وعلم وعرفان کے مجرم جن کا نام مشرک وکافر ہے اپنے ناقابلِ تلافی نتیجہ کے بھگتے بغیر عذابِ دوزخ سے رہائی کا تصور بھی نہیں کرسکتے کہ اُن کی دنیاوی زندگی کا عرفانی فقدان رحمتِ الٰہی کو اپنی طرف جذب کرنے کی قدرت ہی نہیں رکھتا، مگر کیا شرک وکفر کے گنہگاروں کے لیے شرک وکفر کے دورۂ عذاب کے طے کر لینے کے بعد بھی رہائی کا تصور کیا جاسکتا ہے؟ اس کا جواب آئندہ سطروں میں ملے گا،

کیا دوزخ کی انتہا ہے؟ دوزخ جو عقابِ الٰہی کا گھر ہے، کیا ہمیشہ آباد رہے گا؟ اللہ تعالیٰ کی رحمت عمومی کے قائلوں کے نزدیک اس کا جواب نفی میں ہے[1]، ان کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مقررہ

[1] دیکھئے حاشیہ ص ۸۰، ۱۲

مدّتِ دراز کے بعد ایک دن جب جہنّم کی آگ رحمتِ الٰہی کے چھینٹوں سے بالآخر سرد ہو جائیگی،
حدیث صحیح میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "جنّت میری رحمت اور دوزخ میرا عذاب[1] ہے"۔
اسی کے ساتھ حدیثِ صحیح میں وارد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کا فیصلہ کیا، اُسی وقت
اُس نے اپنے عرش کے اوپر یہ لکھدیا کہ،

رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ[2] — میری رحمت میرے غضب سے سبقت لیگئی ہے،

(حاشیہ ص ۷۷۹) [1] ابتدائی اسلامی فرقوں میں جہنم کی ابدیت اور غیر ابدیت پر بہت سے مناظرے ہو چکے ہیں، جن کی تفصیل ملل ونحل کی کتابوں میں موجود ہے، ایک دو کو چھوڑ کر اس پر تو بے شبہہ قطعیت کے ساتھ سب کا اتفاق ہے کہ جنّت کا وجود دائمی اور ابدی ہے، لیکن جہنم کے دوام اور ابدیت میں کسی قدر اختلاف ہے، عام اہلسنت کا عقیدہ یہ ہے کہ جہنم اور جنّت دونوں کا وجود دائمی اور ابدی ہے، گنہگار مومن اپنے گناہ کے بقدر عذاب اٹھا کر یا خدا کی رحمت سے معاف ہو کر بالآخر جنّت میں داخل کئے جائیں گے لیکن مشرک و کافر کے گناہ کبھی معاف نہ ہوں گے، اور وہ ہمیشہ دوزخ میں جلیں گے، فقہاء اور محدثین کا ایک گروہ جو مرجیہ کہلاتا ہے، اس بات کا قائل ہے، کہ جو مومن ہوگا وہ گنہگار بھی ہوگا تو بھی دوزخ میں نہ جائے گا، بلکہ معافی سے سرفراز ہو کر شروع ہی سے جنّت میں داخل ہوگا، اس کے برخلاف خوارج اور معتزلہ کا یہ عقیدہ ہے کہ مومن بھی اگر گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا تو وہ بھی کفار کی طرح ہمیشہ دوزخ ہی میں رہے گا، اور بھی اس بارہ میں لوگوں کی مختلف رائیں ہیں،

اہلِ سنت کے ایک مختصر گروہ کا جس میں صحابۂ کرام اور تابعین کے نام بھی ہیں، اور متاخرین میں جس کے پرجوش حامی حافظ ابن قیم ہیں، یہ خیال ہے کہ جب گنہگار اپنے اپنے گناہوں کے بقدر عذاب پا چکیں گے، تو جہنم فنا کر دیجائیگی، حافظ ابن قیم نے اپنی دو کتابوں شفاء العلیل اور حادی الارواح (دونوں مطبوعہ ہیں، حادی الارواح اعلام الموقعین کے ساتھ چھپی ہے) میں قرآن، احادیث آثار صحابہ اور عقل کی پچیس دلیلوں سے اپنے مسلک کو مبرہن کیا ہے، (دیکھو شفاء العلیل، ص ۲۵۲ تا ص ۲۶۴، حسینیہ مصر اور حادی الارواح از ص ۱۶۷ تا ص ۲۳۵ جلد دوم مطبعۂ جدیدہ مصر) علامہ ابن تیمیہ نے بھی اس نظریہ کو سلف اہلِ سنت کے ایک فریق کا خیال تسلیم کیا ہے، حادی الارواح ابن قیم جلد دوم ص ۱۶۷) ایک زیدی یمنی عالم شیخ مقبلی نے بھی اس کو قبول کیا ہے، العلم المشائخ فی ایثار الحق علی الآباء والمشائخ ص ۱۲۲) صوفیہ میں شیخ محی الدین ابن عربی اور ان کے متبعین یہ فرماتے ہیں کہ کافر و مشرک جن پر خلود نار کا حکم ہے، وہ بالآخر دوزخ میں رہتے رہتے ایسے ہو جائیں گے کہ اُن کو اسی دوزخ میں راحت و لذت معلوم ہونے لگے گی، جیسے بعض کیڑے غلاظتوں ہی کو پسند کرتے ہیں، اور ان ہی میں لطف اٹھاتے ہیں، میں نے اس باب کو بہت ڈرتے ڈرتے لکھا ہے، کہ اس میں اجمال الٰہی کی تصریح کا جرم عائد ہوتا ہے اگر یہ اختیار کردہ پہلو حق نہ ہو تو اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے، اور توبہ کی توفیق بخشے، اور اپنی مراد کا دروازہ مجھ پر کھولدے،

[1] صحیح بخاری باب رحمۃ اللہ، جلد دوم ص ۱۱۱۰ و صحیح مسلم، [2] صحیح بخاری باب وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ جلد دوم ص ۱۱۱۰ و صحیح، مسلم باب سعۃ رحمۃ اللہ،

اب اگر دوزخ جو اُس کے غضب کا مظہر ہے، اُس کی جنّت ہی کی طرح دائمی و ابدی ہو، تو اُس کا غضب اُس کی رحمت پر سبقت لے جاتا ہے، یا برابر ہو جاتا ہے، اور اُس کا تخیل بھی اُس رحمان و رحیم کی نسبت نہیں ہو سکتا، اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصّوں میں سے صرف ایک حصّہ دنیا میں اُتارا، اور ننانوے حصّے قیامت کے دن کیلئے رکھے ہیں[1]، اس لیے ماننا پڑتا ہے کہ ایک دن آئے گا، جب اُس کے غضب پر اُس کی رحمت غالب آ جائیگی، اور اس کی رحمت کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا، اور یہ وہ دن ہوگا جب گنہگار اپنے گناہوں کی ناپاکیوں اور نجاستوں سے اپنے اپنے مقررہ وقت پر پاک ہو کر اُس کی رحمت کی سرفرازی کے قابل بنیں گے،

اسلام کی رو سے سب سے بڑے مجرم مشرک و کافر ہیں، جو اُس وقت تک نجات نہ پا سکیں گے، جب تک دوزخ کے تنور میں ایک گرم کوئلہ بھی باقی ہے، تاہم ان کے عذاب کی مدت کی نسبت بھی قرآن میں حسب ذیل تین تصریحات ہیں،

۱۔ لٰبِثِیْنَ فِیْهَآ اَحْقَابًا (ربنا-۱) وہ دوزخ میں صدہا ہزار سال ٹھہریں گے،

صدہا ہزار سال کی مدت کسی قدر بڑی ہو، پھر بھی ایک دن اُس کا خاتمہ ہوگا، دوسری آیت جو صریحاً کفّار و مشرکین کے حق میں ہے، یہ ہے،

۲۔ اَلنَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِیْمٌ عَلِیْمٌ۔ (انعام-۱۵) دوزخ ہے تمہارا ٹھکانا اس میں تم سدا رہنے والے ہو، لیکن یہ کہ اللہ جو چاہے، بیشک تیرا رب حکیم و علیم ہے،

---

[1] صحیح مسلم باب سعۃ رحمۃ اللہ،

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ شرک وکفر کی سزا تو اصل میں قانونًا یہی ہے کہ دوزخ میں دائمی سزا دیجاتی رہے، مگر اس کی رحمت کا اقتضاء کچھ اور ہے لیکن وہ حکیم وعلیم ہے، اس لئے وہ اپنا ہر کام اپنی حکمت ومصلحت اور علم کے مطابق کرتا ہے، اور وہی جانتا ہے کہ کس کے حق میں کیا کرنا چاہئے، اور کب کرنا چاہیے،

تیسری آیت میں ہے،

۳۔ خَالِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ	وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے جب تک
وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ	آسمان وزمین قائم ہیں، لیکن یہ کہ جو تیرا
اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (ھود)	رب چاہے بیشک تیرا رب جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے،

دوسری اور تیسری آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں اپنی مشیت کو عذاب کی انتہا بتایا ہے، اور اپنے کو "رب" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، جس سے اشارہ نکلتا ہے کہ اس کی مشیت سے بالآخر اس عذاب کا ختم ہو جانا اس کی "ربوبیت" کا اقتضاء ہے،

قرآن پاک میں کوئی ایسی صاف وصریح آیت موجود نہیں ہے جس سے دوزخ کی بقاء دوام، عدم انتہا، اور تسلسلِ وجود پر تصریح استدلال کیا جا سکے، حالانکہ اسکے برخلاف بہشت کی ہمیشگی وبقاء اور عدم انقطاع وعدم فنا کی بیسیوں آیتیں قرآن پاک میں موجود ہیں چنانچہ ان دونوں کے فرق کو اچھی طرح سمجھنے کیلئے اس اوپر والی آیت کو ہم تمام وکمال یہاں نقل کرتے ہیں فرمایا:

فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِى النَّارِ لَهُمْ	تو لیکن جو بدبخت ہوئے وہ دوزخ میں ہونگے
فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ۙ خٰلِدِيْنَ	اس میں ان کو گدھوں کی طرح چلانا

فِيهَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ
اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ
لِّمَا يُرِيْدُ ، وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا
فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَادَامَتِ
السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ
رَبُّكَ ۭ عَطَاۗءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ۔

(ھود۔ ۹)

اور رہیں گے جبتک آسمان اور زمین ہیں وہ
اس دوزخ میں رہیں گے، مگر جو چاہے تیرا
رب بیشک تیرا رب جو چاہے کر ڈالتا ہے
اور لیکن وہ جو خوش قسمت ہوئے تو وہ جنت
میں ہوں گے ہمیشہ اس میں رہیں گے جب تک
آسمان و زمین قائم رہیں، مگر جو چاہے تیرا رب
یہ غیر منقطع بخشش ہوگی،

دیکھو کہ اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ دونوں کے لیے خلود و دوام فرمایا، پھر ان دونوں میں اُس کے بعد اپنی مشیت سے استثنا فرمایا، مگر اہلِ دوزخ کے دوام کے ذکر میں فرمایا کہ "مگر جو چاہے تیرا رب، بیشک تیرا رب جو چاہے کر ڈالتا ہے" اس سے معلوم ہوا کہ وہ چاہے تو دوزخ کے عذاب کو ختم کر دے، اور چاہے تو قائم رکھے، لیکن اہلِ جنت کے دوام کے ذکر میں بتصریح فرمایا "مگر جو چاہے تیرا رب، یہ غیر منقطع بخشش ہوگی" اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ جنت کے حق میں اُس کی مشیت یہی ہوگی کہ وہ بے انقطاع اور غیر منتہی دوام و تسلسل کے ساتھ ہمیشہ قائم و باقی رہے، اس آیت کی تفسیر میں متعدد ائمۂ سلف، مثلاً ابن زید اور شعبی وغیرہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنت کے بارہ میں تو اپنی مشیت ظاہر فرما دی کہ وہ مسلسل اور غیر منقطع ہے، لیکن اہلِ دوزخ کی نسبت اپنی مشیت کو کسی مصلحت سے مخفی رکھا ہے[1]۔

---

[1] تفسیر طبری در منثور سیوطی، تفسیر آیاتِ ہود رکوع ۹ و انعام رکوع ۱۵،

ایک مقام پر خاص طور پر کفار و مشرکین کا نام لے کر اس طرح فرمایا گیا ہے،

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ	بیشک اہلِ کتاب اور مشرکوں میں سے جنھوں نے
وَالْمُشْرِکِیْنَ فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا	کفر کیا وہ جہنم کی آگ میں (خالد) پڑے
اُولٰٓئِکَ ھُمْ شَرُّ الْبَرِیَّۃِ ۔ اِنَّ الَّذِیْنَ	رہیں، یہ بدترین لوگ ہیں بیشک جو ایمان لائے
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ ھُمْ	اور اچھے کام کئے، وہ بہترین لوگ ہیں ان کی
خَیْرُ الْبَرِیَّۃِ ۔ جَزَآؤُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ	جزا اُن کے پروردگار کے نزدیک بسنے کے
جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ	باغ ہیں، جن میں نہریں بہتی ہوں وہ
خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا (بینہ)	اس میں ہمیشہ (خالد) رہیں گے،

غور سے دیکھو کہ اس میں اہلِ دوزخ کے مقابلہ میں اہلِ جنّت کے دوام کی نسبت کتنی تاکید پر تاکید ہے، پہلے "عدن" فرمایا جس کے معنی "قیام" اور "بسنے" کے ہیں، پھر خالدین کہا کہ وہ اس میں رہا کریں گے، "بعدازیں ابداً" فرمایا کہ وہ جنت میں ابدی طور سے قیام کریں گے،

اسی طرح ایک اور سورہ میں ہے،

وَیُدْخِلُہٗ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا	اور اُس کو اُن باغوں میں داخل کریگا،
الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا ؕ	جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی جن میں
ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ، وَالَّذِیْنَ	وہ ہمیشہ رہا کریں گے اور وہی بڑی کامیابی
کَفَرُوْا وَکَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِکَ	ہے اور جنھوں نے انکار کیا، اور ہماری
اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ، وَ	باتوں کو جھٹلایا، وہی دوزخ والے ہیں اس میں

بِئْسَ الْمَصِيْرُ، (تغابن-۱) رہا کریں گے اور وہ بُری جگہ ہے،

دیکھو کہ تقابلاً دونوں میں خالدین (رہا کریں گے) اور خالدین فیہا ابداً (ہمیشہ رہا کریں گے) کا فرق کتنا نمایاں ہے، کہیں یہ کہا گیا ہے کہ کفار کے عذاب میں مدت کی تعیین سے سرے سے خاموشی برتی گئی ہے، اور جنت میں خلود کی تصریح فرما دی گئی ہے، مثلاً،

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ جس دن کچھ منہ سپید ہوں گے اور کچھ سیاہ تو

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ اَكَفَرْتُمْ جو سیاہ ہوئے تو کیا ایمان کے بعد کافر ہو گئے

بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا تھے تو اپنے کفر کی یاداش میں عذاب کا مزہ

كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ، وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ چکھو، اور جن کے منہ سفید ہوئے تو وہ

وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ط هُمْ فِيْهَا اللہ کی رحمت میں ہوں گے، اور اس رحمت

خَالِدُوْنَ. (آل عمران-۱۲) میں سدا رہیں گے،

آیتِ بالا میں عذاب کے ذکر میں مدت کی تصریح سے سراسر خاموشی ہے، اور رحمت کے ذکر میں خلود کی تصریح تام ہے،

ان ہی آیتوں کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض صحابۂ کرام سے روایتیں ہیں کہ ایک دن آئے گا، جب دوزخ کے میدان میں ہو کا عالم ہو گا، اور کوئی ایک متنفس بھی وہاں نظر نہیں آئے گا، چنانچہ:-

۱- طبرانی میں حضرت ابو امامہ صحابیؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جہنم پر ایک دن ایسا آئے گا جب خزاں رسیدہ پتے کے مانند ہو جائیگا، اور اس کے دروازے

کھل جائیں گے،

۲۔ حضرت جابرؓ یا کسی اور صحابیؓ سے روایت ہے کہ آپنے فرمایا کہ جہنم پر ایک دن ایسا آئیگا جس میں اُس کے دروازے کھل جائیں گے، اور اُس میں کوئی نہ ہوگا،

۳۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں جو کہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جہنم پر ایک دن ایسا آئیگا جب اس میں کوئی نہ ہوگا"

۴۔ تفسیر عبد بن حمید میں حضرت عمرؓ سے روایت کی گئی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ اگر اہلِ دوزخ ریگستانِ عالج کے ذرات کے شمار کے بقدر بھی دوزخ میں رہیں، پھر بھی ایک دن آئیگا، جب وہ اس سے نکلیں گے"

۵۔ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ جہنم پر ایک دن آئیگا جب اسکے خالی دروازے بھڑ بھڑائیں گے، اور اس میں کوئی نہ ہوگا، اور یہ اس وقت ہوگا، جب لوگ اس میں صدہا ہزار سال (احقاب) کی مدت پوری کر لیں گے"

۶۔ عبدالرزاق، ابن منذر، طبرانی، اور بیہقی کی کتاب الاسماء والصفات میں ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہؓ صحابی یا ابوسعید خدریؓ صحابی یا کسی اور صحابی نے فرمایا کہ اِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ کا استثنا پورے قرآن پر حاوی ہے، یعنی جہاں جہاں قرآن میں خَالِدِيْنَ فِيْهَا (سدا اس میں رہیں گے) ہے، وہاں مشیت الٰہی کا استثنا قائم ہے،

۷۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ دوزخ پر ایک زمانہ آئے گا جب اُس کے سارے دروازے کھڑکھڑائیں گے"

(حاشیہ ص ۷۸۷ پر دیکھئے)

دفعِ شبہہ قرآن پاک میں ایسی بھی چند آیتیں ہیں، جن سے لوگوں کو دوزخ کے دوام کا خیال ہوتا ہے، مثلاً وہ تین آیتیں جنمیں کفار کو خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا ہمیشہ کے عذاب کی دھمکی دیگئی ہے،

۱۔ اِنَّ اللّٰہَ لَعَنَ الْکٰفِرِیْنَ وَاَعَدَّ لَھُمْ سَعِیْرًا، خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا (احزاب - ۸)

۱۔ بیشک خدا نے کافروں پر لعنت کی اور ان کے لئے وہ آگ مہیا کی، جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے

۲۔ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَاِنَّ لَہٗ نَارَ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا، (جن - ۲)

۲۔ اور جو اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کریگا، تو اُسکے لئے جہنم کی وہ آگ ہی جس میں وہ ہمیشہ پڑا رہیگا،

۳۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَھُمْ وَلَا لِیَھْدِیَھُمْ طَرِیْقًا اِلَّا طَرِیْقَ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا (نسآء - ۲۳)

۳۔ بیشک جنہوں نے کفر کیا، اور حد سے آگے بڑھے، نہیں ہے کہ اللہ ان کو بخشدے نہ یہ کہ اُن کو رہ دکھائے، لیکن جہنم کی راہ جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں،

ان تینوں آیتوں میں خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا (دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے) کا مطلب

لہ (حاشیہ ص ۷۸۶) حافظ ابن قیم نے شفاء العلیل (ص ۲۵۸) میں ان روایات کو غیر مطبوعہ کتب تفسیر و حدیث سے نقل کیا ہے، اُن میں سے بعض ابن جریر طبری میں بھی آیات مذکورہ کی تفسیر میں خصوصاً تفسیر سورہ ہود جلد ۱۲ ص ۶۶ میں مذکور ہیں، اور حافظ جلال الدین سیوطی نے بھی تفسیر در منثور تفسیر سورہ ہود، جلد ثالث ص ۲۵۰ میں زیر آیت مذکورہ ہود ذکر کیا ہے، اور کتاب الاسماء والصفات بیہقی (ص ۱۲۲، مطبوعہ حیدرآباد میں بھی روایت ہے،

یہ ہے کہ ایسے لوگ جن کے حق میں یہ آیتیں آئی ہیں، وہ اُس وقت تک دوزخ میں ہمیشہ ہیں گے
جب تک حسبِ مشیتِ الٰہی دوزخ کے خاتمہ کا دور نہیں آئے گا،

باقی چند آیتوں میں ابداً (ہمیشہ) کے بغیر صرف خالدٌ ہے، جیسے

مُمْ فِیْھَا خَالِدُوْنَ	وہ اس میں خالد رہیں گے،

یا ایک جگہ ہے،

وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا کُنْتُمْ	اور "خلود" کے عذاب کا مزہ چکھو"
تَعْمَلُوْنَ، (سجدہ ۳۰)	

تو یہاں ایک بات سمجھ لینی چاہئے کہ خلود کے دو معنی ہیں، ایک حقیقی دوام اور دوسرے قیام طویل، ان دو میں سے کسی ایک معنی کی تخصیص قرینہ سے ہوگی، اسی دوسرے معنی کے اعتبار سے عربی اشعار میں پہاڑوں اور بدویانہ چوکھوں کے پتھروں کے لئے خوالد اور خالدات کے لفظ صفت میں آتے ہیں، کیونکہ وہ تادیر اور زمانۂ دراز تک باقی رہنے والے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ تنہا "خالدین" کا لفظ ابدیت کے مفہوم میں صریح نہیں، جب تک اس کے ساتھ کوئی اور قرینہ قائم نہ ہو، جو دوام کے معنی کی تخصیص کر دے، جیسا کہ یہ قرینہ اُن آیتوں میں ہے، جہاں اہلِ جنت کو خٰلِدِیْنَ کہا گیا ہے کہ تقریباً بیس آیتوں میں اس خلود کے معنی دوام اور عدم انقطاع کے بتائے گئے ہیں، اسلئے جنت کے سلسلہ میں جہاں صرف خٰلِدِیْن بھی ہے، وہاں ہمیشگی اور دوام ہی کے معنی لئے جائیں گے، برخلاف اسکے جہاں دوزخ کے ساتھ خٰلدین کا لفظ ہے، وہاں دوام کے مفہوم کے لئے کوئی قرینہ موجود نہیں، اسلئے دوزخ

والی آیتوں میں خلود سے مقصود یہ ہے کہ گنہگار زمانۂ دراز تک دوزخ میں رہیں گے، غالباً یہی وجہ ہے کہ گنہگار اہلِ ایمان کی سزا میں کبھی خلود کے ساتھ ابداً استعمال نہیں کیا گیا ہے، گنہگار اہلِ ایمان میں سب سے بڑی دھمکی اس کو دی گئی ہے، جس نے کسی مسلمان کا خون بے سبب بہایا ہو، مگر اس کے لئے بھی خالدین کے ساتھ ابداً استعمال نہیں کیا گیا، فرمایا،

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ	اور جو کوئی کسی با ایمان کو قصداً قتل کریگا،
جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا	تو اس کا بدلہ دوزخ ہے، جس میں وہ خالداً
(نساء - ۱۳)	(یعنی مدت دراز تک پڑا) رہے گا،

یہی سبب ہے کہ معتزلہ اور خوارج کے سوا تمام اہلِ اسلام اس بے گناہ مسلمان مقتول کے قاتل کی بالآخر بخشائش کے قائل ہیں،

اس سے معلوم ہوا کہ ان آیتوں میں خلود سے مراد "ہمیشگی" نہیں ہے، بلکہ زمانۂ دراز ہے، کہ اہلِ توحید کی بالآخر نجات قرآن و حدیث کی متفقہ تعلیم ہے، اور اس لئے مومن کیلئے اس کے کسی جرم کی سزا میں ہمیشگی کا مفہوم داخل ہی نہیں ہو سکتا، بنابریں ان آیتوں میں "خلود" کے معنی منطقی دوام نہیں، بلکہ عرفی دوام، یعنی مدت دراز کے ہیں، ہم عام طور سے مجرم کے لئے جس دوام کی قانونی اصطلاح بولتے ہیں، جس سے مراد ابد تک کیا قیامت تک کا زمانہ بھی نہیں ہو سکتا، بلکہ عمر بھر بھی نہیں، بلکہ صرف اس سے قانونی قید کی درازترین مدت مراد ہے، جس کا قانونی اندازہ بیس سال کیا گیا ہے، کتنے مجرم ہیں جو اس مدت کو کاٹ کر آزادی حاصل کرتے ہیں، اور ایسے بھی ہیں جو کسی شاہی عفو عام کے سلسلہ میں قبل از مدت

رہائی پا جاتے ہیں،

دو چار آیتیں ایسی بھی ہیں، جن میں مذکور ہے کہ یہ گنہگار دوزخ سے الگ نہ ہوں گے چنانچہ وہ آیتیں حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ یَّصْلَوْنَهَا یَوْمَ الدِّیْنِ، وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِیْنَ، (انفطار)

۱۔ بیشک گنہگار دوزخ میں ہیں وہ انصاف کے دن اس میں داخل ہونگے اور وہ اس سے چھپے نہیں رہ سکتے،

۲۔ وَقَالَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا كَذٰلِكَ یُرِیْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَیْهِمْ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّارِ (بقرہ ۲-۳)

۲۔ اور کہیں گے کہ کاش ہم کو دوبارہ دنیا کی زندگی ملتی، تو ہم اپنے پیشواؤں سے ہی الگ ہو جاتے، جیسے وہ ہم سے یہاں الگ ہو گئے، اللہ اُن کے کاموں کو ایسی ہی حسرتیں بنا کر انکو دکھائیگا اور وہ دوزخ سے نکل جائیں، لیکن وہ اس سے نکلنے والے

۳۔ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِیَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ، یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ

۳۔ بیشک جنھوں نے کفر کیا، اگر اُن کی ملکیت میں کل روے زمین ہو، اور اتنا ہی اور ہو تا کہ اُسکو فدیہ دیکر قیامت کے عذاب سے رہائی پائیں تو وہ اُن کی طرف سے قبول نہ ہو، اور انکے لئے دردناک عذاب ہے، وہ چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل جائیں، لیکن وہ اس سے نکلنے والے

مِنْهَا اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ (حج ۲)

۴۔ كُلَّمَا اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ (حج ۲)

۵۔ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰهُمُ النَّارُ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (سجدہ ۲)

نہیں، اور ان کے لئے قائم عذاب ہے،

۴۔ جب وہ چاہیں اس دوزخ سے غم کی وجہ سے نکل پڑیں، وہ اس میں لوٹا دیئے جائیں گے اور (کہا جائیگا کہ) جلنے کی سزا چکھو،

۵۔ اور لیکن جنھوں نے نافرمانی کی، تو اُن کا ٹھکانا دوزخ ہے، جب وہ چاہیں گے کہ وہ اس سے نکل جائیں، اس میں لوٹا دیئے جائینگے اور کہا جائیگا کہ دوزخ کی اس مار کا مزہ چکھو، جس کو تم جھٹلاتے تھے،

یہ وہ پانچ آیتیں ہیں، جن سے بعضوں کو عذاب دوزخ کے دوام اور غیر منقطع بقا کا خیال پیدا ہوا ہے، مگر ان میں سے ایک ایک آیت پر غور کرو تو اُن کے خیال کی غلطی فوراً معلوم ہو جائے گی، پہلی آیت کا منشا اسی قدر ہے کہ کوئی گنہگار اگر یہ سمجھے کہ وہ کسی جگہ چھپ کر دوزخ کے عذاب سے بچ جائیگا، تو یہ محال ہے، کہ عذاب سے چھپ کر بچ جانا کسی طرح ممکن نہیں دوسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ دوزخی کہیں گے کہ ہمکو دوزخ سے نکل کر دوبارہ دنیا میں جانے دیا جائے، تو اب کی ہم نیکی کا کام کریں گے، اس کے جواب میں کہا جائیگا اب یہاں سے نکل کر دنیا میں دوبارہ جانا نہیں، تیسری آیت میں ہے کہ پورے روے زمین کی دولت دیکر بھی آخرت میں نجات خریدی نہیں جا سکتی، اور نہ وہاں سے کوئی نکل کر بھاگ سکتا ہے، چوتھی، اور پانچویں

آیت کا صریح مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی دوزخی دوزخ کے عذاب سے گھبرا کر اس سے نکل بھاگنا چاہیگا، تو وہ پکڑ کر پھر اسی میں ڈال دیا جائے گا، ان آیتوں سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ گنہگار از خود دوزخ سے نکل نہ سکیں گے، اور نہ مدتِ عذاب کے اندر وہ خلاصی پا سکتے ہیں، مگر اس سے خدا تعالیٰ کے حکم و اجازت سے بالآخر اس سے نجات پانے کی نفی نہیں نکلتی، اور نہ اُس کی کہ بقدرِ گناہ عذاب کی مدت بسر کرنے کے بعد بھی نجات نہیں مل سکتی، اور نہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بہشت کی طرح دوزخ کو بھی غیر متناہی دوام بخشا گیا ہے،

یہی وہ آیتیں ہیں، جن سے گنہگاروں کے لئے دوامِ عذاب کا مفہوم نکالا جا سکتا ہے مگر ایک ایک آیت کو غور سے پڑھو کہ ان میں سے کسی میں بھی دوزخ کے دوامِ بقا اور عدمِ فنا یا اُس کے عذاب کے عدمِ انتہا کی تصریح ہے، ؟ حالانکہ اس کے بالمقابل جنت کی بقائے دوام اور عدمِ انقطاع کی تصریح بار بار اور تکرار ہے،

ایک اور نکتہ لحاظ کے قابل ہے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ خدا نے گنہگاروں کو عذاب دوزخ کی ابدیت اور دوام کی دھمکی دی ہے، تاہم اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہئے کہ نیکی کا بدلہ نہ دینا یقیناً بُرائی ہے، جس سے اللہ تعالیٰ کی قدوسیت کا دامن تمامتر پاک ہے، کہ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ (آل عمران ۔۲۰) تو وہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا، اِنَّهُ كَانَ وَعْدُهُ مَأْتِيًّا (مریم ۔۴) اُس کا وعدۂ جنت پورا ہی ہوگا، لیکن اگر بُرائی کا بدلہ حسبِ تہدید سابق بُرائی کے ساتھ نہ دیا جائے، تو حقیقت میں خلافِ وعدگی نہیں جو قابلِ ملامت ہو بلکہ اس کا نام مغفرت، کرم، عطا اور عفو ہے، جس کا اہل اُس رحمان و رحیم اور عفو و غفور سے بڑھ کر کوئی دوسرا

نہیں اسلئے گنہگاروں کے ساتھ جیسا کہ اُس نے فرمایا ہی اپنی حکمت و مصلحت کی بنا پر وہ جو چاہے کر سکتا ہے، چنانچہ مسند ابو یعلیٰ میں حضرت انس رضؓ بن مالک سے روایت ہی کہ آپنے فرمایا کہ خدا نے کسی نیک کام پر جس ثواب کا وعدہ فرمایا ہے وہ اسکو ضرور ہی پورا کریگا، لیکن جس کسی کو اس کے کسی کام پر عذاب کی دھمکی دی ہے، تو اُسکو اختیار حاصل ہے"

کوئی کہہ سکتا ہے کہ اگر بالآخر گناہوں کی مغفرت اور خدا کی رحمت میں یہ وسعت اور عموم ہی کہ بڑے سے بڑے گنہگار بھی دوزخ کی آگ میں جل کر بالآخر پاک و صاف اور جنت میں داخل ہونے کے قابل ہو جائیں گے، تو اشارات و کنایات کے بجائے اُن کی معافی کی صریح تصریح کیوں نہیں کر دیگئی، ؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایسا کیا جاتا تو یہ اُن مجرموں اور گنہگاروں کے حق میں اچھا نہ ہوتا، کیونکہ اُس سے اُن میں ندامت اور توبہ کے رجحان کے بجائے خود سری گستاخی اور شوخی پیدا ہوتی اور اُن میں آیندہ کے نتائج بد سے نڈر پن اور بے خوفی آجاتی، اور ایسا نہ ہونا تنبیہ و صلاح و تدارک کی مصلحتوں کے سراسر منافی ہوتا، اس لئے اُن قانونی سزا تو اللہ تعالیٰ نے دائمی عقاب مقرر فرمائی، لیکن آخر کار اُن کی نجات کو اپنی مشیت اور علم و مصلحت کے سپرد فرما کر، ان کو یک گونہ اپنے سے ناامید بھی نہیں ہونے دیا اور امید و بیم کی حالت میں رکھ کر اپنے سامنے جھکنے اور محبت کرنے کا جذبہ بھی پیدا کر دیا؛

یہ اس باب میں وہ عظیم الشان اصلاح ہے جس کو ایک طرف عیسائیوں نے کفارہ کی اور دوسری طرف ہندو مذاہب نے کرم کی تعلیم دیکر غارت کر دیا تھا،

عیسائیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کے مصلوب ہو کر جی اٹھنے پر ایمان لانے سے تمام

گناہ دفعۃً معاف ہو جاتے ہیں، اس تعلیم نے اعمال کو غیر ضروری چیز ٹھہرا دیا تھا، اسکے برخلاف ہندو مذاہب نے خدا کو اتنا بے اختیار ٹھہرایا کہ اعمالِ بد کے نتائج جن کو کرم کہتے ہیں، خدا چاہے بھی تو معاف نہیں ہو سکتے، اسلام نے آکر ترازو کے اُن دونوں پلّوں کو برابر کر دیا، ایک طرف فرمایا "کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ" ہر نفس اپنے عمل کے ہاتھ میں گرو ہے" (مدثر-۲)، اور دوسری طرف فرمایا "يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ" خدا جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے، (مائدہ) یعنی قانوناً ہر انسان اپنے عمل کے نتائج کا یقیناً پابند ہے، مگر خدا تعالیٰ کی قدرت اور رحمت اس قانون کے باوجود جو چاہے کر سکتی ہے جس طرح اس دنیا کا حال ہے کہ اگو خدا کے بنائے ہوئے قانون یہاں جاری ہیں جن کو آپ قانونِ فطرت کہتے ہیں، مگر بہرحال اس کا حکم اور اس کی خواہش اور مصلحت اُن پر بھی حاکم ہے، اور وہ جو چاہے کر سکتا ہے

اس تعلیم نے ایک طرف اعمال کو غیر ضروری ہونے سے بچا لیا، اور دوسری طرف خدا کی قدرتِ تام اور رحمتِ عام کا دروازہ بھی کھلا رکھا،

عذاب طویل کا سبب | بعض کم فہم یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انسان کا گناہ تو ایک لمحہ کا کام ہے، پھر اس کا عقاب اتنا طویل کیوں رکھا گیا، سال دو سال یا عمر بھر کے گناہ کی سزا صدہا اور ہزارہا سال کے عقاب سے دینا مناسب نہیں، حالانکہ یہ لوگ اگر دنیاوی ہی واقعات پر غور کرتے تو وہ اُن کی تسکین کے لئے کافی ہوتے، دنیا کا ہر بڑے سے بڑا قانونی گناہ ایک لمحہ میں انجام پا جاتا ہے، چوری، عمل خلاف قانون، یا کسی کو قتل کرتے کتنی دیر لگتی ہے؟ مگر اُس کے معاوضہ میں سالہا سال کی قید ہم دیتے اور اپنی انسانی عدالت گاہوں میں تجویز کرتے ہیں، اور اسکو خلافِ عقل نہیں کہتے

دوسری صحیح تر مثال یہ ہے کہ انسان کو دیکھو کہ ذرا سی جسمانی بدپرہیزی اور اصولِ صحت کی معمولی سی غلطی کی پاداش میں وہ کبھی ہفتوں، مہینوں، بلکہ سالہا سال بیمار رہتا ہے، اور ایک مدت دراز میں جاکر کہیں اُن چند لمحوں کی غلطی کا تلافی کر پاتا ہے، اور کبھی اس معمولی غلطی کی بدولت عمر بھر اُس کے روگ میں مبتلا رہتا ہے، اور آخر میں جان دیدیتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ گناہ اور اس کی تلافی کی مدت میں یکسانی نہیں ہوتی، بلکہ ہمیشہ غلطی کی مدت کے مقابلہ میں اسکی تلافی کی مدت صدہا اور ہزار گنا زیادہ ہوتی ہے، کیونکہ طبیعت پر جو اثر پڑجاتا ہے اُسکی تلافی کی مدت غلطی کی نوعیت، طبیعت کی صلاحیت اور خلاقِ عالم کی مصلحت کی بنا پر مختلف ہوتی ہے، اسی لئے عقابِ طویل سے رہائی یا شفایابی کی مدت بھی ہر گنہگار کیلئے یکساں نہیں ہوسکتی، واللہ اعلم بحقیقۃ الحال

مشرک کافر کا آخر انجام اگر یہ صحیح ہے کہ بالآخر ایک دن جہنم کی آگ سرد ہوجائیگی، تو کیا اہلِ کفر و شرک بھی اپنے گناہوں سے پاک ہوکر رحم و کرم کے سزاوار ہوجائیں گے؟ جواب یہ ہے کہ

قرآن پاک میں اسکی تصریح موجود ہے کہ شرک و کفر کا گناہ معاف نہ ہوگا، یعنی اُن کے اُخروی نتائج کی پاداش ضروری ہے، اور یہ بھی معلوم ہوچکا ہے کہ شرک و کفر کی جزا دوامِ عذاب اور خلودِ نار (خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا) ہے، یعنی جب تک دوزخ قائم ہے، اس سے ان کو نجات نہیں مل سکتی مگر جب حسبِ مشیتِ الٰہی وہ دن آئے کہ دوزخ کی مدتِ حیات ختم ہوجائے تو اُس وقت عجب نہیں کہ ان کو بھی اس سے رہائی مل سکے،

چنانچہ مشرکین و کافرین کے ذکر میں خدا فرماتا ہے،

قَالَ النَّارُ مَثْوٰکُمْ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا — فرمائیگا دوزخ کی آگ تمہارا ٹھکانا ہے، ایسین

إِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ (انعام-۱۵)

ہمیشہ رہوگے، مگر یہ کہ جو چاہے اللہ! بیشک تیرا پروردگار حکمت اور علم والا ہے،

اس آیت کا آخری ٹکڑا خاص طور سے غور کے قابل ہے، فرمایا "تیرا رب حکمت اور علم والا ہے" اس موقع پر خدا کے لئے خاص طور سے رَبّ کا لفظ لانا، یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کی شانِ ربوبیت اگر چاہے گی اور اُس کے غیر محدود علم و حکمت کا اقتضا ہوگا تو دوزخ کے خاتمہ پر انکو رہائی مل سکے گی، لیکن اس میں شک ہے کہ آیا اس کے بعد بھی وہ جنت میں داخل ہو سکیں گے کیونکہ حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے قرآن پاک میں یہ تصریح الٰہی ہے،

إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوٰهُ النَّارُ (مائدہ-۱۰)

یہ کہ بیشک اللہ کا جو شریک بنائیگا، تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی ہے اور اسکا ٹھکانا دوزخ ہے،

نیز ایک اور آیت میں ہے،

إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ (اعراف-۵)

بیشک جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان کے ماننے سے غرور کیا تو ان کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور وہ جنت میں داخل نہیں ہونگے، تا آنکہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل ہو جائے،

الغرض خدا کے اعلان کردہ قانونِ جزا کا اقتضا تو یہی ہے کہ گو دوزخ کے عذاب کا خاتمہ

ہو جانے پر بھی جنت کے احاطہ میں ان کا گذر نہ ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کا دائرہ بہت وسیع ہے جیسا کہ خود اُس نے اہل دوزخ کی نسبت کہا ہے کہ

اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (ھود-۹)

وہ سدا دوزخ میں رہیں گے، لیکن تیرا رب جو چاہے، بیشک تیرا رب جو چاہے کر گذرتا ہے،

اس دائرہ کی وسعت کو کون کم کر سکتا ہے، کیونکہ اپنی رحمت کی وسعت کی نسبت اسکا اعلان یہ ہے،

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (اعراف-۱۹)

اور میری رحمت ہر شے کو اپنی گنجائش میں لئے ہے،

اس رحمتِ عام کی وسعت سے آسمان و زمین کا کون گوشہ محروم ہے؟ اس سے بڑھ کر یہ کہ پیغمبر کے جھٹلانے والوں کی نسبت خدا فرماتا ہے،

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ (انعام)

تو (اے پیغمبر) اگر وہ تجھکو جھٹلائیں تو کہدے کہ تمہارا پروردگار وسیع رحمت والا ہے اور اس کا عذاب گنہگاروں سے لوٹایا نہیں جا سکتا،

یعنی کسی دوسرے میں یہ طاقت نہیں کہ اُس کے بھیجے ہوئے عذاب کو گنہگاروں کے سر سے ٹال دے، لیکن خود اس کی رحمت بڑی وسیع ہے، وہ چاہے تو ان کو دنیا ہی میں ہدایت دیکر جنت نصیب کرے، یا آخرت میں عذاب دینے کے بعد درگذر کر دے، اور اُس کی اصلی رحمت کا محل وہی ہے، جہاں کسی دوسری رحمت کا وجود نہ ہوگا، فرمایا،

مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ (انعام-۲)

جس سے اس دن عذاب ہٹایا گیا تو خدا نے اُس پر رحم کیا،

صحیح بخاری و مسلم و ترمذی میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مومن کو معلوم ہو کہ خدا کے پاس کتنا عقاب ہی تو وہ جنت سے مایوس ہو جائے اور اگر کافر کو یہ معلوم ہو کہ اسکی رحمت کتنی وسیع ہے تو وہ بھی جنت سے ناامید نہ ہو مصلح الدین سعدی سیرازی نے غالبًا اسی حقیقت کو اپنے ان دو شعروں میں ادا کیا ہے،

بہ تہدید اگر رکشد تیغ حکم — بماند کروبیاں صم و بکم
وگر در دہد یک صلائے کرم — عزازیل گوید نصیبے کنم

خود اُس رحمان و رحیم کا جس کی بادشاہی آسمان و زمین کو محیط ہے، یہ ارشاد ہے کہ وہ جو چاہے کر سکتا ہے،

یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ وَلِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا وَاِلَیْہِ الْمَصِیْرُ (مائدہ ۲-۳)

جس کو چاہتا ہے بخش دیتا ہی اور جس کو چاہے عذاب دیتا ہی، اور آسمانوں کی اور زمین کی اور اُن کے بیچ کی بادشاہی اللہ کیلئے ہے، اور اسکی طرف لوٹ کر جانا ہی،

لیکن اُس کی یہ مشیت جیسا کہ اُس نے (انعام رکوع ۱۵) میں فرمایا ہی، اُسکی وسیع حکمت و مصلحت پر مبنی ہے، وہ جو چاہی کر سکتا ہی مگر کرتا وہی ہی جو اُسکی مصلحت حکمت کا تقاضا ہوتا ہی،

اس سے زیادہ .... اس بات میں کچھ اور کہنا حد سے آگے بڑھنا ہی کہ جسکی تصریح خود خدائے تعالیٰ نے فرمائی، اسکی تصریح کا حق کسی کو کیا ہے، اسلئے مشرک و کافر کے آخر انجام کے سوال کا جواب صرف مشیئت الٰہی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے،

اَلنَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ (انعام - ۱۵)

دوزخ تمہارا ٹھکانا ہے، اس میں سدا رہوگے، لیکن جو چاہے اللہ بیشک تیرا پروردگار حکمت والا، اور علم والا ہے،

جمہور کا مسلک | یہ جو کچھ کہا گیا وہ اس جماعت کا خیال ہے جو اللہ تعالیٰ کی رحمت عمومی کی معتقد ہے، جمہور کا مسلک اس سے کچھ مختلف ہے اُس کے نزدیک بہشت کی طرح دوزخ بھی ہمیشہ باقی رہیگا، اور اُن لوگوں کو جو شرک و کفر کے مرتکب ہونگے کبھی دوزخ سے نجات نہیں ملیگی

اس عقیدہ کے مطابق گنہگاروں کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو گنہگار تھے، مگر دل میں ایمان رکھتے تھے، ایسے لوگ سزا کے بغیر ہی یا عذاب کے بعد اللہ تعالیٰ کے عفو و کرم سے سرفراز ہو کر بالآخر جنت میں داخل ہونگے دوسرے وہ جو ہمیشہ شرک و کفر میں مبتلا رہے اور اُس سے توبہ کئے اور ایمان لائے بغیر مر گئے، ایسے لوگوں کی بخشایش کبھی نہ ہوگی اور وہ ہمیشہ کیلئے جہنم میں داخل کر دیئے جائیں گے انکی گنہگاری اس درجہ ہوگی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو اپنی طرف کسی طرح جذب نہ کر سکیں گے، یہ وہ زمین شور ہونگے جس میں اس رحمتِ عام کی بارش بھی کوئی روئیدگی پیدا نہ کر سکے گی،

رحمتِ عمومی کے معتقدین گذشتہ آیتوں سے جو معنی نکالتے ہیں، وہ جمہور کے نزدیک صحیح نہیں، وہ ان کے بیان کردہ مطالب کو تاویلات کا درجہ دیتے اور انکی بنیں کردہ روایات کو صحت اور قوت سے خالی جانتے، اور قرآن مجید کی حسب ذیل آیتوں سے اپنے دعویٰ پر استدلال کرتے ہیں،

۱۔ إِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكَافِرِينَ وَأَعَدَّ لَهُمْ سَعِيرًا خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا لَا يَجِدُونَ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا۔

۱۔ بیشک خدا نے کافروں پر لعنت کی، اور انکے لئے وہ آگ مہیا کی جسمیں وہ ہمیشہ سدا پڑے رہیں

۲۔ وَمَنْ يَعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا (جن - ۲۴)

۲۔ اور جو اللہ اور اُسکے رسول کی نافرمانی کریگا، تو اس کے لئے جہنم کی آگ ہے، اسمیں وہ ہمیشہ سدا پڑے رہیں،

۳۔ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَظَلَمُوا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيقًا إِلَّا طَرِيقَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا۔ (نساء - ۲۳)

۳۔ بیشک جنھوں نے کفر کیا، اور حد سے آگے بڑھے، نہیں ہے کہ اللہ اُن کو بخشے اور نہ یہ کہ انکو راہ دکھائے، لیکن جہنم کی راہ، اُس میں وہ ہمیشہ سدا پڑے رہیں،

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ اُن پر ہمیشہ عذاب ہوگا، اور جب عذاب ہمیشہ ہوگا تو عذاب کی جگہ یعنی دوزخ بھی ہمیشہ قائم رہے گی،

ان آیتوں کے علاوہ اور بھی دوسری آیتیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ کا عذاب کفار سے کبھی دور نہ ہوگا،

۱۔ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ أَنَّ لَهُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ

۱۔ بیشک جن لوگوں نے کفر کیا، اگر بالفرض اُنکے پاس ساری دنیا کا خزانہ ہو، اور اتنا ہی اُسکے ساتھ، اور چاہیں کہ وہ اس کو فدیہ دیکر قیامت کے دن عذاب سے چھٹ جائیں

اَلَیْہِ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا ھُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنْھَا وَلَھُمْ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ (مائدہ ۷)

تو اُن سے یہ فدیہ قبول نہ کیا جائیگا، اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے، چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل جائیں اور وہ اس میں سے نکل سکیں گے اور اُن کیلئے قائم رہنے والا

۲۔ وَمَا ھُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّارِ (بقرہ ۲۰)

۲۔ وہ دوزخ سے نکل نہیں سکیں گے

قیامت کے منکروں کی نسبت فرمایا،

۳۔ فَالْیَوْمَ لَا یُخْرَجُوْنَ مِنْھَا وَلَا ھُمْ یُسْتَعْتَبُوْنَ (جاثیہ ۴)

۳۔ تو آج اُس (دوزخ) سے وہ نہیں نکالے جائیں گے، اور نہ اُن کا عذر سنا جائیگا،

۴۔ اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ فِیْ عَذَابٍ مُّقِیْمٍ (شوریٰ ۵)

۴۔ ہاں کافر اور مشرک قائم رہنے والے عذاب میں ہوں گے،

ظلم کا اطلاق قرآن مجید میں شرک پر کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ شرک کا عذاب قائم رہیگا۔

۵۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَھُمْ کُفَّارٌ اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ لَعْنَۃُ اللّٰہِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا لَا یُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ وَلَا ھُمْ یُنْظَرُوْنَ (بقرہ ۱۹)

۵۔ بیشک جنھوں نے کفر کیا، اور اسی کفر کی حالت میں مر گئے اُن پر اللہ کی فرشتوں کی اور آدمیوں کی سب کی لعنت ہے، اس میں وہ سدا رہیں گے، اُن کے عذاب میں کمی نہیں کی جائیگی، اور نہ اُن کو مہلت دیجائے گی،

۶۔ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَھُمْ نَارُ جَھَنَّمَ لَا یُقْضٰی عَلَیْھِمْ فَیَمُوْتُوْا

۶۔ اور اُن کیلئے جنھوں نے کفر کیا جہنم کی آگ ہے نہ تو اُن کا فیصلہ کیا جائیگا کہ وہ مرجائیں اور

وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا (فاطر ۳۶)

نہ سزا میں کچھ کمی کی جائے گی،

شرک و کفر والوں کی مغفرت کسی حال میں نہ ہوگی، فرمایا،

۷۔ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ (نساء ۱۶)

۷۔ بیشک اللہ اسکو معاف نہ کریگا کہ اسکے ساتھ شرک کیا جائے

۸۔ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَن يَغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (محمد ۳۴)

۸۔ بے شبہ جنھوں نے کفر کیا، اور خدا کے رستہ سے روکا، اور اسی کفر کی حالت میں وہ مر گئے تو ان کو ہرگز معاف نہ کیا جائے گا،

ان کے لیے جنّت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہے،

۹۔ إِنَّهُ مَن يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ (مائدہ ۱۰)

۹۔ یقیناً جو خدا کے ساتھ شرک کریگا تو اللہ نے اُس پر جنت حرام کردی، اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے

۱۰۔ إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ (اعراف ۴)

۱۰۔ بیشک جنھوں نے ہمارے حکموں کو جھٹلایا اور ان کے ماننے سے سرکشی کی، اُن کے لیے آسمان کے دروازے کھولے نہ جائیں گے، اور نہ جنت میں وہ داخل ہوں گے تاآنکہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں گھس جائے،

۱۱۔ وَلَا يَحْزُنكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَن يَضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا يُرِيدُ اللّٰهُ أَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (آل عمران ۱۷۶)

۱۱۔ اور (اے پیغمبر) تجھے وہ لوگ جو کفر میں جلدی کرتے ہیں، غم میں نہ ڈالیں، وہ ہرگز خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے خدا چاہتا ہے کہ ان کیلئے آخرت میں کوئی حصّہ نہ بنائے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے،

اس قسم کی اور بھی بہت سی آیتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ مرتے دم تک شرک و کفر میں مبتلا رہے، اور توبہ نہیں کی، اُن کا گناہ بخشا نہ جائیگا، اور وہ جنت میں کبھی داخل نہ ہو سکیں گے، بلکہ ہمیشہ دوزخ کے عذاب میں پڑے رہیں گے، جہاں نہ اُن کے عذاب میں کبھی تخفیف ہوگی، اور نہ اُن کو موت آئے گی،

تصویر کے دونوں رخ آپکے سامنے آگئے،

بیا کیں داور یہا را بہ پیشِ داور اندازیم

بہشت و دوزخ کی جزا و سزا بھی تمثیلی ہو

اوپر عالمِ برزخ کے ذکر میں ہم بہ تفصیل بتا چکے ہیں کہ آخرت میں جزا و سزا تمامتر تمثیلی ہوگی، اس تمثیلی کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ جیسا عمل ہوگا اسی کے مناسب و مشابہ اسکی جزا یا سزا ہوگی، مثلاً قرآن میں ہے کہ جو زکوٰۃ[1] یعنی اپنے مال کا میل کچیل مستحقین کو کھانے کے لئے نہ دیگا تو اُسکو دوزخ میں زخموں کا دھوون کھانے کو ملیگا، یا یہ کہ جو خدا کی راہ میں اپنی جان دیگا مرنے کے بعد اُس کو جانِ تازہ اور حیاتِ نو بخشی جائیگی، وہ دولتمند جس کو دھوپ کی تپش سے بچنے کیلئے قصر و محل اور پینے کیلئے ٹھنڈے سے ٹھنڈا پانی اور عزت کی جگہ عنایت کی گئی تھی، اگر اُس نے دنیا میں ان نعمتوں کے ملنے کا حق اس دنیا میں ادا نہ کیا، تو دوسری دنیا میں اُس کو یہ سامان ملے گا۔

فی سمومٍ وّحمیمٍ لاّ وظلٍّ من یحمومٍ	وہ لو اور کھولتے پانی میں دھوئیں کے سایہ
لا بارد وّلا کریم، انّھم کانوا قبل	میں نہ ٹھنڈا، نہ باعزت، بے شک وہ پہلے ناز
ذٰلک مترفین، ج صلے (واقعہ ۲)	و نعمت میں تھے،

[1] حدیث میں ہے کہ زکوٰۃ مسلمانوں کی دولت کا میل ہے،

رویائے برزخ کی حدیث میں ہو کہ آپنے کچھ ایسے لوگوں کو دیکھا جن کا آدھا دھڑ خوبصورت اور آدھا بدصورت تھا، یہ وہ تھے جن کے کچھ کام اچھے اور برے تھے، اس لیے بداعمالی بدصورتی، اور نیکی خوبصورتی کے رنگ میں نمایاں ہوئی، صریح طور سے یہ اصول ان حدیثوں سے مستنبط ہوتا ہے،

۱۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہو کہ جو مومن خود بھوکا رہ کر کسی دوسرے بھوکے مومن کو کھلائے گا، تو خدا اس کو جنت کے پھل کھلائے گا، اور جو پیاسا ہو کر کسی دوسرے پیاسے کو پلائے گا تو خدا اس کو جنت میں شراب طہور پلائے گا، اور جو کوئی کپڑوں کا حاجتمند ہو کر ننگے کو پہنائے گا، تو خدا اس کو جنت کے سبز جوڑے پہنائے گا، (ترمذی کتاب الزہد والرقاق ص ۴۰۴)

۲۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کسی تکلیف کو دور کریگا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکلیف دور فرمائیگا، اور جو کوئی کسی نادار کو یہاں کسی مصیبت میں پھنسائیگا، تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کو مصیبت میں مبتلا فرمائیگا، اور جو کسی مسلمان کی ستر پوشی کریگا، تو خدا دنیا و آخرت میں اسکی ستر پوشی کریگا، اور جو کوئی اپنے بھائی کی مدد میں جب تک رہیگا خدا اس وقت تک اسکی مدد میں رہیگا (ترمذی ص ۲۲۳)

۳۔ جو انسانوں پر رحم کریگا، خدا اس پر رحم فرمائیگا، (ترمذی)

تمثیل کے دوسرے معنی یہ ہیں، کہ جو امور معنوی اور غیر مجسم ہیں، وہ اپنی مثالی شکل و صورت میں ظاہر ہوں گے مثلاً،

۱۔ قرآن میں ہو کہ جو اس دنیا میں حقیقت بینی سے اندھا ہوگا، وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا، دیکھو کہ دنیا کی معنوی قلبی نابینائی، دوسرے عالم میں ظاہری جسمانی نابینائی کی شکل میں ظاہر ہوگی،

۲- حدیث میں ہے کہ اہل تکبر قیامت کے دن چیونٹیاں بنا کر اٹھائے جائیں گے جنپر ہر طرف سے ذلت وخواری چھائی پھرے گی[1]" دیکھو کہ تکبر کی جزا ذلت وخواری سے ملے گی، اور چیونٹیوں سے زیادہ حقیر وذلیل کوئی ہستی نہیں، اسلئے اُن کی بڑائی اور تکبر کا معاوضہ یہ ہوا کہ چیونٹی بن کر اٹھیں"

۳- اسی طرح آپنے فرمایا کہ جو بخل کریگا، قیامت میں اس کا مال سانپ بن کر اس کو ڈسیگا[2] صفتِ بخل اُس کے حق میں اسی سانپ کی صورت اختیار کرکے اُس کی تکلیف کا باعث ہوگی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ "جو شخص بلاوجہ بھیک مانگ کر اپنی آبرو ریزی کرتا ہے قیامت میں وہ اٹھیگا تو اُس کے منہ پر گوشت نہ ہوگا، دیکھو کہ دنیاوی بے شرمی وبیحیائی بے گوشت چہرہ کی صورت میں ظاہر ہوگی، اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ دو بیبیوں کا وہ شوہر جو ایک کا حق ادا کرتا اور دوسری سے غفلت برتتا تھا، قیامت میں اس طرح آئیگا کہ اس کا ایک پہلو رگویا مفلوج ہوکر جھک گیا ہوگا[3] ایک پہلو کا عدم ادائی حق اپنی تمثیلی صورت میں ایک پہلو کی مفلوجی کیفیت میں نمودار ہوگا، یہ چند حوالے ذکر کئے گئے ہیں، ان ہی پر جزا وسزا کے اور دوسرے جزئیات کو قیاس کرنا چاہئے، اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے حسب ذیل آیتوں پر غور کرنا چاہئے،

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ	جس نے میری یاد سے منہ پھیرا تو اس کو تنگ گذران
لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ	ملیگی اور قیامت کے دن ہم اس کو اندھا
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى، قَالَ رَبِّ لِمَ	اٹھائیں گے، وہ کہیگا، اے میرے پروردگار
حَشَرْتَنِيْ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا	تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا، میں تو دیکھتا تھا

[1] ترمذی کتاب الزہد الرقاق ص۴۱، [2] صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں یُمَثَّلُ لَهٗ مَالُهٗ شُجَاعًا اَقْرَعَ [3] ترمذی ایضاً

قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى، (طٰہٰ-۷)

فرمائیگا، اسی طرح میری آیتیں تیرے پاس آئیں تو تو نے اُن کو بھلا دیا، ایسے ہی آج تو بھلایا جائیگا،

دیکھو کہ دل کی نابینائی، قیامت میں ظاہری نابینائی، اور یہاں خدا کو بھولنا، اور اسکے احکام کو یاد نہ کرنا، وہاں رحمتِ الٰہی کی یاد سے بھول کی شکل میں نمودار ہوگا،

دوزخ کی جسمانی سزائیں دوزخ میں جسمانی اور روحانی دونوں سزائیں ملیں گی، قرآن پاک میں جن جسمانی سزاؤں کا ذکر ہے، وہ حسب ذیل ہیں،

۱۔ آتشِ دوزخ اور اس کی سوزش کا ذکر بار بار آیا ہے، بلکہ النّار یعنی آگ گویا دوزخ کا دوسرا نام ہے ان ہی معنوں میں السَّعِیْر یعنی جلتی آگ بھی بارہا مستعمل ہوا ہے اور عَذَابَ الْحَرِیْق (جلن کا عذاب) بھی دو چار جگہ کہا گیا ہے، ایک جگہ یہ بھی ہے کہ

تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ (مؤمنون-۷)

ان کے چہروں کو دوزخ کی آگ جھلس دیگی اور اُن کی صورتیں اس میں بگڑ جائیں گی

دوزخ کا ایک اور نام سقر ہے، جس کے متعلق یہ ہے کہ

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ (مدثر-۱)

اور تمھیں کیا معلوم سقر کیا ہے نہ وہ رحم کھائیگی نہ چھوڑے گی، چہروں کو جھلس دینے والی

كَلَّآ اِنَّهَا لَظٰى نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى (معارج-۱)

ہرگز نہیں وہ شعلہ والی آگ ہے منہ کی کھال اُدھیڑنے والی،

اِنَّهَا تَرْمِیْ بِشَرَرٍ کَالْقَصْرِ کَاَنَّهٗ — دوزخ محل کے برابر اونچی چنگاریاں اتنی بڑی

جِمٰلَتٌ صُفْرٌ (مرسلات ۱) — پھینکے گی جیسے زرد رنگ کے اونٹ

۲۔ وہاں سایہ نہ ہوگا بلکہ یہ حکم ہوگا،

اِنْطَلِقُوْا اِلٰی ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ — چلو ایک چھاؤں کی طرف جس کی تین شاخیں

لَا ظَلِیْلٍ وَّلَا یُغْنِیْ مِنَ اللَّهَبِ (مرسلات ۲) — ہونگی، نہ گھن کی چھاؤں اور نہ تپش میں کام آسکے

۳۔ وہاں ٹھنڈک نہ ہوگی،

لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا — اس میں نہ وہ ٹھنڈک کا مزہ چکھیں گے، اور نہ

(نباء ۱) — کسی پینے کی چیز کا،

۴۔ دوزخ میں نہ موت آئیگی کہ چین آجائے، اور نہ ایسی زندگی ہی ہوگی، جس میں کوئی مسرت نہ ہوگی، دو جگہ فرمایا۔

لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی (طٰہٰ ۱۱) — وہاں وہ نہ مرے گا نہ جئے گا،

۵۔ پینے کو گرم پانی ملے گا جس سے آنتیں نکل پڑیں گی،

وَسُقُوْا مَآءً حَمِیْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ — اور وہ گرم پانی پلائے جائیں گے، تو وہ

(محمد ۲) — پانی اُن کی آنتوں کو ٹکڑے کر دیگا،

۶۔ اور پیپ پئیں گے،

اِلَّا حَمِیْمًا وَّغَسَّاقًا (نباء ۱) — لیکن کھولتا پانی اور پیپ،

۷۔ ان کے اوپر سے گرم پانی چھوڑا جائے گا،

يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوسِهِ الْحَمِيمُ (ح-۲)

ان کے سروں کے اوپر سے گرم پانی ڈالا جائیگا،

۸۔ کھانے کو سینڈھے کا پھل ملے گا،

اَهُ شَجَرَةُ الزَّقُّومِ . . . . . .

یا سینڈھے کا پھل . . . . . وہ

اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِي اَصْلِ الْجَحِيمِ لا

ایک درخت ہے، دوزخ کی جڑ میں اُس

طَلْعُهَا كَاَنَّهُ رُءُوسُ الشَّيَاطِينِ

کے شگوفے جیسے شیطانوں کے سر، تو

فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُونَ مِنْهَا فَمَالِـُٔونَ

وہ کھائیں گے، اور اُس سے پیٹ بھریں گے

مِنْهَا الْبُطُونَ ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا

پھر اُس پر گرم پانی کی ملونی ہوگی

لَشَوْبًا مِنْ حَمِيمٍ ج (والصّٰفّٰت-۲)

اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّومِ لا طَعَامُ الْاَثِيمِ لا

سینڈھے کا درخت گنہگار کی غذا ہی جیسے،

كَالْمُهْلِ يَغْلِي فِي الْبُطُونِ كَغَلْيِ الْحَمِيمِ (دخان-۳)

پگھلا تانبا، وہ پیٹوں میں کھولتا ہے جیسے کھولتا پانی،

۹۔ خاردار جھاڑ ضریع کی خوراک ہوگی، جس سے بدن کو کوئی فائدہ نہ ہوگا،

لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيعٍ

اور اُن کے لیے کوئی کھانا نہ ہوگا، لیکن خاردار

لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوعٍ ط

جھاڑی، جو نہ موٹا کرے گی، اور نہ بھوک سے

(غاشیہ-۱)

بے پروا کرے گی،

۱۰۔ زخموں کے دھوون کی خوراک ملے گی،

وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِينٍ (حاقہ-۳)

اور نہ کوئی کھانا مگر زخموں کا دھوون۔

۱۱۔ کھانا نگلا نہ جائے گا۔

وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ، (مزمل-۱)

اور گلے میں اٹکنے والا کھانا،

۱۲۔ آگ کے کپڑوں کا لباس ہوگا،

فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ، (حج-۲)

کافروں کے لیے آگ کے کپڑے قطع ہوں گے،

۱۳۔ لوہے کے ہتھوڑے پہنیں گے،

وَلَهُمْ مَقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ (حج-۲)

اور اُن کے لیے لوہے کے ہتھوڑے ہوں گے

۱۴۔ گلے میں طوق اور زنجیریں ہوں گی،

اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ يُسْحَبُوْنَ، (مومن-۸)

جب اُن کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی، وہ کھینچے جائیں گے،

اِنَّا اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَا وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا، (دھر-۱)

ہم (خدا نے) کافروں کے لئے زنجیریں اور طوق اور آگ تیار رکھی ہے،

مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ (ابراہیم-۱)

دو زنجیروں میں جکڑے ہوئے

دوزخ میں روحانی سزائیں، ان جسمانی سزاؤں کے ساتھ روحانی سزائیں بھی ہوں گی جو اہلِ نظر کی نگاہوں میں اُن سے بھی بڑھ کر ہیں، چنانچہ دوزخ کی وہ آگ جس کی گرمی اور سوزش کا حال اوپر گذر چکا، وہ دل کو جا کر جھانکے گی، فرمایا،

نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ، (ہمزہ-۱)

سُلگائی ہوئی اللہ کی آگ، جو دلوں کو جھانکے گی،

وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا	اور جب عذاب کو دیکھیں گے، تو اپنی
الْعَذَابَ (یونس-۷)	پشیمانی کو چھپائیں گے،
یٰحَسْرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطْتُّ فِیْ جَنْۢبِ	اے حسرت اس پر کہ میں نے خدا کے پہلو
اللّٰہِ، (زمر-۷)	میں کمی کی،
کُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا	وہ جب جب دوزخ سے غم کی وجہ سے
مِنْ غَمٍّ، (حج-۲)	نکلنا چاہیں گے،
ذلت کا عذاب،	
فَالْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ	تو آج ذلت کے عذاب کا بدلہ دیئے
(احقاف-۲)	جاؤ گے،

اس افسوس وحسرت وندامت سے بڑھ کر یہ کہ اُن کو معذرت پیش کرنے کی بھی اجازت نہ ہوگی

لَا تَعْتَذِرُوا الْیَوْمَ، (تحریم-۱)	آج معذرت نہ پیش کرو،

اللہ عزوجل سے مکالمہ کا شرف اُن کو نہ ملیگا جب وہ بات کرنا چاہیں گے تو وہ فرمائیگا

اِخْسَـُٔوْا فِیْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ	ذلیل ہو اس دوزخ میں اور مجھ سے
(مومنون-۷)	بات نہ کرو،

سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے جلوہ سے محروم رہیں گے،

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ یَوْمَئِذٍ	ہرگز نہیں وہ اس دن اپنے رب سے پردہ
لَّمَحْجُوْبُوْنَ، (المطففین)	میں ہوں گے

اُن میں سے جنھوں نے اس دنیا میں اپنے پروردگار کو بھلا دیا تھا، اُس دن وہ بھی ان کو اپنی رحمت و شفقت کی یاد سے بھلا دے گا، فرمایا:۔

كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا — اسی طرح ہماری آیتیں تیرے پاس آئیں تو تو نے
وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى (طٰہٰ) — ان کو بھلا دیا، ایسے ہی آج تو بھی بھلایا جائیگا

ایسے دو زخی بھی ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی نگاہِ کرم سے بھی محروم رہیں گے، وہ اُنکی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا، نہ اُن سے کچھ بات کرے گا، اور نہ اُن کی اصلاح حال کی کوئی فکر کرے گا، یہ حقیقت میں شفیق و مہربان رب کی انتہائی ناراضی کی تصویر ہے، اس درد کے احساس کو وہی کچھ سمجھ سکتے ہیں، جو عشق و محبت کے زخم خوردہ ہیں، فرمایا،

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ — جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی (جھوٹی)
وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ — قسموں کے ذریعہ سے تھوڑی سی دولت
لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَ — خرید کرتے ہیں، آخرت میں اُن کا کوئی
لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ — حصہ نہیں، نہ قیامت میں خدا ان سے
اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ — بات کرے گا، نہ اُن کی طرف دیکھے گا،
وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ — نہ اُن کو سنوارے گا اور ان کے لیے
(آل عمران۔۸) — دردناک عذاب ہے،

جنّت

جنت کے نام اُس مقام کا نام جو نیکو کار انسانوں کا دائمی گھر ہوگا، قرآن پاک میں عموماً اَلْجَنَّۃُ (باغ) بتایا گیا ہے، اور کبھی کبھی اُس کو مناسب اضافتوں کیساتھ بھی ادا کیا گیا ہے، مثلاً جَنَّۃُ النَّعِیْمِ (نعمت کا باغ) جَنَّۃُ الْخُلْدِ (بقائے دوام کا باغ) جَنّٰتُ عَدْنٍ، (دائمی سکونت کے باغ) جَنَّۃُ الْمَاوٰی (پناہ کا باغ) اُن کے علاوہ اور دوسرے لفظوں سے بھی اُس کی تعبیر کی گئی ہے، مثلاً فِرْدَوْسٌ (باغ) رَوْضَۃٌ (چمن) دَارُ الْخُلْدِ، (ہمیشگی کا گھر) دَارُ الْمُقَامَۃِ (قیام کا گھر) دَارُ السَّلَامِ (امن و سلامتی کا گھر)

جنت کا دوام اس موجودہ دنیا میں بھی گو لذتیں اور مسرتیں ہیں، مگر جو چیز یہاں نہیں ہے، وہ بقائے دوام ہے، یہاں کی ہر لذت عارضی، اور ہر مسرت آنی ہے، یہاں خوشی کا کوئی ایسا ترانہ نہیں، جس کے بعد غم و ماتم کا نالہ نہ ہو، یہاں ہر پھول کیساتھ کانٹے، ہر روشنی کے ساتھ تاریکی، ہر وجود کیساتھ فنا، ہر سیری کے بعد بھوک، ہر سیرابی کے بعد پیاس اور ہر غنا کے بعد محتاجی ہے، انسان ہزاروں مشکلیں اٹھانے اور ہزاروں صدمے سہنے کے بعد ایک مسرت کا پیام سنتا، اور خوشی کا منظر دیکھتا ہے، مگر ابھی اس سے سیر ہونے کی بھی نوبت نہیں آتی کہ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے، غرض اس موجودہ عالم فانی کی ہر شے آنی جانی ہے، اور یہی یہاں کی سب سے بڑی کمی ہے،

لیکن جنّت اُس مملکت کا نام ہے، جہاں کی لذتیں بادوانی اور جہاں کی مسرّتیں غیر فانی ہیں، جہاں حیات ہی، مگر موت نہیں، راحت ہی، مگر تکلیف نہیں، لذّت ہی، مگر الم نہیں، مسرت ہی، مگر غم نہیں، جہاں وہ سکون ہے، جس کے ساتھ اضطراب نہیں، اور وہ شادمانی ہی، جس کے بعد حزن واندوہ نہیں، شیطان نے حضرت آدمؑ کے سامنے جنت کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ بالکل صحیح تھا، اس نے کہا اے آدم!

هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى، (طٰہٰ-۷) — کیا میں تجھے سدا جینے کا درخت اور وہ بادشاہی بتاؤں جس کو فنا نہیں

مگر جنت کا یہ وصف سنا کر اُن کو جدھر کا راستہ بتایا، وہ موت کے درخت اور فنا کے ملک کی طرف کا تھا، اور یہی وہ فریب تھا، جس میں آدم گرفتار ہوئے، چنانچہ اسی جنتی زندگی کی تلاش میں وہ چیز کھالی، جو اُن کے حق میں زہر تھی، یعنی گناہ کا پھل، نتیجہ یہ ہوا کہ جنۃ الخلد اور غیر فانی ملک سے نکل کر اُن کو اِس فنا کے ملک میں آنا پڑا، اور پھر اس جنۃ الخلد اور غیر فانی ملک کا استحقاق اُن کے اور اُن کی نسل کے اعمالِ صالحہ کا صلہ قرار پایا، چنانچہ فرمایا،

اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ كَانَتْ لَهُمْ جَزَاۗءً وَّمَصِيْرًا، (فرقان-۲) — یا ہمیشگی کا باغ جس کا وعدہ پرہیزگاروں سے کیا گیا جو اُن کا صلہ ہوگا اور واپسی کی جگہ

یہ ہمیشگی کا باغ وہ غیر فانی مملکت ہی، جہاں کا آرام دائم اور جہاں کی سلامتی ابدی ہے جہاں کی لذت بے انتہا، جہاں کی زندگی غیر منقطع، جہاں کا سرور غیر مختتم اور جہاں کا عیش جاودانی ہے

چنانچہ اس کی تصریح قرآن پاک کی سولہ آیتوں میں مختلف طریقوں سے کی گئی ہے، فرمایا،

۱۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ — اور جو ایمان لائے اور اچھے عمل کئے ہم
سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ — اُن کو باغوں میں داخل کریں گے، جن کے
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا — نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی وہ ہمیشہ
اَبَدًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَمَنْ — کے لیے رہ پڑیں گے، اللہ کا وعدہ سچا ہے،
اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا (نساء) — اور اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی ہوگی،

اس تاکید پر تاکید اور پُرزور طریقہ تعبیر پر نظر ڈالئے کہ صرف "خلود" پر اکتفا نہیں کی بلکہ ساتھ ہی اَبَدًا فرما کر اس خلود کو غیر فانی اور دوام کو ابدی ظاہر فرمایا، اس پر بھی بس نہ کی بلکہ یہ بھی اضافہ کیا کہ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے، پھر مزید تاکید کا اضافہ کیا، کہ اور اللہ سے زیادہ سچی بات کس کی ہو سکتی ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خلود جنت اور بقائے غیر فانی کی قطعیت کتنی ہے

۲۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا — ۲۔ اور جو ایمان لائے اور اچھے عمل کئے ہم
الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ — ہم ان کو ان باغوں میں داخل کریں گے
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ — جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں
فِيْهَا اَبَدًا (نساء - ۸) — وہ ہمیشہ رہا کریں گے،

۳۔ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا — ۳۔ اُن کے لیے وہ باغ ہیں جن کے نیچے سے
الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا (مائدہ) — نہریں بہتی ہیں، وہ اُن میں ہمیشہ رہا کریں گے

۴۔ وَجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ — ۴۔ اور اللہ اُن کو خوشخبری دیتا ہے کہ ان کے

خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ	لیے وہ باغ ہیں جن میں ہمیشہ کا آرام ہے،
(توبہ-۳)	اور جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے،
۵- وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ	۵- اور اُن کے لیے وہ باغ مہیا کئے ہیں
تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا	جن کے نیچے نہریں رواں ہیں، وہ ان
اَبَدًا ۭ (توبہ-۱۳)	میں ہمیشہ رہا کریں گے،
۶- وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ	۶- اس کو اُن باغوں میں داخل کریگا،
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا	جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اُن میں
اَبَدًا ۭ (تغابن-۱۱)	وہ ہمیشہ رہا کریں گے،
۷- وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ	۷- اور جو اللہ پر ایمان لائے اور نیک کام
صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ	کرے، اُس کو وہ اُن باغوں میں داخل
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا	کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں،
اَبَدًا ۭ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا	اُن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے، اللہ
(طلاق-۲)	نے اُس کو روزی خوب دی،
۸- جَزَاۗؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ	۸- ان کی مزدوری اُن کے رب کے حضور
عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ	میں بسنے کے وہ باغ ہیں جن کے نیچے نہریں
خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا (بینہ-۱)	بہتی ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے،

یہ آیتیں وہ ہیں جن میں اہلِ جنت کو جنت میں خلود ابدی کی قطعی بشارت سنائی گئی ہے،

اُن کے علاوہ وہ آیتیں ہیں جن میں جنّت کی راحتوں اور لذّتوں کی ابدیت اور دوام کی خبر دی گئی ہے، فرمایا

۹۔ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا، مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا (کہف ۱۰)

۹۔ اور اُن مومنوں کو بشارت دیگا، جنھوں نے اچھے کام کئے کہ اُن کے لیے اچھی مزدوری ہے جس میں وہ ہمیشہ قیام پذیر رہیں گے

سورہ ص میں جنّت کی اکثر نعمتوں کے بیان کے بعد ہے،

۱۰۔ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ (ص ۵۴)

۱۰۔ یہ وہ ہے جس کا حساب کے دن تم کو دینے کا وعدہ کیا جاتا ہے، بے شبہ یہ ہماری وہ روزی ہوگی جس کو ختم ہونا نہیں ہے،

۱۱۔ وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ، (هود ۹)

۱۱۔ اور لیکن جو خوش قسمت ہوئے تو وہ جنت میں رہا کریں گے، جب تک آسمان اور زمین ہیں لیکن جو تیرا رب چاہے وہ بخشش ہوگی، جو منقطع نہ ہوگی،

یعنی خدا کی مشیت کے سوا ان کو اس جنّت سے کوئی الگ نہ کر سکے گا، لیکن اس کی مشیت یہی ہوگی، کہ ان کے لیے اس کی یہ بخشش دائمی اور غیر منقطع طریقہ سے ہمیشہ قائم رہے، پھر جس کے متعلق اس کی مشیت کا یہ اعلان ہے، وہ فنا کیونکر ہو سکے گی،

۱۲۔ وَجَنّٰتِ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ وَعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ (رعد ۳)

۱۲۔ اور وہ باغ جن میں ان کے لیے قائم رہنے والی نعمت ہوگی،

۱۳۔ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا (رعد۔۵)

۱۳۔ جنت کا میوہ اور اس کا سایہ دائمی ہوگا

۱۴۔ وَّفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ لَّا مَقْطُوْعَةٍ

۱۴۔ اور بہت سے میوے جن کا نہ انقطاع ہوگا

وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ (واقعہ۔۱)

اور نہ جن کی روک ہوگی،

۱۵۔ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

۱۵۔ لیکن جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام

الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ،

کئے اُن کے لیے وہ مزدوری ہے جس کا

(تین)

سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا،

فنائے راحت اور انقطاعِ مسرت کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ راحت و مسرت کے اسباب کا خاتمہ ہو جائے اور دوسرے یہ کہ خود لذت اٹھانے والے کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے، پہلی صورت کی نفی تو گذشتہ آیتوں میں کر دی گئی کہ راحت و مسرت کے اسباب کا وہاں خاتمہ نہ ہوگا، اب رہ گئی دوسری صورت تو گو خَالِدِيْنَ اَبَدًا کہہ کر اس کی نفی بار بار کی جا چکی ہے، مگر ایک جگہ تبصریح یہ کہہ دیا گیا ہے کہ اس احاطہ میں موت کا گذر نہ ہوگا فرمایا،

۱۷۔ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا

۱۷۔ جنت میں جانے والے پہلی موت کے سوا

الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى ج (دخان۔۳)

پھر موت کا مزہ نہیں چکھیں گے،

لیکن ایک تیسری صورت یہ بھی ممکن تھی کہ مسرت کے اسباب بھی قائم رہیں اور اہل جنت کی زندگی بھی دائم ہو مگر کچھ دنوں کے بعد ان کو وہاں سے نکال کر الگ کر دیا جائے، تو اسکی تصریح بھی فرما دی کہ یہ بھی ممکن نہ ہوگا کہ کوئی اہلِ جنت کو ان کے عیش و راحت کی منزل گاہوں سے باہر نکال سکے، فرمایا،

لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ — وہاں اُن کو کوئی غم نہ چھوئیگا، اور نہ وہ
مِنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ط (حجر-۴۸) — اس میں سے نکالے جائیں گے،

یہ بھی ممکن ہے کہ خود اہلِ جنت اس سے گھبرا کر نکل آئیں تو فرمایا کہ اُن کی جبلت و فطرت ایسی ہوگی کہ وہ خود بھی اس مہمان خانہ الٰہی سے نکلنا پسند نہیں کریں گے، فرمایا،

خَالِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا — سدا رہیں گے اس میں، اس سے منتقل ہونا
حِوَلًا (کہف-۱۴۰) — نہ چاہیں گے،

دوام و بقا اور تسلسل و عدم انقطاع کی اس تو بر تو تاکید اور اصرار سے اندازہ ہوگا کہ اسبابِ مسرت کی بقا، راحت کا دوام، اور زندگی کا تسلسل جنت کی اصلی خصوصیت ہوگی، یہی وہ حقیقت ہے جس کی لالچ شیطان نے

وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى (طٰہٰ-۷) — اور غیر فانی سلطنت

کہکر آدم کو دلائی تھی، اور اس بہانہ سے اس عالمِ بقا سے اُن کو اس عالمِ فنا میں بھجوا دیا، آخر وہ زمانہ آئیگا جب آدم کی اولاد کو اُن کے نیک اعمال کے بدولت اس غیر فانی بادشاہی کی وراثت ہمیشہ کے لیے حاصل ہوگی،

غیر فانی بادشاہی دنیا میں شخصی راحت و آلام کا ملن سے بلند تخیل، ایک لفظ "بادشاہی" کے اندر بخوبی ادا ہو سکتا ہے، اگر انسان کو اسکی انتہائی آرزوؤں کے بر آنے کی خوشخبری دینے کے لیے کوئی لفظ ہو سکتا ہے تو یہی ہے، گویا بادشاہی اس کیفیت کا نام ہے، جس میں انسان کی کوئی آرزو کامیابی سے محروم نہ رہے، سامانِ راحت اور اسبابِ شادمانی کی فراوانی سے اس کی مسرت

میں کسی غم کا شائبہ نہ ہو اونچے اونچے محل، ہرے بھرے باغ، بہتی نہریں، سرسبز و شاداب تختے
سونے چاندی کے اسباب، زر و جواہر کے بدن، زرین کمر غلام و خدام، ریشمی لباس، طلائی تخت،
موتیوں کے ہار، سونے کے کنگن، شراب کے زمردیں اور بلورین پیالے، حسین و مہ جبین بیگمات غرض
ایک لفظ بادشاہی کے یہ تمام ضروری لوازمے ہیں،
جنت کی مختصر ترین لیکن سچی تعریف آدمؑ کے دشمن نے آدمؑ کے سامنے کی تھی،

وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ (طٰہٰ - ۷)

اور غیر فانی بادشاہی،

آنے والی زندگی کے اس غیر فانی عیش و مسرت کے لیے، مختلف پیغمبروں نے مختلف لفظ
استعمال کئے ہیں، چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کے لیے آسمانی بادشاہی کی اصطلاح
قائم فرمائی، اور اپنی گفتگو کے تمام استعاروں میں اس مفہوم کو اسی لفظ سے ادا کیا ہے، مگر
جیسا کہ بار بار کہا گیا ہے کہ انسانی لغت کے الفاظ سے جو مادیت کی گودوں میں پلے اور
مادیت کے ماحول میں پھولے پھلے ہیں کسی روحانی مفہوم کی تعبیر ناممکن ہے کہ اس کے ہر لفظ کے
مفہوم کو ان ہی لوازم اور خیالات کیساتھ انسان سمجھنے پر مجبور ہے، جو ہمیشہ سے اس لفظ
کے ساتھ وابستہ چلے آتے ہیں، آپ بادشاہی کو آسمانی کہکر کسی قدر مادہ سے بلند کریں، مگر
بادشاہی کے مفہوم کے ساتھ جو موروثی خیالات و لوازم وابستہ ہیں وہ دور نہیں ہو سکتے، چنانچہ
خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی زندگی کی آخری شب میں شاگردوں کو جب شراب کا پیالہ بھر کر
دیتے ہیں تو آسمانی بادشاہی کے مادی لطف و مسرت کا ذکر ان لفظوں میں کرتے ہیں،

میں پھر تمھیں کہتا ہوں کہ انگور کا شیرہ پھر نہ پیونگا اس دن تک کہ تمھارے ساتھ اپنے

باپ کی بادشاہی میں اُسے نیا نہ پیوں۔" (متی ۲۶-۲۹)

آپ نے دیکھا کہ "باپ کی آسمانی بادشاہی" میں بھی انگور ہی کا شیرہ پینے کو ملے گا۔

اور یوحنا حواری نے جب اس آسمانی بادشاہی کا خواب دیکھا تو وہ انگوا سی سونے چاندی کے محل، آبِ حیات کی نہر اور جواہرات کی دیواروں میں نظر آئی (مکاشفاتِ یوحنا باب ۲۱ و ۲۲)

"وہاں رات نہ ہوگی، اور وے چراغ اور سورج کی روشنی کے محتاج نہیں، کیونکہ خداوند ان کو روشن کرتا ہے اور وے ابدالآباد بادشاہی کریں گے۔" (۲۲-۵)

لیکن یہ "بادشاہی" عیسوی پیغام میں ہنوز تفسیر کی محتاج ہے، نبوت کے آخری پیغام نے اس اجمال کی تفصیل ان لفظوں میں کی ہے،

فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ	تو اللہ نے اہلِ جنت کو اس دن کی تکلیف سے
وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا وَجَزٰهُمْ	بچا لیا، اور اُن کو تر و تازگی اور شادکامی سے ملایا
بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا مُّتَّكِـِٕيْنَ	اور اُن کے صبر کے بدلے میں انکو (رہنے کے لیے)
فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا	باغ اور (پہننے کے لیے) ریشمی کپڑے دیے وہ ان
شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا وَدَانِيَةً	باغوں میں تختوں پر تکیے لگائے ہوں گے ان میں
عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا	نہ دھوپ ہوگی نہ ٹھنڈ اور سایہ اُن کے
تَذْلِيْلًا وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ	پر جھکے ہوں گے اُن کے خوشے پست ہو کر
مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا	لٹکے ہوں گے، چاندی کے برتن اور نقرئی
قَوَارِيْرَا مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا	شیشوں کے آبخورے جو ناپ کر بنائے

تَقْدِيرًا، وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ
مِزَاجُهَا زَنْجَبِيلًا ۝ عَيْنًا فِيهَا تُسَمّٰى
سَلْسَبِيلًا، وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ
مُخَلَّدُونَ إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ
لُؤْلُؤًا مَنْثُورًا، وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ
رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلْكًا كَبِيرًا، عَالِيَهُمْ
ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَإِسْتَبْرَقٌ
وَحُلُّوا أَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ وَسَقَاهُمْ
رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا، إِنَّ هٰذَا
كَانَ لَكُمْ جَزَاءً وَكَانَ سَعْيُكُمْ
مَشْكُورًا،

(دھر-۱)

گئے ہیں، اُن کو لوگ اُن کے پاس لیے
پھریں گے، اور اُن کو وہاں وہ پیالہ پلایا،
جائیگا جس میں سونٹھ ملی ہوگی، اُس میں ایک
چشمہ کا نام سلسبیل ہے، اور سدا رہنے والے
کمسن غلام اُنکی خدمت میں گھوم رہے ہونگے اور
تو انھیں دیکھے تو سمجھے کہ موتی بکھرے ہیں،
اور جب تو یہ سب دیکھے تو وہاں نعمت و
عیش اور بڑی بادشاہی دیکھے، ان کی پوشاک
سبز نرم ریشم اور دبیز ریشم ہو، اور اُن کو
نقرئی کنگن پہنائے جائیں گے، اور اُن کا پروردگار
اُن کو پاک شراب پلائیگا یہ تمھاری مزدوری
ہوگی، اور تمھاری محنت کی قدر کیجائے گی

یہ پورا نقشہ اُس عیش و مسرت کا ہے، جو اس دنیا کے شاہانہ محلوں کے متعلق تخیل میں آتا ہے، اس بیان کی تائید و تصدیق اس صحیح حدیث سے ہوگی جو جامع ترمذی میں حضرت مغیرہؓ صحابی سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ موسیٰ نے اپنے پروردگار سے پوچھا کہ اے پروردگار! جنت والوں میں سے سب سے کم رتبہ کون ہوگا۔ فرمایا وہ شخص جو جنت والوں کے جنت میں داخل ہو چکنے کے بعد آخر میں آئے گا، تو اس سے کہا جائیگا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ، وہ کہے گا کہ اب میں

کہاں جاؤں کہ لوگ اپنے اپنے مقام پر جا چکے، اور زبانی نوازشوں پر قابض ہو چکے، اُس سے کہا جائیگا کہ کیا تو اس پر راضی ہے کہ تجھے وہ ملے جو دنیا کے بادشاہوں میں سے کسی کے پاس نہ تھا؛ عرض کریگا "خداوندا میں راضی ہوں"، فرمائیگا "تیرے لیے اتنا اور اس سے دونا، اور اس سے تگنا اور چوگنا ہے"، کہیگا "خداوندا میں راضی ہو گیا"، خدا فرمائیگا "تیرے لیے وہ اور اوسکا دوگنا ہے"، عرض کریگا "میں راضی ہو گیا"، فرمائیگا "اسکے ساتھ یہ بھی کہ جو تیرا دل آرزو کرے اور جو تیری آنکھ کو لذت بخشے"[1]

باغ کا استعارہ آخرت کے خانہ عیش و راحت کے لیے قرآن پاک نے عموماً جنت اور کہیں روضہ کے لفظ کا استعمال کیا ہے، نادان اسکی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ عرب کے شور و ریلے حاصل اور خشک صحرا کے بسنے والوں کی انتہائی آرزو چونکہ سرسبز و شاداب باغوں ہی کی ہو سکتی ہے، اسلیئے ان کے لیے یہ لفظ اُس مقامِ آخرت کے لیے قرآن نے استعمال کیا ہے، مگر یہ سمجھنا چاہیئے کہ قرآن کا مخاطب صرف عرب نہیں بلکہ دنیا کا گوشہ گوشہ ہے، اسلیئے عرب کی تخصیص بے معنی ہے، کیا دنیا کے سرسبز و شاداب ملکوں کے بسنے والوں کے تخیل میں باغ و راغ اور رنگ و گل کی بہار پسندیدہ نہیں ہے اصل یہ ہے کہ یہاں بیابان و گلستاں کی تخصیص نہیں، یہ فطرتِ انسانی کی تصویر ہے، انسان کسی خطۂ ارضی میں آباد ہو مگر وہ سرسبز و شاداب قطعات باغ و بہار، اور کنارِ آب و نہر کو عیش و مسرت کا مقام سمجھتا ہے اور اُن کو دیکھ کر اندر سے اس کی روح وجد کرتی ہے،

اس استعارہ کے استعمال کا ایک اور نکتہ بھی توجہ کے قابل ہے، انسان کا گھر وہ عیش خانہ ہوتا ہے، جس میں حزن و غم کی آمیزش بھی شامل ہوتی ہے، اہل و عیال اور دولت و مال کے متعلق ہر قسم

[1] جامع ترمذی تفسیر سورہ سجدہ (حدیث حسن صحیح)

کی فکرین اُس کے دل کے دامن سے لپٹی ہوتی ہیں، مگر جب انسان سیر و تفریح کے لیے باغ و چمن کا رُخ کرتا ہے، تھوڑی دیر کے لیے وہ ہر غم کو بھول جاتا اور ہر تعلق کو دل سے نکال دیتا ہے، اور ایسا شاداں و فرحاں بنجاتا ہے کہ غم و الم اُس کے ہر گوشہ خاطر سے دور ہو جاتے ہیں وحی محمدی علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ والسّلام نے اس لفظ کو اسی لیے استعمال کیا ہے تاکہ اس سے اخروی عیش و مسرت، شادی و خوشی اور فراغِ خاطر کی پوری تصویر کھنچ جائے،

سامان جنت کے دنیاوی نام سے

یہ حقیقت بار بار دہرائی گئی ہے کہ عالمِ آخرت کی اشیاء کو جن دنیاوی الفاظ سے ادا کیا گیا ہے، اُن سے مقصود بالکل وہی نہیں ہیں جو ان لفظوں سے سمجھنے کے ہم عادی ہیں، بلکہ اُن اُخروی اشیاء کو اُن دنیاوی الفاظ سے اسلئے ادا کیا گیا ہے کہ وہ ان سے خاص مناسبت رکھتی ہیں، ورنہ از روے حقیقت ان الفاظ کے لغوی مفہوم و معنی سے اُن کی اُخروی حقیقتیں بدرجہا بلند و اتم ہوں گی چنانچہ قرآن مجید کی ان آیتوں میں،

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	اور اُن کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے
اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا	یہ خوشخبری سنا کہ ان کے لیے وہ باغ ہیں
الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ	جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہونگی وہ جب
رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا	جب ان باغوں سے کوئی پھل دیئے جائینگے
مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ	کہیں گے کہ یہ وہی ہے جو اس سے پہلے ہمکو دیا
وَلَهُمْ فِيْهَا اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ	گیا تھا اور وہ ان کو ایک دوسرے
وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ	کے مشابہ دیا جائے گا۔ اور ان باغوں میں انکی

لَا يَسْتَحْيِ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ط (البقرہ ۲-۳)

صاف ستھری بیویاں ہونگی اور ان باغوں میں رہا کرینگے بے شبہ خدا اس سے شرمندہ نہیں کہ وہ ایک مچھر کی یا اس سے بھی کم رتبہ چیز کی مثال بیان کرے

اُن آیتوں کے سباق و سیاق اور نظم و ترتیب پر لحاظ کرکے میرے ذہن میں یہی معنی آتے ہیں' کہ ان میں دنیاوی الفاظ اور اُن کے اُخروی مفہوم کے درمیان تشابہ کا بیان ہے ورنہ حقیقت کے رو سے ان الفاظ کے دنیاوی لغوی معانی اور اُخروی معنوں میں وہی نسبت ہے، جو مچھر اور کسی عظیم الجثہ شے کے درمیان ہوسکتی ہے، یہی سبب ہے کہ جنت کی لذتوں اور نعمتوں کی نسبت قرآن نے یہ بھی کہا ہے،

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ج جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ، (سجدہ ۲-۳)

تو کسی نفس کو معلوم نہیں کہ ان کیلئے ان کے (اچھے) اعمال کے بدلہ میں آنکھوں کی جو ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے،

اس "آنکھوں کی ٹھنڈک" یعنی لذت و راحت کی کیفیت دنیاوی تخیل سے چونکہ بہت بلند ہے اس لئے فرمایا گیا کہ جنت کی راحت و لذت کی حقیقت علم و فہم سے پوشیدہ اور مخفی ہے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسی مفہوم کو اپنے ان مبارک الفاظ سے واضح فرمادیا ہے،

قَالَ اللّٰهُ اَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصّٰلِحِيْنَ مَا لَا عَيْنٌ رَاَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبٍ

خدا فرماتا ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ مہیا کیا ہے جسکو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے

بشر[1] — دل میں اس کا خیال آیا،

اگر جنت کے باغوں، نہروں، میووں، غلاموں، شرابوں، ریشمی کپڑوں، اور طلائی زیوروں کی وہی اخروی حقیقت ہے جو ان لفظوں سے لغوی طور پر ہم اس دنیا میں سمجھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بہشت کی لذتوں اور مسرتوں کو ایک "مخفی حقیقت" نہ فرماتا، اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی توضیح میں اس درجہ بلندی کرتے کہ وہ ایسی چیزیں ہیں جنکو آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سنا، اور نہ وہ کسی انسان کے خیال میں گذریں، مزید تاکید روایت کے دوسرے الفاظ میں ہے۔

بلہ ما اطلعتم علیہ[1] (صحیح بخاری تفسیر سورہ سجدہ) — جو تم جانتے ہو اس کو چھوڑ دو،

صحیح مسلم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: بلہ ما اطلعکم اللہ علیہ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ بلہ "خدا نے تم کو اس پر مطلع بھی نہیں کیا ہے"۔ دوسرے یہ کہ "خدا نے اس کا جو حال بتایا ہے، اس سے بھی درگذر کرو"۔

غرض ان لفظوں سے جو بھی تم سمجھ سکتے ہو، اس کو چھوڑ کر آگے بڑھو، اصحاب تفسیر نے حضرت ابن عباسؓ سے بسند نقل کیا ہے:

وقال السفیان الثوری عن الاعمش عن ابی ظبیان عن ابن عباس الا یشبہ شئ مما فی الجنۃ ما فی الدنیا الا فی الاسماء

سفیان ثوری، اعمش سے اور وہ ظبیان سے اور وہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جنت میں جو کچھ ہے وہ دنیا کی چیزوں سے ناموں کے سوا اور کسی بات میں مشابہ نہیں۔

---

[1] صحیح بخاری، باب کلام الرب و تفسیر سورہ سجدہ، صحیح مسلم کتاب الجنۃ۔ و ترمذی تفسیر سجدہ [2] صحیح مسلم کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمہا۔

دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں :

لیس فی الدنیا مما فی الجنۃ الا الاسماء[1] — جنت میں جو کچھ ہے، وہ ناموں کے سوا دنیا میں نہیں،

غرض ان الفاظ سے ان ہی دنیاوی مشاہدات کی چیزوں کو سمجھنا ضروری نہیں، بلکہ ان سے بدرجہا بلند لذائذ اور مسرتیں مراد ہیں، جن کی تعبیر کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ کسی وجہ مناسب کے سبب سے ان کو ان دنیاوی لفظوں سے ادا کیا جائے اور اس پر بھی مفہوم ادا نہ ہو سکے۔ اسمیں اشکال نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کی عدم قدرت کلام کے سبب سے نہیں ہے، بلکہ عاجز انسانوں کی ذہنی درماندگی کے سبب سے ہے کہ نادیدہ و ناشنیدہ اور در دل ناخلیدہ مفاہیم کے لیے انکی زبان و لغت میں کوئی لفظ ہی نہیں،

جنت کی مسرتیں اعمال کی تمثیل ہیں

یہ اصول بارہا بیان میں آچکا ہے کہ دوزخ کی تکلیفیں ہوں یا جنت کی مسرتیں دونوں اعمال انسانی کی تمثیلیں ہیں اسی لیے قرآن پاک نے بتصریح تمام یہ کہا ہے

اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (طور) — وہی بدلہ پاؤ گے جو تم کرتے تھے،

حدیث میں آتا ہے کہ قیامت میں خدا فرمائے گا "اے میرے بندو، یہ تمھارے ہی عمل ہیں جو تم کو واپس مل رہے ہیں، تو جو نیکی پائے وہ خدا کا شکر ادا کرے اور جو برائی پائے وہ اپنے آپ کو ملامت کرے،

مثلاً وہ نیکوکار جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے خوف سے ہمیشہ ترساں و لرزاں رہتے تھے، ان کو جنت

[1] تفسیر ابن جریر طبری آیت مذکورہ و بیہقی فی البعث کما فی الدر المنثور للسیوطی، تفسیر آیت مذکورہ،

میں امن وسلامتی کے ساتھ وہاں کی تمام راحتیں ملیں گی تو

قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ	کہیں گے ہم اس سے اپنے پہلے گھر والوں میں ڈرتے
فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ	تھے، تو خدا نے ہم پر مہربانی فرمائی، اور ہم کو
(طور - ۱)	دوزخ کی لو کے عذاب سے بچا لیا،

اس آیت سے صاف نمایاں ہے کہ جو لوگ دنیا میں خدا کے قہر وغضب سے ڈرتے تھے، وہ قیامت میں گرم لو (سموم) کے عذاب سے بچائے جائیں گے، قہر وغضب کی تمثیل شعلہ، آتش، لو وغیرہ گرم چیزوں سے ہے، تو جو لوگ دنیا میں خدا کے قہر وغضب سے ترساں تھے، دیکھو کہ قیامت میں انکو سموم یا گرم ہوا کی لو سے بچائے جانے کی بشارت ملی،

دولتمندی وقوی دست منکرین، غریب مسلمانوں کو دیکھکر دنیا میں ان پر تحقیرانہ ہنستے تھے، قیامت میں اس کا الٹا ہوگا کہ یہ ان پر ہنسیں گے، فرمایا،

اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ	بیشک گنہگار، ایمان والوں پر ہنستے تھے،
اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ	.....
فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ	..... تو آج ایمان والے
يَضْحَكُوْنَ (تطفیف)	کافروں پر ہنسیں گے۔

نکوکاروں کے دنیا کے آنسو یہاں تبسم اور خندۂ مسرت میں بدل گئے اور گنہگاروں کی وہاں کی ہنسی یہاں آنسوؤں کا تار بنکر ظاہر ہوئی،

گنہگار جو دنیا میں اپنی دولت وقوت کے نشہ میں چور اور اپنے اہل وعیال کیساتھ خوش

اور مسرور رہتے تھے، وہ یہاں غمگین ہونگے، اور جو وہاں غمگین تھے، وہ یہاں خوش اور مسرور ہونگے،

فَسَوْفَ يَدْعُوا ثُبُورًا وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا	تو وہ موت کو پکاریگا، اور وہ دوزخ
اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا	میں داخل ہوگا، کیونکہ وہ اپنے اہل وعیال
(انشقاق - ۱)	میں (مغرورانہ) خوش تھا،

اور جنکو کہ وہاں اہل وعیال میں بیٹھ کر بھی مسرت سے نا آشنا تھا، اسکا یہ حال ہوگا کہ

فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا	تو اس سے آسان حساب لیا جائیگا اور وہ
وَّيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا (انشقاق)	خوش خوش اپنے لوگوں کے پاس لوٹیگا۔

قرآن پاک میں بارہا یہ آیتیں یا بعینہٖ ان ہی معنوں کی آیتیں آئی ہیں

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے
اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا	ان کو باغوں کی خوشخبری سنا جن کے
الْاَنْهٰرُ (بقرہ ۳-۴)	نیچے نہریں بہتی ہیں،

ان آیتوں میں ایمان اور عملِ صالح کے بالمقابل باغ اور اسکی نہروں کا ذکر پابندی کے ساتھ آتا ہے، اس سے ادھر خیال جاتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی خاص تمثیلی تعلق ہے، یہ ظاہر ہے کہ درخت اصلی چیزیں ہیں. جنکی ترقی اور نشو ونما پانی سے ہوتی ہے، بعینہٖ اسی طرح ایمان اصل ہے جس کی جڑوں کی سیرابی اعمال صالحہ کی آبیاری سے ہوتی ہے، اگر ایمان ہو اور اعمال صالحہ نہ ہوں تو وہ ایک ایسا درخت ہوگا جس کی ترقی اور نشو ونما کی امید نہیں، اور اگر صرف عملِ صالح ہے اور ایمان نہیں تو ریگ میں پانی کی روانی ہے جس کا وجود و عدم یکساں ہے، اس تمثیل کے ذہن

میں آنے کے ساتھ قرآن پاک کی یہ آیت سامنے آتی ہے،

وَاُدْخِلَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا	اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے وہ ان
الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا	باغوں میں داخل کیے گئے جنکے نیچے نہریں
الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ	بہتی ہیں اور وہ اپنے پروردگار کے حکم سے
تَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌ، اَلَمْ تَرَ کَیْفَ	ان میں سدا رہیں گے، وہاں سلامتی کی
ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا کَلِمَةً طَیِّبَةً	مبارکباد ہے، تو کیا تو نے نہیں دیکھا کہ خدا نے
کَشَجَرَةٍ طَیِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ	کیسی ایک مثال بیان کی، نیک بات
فَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ تُؤْتِیْ اُکُلَهَا	ایک ستھرے درخت کی طرح ہے جسکی جڑ مضبوط
کُلَّ حِیْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا، وَیَضْرِبُ	ہے اور ٹہنی آسمان میں ہے، اپنے پروردگار کے
اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ	حکم سے وہ ہمہ وقت پھل لایا کرتا ہے، اور خدا
یَتَذَکَّرُوْنَ (ابراھیم - ۴)	مثالیں بیان کرتا ہے کہ لوگ شاید سوچیں،

اس آیت میں جنت اور کلمۂ طیبہ کے درخت کی پوری تمثیل ہے، یہانتک تقابل ہے کہ پہلے میں جب یہ کہا گیا کہ "اپنے پروردگار کے حکم سے وہ ان باغوں میں سدا رہیں گے" تو دوسرے میں ہے کہ وہ درخت "اپنے پروردگار کے حکم سے سدا پھل دیتا رہے گا"[1] کلمۂ طیبہ سے یہاں مراد ایمان ہے، جس کی جڑ مضبوط و مستحکم اور اس کی شاخیں آسمان میں اور اسکے پھل سدا پھلنے والے ہیں،

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عثمانؓ بن مظعون صحابی کی وفات کے بعد انکی ایک ہمسایہ

[1] تفسیر ابن جریر طبری، تفسیر آیت مذکورہ،

صحابیہؓ نے خواب میں دیکھا کہ ایک نہر بہ رہی ہے، اور جب یہ معلوم ہوا کہ یہ حضرت عثمانؓ بن مظعون کی ہے، انھوں نے آکر یہ خواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا، آپ نے اسکی تعبیر میں فرمایا ذالک عملہ یجری لہ، یعنی "یہ نہر انکا عمل ہے جو ان کے لیے بہ رہی ہے"، (بخاری کتاب التعبیر)

ان دونوں سابقہ حوالوں سے یہ ہویدا ہوتا ہے کہ ایمان کی تمثیل سدا بہار درخت سے اور عمل کی تمثیل نہر رواں سے ہے، اس بنا پر اہل جنت کے لیے بار بار حسن باغ اور نہر جاری کی بشارت دی گئی ہے، وہ حقیقت میں ان کے ایمان اور عمل صالح کی تمثیلی شکلیں ہونگی، انکا ایمان خوشنما اور سدا بہار باغ اور انکے اعمالِ صالحہ صاف و شفاف نہر کی صورت میں نمایاں ہونگے، اور وہ ان سے لطف و لذت اٹھائیں گے۔

اسی قیاس پر جنت کی دوسری لذتوں اور مسرتوں کی حقیقت کی تشریح کیجا سکتی ہے، علوم نبوی کے ایک بڑے واقفکار اور اسرار شریعت کے ایک بڑے دانائے راز شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں:

واکثر الوقائع الحشریۃ من ھذا	حشر کے واقعات اسی قبیل تمثیل ہیں
القبیل	حاصل یہ
وبالجملۃ فتشبحات وتمثلات	کہ یہ تمام امور معانی کا جسمانی قالبوں میں
لما عندھا .. .. .. وتشبح	اور مثالی صورتوں میں ظاہر ہونا ہے ..
النعمۃ بمطعم ھنیئ ومشرب	.. .. اللہ تعالیٰ کی عنایت
مرئ ومنکح شھی وملبس رضی	و مہربانی خوش مزہ کھانے خوشگوار پینے

ومسکن بھیٍ — کی چیزوں، رغبت انگیز لذت نکاح، دلپسند لباس

(ص ۳۶ - ھند) — اور عمدہ مسکن کی صورتوں میں نمایاں ہونگی

ہم نے آیات و احادیث کے حوالوں سے پہلے کئی دفعہ یہ دکھایا کہ اس تمثیل و تشبیہ کے کیا معنی ہیں، اور کیونکر غیر مجسم معانی، اپنے مناسب قالبوں میں مجسم ہوکر وجود پذیر ہوتے ہیں، دنیا کے تمام اعمال صالحہ کی اگر تحلیل کیجائے تو ان کی اولاً دو قسمیں نکلیں گی، اور خدا پر ایمان اور خلوص دل سے اسکی اطاعت جس کو "حقوق اللہ" کہتے ہیں، اور دوسری بندگان الٰہی کے ساتھ حسن سلوک بندگان الٰہی کے ساتھ جو نیک سلوک کیا جاسکتا ہے وہ یہی ہے کہ انکی عزت و آبرو کا پاس کیا جائے جس کو عفت و عصمت کہتے ہیں، اور ان کی ضروریات زندگی کے مہیا کرنے میں امداد کیجائے اور ضروریات زندگی یہی کھانا، پینا، پہننا اور رہنا ہیں۔ ان ہی کی نسبت ہم ان کے ساتھ حسن سلوک کرسکتے ہیں، اب یہ پانچ قسمیں ہوئیں، جنت کی نعمتیں ان ہی پانچ قسموں میں منحصر ہیں، ایمان و اخلاص و طاعت کی جزا تو خود اللہ تبارک تعالیٰ ہے وہ اپنے قرب اور اپنے دیدار سے نوازیگا، عفت و عصمت کی جزا حسین و مہ جبین بیویوں کی صورت میں نمایاں ہوگی، دوسروں کے کھلانے کی جزا جنت کے باغ اور پھل اور قسم قسم کے الوانِ طعام ہیں، دوسروں کو پلانے کی جزا خوش مزہ و خوشگوار پینے کی مختلف چیزوں کی فراوانی ہے۔ پہنانے کی جزا ریشم و حریر و دیبا و اطلس اور بہتر سے بہتر خوشنما لباس ہے اور رہنے اور بسانے میں حسنِ سلوک کی جزاء خوش منظر مکان و قیامگاہ ہے۔

ایک اور پہلو سے دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی بہشت کی صفت یہ بیان فرمائی ہے،

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا — بے شک تیرے لیے اس بہشت میں نہ

تَعْرٰی وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰی ، (طٰہٰ - ۷)

بھوکا ہونا، نہ ننگا ہونا، اور نہ پیاسا ہونا

نہ دھوپ میں رہنا،

یہی چار مختصر انسانی ضرورتیں ہیں جو پھیل کر ایک دنیا ہوگئی ہیں، جب آدم کی اولاد کو اپنے اعمالِ صالحہ کی بدولت نجات ملے گی تو پھر ان کے لیے وہی بہشت ہے جس میں نہ بھوکا ہونا ہے، نہ پیاسا ہونا، نہ ننگا ہونا، نہ گرمی اور نہ دھوپ کی تکلیف میں گرفتار ہونا۔ اس حقیقت کی تعبیر دو طرح سے کیجا سکتی ہے، یا تو یہ کہ بہشت میں اہل بہشت کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ ان تمام انسانی ضرورتوں سے یکسر پاک و بے نیاز ہو جاتے ہیں، اس لیے وہاں نہ کوئی بھوکا ہوگا نہ پیاسا، نہ ننگا ہوگا اور نہ دھوپ اور لو کی محنت میں گرفتار، دوسرے یہ کہ بہشت میں اہل بہشت کو کھانے کیلیے ایسے الوان نعمت ملیں گے جن کو کھا کر انسان پھر بھوکا نہ ہوگا، اور پینے کے لیے شراب و شربت کی وہ نہریں بہیں گی جن کو پی کر پھر پیاسا نہ ہوگا، اور پہننے کو وہ کپڑے ملیں گے جو پھر نہ میلے ہونگے اور نہ بوسیدہ ہو کر پھٹیں گے، اور رہنے کے لیے ایسے گھنے باغ اور بلند مکانات ملیں گے جہاں دھوپ کا گذر نہ ہوگا۔

یہ اصول پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ دنیا میں انسان کیلیے جو لطف و لذت ہے وہ تھوڑی سی تکلیف کا نتیجہ ہے، انسانی اصول یہ ہے کہ بڑی لذت کے حصول کے لیے تھوڑی تکلیف گوارا کرتا ہے، اور بڑی مسرت پر چھوٹی چھوٹی مسرتوں کو قربان کرتا ہے، اسی اصول پر اسکے تمام اعمال کی کامیابی و ناکامیابی کی بنا ہے، اعمال صالحہ کے بجالانے میں انسان کو اس دنیا میں چھوٹی چھوٹی تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں، اور اپنی عارضی خوشیوں اور

لذتون کو ان پر قربان کرنا ہوتا ہے، صبح کے نمازی کو خواب سحر کی لذت کو خیرباد کہنا، اور دوپہر کی جلتی دھوپ میں ظہر کے لیے مسجد جانا پڑتا ہے، خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھلانا پڑتا ہے، اور اپنی بہت سی ناجائز مگر بظاہر دلچسپ خوشیوں کا ایثار کرنا پڑتا ہے، اس طرح پاکیزہ زندگی گذارنے پر اس کو آخرت کی غیر فانی دولت اور ابدی سعادت میسر آتی ہے،

انسان کو دنیا میں ان اعمالِ صالحہ کی خاطر جن چیزوں کو قربان کرنا پڑتا ہے، اُن میں پہلی چیز تو خود اُس کی زندگی ہے، پھر انسانی زندگی کی وہ چار تسمین ہیں جنکا نام کھانا، پینا، پہننا اور رہنا ہے، اس لیے آخرت میں ان قربانیوں کی جزا میں ان ہی کے مناسب و مماثل جو چیزیں ملیں گی وہ غیر فانی زندگی، الوانِ طعام، اقسامِ شراب و شربت، انواعِ لباس اور بہترین مسکن ہیں، قرآن پاک میں ہے

فَاَمَّا مَنْ طَغٰی ۙ وَاٰثَرَ الْحَیٰوۃَ	پس جس نے خدا سے سرکشی کی اور دنیا دی
الدُّنْیَا ۙ فَاِنَّ الْجَحِیْمَ ھِیَ الْمَاْوٰی ؕ	زندگی (کے ناجائز لطف و آرام) کو ترجیح دی
وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ	تو دوزخ اس کا ٹھکانا ہے، لیکن جو خدا
وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی ۙ فَاِنَّ	کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور
الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی ؕ	اپنے نفس کو ناجائز خواہشوں سے
(النازعات-۲)	روکا تو اس کا ٹھکانا بہشت ہے،

گو اُس کی جزئی نیکیوں کی جزا تو وقتاً فوقتاً اس دنیا میں تھوڑی تھوڑی کرکے شہرت، تعریف، ہر دلعزیزی اور دولت کی صورت میں ملتی رہتی ہے، مگر پوری زندگی کی مجموعی جزا دوسری زندگی ہی میں اسکو ملے گی،

وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (آل عمران-۱۹)

اور تمہاری مزدوری قیامت دن پوری ادا کیجائے گی،

لطف و مسرت کا تصور

مسرت ایک نفسی کیفیت کا نام ہے جو انسان کو اپنی کسی خواہش کے پورے ہوتے وقت حاصل ہوتی ہے، اس بنا پر مسرت کے وجود کے لیے کسی خواہش کی تکمیل ضروری ہے، اب انسانی خواہشوں کی تحلیل کرو، تو بالآخر انکی انتہا ان ہی باتوں پر ہوگی، جنکی طلب اسکی فطرت کے اندر ودیعت کردی گئی ہے، اب غور کرو کہ وہ کیا چیزیں ہیں، یا کیا چیزیں اس کے فہم میں آسکتی ہیں، وہ یہی ہیں، باغ و بہار، لباس و طعام، حور و قصور، خدم و حشم، سامان و اسباب اور سیم و زر و جواہر مسرت اور راحت کا جب کبھی تخیل آئیگا، اور جب کبھی ہم اُن کو سمجھنا چاہیں گے اور کہنا چاہیں گے تو ہم کو ان ہی چیزوں کا نقشہ کھینچنا پڑے گا، اور ہماری انسانی فطرت ان ہی مسرتوں اور خوشیوں کو ڈھونڈھنے کی عادی ہے، اور ان ہی کے حصول کی خاطر دنیا میں ہر طرح کی سیہ کاری اور گنہگاری کی مرتکب ہوتی ہے، اس لیے اُن سے احتراز کرنے پر جو چیزیں ہم کو وہاں ملیں گی وہ ہمارے ان ہی عادی و مانوس اسباب مسرت کی صورتوں میں ہمارے سامنے پیش ہونگی اور ہم ان سے لطف اندوز ہوں گے،

لطف و مسرت کا اعلیٰ ترین تخیل

اس دنیائے کون و فساد میں ہم ایک عجیب قسم کی مصیبت میں مبتلا ہیں، ہم کو تخیل کے لحاظ سے اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کی وسیع اور غیر محدود دنیا بخشی گئی ہے لیکن عملاً اپنی اپنی خواہشوں اور تمناؤں کے مطابق اپنی دنیا بنا لینے پر قدرت نہیں، نتیجہ یہ ہے کہ اگر ہم نے صبر و شکر کا دامن نہیں پکڑا ہے، تو ہم سے زیادہ اس دنیا میں تصور و تخیل کی

تکلیف میں کوئی اور گرفتار نہیں جنت آخرت کی اُس دنیا کا نام ہے جو ہمارے اعلیٰ ترین تخیل اور ہماری تمناؤں اور آرزوؤں کے مطابق ہوگی،

جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِیْهَا مَا یَشَآءُوْنَ ؕ كَذٰلِكَ یَجْزِی اللّٰهُ الْمُتَّقِیْنَ ۙ (نحل-۴)

رہنے کے باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں، ان کیلئے ان باغوں میں وہ ہے جو وہ چاہیں، اللہ اسی طرح پرہیزگاروں کو بدلہ دے گا،

وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْۤ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَدَّعُوْنَ (حٰمٓ السجدۃ-۴)

اور تمہارے لیے جنت میں وہ ہے جو تمہارا دل چاہیں، اور تمہارے لیے اسمیں وہ ہے جو تم مانگو۔

لَهُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ فِیْهَا وَلَدَیْنَا مَزِیْدٌ (ق-۸)

اُن کے لیے جنت میں وہ ہے جو وہ چاہیں، اور ہمارے پاس اُس سے بھی بڑھ کر ہے،

وَفِیْهَا مَا تَشْتَهِیْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْیُنُ ، (زخرف-۷)

اور جنت میں وہ ہے جس کی دل خواہش کریں، اور جو آنکھوں کو لذت دے،

لَهُمْ فِیْهَا مَا یَشَآءُوْنَ خٰلِدِیْنَ كَانَ عَلٰی رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا (فرقان-۲)

اُن کے لیے جنت میں وہ ہے جو وہ چاہیں گے یہ وعدہ ہے تیرے رب کے ذمہ

لَهُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ (زمر-۴)

اُن کے پروردگار کے پاس انکے لیے وہ ہے، جو وہ چاہیں گے،

الغرض جنت وہ مقام ہے، جہاں ہم کو وہ کچھ ملیگا، جہانتک ہمارا مرغِ خیال اڑکر پہنچ سکتا ہے

لطف و مسرت کا وہ بلند سے بلند معیار جو تصور میں آسکتا ہے، وہاں ہمارے لیے مہیا ہوگا، جنت میں ہر قسم کے لوگ تھے جنت کے سامانِ مسرت کے متعلق وہ اپنی اپنی پسند اور آرزو کے مطابق آپ سے پوچھتے رہتے تھے، اور آپ جواب دیتے تھے، حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں جو سب سے کم رتبہ ہوگا اُس کی کیفیت بھی یہ ہوگی کہ خدائے تعالیٰ اُس سے فرمائیگا کہ تو اپنی انتہائی آرزو دل میں خیال کر، وہ کریگا تو خدا فرمائیگا کہ تجھ کو وہ سب دیا گیا، جس کی تو نے آرزو کی تھی، اور اس کے برابر اور[1]، یہانتک کہ بازار کا شوق ہوگا تو بازار بھی لگیگا، لیکن وہ حقیقی خرید و فروخت نہ ہوگی، کہ وہاں کمی کس چیز کی ہوگی، بلکہ وہ مثالی صورتوں میں ہوگی، (الا الصور من الرجال[2])

کسی کو جنت میں کھیتی کا شوق ہوگا تو دانہ، سبزہ، غلہ اور پھر تیاری، یہ سب کام منٹوں میں انجام[3] پاجائیگا، ایک بدوی نے پوچھا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) وہاں گھوڑے بھی ہونگے، فرمایا کہ اگر تم کو جنت ملی تو اگر تم یہ بھی چاہوگے کہ سرخ یاقوت کا گھوڑا ہو جو تم کو جہاں چاہو بہشت میں لیے پھرے تو وہ بھی ہوگا، دوسرے نے پوچھا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اونٹ بھی ہوگا، فرمایا اگر تم جنت میں گئے[4] تو تمہارے لیے وہ سب کچھ ہوگا جو تمہارا دل چاہے گا اور تمہاری آنکھیں[5] پسند کرینگی،

جنت میں اہل جنت کے مختلف رتبے ہوں گے، اس لیے اعلیٰ کے لباس و سامان کو دیکھکر ادنی کو اپنی کمی کا خیال ہوگا، تو اس کے تصور میں یہ پیدا کر دیا جائیگا (حتی تخیل الیہ) کہ خود اس کا لباس و سامان اس سے بہتر ہے اور یہ اس لیے ہوگا کہ جنت میں کسی کو غم ہونا ممکن[6] نہیں

---

[1] صحیح مسلم [2] ترمذی، دیکھو مشکوٰۃ صفۃ الجنۃ [3] صحیح بخاری [4] ترمذی [5] ترمذی، یہ کل حدیثیں مشکوٰۃ صفۃ الجنۃ سے لی گئی ہیں،

جنت جہان کوئی جسمانی و روحانی آزار نہیں

کسی صاحبِ دل نے جنّت کی یہ تعریف خوب کی ہے، ع

بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد

دنیا میں کوئی بڑی سے بڑی مسرور زندگی بھی ایسی نہیں مل سکتی جس کے پہلو میں مسرت کے پھول کے ساتھ غم کا کوئی کانٹا نہ چبھ رہا ہو، یا تو موجودہ مسرت کے آیندہ ختم ہو جانے کا خوف ہے اور یا گذشتہ ناکامی کا افسوس ہے، اس بنا پر یہاں کی کوئی خوشی بھی کامل نہیں، مگر جنت وہ مقام ہوگا جہاں نہ ماضی و حال کا غم ہوگا، اور نہ مستقبل کا خوف ہوگا، چنانچہ اہلِ جنت کے متعلق بار بار ارشاد ہوا،

لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ — نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ غمگین ہوں گے،

اور یہی بہشت کی سب سے بڑی نعمت ہوگی، اس میں جسمانی و روحانی ہر قسم کی نعمتیں داخل ہیں۔

دنیا میں کوئی انسان اُس وقت تک کوئی لقمہ گلے سے نہیں اتار سکتا، اور نہ کوئی چھٹرا بدن پر رکھ سکتا ہے، جب تک اُس کے سر کا پسینہ پانوں تک نہ آئے، دنیا کی تمام فانی مسرتیں ہماری فانی کوششوں کا فانی نتیجہ ہیں، مگر جنت کی خوشیاں بے غم و تکلیف ہماری گذشتہ فانی نیکیوں کا غیر فانی نتیجہ ہیں، اور یہ محض اللہ تعالیٰ کا رحم و کرم ہے کہ وہاں ہم کو ہماری آسائش کا تمام سامان کسی قسم کی ادنیٰ زحمت و مشقت اٹھائے بغیر میسر آئیگا، جس کے بغیر دنیا میں کوئی انسان زندہ ہی نہیں رہ سکتا، اور جس کی کشمکش سے یہ دنیا ہر انسان کے لیے دوزخ بنی ہے، چنانچہ اہل جنت جنت میں داخل ہوکر اور شاہانہ تزک و احتشام اور لباس و زیور سے آراستہ ہوکر خدا کی حمد و تعریف کا ترانہ ان لفظوں میں گائیں گے،

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا — رہنے کے باغ جن میں وہ داخل ہونگے،

يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ	اُن میں وہ سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے
وَّلُؤْلُؤًا ج وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ	اور ان کی پوشاک ان میں ریشم ہو گی
وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَذْهَبَ	اور وہ کہیں گے پاک ہے وہ جس نے
عَنَّا الْحَزَنَ ط إِنَّ رَبَّنَا لَغَفُورٌ شَكُورٌ	ہم سے غم دور کر دیا، بیشک ہمارا پروردگار
نِ الَّذِيْ أَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ	گناہوں کا معاف کرنیوالا ہے، اور نیکیوں
مِنْ فَضْلِهِ ج لَا يَمَسُّنَا فِيهَا نَصَبٌ	کی قدر کرنے والا ہے، وہ جس نے ہم کو اپنی
وَلَا يَمَسُّنَا فِيهَا لُغُوبٌ،	مہربانی سے رہنے کے گھر میں اتارا اور ہمکو
(فاطر-۴)	وہاں نہ مشقت پہنچی اور نہ اسمیں ہم کو تھکنا ہے
لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ	اُن میں اُن کو کوئی آزار نہ ہوگا، اور نہ وہاں سے
مِنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ (حجر-۴)	نکالے جائیں گے،

جنت جہان رشک وحسد نہیں | موجودہ دنیا خیر وشر کے متضاد عناصر سے بنی ہے، یہاں ثواب کیساتھ گناہ، رحم کے ساتھ سنگدلی، محبت کیساتھ کینہ ہے، یہ گناہ وکینہ اور بغض وحسد، وہ آگ ہے جس نے یہاں کے قلبی امن وامان کے خرمن میں آگ لگا رکھی ہے، ہر شخص یہاں دوسروں کی اچھی حالت کو دیکھ کر جلتا ہے، اور دوسروں پر غصہ کے جوش وخروش سے ابلتا ہے، جنت وہ عالم ہے جہاں اس آگ اور سیلاب کا وجود نہ ہوگا، ہر قسم کے گناہ، سنگدلی، عداوت، اور بغض وحسد کا خاتمہ ہوگا، اور خالص محبت والفت کے دریا موجزن ہوں گے، فرمایا،

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيهَا لَغْوًا إِلَّا سَلٰمًا (مریم-۴)	اسمیں امن وسلامتی کے سوا کوئی بیہودہ بات نہیں سنیں گے،

وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ (اعراف-۵)

اور ہم نے ان کے سینوں سے کینہ کو کھینچ لیا، ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ (حجر-۴)

اور ہم نے انکے سینوں سے کینہ کو کھینچ لیا، بھائی بھائی بنکر تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہونگے،

اسی کی تفسیر میں حدیثِ صحیح میں ہے کہ آپنے فرمایا کہ "وہاں نہ دلوں کا اختلاف ہوگا، نہ باہم بغض اور کینہ، سب کے دل ایک دل کی طرح متحد ہونگے"[1]

وہاں کی جسمانی زندگی کیسی ہوگی بہشت میں زندگی کی جو لذتیں ہونگی، اُن کی تعبیر الوانِ نعمت اور انواعِ شربت و شراب، اور دوسرے مادی لذائذ سے ہوسکتی ہے، مگر وہ حظ و مسرت اور اطمینان و سکینت کے علاوہ کسی معنی میں بھی مادی خصوصیات سے آلودہ نہ ہونگی یہاں ہر کھانے پینے کے ساتھ بول و براز لیسنہ اور سوءِ ہضم کی علت لگی ہوئی ہے، اور بغیر اس کے انسان یہاں زندہ نہیں رہ سکتا، مگر وہاں یہ کچھ نہ ہوگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہلِ جنت کھائیں گے اور پئیں گے لیکن نہ تھوکیں گے، نہ وہاں بول و براز کی حاجت ہوگی، نہ وہاں ناک سے رطوبت نکلے گی، نہ بلغم اور کھکھار جیسی گھنونی چیزیں ہونگی، کھانا ایک ڈکار میں ہضم ہوگا وہاں کے پسینہ میں مشک کی خوشبو ہوگی، جو بہشت میں داخل ہوگا، اُس کو وہ نعمت ملیگی کہ پھر کبھی تکلیف نہ ہوگی، نہ انکے کپڑے بوسیدہ ہونگے، اور نہ انکی جوانی زائل ہوگی، وہاں منادی غیب یہ پکار کر کہدیگا، یہاں وہ تندرستی ہے کہ بیمار نہ پڑوگے، وہ زندگی ہے کہ پھر موت نہ آئے گی، وہ جوانی ہے کہ پھر بوڑھے نہ ہوگے، اور وہ

[1] صحیح مسلم صفۃ الجنۃ،

آرام ہے کہ پھر تکلیف نہ پاؤ گے لوگوں کے چہرے اپنے اپنے اعمال کے مطابق چمکیں گے کوئی ستارہ کی طرح کوئی چودھویں کے چاند کی طرح[1]!

غور کرو کہ وہ جسمانی زندگی ہماری موجودہ جسمانی زندگی سے کتنی مختلف ہوگی، اس پر تعجب نہ کرنا چاہیئے، انسان کبھی شکم مادر میں ایک بچہ کی صورت میں زندہ تھا، مگر وہاں اس کی زندگی اسکی غذا، اسکے فضلۂ غذا اس کی سانس اور دوسرے لوازمِ حیات، بیرونِ شکم کے دنیاوی اصول حیات و قوانینِ زندگی سے بالکل مختلف تھے، اور جس طرح شکم مادر میں بچہ کا اس بیرونی زندگی کے حکایات کو تعجب کے ساتھ سنکر آمادۂ انکار ہونا دانشمندی نہ ہوگی، ایسے ہی اس مادی زندگی کے خوگر، اور اس عالم آب و گل کے باشندے اس دوسری زندگی کے اصولِ حیات، طرز غذا، اور دوسرے لوازمِ حیات کو سنکر آمادۂ انکار ہوں تو ان کا یہ فعل بھی دانشمندی کے خلاف ہوگا۔

جنت لقائے روحانی ہے، اور

مادی و جسمانی خلقت و فطرت کی لاکھوں برس کی تاریخ کے مطالعہ و تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی ہے کہ مادہ نے لاکھوں برس کے تغیرات کے بعد اس انسانی جسمانیت تک ترقی کی ہے، وہ پہلے جماد بنا، پھر نبات کی شکل میں آیا، پھر حیوان کا قالب اختیار کیا، پھر جسم انسانی کی صورت میں نمودار ہوا، اور یہ مادیت کی معراجِ ترقی ہے، جمادیت مٹکر نباتیت پیدا ہوئی، اور نباتیت فنا ہوکر حیوانیت نمودار ہوئی، پھر حیوانیت معدوم ہوکر انسانیت ظہور پذیر ہوئی، اور ارتقائے انسانی کا جسمانی پہلو تکمیل کو پہنچ گیا، لیکن انسانیت کا دوسرا رخ جو روحانیت ہے عبارت ہے ہنوز اپنے آغازِ طفولیت میں ہے کیا اس پر بھی اسی ارتقائی دور کے مدارج نہیں آئیں گے،

---

[1] یہ ساری حدیثیں صحیح مسلم صفۃ الجنۃ میں ہیں،

ایک مادہ پرست صرف بام ارتقا تک زینہ بزینہ چڑھکر ٹھہر جاتا ہے لیکن مذہب اس سے بھی آگے لے چلتا ہے، اور یہاں سے وہ اڑکر سقفِ آسمان تک پہنچتا ہے، اور ملکوتیت کی سرحد کی ترقی شروع کرتا ہے، قرآن پاک کی ان آیتوں پر غور کرنے سے اس نظریہ کے اشارات نکلتے ہیں،

اَلَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ط ھُمْ	جو فردوس کی وراثت پائیں گے، اور وہ اسمیں سدا
فِیْھَا خٰلِدُوْنَ ۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا	رہیں گے، اور ہم (خدا) نے انسان کو مٹی کی کشید
الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَۃٍ مِّنْ طِیْنٍ ج	سے بنایا، پھر اسکو (رحم نسوانی کے) ایک ٹھہراؤ
ثُمَّ جَعَلْنٰہُ نُطْفَۃً فِیْ قَرَارٍ مَّکِیْنٍ ص	کی جگہ میں ایک بوند بنایا، پھر اس بوند کو سنبھالا ہوا
ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَۃَ عَلَقَۃً فَخَلَقْنَا	خون بنایا، پھر اس خون کو لوتھڑا بنایا پھر اس
الْعَلَقَۃَ مُضْغَۃً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَۃَ	لوتھڑے کو ہڈیاں بنایا، پھر ہڈیوں کو گوشت
عِظٰمًا فَکَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ	پہنایا، پھر اس کو ایک نئی صورت میں اٹھا
اَنْشَاْنٰہُ خَلْقًا اٰخَرَ ط فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ	کر کھڑا کیا، تو برکت والا ہے سب سے
اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ ۔ (مومنون-۱)	بہتر بنانے والا (خدا)

لیکن یہ ترقی یہیں تک پہنچکر رک نہیں جائیگی، بلکہ آگے بھی ہوگی، اسلیے جسطرح ماں کے پیٹ کی تنگ و تاریک دنیا میں زیست و حیات کے کچھ قواعد تھے، پھر عالم کی اس سے بھی وسیع تر دنیا میں اس نے قدم رکھا، جہاں ترقی و حیات کے دوسرے ہی اصول ہیں، اسی طرح اس دنیائے مادی سے نکل کر اس وسیع تر دنیا میں قدم رکھے گا، جہاں ترقی اور سعادت کے اور دوسرے اصول ہوں گے، چنانچہ اس کے بعد ہی فرمایا،

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذَالِكَ لَمَيِّتُوْنَ ط ثُمَّ — پھر بیشک تم اس کے بعد مرنے والے ہو، اور

اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ (مومنون ۱۰) — پھر قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے،

جس طرح انسانیت سے پہلے لاکھوں برس میں ایک نوع کی کیفیت مٹ کر دوسری نوع کی کیفیت پیدا ہوتے انسانیت تک نوبت پہنچی، موت کے معنی یہ ہیں کہ اب نوعِ انسانی کی تمام کیفیتیں مٹ کر ایک بلند تر نوع کی کیفیتوں کی تیاری شروع ہوئی، صدہا ہزارہا سال کے بعد قیامت سے دوسری نوع ملکوتی کا ظہور ہوگا،

یہاں مسئلۂ ارتقاء کا دوسرا اصول سامنے آتا ہے جسکو "ارتقاے اصلح" کہتے ہیں کہ ان مدارج ترقی کے اثنا میں ہزاروں وہ نوعیں فنا ہوتی رہتی ہیں جنہیں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، اور وہی باقی رہ جاتی ہیں جنمیں آئندہ بقا کی پوری استعداد ہوتی ہے، جس طرح پچھلی استعداد سے آئندہ کی استعداد پیدا ہوتی ہے، اسی طرح اس دوسری ملکوتی نوع کی استعداد ان ہی کو ملتی ہے جن کے اندر اپنی پچھلی مادی وجسمانی زندگی میں اس کی استعداد پیدا ہو چکی تھی، دوزخ کے درجے ان لوگوں کے مقامات ہیں جو گویا ہنوز جمادی ونباتی وحیوانی منزلوں میں ہیں اور ممکن ہے کہ وہ اس دارالامتحان میں اپنی کمیِ استعداد کے بقدر رہ کر آگے کی استعداد پیدا کرلیں، اور ملکوتیت کی ترقی حاصل کرسکیں،

بہشت کے مختلف مدارج انکی استعدادوں کے مقامات ہیں جو اپنی پہلی ہی زندگی میں اس ترقی کی استعداد پیدا کر چکے تھے، لیکن یہاں پہنچکر بھی ان کی روحانی ترقی کا دروازہ بند نہ ہوگا، بلکہ وہ بقدر استعداد تکمیل کے مدارج طے کرتے چلے جائینگے، شاید اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا

فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ط	ان (بہشتیوں) کے لیئے نہ ختم ہونے والی
(تین-۱)	مزدوری ہے،

ایک دوسری آیت میں ہے کہ نشاۃ ثانیہ میں اہل ایمان کے آگے پیچھے، داہنے بائیں نور ہوگا، پھر بھی دعا کریں گے،

نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ و	ان کا نور ان کے سامنے اور داہنے دوڑیگا
بِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا	اور وہ کہیں گے، اے ہمارے پروردگار!
نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ج اِنَّكَ عَلٰى	ہمارے نور کو کامل اور ہم کو معاف کر، تو
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (تحریم-۲)	ہر بات کر سکتا ہے،

مومنوں کے لبوں پر اللہ کے بخشے ہوئے نور کی مزید تکمیل اور اتمام کی دعا، ادھر اشارہ کر رہی ہے کہ ان کے مدارج میں ترقی ہوتی رہے جس کا اقتضا خدا کی ربوبیت کا منشا ہے،

امن وسلامتی کا گھر انسان امن وسلامتی کا بھوکا ہے، لیکن وہ اس امن وسلامتی کو اسباب راحت کے انبار میں تلاش کرتا ہے، اور نہیں پاتا، وہ دنیا میں امن کا گوشہ ڈھونڈھتا ہے، اور وہ اس کو نہیں ملتا، لیکن یہاں آکر اس کو نہ صرف امن کا گوشہ، بلکہ امن وسلامتی کی ایک دنیا لے گی، وہ پرند جو عمر بھر چار عناصر کے قفس میں گرفتار رہا، یہاں وہ سدرۃ المنتہیٰ کی ہر شاخ پر آزادانہ پرواز کرے گا، جنت کے جہان روحی محمدی نے! اور بہت سے نام بتائے ہیں وہاں اسکا ایک نام دَارُ السَّلَامِ بھی بتایا ہے، جسکے معنی امن وسلامتی کے گھر کے ہیں،

اہل جنت کی نسبت ارشاد ہے،

لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّهِمْ (انعام-۱۵) — ان کے لئے ان کے پروردگار کے پاس سلامتی کا گھر ہے،

اللہ تعالیٰ نے جس شریعت کو دیکر اپنے پیغمبر علیہ السلام کو مبعوث فرمایا ہے، وہ حقیقت میں اسی امن و سلامتی کی نوید و بشارت ہے، اسی لئے فرمایا،

وَاللّٰہُ یَدْعُوْا اِلٰی دَارِ السَّلَامِ (یونس ۳) — اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو سب سے پہلے اس امن و سلامتی کے گھر کی دعوت پیش فرمائی، عبداللہ بن سلام رضؓ ایک یہودی عالم تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جس صدائے نبوت نے سب سے پہلے انکے دل میں گھر کیا، وہ یہ تھی، "لوگو! سلامتی پھیلاؤ، بھوکوں کو کھلاؤ، جب دنیا غفلت کی نیند سوئے تو تم اٹھکر خدا کی عبادت کرو، امن و سلامتی کے گھر میں رہنا تم کو نصیب ہوگا"

جنت کے ذکر میں اس امن و سلامتی کا تذکرہ قرآن پاک میں بار بار آیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے در و دیوار سے امن و سلامتی کے ترانے سنائی دیں گے،

وَالْمَلٰٓئِکَةُ یَدْخُلُوْنَ عَلَیْهِمْ مِّنْ کُلِّ بَابٍ، سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَی الدَّارِ — اور فرشتے ہر دروازہ سے انکے سامنے یہ کہتے ہوئے آئینگے کہ تم پر سلامتی ہو کہ تم نے صبر کیا تھا، تو کیا اچھا پچھلا گھر ہے،

وہاں امن و سلامتی کے سوا کچھ اور سنائی نہ دے گا،

اِلَّا قِیْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا (واقعہ-۱) — لیکن سلامتی سلامتی کی پکار،

فرشتے اہل جنت کو یوں کہیں گے،

ن اُدْخُلُوهَا بِسَلٰمٍ ط ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ	اس جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو، یہ
(ق-۳)	زندگی جاوید کا دن ہے،
لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا	اس میں سلامتی کے سوا کوئی اور بیہودہ ہ
(مریم-۴)	بات نہ سنیں گے،

جنت کا ایک اور نام قرآن میں "مقامِ امن" امن والا مقام بتایا گیا ہے، فرمایا،

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ط	بیشک پرہیزگار لوگ امن والے
(دخان-۳)	مقام میں ہوں گے،

مقام رحمت خدا کی رحمت کب نہیں؟ اور کہاں نہیں؟ مگر دنیا کے فطری قوانین کے بموجب اس دنیا میں ایسے واقعات اور حادثے بھی پیش آجاتے ہیں جنکو ہم رحمت کے بجائے قہر الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں، پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ خود ہم کو ہمارے اعمال کی بدولت خداوند تعالیٰ کے قہر و غضب میں مبتلا ہونا پڑتا ہے لیکن ایک عالم وہ ہے جہاں اسکی رحمت کے سوا اسکے قہر و غضب کا نام و نشان نہ ہوگا، وہاں ہر طرف اسکی رحمت اور فیض و کرم کی بارش ہوگی، اور اسکی رحمت کے سوا وہاں کوئی اور منظر کبھی دکھائی نہ دیگا،

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ	ان کا پروردگار ان کو اپنی رحمت، خوشنودی
وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا	اور ان باغوں کی خوشخبری دیتا ہے، جن میں
نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ لا (توبہ-۳)	ان کے لئے ہمیشہ کا آرام ہے،

اہل جنت کو جن کے چہرے خوشی سے دمکتے ہوں گے یہ آواز سنائی دے گی،

وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (اٰل عمران-۱۱۰)

لیکن جن کے چہرے روشن ہوئے تو اللہ کی رحمت میں ہوں گے، اسمیں وہ سدا رہیں گے،

مقامِ نور جنت نور کا وہ مقام ہے جہاں ظلمت و تاریکی کا نام و نشان نہ ہوگا، جنتیوں کے چہرے روشن ہوں گے، کوئی ستاروں کی طرح چمکے گا، اور کوئی چاند کی طرح، ہر طرف ان پر انوار کی بارش ہوگی، آگے پیچھے، داہنے بائیں ہر سمت سے نور درخشاں ہوگا، فرمایا،

نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ (تحریم-۲)

ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے داہنے دوڑے گا،

اس دن اہل ایمان کے نور ایمان کی تجلیاں ہر طرف کوندینگی،

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (حدید-۲)

جس دن تو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دیکھے گا کہ ان کا نور انکے سامنے اور ان کے داہنے چمکے گا آج تم کو خوشخبری ہو، وہ باغ ہیں جنکے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہا کروگے، یہی بڑی کامیابی ہے،

اس دن اہل نفاق اہل ایمان سے آرزو کریں گے کہ ذرا ٹھہر جائیے کہ ہمارے ظلمت کدہ میں بھی ایک دم کے لئے روشنی ہو جائے،

يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ

جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں اہل ایمان سے کہیں گے کہ ذرا ٹھہرو کہ ہم بھی تمہارے

مِنْ نُّوْرِكُمْ ج (حدید-۲) نور سے روشنی لیں،

مقام رضوان جنت کے انعامات کی فہرست میں سب سے آخری چیز مقامِ رضوان ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ سے راضی اور خوش ہونا کہ اس کے بعد نہ کبھی وہ اپنے اس بندہ پر عتاب فرمائیگا، نہ اس سے ناراض ہوگا، بلکہ اس کو اپنی رضامندی اور خوشنودی کی لازوال دولت عطا فرمائیگا متقیوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں رکھی ہیں، ان میں جنت، نہریں، پاک بیویاں اور ان سب کے بعد روح کی مسرت رکھی ہے لیکن ان سب کے بعد بھی اپنی سب سے آخری نعمت اپنی اسی رضامندی کو ظاہر فرماتا ہے، چنانچہ سورۂ توبہ میں رحمت اور رضوان کے بعد جنت کے ذکر کو جگہ دی گئی ہے،

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ۔ (توبہ-۳)	ان کا پروردگار ان کو اپنی رحمت اور خوشنودی (رضوان) کی خوشخبری دیتا ہے، اور ان باغوں کی جن میں نعمتِ الٰہی قائم رہے گی،

سورہ حدید میں بھی اسی طرح مغفرت اور رضائے الٰہی کے بعد بطور تکملہ کے جنت کا ذکر آتا ہے، فرمایا،

وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ط وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ، سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ	اور آخرت میں سخت عذاب ہو، اور خدا کی بخشش اور رضامندی بھی ہے، اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے، اپنے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف دوڑو

وَجَنَّتٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَ
الْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ
يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ
الْعَظِيْمِ (حدید-۳)

جس کا پھیلاؤ آسمان اور زمین کے پھیلاؤ کے
برابر ہے، یہ ان کے لئے بنائی گئی ہے جو اللہ
اور اس کے رسولوں پر یقین رکھتے ہیں، یہ اللہ
کی مہربانی ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور
اللہ بڑی مہربانی والا ہے۔

سورۂ آل عمران میں جنت کی تمام نعمتوں کو گنا کر ان کا خاتمہ رضوان کی عظیم الشان بشارت پر کیا گیا ہے، فرمایا،

لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ
مِّنَ اللّٰهِ (آل عمران-۲)

جنھوں نے پرہیزگاری کی، ان کے لئے اُنکے
پروردگار کے پاس ایسے باغ ہیں جنکے نیچے
نہریں بہتی ہیں، ان میں وہ سدا رہیں گے
اور پاک بیویاں، اور اللہ کی خوشنودی،

سورۂ توبہ میں جنت کی تمام نعمتوں سے بڑھکر نعمت رضوان الٰہی کو قرار دیا ہے،

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ
خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ
جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ
اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (توبہ-۹)

اللہ نے باایمان مردوں اور عورتوں سے اُن
باغوں کا وعدہ کیا ہے جنکے نیچے نہریں بہتی ہیں،
ان میں سدا رہیں گے اور رہنے کے ستھرے گھر
اور اللہ کی رضامندی سب سے بڑی ہے، وہی
بڑی کامیابی ہے،

بہشت کی مطمئن روحوں کو یہ نوید مسرت سنائی جاتی ہے،

یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْٓ	اے اطمینان والی روح! تو اپنے رب کے
اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً :	پاس اسی طرح واپس جا کر تو اس سے
(فجر - ۱)	راضی ہو اور وہ تجھ سے راضی ہو،

اہل جنت کی یہ صفت آئی ہے،

رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (مائدہ ع-۱۶) خدا ان سے خوش اور وہ خدا سے خوش،

ان ہی آیتوں کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بشارت سنائی ہے کہ خداوند تعالیٰ اہل جنت کو آواز دیگا کہ اے جنت والو! وہ جواب دیں گے کہ اے خداوند! ہم حاضر ہیں، سب بھلائیاں تیرے پاس ہیں، فرمائیگا (جنت کی نعمتیں پاکر) اب تم خوش ہوئے؟ عرض کرینگے پروردگار کیوں خوش نہ ہوں کہ تو نے ہمکو وہ کچھ دیا جو کسی کو نہیں دیا، فرمائیگا کہ میں ان تمام گذشتہ نعمتوں سے بڑھکر جو چیز ہے وہ تمکو نہ دوں؟ کہیں گے اے پروردگار! ان سے بہتر کیا ہے؟ فرمائیگا "یہ کہ اپنی رضامندی و خوشی تم پر اتاروں، پھر اس کے بعد میں کبھی تم سے ناراض نہ ہوں گا"[1]۔

مقام طیب و طاہر موجودہ دنیا کی ہر چیز آلودگیوں اور نجاستوں سے بھری ہے لیکن بہشت وہ مقام ہے، جو پاکی، ستھرائی، لطافت اور طہارت کا مظہر ہے، اس میں وہی داخل ہونگے جو گناہوں سے پاک ہو چکے ہوں، فرمایا،

طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِیْنَ (زمر ۹)	تم پاک ہو چکے تو جنت میں ہمیشہ کیلئے داخل ہو جاؤ

[1] صحیح بخاری و مسلم صفۃ الجنۃ،

جو زندگی وہاں ملے گی، وہ بھی پاک وصاف اور ستھری اور ہر جسمانی و روحانی آلایش سے بری ہوگی، فرمایا،

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ، (نحل ۱۳)

مرد ہو یا عورت جس نے مومن بنکر اچھے کام کئے ہم اسکو ایک پاک زندگی دیکر جلائینگے، اور ان کو ہم ان کے سب سے بہتر عمل کے مطابق بدلہ دیں گے،

جو گھر وہاں ملیں گے وہ بھی پاک وصاف اور ستھرے ہوں گے،

وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً، (صف ۳۰)

اور پاک گھر،

جو بیویاں ملیں گی وہ بھی پاک ہوں گی،

وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ (آل عمران ۱۵)

اور پاک بیویاں

وہاں کی جو باتیں ہونگی وہ بھی پاک ہونگی،

وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ (حج ۳)

اور اہل جنت کو پاکیزہ گفتگو کی طرف رہنمائی کی جائے گی،

ان کے پینے کی جو چیز ملے گی وہ بھی پاک ہوگی،

شَرَابًا طَهُوْرًا، (دھر ۱)

پینے کی پاک چیز،

غرض کہ ہر چیز وہاں پاک صاف طیب و طاہر اور تمام روحانی وجسمانی آلودگیوں سے مبرا ہوگی

مقام تسبیح وتہلیل | اس آرام ولطف کے بعد اہل جنت کی روحانی لذت اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور

تسبیح و تہلیل ہوگی، یہ ان کی روحانی غذا ہوگی، وہ عالم جہاں ہر طرف انوار الٰہی برسیں گے، جہاں صفائی اور ستھرائی کے سوا کوئی اور منظر نہ ہوگا، جہاں قدس و نزاہت کی ہر طرف صورتیں نظر آئیں گی، وہاں حمد و ثنا کے روح افزا ترانے بھی ہر طرف سے بلند ہوں گے،

دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ	جنت میں ان کی ندا یہ ہوگی کہ اے میرے اللہ!
وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ	تیری پاکی اور ان کی آپس کی دعا سلامتی
دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ	ہوگی، اور انکی آخری پکار یہ ہوگی کہ دنیا کے
(یونس-۱)	پروردگار اللہ (تعالیٰ) کی حمد ہو،

جنت کی تمام شاہانہ نعمتوں کے بعد بڑی نعمت یہ ہوگی کہ خدا کی تسبیح و تہلیل کی نئی نئی لطف راہیں وہاں ان پر کھلیں گی، فرمایا،

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	بیشک اللہ ان کو جو ایمان لائے اور اچھے
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ	کام کئے ان باغوں میں داخل کرے گا
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا	جنکے نیچے نہریں بہتی ہوں، ان میں انکو
اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا وَ	سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائینگے
لِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ وَهُدُوْٓا اِلَى	اور ان کی پوشاک ان میں ریشم کی ہوگی،
الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ وَهُدُوْٓا اِلٰى	اور وہ راہ دکھائے جائیں گے اچھی بات
صِرَاطِ الْحَمِيْدِ، (حج-۳)	کی، اور وہ دکھائے جائینگے اس سراپا

وہ اپنے ہر سرور اور نعمت کے شکریہ میں فرشتوں کے ساتھ مل کر حمد الٰہی کا سرود سرمدی گائینگے

اور یہ وہ وقت ہوگا جب عالمِ وجود کے ہر گوشہ سے اس کی حمد کا ترانہ بلند ہوگا فرمایا،

وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ	جنت کے نگہبان ان سے کہیں گے تم پر
طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ وَقَالُوا	سلامتی ہو تم پاک ہو چکے تو جنت میں چلے
الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهُ	جاؤ، اہل جنت کہیں گے اس اللہ کی حمد
وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ	ہو جس نے اپنا وعدہ سچا کیا، اور ہم کو اس
حَيْثُ نَشَاءُ ۚ فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ	سرزمین کا مالک کیا کہ جنت میں جہاں
وَتَرَى الْمَلَائِكَةَ حَافِّينَ مِنْ حَوْلِ	چاہیں رہیں تو کام کرنے والوں کی کیسی اچھی
الْعَرْشِ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۚ	مزدوری ہے، اور دیکھئے گا کہ فرشتے عرش الٰہی
وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيلَ الْحَمْدُ	کو گھیرے اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح
لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ،	کر رہے ہونگے اور سب لوگوں کے درمیان فیصلہ
(زمر - ۸)	کیا جائیگا اور کہا جائیگا کہ حمد ہو سارے

اہل جنت کے متعلق قرآن پاک میں ایک جگہ ہے،

لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا إِلَّا سَلَامًا	وہ نہ سنیں گے وہاں بیکار بات، مگر
وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَعَشِيًّا	سلام اور انکی روزی اس میں صبح
(مریم - ۴)	اور شام ہوگی،

اس صبح و شام کی روزی سے مقصود کیا جنت کے کھانے کے الوانِ نعمت ہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو صبح و شام کی تخصیص کیا تھی، وہ تو ہر وقت سامنے ہونگے، میرا گمان یہ ہے کہ اس روزی

سے خدا کی تسبیح و تہلیل کی روحانی روزی اور ربّانی غذا مراد ہے، اور حدیث کے ان لفظوں کو اسی کی تفسیر جانتا ہوں، صحیح مسلم میں ہے کہ آپنے جنت کی نعمتوں کے سلسلہ میں فرمایا،

یُسَبِّحُوْنَ اللّٰہَ بُکْرَۃً وَّعَشِیًّا، (صفۃ الجنۃ)	وہ صبح اور شام اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس کریں گے،

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپنے فرمایا کہ اہلِ جنت کو خدا کی تسبیح و تقدیس کا الہام ہوا کریگا" اور شاید قرآن پاک کی اس آیت کے یہی معنی ہوں،

وَھُدُوْٓا اِلَی الطَّیِّبِ مِنَ الْقَوْلِ	اور اچھی بات کیطرف انکی رہنمائی کیجائیگی
وَھُدُوْٓا اِلٰی صِرَاطِ الْحَمِیْدِ (حجر ۳)	اور اس سراپا حمد کا راستہ ان کو بتایا جائیگا،

مقام قرب اہل جنت کو جو کچھ نصیب ہوگا ان کے سوا سب سے اعلیٰ مرتبہ قرب خاص کا مقام ہوگا، بندے اپنے پروردگار کی حضوری کا شرف پائیں گے قرآن پاک میں جابجا ان کے لئے یہ آتا ہے، جَزَآءُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ، ان کی جزا ان کے پروردگار کے پاس"، یہ قرب خاص کے اشارے ہیں، اور ایک جگہ یہ اشارہ اس تصریح سے بدل جاتا ہے،

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَھَرٍ،	بے شک پرہیزگار باغوں میں اور نہروں
فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْکٍ	سچائی کی نشستگاہ میں اس بادشاہ
مُّقْتَدِرٍ، (قمر ۳)	کے حضور جس کا سب پر قبضہ ہے،

دیدار جنت کی سب سے آخری لیکن بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کی تجلّی کا نظارہ ہے، کون ہے جو اس مطلعِ انوار کے دیدار کی تاب لاسکے، تاہم یا تو یہ آنکھیں کچھ اور ہوں گی، یا وہ نورِ مطلق کسی

خاص شان میں نمایاں ہوگا، اس وقت یہ عالم ہوگا کہ وہ نور کا مرکز بن کر نمودار ہوگا، اور اہلِ جنت کی مشتاق آنکھیں اس کی طرف اٹھی ہوں گی،

وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (قیامہ-۱)	کتنے چہرے اس دن تروتازہ اور اپنے پروردگار کی سمت دیکھ رہے ہونگے،

اسی آیت کی تفسیر میں حضرت جریرؓ بن عبداللہ صحابی روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنے پروردگار کو بالمشاہدہ دیکھو گے"، دوسری روایتوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جیسے چاند کو تم دیکھ رہے ہو ایسے ہی تم اپنے پروردگار کو دیکھو گے اس دیدار و رویت میں کوئی ایک دوسرے کا مزاحم نہ ہوگا[1]، اس تمثیل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو مقصود ہیں ایک تو شدتِ یقین کا اظہار کہ جس طرح تم اس روشن چاند کو بے شک و شبہ دیکھ رہے ہو اسی طرح بے شک و شبہ اپنے پروردگار کو دیکھو گے، دوسرا مقصد یہ ہے کہ جس طرح لاکھوں کا مجمع بھی ہو تو سب لوگ ایک چاند کو یکساں حیثیت سے باطمینان اسطرح دیکھ سکتے ہیں کہ ایک کا دیکھنا دوسرے کے دیکھنے میں عائق نہیں ہوتا، اسی طرح دیدارِ الٰہی میں کروڑوں کا جو ہجوم ہوگا اس میں خدا کے دیدار میں ایک دوسرے کا مانع نہ ہوگا، اتنا ہی نہیں بلکہ جس دن جنتی اپنے پروردگار کے حضور میں پیش ہوں گے ان کی زبان پر سلامتی کی دعا ہوگی،

تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهُ سَلَامٌ (احزاب-۶)	ان کی دعا جب وہ اپنے پروردگار سے ملیں گے، سلامتی ہوگی،

[1] صحیح بخاری جلد ثانی ص ۱۱۰۵،

بلکہ اس سے بھی بڑھکر یہ کہ وہ سراپا رحمت پروردگار خود اپنے بندہ کو اپنی زبان سے سلامتی کا پیام دیگا،

سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ، رحمت والے پروردگار کی طرف سے پیام

(یٰسین - ۴) سلامتی ہوگا،

بخاری میں ہے کہ آپنے فرمایا خداوند تعالیٰ اپنے بندہ سے ترجمان کے بغیر خود کلام فرمائیگا[1]!!

یہ روایت کیونکر ہوگی؟ اہلِ روایت لفظ کے قائل ہیں، اہل عقل زیادت ایمان کی تاویل کرتے ہیں، اہل حقیقت اُسکو اسماء وصفات کی ناقابل بیان جلوہ انگیزی سے تعبیر کرتے ہیں لیکن فیصلہ یہ ہے،

ع بیا کیں داور ہمارا بہ پیش داور اندازیم

ان تعلیمات کا عملی اثر اوپر کے صفحوں میں قیامت، حشر ونشر اور جنت ودوزخ کے پورے مناظر گذر چکے، یہ ایمان بالغیب مذہب کی حقیقت کا اصلی جوہر ہے، اور اسی کے یقین میں مذہب کی اصلی طاقت پوشیدہ ہے، معلوم ہو چکا ہے کہ اہل عرب کو ان حقائق کی تسلیم سے کس قدر انکار تھا، بلکہ مر کر جی اٹھنا، اور اس موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ان کے نزدیک کس قدر بعید تھا، قرآن پاک کا بڑا حصہ شرک کے ابطال اور توحید کے اثبات کے بعد اسی حیاتِ بعد الموت کی تلقین اور اس پر ایمان کی دعوت پر مشتمل ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اکثر خطبوں میں اس کا حال بیان کیا کرتے تھے اور جمعہ کے خطبوں میں خصوصیت کیساتھ سورۂ قٓ تلاوت فرماتے تھے جسمیں قیامت کے حالات ہیں، مگر دیکھو کہ ۲۳ برس کی مسلسل تعلیم قرآن پاک کی تاثیر اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض ہدایت سے نہ صرف انکا انکار اقرار سے بدل گیا، بلکہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ مناظر انکے دل ودماغ کی لوح میں منقوش ہو گئے تھے،

---

[1] صحیح بخاری ج ثانی باب کلام الرب،

یاد ہوگا کہ اسلام کے آغاز میں ایک عرب شاعر نے طنزاً کہا تھا،

امرت ثم بعث ثم حشر	حدیث خرافۃ یا ام عمر
کیا مرنا ہے، پھر جینا، اور پھر اکٹھا ہونا	اے عمر کی ماں، یہ خرافات باتیں ہیں

لیکن چند ہی سال کے بعد یہ طنز انکار، رمز یقین سے بدل گیا، اور اس وقت عرب کا شاعر یہ کہنے لگا،

"ہم آسمان تک پہنچ گئے، اور خدا سے امید ہے کہ ہم اس سے بھی اونچے جائیں گے"[1]

وانا لنرجو فوق ذلک مظہرا،	اور ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ اس سے بھی
	بلند مقام میں ظہور کریں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم استفسار فرماتے ہیں کہ آسمان سے بھی بلند مقام اور کیا ہے؟ عرض کرتا ہے کہ جنت یا رسول اللہ! آپ فرماتے ہیں انشاء اللہ دیکھو کہ جنکی نظریں زمین سے اونچی نہیں جا پاتی تھیں، اُن کا تخیل آسمان سے بھی اونچا جانے لگا جنکو مر کر پھر جینا دور از عقل معلوم ہوتا تھا جنکو آخرت کے مواخذہ کا کوئی ڈر نہ تھا جن کو اپنے اعمال کی جوابدہی کی پروا نہ تھی، جو سزا و جزا کے مفہوم سے بیگانہ تھے جو جنت و دوزخ کے تخیل سے ناآشنا تھے، وہ اس ہولناک منظر سے ڈرنے لگے دوسری زندگی پر ان کو اسی طرح یقین آگیا جس طرح آج کی زندگی پر تھا، آخرت کے مواخذہ سے وہ بید کیطرح کانپنے لگے، اعمال کی جوابدہی سے ترساں ولرزاں رہنے لگے، سزا و جزا کے خوف سے وہ اپنے ہر عمل کی باز پرس خود کرنے لگے، جنت کا اشتیاق ان کو بڑی سے بڑی قربانی پر آمادہ کر دیتا تھا، دوزخ کا ڈر ان کے دل کے اندر کے ہر تار کو چھیڑا کرتا تھا، انکی آنکھوں کو اشکبار رکھتا تھا، فرائض اور ذمہ داری کو

[1] اصابہ اور استیعاب ذکر نابغہ جعدی،

دیانتداری کے ساتھ ادا کرنے پر ہر لحظہ ان کو آمادہ کرتا رہتا تھا، راحت کے خواب اور آرام کے بستر سے اُن کو چونکا کر عمل کے میدان میں تنہا لے آتا تھا، اور ہر نیک کام اور عمدہ عمل کے لئے ان کو ہمہ تن سرگرم اور سرتاپا مصروفِ جدوجہد بنا دیتا تھا، تنہائی اور تاریکی میں بھی انکے دل اور بدن کو برائیوں اور بداعمالیوں سے باز رکھتا تھا، انکے ضمیر اور دل کے صفحوں کو ہر وقت خدا کی آنکھوں کے سامنے کھلا رکھتا تھا۔

ایک دفعہ کسی حقیقت کے متعلق دو صحابیوں میں جھگڑا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فریقین کی باتیں سُن کر ایک کے حق میں فیصلہ دیدیا، پھر فرمایا میں بھی ایک آدمی ہوں، مدعی اور مدعا علیہ میں ہی ممکن ہے کہ کوئی زیادہ اچھا بولنے والا ہو جو اپنے دعویٰ کو خوبی کیساتھ بیان کرے اور میں اسکے موافق اُسکا فیصلہ دوں لیکن درحقیقت وہ چیز اس کی نہ ہو تو گویا میں اس کے گلے میں آگ کا ایک طوق پہنا رہا ہوں[1]، یہ سن کر فریقین پر یہ اثر ہوا کہ دونوں رونے لگے اور ہر ایک اپنا حصہ دوسرے کو دینے لگا،

حضرت عمرؓ خدا کے مطیع و فرمانبردار تھے، رسول کے عاشق و شیدا تھے، نیکیوں سے مالا مال تھے، جنت کی بشارت سے سرفراز تھے، تاہم آخرت کے مواخذہ اور جوابدہی سے اسقدر خوفزدہ تھے کہ ایک دفعہ انھوں نے کہا کہ اگر وصالِ نبوی کے بعد میرے اچھے اور بُرے اعمال برابر برابر رہیں تو بھی میں خوش ہوں، اگر جنت نہ ملے تو پرواہ نہیں، مگر الٰہی دوزخ نہ ملے[2]، وہ نزع کی حالت میں بہت بیچین تھے، بعض صحابہ انکے اچھے اعمال گنا کر ان کو تسلی دینے لگے، تو جواب میں کہا خدا کی قسم اگر کل زمین میرے لئے سونا ہو جاتی کہ اسکو دیکر عذاب الٰہی سے بچ سکتا تو میں دیدیتا[3]، اُمّ المومنین حضرت عائشہؓ کہتی تھیں "اے کاش میں جنگل کی گھاس ہوتی[4]، اے کاش میں کچھ نہ ہوتی"[5]

---

[1] سنن ابی داؤد کتاب القضیہ [2] صحیح بخاری باب الہجرۃ جلد اول ص ۵۵، [3] صحیح بخاری فضائل حضرت عمر رضی اللہ عنہ

قیامت کے متعلق قرآن پاک کی یہ عجیب مؤثر آیت :۔

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمْ اِنَّ زَلْزَلَۃَ	لوگو! اپنے رب سے ڈرو قیامت کا بھونچال
السَّاعَۃِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ یَوْمَ تَرَوْنَھَا	ایک بڑی چیز ہے جس دن اس کو دیکھو گے ہر دودھ
تَذْھَلُ کُلُّ مُرْضِعَۃٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ	پلانے والی عورت اپنے دودھ پیتے بچہ
وَتَضَعُ کُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَھَا وَتَرَی	کو بھول جائیگی اور پیٹ والی اپنا پیٹ ڈال دیگی،
النَّاسَ سُکٰرٰی وَمَا ھُمْ بِسُکٰرٰی	اور لوگوں کو نشہ میں دیکھیگے لیکن وہ نشہ میں
وَلٰکِنَّ عَذَابَ اللّٰہِ شَدِیْدٌ (حج،)	ہونگے بلکہ خدا کا عذاب سخت ہوگا،

جب اتری اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو سنایا اور اسکی تفسیر کی تو انکے چہروں کا رنگ[۱] بدل گیا اور آنکھوں سے آنسو جاری[۲] ہوگئے، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کا ذکر کیا اور موت کے بعد کے عذاب کا حال بیان کیا تو صحابہ چیخیں مار مار کر رونے[۳] لگے، حضرت ابوہریرہؓ کو ایک بار قیامت کے ایک منظر کے بیان کرنے کی ضرورت پیش آئی تو اثنائے روایت میں وہ تین دفعہ بیہوش ہوکر گرے[۴] اور جب امیر معاویہؓ کے سامنے یہ آیت دہرائی گئی تو ان پر بھی گریہ طاری ہوگیا[۵]،

اس یقین و ایمان کا دوسرا سماں یہ ہے کہ بدرؓ کا میدانِ جنگ ہے، مشرکین کی ایک ہزار لوہے میں ڈوبی ہوئی فوج کا سیلاب امنڈا آرہا ہے، ادھر تین سو نہتے مسلمان صف باندھے کھڑے

(بقیہ حاشیہ ص ۸۵۷) اوّل ص ۵۲۱ [۱] ابن سعد جزء النساء ص ۱۱ [۲] صحیح بخاری مناقب عائشہؓ و تفسیر سورۂ نور و مستدرک حاکم ترجمۂ عائشہؓ و ابن حنبل مسند عائشہؓ [۳] صحیح بخاری تفسیر سورہ حج ج دوم ص ۶۹۳ [۴] جامع ترمذی تفسیر سورۂ حج [۵] سنن نسائی کتاب الجنائز باب التعوذ من القبر [۶] جامع ترمذی ابواب الزہد،

ہیں کہ آپ صحابہ کی طرف خطاب کرکے فرماتے ہیں، "تو اس جنت کا موقع سامنے ہے جس کی وسعت آسمان و زمین کے برابر ہے" ایک انصاری حیرت سے پوچھتے ہیں کہ کیا آسمان و زمین کے برابر؟ آپ فرماتے ہیں "ہاں"، وہ خوشی سے واہ واہ کہہ اٹھتے ہیں، آپ دریافت فرماتے ہیں کہ تم نے واہ واہ کیوں کہا؟ عرض کی اس امید سے کہ شاید میں بھی اس میں ہوں، فرمایا تم اس میں ہو، یہ سن کر وہ کھجور نکال نکال کر جلدی جلدی کھانے لگے، بالآخر جنت کے جانے میں اتنا توقف بھی شاق گذرا، بولے اتنی دیر بھی کیوں کیجائے، یہ کہکر کھجوریں پھینک دیں اور تلوار کھینچکر آگے بڑھے، اور شہید ہوئے،

غزوۂ اُحد میں بھی اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا، اُحد کے میدان میں دار و گیر کا شور برپا تھا، لاشوں پر لاشیں گر رہی تھیں، کہ ایک صحابی نے آگے بڑھ کے پوچھا یا رسول اللہ اگر خدا کی راہ میں مارا گیا تو کہاں ہونگا، فرمایا جنت میں، وہ کھجور کھا رہے تھے، ہاتھ سے کھجوریں پھینک دیں اور یہ کہکر جان دیدی اور قیسؓ ایک صحابی تھے وہ ایک جہاد میں شریک تھے انھوں نے اسلامی فوج کے سپاہیوں کے سامنے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جنت کے دروازے تلواروں کے سائے کے نیچے ہیں، ایک معمولی سا مسلمان پاس کھڑا تھا، اس نے آگے بڑھکر پوچھا کہ کیا آپنے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے، انھوں نے کہا ہاں، یہ سنکر وہ اپنے دوستوں کے پاس آیا اور سلام کرکے رخصت ہوا، میان توڑ کر پھینک دی اور تلوار لیکر دشمن کی صف میں جا پڑا اور شہادت حاصل کی[1]

ان حیرت انگیز واقعات میں سے ہر ایک واقعہ پر غور کرو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے منکر اور کافر عربوں کے دل و دماغ اور ذہن و اعتقاد کو کس طرح آن کی آن میں بدل دیا اور دم کے دم میں ان کے عقائد و اخلاق کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا،

[1] یہ تینوں واقعے صحیح مسلم کتاب الجہاد باب ثبوت الجنۃ للشہید میں ہیں، دوم واقعہ تین زنانی میں بھی ہے کتاب الجہاد باب ثواب من قتل فی سبیل اللہ۔ ۱۲

قضاؤ قدر

اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰہُ بِقَدَرٍ (قمر ۳)

اگرچہ قرآن پاک میں ایمان کے سلسلہ میں اس کا ذکر کہیں نہیں آیا، مگر اس کا اعادہ بار بار قرآن میں اتنی دفعہ ہوا ہے کہ اسکی اہمیت اسکی مقتضی ہے کہ اس کو بھی ایمانیات کے پہلو میں جگہ دیجائے چنانچہ بعض صحیح حدیثوں میں یہ ایمانیات کی آخری کڑی قرار بھی دیگئی ہے، اور سلسلۂ توحید میں اسلام نے اللہ تعالیٰ کی وسعتِ قدرت اور مشیتِ مطلقہ کا جو نقشہ کھینچا ہے، اسکا لازمی نتیجہ بھی یہی ہونا چاہیئے،

اس عقیدہ کا حاصل یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ اب تک ہوا، جو کچھ اب ہو رہا ہے اور جو کچھ آئندہ ہوگا، وہ اللہ تعالیٰ کے علم سابق اور فیصلۂ ازلی کے مطابق ہوا ہے، ہوتا ہے اور ہوگا، جس طرح مہندس اور انجنیر مکان بنانے سے پہلے مکان کی تمام جزئیات پر غور کرکے پہلے ہی سے نقشہ تیار کر لیتے ہیں اور اور اسی مجموعہ نقشہ کے مطابق معمار اور مزدور اس تعمیر کو مکمل کرتے ہیں، اسیطرح اس مہندسِ ازل خالقِ کائنات نے کائنات کی پیدائش سے پہلے اسکے تمام اصول و قواعد اور دوسرے اہم جزئیات طے کرکے ہر چیز کی نسبت فیصلہ کر دیا تھا، اب اسی فیصلہ کے مطابق یہ کائنات اور اس کے تمام حوادث

سلہ صحیح مسلم بروایت ابن عمرؓ و ابو ہریرہؓ باب الایمان،

دو واقعات انجام پا رہے ہیں، موت وحیات، فقر وغنا، کامیابی وناکامی، تکلیف وراحت ہر چیز پہلے سے طے شدہ ہے، اور اسی کے مطابق وہ ظہور پذیر ہوتی ہے،

نفس یہ عقیدہ بھی اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں جو کچھ مخصوص ہے، وہ اس کی تکمیلی تعلیم ہے۔

توراۃ میں حضرت آدمؑ وشیطان اور ہابیل وقابیل کے قصوں میں اس عقیدہ کے اشارات پائے جاتے ہیں، حضرت یوسفؑ کا خواب اسی حقیقت کی تعبیر ہے مگر ان اشارات سے گذر کر زبور میں اسکی کھلی کھلی تعلیم بھی ملتی ہے، زبور ۱۳۹-۱۴ میں ہے،

"تیرے کام حیرت افزا ہیں، اس کا میرے جی کو بڑا یقین ہے، جب کہ میں پردے میں بنایا جاتا تھا، اور زمین کے اسفل میں منقوش ہوتا تھا، تو میرے جسم کی صورت تجھ سے چھپی نہ تھی، تیری آنکھوں نے میرے بے ترتیب مادہ کو دیکھا، اور تیرے دفتر میں یہ سب چیزیں تحریر کی گئیں، اور ان کے دنوں کا حال بھی کہ کب بنیں گی، جب ہنوز ان میں سے کوئی بھی نہ تھی"

اس کے بعد زبور ۱۴۸ کا ترانۂ حمد اسی لے میں شروع ہوتا ہے،

".....خداوند کے نام کی ستائش کریں کہ اُس (خدا) نے حکم دیا، اور وہ (مخلوقات) موجود ہو گئے، اس نے ان کو پائداری بخشی، اس نے ایک تقدیر مقرر کی جو ٹل نہیں سکتی،

انجیل میں اُس کی تعلیم "خدا کی مرضی" کے عنوان سے ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندگی کی آخری شب کی دعا میں فرماتے ہیں میری مرضی نہیں تیری مرضی پوری ہو، (متی ۲۶-۲۹) اور اسی مرضی کا ذکر یوحنا (۵-۳-۶-۳۸) اور خطوط (فلپیون ۲-۱۳) میں ہے اور رومیوں کے نویں باب میں اسکی پوری تفصیل ہے مگر خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم نے اوّل یہ کیا کہ اس مسئلہ کی مجمل حقیقت

کی توضیح اور اس کی حکمت و مصلحت کی تشریح کی، اور پھر یہ کہا کہ گذشتہ مذاہب کی طرح اپنے دفتر کے کسی ایک گوشہ میں بطور ایک حقیقتِ ثابتہ کے اُسکو کہکر خاموشی اختیار نہیں کر لی بلکہ بار بار اتنی دفعہ دہرایا کہ سننے والوں کے دلو نمیں اسکی عقیدت نے گھر کر لیا اور یہ تلقین یقین کی صورت میں اُنکی رگ و ریشہ میں پیوست ہو گئی، اور ایسا اُس نے اسلئے کیا کہ صبر و شکر کی اخلاقی تعلیم صرف نظریہ کی صورت میں نہ رہ جائے بلکہ عملی حیثیت سے اس کے پیرؤوں کے اندر استقلال و ثبات کی روح اور دنیا کے مصائب و حوادث میں تسلی و تشفی کی قوت پیدا کرے، اور اسطرح یہ عقیدہ پہلے کیطرح صرف ایک مذہبی تلقین یا فلسفیانہ نظریہ کی حیثیت میں نہ رہے بلکہ ایک مفید عملی تعلیم کی شکل اختیار کر لے،

وحی محمدی نے اس اصطلاح کے لئے دو لفظ اختیار کئے ہیں ایک قدر، جسکے معنی اندازہ کرنے کے ہیں، اور دوسرا قضا جس کے معنی فیصلہ کرنے کے ہیں،

اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (قمر ۳)	ہم نے ہر چیز کو اندازہ سے پیدا کیا،
هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ طِیْنٍ ثُمَّ	وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے بنایا، پھر
قَضٰٓی اَجَلًا ط (انعام ۱۰)	ایک وقت کا فیصلہ کیا،

یہ دونوں لفظ بجائے خود اس عقیدہ کی اسلامی حقیقت کو پوری طرح واضح کر دیتے ہیں، مقصود یہ ہے کہ کائنات کی پیدائش سے پہلے، کائنات کی ہر چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے اندازہ اور تقدیر سے ہر ایک کا فیصلہ فرما دیا ہے اور متعین کر دیا ہے، اسی کے مطابق یہ کائنات چل رہی ہے، اسمیں خدا کے حکم کے بغیر ایک ذرہ کا بھی تغیر نہیں ہو سکتا، آسمان کو جسطرح بنایا، آفتاب کو جسطرح روشن کیا، چاند کے متعلق جو اصول مقرر فرما دیا، ستاروں کے نکلنے اور ڈوبنے کے جو احکام دیدیئے، موت و حیات

فنا وبقا، اور عروج وزوال، غرض کائنات کی ہر شق اور ہر پہلو کے متعلق جو اصول متعین فرمادئے
انہی پر وہ چل رہی ہے، قرآن پاک میں کائنات کے بہت سے حالات کے بیان کرنے کے بعد ہے،

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا — اور سورج اپنے ٹھہراؤ پر چل رہا ہے یہ ہے حساب
ذَالِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ وَالْقَمَرَ — اور علم والے کی تقدیر (اندازہ) اور چاند کو ہے
قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُونِ — منزلیں یہانتک کہ وہ پرانی ٹہنی کیطرح خمیدہ
الْقَدِيمِ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِي لَهَآ اَنْ — ہوکر رہ جاتا ہے نہ تو سورج کی قدرت میں ہے کہ
تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ — چاند کو پالے اور نہ رات دن سے آگے بڑھے
النَّهَارِ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَّسْبَحُونَ (یٰسٓ) — ہر ایک اپنے مدار میں تیر رہا ہے،

یہ تو آسمان کی بات تھی، زمین کے متعلق ارشاد ہوا،

وَقَدَّرَ فِيهَآ اَقْوَاتَهَا (حم سجدہ ۲) — اور زمین میں اسکی روزیاں اندازہ کردیں،

اس سے آگے بڑھکر یہ کہ دنیا کی ہر چیز میں اس نے ایک اندازہ مقرر کر دیا،

قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (طلاق ۲) — اللہ نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ بنایا ہے،

موت وحیات بھی اسی اندازہ کے مطابق ہے، فرمایا،

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ (واقعہ ۲) — ہم نے تمھارے درمیان موت کو اندازہ کر دیا،

ہر شے میں اللہ تعالیٰ نے جو اندازہ لگایا ہے وہ وہی چیز ہے جسکو لوگ قانون قدرت کہتے
ہیں، اور جس پر دنیا چل رہی ہے، اسیطرح اللہ تعالیٰ نے کائنات کے ہر حصہ اور ہر پہلو کے
متعلق اپنے احکام معین فرمادئیے ہیں جن کی اطاعت اس پر واجب ہے، علیٰ ہذا انسانوں کی

ترقی و زوال، موت و حیات، بیماری و صحت، دولت و افلاس، آرام و تکلیف، سعادت و شقاوت ہر ایک کے اصول و قواعد مقرر فرما دیئے ہیں، غرض انکو آرام و تکلیف جو کچھ بھی پیش آتی ہے خدا کے علم اور اجازت سے پیش آتی ہے،

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (تغابن-۲) نہیں پہنچتی تم کو کوئی مصیبت لیکن اللہ کے حکم سے۔

اور چونکہ تقدیر سے کوئی چیز ہٹ نہیں سکتی، اسلئے مقدرات کو نوشتۂ الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں کہ جسطرح لکھی ہوئی بات قائم رہتی ہے مٹتی اور بھولتی نہیں، ایسے ہی یہ باتیں بھی مٹتیں اور بدلتیں نہیں،

وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا	اور کوئی عورت حمل میں نہیں رکھتی اور
بِعِلْمِهٖ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ	نہ جنتی ہے لیکن خدا کے علم سے، اور نہ کسی
مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ، اِنَّ ذٰلِكَ	دراز عمر کو عمر کی درازی ملتی ہے، یا اسکی
عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ،	عمر کم کیجاتی ہے لیکن وہ کتاب میں ہے،
(فاطر-۲)	بے شک یہ اللہ پر احسان ہے،

اس آیت پاک میں دو ٹکڑے ہیں، ایک یہ کہ جو عورت بھی اپنے پیٹ میں بچہ رکھتی ہے یا بچہ جنتی ہے وہ خدائے پاک کے علم سے ہے، دوسرا یہ ہے کہ جسکو چھوٹی بڑی جو عمر بھی ملتی ہے، وہ کتاب الٰہی میں پہلے سے لکھی ہوتی ہے، ان دونوں ٹکڑوں کے ملانے سے معلوم ہوگا کہ کتاب الٰہی میں ہونا اور علم الٰہی میں ہونا دونوں ہم معنی ہیں،

قرآن پاک نے اس کو بھی ظاہر کیا ہے کہ قضا و قدر کے عقیدہ کی فلسفیانہ حقیقت سے زیادہ اس کی نظر اس عقیدہ کی اخلاقی اہمیت پر ہے، انسان کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی ناچیز کوشش کی ذرا سی

کامیابی پر فخر و غرور کے نشہ میں چور ہو جاتا ہے، اور ذرا سی ناکامی پر وہ دل شکستہ ہو کر ہمت ہار بیٹھتا ہے،
یہ دونوں مختلف اخلاقی بیماریاں اس لیے اُس کو لاحق ہوتی ہیں کہ وہ اپنے کام کے اچھے یا بُرے
نتیجے کو خود اپنے کام کا لازمی نتیجہ جانتا ہے، اس لیے وہ کبھی اپنے کئے پر مغرور اور کبھی ملول ہوتا ہے،
اور یہ دونوں کیفیتیں افراد اور اقوام کی متانت، استقلال، اور صبر و ثبات کے جوہر کو برباد کرتی ہیں،
اس لئے ایک ایسے عقیدہ کی ضرورت تھی، جو کامیابی کے فخر و مسرت اور ناکامی کے افسوس
و حسرت دونوں موقعوں پر عاجز انسانوں کی دست گیری کرے، اور وہ یہی عقیدۂ قضا و قدر ہے،

اس عقیدہ کا منشا یہ ہے کہ ہم کو جو کامیابی ہوتی ہے وہ ہماری کوشش کا براہ راست نتیجہ
نہیں، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا نتیجہ ہے، اس لیے اس پر ہمارا فخر و غرور کرنا بیجا ہے، اسی
طرح ہم کو جو ناکامی پیش آتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی کسی حکمت و مصلحت کا نتیجہ ہے، اور ہمارے
کام سے پہلے ہی ہمارے کاموں کے نتیجے اُس علام الغیوب کے علم میں مقرر ہو چکے تھے، اس لیے
ہم کو دل شکستہ اور مایوس نہ ہونا چاہئے، بلکہ اُسی جوش و خروش اور سرگرمی سے پھر از سر نو جد و جہد
میں مصروف ہو جانا چاہیئے،

اس مسئلہ کی یہ پوری توضیح سورۂ حدید میں ان لفظوں میں مذکور ہے،

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي	کوئی مصیبت نہیں آتی ملک میں اور نہ خود
الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ	تم (اس ملک کے بسنے والوں) میں لیکن یہ کہ وہ
كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ	ایک کتاب (الٰہی) میں اپنی پیدائش سے پہلے
ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ لِكَيْلَا	درج ہوتی ہے یہ اللہ پر آسان ہے ایسا اس لیے

تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا	کیا گیا تاکہ تم اُس پر جو تم سے جاتا رہے غم نہ کھاؤ
بِمَا اٰتٰكُمْ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ	کرو اور جو تم کو (اللہ) دے اس پر اترایا نہ کرو
مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۙ	اور اللہ تعالیٰ کسی اترانے والے بڑائی مارنے
(حدید - ۳)	والے کو پیار نہیں کرتا،

اس آیتِ کریمہ نے مسئلۂ قضا و قدر کے فلسفہ کو اس خوبی سے واضح کیا ہے کہ اس کی تائید کیلئے کسی مزید تشریح کی ضرورت باقی نہیں رہتی، یہ اسی عقیدہ کا نتیجہ تھا کہ صحابۂ کرام رضؓ کی کرنیں عین کامیابی و فتوحات کی حالت میں خداوندِ قادرِ مطلق کے آگے جھک جاتی تھیں اور ناکامی کی حالت میں انکے دل یاس و ناامیدی سے دوچار نہیں ہوتے تھے، اور انکی عملی زندگی کا جو نتیجہ بھی پیش آتا تھا، وہ اُس کو اپنی طرف سے نہیں، بلکہ خداوندِ عالم کی طرف سے سمجھ کر خاموش رہتے تھے، مالی بیچارگی، سیاسی مصیبت، عزیزوں کی مفارقت، لڑائیوں کی ناکامی، کسی موقع پر وہ رحمتِ الٰہی سے مایوس ہونا نہیں جانتے تھے، اور ہر خطرناک سے خطرناک کام کے لیے وہ قدم اٹھا بیٹھتے تھے کہ اُن کا یقین تھا کہ موت اپنے وقت پر آئے گی، اور جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہیگا، اسی لیے اُن کے دلوں میں وہ عزم ہوتا تھا کہ اس کو پہاڑ روک سکتے تھے، نہ سمندر بہالے جا سکتے تھے، نہ حوادث کا طوفان اُسکو اکھاڑ سکتا تھا، اور نہ بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے اُس کو جلا سکتے تھے،

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا	کسی کے اختیار میں نہیں کہ وہ اللہ کے حکم
بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ	کے بغیر مر سکے، یہ لکھا ہوا مقرر ہے جو کوئی دنیا کا
يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ	معاوضہ چاہیگا تو ہم اُس کو اسمیں سے کچھ دیں گے

وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا
وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ، وَكَاَيِّنْ مِّنْ
نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ
فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ،
(آلِ عمران ع - ۱۵)

اور جو آخرت کا معاوضہ چاہے گا، اُس میں سے
کچھ (یہاں) دیں گے، اور پورا معاوضہ شکر کرنے
والوں کو آئندہ (وہاں) دیں گے کتنے پیغمبر تھے
جو لڑے ہیں انکے ساتھ بہت سے خدا کے طالب تھے خدا کی
راہ میں انکو جو مصیبت پیش آئی اس کی وجہ سے
نہ دل ہارے، نہ سست ہوئے اور نہ دب گئے اور اللہ
ثابت قدم رہنے والوں کو پیار کرتا ہے،

ان آیتوں نے یہ واضح کر دیا کہ قضا و قدر کے عقیدہ کا نتیجہ پستی، سستی، اور دون ہمتی نہیں، بلکہ بلندی استقلال، اور صبر و ثبات ہے، اور یہی وہ چیز ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کارناموں میں ہر دیکھنے والے کو صاف نظر آتی ہے، اُن کو صاحب وحی کی یہ تعلیم تھی کہ وہ دشمنوں سے کہدیں کہ ہمیں ڈر نہیں، کیونکہ

لَنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا
هُوَ مَوْلٰنَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ
الْمُؤْمِنُوْنَ، (توبہ - ۷)

ہم پر کوئی آفت آئی ہی نہیں سکتی لیکن جو خدا نے
ہمارے لئے لکھ دیا ہے، وہ ہمارا آقا ہے اور اللہ ہی
پر چاہیے کہ ایمان والے بھروسہ کریں،

خطرات اور مشکلات کی ان کو پروا نہیں کہ جن کے لیے موت لکھی ہے، وہ میدان جنگ میں بھی مریں گے اور بستر راحت پر بھی، اور جن کی موت کا مقررہ وقت نہیں آیا، وہ تلواروں کی دھاروں اور سمندروں کے طوفانوں سے بھی سلامت بچ کر نکل آئیں گے،

يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۭ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ (آل عمران:۱۵۴)

منافق کہتے ہیں کہ اگر ہماری بات مان لیجاتی تو ہم یہاں مارے نہ جاتے، کہدے کہ اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن پر جان مرنا لکھا جاچکا تھا، وہ از خود اپنے مقتل میں نکل کر پہنچ جاتے،

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ (نساء:۷۸)

تم جہاں بھی رہو تم کو موت آکر پالے گی، اگرچہ تم مضبوط اور مستحکم قلعوں میں ہو،

یہی وہ عقیدہ ہے جو مسلمان کی ناقابل ہزیمت جرأت، اور غیر شکست پذیر عزیمت اور بے خوف بہادری کا راز ہے، کچھ لوگوں نے اپنی غلط فہمی سے یہ سمجھا ہے کہ مسئلہ تقدیر کے ماننے سے انسان کا مجبور محض ہونا لازم آتا ہے اور اس سے یہ تعلیم نکلتی ہے کہ انسان اپنی تقدیر پر صابر و شاکر ہو کر سست و غافل بن کر بیٹھ رہے حالانکہ اگر یہ صحیح ہوتا تو نہ رسولوں کی بعثت کی ضرورت تھی، نہ آسمانی کتابوں کے اترنے کی حاجت ہوتی، نہ تبلیغ و ارشاد کی تاکید ہوتی، نہ اصلاح و ہدایت کا حکم ہوتا، اور خدا کی مخلوق اپنے حال پر چھوڑ دیجاتی، مگر ایسا نہیں کیا گیا، لاکھوں پیغمبر بھیجے گئے، کتنی کتابیں اتریں، کروڑوں مبلغ اور مرشد بنا کر پھیلائے گئے، ہدایت و ارشاد کی تاکید پر تاکید آئی، لوگوں کی دعوت و اصلاح ہر مسلمان کا فرض ٹھہرایا گیا، کوشش و محنت، سعی و تلاش اور جد و جہد کی ہر مسلمان کو تاکید کی گئی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جد و جہد سے معمور زندگی ہمارے لئے نمونہ ٹھہرائی گئی اور خلفائے راشدین اور عام صحابہؓ نے اپنے کارناموں سے اس نمونہ کی کامیابی کی تصدیق کی،

اب کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلقین اور آپ کا عمل دو متضاد چیزیں تھیں، نہیں یہ دونوں

ایک دوسرے کی موید تھیں، اور اس طرح یہ ایک دوسرے کی تصدیق کرتی تھیں کہ اعملوا فکل میسر لما خلق (بخاری) لوگو! اپنے اپنے کام کئے جاؤ، کہ تم میں سے ہر شخص سے وہی کام صادر ہوں گے جن کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے، کام کرنا انسان کا فرض ہے، اور اس کے نتیجہ کے مطابق جزا دینا خدا کا کام ہے، اور یہ تقدیر ہے فرمایا۔

إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى. فَأَمَّا مَنْ	بے شبہ تمہاری کوششیں مختلف رخ کی ہیں تو
أَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى	جس نے دیا، اور پرہیزگاری کی، اور نیکی کو
فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى وَأَمَّا مَنْ	سچ کر دکھایا تو ہم اس کو آہستہ آہستہ آسانی
بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى	کی طرف لیچلیں گے، اور جس نے نہ دیا، اور
فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى، وَمَا يُغْنِي	بے پروائی برتی، اور نیکی کو جھٹلایا، تو ہم اسکو
عَنْهُ مَالُهٗ إِذَا تَرَدّٰى. إِنَّ عَلَيْنَا	آہستہ آہستہ سختی کی طرف لے چلیں گے، اور اس
لَلْهُدٰى، وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ	کی دولتمندی اس کو گڑھے میں گرنے سے نہیں
وَالْأُولٰى،	بچا سکتی ہے، بیشک راہ سوجھانا ہمارا فرض
(لیل۔۱)	ہے، اور آخر اور اوّل ہمارے لئے ہے،

یہ ہے قضا و قدر اور سعی و عمل کی باہمی تطبیق، جس کی ژولیدگی نے اسلام سے پہلے ایک عالم کو گمراہ کر رکھا تھا، کام کرنا اور عمل کر دکھانا انسان کا فرض ہے، اور اس کے مطابق اسکی جزا، کا دینا جو اس کام کے لئے پہلے سے مقدر ہو چکی ہے، خدا کا کام ہے، نیکوں کو آہستہ آہستہ نیکی کے مزید راستہ کے دکھانے کا نام توفیق و ہدایت ہے، اور بروں کو خدا کی طرف سے اس توفیق و ہدایت

کے نہ ملنے کا نام عدمِ توفیق وضلالت ہے، اور ان دونوں میں سے ایک کا ملنا انسان کی ابتدائی کوشش سے ہے، خدا فرماتا ہے،

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا. (عنکبوت - ۷)

اور جو ہماری بات میں کوشش کرتے ہیں اللہ ہم اُن کو اپنا راستہ سوجھاتے ہیں،

خدا کی طرف سے توفیق وضلالت کا ملنا، خود انسان کے اچھے یا بُرے عمل کا زمی نتیجہ ہے،

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفَاسِقِيْنَ (بقرہ - ۳)

اور ہم اُس سے گمراہ نہیں بناتے لیکن انہی کو جو ہمارا حکم نہیں مانتے،

غرض پہلے فسق عدمِ اطاعت اور نافرمانی ہوتی ہے، تب اس کے نتیجہ کے طور پر خدا کی طرف سے ضلالت کا ظہور ہوتا ہے۔

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى

وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى، (نجم - ۳)

اور انسان کے لئے نہیں لیکن وہی جس کی اس نے کوشش کی، اور بیشک اسکی کوشش (خدا کے حضور) دیکھی جائے گی،

اس کی مثال بالکل بچہ کی سی ہے، بچہ چلنا یا بولنا کیونکر سیکھتا ہے، وہ پہلے چلنے اور بولنے کی خود کوشش کرتا ہے تو اُس کے والدین اس کو چلنا اور بولنا سکھاتے ہیں، بچہ پانوں اٹھاتا ہے، اور والدین اُس کے ہاتھ پکڑ کر اُس کو دو چار قدم چلاتے ہیں، اور اس طرح رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ چلنا سیکھتا ہے، وہ پہلے زبان ہلاتا ہے، اور مبہم آوازیں نکالتا ہے، تو والدین اُس کو باعنی الفاظ کی تلقین کرتے ہیں، اور اس طرح دونوں کوششیں مل کر بار آور ہوتی ہیں، اسی طرح تقدیر

الٰہی اور عملِ انسانی باہم مل کر انسانوں کی عملی تاریخ تیار کرتے ہیں،

جبر و قدر

عموماً لوگ اسی موقع پر جبر و قدر کے مسئلہ کو چھیڑتے ہیں، یعنی یہ کہ انسان اپنے عمل میں مجبور ہے، یا مختار؟ حالانکہ یہ سر رشتۂ کائنات کا وہ عقدہ ہے، جس کا حل نہ صرف یہ کہ مذہب کے ناخن سے نہیں ہوتا، بلکہ عقل کے ناخن سے بھی نہیں ہو سکتا، جس طرح اہلِ مذہب ارادۂ الٰہی اور ارادہ انسانی کی باہمی تطبیق میں حیران ہیں، اسی طرح فلسفۂ الٰہیات کے معلم علمِ الٰہی اور انسان کی عملی آزادی کے درمیان، اور فلسفۂ اخلاق والے، انسان کی آزادیِ عمل، اور اُس کے موروثی اثرات، فطری جذبات اور ماحول کی تاثیرات کی مجبوریوں کے درمیان جو تصادم ہے، اُس کو بمشکل بچا سکتے ہیں،

دنیا کے عام مذاہب کا بھی یہی حال رہا ہے، ہر دھارے میں ہر گروہ اُسی طرح پڑی ہوئی تھی اور اُس کے حل کی صورتیں وہی انھوں نے نکالی تھیں، یا تو سرے سے اُس سے خاموشی برتی جائے، اور روبے پاؤں اُس راستہ سے گذر جایا جائے، یا بحث چھڑی تو جبر ہی کی طرف اُن کا میلان نمایاں تھا چنانچہ یہی جبر ہندو مذاہب میں تناسخ، آواگون اور کرم کی صورت میں ہے، عیسائیوں میں حضرت آدمؑ کے گناہ، اور خدا کی "مرضی"[1] کے پیرایہ میں ہے، اور یہودیوں کے مجموعۂ تورات میں حضرت ایوبؑ کا صحیفہ اُدھر ہی رہبری کرتا ہے دوسری طرف مجوسی تھے، جنھوں نے انسانی اختیار و آزادی کو یہاں تک بڑھا دیا تھا کہ خود خدا بھی اُس کے آگے مجبور تھا، خدا کو نہ صرف

---

[1] انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنی گرفتاری کی رات کو دعا میں فرمایا "اے خدا اگر تو اس پیالہ کو ہٹا سکتا ہے تو ہٹا دے لیکن میری نہیں، بلکہ تیری مرضی پوری ہو" عیسائیوں کے جبری و قدری فرقوں کی معرکہ آرائی کا حال فرنچ فاضل موسیو دی کانت کی کتاب الاسلام (ترجمہ عربی) ص، سے کسی قدر معلوم ہو سکتا ہے،

انسانون کے بلکہ فرشتون کے کاموں پر کوئی قابو حاصل نہ تھا،[1] غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے پہلے مذاہب کی یہی دو نوعیتیں تھیں، یعنی یا تو ان کو اس مشکل کی خبر ہی نہیں تھی، یا تھی تو خدا کی قدرتِ مطلقہ اور مشیتِ عامہ کی اس طرح تعبیر کرتے تھے کہ انسان بالکل بے بس اور مجبور نظر آتا تھا، یا یہ کہ تناسخ کے چکر میں اس کو پھنسا کر اس کی زندگی کو اس کے پچھلے جنم کے کرمون کے ہاتھون گرو گرد دیتے تھے، یا پھر اس سے بچے تو انسان کو کامل خود مختار بنا کر خود خدا کو مجبور بنا دیا،

تمام انبیاء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی شخصیت وہ نمایان شخصیت ہے، جسکے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس دینہ راز کے چہرہ سے پردہ ہٹایا، حقیقت یہ ہے کہ یہ دو صداقتیں ہیں، اور دونون اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام دنیا اور اس کے ذرہ ذرہ پر قدرتِ مطلقہ رکھتا ہے، آسمان و زمین اور بر و بحر میں کوئی چیز نہیں جو اس کے ارادہ اور مشیت کے بغیر حرکت بھی کر سکے، اس طرح انسان اور اس کے تمام اعمال بھی اسی کی قدرت اور مشیت کے ماتحت ہیں یہ وہ عقیدہ ہے جو ہر مذہب کی، اور خصوصاً اسلام کی جان ہے، اگر یہ نہو تو مذہب کی قوت بے اثر ہو کر رہ جائے اور ایک ایسا خدا ماننا لازم آجائے، جس کے اختیارات محدود جس کی قدرت ناقص اور جس کی شاہنشاہی ناتمام ہو،

۲۔ دوسری طرف یہ بھی صداقت ہے کہ دوسری مخلوقات کو نہ سہی، مگر انسان کو اپنے اعمال کے کرنے نہ کرنے کا کسی نہ کسی طرح اختیار ضرور بخشا گیا ہے، کہ اگر یہ اختیار نہ تسلیم کیا جائے، اور انسان کو اسی طرح سراپا مجبور فرض کیا جائے، جس طرح دوسری مخلوقات ہے، تو پھر انسان

---

[1] شفاء العلیل فی القضاء والقدر والتعلیل حافظ ابن قیم،

کے لئے خیر و شر کا امتیاز، جزا و سزا، شریعت، کتاب تعلیم، اور انبیاء کی بعثت یہ تمام چیزیں بیکار محض ہو جائیں، ظلم و انصاف دنیا میں کوئی چیز باقی نہ رہے، انسان کا اپنے کسی فعل پر قابلِ مدح یا قابلِ ملامت ہونا بے معنی ہو جائے، کسی اچھے کام پر خدا کا اُس کو انعام، اور بُرے کام پر عذاب دینا سراسر ظلم بنجائے، بلکہ اس دنیا کی عدالت میں بھی وہ اپنے کسی فعل کا ذمہ دار نہ ٹھہرے

الغرض یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں، ایک یہ کہ خدا کو اپنی مخلوقات پر قدرت تامہ حاصل ہے، اور اس کی مشیت دارادہ ہر جزو کل پر حاوی ہے، اور دوسری یہ کہ انسان کو بھی اپنے عمل پر کوئی نہ کوئی ایسا اختیار حاصل ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنے اُس عمل کا ذمہ دار بنتا ہے نیکی کے کاموں کے کرنے پر وہ تعریف کا، اور بدی کے کاموں پر ملامت کا سزاوار ٹھہرتا ہے اور اسی کی بنا پر وہ اپنی دوسری زندگی میں اپنے فعل کی جزا و سزا پانے کا مستحق ٹھہرے گا، اسی پر وہ نظرت کے سامنے دنیا کی عدالت میں، اور آخرت میں بھی مواخذہ اور باز پرس کی ذمہ داری میں گرفتار ہے، اور اسی کے لئے خدا کی طرف سے اس کے پاس ہدایت کی کتاب اور راستہ دکھانے والے رسول اور نبی آتے ہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صحیفۂ ربانی پہلی اور آخری آسمانی کتاب ہے جس نے ان دونوں صداقتوں کو پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ساتھ اپنی اپنی جگہ پر تسلیم کیا ہے، اور انکی تبلیغ کی ہے ایک طرف وہ کہتا ہے کہ "خدا کی اجازت کے بغیر درخت کا ایک پتہ بھی گر نہیں سکتا" اور دوسری طرف وہ کہتا ہے ہر جان اپنے کاموں کے ہاتھوں گرو ہے یعنی خدا کی ہمہ گیر قدرت و وسیع اختیار اور ناقابلِ مشیت کے باوجود اُس نے خود اپنے اختیار، خود اپنی مشیت اور خود اپنی حکمت

سے انسان کو ارادہ، اور ارادہ کے مطابق اپنے کام کرنے والے اعضا کو ہلانے کی مشروط طاقت بخشی ہے، ارادہ اور اعضاء کو اُس کے مطابق حرکت دے سکنے کی محدود قدرت اُس کی ذمہ داری، تکلیف، بازپرس اور مواخذہ کی بنیاد ہے، اور اسی پر اُس کے اعمال، اخلاق اور معاملات کی پوری عمارت کھڑی ہے، اس لیے انسان پر اس کے کسی ایسے عمل کی ذمہ داری قانوناً اور شرعاً نہیں، جو اُس کے ارادہ اور نیت سے صادر نہ ہوئی ہو، بلکہ اُس کے کرنے یا نہ کرنے میں وہ مجبور و بے اختیار رہا (اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّات) اس تطبیق سے نہ تو خدائے پاک کی قدرت و اختیار کی وسعت میں فرق آتا ہے، اور نہ انسان کا تمام تر مجبور ہونا لازم آتا ہے، خدا جب چاہے انسان سے اپنے دیئے ہوئے اختیار اور بخشی ہوئی قدرت کو چھین لے، مگر ایک وقتِ مقرر تک اپنے بنائے ہوئے قانون اور فرمائے ہوئے وعدہ کے مطابق وہ اسکو اس اختیار اور قدرت سے محروم نہیں کرتا، فرمایا

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ، (کہف - ۴)	تو جو چاہے مومن بنجائے، اور جو چاہے کافر ہو جائے۔

اس لئے ہر انسان اپنی جنت آپ بناتا، اور اپنی دوزخ آپ مہیا کرتا ہے،

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ أَسَآءَ فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ، (فصلت - ۶)	جس نے نیک کام کیا، تو اپنے لیے کیا اور برا کام کیا تو اپنے لیے کیا، تیرا پروردگار بندوں پر ظلم نہیں کرتا،

کہ اگر ایسا نہ ہو تو وہ ظلم ہو، جس سے اللہ تعالیٰ کی جناب پاک و برتر ہے، چنانچہ آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سے ارشاد ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ط اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ، وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ اَفَاَنْتَ تَهْدِى الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ، اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ، (یونس - ۵)

اے پیغمبر! ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو تمہاری طرف کان لگاتے ہیں، تو کیا تم بہروں کو سناؤ گے اور اگرچہ وہ سمجھتے نہ ہوں، اور ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو تمہاری طرف دیکھتے ہیں، تو کیا تم اندھوں کو سوجھاؤ گے اور اگرچہ وہ نہ دیکھیں، بیشک اللہ کوگوں پر ظلم نہیں کرتا، بلکہ لوگ ہیں جو اپنے اوپر آپ ظلم کرتے ہیں،

وہ انسان جو اندھا اور بہرا بنتا ہے، اور حق کا پیغام نہ سنتا ہے، اور نہ اس پر عمل کرتا ہے، خدا اس کو اندھا اور بہرا بنا کر پھر اس کو دیکھنے اور سننے کی تکلیف نہیں دیتا کہ اگر وہ ایسا کرتا، تو یہ اس کا ظلم ہوتا، اور ظلم کے ہر شائبہ سے اس کا ہر حکم اور ہر کام بری ہے، لوگوں کو قرآن کی ہدایت وضلالت کے الفاظ سے بھی دھوکا ہوا ہے، حالانکہ ہدایت اور ضلالت خدا کا وہ فیضان ہے جو انسان کے اچھے یا بُرے کام کے جواب میں خدا کی طرف سے ہوتا ہے، ضلالت کی نسبت فرمایا،

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ

بیشک جنھوں نے (اسلام کی تعلیمات کے قبول) سے انکار کیا، اُن کو تمہارا تنبیہ کرنا یا نہ کرنا دونوں برابر ہے وہ ایمان نہ لائیں گے خدا نے انکے دلوں پر اور کانوں پر مہر کر دی

عشاوۃ (بقرہ - ۱) اور آنکھوں پر پردہ ہے۔

دیکھو جب انسان سے کفر کا صدور پہلے ہو چکا، تب خدا کی طرف سے ضلالت کا فیضان ہوا، اور اس کو تشبیہاً یوں ادا کیا کہ اُن کے دلوں پر مہر پڑ گئی کہ سمجھتے نہیں، کانوں پر مہر پڑ گئی کہ سنتے نہیں، اور آنکھوں پر پردہ پڑا ہے کہ دیکھتے نہیں، دوسری جگہ فرمایا،

بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ (نساء - ۲۲) بلکہ خدا نے اُن کے کفر کے سبب اُن کے دلوں پر مہر کر دی۔

یہاں بھی اُن کا کفر خدا کی مہر پر مقدم ہے، مقصد یہ ہے کہ جب کفر کا صدور ہوتا رہتا ہے تو دلوں سے صداقت شناسی اور اثر پذیری کا جوہر سلب ہو جاتا ہے، اور یہی خدا کی مہر ہے۔[1]

برخلاف اس کے اگر لوگ کانوں سے پیغام حق کے سننے اور آنکھوں سے دیکھنے اور دل سے سمجھنے کی کوشش کریں تو اللہ تعالیٰ اپنی توفیق و ہدایت سے سرفراز فرماتے، ارشاد فرمایا،

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ (یونس - ۱) بیشک جو ایمان لائے اور نیک کام کئے ان کو اُن کا پروردگار اُن کے ایمان کے سبب ہدایت دے گا۔

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى، (محمد - ۲) اور جنھوں نے ہدایت قبول کی انکو ہدایت میں اور بڑھایا۔

---

[1] قرآن پاک میں جہاں خدا کی اس مہر کا یا کسی کو ہدایت نہ دیئے جانے کا ذکر ہے، وہاں اسکے کفر فسق کی علت ہمیشہ پہلے ذکر کر دی گئی ہے، اس لئے ان آیتوں سے جبر پر استدلال صحیح نہیں،

ایرانی فلسفہ خیر و شر کی نے آمیزش نے اس مسئلہ کو اور زیادہ الجھا دیا ہے، حالانکہ عربی الفاظ
خیر و شر کو اعمال کے خیر و شر سے بحث نہیں، عربی میں مطلق "خیر" کے معنی دولت و نعمت و آرام کے
اور "شر" کے معنی غربت، تکلیف، اور مصیبت کے ہیں، قرآن پاک میں یہ دونوں لفظ ان ہی معنو
میں آئے ہیں، البتہ جب اُن کے ساتھ لفظ عمل شریک ہوگا، تو عملِ خیر اور عملِ شر کے معنوں میں
یہ استعمال ہوگا، جیسے

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا	جو کوئی چیونٹی برابر نیکی کرے گا وہ اسکو
يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ	دیکھے گا، اور جو برائی کرے گا وہ بھی
شَرًّا يَرَهُ (زلزال۔۸)	دیکھے گا،

اس لئے حدیثوں کے ان الفاظ میں۔

وَالْقَدْرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ مِنَ	اور اس پر ایمان کہ خیر اور شر کی تقدیر
اللّٰهِ تَعَالٰى،	خدا کی طرف سے ہے۔

کا یہ مطلب نہیں کہ انسانوں کے اچھے اور بُرے کام سب خدا کی طرف سے ہیں، بلکہ یہ معنی ہیں کہ
انسانوں کو راحت و رنج، مسرت و تکلیف، دولت و افلاس اور صحت و مرض وغیرہ اچھائی
اور برائی سب خدا کی طرف سے پہنچتی ہے، اور اس کے تسلیم کرنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے؟

بعض لوگوں کو صحیح مفہوم کے سمجھنے میں اُن آیتوں سے بھی شبہہ ہوتا ہے، جن میں یہ ذکر ہے کہ
"اگر خدا چاہتا تو اُن کو ہدایت دے دیتا" اس سے وہ غلطی سے یہ سمجھے ہیں کہ خود خداوند تعالیٰ
ہی ہے، جو ان کافروں کو ہدایت سے جبراً روکے ہوئے ہے، حالانکہ ان آیتوں کا مطلب یہ ہے کہ

یہ لوگ از خود اسلام قبول نہیں کر سکتے، الّا یہ کہ خود خدا زبردستی اُن کو مسلمان بنا دینا چاہے، مگر ایسے زبردستی سے مسلمان یا کافر، اور نیک یا بد بنا دینا اللہ تعالیٰ کے جاری قانون کے خلاف ہے، چنانچہ ان آیتوں کا یہی مطلب ہے،

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ، (دھر-۲)	تم نہیں چاہو گے، الّا یہ کہ خود خدا چاہے،
مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ، (انعام-۱۴)	اور (تم کو زبردستی مسلمان بنا دے) وہ نہیں ہیں کہ ایمان لے آئیں الّا یہ کہ خدا چاہے،
وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى (انعام-۴)	اور اگر خدا چاہتا تو اُن کو ہدایت پر متفق کر دیتا،
فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ، (انعام-۱۸)	تو اگر وہ (خدا) چاہتا تو البتہ ان سب کو وہ خود ہدایت دے دیتا۔
وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ (نحل-۱)	اور اگر وہ چاہتا تو البتہ تم سب کو ہدایت دے دیتا۔

مگر اس کی عادت نہیں کہ وہ بندے کے ارادہ اور کوشش کے بغیر از خود کسی کو ہدایت دیدے، اس لئے اس مشیتِ الٰہی کے ساتھ قرآن پاک کی وہ آیتیں مطابق ہوں گی، جن میں بندوں کی مشیت کا بھی اعتبار کیا گیا ہے، فرمایا،

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ	تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے

فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِیْلًا،	تو جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ
(دھر، ۲ ومزمل ۱۰)	قبول کرے۔
فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّہٖ مَاٰبًا (نبا ۲)	تو جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف بازگشت کرے
اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ یَّتَّخِذَ اِلٰی رَبِّہٖ	لیکن جو اپنے پروردگار کی طرف راستہ
سَبِیْلًا، (فرقان ۵)	اختیار کرنا چاہے،

اللہ تعالیٰ کی طرف سے گمراہی بھی اُترتی ہے مگر کن کے لئے، تصریح فرمایا،

۱۔ وَمَا یُضِلُّ بِہٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ (بقرہ ۳)	اور اللہ اس سے گمراہ نہیں کرتا مگر نافرمانوں کو
۲۔ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ	جب وہ کج ہوئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو
وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ (صف ۱۰)	کج کر دیا، اور اللہ بے حکم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا،
۳۔ بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ مَّا کَانُوْا	بلکہ اُن کے کام اُن کے دلوں پر زنگ
یَکْسِبُوْنَ، (تطفیف ۱)	بن گئے۔
۴۔ بَلْ طَبَعَ اللّٰہُ عَلَیْھَا بِکُفْرِھِمْ (نساء ۲۰)	بلکہ ان کے کفر کے سبب سے اللہ نے اُن پر مہر کر دی
۵۔ اَنْصَرَفُوْا صَرَفَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ	وہ پھر گئے اللہ نے اُن کے دلوں کو اس لیے
بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ (توبہ ۱۶)	پھیر دیا کہ وہ لوگ سمجھتے نہ تھے۔
۶۔ کَذٰلِکَ یَطْبَعُ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِ الْکٰفِرِیْنَ (اعراف ۱۳)	اسی طرح اللہ کافروں کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے
۷۔ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ، فَزَادَھُمُ	اُن کے دلوں میں (پہلے سی نفاق کی)
اللّٰہُ مَرَضًا (بقرہ ۲)	بیماری تھی، پس خدا نے بیماری بڑھا دی

ان آیتون میں سے ہر ایک پر غور کرو، ہر ایک سے یہ صاف وصریح معلوم ہوگا کہ انسان کی بداعمالی مقدم ہے، اور اللہ تعالیٰ کا اُس کے جوابی اثر کو اپنی طرف سے ضلالت، گمراہی، زنگ، مہر اور بیماری فرمانا مؤخر ہے، اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضلالت، زنگ، مہر، اور بیماری کا اترنا علت اور انسانوں کا کفر وگناہ ونفاق معلول نہیں ہے، بلکہ حقیقت اسکے برعکس ہے یعنی انسان کا فسق، کجی، زنگ، کفر، انصراف (پھر جانا) نادانی اور قلب کی بیماری پہلے ہوتی ہے، اور خدا کی طرف سے اس کے جواب میں ضلالت وگمراہی اور دل پر مہر بعد کو ہوتی ہے، اور یہی طبعی اصول بھی ہے، انسان جب گرتا ہے تو چوٹ لگتی ہے، اور غمگین ہوتا ہے، تب آنسو کے قطرے ٹپکتے ہیں، اگر کوئی اس کو الٹ کر بیان کرے تو یہ کیسی سخت نادانی ہوگی۔

بہرحال اس مسئلہ میں مہبط وحی ورسالت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عجیب مصلحت مبنی یہ ہے کہ آپنے اپنی اُمت کو اس پر جس شدت سے ایمان لانے کی تلقین فرمائی اُسی شدت سے اس میں بحث ومناقشہ سے منع فرمایا[1]، اور درحقیقت اس نظریہ سے اسی طرح فائدہ اٹھانے میں راز ہے یہ کلی جہاں چنگی کہ اُس کی خوشبو اڑ گئی۔

اس عقیدہ کے تمام وسیع اطراف اور گوشوں کو چھوڑ کر جن کو متکلمین کی مجادلانہ کاوشوں نے پیدا کیا ہے، قرآن حکیم کی صرف اس آیت کو سمجھ لینا کافی ہے،

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ	اور خدا کی سلطنت میں اسکا کوئی شریک نہیں اور اس
كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا (فرقان ۔)	نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اسکا ایک اندازہ (تقدیر) لگا دیا،

[1] مشکوٰۃ باب الایمان بالقدر،

ایمان کے نتائج

گذشتہ صفحوں میں ایمان کی حقیقت، اور اس کی چھ شاخوں خدا، فرشتے، رسول، کتاب، یوم آخر اور قدر کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، اور دکھایا گیا ہے کہ اُن میں سے ہر عقیدہ کی حقیقت کیا ہے، اس کی صداقت کی دلیلیں کیا ہیں؟ اور اسکی تعلیم میں شارع نے کیا مصلحتیں رکھی ہیں. اور شروع میں یہ بحث بھی کیجا چکی ہے کہ ہر مذہب میں اور خصوصاً مذہب اسلام میں ایمان کو اولیں اہمیت کیوں دی گئی ہے؟ وہ بحثیں اصول کی تھیں، یہاں خاتمہ میں نتائج کی حیثیت سے پھر اسی دعویٰ کی تکرار کیجاتی ہے، یعنی یہ کہ درحقیقت ایمانیات اسی لائق ہیں کہ اُن کو مذہب میں یہی اولیں درجہ دیا جائے، کیونکہ مذہب جن نتائج تک پہنچنا چاہتا ہے، وہاں ایمان کی روشنی کے بغیر پہنچنا ممکن ہی نہیں،

اس سے پہلے کہ ہم کسی دستور پر عمل کریں، یہ ضروری ہے کہ ہم اس دستور کی خوبی اور سچائی کا یقین کرلیں کہ اگر ایسا نہ ہو تو ہم اس پر ایمانداری کے ساتھ نہ تو عمل کر سکتے ہیں، اور نہ ہمارے نفس وضمیر پر اس کا اثر ہو سکتا ہے، یہ حقیقت ہر دلیل سے ثابت ہے کہ ہمارے تمام اعمال ہمارے دل کے تابع ہیں، اس لیے جب تک دل نہ بدلے گا، ہمارے اعمال میں تغیر نہیں ہو سکتا یعنی ہمارے اعمال کی اصلاح، تمامتر ہمارے دل کی اصلاح کے زیر اثر ہے، اور ایمان کا مقصد اسی دل کی اصلاح ہے کہ اگر یہ درست ہو گیا تو سب کچھ درست ہو گیا،

یہاں ایک خاص نکتہ ہے، جس کو سمجھے بغیر آگے نہیں پڑھنا چاہئے، یہود نے سب سے زیادہ اہمیت عملی رسم و رواج کو دی تھی، اور عیسائیوں نے اس کے برخلاف صرف ایمان پر نجات و فلاح کا دارومدار رکھا، چنانچہ حواریوں کے خطوط و ملفوظات میں اس تعلیم کو بہت کچھ نمایاں کیا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ عمل نہیں بلکہ صرف ایمان نجات کا ذریعہ ہے، اسلام کی پہلی تکمیلی شان اس بارہ میں یہ ہے کہ وہ دونوں کی اصلاح کر کے اُن دونوں کو جمع کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ نجات نہ تنہا ایمان، اور نہ تنہا عمل پر بلکہ ایمانِ صحیح اور عملِ صالح کی جامعیت پر موقوف ہے، اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے) دوسری بات یہ ہے کہ وہ ایمان کو محض ایمان کی بنا پر اہمیت نہیں دیتا، بلکہ اس لیے اہمیت دیتا ہے کہ وہ عملِ صالح کی علت و سبب ہے، یعنی وہ عملِ صالح کے لیے راستہ بناتا، اور تخم ریزی کے لیے زمین درست کرتا ہے۔

یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، اس لیے نخلِ ایمان کی شناخت بھی اس کے پھل ہی سے ہو سکتی ہے، اب اگر ایسا کوئی شخص تم کو نظر آتا ہے کہ زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتا ہے، مگر اس کے اعمال میں اس ایمان کے مطابق کوئی بہتر تغیر نظر نہیں آتا، تو یہی سمجھنا چاہیے کہ ایمان نے اس کی زبان سے اتر کر اس کے دل کی گہرائیوں میں برگ و بار پیدا نہیں کیا ہے، یہی سبب ہے کہ قرآن پاک ہر نیکی اور خوبی کو ایمان کا خاصہ اور مومنوں کا وصفِ لازم بتاتا ہے، ہر اہم موقع پر اس نے مسلمانوں کو

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا، اے وہ لوگو! جو ایمان لائے،

کی ندا سے خطاب کیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام پر وہی عمل کر سکتے ہیں جو ایمان سے متصف ہیں، بہت سے موقعوں پر ہے،

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ اگر تم ایمان والے ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ بات ایمان والوں ہی کے لیے خاص ہے، اور وہی اسکے اہل و سزاوار ہیں، فرمایا،

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ایمان والے سب سے زیادہ اللہ سے (بقرہ ۲۰۰) محبت رکھتے ہیں،

اس سے معلوم ہوا کہ محبتِ الٰہی ایمان کی بہت بڑی علامت ہے، ایک اور سورہ میں ہے

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ایمان والوں کی بات یہ ہے کہ جب ان کو فیصلہ
اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ کرنے کیلئے اللہ و رسول کی طرف بلایا جائے
لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا تو کہیں کہ ہم نے سنا اور ہم نے مانا، اور
وَاَطَعْنَا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (نور ۵۱) ان ہی لوگوں کا بھلا ہے،

اس سے ظاہر ہوا کہ ایمان کا ایک نتیجہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور اس کے فیصلہ کے آگے سر جھکانا ہے، دوسری آیت میں فرمایا،

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (حجرات ۱۰) ایمان والے تو آپس میں بھائی ہیں،

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ مسلمانوں میں باہمی محبت اور شفقت ہونا بھی ایمان کی نشانی ہے،

ایک اور آیت میں ہے۔

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (آل عمران ۱۰) اور خدا ہی پر چاہیے کہ ایمان والے بھروسہ کریں،

معلوم ہوا کہ خدا پر بھروسہ اور توکل اہلِ ایمان کی شان ہے، سورہ مومنوں میں اہلِ ایمان کے اوصاف یہ بتائے گئے ہیں،

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ، وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ، وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ، وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ.... وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ، وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (مومنون ۱)

بے شبہ اہلِ ایمان نے بھلائی پائی، جو اپنی نماز میں ادب سے جھکے رہتے ہیں، اور جو نکمی بات پر دھیان نہیں دیتے، اور جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں..... اور جو اپنی امانتوں اور وعدوں کی نگرانی رکھتے ہیں، اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں،

ان آیتوں سے اہلِ ایمان کے ضروری اوصاف یہ معلوم ہوئے "نماز میں خشوع و خضوع بے کار باتوں سے احتراز، زکوٰۃ و خیرات دینا، عفت و پاکدامنی، امانت، ایفائے عہد، نمازوں کی پابندی"، ان آیتوں میں ایک عجیب رمز ہے، دیکھو کہ اہلِ ایمان کے اوصاف کا آغاز بھی نماز سے کیا گیا، اور انجام بھی نماز پر رکھا گیا، اس سے اشارہ نکلا کہ نماز ایمان کی اولین و آخرین نشانی ہے، اور اسی لیے ایمان کے بعد سب سے زیادہ اس پر زور دیا گیا ہے۔

ہم نے یہ چند آیتیں یہاں مثالاً نقل کی ہیں، ورنہ اگر کوئی استقصا کرے تو قرآن میں ایمان کے اثرات و نتائج اور بہت سے ملیں گے، احادیث میں بھی اس مضمون کی کمی نہیں، صحیح حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ایمان کی کچھ اوپر ستر شاخیں ہیں" حافظ بیہقی نے اپنی کتاب شعب الایمان میں مختلف حدیثوں سے ایمان کی ان ستر شاخوں کو ایک ایک کرکے گنایا ہے، اس کتاب کا خلاصہ مختصر شعب الایمان کے نام سے چھپ بھی گیا ہے،

ایک حدیث میں ایمان کی شناخت، اخلاق کی پاکیزگی کو بتایا گیا ہے، آپ نے فرمایا،

اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُھُمْ خُلُقًا (سنن ابی داؤد۔ کتاب السنۃ)	مومنوں میں اس کا ایمان سب سے زیادہ کامل ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔

حسنِ اخلاق کا اساسی مرکز محبت ہے، محبت سب سے پہلے تو اسی ہستی سے ہونی چاہیے جو تمام محبتوں کا مرجع و مرکز ہے، یعنی اللہ تعالیٰ، اور اس کے بعد اسی محبتِ الٰہی کے ضمن اور تبعیت میں اُس ہستی سے بھی محبت کرنا جس کی ہدایت اور تعلیم کے وسیلہ سے یہ جوہر ایمانی ہم کو ہاتھ آیا، اس محبت کے سامنے دوسری تمام دنیاوی محبتیں اور قرابت اور رشتہ داری کے علائق ہیچ ہیں، فرمایا۔

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَلَدِہٖ وَوَالِدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ۔ مسلم و بخاری کتاب الایمان)	تم میں سے کوئی اُس وقت تک ایمان کامل نہیں، جب تک اس کے دل میں میری محبت اس کی اولاد، والدین اور تمام لوگوں سے زیادہ نہ ہو۔

ایمان کا تیسرا اثر یہ ہے کہ اس کو اپنی ہم جنس برادری اور پڑوسی سے بھی اسی طرح محبت، پیار اور اخلاص ہو، جس طرح خود اپنے آپ سے فرمایا:

والذی نفسی بیدہ لا یومن	قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے،
احدکم حتی یحب لاخیہ او	تم میں سے کسی کا ایمان اسوقت تک کامل نہیں،
لجارہ ما یحب لنفسہ،	جبتک وہ اپنے بھائی یا پڑوسی (راوی کو شک ہے)
(بخاری و مسلم کتاب الایمان)	کے لیے وہی نہ چاہے جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے،

آپنے ایک دفعہ صحابہ کو خطاب کرکے فرمایا جب تک تم مومن نہ بنوگے جنت میں داخل نہ ہوسکوگے اور مومن نہ بنوگے جب تک تم آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کروگے، میں تمھیں بتاؤں کہ تم میں آپس میں محبت کیونکر ہوسکتی ہے آپس میں سلام پھیلاؤ" (مسلم کتاب الایمان)

یہ محبت کسی نمائش ریا یا ذاتی نفع و نقصان کے لیے نہ ہو، بلکہ خدا اور صرف خدا کے لیے ہو، فرمایا تین باتیں جس میں ہیں اُس نے ایمان کا مزہ پالیا، اوّل یہ کہ اس نے دل میں خدا اور رسول سے بڑھکر کسی اور کی محبت نہ ہو، دوسری یہ کہ بندگانِ خدا سے صرف خدا کیلئے محبت کرتا ہو تیسری یہ کہ کفر سے نجات پانے کے بعد پھر اُس میں آلودہ ہونا اس کیلئے اتنا ہی تکلیف دہ ہو جتنا آگ میں ڈالا جانا" ایک صحابیؓ نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ کامل اسلام کس مسلمان میں ہے، فرمایا، "اُس مسلمان میں جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرا مسلمان محفوظ رہے" فرمایا کہ ایمان کی ستر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں جن میں سے ایک شرم و حیا ہے"، یہ بھی تعلیم دی کہ "جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہو اُس کو چاہیئے کہ زبان سے بات نکالے تو اچھی، ورنہ چپ رہے، جس کو خدا اور آخرت

پر ایمان ہو، اس کو چاہیے کہ اپنے پڑوسی کو دکھ نہ پہنچائے، جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہو اس کو چاہیے کہ مہمان کی عزت کرے"، ایک صحابیؓ آپؐ کے اس ارشاد کو نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا تم میں سے کوئی اگر کوئی برائی دیکھے تو اس کو ہاتھ سے مٹا دے، یہ نہ ہو سکے تو زبان سے ٹوک دے، یہ بھی نہ ہو سکے تو اپنے دل میں اس کو برا سمجھے، اور یہ ایمان کا آخری درجہ ہے"[1]

اس کے بالمقابل آپؐ نے متنبہ فرمایا کہ "نفاق کی چار نشانیاں ہیں، جس میں ان میں سے ایک بھی پائی جائے اس میں اتنا نفاق کا عنصر موجود ہے، اگرچہ وہ نماز گذار اور روزہ دار ہی کیوں نہ ہو، اور اپنے کو وہ مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو، ایک یہ کہ گفتگو کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو توڑ دے، امانت سپرد کیجائے تو خیانت کرے، غصہ آئے تو گالی بکے"[2]

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ تمام نیکیاں، اور ہر قسم کی بھلائیاں اور خوبیاں جس ایک جڑ کی شاخیں ہیں وہ **ایمان** ہے، اور اسی لیے وہ مذہب کا اصل الاصول ہے، وہ نہ ہو تو انسانی نیکیوں کی ساری عمارت بے بنیاد ہے، اس تقریر سے کسی کو یہ شبہہ نہ ہو کہ ایمان کے بعد عمل کی ضرورت نہیں، اسلام نے اسی نکتہ کو بار بار ادا کیا ہے کہ نجات کا مدار ایمان اور عملِ صالح دونوں پر ہے، اسی لیے اٰمَنُوْا کے ساتھ ساتھ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ پر بھی اس نے ہمیشہ زور دیا ہے، بلکہ اوپر جو کچھ کہا گیا ہے، اس کا منشا یہ ہے کہ ان دونوں میں ایمان اصل اور عمل اس کی فرع ہے، ایمان ملزوم اور اعمالِ حسنہ اس کے خصوصیات اور لوازم ہیں، یعنی ان دونوں میں اصل و فرع اور لازم و ملزوم کا تعلق ہے، جو ایک دوسرے سے الگ

---

[1] یہ تمام روایتیں صحیحین کتاب الایمان میں ہیں [2] صحیح بخاری کتاب الایمان پیش نظر مسلم ہے،

اور جدا نہیں ہو سکتے، اس لیے جس طرح ایمان کے بغیر عمل سرسبز نہیں رہ سکتا، اسی طرح عمل کے بغیر ایمان ایک بے برگ و بار درخت ہے، جس کا فائدہ کے لحاظ سے عدم و وجود برابر ہے، اس بنا پر جہاں ایمان ہے اس کے عملی نتائج و آثار کا وجود بھی ضروری ہے،

کاغذ کے آٹھ سو اٹھاسی صفحے سیاہ ہو چکے، ناظرین کے ہاتھ ان اوراق کی گرانباری سے اور آنکھیں ان سطور کی کم سوادی سے تھک چکی ہوں گی، اس لیے بہتر ہے کہ رہرو قلم کیساتھ قافلۂ نظر کے دوسرے رفقاء بھی کچھ دیر آرام کریں، ہر چند کہ

رہروان را خستگی راہ نیست
عشق ہم راہ است و ہم خود منزل است

سلیمان ندوی
لمصنفین دارالمصنفین
رمضان سنہ ۱۳۵۰ھ

دیگر مطبوعات دارالمصنفین

ہرشمار	نام کتاب		مصنف	قیمت
۱	سیرت النبیؐ	جلد اول	شبلی نعمانی	۲۰ روپے
۲	〃	〃 دوئم	〃 〃	〃
۳	〃	〃 سوئم	سلیمان ندوی	〃
۴	〃	〃 چہارم	〃 〃	〃
۵	〃	〃 پنجم	〃 〃	〃
۶	〃	〃 ششم	〃 〃	〃
۷	تاریخ فقہ اسلامی		عبدالسلام ندوی	۲۸ روپے
۸	سیر الصحابیات		سید انصاری	۱۳ روپے
۹	اسوۂ صحابیات		عبدالسلام ندوی	۷ روپے
۱۰	تاریخ اسلام	جلد اول تا چہارم	شاہ محی الدین ندوی	زیر طبع
۱۱	تاریخ دولتِ عثمانیہ	دو جلد	ڈاکٹر محمد عظیم	〃
۱۲	تاریخ اندلس		سید ریاست علی ندوی	〃
۱۳	شعر العجم	پانچ جلد	شبلی نعمانی	〃
۱۴	اسہل کتاب صحابہ و تابعین		حفیظ مجیب اللہ ندوی	〃
۱۵	شعر الہند	اول و دوئم	عبدالسلام ندوی	〃
۱۶	اسوۂ صحابہ	دو جلدیں	〃 〃	〃
۱۷	گلِ رعنا		عبدالحی	〃
۱۸	بزمِ صوفیہ		سید صباح الدین عبدالرحمان	〃
۱۹	بزمِ تیموریہ		〃 〃 〃	〃
۲۰	اقبالِ کامل		عبدالسلام ندوی	〃
۲۱	الفاروق		شبلی نعمانی	〃
۲۲	المامون		〃 〃	〃
۲۳	الغزالی		〃 〃	〃
۲۴	اسلام کا سیاسی نظام		اسحاق حسند وسلی	〃
۲۵	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے		سید صباح الدین عبدالرحمان	〃
۲۶	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے		〃 〃	〃